Hitler Ki Aap Beeti

ہٹلری کی آپ بیتی

از

ایڈوولف ہٹلر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعارف

از قدوس صہبائی

[illegible] ہوائی جنگیزخان اور پولین جارحی تذکروں میں "اعظم" کے لقب کے سزاوار ہیں تو یقیناً اعظم کی ترکیب لغوی بھی بامعنی نہیں۔ اگر مصطفےٰ کمال کا نام صرف اس لیے اعظم ہوتا کہ اس نے یورپ کے مردِ بیمار کو ایک مرتبہ پھر دنیا کی تہذیب قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ تو یہی جنگ عظیم کے بعد ترکی جس شکست خوردہ حالت میں اور اس کی کمزوری کے تاریک گوشوں میں پڑا تھا وہاں سے نکال کر دنیا کی زبردست زبردست طاقتوں کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے والا ہٹلر بھی کبھی انسانی حافظے کا فراموش نہ ہوگا۔

ہٹلر نے اس وقت منتشر و بے جان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا صرف ایک زبردست طاقت کی صورت میں منظم کر دیا بلکہ انہیں ایک نیا فلسفہ دیا۔ اس فلسفے کا مغوں طاقت اور تشدد ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے دور رس اثرات نے آج جمہوری اور سوشلزم کی دونوں فلسفوں کو قابل عمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ "ٹرک ہٹلری" کے مترجم مولانا ابراہیم علی صاحب چشتی کے الفاظ میں "آج روسی اور امریکی دونوں باتوں نے۔

"ہٹلر کا یہ مقصد و تعلیم کر دیا ہے کہ طاقت اور کامیابی ہی سچائی ہے۔۔۔۔ انگریزی، روسی اور امریکی حمایت کرنے والی افواج کو میدان جنگ میں ضرور شکست دی لیکن وہ ہٹلری کارفرما کو نہ مٹا سکے فکر کے دشمن کو اس کے خلاف کامیاب ہیں لیکن اس کے فلسفہ اور طریق کار کے سامنے ناچار ہیں۔۔۔۔ شاید کے اس چیلنج نے ایک عالمگیر جنگ میں ہوش سنبھالا اور ہری جنگ لڑنے والے دنیا سے روپوش ہو اور اب اس کی تلخیں تیسری عالمگیر جنگ کی تیاری کر رہی ہے۔"

"ٹرک ہٹلری" کا مترجم ہٹلر یا نازی کا مسلک اختیار نہیں کرنا چاہتا اس لیے یہ فرض

کسی سوچ بچار کے دائرے ہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ہر نئی کتاب کا مطالعہ شروع کرنے سے پیشتر اس کا تاریخی کردار کسی خارجی معیار پر رکھنے کے لئے کچھ سوچ وضع کرے۔ جب سچ کی دنیا میں ہر قابل ذکر سلطنت فکر کے کسی مخصوص طریقہ کار کی محنت اصطلاحات کا جوا پہنا کر روزانہ معصوم اور بے زبان انسانوں کو جنگ کے جہنم میں جھونک دینے کی تیاریوں کر رہی ہے تو سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آخر کار کسی نہ کسی روز کوئی ایک فکر کامیاب ہو جائے گا اور یہ تمام مختلف نکلی فکروں یا دنیا اصطلاحوں کو سامنے آکر لڑنی پڑی ہیں بلکہ ہے گزشتہ دو عظیم جنگوں سے ہمارے کانوں سنائے کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کیا کبھی کسی کو دنیا کی تاریخ ایک فکر کی ترقی و عروج کی اہم مظہر ہے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مقصود عوام کی آسائش اور امن عالم ہو کبھی اس سوال کا جواب ثبت میں قبول نہ کرے کہ کس طرح ہر فکر کا عروج عوام کی بے پناہ تباہی اور خطرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہر فکر چند روزہ حکومت کے بعد فنا کی آغوش میں ڈوب ہو جاتا ہے پھر اس کے جانشین اس کے تشدد اور ظالمانہ طریقہ کار کو نہ اپنا سکے یا قدرت کے جذبہ انتقام کا شکار ہو کر علم کی حالت کو اس وناک کی طرح رہا کر لے جاتا ہے جو بچھو کے مرنے کے بعد اس کی ہلاکت کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہو اس بار و ہم کے مستبدانہ کردار نے انقلاب فرانس کو جنم دیا فرانس کے انقلابی لیڈروں کے عدم توازن سے تباہ ہونے نہیں پولین کے جنگ آرا سے پامال کر دیا۔ اور شہ پولین کی ہوس ملک گیری نے طاقت کی ارض کشور کشائی کا خواب رہ گئی۔

ہٹلر ویلف ایک سے بڑھ کر طاقت تھا اور فکر کے مصنوعی قرار دیا گیا اس کے قتل قدم ہی چل کر ضرور ایک تباہ کن طاقت ثابت ہوں گے لیکن ہٹلر کے حملے قریب کی وہ سوچنے والی ان ہاتھوں اور سر کے لئے ہی موت کی ادنی خواہش ایک ایک ہٹلر کو تاکر کے دم لے گی جب تک دنیا کی حاکمیت کا کاروبار چھائیں جاتی جب تک علم اور فکر کے

شیرازے اسی طرح بکھرے ہوئے رہیں گے۔

ہٹلر کے آبا و اجداد کا ایک نقشہ ذہن میں رکھتے ہوئے آپ ہٹلر سے ملیے اور جنم تصور سے دیکھیے کہ یہ فتنہ کس طرح پیدا ہوا۔ کیسے پرورش پائی اور کیا کیا گل کھلانے کے بعد کن بے نتیجوں کے ساتھ کس فتنہ سامانی سے روپوش ہو گیا۔

ہٹلر 1889ء میں براؤ (آسٹریا) اور آسٹریا کی سرحد پر واقع "سرائے ہوف" پیدا ہوا۔ ہوف سرائے کا ایک گاؤں ہے اور براؤ ہٹلر کا کس طرح ایک دریا ہے کے کنارے پر ایک ٹوٹی آفتاب بن کر چمکا یہ ایک دلچسپ اور عبرت انگیز کہانی ہے۔

ہٹلر کے باپ کا نام الوئس شکل گروبر تھا وہ ایک موچی تھا اس کی زندگی اس کی پہلی بیوی کی موت کے سہارے شروع ہوئی تھی بیوی کی موت و معاش سے مایوس کسٹم انسپکٹر بن گئے نہ جانے اس داستان میں کہاں تک سچائی ہے لیکن فتح یاب ہتلر اپنی تحقیق کے پل باندھے کرتے ہیں کہ ہٹلر اپنی ماں کی بہن (خالہ) تھا اور ہٹلر کے ماں باپ کی رسمی شادی اس کی پیدائش کے مہینوں بعد ہوئی تکمیل کو پہنچی یہ واقعہ بھی ہو تو بھی اب کوئی عجوبہ نہیں کیونکہ عیسائی یورپ کے رسم و رواج کے مطابق ہونے والی بیوی کی شادی سے پہلے مرتے دم تک ایک دوسرے کی "آزمائش" کرتے رہتے۔ ایک عام دستور ہے اس شادی کے بعد ہٹلر کی ایک بہن پولا 1897ء میں اور ہٹلر ایک بھائی ادولف پیدا ہوئے۔

ہٹلر کا بچپن عام زندگی کی بڑی مسرت سے محروم تھا باپ ایسا ہٹلر کی اس آزادی کی مخالفت کرتا تھا کہ وہ ایک لمحہ کا بھی آرام نہ لے سکے یہاں تک کہ خود ہٹلر کے بیان کے مطابق رفتہ رفتہ وہ اپنے باپ سے نفرت کرنے لگا۔ نفرت نے اسے ماں کی آغوش محبت میں بھی زیادہ دیر تک نظر حاصل نہ کرنے دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ہٹلر کی زندگی میں کبھی اس نے سچی محبت کی ہی نہیں کی سماج نے ہٹلر کے بچپن میں اس سے جو جو سوتیلی ماں رکھی تھی بڑے ہو کر ہٹلر نے تمام دنیا سے اس کا خون کا انتقام لیا ہے بڑے باپ کے بچے بھی ہمیشہ ایسے ہوتے ہیں جو قوم اپنے لوگوں کو گناہ کی سخت سزا دیتی

سے محفوظ نہیں رکھتی اسے جلد ہی اپنے اعمال کی پاداش بھگتنی پڑتی ہے۔

مغلوں کے دور میں لاہور کو جہاں تجارتی کے کاروبار کے تاریخ کے معلومات سے بڑھ چڑھ کر آپ سے باہر ہو جاتا تھا اگرچہ اس کا باپ آسٹریا سے تجارت کی ملوکیت کا مالک تھا۔ لیکن اس کا دل کھلے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں کچھ نہ رہتا تھا۔

جب اس کی عمر تیرہ سال کی تھی تو اس کا باپ مر گیا دو سال بعد ماں بھی اسے داغ مفارقت دے گئی وہ تنہا تھا اس کے پاس کچھ نہ تھا اس کے عزیز اور رشتہ دار دنیا میں موجود تھے لیکن تجارتی کاروبار کے گروں پر اسے زندگی بسر کرنا بہت دشوار دکھائی دیتا تھا۔ وہ سوچتا اس کی جان کا اس طرح رہنا کرب کتنا شدید ہوگا۔

اٹھارہ انیس برس کی عمر میں لڑکا آسٹریا کی دارالحکومت "ویانا" کو روانہ ہوا وہ ایک تھوں تا آشنا چھوٹے سے گاؤں سے چلا کہ ایک بڑے شہر میں بے یار و مددگار رہ پڑا تھا اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی لیکن اس کے دل میں اب بھی یہی آرزو تھی کہ وہ ایک تصویر بنانے کا آرٹسٹ بنے گا۔ اس نے ایک بڑے سکول میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے مدرسین نے یہ ہدایت دی کہ وہ تصویر بنانے کی بجائے فن تعمیر کی تعلیم حاصل کرے۔

لڑکے نے اسے بری طرح گھیر رکھا تھا مجبوراً وہ فن تعمیر کی تربیت حاصل کرنے کے لیے کسی عمارتی ٹھیکیدار کے ماتحت مزدوروں اور مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگا۔ تحمل اور تعمیر اور تخریب و تعمیر کا ایک جائزہ لیا اس کے رگ و ریشہ میں سما گیا۔ مزدوروں کے نام نہاد لیڈر خود تعمیروں کے نام پر تعمیروں کرتے تھے لیکن مزدوروں کی حالت نہ سنبھلتی تھی۔ پہلے پہل لڑکے نے بھی مزدور لیڈروں کی اطاعت کی لیکن رفتہ رفتہ اسے کیونکہ مزدور لیڈروں سے نفرت ہو گئی۔

انہی دنوں ویانا کا ایک مزدور لیڈر "کارل وکز" ..... سوشلزم کے خلاف

کی تبلیغ کا مسلسل پروپیگنڈے کا رہا تھا۔ اگر کوئی کچھ تو اپنی ذہنی قوت کے باعث اور کچھ وطن کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنی ذات اور یہودی سرمایہ داروں کی پیدا دشمنوں کے نتیجے کا احساس اور ان دشمنوں کے احساس برتری کی بیماری اور تمام قوموں کے تعاون کی تکمیل میں نظر آنے لگا چنانچہ ہٹلر نے اسی خواہش کو بار بار اپنی تصنیف "میری جدوجہد" میں دہرایا ہے۔

جسمانی محنت اور مشقت سے فرصت ملنے پر ہٹلر پوسٹ کارڈ سائز کے کتبے کے ٹکڑوں پر نقش کاری کیا کرتا تھا۔

عارضی ملازمت میں وہ اس قسم کی تصویریں فروخت کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس کی حالت نہ سنبھلی مجبور ہو کر 1913ء میں وہ میونخ روانہ ہو گیا اس کی جدوجہد اور مشقت کی زندگی تو یہاں بھی جاری رہی۔ لیکن اس کی حالت میں ایک تبدیلی بھی پیدا ہو گئی یہاں اس نے ایک کمرشل آرٹسٹ کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ یہ کاروبار نہ چلنے کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

1914ء میں ہٹلر کی قسمت کا پانسہ پلٹنے کا آغاز ہوتے ہی اس نے بغیر دیر کیے وہ فوج میں بھرتی ہو گیا آج تک وہ ایک آسٹرین باشندہ اور غیر جرمن سمجھا جاتا تھا۔

1914ء سے لے کر 1918ء تک پہلی جنگ عظیم میں ہٹلر کا ریکارڈ سوائے اس کے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا کہ اسے کئی دفعہ ترقی کا موقع ملنے میں آسٹرین کمانڈر کا تردد کیا گیا تھا۔ وہ کارپورل کے عہدہ تک پہنچ گیا 1912ء میں وہ دوبارہ "سومے" کے معرکہ کے دوران زخمی ہو کر ایک اسپتال میں داخل ہو گیا اور جنگ کے اختتام تک وہیں رہا۔ جب صحت یاب ہو گیا تو وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہوا تھا۔

جنگ میں جرمنی کی شکست ہٹلر کے دیوانی خیالوں کا سد راہ تھا اور اس کے اپنے قول کے مطابق وہ اپنی ماں کی موت کے بعد اس موقع پر پہلی بار خاموش اور رو پڑا۔ اس

کے نوٹ تصورات تحریر ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اس نے ان خیالوں سے نظریات کا ایسا ڈھانچہ کھڑا کیا جو اس کے ذہن میں ایک مکمل نظام کی طرح کھل رہا تھا۔ اسے اپنے مقصد کا علاج سوائے ہوسٹ کے کھڑے میں گھومنے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ رفتہ رفتہ غور و فکر اور کافی تامل کے بعد اس نے یہ نصب العین بنا لیا کہ جرمن نسل کو جمہوریت، سوشلزم کیت اور بیوروکریٹ کی زنجیروں سے نجات دلائی جائے۔ اس دوران میں وہ پبلی رہنمت کے ساتھ شامل رہا۔۔۔۔ اور میونخ میں ہی مقیم رہا۔

میونخ کا شہر اس زمانہ میں ہر قسم کے سیاسی خیالات کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ تمام رنگ و قسم کی سیاسی جماعتوں کا مشاہدہ وہ بغور کرتا رہا۔ اپنی طبیعت کے باعث ہٹلر ان سیاسی جماعتوں سے متنفر تھا۔

1919ء میں ہٹلر نے گاٹ فرائیڈ فیڈر کا اقتصادیات کے متعلق ایک لیکچر سنا۔ وہ فیڈر کی قدرت خیال سے بہت متاثر ہوا۔ فیڈر کا فکر یہ اقتصادیات پر تھا کہ دولت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دولت سودی سرمایہ داری کا نام ہے جس کے مالک یہودی ہیں۔ اور دوسری محنت یا مشقت کے محض سیاری فریب کاری اور سود خوری سے ان مزدوروں کا خون چوس چوس کر موٹے ہو رہے ہیں۔ سودی سرمایہ داری پبلی میں اقوامی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر قومی کا قومی مفاد قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ دوسری اس کے دولت کی ایک دوسری قسم وہ ہے جو محنت مشقت اور کفایت شعاری سے فراہم کی جاتی ہے ایسی دولت قومی کے قومی مفاد کے منافی نہیں بلکہ قومی کی آزادی کی ضمانت ہے یہودی سود خور سرمایہ دار ہوائی پیدا کرتے ہیں کہ مزدوروں کا خون چوستے ہیں اور پھر ان کے انقلاب سے بچنے کی خاطر ان مزدوروں کو قومی کے محب قوم دولت مندوں کے ساتھ لڑا دیتے ہیں۔

ہٹلر نے فیڈر کے اس اقتصادی نظریہ پر ہاشویکی سوشلزم اور قومی سوشلزم کے مابین ایک خلیج کھینچ دی۔ جہاں ہاشویکی سوشلزم سرے سے سرمایہ داری کو ختم کر دینے

کا دعویٰ تھا۔ وہاں جرمن کمیونسٹ سوشلزم اور سرمایہ داری صرف اس حد تک پابندیاں عائد کرنے کا خواہاں تھا جو جرمنی کے قومی استحکام کے لیے ضروری ہو۔

نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی ایک چھوٹی سی جماعت تھی۔ جس میں کل ملا کے بیس آدمی شامل تھے ہٹلر کو اس پارٹی میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا تو پہلے اس نے ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن بالآخر اس نے اس پارٹی کا ساتواں رکن بننا منظور کر لیا۔ جلد ہی ہٹلر کی غیر معمولی جرمن خوبیوں کو بھی اس پارٹی کا رکن بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریر کرنے کا ہٹلر پر عادت کر دیا کہ وہ ایک سوز مسلسل رہی ہے۔ جب وہ تقریر کرتا تو ایک جذبہ اس کی باتیں سننے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ہٹلر پارٹی شدت سے اشتراکیوں جمہوریوں اور یہودیوں کے خلاف رہا کرتا۔ وہ معاشرہ کی برائیاں ذکر کرتا۔ عوام جب تالیوں اور نعروں سے تحسین کرتے تو ہٹلر کی تخلیقی روح اور نعروں و کار ایک عجیب قسم کی تسکین محسوس کرتے۔

ہٹلر کی ذاتی زندگی اور صلاح کے علاوہ اس کی کامیابی کا ایک اہم راز یہ بھی تھا کہ ہٹلر کا اضطراب اور جوش انتقام لاکھوں جرمنوں کی دلی کیفیتوں کا ترجمان تھا۔ جرمن قومی جنہیں معطل کر کے ملکی زندگی سے خارج کر دیا گیا تھا ہٹلر ہی جان پھونکتے تھے۔ جرمن صنعتوں کے مالک جن کا کاروبار اشتراکیوں اور بیرونی دشمنوں کے ہاتھ سے تباہ ہو رہا تھا۔ اپنی ہمدردیاں ہٹلر کے قدموں پر نچھاور کر رہے تھے ہٹلر کے "خونی رضا کاروں" کے دستے ملک کے طول و عرض میں اپنی دہشت انگیزی کا سکہ بٹھا رہے تھے فوج پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی جمہوری حکومتوں کے دور میں اکثریت کی ایک ایسی تحریک حاصل کر رہی تھی جس کے نعرے سن کر ہر جرمن کے دل و دماغ میں ایک چنگاری سلگ اٹھتی تھی جو بالآخر ایک شعلہ بن کر ہٹلر کی اور ایک دن آتش فشاں جہنم کی صورت اختیار کر کے نہ صرف جرمنی بلکہ دنیا کی اقوام اور کروڑوں انسانوں کو بھی بھسم کر گئی۔

8 نومبر 1923ء کو جرمنی میں سیاسی فضا ایسی ہو رہی تھی ہٹلر کو گرفتار کرنے کے بعد

کے دوران میں نظر بند کر دیا گیا۔ دوران نظر بندی میں ہٹلر نے "میری جدوجہد" لکھنی شروع کی۔ 1923ء میں ہٹلر کو رہا کر دیا گیا۔ وہ دوبارہ اپنی پارٹی کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔ 1929-30ء کے عالمگیر اقتصادی بحران نے ہٹلر کی پارٹی کو بڑی تقویت پہنچائی۔ 1930-32ء میں ہٹلر کی نازی پارٹی جرمنی کی سب سے طاقتور سیاسی جماعت بن چکی تھی۔

1932ء کے عام انتخابات میں ہٹلر کی پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ جنوری 1933ء میں ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر یا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہٹلر جمہوری دوست کا لبادہ اوڑھ کر مطلق العنان آمر بن گیا۔ اس کے حواری دستوں نے ایک طرف ہٹلر کے سیاسی دشمنوں کو ختم کرنے کے کام انجام دیے۔

برسر اقتدار آتے ہی ہٹلر نے قومی تنظیم نو کا وہ عظیم الشان پروگرام شروع کر دیا جس نے چھ سال کے اندر جرمنی کی فوجی قوت کو دنیا کی بڑی بڑی مملکتوں کی متحدہ فوجی قوت پر بھی بھاری کر دیا۔ ساری دنیا ہٹلر کی طاقت سے لرز رہی تھی۔ کبھی وہ بلجیم کے راستے برطانیہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر آسٹریا کو حاصل کر لیتا تھا۔ اور کبھی اس کی غضب ناک آنکھوں کا ایک اشارہ دیکھ کر چیکوسلواکیہ کے حکمران ہتھیار ڈال دیتے تھے۔

1939ء میں ہٹلر نے پولینڈ سے اس راہداری کے جرمن شہر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ کے چیمبرلین وزیر اعظم مسٹر نیویل چیمبرلین کو بھی اب احساس ہو چکا تھا کہ ہٹلر کو مزید آگے بڑھنے کا موقع دیا گیا تو وہ فرانس کا صفایا کر کے برطانیہ کی گردن مروڑنے کی دھمکی دے گا۔ چنانچہ برطانیہ اور فرانس نے ایک طرف پولینڈ اور دوسری طرف رومانیہ اور بلقان کی دوسری ریاستوں کے تحفظ کی گارنٹی کا اعلان کر دیا۔

ہٹلر نے جب دیکھا کہ برطانیہ اور فرانس جرمنی کو عملی حملے میں پہلے کے سے زور شور کے ساتھ ہتھیار کر رہے ہیں تو ہٹلر نے فیصلہ کن قدم کر کے خود روس سے پولینڈ کا بٹوارہ کر

لیا۔ روس نے پہلے رومانیہ اور فرانس سے ہتھیار کرانا چاہا لیکن روس کی خواہش تھی کہ اسے ہتھیار اسٹونیا اور پولینڈ میں روسی فوجیں گرفتار کرنے کے بعد ملے یا اسے روکنے کی اجازت دی جائے۔ برعکس اس کے برطانیہ اگر جرمنی کو بڑھنے نہ دیتا تو روس کے پاس اتنا کافی وقت نہ تھا طویل گفت و شنید اور دو ہفتہ سازباز کے بعد انگلستان نے فرانس، بلجیم اور ہالینڈ کے ساتھ مسیو مولوف کے ساتھ گفت و شنید کے بعد روس و رومانیہ کے درمیان معاہدہ کا اعلان کر دیا گیا۔

یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا 28 ستمبر 1939ء تک پولینڈ کا ہر حصہ دو سامراطر کے زیر نگیں آ چکا تھا۔ اور پولینڈ کے مشرقی خطوں پر روس کا قبضہ ہو چکا تھا۔

1940ء کے موسم بہار میں جرمنی نے ناروے پر حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ ناروے کا ایک فوجی افسر میجر کوزلنگ جرمنی کے ساتھ مل گیا 10 جون 1940ء تک ناروے پر جرمنی کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔

ہی ٹلر نے 10 مئی 1940ء کو جرمنی، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ اور فرانس کی سرحدیں جرمنی کی مسلح ہو چکی تھیں۔ برطانوی فوج بمشکل بچ بچا کر ڈنکرک کی بندرگاہ سے گھر کو بھاگ سکی۔

1940ء کے آخر میں برطانوی فوج نے اطالوی طرابلس پر فتح قدمی شروع کر دی۔ 1941ء میں جرمن فوجیں خود ہی کی مدد کو آگئی تھیں مشہور جرمن سپاہ سالار رومیل جو رومیل ان فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ برطانوی فوجیں مکمل طور پر تک مراجعت کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

ی سال انگلستان کی سمندری برتری ہو گئی اور برطانیہ عظمیٰ پر جرمنی کی فتح کے امکانات ختم ہو گئے۔ جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ شروع شروع میں جرمنی کی فوجی قدمی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ماسکو میں لینن گراڈ وسط میں ماسکو اور جنوب میں ہارکوف پر قبضہ کرنے کے

ہمدرد کو ماسکو تک نہ آنے دیا جائے گا۔

1941ء میں ہی برطانیہ اور روس نے ایران پر قبضہ کر لیا۔

1943ء میں روسیوں نے جوابی حملہ شروع کیا۔ 1944ء میں جرمن فوجوں کو روسیوں کے مقابلے میں شکستیں ہونے لگیں جون 1944ء میں امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں مغرب سے متفقہ فرانس پر حملہ آور ہوئیں دو ماہ کے اندر فرانس، بیلجیم اور ہالینڈ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن جب اتحادی افواج فرانس اور جرمنی کی سرحد پر سے سیدھا برلن تک پہنچیں تو ان کو رک جانا پڑا۔ ہٹلر نے آخری بار اپنی قوت مجتمع کر کے آرڈینس کے میدان پر اپنا آخری دست حملہ کیا کہ اتحادیوں کو راہن سٹریٹ کے کنارے پیچھے ہٹا دے۔ لیکن اتحادی جلدی سنبھل کر پھر حملہ آور ہوئے۔ ادھر روسی جرمن فوجوں کو شکست دیتے ہوئے جرمن علاقے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ تیسری طرف اٹلی میں سوویٹ کی فسطائی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی تھیں۔

ہٹلر نے جب اپنی شکست کو یقینی سمجھا تو عورت کی دوست کو دوست کی زندگی پر ترجیح دی۔ اور 30 اپریل 1945ء کو خودکشی کر کے اپنی نعش اپنی معشوقہ ایوا براؤن کے ساتھ 8 مئی 1945ء کو جرمن فوجوں نے اتحادیوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔

یہ تھا ایک عظیم المرتبت جرنیل، ایک کامیاب انتظامی، ایک زبردست فوجی، ایک دانشمند مدبر اور ایک مؤثر اعلم سیاست دان کا سرتاسر انجام۔ علامہ اقبال نے اپولین پر نظم لکھتے ہوئے ان جرنیلوں کے حشر کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ہے مگر اس قوم کے جرنیل کی آغوش تنگ
جس میں پیدا ہو نہ سکیں قیصر و نپولیاں

☆☆☆☆☆

وہ مر کر بھی زندہ ہے

افلاطون تو مر گیا لیکن اس کا فلسفہ آج بھی زندہ ہے۔ پچھلے دو ہزار سال سے اس کے افکار کے خلاف جنگ چھڑی لیکن انگلستان، روس اور امریکہ نے اس کے افکار کو قبول کر لیا جس کا پرچار افلاطون خود اپنی جمہوریہ اور دوسری عالمگیر جنگ میں ناکام رہا لیکن افلاطون کا جمہوری فلسفہ بالآخر آج دنیا کے تمام دوسرے سیاسی فلسفوں پر غالب آ چکا ہے۔

افلاطون اور انگلستان میں موازنہ

افلاطون کی تصنیف "ریپبلک" کے بعد انسانی تمدن کی تقریباً دو ہزار سال کی تاریخ میں "نزک بابری" دوسری کتاب ہے جس نے محض ایک عقلی کلام کی بنا پر ایک کامل ریاست کے ہر شعبہ کی تفصیلی تصویر پیش کی اور جس نے اتنی شہرت حاصل کی۔ افلاطون نے اپنی ریاست کی بنیاد عالمگیر اور ازلی و ابدی انسانی حالتوں اور جذبات پر رکھی تھی۔ بابر نے فرضی بے عقل کو تمدن کی بنا قرار دیا اور جس عقل کی خیر اہم فرض کرتے ہوئے سلطنت کا نقشہ تیار کیا۔ افلاطون کو موقع ملا تھا تو وہ اپنی ریاست کے تصور کو عملی شکل نہ دے سکا۔ بابر کو بظاہر یہ موقع میسر نہ تھا۔ لیکن اس نے اپنی قوت عمل سے اپنے خواب کی تعبیر بھی پیش کر دی۔ یہ درست ہے کہ تعبیر ادھوری ثابت ہوئی لیکن اس سے خواب کی عظمت میں بظاہر فرق نہیں آتا۔ شاید افلاطون کی ریاست کی بنیادیں تو بابر کی ریاست سے زیادہ گہری ہیں لیکن بابر کا کارنامہ زیادہ قابل عمل ثابت ہوا۔

بابری نظام فکر کی خصوصیات

بابری نظام فکر کی خصوصیات تین ہیں

۱۔ اول وہ خیال جو عمل، تصور اور حقیقت، دماغ اور روح کی بنیادی وحدت کا قائل ہے اس لیے اس کے کلام میں تشدد کو کبھی بنیادی طریق کار کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

دوسرے وہ طبیب اور مسلمان کی ہاتھی کی بجائے خون اور نسل قرار دیتا ہے
یہی وجہ ہے کہ فکر کی اجنبی منزلوں سے گزرنے کے باوجود اس کے فلسفہ کا خطاب
زمینوں تک محدود رہا۔

دور حاضر کی نفسیاتی عمیق اور تاریخی تحقیق کو نطشے نے اس ہمہ گیری اور خوبی سے
اپنے کلام فکر سے سمیٹا ہے وہ قابل داد ہے۔

فلسفہ عمل و قوت

میں وہی کا معتقد اور عالمگیر دینی قوت کا قائل ہونے کی حیثیت میں نطشے کے اصلی
مقصد و مدعا کو خلط کرتا ہوں۔ لیکن اس کے کلام فکر کی دوسری دونوں خصوصیتیں یقیناً فکر
انسانی کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ بھاپ، بجلی، ہوائی جہاز، آٹومیٹر، ہوائی
جہاز، آٹومیٹر، ریڈیو، بجلی خون اتار اور بے تاری قوت کے انکشاف سے گذشتہ سو سال
میں یورپ کے اندر جو اخلاقی تمدنی اور سیاسی تصورات نشوونما پاتے رہے نطشے کا فلسفہ ان
کا پورا ترجمان کرتا ہے۔ زندگی اسے عاقت کا مظہر، فکر آتی ہے دنیا کی ہر شے اور ہر عقیدہ
عاقت کے سامنے ہیچ ہے اس عاقت کے مندر میں وہ تاوان ہیں، یقیناً یہی ایجادات
کرنے والے تھے مگر لوگ جو باقی دنیا پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں یہ
بیسویں صدی کے برمن اپنے دین کو مسل کا ذمہ دے کر یہودیوں کو راکفلر اور
دوسرے لیڈروں کو پیچھے رکھتے ہیں۔

عمر دکار اور عمر دانکار

نطشے عمر دانکار کی بدقسمتی سے بڑا کر وہ عمر دکار بھی تھا ایک عرصہ تک اس کی سیاست
اس کی فراست سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ وہ ہر لحظہ سے توشہ سے اپنے ہر چھوٹے
بڑے عمل اور خارجی دنیا کی اقدام میں کامیابی ہوئی لیکن اس کے جھاڑی کا نشہ اور
رنج دونوں بڑھ گئے۔ شاید وہ روحی قوت کا اندازہ نہ کر سکا۔ شاید وہ اپنی عاقت غلط سمجھا
شاید اس کا یہ کلی عقیدہ غلط تھا کہ مگر زیادہ عمر کی روس کے مقابلہ میں ہار اس کے

معاون ہوں گے۔ ثانیاً وہ جمہوری نظام کی گہرائی ہو کر رہ سکے نہ پھیل سکا۔ بہر حال اس مرتبہ کی جنگ عظیم ضرور لڑی۔ جدید ہتھیار کی کمی کے لئے کی نوبت بھی آ چکی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عمل کی ایک چوک سے نظر کے بنیادی تصورات بھی سب غلط ثابت ہو گئے ہیں۔

یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

آج دنیا میں نئی نئی چالیں ذکر مطلق پائی ہیں۔ انگلستان، روس اور امریکہ ان تینوں نے نظر کا یہ عقیدہ تسلیم کر لیا ہے کہ طاقت اور کامیابی کی کنجی ہے دنیا میں مادی نتائج حاصل کرنا اور ان سے مادی لذتیں حاصل کرنا ہی زندگی ہے۔ جتنی کی سہولتیں اور لذتیں حاصل ہو سکیں اس نے کہا ہاں۔ جو پتے کے ساتھ اس ہوئے کھوٹے کے لیے موت تک لڑنے والی ہے۔ طور اطمر کے اس دعوی کو ثابت کرنے کے لئے یہی لفظوں کی رٹ استعمال کی جاری ہے کہ ایک مگر ہی روسی یا امریکن مصنف یا علم نظر نے "ترک نظری" کا جواب نہیں لکھا ہے مگر ہی روسی اور امریکن فوج نے ان عساکر کو میدان جنگ میں شکست ضرور دی۔ نظام نظری اور اور نظری کی کسی ایک کتاب ہستی کو دین نظری سے روگردان نہیں کیا گیا۔ البتہ انہیں پھانسیاں دی گئیں اور دی جاری ہیں کلام نظری کی تکذیبات کا جواب لکھنے کے بجائے انہیں جلایا جا رہا ہے۔ اس کی اشاعت بند کی جاری ہے اس سے کیا ثابت ہوا کہ نظر کے دشمن کو اس کے خلاف کامیاب ہیں لیکن اس کے فلسفہ اور طریق کار کے سامنے لاجواب ہیں۔ دین نظری کے پرستار گھڑی پر سے تاری کیوں دیے گئے ہوں لیکن وہ جو شور آسمان پر اڑا رہے ہیں۔ ممالک مغرب آج بھی طاقت کے پرستار ہیں۔ روسیوں نے جیسی دنیا اسلام کو صلیب پر چڑھا کر دین کا دین اکتیا کر لیا تھا۔ اور صدہا سال ان کے ہاتھ پر حکومت چلتے رہے۔ بالکل اسی قبائل اور انقلابیوں نے نظر کو دنیا میں جاری کیا لیکن اس کی راکھ ان کی آنکھوں کا سرمہ ہے وہ دین اور نمونہ اس کے پیغام کی اصل

بحیثیت مترجم کے میں رہا کار کا منصب اختیار کرنا مناسب نہیں۔ مگر ورنہ اس اور
اشتعال پر بعد ذہنی کنفیوژن ہو کر پیام سے بہت جلد متاثر ہو جایا کرتی ہیں اس
لیے ان کو متوجہ کرنے کی خاطر اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح فلسفہ اور فن کے
معراج پر پہنچے ہوئے یونان کے لوگوں کی "ریپبلک" وحی سے خالی تھی۔ اس طرح
بجوات اور معجزات کے حامل کامل بشر کی خوش قامت روح اللہ اور اس کے رسول کی
رحمت سے عاری ہیں۔ ہاں سلطانیوں اور طاغوتوں سے حق و باطل کی تمیز کے لیے
روحوں کی ضرورت ہوتی تو ہمیں ان کے بھیانک چہرے "حقیقت کام" آئے گی۔ لہٰذا ہم "ترک
جنگ" کے مطالعہ سے محض لطف خدا کے لیے اس کے تصور کو اپنا سکتے ہیں اس کی عمر
طرزی کے معنوں کو ہمیں ہم طوں کی سمجھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆☆

حصہ اول

باب اول — میرے والدین

سپاہی کی تلوار اور ہل چلانے والا کاشت کار

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری پیدائش اور آنکھ کھولنے کی صدا اتصال پر واقع ہوئی۔ یہ قصبہ پہلے بھی قومی تاریخ میں فی صعوبت کے لمحوں میں قومی عزت کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ جب پولیس کا محکمہ اور ہماری قومی عزت کو پاؤں تلے روندا جا رہا تھا تو اسی قصبہ کے ایک غیور کتب فروش نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اپنی حق گوئی کے پاداش میں آخر دم تک قید کر دی۔ علاوہ ازیں آسٹریا اور ترکی کی صدا کا اتصال ہر وقت ہم نوجوانوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہمیں دونوں ملکوں کا حامی اور قومی فرض ہے ایک مسلم اور ایک خون کے لوگ ایک ہی سلطنت کے ماتحت ہونے چاہئیں جب ہم متحد ہو جائیں گے تو اس وقت ہمیں مقبوضات طلب کرنے کا اخلاقی حق ہوگا۔ سپاہی کی تلوار اور ہل چلانے والا کاشتکار یہ ہی تقدیر کی بھلی اور بری تاریں ہیں جائیں گے۔ میدان جنگ میں خون بہایا جائے گا تو اس سے ہماری آئندہ نسلوں کے چہرے پر سرخی آئے گی۔

میرے والد اعزم باپ اور پیاری ماں

اس قصبہ میں میرے والدین انیسویں صدی کے اوائل میں آکر مقیم ہوئے تھے۔ میرے والد ایک سرکاری دفتر میں کام کرتے تھے۔ وہ اپنا کام نہایت محنت اور دیانت داری سے سرانجام دیتے تھے۔ میری والدہ گھر کا کام کاج کرتی تھیں اور بڑی محبت سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی تھی۔ مجھے ان دنوں کے زیادہ واقعات یاد نہیں۔ یا جلد ہی یہاں سے تبدیل کر کے پاسو کے شہر میں بھیج دیئے گئے۔ ان دنوں آسٹریا ہنگری کے دفتری ملازمین کو تقریباً ہر تین سال کے بعد تبدیل کر دیتے تھے۔ یہاں پیدا ہوئے ہوئے ہمارا تبدیل کر کے نئے مقام پر بھیج دیا گیا۔ میں ان کی پنشن ہوگئی لیکن ریٹائرڈ ہو کر بھی انہوں نے سخت مزدوری سے ہاتھ نہ

لطایو۔

ہا ایک غریب کاشتکار کے بیٹے تھے۔ انہوں نے تیرہ سال کی عمر میں ہی گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے سمجھاتے رہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور سیدھا ساحل کے دارالحکومت ونانکا روانہ ہو گیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہاں جا کر کوئی ہنر سیکھا جائے۔ یہ واقعہ 1810ء کا ہے۔ اس وقت ان کی جیب میں صرف تین روپے تھے انہیں بہت سی مشکلات پیش آئیں لیکن جب تیرہ سال کا بچہ سترہ برس کا نوجوان ہوا تو وہ کاریگری کے امتحان میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ اس پر قانع نہ ہوئے اس زمانہ میں کساد بازاری اور بروقت کی تنگ دستی نے ان میں عزم و ہمت پیدا کر دیا کہ "ہم کچھ بن کر رہیں گے" بچپن میں وہ سمجھا کرتے تھے کہ گاؤں کا پادری خدائی نائب السلام ہے۔ شہر میں آ کر وہ اکثر گرجوں میں گئے تو انہوں نے سرکاری ملازم بننے کی ٹھانی۔ دنیا کی حسینتوں اور حضوروں نے انہیں زمانہ طالب علمی میں ہی عمر رسیدہ لوگوں کا سا تخیل کھو دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس لگن کو لے کر چلے تھے اس میں کامیاب ہو گئے۔ تیئیس سال کی عمر میں وہ سرکاری دفتر کے باہر بن چکے تھے گھر سے جاتے وقت وہ کہہ گئے تھے "اب ہم آئیں گے تو بڑے بن کر ہی واپس آئیں گے" آخر انہوں نے اپنی بات پوری کر دکھائی وہ تو پوری کر دکھائی لیکن جب گھر واپس پہنچے تو گاؤں میں انہیں کوئی پہچاننے والا بھی باقی نہ رہا تھا۔ گاؤں بدل چکا تھا۔

پچیس سال کی عمر میں انہیں پنشن ملی تو اس سے بیکار نہ بیٹھا گیا۔ انہوں نے تمام آسٹریا کے شہر ملٹی میں پھر سے خرید کر خود بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا غرض عمر کا ایک حصہ دفتری ملازمت بسر کر کے آخر انہوں نے پھر اپنے باپ کے پیشہ کی طرف رجوع کر لیا۔

میرا بچپن

یہی زمانہ تھا جب میں نے ہوش سنبھالا اور خود منحصر ہونے کے قابل ہوا

میرے وقت کا بہت سا حصہ گھر سے باہر کوئے چھاؤنی میں گذرتا تھا۔ اسکول گھر سے بہت دور تھا۔ راستے میں خوب فرصت ملتی تھی چونی کے نت نکت لڑکے میرے ساتھی تھے ہماری شرارتوں سے اس کوچہ کی ظرر باگرتی تھی گھر میں ہمارا ہاں کتابی نہ تھا۔ میں نے یہ سوچنے کی تکلیف کبھی گوارا نہ کی تھی کہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا ہے۔ باں بابا کا پیشہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

میں پیدائشی خطیب تھا

مجھے اب یہاں آتا ہے کہ مجھ میں تقریر کا ایک فطری ملکہ ودیعت تھا جو اسی زمانہ میں ظاہر ہونے لگا۔ لڑکوں سے بڑے بڑے معرکوں کے مباحثے کیا کرتے تھے میں اپنی پارٹی کا سالار ہوتا تھا۔ اسکول میں پڑھتا تو خوب تھا لیکن کتابوں میں نہ رہتا تھا میں خالی وقت میں کلی کے گرجا گھر جا کر وہاں کے گویوں سے فوٹی کی سیکھ کرتا تھا۔ بابا بھی اسی رموز شناس اور ہنر دیکھنے سے میرے جذبات کی قدر کرنے لگتے ہوں گے کہ اس طرح کبھی ان کو اپنے کاموں کا مکھین ہاری نہ ہونے کا نمونہ نظر آیا تھا۔ اسی طرح میرے بچپن کی کاشپ بکوعرصہ سنبھالے نظر آتا رہا۔ لیکن میری فصاحت و بلاغت کے بکھیڑے ہوتے تھے۔ جب ان سے ذکر ہوا تو انہوں نے میرے لیے یہ پیشہ پسند نہ کیا میرے اصرار سے بھی ان پر بکواڑ نہ ہوا۔ یہاں میری الجھن سے انہیں بھی بکھ تشویش ضرور رہتی ہوگی۔

سب جرمن ایک ہی امت کے چشم و چراغ ہیں

ان دنوں میں میری آرزوئیں ایک نئے پہلو کی طرف راغب ہو گئیں جو میرے مزاج کے زیادہ قریب تھا۔ بابا کی الماری دیکھتے دیکھتے کتابیں میری نظر سے گذریں جو جنگ سے تعلق رکھتی تھیں ان میں 1870-71ء کی جنگ فرانس کی ایک تاریخ بھی تھی یہ تاریخ بہت سے باتصویر رسالوں کا مجموعہ تھی جو اس جنگ سے تھوڑی ہی مدت بعد شائع ہوئے تھے مجھے اس کتاب سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ اکثر میرے زیر مطالعہ

رہے تھے میرے دل و دماغ میں جنگ کے نظارے بسنے لگے میں تھوڑے ہی عرصہ میں
ہر اس شے کا عاشق ہو گیا جو کسی طرح جنگ و جدل سے تعلق رکھتی ہو۔

جرمنی اور فرانس کی جنگ کی کہانی پڑھ کر میرے دل میں نئے نئے سوالات پیدا
ہونے لگے میں سوچتا تھا جو جنگ لڑنے والے جرمن کیا دوسرے انسانوں سے مختلف تھے
اگر نہیں تو آخر کیا وجہ ہے کیوں اس جنگ میں ان کا ساتھ نہ دیا میرے والد کس طرح اس
جنگ میں شمولیت کی حمایت سے محروم رہے؟ کیا ہم جرمن نہیں؟ کیا سب جرمن ایک
ہی امت کے جزو نہیں؟ میرے ننھے دماغ میں یہ سوال پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھا
جب مجھے بتایا گیا کہ ہم ان جرمنوں سے ہیں جو اسمارک کی قائم کردہ سلطنت میں
شمولیت سے محروم ہیں تو میرے سینہ میں رشک کی پرکاری سلگ اٹھی یہ محرومی قسمت کا
قائل نہ ہو سکتی تھی۔

میں شروع سے ہٹ کا پکا تھا

ہی اثنا میں مجھے تعلیم دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میرے متعلق بابا کا اندازہ تھا کہ
قدیم نصاب کی نسبت جدید تعلیم میرے لیے زیادہ مناسب ہو گی ذرا لگ سے سمجھے تو
طبعی مناسبت تھی اسے دیکھ کر ان کی یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی اپنی ابتدائی جدوجہد کے
پیش نظر ان کی خواہش تھی کہ میں کالج کی کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہو جاؤں انہوں نے
جس مشکل سے دفتر کی ملازمت حاصل کی تھی اس سے ان کی نگاہ میں کسی ملازمت کی
قدر و قیمت حقیقت سے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ انہیں آرزو تھی کہ میں ان کی عمر بھر کی
خدمات سے فائدہ اٹھاؤں اور ان کے توسط سے انہیں کے نقش قدم پر چل کر ترقی
کروں۔

انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں ان کی ہدایات کے مطابق چلنے سے انکار کروں گا
ان کی رائے میں یہ فیصلہ ایسا صحیح تھا کہ وہ اس کی وجہ سمجھے بغیر نہ سمجھ سکے "تو" غیر
ذمہ دار نوجوان کے اعتراضات سننے کو بھی آمادہ نہ تھے مدت العمر کی جدوجہد نے ان

کی طبیعت میں جبر اور سختی کا رنگ غالب تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنی اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں نرمی یا شفقت سے کام لیں تو یہ ان کی ذمہ داری کا صحیح ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔

اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی باوجود اس کے مزاج کی تلخی کے میں ان کی اس تجویز کی مخالفت سے باز رہا۔ وہ ٹھیک ہے کہ وہ بات کا کبھی ورنہ سے کام لیتا تھا لیکن جہاں بھی تو آخری بات کا ہوتا تھا میری صد ضد بحث دھری کی دھری رہ گئی میں ہرگز وہ راستہ اختیار کرنے پر مائل نہ تھا جس پر مجھے خود ایمان نہ ہو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں وکیل کا بیٹا ہے کو نہیں بنوں گا۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن یہاں بھی کچھ گھاؤں نہ کھیلے تھے وہ مجھے ملازمت پر مجبور کرنے اتنا ہی میں ان سے نفور ہوتا تھا یہ تصور کرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا تھا کہ ایک دن میں وکیل کے محرر (منشی) کی طرح بیٹھا ان کا ساری عمر راستروں کی نقل نویسی کرتے کرتے گزار دوں گا۔

میں کتابوں کا کیڑا نہ تھا

میں کتابوں کا کیڑا نہ تھا میں اسکول سے آنے کے بعد گھنٹوں مجھے گھر کی چھت پر کھلی ہوا میں رہا دوڑتے رہنے کا دل چاہتا تھا آپ خود ہی خیال کیجئے ایسے بچے کو وکیل کی ملازمت سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے۔

آج میرے سوانح حیات میری بچپن کی زندگی کی جھلکیاں دیکھ کر کہتے ہیں "یہ بچہ ذہین تھا" میں نہ کہتا ہوں "میں نہ کہتا ہوں کہ اس نے مجھے بچپن کے بعد اس طرح سیر کرنے کی توفیق عطا کی کہ آج ان دنوں کی یاد سے دل میں مسرت اور طبیعت میں انشراح کی لہر پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی عمر کے جنگل اور کھلے پہاڑ اور میدان جنگل تھا۔ جہاں میں نے آزاد زندگی کے مزے سیر کرنے کی تربیت حاصل کی۔

نقاش بننے کا شوق

اسکول میں داخل ہو کر بھی میری عادات میں کوئی فرق نہ آیا لیکن اب وہ وقت نزدیک تھا جب ذہنی الجھنوں کو عملی مشکلات کی شکل اختیار کرنی تھی جب تک ابا کے روبرو محض روبرو ہی تھے میں اپنی رائے ظاہر کرنے میں ذرا جھجھک محسوس کرتا رہا اور کمرے کے علیحدے میں بیل مول سے کام لے سکتا تھا اس وقت تک میرے اطمینان کے لیے یہی تسلی کافی تھی کہ میرا ارادہ مصمم ہے لیکن جب میں بڑا ہو گیا تو مجھے خود بھی اپنے مستقبل کی بابت ایک نہ ایک نقشہ سوچنا ہی پڑا میں یہی سوچتا رہا کہ میں تو نقاش ہوں گا اس ارادے کا اظہار کرنا تھا کہ صورت حالات بدلنے لگی اس سے تو کسی کو انکار نہ تھا کہ مجھے ذرا تک سے ایک گونہ طبعی مناسبت تھی اس اسباب کی بنا پر ابا نے مجھے جدید تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا تھا ان میں سے ایک مدعا یہ بھی تھا لیکن یہ تو کبھی اس کے وہم میں بھی نہ تھا کہ میں نقاش بننے کی بھی خواہش کر سکتا ہوں ایک روز جب میں نے بڑے اعتماد کا یہ بننے سے انکار کیا تو وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھے کہ یہاں آ کر تم کیا بننا چاہتے ہو؟ ..... میں نے جھجکتا ہوا سے کہا میں بچپن سے ہی بے اختیار کھنچتا رہا ہوں اور اب تو میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ میں نقاش بنوں گا۔ ابا نے کہا "تو نقاش بنے گا کیا تو نقاش بنے گا صبر جمیل ہو کر نقاشی کرے گا؟"

پہلے تو انہیں اپنے سوا میرے سوا کسی کا نقاش بننے پر شک رہا کہ شاید وہ میرے الفاظ صحیح نہیں سمجھ سکے جب میں نے اپنے خیالات تفصیل سے بیان کئے اور سمجھایا کہ میں سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کر رہا ہوں تو انہوں نے اپنی مخصوص خشونت سے میری مخالفت کی وہ ایک رائے قائم کر چکے تھے اور میرے خیالات ان کا رویہ بدل نہ سکتے تھے۔

ابا مجھ سے ناراض ہو گئے

ابا کہتے تھے جب تک میں زندہ ہوں تجھے نقاش نہ بننے دوں گا اور میں بھی اتنے ہی زور سے اپنی ہٹ پر قائم تھا غرض نتیجہ یہ نکلا کہ میں مستقل صورت اختیار کرنے میں اپنی "ہٹ" نہ چھوڑ سکا اور وہ اپنی "ہٹ" پر قائم رہے۔

باعث ناراض ہو گئے تھے تو یہ ہے کہ گو مجھے ان سے دلی محبت تھی لیکن میں بھی دل برداشتہ ہو چکا تھا انہوں نے صرف حکم دے دیا کہ میں نمائش چلے جاؤں۔ بیٹھ کے پہ اس سے قبل دو میں نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ طے کر لیا کہ میں سوائے نمائش کے اور کچھ نہ دیکھوں گا۔ اس نمائش میں تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے تحریر سے بھی سلام دعا شروع کر دیا۔ میں نے سوائے خاموشی کے چارہ نہ تھا لیکن اپنی ضد میں نے بھی پوری کر دکھائی میرا نہیں تھا جب میں اسکول میں کوئی ترقی نہ کروں گا تو ناچار انہیں میرا یہ شعبہ اختیار کرنے کی اجازت دینی پڑے گی۔

تاریخ میرا محبوب مضمون تھا

یہ معلوم ہے میرا قیاس صحیح تھا۔ بلکہ اسکول میں میرے تفاضل کا شیڈ صرف بعد ہی ظاہر ہونے لگا۔ میں صرف انہیں مضامین پر دھیان دیتا تھا جو میرے مذاق کے مطابق تھے۔ بالخصوص میں ان مضامین میں تو ہر ری رغبت سے محنت کرتا تھا جو تفاضل بننے کے لیے مفید مطلب ہو سکتے تھے اس کے سوا باقی تمام مضامین میرے لیے دلیک کی کام کے نہ تھے۔ اس لیے میں نے ان سے کامل غفلت برتنی شروع کی۔ جب میرے متعلق اسکول کی رپورٹ گھر پہنچی تو حالت پتی کہ ان مضامین میں ہم نے شوق سے کام کیا تھا ان تو اور انٹرمیڈیٹ کے طالب علموں میں تھا۔ اور باقی کہیں معمولی اور کہیں اس سے بھی بدتر تاریخ اور انگریزی میرے مرغوب مضامین تھے چنانچہ میں ان دونوں مضامین میں جماعت بھر میں اول تھا۔

جب میں ان دنوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے متعلق دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو مجھ پر قومی مصیبت بجوٹ بجوٹ کر جاری ہونے لگی۔ اور دوسرے مجھے تاریخ کی معنوی حقیقت کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔

نسبی اور نسلی تعصب کا احساس

والے ایک خون اور ایک ہاتھ کے بھوتوں سے لہو لہان کر چکے تھے۔ اس وقت بھی آسٹریا کے جرمن تھے جنہوں نے گرتے گرتے بھی مشرق میں جرمن تہذیب کا جھنڈا تھامے رکھا۔

سپاہی بزدل اور غدار

جیسے دنیا کے ہر سب جنگجوؤں میں مشترک ہے آسٹریا میں جرمنوں نے اپنی زبان کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا تو نہیں بلکہ ان کے خواص بنتے آئے۔ اس جنگ میں بھی سپاہی تھے۔ بھیڑوں کی طرح جان چھڑاتے تھے اور بھیڑیا نظر آتے تھے۔ سکولوں کے بچوں میں بھی بچپن سے ہی۔ خاص ذکر ہوتا ہے کہ اس لڑائی کے لئے تین سو کے لگ بھگ کی تعداد ہی سے مخصوص تھے۔ یہی وہ گھرانے ہے جہاں آنے والی نسل کے نوجوانوں کی تربیت ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ بچپن سے منوں کو بھیڑ سے ڈرایا جاتا تھی کہ دیکھو جرمن کو بھلا نہیں بھول نہ جانا کہ تمہاری رگوں میں کس قوم کا خون گردش کر رہا ہے۔ اور دیکھو جرمن بچو! یاد رکھو تمہیں ایک روز کسی جرمن کی جان بچانا ہے۔

جن لوگوں کو بچوں کے ذہنی رجحانات کا کچھ تجربہ ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ بچے کس جوش اور شوق سے اس قسم کی تحریکوں میں دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ بچپن سے ہی انہوں نے اپنے مخصوص رنگ میں رہنا اپنے مخصوص طریقے استعمال کرتے ہوئے نت نئے طریقوں سے دادِ شجاعت دی کبھی تو وہ جیرزوں کے گیت گانے سے انکار کر دیتے۔ کبھی وہ اپنے طرز سے پیچھے ہٹ کر قومی روایات برقرار رکھنے کیلئے چھوڑ دیتے۔ غرض بچپن ہی جرمن قوم سے دور لے جانے کی کوشش کی جاتی۔ اسی زور کے ساتھ وہ اس کے پہلو سے چپٹے تھے۔ ان راتوں جرمن مشاہیر کے بچے ہیں کی زبانوں پر تھے جب کوئی غیر جرمن ستا کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکالتا اور ان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے اور ہو کر وہ اس کی تردید کر دی جاتی جرمن لباس پہننا ممنوع تھا حالانکہ علم بھی لباس بدل کر

سکوں آتے۔ پھر جب اس قوم کے لیے کسی انسانی سرداری جاتی تو وہ اس پر فخر کرتے۔ مقصد یہ کہ پختونی وفاداری کی کایا پلٹ پیش کر رہے تھے جس سے ہر سیدھا لوگ بھی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ ماحول تھا جس کے اندر میں نے بچپن سے ہی اس جہاد میں حصہ لینا شروع کیا جو ہماری قوم کو آسٹریا میں درپیش تھا۔ جب ہمارے مت کے جلسے منعقد ہوتے تو ہم قومی لباس پہن کر اور قومی لباس پہن کر ان میں شریک ہوتے ہم ایک دوسرے سے ملتے تو اسی طرز سے سلام کرتے جب قومی ترانہ گانے کا موقعہ ہوتا ہم آسٹرین ترانہ کے بجائے اپنا ترانہ گاتے اور پھر خوشی سے اس کے لیے سزا برداشت کرتے۔ اس طرح جب ایک نام نہاد قومی مقصد کے واسطے سے قومی زبان کے اپنی قومیت سے اور کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ اس وقت ہم نوجوانوں کو سیاسی تربیت مل رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا شمار ان لوگوں کی فہرست میں نہ تھا جن تھوڑے ہی عرصہ میں اس قومیت کا ستون بن چکا تھا۔

بادشاہ سے عقیدت اور ملت کی وفاداری کا فرق

قومی عصبیت میرے اندر اس وقت چوکی سرایت کر رہی تھی جب میں پندرہ برس کا تھا تو وہ سے اس وقت سے محبت کا فرق مجھ پر واضح ہو چکا تھا میں قوم کے عشق سے سرشار تھا مجھے بادشاہ سے وابستگی نہ تھی میری اس تاریخ کی وجوہات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو آسٹرین شہنشاہوں کی کرتوتوں سے واقف ہیں۔

تمام دوسرے ممالک کے مقابلہ میں آسٹریا کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ یہاں تاریخ کا درس نصاب تعلیم تاریخ عالم پر مشتمل تھا۔ جب یہ تھی کہ آسٹریا کی اپنی علیحدہ تاریخ نہ ہونے کے برابر تھی اس ملک کی قسمت ہمیشہ سے آسٹریا کے ساتھ وابستہ رہی ہے اس لیے آسٹریا کی تاریخ کو آسٹریا سے جدا بیان کرنا محال تھا۔ آسٹریا کی علیحدہ تاریخ تو صرف اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آسٹرین قوم دو ریاستوں میں بٹ گئی۔

جب 1918ء میں آسٹریا ہنگری سلطنت کا خاتمہ ہوا تو وہاں کے حکمرانوں نے بے تعلیم و تربیت سے الحاق کی خواہش ظاہر کی۔ یہ خواہش ایک پوری قوم کی خواہش تھی۔ جو پچھلے ڈیڑھ سو سال سے اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح جرمنی سے وابستہ ہو جائے۔ اس خواہش کا تجزیہ کریں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس کی جڑ وہی ذہنی رویہ تھا جو آسٹریا کی تاریخ کی مشترکہ کتابیں بھی آسٹریا کے حکمرانوں کے دلوں میں قرار واقعی اہمیت حاصل ہونے کے جو کچھ لکھے جا چکے تھے وہ ضائع نہ ہو سکتے تھے۔ خصوصاً جب قوم کے آقا اور مصاحب کا کام ہو تو فتح مسلسل ہی مستقل معاملہ کا حکم رکھتا ہے اور ہمیشہ کی مستقل معاملہ کا حکم رکھتا ہے۔

معاملاتی تاریخ کا کمزور

ابھی تک ہمارے اسکولوں میں تاریخ پڑھانے کا نتیجہ نکلتا ہے کہ قابل طلبہ بہت کم ہوتے ہیں کہ جو واقعات اور واقعات رٹ لینے کا نام مطالعہ تاریخ نہیں۔ جانب طلبہ کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ کون جنگ کس سن میں ہوئی تھی اور کون سا سپہ سالار کونسی اور کیسی توپ سے مارا گیا۔ ان کی بلا جانے کہ کون بادشاہ کس سن تخت نشین حاصل ہوا۔ یہ اہم اور ضروری باتیں نہیں۔

درس تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخی اہمیت رکھنے والے واقعات کے اسباب کو سمجھ کر ان حالتوں کی تہ تک پہنچ جائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے نئے نئے گل کھلا رہی ہیں۔ مطالعہ درحقیقت ایک فن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اصل کو یاد رکھنے اور فروع کو نظر انداز کرنے پر قادر ہو جائے۔ کیونکہ جب اصل ذہن میں محفوظ ہو تو اس سے ہر وقت فروع کا استخراج ممکن ہے۔

ہماری زندگی کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ ہم تاریخ کا مطالعہ کس طرح اس علم کو سمجھتا تھا۔ مگر بہت کم لوگ اس طرح اس مضمون کو سمجھتے ہیں کہ اس کے علاوہ ذہن میں وہ جو کچھ خود سمجھتے تھے سے کہہ سکتے تھے اور پھر اپنے پڑھائے ہوئے سبق کا امتحان لینے کا آرزو مند ہوتے تھے۔ میرے اس استاد کا نام بدھا تھا۔

خلاء دو سو کے جدید دور میں ملازم تھے۔ میں نے علم تاریخ کے استاد کے لیے جن
اوصاف کو ضروری قرار دیا ہے وہ سب ان کی ذات میں جمع تھے وہ ایک معمر بزرگ
تھے ان کی چوں اعضاء میں ایک عالمانہ شان تھی اس کے ساتھ ہی ان میں شفقت کی بھی
کمی نہ تھی جب وہ تقریر کرتے تو نوجوان خود بخود ان کی طرف کھنچا چلا آتا جس جذبہ سے وہ
خود پڑھاتے تھے وہی جوش ان کے شاگردوں میں بھی پیدا ہو جاتا تھا میں آج بھی اس
قابل احترام ہستی کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے جب وہ کبھی تاریخ پڑھانے لگتے تو
ہم گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ ماضی کے سے پھر ہماری آنکھوں
کے سامنے پھر جاتے تھے وہ عہد گذشتہ کے مختلف حصوں میں ہمیں پھرا دیتے تھے کہ ایک لمحہ تو
ہمیں ہے جان کتابوں میں بیٹھے ہوئے بچوں کی بجائے ہم ان کی ہو جاتی تھی جب وہ ہم سے
مخاطب ہو کر اپنی تقریر شروع کرتے تو ہمارے دل بیٹھے جاتے۔ اور جب وہ اٹھ کر جاتے تو ہماری
آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔

وہ ہمیں یہ سبق صرف زمانہ حال کی مثالوں سے ماضی کی تصویر ہی بیان نہ کرتے تھے
بلکہ ماضی کی مثالوں سے حال کے لیے سبق آموز نکات اخذ کر کے ان کی وضاحت بھی
کرتے تھے کہ ان مسائل پر پورا عبور تھا جو ان دنوں ہمارے لیے باعث اضطراب
تھے۔ وہ ہمیں کالم اور مضمون پر ہماری توجہ مرکوز رکھنے کے لیے وہ ہماری قومی خبروں
کو کس کر کام لیتے تھے۔ ان اداریوں کی طویل تاریخ پر مرتب مضمون سن کر۔ اس کا
فوری نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اندر ایک باقاعدہ دلچسپی اور انتخابی رجحان پیدا ہو گیا۔ تاریخ
تاریخ ہے خواہ وہ پرانے زمانے سے متعلق ہو خواہ اس صدی سے پیدا کی ایک قطعی حد تھا جو
قوم کی جڑیں کھوکھلی کر رہی تھی۔ شیشہ وقت کا دشمن کل روپیہ اور قوم فروشی کی سازش
دولت کا حصول بنانے کے لیے کافی تھیں۔

زمانہ بہترین استاد ہے

ہر بوجھ آزمائش کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا تھا۔ ان کی جان و مال کو بے حد سے

یوں ہوں کہ آسٹرین سلطنت کے تحفظ کو مدنظر رکھنے کی اداصل کوشش کی جاتی تھیں۔
ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے جس کے دیتا تھا کہ اس مرگ رسیدہ جرثومے کو زندہ رکھنے کا باعث
ترکی اور آسٹریا کا اتحاد ہے اس اتحاد سے اب ہر کم ہی کم نظر آتا تھا ترکوں کی جو گت
بن رہی ہے اس پر ترکی رضامند ہے آسٹریا کا دل شہنشاہ ابھی تک یہ احمق نہیں سکا ہے کہ
خواہشمند تھا کہ آسٹرین سلطنت ایک ترکی حکومت ہے۔ ان حرکتوں سے وہ فطرت بھلی
جس نے یا آخر وہ یا وہ جدید کی صورت اختیار کرتی۔

ترکی کو ابھی تک حقیقت حال کا احساس نہ تھا گو وہ دیکھ چکے تھے کہ یک لخت
کوپی آنکھوں کے سامنے گھومتا ہوا دیکھتے تھے وہ بار بار میں رقص جاں کنی کرنے کے
دیکھ رہے تھے۔ ترکی اور آسٹریا کے ان مخلوں اتحاد میں ہی جنگ عظیم اور ہماری قومی
رہائی کے تخم پرورش پا رہے تھے۔

میں آگے چل کر اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالوں گا۔ فی حال یہ کہنا کافی ہے کہ میں
نے ہر سال ترکی عمر کے ساتھ ساتھ جو خصوصی استعداد ہے وہ مجھے تیس تک بڑھنے کی
ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ تقریباً اڑتالیس سے میرے عقیدے اور بھی راسخ ہوتے گئے۔ یہ
عقیدے حسب ذیل ہیں اول تو یہ کہ آسٹرین سلطنت کا پارہ پارہ ہونا ترکی کی پہلی شرط
ہے۔ دوسرے یہ کہ قومی عصبیت اور شہنشاہی وفاداری دونوں بالکل مختلف چیزیں ہیں
تیسرے یہ کہ بیکار جنگ کا ٹالنا ہی تمام سے ایک دن ضرور ترکی کی بربادی کا باعث ہوگا۔
ان عقیدوں کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ مجھے آسٹریا اور ترکی سے جتنی محبت تھی آسٹرین
شہنشاہیت سے اتنی ہی عداوت ہوگئی۔

تاریخ سے اس طرح استدلال کی جو عادت مجھ میں سکول کی تعلیم سے راسخ ہوگئی
تھی وہ پھر کبھی نہیں چھوٹی۔ دنیا کی تاریخ میرے لیے ایک دفتر معلومات ہوتی جس کی
رہنمائی سے میں ہمیشہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب رہا ہوں میں تو یہ کہا ہوں
کہ سیاست میں کبھی کسی دوسرے سے سبق لینے کا ملکہ خود سیاست عالم کے سامنے

ی زندگی اب تبدیل ہو گئی۔

مجھے آرٹ سے بھی دلچسپی تھی

جہاں میں سیاسیات میں عمل اور وقت دلچسپی لے رہا تھا وہاں میں نے آرٹ میں بھی اس طرح اتنا کر دی تھی ان دنوں شہنشاہ آسٹریا کے صدر شہر میں ایک تھیٹر تھا۔ یہ تھیٹر بھی بہت اور تھا یہاں ہر قسم کے ڈرامے دکھائے جاتے تھے جب میں بارہ سال کا تھا تو میں نے یہاں ایک ڈرامہ دیکھا۔ تھیٹر کے متعلق یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے کچھ ماہ بعد میں نے اوپر میں پہلی مرتبہ اگ کھر میں حاضری سے لطف اٹھایا۔ مجھے فوراً اوپرا سے دلچسپی ہو گئی جب سے میں نے بار بار ان محفلوں میں شرکت کا لطف اٹھایا۔ اب میں اپنے تئیں خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ ان دنوں کی مشق نے آج مجھ میں آرٹ کو سمجھنے کا صحیح ذوق پیدا کر دیا ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ لیکن اس نے میرے لیے جو پیشہ انتخاب کیا تھا اس سے میری نفرت بڑھتی ہی گئی جوں جوں میں ہوش سنبھالتا تھا میری یہ رائے مزید پختہ ہوتی جاتی تھی کہ میں افسر کا پیشہ نہیں اپناؤں گا۔ اب تو سکول میں بھی میری ذہنی تربیت کی جا چکی تھی میرا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دھکا نے پھسلانے سے میری راہ میں حائل کرنے کی امیدیں پہلے سے بھی زیادہ دیا تھیں میں نکل جانا چاہتا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت میری خواہش کے خلاف مجھے افسر کا پیشہ نہ اپنا سکتی تھی۔ ہاں جب بات یہ تھی کہ میرا ذہنی رجحان اب خود فن تعمیر کی جانب زیادہ ہو جاتا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ میری فن تعمیر سے دلچسپی بھی نقاشی سے رغبت ہی کا نتیجہ ہے میں اس طرح آرٹ سے پہلی مناسبت پیدا ہو جانے پر خوش تھا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ایک دن فن تعمیر سے میری یہ دلچسپی نقاشی کو بھی پشت ڈال دے گی۔

میں یتیم رہ گیا

اسی اثنا میں میرے اپنے کسی پیشہ کو اختیار کرنے کا مسئلہ آسانی سے حل ہو گیا

جس کا انہیں تک بھی نہ تھا میں تیرھویں سال میں تھا کہ ابا یک لخت انتقال کر گئے وہ بیٹے بیٹے تھے موت نے انہیں بغیر طویل ایذا دیئے ہم سے جدا کر دیا ہمیں جو صدمہ پہنچا وہ ظاہر ہے اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں بیرسٹر کا پاؤں بنا دیں تاکہ خاندان کی تصویروں کا ایک قمر پورا ہو جائے وہ اس سے محروم رہے۔ لیکن آخری عمر میں انہیں اپنی یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

پہلے پہل تو زندگی میں کوئی خاص تغیر رونما نہ ہوا۔ ابا کی خواہش کے مطابق میری تعلیم کی تکمیل میں یہ فرض ضرور ادا کرتی تھیں گو وہ بھی مجھے بیرسٹر کا پاؤں بنانا چاہتی تھیں لیکن میرا ان سے پہلے سے بھی زیادہ مصمم ارادہ ہو چکا تھا کہ میں ہرگز بیرسٹر کا پاؤں نہیں بنوں گا۔ سکول کا طریقہ تعلیم اور نصاب میرے مذاق سے اس قدر بعید تھا کہ میں اس طرف سے سراسر غافل ہو گیا۔

اسی دوران میں حادثات نے میری بھاوجی کی چھوٹی بہن میں میرے مستقبل کا فیصلہ ہو گیا۔ خاندان میں جو شعر فہمی رہی سہی آئی تھی وہ اس کا خاتمہ ہوا۔ میرے بھپھیرے بھائی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے ماں کو صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے ہرگز کوئی ایسا پیشہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس کے باعث مجھے بہ بیرسٹر میں بیرسٹر کا مرکز ہو۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ کم از کم ایک سال کے لیے مجھے سکول سے اٹھا لینا چاہیے۔ اس سے جو تمنا میرے دل میں تھی وہ اب ٹوٹ کر اور چور چور ہو کر بکھر گئی۔ ماں نے میری بیماری سے متاثر ہو کر مجھے سکول سے اٹھا لیا اور فی الحال کالج میں داخل کرانے پر بھی آمادہ ہو گئیں خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہونے تھے دو سال بعد ماں کی موت نے میری تمام تمناؤں کو خاک میں ملا دیا۔ ماں وفات سے پہلے ایک طویل اور تکلیف دہ بیماری میں مبتلا رہیں۔ شروع سے ہی ان کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی آثار چراغاں کا بجھ جانا دور سے نظر آ رہا تھا پھر بھی مجھے اس سے سخت دھچکا لگا میں ان کا احترام کرتا تھا لیکن ماں سے مجھے محبت نہ تھی۔

مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے!

کسی نام نہاد غلطی نے جلدی مجھے کسی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔

شادی کی خوشی بہت ہوئی تھی وہ ماں کی بیماری پر ختم ہو چکی تھی مجھے جتنی جلد ہو سکے ملازمت ہو وہ ضروریات زندگی کے لیے بھی تھا کافی تھی مجھے اپنی روٹی کسی نہ کسی طرح خود پیدا کرنی ہوگی۔

میں نے اپنے کیرئیر کے ایک فیصلہ میں ڈالے اور ایک عملی ارادہ دل میں لے کر دانا کی جانب روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ جس طرح پہلی دس پہلے باتوں کو پہلی تھی ہی کی دعا و تقدیر کی تھی میں بھی انہیں کے نقش قدم پر چلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ میں بھیک نہ مانگوں گا لیکن میں فقر کا بہانہ کی صورت میں نہ کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم :: دانائی میں مصیبتیں جھیلنا اور عبرت حاصل کرنا

مدرسے کا امتحان داخلہ

ماں کی وفات سے دنیا کی ایک طرح میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا میں اماں کی بیماری کے آخری دنوں میں نون لیڈ کی درسگاہ کا امتحان داخلہ دینے کی نیت سے دے آیا تھا۔ میرے تیار کردہ نقاشی کے خاکوں کا ایک عظیم گٹھا میری بغل میں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں ضرور اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اسکول کے زمانے سے ہی میں ڈرائنگ کا بہترین طالب علم شمار ہوتا تھا اور اب تو میں نے مزید مشق پیدا کرنی بھی فرض میں مخصص تھا۔ مجھے اپنے مستقبل پر فخر تھا اور میں بھی کامیابی کے تصور سے پھولا نہ سماتا تھا۔

تاریکی و ظلمات کا مجھ پر اثر ہے

ہاں ایک بات ضرور تھی مجھے نقاشی کی نسبت ڈرائنگ میں اور خاص طور پر عمارتی نقشہ کشی میں زیادہ مہارت ہوتی تھی ساتھ ہی ساتھ فن تعمیر سے میرا لگاؤ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ میرا میلان طبع نقاشی کی بجائے فن تعمیر کی جانب زیادہ ہے۔ میرا قیام ہوا کا میں رہا۔ اس دوران میں یہ شوق اور بھی ترقی کر گیا۔ ابھی میری عمر بارہ سال نہ ہوئی تھی یہاں کے قلعہ کہنہ میں آیا تو تھا۔ نقاشی کے نمونے دیکھے لیکن میری تمام دلچسپی قلعہ کی عمارت نے ہی جذب کر لی صبح سے لے کر شام تک میں ٹوٹی عمارات دیکھتا رہا۔ ہر جگہ مجھے عمارت کی مرمت کرتی تھی۔ میں راگ گھر اور دیوان عام کے سامنے گھنٹوں بت بنا دیکھتا رہا۔ بالخ عام دیکھ کر میں یہ محسوس ہو گیا کہ گویا میری آنکھوں کے سامنے اب اس کا کوئی مقصد ہے۔

اپنا حقیقی میدان میں خود ہی طے کرتا تھا

اس خوبصورت شہر میں میری یہ دوسری آمد تھی میں نے بصری سے امتحان کے نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے کامیابی کا ایسا اعتماد تھا کہ فیل ہو جانے کی خبر مجھ پر بجلی کی طرح گری تاہم میں خود درس گاہ کے مہتمم اعلیٰ کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ آپ کیوں مجھے نائی سیکھنے کے لیے داخل نہیں کرتے انہوں نے جواب دیا جو نائی کے میں نے قابل لیے تھے ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مجھے نائی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ہاں عمارتی نقشہ نویسی سے ضرور گہری مناسبت ہے غرض وہ مجھے نائی کے پیشہ داخل نہیں کریں گے۔ البتہ عمارتی نقشہ نویسی کے لیے داخل کریں گے یہ سن کر بلکہ دیر کے لیے تو میں بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ میں آج تک کبھی عمارتی نقشہ نویسی کے سکول میں نہ گیا تھا۔ دل میں نے کہیں اور اس فن کی تعلیم حاصل کی تھی۔

جب میں مہتمم اعلیٰ سے ملاقات کے بعد واپس آیا تو میری امیدوں پر اوس پڑ چکی تھی عجب شش و پنج کا عالم تھا جب میں خود اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا۔ پہلی استعداد کے متعلق جو باتیں میں نے ابھی سنا تھا اس سے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں دو چیزوں کے درمیان مذبذب اور گومگو میں مبتلا ہوں یہ کیفیت مجھ پر عرصہ دراز سے طاری تھی لیکن نہ معلوم کیوں اور کس طرح۔

تھوڑے ہی دنوں میں مجھے خود بھی احساس ہونے لگا کہ مجھے عمارات بنانا چاہیے لیکن اس راستہ میں کئی مشکلات تھیں میں ان دنوں کوئنا سب میں نے سکول میں کچھ عرصہ میں طور سے پڑھے اور باقیوں کو گھر پر تیار کر رہا تھا۔ عمارتی نقشہ نویسی کی جماعت میں شامل ہونے سے پیشتر مجھے سکول میں جانا پڑتا تھا۔ اور اس سکول میں داخلہ سے پہلے مڈل سکول سے فارغ التحصیل ہونے کا سرٹیفکیٹ دکھانا ضروری تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ مجھے نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ غرض ہزار ہا میرے لیے سوائے کو اور پیشہ اختیار کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

مصیبت تو صلہ کے امتحان کا نام ہے

ماں کی وفات کے بعد اب میں تیسری مرتبہ ماں بننے والی تھی۔ اس دفعہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں پہلے بھی بیوی رہ چکی تھی۔ اس لیے بھلی ہی میرا سلیمان میرا انتظار واپس لوٹ آئے۔ وہی پرانی خود اعتمادی پھر میرے اندر پیدا ہو گئی میں نے یکسو ہو کر اپنا نصب العین تاک لیا۔ میں دو بچوں کی ماں تھی۔ زندگی میں کوئی ایسی ویسی ویسی نہیں آتی کہ بچے انتقال اختیار کر جائے۔ بلکہ اس لیے فکر مند تھی کہ ہم انہیں بتا کر اور سمجھا کر بچپن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں ان بچوں پر غالب آ کر رہوں گی۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت ماں کی تصویر رہتی تھی جو ایک بیوی کے بیٹے ہو کر محض ذاتی ہمت سے افلاس کی بھٹی کے دہانے تک پہنچی۔ میری زندگی تو اس سے بہتر حالت میں ہوئی ہے میرے لیے جدوجہد کے مواقع بھی بہتر تھے اس دنوں مجھے روزی کی فکر تھی لیکن آج میں اس علم مطلق کا شکر ادا کرتی ہوں کہ وہ میری ہر ضرورت کا خیال کر رہا تھا۔ قسمت کی دیوی مجھے دونوں ہاتھوں میں دولت سمیٹ دیا چاہتی تھی لیکن مشکلات کے ہجوم کے ساتھ ساتھ میرا ارادہ بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ "قوت ارادی نے فتح پائی۔

میں اپنی زندگی کے اس دور کے لیے ممنون ہوں۔ یہ ہی دور کارآمد تھا جس نے مجھ میں پختگی پیدا کر کے مجھے یہ سکھایا تھا جیسا کہ میں آج ہوں میں اس لیے مزید ممنون ہوں کہ جس وقت مجھے کھلونا بنا کر رکھنے والوں کے آغوش محبت سے بچپن کر مصیبتوں کی سوتیلی ماتا کے حوالے کر دیا گیا۔ ان دنوں میں اس محرومی قسمت کے خلاف جہاد پر آمادہ تھا۔ آج میں شکر کرتا ہوں کہ میں نے مظلومی اور ماں جیسی کی دنیا بھی دیکھی ہیں میں نے ان لوگوں سے تعارف حاصل کیا جن کی خاطر آج وہ مجھے جنگ کر رہا تھا۔

شہروں میں کفن بکتے ہیں

یہیں مجھے پہلی مرتبہ ان دو ہولناک حقیقتوں کا علم ہوا جن کا مجھے یوں بھی نہ تھا پہ

فطرت نے ان تمام کے وجود کو خلق کیا تھا ان میں سے پہلے کا نام شترا کیت اور دوسرے کا نام بھودیت ہے۔

کتابوں کو دیکھ کر ان کے ذکر سے معصوم مسرتوں اور میٹھی تمناؤں کے تصورات پیدا ہو جاتے ہیں مجھے اپنے بچپن کے علاقہ کے لیے پیدا کردہ ورد کی ایک لمبی فہرست یاد آتی ہے آج بھی جب میں اس شرکا ذکر کرتا ہوں تو میرے دماغ میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں نے طفلی کے پانچ سال اس کمن پودوں کے شہر میں بسر کیے میں اس پانچ سال کے عرصہ میں پہلے ظلی بن کر رہا پھر ایک معمولی کاش کی حیثیت سے پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔ بھوک ہر وقت ستاتی تھی جو کھانا میسر آتا تھا اس سے شکم سیری بھی نہ ہوتی تھی پیاس بھی ایک مستقل عارضہ تھا جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا میں جو کچھ کرتا اس میں بھوک بھی شریک تھی اگر میں کوئی کتاب پڑھتا تو پیٹ پر پتھر باندھ کر۔ اگر میں رات گھر جاتا تو اگلے دن کا کھانا ہوتا رہتا۔ غرض میں ہر وقت بھوک کے اس بے رحم ساتھی سے مصروف پیکار تھا۔ باوجود اس کے بھوک میں نے اس زمانہ میں سیکھا پہلے کبھی نہ سیکھا تھا۔ فن تعمیرات کے مطالعہ اور کبھی کبھی رنگ گھر جانے (اس کی لذت بھوک کے سکھ میں مدغم کرنی پڑتی تھی) کے علاوہ کتابیں میرا حصا میرے لیے وہاں حرام تھا۔

پچھڑ کر تو جوانوں نے لکھی جوانیاں ہیں

میں نے ان دنوں بہت کچھ پڑھا۔ مگر جو پڑھا اس پر گہری غور و خوض کی کام سے فرصت کا جو وقت ملتا وہ مطالعہ کتب میں صرف ہوتا۔ اس طرح میں نے چھ سات سالوں کے عرصہ میں دو سو مایہ علم جمع کر لیا جو میرے پاس آج بھی مخطوطات ہوتا ہے۔

صرف یہی نہیں میں نے اسی دوران میں زندگی اور دنیا کے متعلق وضع عقیدے قائم کرنے شروع کیے میرے عمل کی تمام بنیادیں انہیں عقیدوں پر تھیں اس کے بعد میں نے آج تک ان عقیدوں کو تبدیل نہیں کیا صرف کہیں کہیں وسعت دی ہے۔

آج میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری اپنی تخلیقی بنیادیں عہد شباب میں ہی

کھڑی کر دیتا ہے تو پھر یہ سوال بالکل مختلف چیزیں ہیں تو پھر وہ ہو رہا ہے
باریک بینی کا تقاضا ہے جو عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتا ہے برعکس اس کے ایسا
صنعتی نظام جو تکمیل کے کار میں جوانی کے دور سے ہی ہر ہم نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے
اس کا تقاضا ہے کہ وہ کسی خاص عمل کے کلید سے کی مکمل اجتناب کرنے سے مانع رہتی ہے
لیکن مستقبل میں یہی سوال آرایاں تغیر عمل کے پیچیدگیوں اور سامان دونوں
لوازمات مہیا کرتی ہیں عمر رسیدگی کی ہی نگرے ہوئے پھولوں سے حصول مقصد کی
شاہکار مدد ہوتی ہے۔ اگر طبقہ بڑھاپے کی ہمنوا "دوائی" ان پھولوں کو کچل نہ
ڈالے۔

اللہ تو دولتوں سے بچائے

بے تک میری زندگی ماں باپ کے روپ میں سر ہوئی تھی یہ زندگی ایسی ہی تھی جیسی
میرے پیچھے کسی دوسرے لڑکے کی ہوتی کل کیا ہوگا اس کی فکر نہ تھی دو غریبوں کی کیسی سر ہوتی
ہے اس کا احساس نہ تھا میرا بچپن کا زمانہ معمولی درجہ کے خوشحال طبقہ میں گزرا ان لوگوں
کو غریب مزدوری دیہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا گرچہ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن
حقیقت یہی ہے کہ متوسط الحال طبقہ اور غریب مزدوروں کے مابین ایک ایسی وسیع خلیج
حائل ہے جس کا لوگوں کو عموماً علم نہیں ہوتا ٹھیک ہے کہ متوسط الحال طبقہ بھی بکھرا ہوا نہیں
ہوتا لیکن جو لوگ غریبی کی حالت سے اٹھ کر کھاتے پیتے ہو جاتے ہیں انہیں ہمیشہ ڈر رہتا
ہے کہ کہیں ہم پھر اس پہلی حالت کو نہ پہنچ جائیں کہیں ہمیں مفلسوں کی فہرست میں شمار نہ
کیا جائے کل جو لوگ ہمارے ساتھ تھے اور آج پیچھے رہ گئے ہیں وہ کہیں مصلحت نہ ہو
جائیں علاوہ ازیں قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے بڑے دنوں کی یاد بھلی معلوم ہوتی ہے
مزدوروں کی باہمی بے جا تعلقات اور رشتہ عادات سے نفرت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ
یہ سب ہی معاملات کو دشمنی کی حد تک پہنچا کر رہتی ہیں غرض جو لوگ خوش حالی اور تمدن
کی پہلی سیڑھی چڑھ جاتے ہیں انہیں اپنے پہلے ساتھیوں سے بہت سا تعلق رکھنا بھی مشکل

دکھور رہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دولت مند لوگوں کی نسبت بالائی طبقوں کے خاندانی امیر زیادہ آسانی سے اپنے غریب ترین ہمسایوں سے مل جل سکتے ہیں اور ان کے جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ نو دولت سے میری مراد وہ شخص ہے جو اپنی ہمت کے بل بوتے پر دولت و عزت کے کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے جو پہلے اسے نصیب نہ تھا۔ وہ بھی لاکھوں ایسے لوگوں کے دل سے بھلی انسانی ہمدردی کا کشش محسوس کرتا ہے جن میں وہ خود قائم رکھنے کے لیے اپنے ٹھوس کے معرکے لڑتے ہوتے ہیں کہ اب جو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں وہ ان کے مصائب بھول چکے ہیں۔

اس نظر سے دیکھو تو میرے مقدر نے سارکاری کی زندگی نے مجھے بھرا ہی غربت اور بیکاری کی دنیا میں دھکیل دیا۔ جہاں سے ہوتے ہوئے میں اپنے آپ کو نکالا تھا۔ معمولی خوشحالی سے تعلق میں جو تنگی اور آنکھوں میں جو پریشانی ہے وہ اس آزمائش میں پڑ کر مجھ سے دور ہو گئی مجھے بیکلی مرتبہ مرہم شناسی کا ملکہ حاصل ہوا۔ اور جو لوگ جاہل نظر آتے ہیں میں نے ان کی ویران نگاہوں کے اندر پوشیدہ روح کو سمجھنا شروع کیا۔

امیروں کی دنیا جدا ہوتی ہے

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی وہ لوگ جن شہروں میں آباد ہیں مقام حاصل تھا۔ ان کے باشندوں میں ایک طرف پونی کے امیر تھے تو دوسری طرف ہزار ہا بدنصیب خاندان جو پیٹ بھرنے کو روٹی کے ٹکڑے سے بھی ادھار تھے دولت کی چمک دمک سیاہ دیوار کی پرلے درجہ کی غربت کی گھناؤنی روٹی کا فرق بھوت بھوت نظر آتا تھا۔ شہر کے مرکز اور اندرونی حلقہ میں ان تعلیم یافتہ سوسائٹی کا ذہن حاضر کا ہو محسوس ہوتا جو بڑی کوٹھیوں پر مشتمل تھی جہاں وہ مہمک کرتے تھے جو ایک حکومت کے ماتحت متعدد قوموں کے جمع ہو جانے کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ شاہی دربار

کی محکوم کن شان و شوکت میں وہ ملکہ جیسی قوت تھی جو سلطنت کے کونے کونے سے دولت اور ذہانت کو یہاں کھینچ لائی تھی اس کشش میں شہروں بیوروکریٹ کی اس عادت والی بالادستی سے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ ہر چیز کا مرکز ہو، مقصد اپنی ذات کو قرار دیتے تھے۔

مختلف قوموں کی اس مخلوط مرکب سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے ہر شے مرکز سے وابستہ رکھنا از حد ضروری تھا چونکہ رومانا کو دارالسلطنت ہونے کے علاوہ شاہی قیام گاہ کا مرتبہ بھی حاصل تھا اس لیے یہاں بڑے بڑے عہدداروں کی فوج بھیڑ رہتی تھی۔

وائکان آسٹروی سلطنت کا یا ہر مرکزی دفاتر کا مرکز بھی یہیں تھا فوج کے اعلیٰ افسروں، سلطنت کے عہدداروں، شاہی لفیف کے ماہروں، علماء کے علوم کے علاوہ مزدوروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی سوداگروں، صنعتیوں کی دولت کے پہلو بہ پہلو مفلسی کی ذلیل ترین خواریاں دکھائی دیتی تھیں، بیچ عام کے سامنے بازار بیکار پھر کاٹتے رہتے تھے بڑے بازار سے آگے جائیں تو نانبائیوں کی گندگی اور کھانا لوٹنے میں خانساں، بادوگ ایک دوسرے پر گھسے ہوئے گھر جاتے تھے۔

افلاس کا علاج سخاوت نہیں انصاف ہے

بیکاری اور مفلسی کے بڑھ جانے سے قحط کو جو مسئلہ درپیش تھا اس کا مطالعہ اس طرح وائکان میں کیا جا سکتا تھا کہ لاکھوں انسانوں کے اور کسی شہر میں نہ کیا جا سکتا تھا لیکن ہمیں اس تجربہ کرنے والے ہوں کہ مفلسی اور بیکاری کی چکی میں پسے ہوئے اس مسئلہ کو سمجھنا آسان نہیں تو محال ضرور ہے۔ جو شخص خود کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوا وہ کیا جان سکتا ہے کہ مصیبتیں دور کیسے کرتے ہیں یہاں تو اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ مفلسی گندگی اور جذباتی عوام کے غبار کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ خانہ جنگی گندگی اور موروثی جذبات کے دل رسے الگ نقصان پہنچاتی ہے خانہ جنگی گندگی سے تو یوں نقصان پہنچتا ہے کہ ہم کبھی مسئلہ کی تہ تک نہیں پہنچتے اور موروثی جذبات سے یہ نقصان پہنچتا ہے کہ ہم اصل روگ دور کرنے کے بجائے دوسری

ذات سے متعلق ہیں اور ان میں سے بیشتر میرے ذہن کے تصورات تعلیم کا باعث ہوتے رہے ہیں میں چند ان نتائج کا بھی ذکر کروں گا جو میں نے اپنی زندگی کے اس عہد کے تجربات سے نکالے ہیں۔

اس دوران میں مجھے کام حاصل کرنے میں کبھی دقت پیش نہ آئی مجھ پر تھی کہ میں کوئی کام کرتا تھا نہیں کہ ایک کے سوا دوسرا کام نہ کر سکتا۔ مجھے جو کام ملتا اور جہاں ملتا میں کرنے کو تیار تھا مجھے فقط ہر روز روٹی کمانا تھا جہاں موقعہ ملے میں کام کرنے پر آمادہ تھا۔

غرض میری حالت بالکل اس خانہ بدوش کی سی تھی جو مسافت کی تکان اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہر جگہ بھٹکتا جاتا تھا اور جس کے دل میں ایک ہی عزم ہوتا تھا کہ بھوکی دنیا میں اپنے لیے کچھ نہ کچھ حاصل کریں گے اور ایک نئے گھر کی بنیادیں ڈال کر رہیں گے یہ لوگ اپنے مرتبہ اور اپنی عادات کو مطلوب کر دینے والی قیود اور تعصبات کو پیچھے چھوڑ کر ہر وہ ملازمت کرنے کو تیار رہتے تھے جو انہیں میسر آ جائے اور ہر وہ کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جو انہیں مل جائے ان کے دلوں میں یہ عقیدہ روز بروز زیادہ راسخ ہوتا چلا جاتا تھا کہ جو محنت و مشقت ایمانداری سے کی جائے چاہے وہ کسی قسم کی ہو اس سے کسی عزت کو دھبہ نہیں لگتا۔ مختصر یہ کہ میرے سامنے جو دنیا آ گئی تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر رہوں گا اور اس کے بعد جو راستہ بھی اختیار کرنی ہے اس پر بھروسے استقلال سے آگے بڑھتا رہوں گا۔

مجھے ہیرو ورشپ کا تجربہ ہوتا ہے

مجھے جلد ہی تجربہ ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی کام ہمیشہ مل سکتا ہے لیکن مدتوں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ بغیر جلد کام مل سکتا ہے اتنی ہی آسانی اور سرعت سے وہ چھن بھی جاتا ہے میں نے جونہی زندگی شروع کی میرے پاس کام تھا۔ ایک قریب رہنے والا شخص تھا جو باقاعدہ روزگار کا سہارا رکھتا تھا۔

یہ درست ہے کہ کاریگر مزدور اس کثرت سے بے روزگاری کا شکار نہ ہوتے تھے جس تواتر سے ناتربیت یافتہ مزدوروں کو اس بلا کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن روزگار کی کامل ضمانت وہ بھی نہ تھا۔ کسی ایک کو بیکاری اور کساد بازاری کے باعث فاقہ کشی کرنی پڑتی تھی تو دوسرا بڑے شہروں اور کارخانوں کے مزدوروں پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے کام نہ ملنے کا بہانہ کر کے سب سے کم اجرت پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ یہ طریق کار ہر دور کی بے اختیار اقوام کے تمام ہی ادوار میں سب سے زیادہ پھیلا ہوا رواج تھا۔

بھولے بھالے دیہاتی شہر میں آ کر تجربہ حاصل کرتے ہیں

نوجوان گاؤں چھوڑ کر شہر اس لیے آتے ہیں کہ کام آسانی سے مل جائے گا اور محنت تھوڑی دیر کرنی پڑے گی۔ کوشش ان کی یہ توقع پوری بھی ہو جاتی ہے لیکن شہر میں آنے کا سب سے بڑا سبب وہ جاننے کی کوشش ہوتی ہے جو ہمیشہ بڑے بڑے شہروں کے ساتھ منسوب رہی ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ نوجوان گاؤں سے چل کر شہر آتے ہیں ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ گھر بیٹھ کر کھیتی باڑی کریں۔ عمل اس کے برعکس ہے۔ وہ نوجوان جن پر ہمیشہ خوشحال اور باعزم لوگ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں میں ان تارکین وطن میں صرف ان اشخاص کو شمار نہیں کرتا جو ہجرت کیے جاتے ہیں بلکہ میں ان میں اس مزدور پیشہ نوجوان کو بھی شامل کرتا ہوں جو جانتا ہے کہ وہ شہر میں بھوکا رہے گا اور وہ خود اس کے گاؤں چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اس میں ایک مقصد سے دوسرے کا راستہ اختیار کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ وہ علوم شہر کے ہوتے ہوئے وہ بھوکا رہنے کو پسند کرتا ہے اس لیے جب پہلے دن کام نہیں ملتا تو وہ بددل نہیں ہوتا۔ لیکن جب کام مل کر چھن جاتا ہے تو اس پر بہت برا اثر ہوتا ہے۔ نئے سرے سے کام ڈھونڈنا اور بار بار بالخصوص سردیوں میں کام کا چھن ہونا ہے پہلے پہل تو ان کے حوصلے پست کر دیتے ہیں لیکن بے روزگاری کا ڈنک لگ جاتا ہے اس سے گزارہ ہوتا رہتا ہے لیکن جب گھر سے ادھار ملنا بند ہو جاتا ہے تو طویل بے روزگاری کے باعث ان کی حوصلہ شکنی ہو جاتی ہے اور وہ بالآخر

ہے اس وقت تک کھیں ہوتی ہے جب تک وہ بھوک سے لاچار ہو کر ہار نہیں مان لیتا ہے۔ کچھ
سوچے کہیں گروی رکھ کر قرض لے کر گزارہ چلاتا ہے لیکن تڑپتا رہتا ہے۔ شکل و
شباہت، حرکات کے اعتبار سے بھی ہوشیار ہو جانے سے کچھ وقار میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ ان
لوگوں سے ملاقات ختم ہو جاتی ہے جو اس کی جسمانی طاقتوں کے علاوہ اس کی روحانی دنیا
میں بھی رہبر کے فرائض نبھا دیتے ہیں۔ رشتے کو ہونے کے لیے کچھ نہیں ملتا اور جب ملتا
ہے تو کہیں جا کر کہیں کا ہوتا ہے اگر کہیں جا کر کہیں کا ہو تو اس جہاں ہی سے جی بھر جاتا ہے۔ ایک سے بھر
کا ملن جاتا ہے لیکن تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی کیفیت گذرتی ہے پہلی داستان پھر
ایک مرتبہ دوہرائی جاتی ہے یہی قصہ تیسری مرتبہ پیش آتا ہے شوہر اس کے پہلے سے
زیادہ تلخی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس مستقل آشوبش کا عادی ہو جاتا ہے اور
آخر کار تو زیست کا اساس ہی بن جاتا ہے۔

شریف انسان کمیونسٹ کیسے بن جاتا ہے

جس طرح جو شخص طبعاً محنتی ہوتا ہے اگر بے روزگار ہونے کی نوبت آ جاتی ہے تو وہ
ان بے حس لوگوں کے ہاتھ میں آلہ کار بن جاتا ہے جو اسے اپنے غیر مستحسن مقاصد
کے لیے استعمال کرتے ہیں اسے کئی مرتبہ محض کسی قصور کے بے روزگاری کا تجربہ ہو چکا
ہے کہ اب وہ بے روک ٹوک ہڑتالی ہو جاتا ہے۔ اس کی بلا سے کہ کس ہڑتال میں وہ
شریک ہو رہا ہے آیا وہ مزدوروں کے حقوق حاصل کرنے کی خاطر قرار پائی ہے یا اس
سے قوم کی تباہی کا خطرہ ہے تو یہ بھی وہ نہیں جانتا ہے ساری دنیا کا کام ہڑتالوں
غرق ہو جائے، کوئی اس کی پروا نہیں کرتا ہڑتال پر مائل نہ ہو۔ مگر کبھی اس میں حصہ نہیں لیتا
ہے۔ کیونکہ اس کی قوت ارادی اس کا ساتھ دینے سے مفلوج ہو چکی ہے۔

میں نے متعدد بار محل کی ہڑتالیں دیکھیں ہیں جس کی وجہ سے میری
آنکھوں کے سامنے سے گزرتی ہیں ان میں سب سے زیادہ شور کی طرف سے نفرت
پیدا ہوتی جاتی تھی جو قوم کے نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر کے غریب الوطنی

ہو رہی تھی اس نے بھی سے نکل نکل کر ہیں رہا تھا جب وہ گھر سے نکلتے تھے تو اس کے دل میں عزم و اقرار کی حرارت ہوتی تھی لیکن اس کو لوٹ ہیں دے کر ان کے خون سفید ہو جاتے تھے۔

محتاجی صبر کا رنگ ہے

میں دانا میں یہ پیش پڑا تھا کہ میں خود بھی اس چکر سے محفوظ نہ تھا میں ان تاثرات کو اپنے آپ پر محسوس کر رہا تھا ایک بات تو مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی وہ یہ کہ ہماری قسمت بدلنے کی طرح کوشش ہو رہی ہے ہمیں ڈھکائی رائی تھی آمدن ہو رہی ہے خرچ کے ہوا رہا ہے اس سرعت سے تغیر ہو رہے تھے کہ انسان کوئی واقعہ نہ کر سکتا تھا کہ بیت کی عادت ہی گر ہوتی تھی ہمیں بھی بھوک اور تنگ دستی کے بار چھ سات کا عادی ہو جاتا تھا جب پیٹ بھر کر کھاتے ہو جب نہ بھی تو خالی ہی رہے۔ سچ تو یہ ہے بھوک بے کاری و تنگ دستی کے تمام تکلیفات کو اس طرح درہم برہم کر دیتی ہے کہ روزگار مل بھی جائے تو آدمی کو سنبھلنا محال ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بے روزگار مزدور کو جب محرومی ستاتی ہے تو وہ خیالی پلاؤ پکا کر اپنی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے بروقت یہی ہوتا ہے کہ میں ہوں مایہ بھر کر کھاؤں گا رفتہ رفتہ یہ خواب ایک جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ جہاں روزگار ملا وہیں جا کر کی بھی بالکل ہو رہے اختیار ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہیں جوتی کو لو جیب میں آنی طرح کی ترتیب رکھنے کا ہوش کے باقی رہتا ہے کل کی طرح بے فکر سب کچھ آج ہی لٹا دیا جاتا ہے یوں تو فرق کی تقسیم کا خاطر نہیں رکھا جاتا۔ اس لیے دانستہ ریزہ میں فرق آنے لگتا ہے جس عادت کی تشکیل میں سے اوپر یوں کی ہے جب وہ پہلی مرتبہ ٹوٹتی آتا ہے تو ٹوٹ جاتے ہوتے دن کی کمائی پوری روز میں ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تین روز میں ہی صفایا ہو جاتا ہے ہوں ہوں عادت راسخ ہوتی جاتی ہے پھر تو ایک دن کا گذارہ بھی مشکل ہوتا ہے اور انجام کار سب کچھ ایک ہی رات کے جنبش مژگاں کی نذر ہو جاتا ہے۔

اخلاص محبت کی قیمتی ہے

اور اوقات گھر میں بیوی بچے ہوتے ہیں کہ انہیں بھی ایسی زندگی بسر کرنے کی لت پڑ جاتی ہے بالخصوص گھریلو کاموں کے گھر میں بچے ہے وہ بیوی بچوں سے اپنی حیثیت اور رسوخ کے مطابق محبت رکھتا ہے اور انہیں جو آرام پہنچا سکتا ہے پہنچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کا ذہن پر ہر وقت چھایا ہوتا ہے بلکہ گھر کی مالی سارا کچھ ایک دھن کے اندر کھلے تھلے میں آ جاتا ہے۔ جب تک گھر کو وہ پوری کرتی ہے سارے گھر والے لوٹ کھاتے پیتے ہیں اور جب ہفتہ کا اختتام ہوتا ہے تو اکھٹے ہو قرضی کرتے ہیں اس وقت بیوی دیوانوں کی طرح ہمسایوں کے پاس ماری ماری پھرتی ہے کبھی وہاں سے قرض لیتی ہے کبھی دکاندار سے ادھار کرتی ہے اور اس طرح تنگی کے دن کاٹنے کی کوشش کرتی ہے دوپہر کے وقت سب کھلے بندے ہو کر پھر اکھٹے دسترخوان پر بیٹھتے ہیں کبھی تھوڑی بہت میسر آ جاتی ہے اور کبھی دن صاف ہی گزر جاتا ہے سارے گھر کو کھانے دن کو وہ کا انتظار رہتا ہے اسی کی وہ تمنا کرتے ہیں اسی کے ذکر کرنے کی تھوڑیں سوچتے ہیں جب بھوک لگتی ہے تو آنے والی خوش حالی کے خواب دیکھ دیکھ کر دل بہلاتے ہیں غرض بچے بھی ابتدا سے ہی اس حالت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اور سب سے بڑی گھڑی وہ آتی ہے جب خاوند ہفتہ کی تنخواہ لاتے ہی تجوری میں پھاگ کھیلنے لگتا ہے اور بیوی سے بھالنے کی کوشش کرتی ہے اس بیچاری کو وہ تو کچھ نہیں بچوں کی ماتا مجبور کرتی ہے گھر میں جھگڑے ہونے لگتے ہیں دل میں ناراضگیاں پیدا ہو جاتی ہیں خاوند جب بیوی سے بچا نہ ہو جاتا ہے تو نشہ سے لطف اندوز ہوتا ہے جو بلکہ شراب اندر جانے لگتا ہے اس وقت بیوی کے سامنے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی و موت کا مسئلہ آ جاتا ہے غریب وہ ڈرتے کی طرح اسکے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے خاوند کو روٹی سے کارخانہ سے تو شوق کر کے گھر لے جاتی ہے کہ بچوں کیلئے تو کچھ روپے مل جائیں لیکن یہاں تو کہ دوسرے یا تیسرے روز بھی خالی کر کے گھر آ نکلتے ہیں اس

وقت ایک ایسا تماشہ ہوتا ہے جسے دیکھ کر کلیجہ پھٹنے لگتا ہے مظلوموں کی فریادیں عرش الٰہی کے ٹکرے ہلا دیتی ہیں۔

ذلت کے ماحول سے عزت کے متلاشی پیدا ہونے میں مشکل ہیں

میں نے یہ سب بچوں سکولوں میں اپنی آنکھوں سے دیکھا پہلے دکھ میں چور ہو جاتا تھا حوصلہ ٹوٹتا تھا لیکن آہستہ آہستہ میں ان سب کی مجبوریوں سے واقف ہو گیا مجھے ان کی معصومیتوں کے گہرے اسباب سمجھ میں آنے لگے یہ غریب حالات کی ستم کاری کے شکار تھے۔

ان دنوں رہائشی مکانات کی حالت بھی ابتر تھی وہ مکانوں میں رہنے والے مزدوروں کے گھر ایک عذاب الیم کا نمونہ تھے صبح بھی جب کبھی میں ان دڑبہ نما کالی کوٹھڑیوں میں رات بسر کرنے کی جگہوں میں بوسیدہ و رنگ کھوئے ہوئے ان مکانوں میں تاریکی اور غلاظت کے گھٹا ٹوپ ماحول کو دیکھتا ہوں وہاں کی بیمار یوں کا تصور کرتا ہوں تو مجھ پر ایک لرزہ طاری ہو جاتی ہے۔

اس دن کیسی ہو گی جب ہمارے ہمسایوں کی ان ننھی منی جانوں میں ذلت مسکینیت اور دردو الم کے گڑھوں میں دبی ہوئی بے ہوش میں آکر عاقل انسانوں پر ہجوم بنیں گی۔ آج دنیا ان کی بے وقوفیوں کی پردہ پوشی کرتی ہے ہوتا ہے اور حقیقت ہم ہی اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں اور ہم نے ہی آنکھیں بند رکھی ہیں نہ روکا تو کبھی سمجھایا بھی نہیں کیا عدالت تمہیں کبھی نہیں بتائی کہ تم نے وقت سے پہلے انصاف نہ کیا تو پھر قدرت کا انصاف تم سے انتقام لے کر چھوڑے گا؟

آج میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسے اسکول کی تعلیم سے بہرہ ور کیا جہاں مجھے بھی معلوم نہ ہوں انہیں میں فکر انداز کر سکتا تھا یہاں کے گہرے سبق میرے دل پر نقش ہو گئے۔

المناک حالات کے نتیجے بھی المناک ہوتے ہیں

میں جس لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتا تھا ان سے داخلی طور پر ایک طرف میں ان کی زندگی کی ظاہری حالت دیکھتا تھا تو دوسری طرف ان کے باطن پر بھی نگاہ دوڑاتا تھا جس نے انہیں ویران بنا دیا تھا۔ ان غریبوں سے مدد نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس مصیبت اور بدحالی، اس غلاظت اور بے حرمتی کی ذمہ داری کو خدا پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ آفت زدہ لوگ خود اپنے کرتوتوں کے خوفناک نتیجے ہیں جو مجھے ذاتی طور پر ایسے ہی مصائب کا تجربہ ہوا تھا اس لیے اب میں قوم کی بستی اور بدحالی کی یہ جلتی بھرتی تصویریں دیکھتا تھا تو فوراً ڈر کر رہ جاتا تھا کہیں یہاں خالی ترس کھانے سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔

میں نے انہیں دنوں دیکھ لیا تھا کہ یہاں حالی صرف دو طرح سے ہو سکتی ہے۔ اول تو یہ کہ قوم میں باہمی ذمہ داری کا شدید احساس پیدا کر کے ان خوبیوں کی اصلاح کی جائے۔ جن پر سوشل ترقی کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ احساس پیدا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ بعض کسی رحم کے قوم کے جسم سے وہ تمام چھوڑے پھنسیاں کاٹ کر پھینک دی جائیں جن کا علاج ناممکن ہے۔

کارخانۂ فطرت کو دیکھو قدرت کو یہ تردد نہیں کہ اس کی موجودہ مخلوق برقرار رہے۔ اسے تو ساری لگن یہ ہے کہ ترقی کی رفتار قائم رکھنے کی خاطر مخلوق کی مختلف نوع میں سے بہترین نسل کی افزائش ہو اسی طرح انسانوں میں بھی موجودہ نسل کی حالت سنوارنے کا سوال کچھ ایسا ہم نہیں آدمی کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ جیسا کچھ وہ ایک مرتبہ بن جائے پھر سانچے نہیں بدلتی اس کی اصلاح ناممکن ہوتی ہے ہمیں تو شروع سے یہ حساب دینا چاہیے کہ آئندہ نسلوں کے رستے کھول دیے جائیں۔

قوم کو خیرات نہیں مساوات کی ضرورت ہے

مجھے وہ کام جس اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے جو جدوجہد کرنی پڑی اس کے دوران میں مجھے یہ سمجھ آئی کہ قومی معاشرت کی اصلاح بھیک مانگنے سے نہیں کی جا سکتی

سے کیا فرق پڑتا ہے ہمیں تو جہاں سر چھپانے کو تھوڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی مل گئی وہیں ہمارا وطن ہے اس وقت اور کے کھانے پینے طبقہ کے لوگوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے وہ حکومت ملی کے جوش میں مل جلتے ہیں وہ قومی جذبہ سے اس بیگانگی کے نشہ کو بے خبری پر محمول کرتے ہوئے اسے سختی سے محترک دیتے ہیں۔ وہ اس قسم کی کوشش سن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

کیا ان لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ خود کیوں اس بے حسی کا شکار ہیں کیا وجہ ہے کہ قومی جذبات سے سرشار وہ نہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے قوم و وطن کی عظمت۔ تمدن اور صنعت کی وہ تصویریں دیکھی ہیں اور اس طرح دیکھی ہیں کہ اب وہ ان کے دلوں پر نقش ہو چکی ہیں کیا انہیں یقین ہے کہ اگر وہ ان تمام نعمتوں سے محروم رہتے تو پھر بھی انہیں قوم کے وجود مرتب ہونے کا احساس ہوتا؟ کیوں ہمارے اور اس طبقہ کو یہ ہوش نہیں کہ جب تک قومیت الناس کو قوم کے بہبود اور تمدن کی پٹی نہ پڑھائی جائے تب تک ان میں ہرگز قومی جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ ہاں ملت کی محبت بھی دل میں پیدا کی جا سکتی ہے جب ملت کی برتری اور تفوق ذہن نشین کرائے جا چکے ہوں۔

تعلیم کا نصاب بدلنا چاہیے

یہاں یہ کوئی جواب نہیں کہ دوسرے ملکوں کی بھی یہی حالت ہے اور وہاں کے مزدوروں کے جذبہ حب وطن میں کوئی فرق نہیں آیا اگر ایسا ہوتا بھی تو اس سے ہماری حالت قابل معافی قرار نہیں پا سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے مثال کے طور پر فرانسیسیوں ہی کو لیجئے تم تعصب کی تربیت کیتے ہوئے فرانسیسی تمدن کی تعلیم کا کام دیتے ہیں۔ ذرا اس کا نصاب تو اٹھا کے دیکھو اس میں سوائے ہر ہوئے فرانس کی عظمت ثابت کرنے کے اور کیا دھرا ہے فرانس کے نوجوانوں کو خاص سائنس ہی نہیں پڑھائے جاتے بلکہ جہاں وطن کی سیاسی اور تمدنی عظمت کا ذکر آتا ہے وہاں پورے تعصب اور مبالغہ سے کام لیا

جاتا ہے۔

اس قسم کی تعلیم میں نقطہ موڑنے موڑنے عقیدے ذہن نشین کرائے جاتے ہیں وہ ان عقیدوں کا اس منظر ضرور صحیح ہوا ہوں پر بٹھایا جاتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان عقائد کو اس طرح بار بار دہرایا جائے کہ ان سے دونوں کی گہرائیوں میں اتر کر جذبات حاوی اور تمام دیگر قوائے دماغی کو اپنی رنگ میں رنگ لیں۔

ہمارے کہنے ہیں ہم نے خانی قوم کو قومی روح سے شناسا کرنے میں غلطی سے کام نہیں لیا بلکہ لئے جو کچھ کیا وہ ضرور کرنا تھا ہم نے بھی مصیبتوں اور دقتوں سے بچ کر دل کے کسی کونے میں قومی محبت کی شمع روشن رکھی ہے اور اسے وہ شیاطین نما دیتے ہیں ان کی ہمارے اندر کی نہیں۔

ملت کی آئندہ نسلیں توجہ کی مستحق ہیں

اب اس کتابچے کے پڑھنے والوں کو راولپنڈی کے حالات پر غور کرنا۔

ایک بڑا خاندان ہے اس بڑے خاندان میں دو مرحوم کرتے ہیں ان گھروں میں ایک مرد اور اپنے خاندان کے کنبہ پر رہتا ہے خاندان سات آدمیوں پر مشتمل ہے ذرا غور کرو کہ ان میں سے ایک بچہ کی عمر تین سال ہے یہ وہ عمر ہے جب بچے گرد و پیش کی دنیا سے تاثرات قبول کرنے لگتے ہیں ان اور طباع لوگوں کے حافظہ میں اس عمر کے تاثرات کی یادیں ہمیشہ کے لئے رہتی ہیں اب ذرا سوچو کہ جس گھر کی نکلی ہوئی آدمیوں کی زیادتی کے باعث باہمی تعلقات خوشگوار نہیں رہتے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ہر روز شکوے پیدا ہو جاتی ہیں ان عزیزوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اکٹھے رہتے ہیں بلکہ ان کے متعلق تو یہ کہنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے سر پر بیٹھ کر گزارہ کرتے ہیں چھوٹی چھوٹی سی ہر مرغیاں جو صحن گھروں میں ہوتی ہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا کر بھول جاتی ہیں وہ یہاں مستقل عادتوں کا سودا ان کی جاتی ہیں جہاں تک بچوں کا تعلق ہے وہ اس معاملہ میں بڑوں سے بھی بڑھے رہتے ہیں ان کی یادیں تو ان میں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن بعد

ی صفائی بھی ہو جاتی ہے برخلاف اس کے جب میوں ہوئی میں لگتی ہے تو وہ درختی اور تلخی کا نشہ کھینچتا ہے کہ خدا کی پناہ پھول پر یہ کھا رے اچھا کر ہو جاتا ہے اس کے تلخ بعد میں ہا کر ظاہر ہوتے ہیں جب تک انسان خود اس ماحول میں رہ نہ پکا ہو وہ تصور نہیں کر سکتا کہ کس وقت میوں تربیت کے نشہ میں ہوتی ہے ہوش کرتا ہے سے رہتا ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو طرم طمطراق دیتے ہیں اس وقت کیا کیفیت ہوتی ہے چھ سال کی عمر میں بچوں کو بیدار کاٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس سے بڑے بڑوں کا کلیجہ بھی منہ کو آنے لگتا ہے۔

مکتبوں کی اصلاح کرو

قوم کا یہ نونہال جب تعلیمی مکتب میں داخل ہوتا ہے اس وقت اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ سر جوان سے کھڑا ہے علم ہاری نہ ملنے کے باعث تن میں سکت نہیں اور روح کو علم اخلاق کا کیڑا لگ چکا ہے مشکل سے ہی سمجھتا ہے گھر کا سبق یاد کرنے کا کوئی سوال نہیں صورت حالات بالکل اس کے برعکس ہے ماں باپ خود تو اولاد کی کوشش کرتے اور اسے اپنے پاس بٹھا کر تمیز کھانے سے رہے وہ الگ ہر وقت بچوں کے سامنے اسکول اور وہاں کے استادوں کی عیب جوئی کرتے رہتے ہیں اور یہ بھولے بچے ان باتوں کے کان میں جو باتیں پڑتی ہیں وہ ایسی ہیں جن سے اس کے دل میں خود استاد کا احترام بھی باقی نہیں رہتا۔ یہاں تو ہر وقت انسان اور انسان سے لے کر حکومت تک انسان کی ہر شے کی تذلیل کی جاتی ہے جہاں سلطنت کا ذکر ہوتا ہے وہاں تربیت کی باتیں بکھر جاتی ہیں، جہاں اخلاق کی گفتگو ہو رہی ہے مذہب کا بیان ہو رہا ہے سب کی مذمت کی جاتی ہے سب کو بکواس کہا جاتا ہے کا تیرہ سال کی عمر میں جب بچہ جوانی میں داخل ہوتا ہے تو یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی تربیت کا سب سے نمایاں پہلو کیا ہے حقیقی محبت سے وہ کوسوں دور ہے بے صبری کی کشاکش اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اس کمی کی عمر میں وہ دوسرے بچوں پر تیور کرنے

کا ہوں نہ فی الحال ہے کہ انسان دوسرے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

سیکھنا کی ریمک اور محفوظ اشارات

ہر وہ شخص زندگی میں کیا کام کر سکتا ہے جس کی نظر میں کوئی شے مقدس رہتے کبھی ہاں بھی کا احساس نہیں ہو۔ اور جو ہمیشہ انسانیت کی بہتری کے متعلق سوچتا رہتا ہے تین سال کی عمر سے سن بلوغ کو پہنچنے تک ظاہر ہوتی ہو جذبات اس بچہ کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے اس نے دیا میں محفوظ اشارات اور مدد معاش دیکھی ہے وہ ہر ایسے بلند کرنے والے تاثر سے محروم رہتا ہے جس سے اس کے دل میں گھر کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ہے آدمیت کا وہ شاہکار جو اب زندگی کی تگ و دو میں داخل ہوتا ہے۔

وہ بھی ویسی ہی عادات اختیار کرتا ہے جن کا نمونہ اس نے بچپن میں اپنے ماں باپ کی ذات شریف میں ملاحظہ کیا تھا۔ آوارہ پھرتا ہے راتوں کو دیر سے گھر پہنچتا ہے اس دل شکستہ سے بھی مذاق کرتا ہے جس کی کوکھ سے وہ پیدا ہوا تھا خط بھی لکھتا ہے اور دنیا کو صلوٰتیں سناتا ہے آخر تعمیل خانے کی ہوا کھاتا ہے یہاں بھی کسر بھی پوری ہو جاتی ہے۔

کیا اب بھی ہمارے تئیں آسمان اس بات کو تعجب ہے کہ یہ قوم کا "بھگوڑا" کیوں سب جس سے عاری ہے۔

یہ اہل ثروت ہر روز دیکھتے ہیں کہ سینما اور تھیٹر، محفوظ اشارات اور فحش کتابیں قوم میں زہر پھیلا رہے ہیں اور پھر معصوم بن کر حیران ہوتے ہیں ..... کہ عامۃ الناس کی اخلاقی حالت کیوں گرتی چلی جاتی ہے وہ سب قوم سے کیوں بیگانہ ہو رہے ہیں اگر لوگوں کی ابتدائی تربیت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کیا یہ سینما کی ریمک اور محفوظ اشارات اور اس قسم کی دوسری چیزیں قوم کی عظمت کے حق میں ہو سکتی ہیں؟

بچوں کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے

آخر مجھے اس بات کی کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کسی قوم کو ایک قوم بنانا

دینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرت کا صحیح انتظام کیا جائے تاکہ ہر فرد اس نظام کی گود میں پرورش پاتے ہوئے تربیت حاصل کر سکے۔ یاد رکھو کہ جب تک بچے کے دل میں ماں کے متعلق اور اسکول کی پیروی سے ہی قوم کے تمدن قوم کی خوشحالی اور سب سے ضروری یہ کہ قوم کی سیاسی عظمت کا سکہ نہ بٹھا دیا جائے گا۔ تب تک وہ قوم کامیاب ہونے میں ہرگز کوئی فخر محسوس نہ کرے گا۔ اس کی خاطر اپنا خون گرانے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس سے اسے محبت اور محبت ہی سے ہو سکتی ہے۔ جس کا دل میں احترام ہو اور جب تک ایک چیز سے شناسائی بھی نہیں اس کا احترام کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

جوں ہی مجھے معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا میں نے اس کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہاں میرے سامنے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔

کتابیں کائنات کا آئینہ ہیں

میں نے 1909-10ء کے سال میں اپنی حالت اس قدر معلوماتی بنا لی تھی کہ مجھے محفل میں گفتگو کرنے کی عادت ہو گئی تھی اب میں ایک شاعر اور فلسفہ نویس کی حیثیت میں کام چلاتا تھا۔ جہاں تک مدنی کا تعلق ہے یہ پیشہ بھی فریبانہ تھا۔ ضروریات زندگی کا گذارہ بمشکل چلتا تھا باوجود اس کے میں مطمئن تھا کیونکہ یہ پیشہ میرے نصب العین کے قریب تر تھا۔ علاوہ ازیں اب میں رات کو گھر لوٹتا تو پہلے کی طرح تھکان سے چور چور نہ ہوتا تھا ورنہ قبل ازیں تو یہ حالت تھی کہ کسی کتاب کو ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی نیند نے بیہوش کر دیا۔ میرا موجودہ کام اس پیشہ سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا جو میں خود اختیار کرنا چاہتا تھا۔ مزید برآں اب میں اپنے وقت کا مالک آپ تھا۔ میں اپنے خیالات کی تنظیم پہلے کی نسبت بہتر طریق ترتیب دے سکتا تھا۔ تاہم تو میں اس لیے کرتا کہ روزگار کا سوال بھی تھا۔ لیکن کتابیں اس لیے پڑھتا کہ مجھے مطالعہ کا شوق تھا۔

اس طرح مجھے معاشرتی مسئلہ کی اہمیت و علمی و تعلیمی اہمیت بھی حاصل ہو گئی جس کے بغیر جو کچھ میں نے ذاتی تجربہ سے دیکھا تھا وہ ادھورا رہتا۔ اس مسئلہ کے متعلق مجھے جو کتاب

بھی مل جاتا میں اسے پڑھ کر رکھ دیتا مگر جو کچھ پڑھتا اس پر گہری غور و خوض کرتا۔ میرا خیال ہے ان دنوں میں ان دنوں میرا اٹھنا بیٹھنا جتنا وقت مجھے ایک لاکھ سائنسدان قبول کرتے تھے۔

معاشرتی مسئلہ کی تحقیق کے ساتھ میں طلعاتی قبیلہ کا مطالعہ بھی بڑے انہماک سے کر رہا تھا۔ طلعاتی قبیلہ کو میں موبیلی کی طرح ٹوں ایلیڈ کی ملکہ قرار دیتا ہوں اس کا مطالعہ میرے لیے مشکل نہ تھی بلکہ بہت راحت تھی۔ جب میں تھی راتوں کے تک بیٹھا ہوں، باتیں بناتا رہوں، مجھے کبھی تھکن محسوس نہ ہوتی میرا دل کہہ رہا تھا کہ میرے سامنے ایک روشن مستقبل ہے میرا یہ خواب پورا ہو کر رہے گا جب مجھے رہوں اس کا انتظار کیوں نہ کرتا بڑے مجھے پکا یقین تھا کہ میں ماہر تعمیرات بن کر اپنے لیے نام پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

مطالعہ کس طرح کرنا چاہیے

میں اپنے پیشے کے لیے تیاری کرنے کے علاوہ جو اس چیز میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا جو کسی طرح بھی بات سے تعلق رکھتی ہو لیکن اس زمانہ میں میرا یہ طرز عمل میری نگاہ میں بڑھ اس اہمیت نہ رکھتا تھا میرا خیال تھا کہ سیاسیات میں محض دلچسپی ہونا ایک ایسا ناقابل فرض ہے جو ہر وہ شخص پورا کرتا ہے جو لوگ اپنے گرد و پیش کے سیاسی حالات سے واقفیت نہیں رکھتے انہیں شہریت اور کلیہ چینی کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ فرض میں نے اس مرحلہ پر بھی سیاسی مسائل کے متعلق کتابیں پڑھنا اور ان کا مطالعہ کرنا جاری رکھا لیکن میرا مطالعہ عام پڑھے لکھوں کے کتابیں پڑھنے سے قطعاً مختلف تھا۔

میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بے اندازہ کتابوں پر کتابیں پڑھے جاتے ہیں اور صفحے پر صفحے الٹتے جاتے ہیں، پڑھا ہوا سب کچھ میں انہیں صاحب مطالعہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں پھیلانے اور بچانے کی استعداد مفقود ہوتی ہے انہوں نے کتابوں سے جو مواد جمع کیا ہے وہ

سے کوئی ترتیب نہیں دے سکتے۔ انھیں کتابوں کے مفید اور غیر مفید حصوں میں تمیز کرنے کی بھی نہیں ہوتی۔ جہاں مطلب کی بات ہو رکھی چاہیے وہاں غیر ضروری حصے چھوڑ جانے چاہئیں۔ یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم پڑھنے کے بعد ہی انھیں ہٹا دینا چاہیے۔ مطالعہ بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے تو حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے کتابیں خالی اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ ہمارا مقصد اور ارادہ پہلے سے انسان میں موجود ہوتی ہیں انھیں ذرا تھپکیوں سے بیدار کر دیا جائے۔ فرض ہر شخص جس منصب کے لائق ہوتا ہے وہ اسی کی مناسب سے وزارہ اور سامان انتخاب کرتا ہے چاہے کسی کا منصب یہ ہو کہ وہ روزمرہ کی گفتگو میں بازاری پن پیدا کرتا رہے چاہے کسی کا منصب یہ ہو کہ وہ اس سے بلند تر انسانی آرزوؤں کی تسکین کرے۔ یہ ہے مطالعہ کا پورا مقصد ہر مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے متعلق ایک عام واقفیت حاصل ہو جائے دماغوں میں سے جو ہے کوئی صورت مدنظر ہو کتاب کے مطالعہ میں اسی ترتیب سے ذہن میں نقوش بیٹھنے چاہئیں جس ترتیب سے وہ کتاب میں مذکور ہیں مطالعہ سے حاصل کی ہوئی واقفیت کے ہر ذرہ کو ایک الگ تصور کرنا چاہیے جو اپنی حیثیت کے مطابق عمارت میں جہاں پہنچ جائے وہیں لگا دو۔ گویا دماغ کے نگارخانے میں دنیا ایک تکمیلی تصور قائم ہے اس میں ہر تازہ نقش کو وہی جگہ دینی چاہیے جہاں وہ ٹھیک بیٹھتا ہو نہیں تو ایسا مطالعہ غلط پریشانی دماغ کا سامان مہیا کرے گا یہ پریشانی خیال نہ کرنا کہ وہ نہیں بلکہ اس عیب کے لئے کافی ہو جائے اسے جہالت کے ساتھ خود پسندی کی بلا بھی گرفتار کر دیتی ہے ایسے شخص کو بڑی بڑی باتیں ہو جاتا ہے کہ وہ خاصہ "پڑھا لکھا" ہے اور اس قابل ہے کہ دنیا کے مسائل کو سمجھ سکے سوال ہوتا ہے کہ میں نے "علم" حاصل کیا ہے حالانکہ یہ "علم" اسے روزمرہ زندگی کے حقائق سے دور لے جاتا ہے "آگہی" اس غریب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تو کہیں پاگل خانہ میں جا کر مرتا ہے اور دنیا پاگل خانہ بن جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کا علم کبھی ضرورت کے وقت کام نہیں آتا بلکہ یہ کہ ان کے ذہن کی تربیت

غرض اصرف اس مطالعہ ہی مطالعہ کہلانے کا مستحق ہے اور اسی مطالعہ پر وقت خرچ کرنا چاہئے جس سے کوئی مطلب تو حاصل ہو۔

حافظہ کی تربیت کے اصول

مثال کے طور پر تقریری کو لیجئے جو تقریر کرنے والا اپنے موضوع پر پورا عبور نہیں رکھتا وہ کسی حوالہ کو جو اسے یاد ہے گا اسے تو سمجھ کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے تمام ذرائع تو ساتھ ہونے چاہئیں تاکہ کہیں بند نہ ہو جائے بصورت دیگر ہو سکتا ہے سب کچھ درست بھی کیوں نہ ہو، ناکامی تقریر کرنی پڑے گی۔ بات چھوٹی ہے لیکن حضرت کا علم حاضر نہیں ہے بھلیں بھٹک رہے ہیں مارے شرم کے منہ سے نکلتا نہیں یہ دعویٰ ثابت کرنے اور مدمقابل کے رد کے لیے دلیل نہیں سوجھتے جب تک ایسے مقررین کا حلقہ وسیع تر رہتا ہے اس وقت تو کوئی خطرہ کی بات نہیں لیکن اگر قسمت نہیں قوم کا کام جہاں بڑھے اور وہاں باوجود اتنی آنکھوں کی سوئی جانے کے میاں پر جو کھوٹی زبان اس سوجائے تو پھر بس موت ہی ہوتی ہے۔

میں نے بندے کے شعور سے درست طریقہ پر مطالعہ کی عادت ڈال رکھی ہے یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ بات سے بات اور یاد سے یاد بھی بھا ہے اس لحاظ سے میرے لیے دانا کا پڑھنا روزمرہ کا معمول مفید اور حق آموز ثابت ہوا۔ یہاں لکھنے کی ضرورت سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا کہ میں طرح طرح کے مسائل کو مختلف زاویوں سے جانچنے کا عادی ہو گیا۔ میں بہت سے کو واقفیت کی کسوٹی پر رہ واقعات کو اصول کے معیار سے پرکھتا رہتا تھا جبکی وجہ تھی کہ بعض اوقات میں بیٹھا بیٹھا خود بخود کھو جاتا تھا کہ دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے اپنی ہی عقل کے گھوڑے دوڑانے میں مصروف رہتا۔ اور یہی میرے لکھنے کا کچا تھا کہ واقعات کا تسلسل خیال کے پردہ میں سما جاتا۔

اشتراکیت سے میری پہلی ٹکر

ان دنوں کے روزمرہ تجربات نے مجھے معاشرتی مسئلہ کے علاوہ دوسرے اہم مسائل

کے متعلق ہماری ہر ممکن علمی تحقیق کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر اشتراکیت سے میری اس طرح اچانک ٹکر نہ ہو جاتی تو میں کب اس کے خصائص اور اصولوں کا مطالعہ شروع کرتا۔

میں جوانی میں جرمنی کی اشتراکی پارٹی کے متعلق بہت کم جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ بھی اشتراکی لٹریچر کے مطالعہ تک محدود تھا۔ جہاں تک اس تحریک کا تعلق تھا میرا خیال تھا کہ تمام سرمایہ کو ختم کر دینے کا حق حاصل ہو جائے اور الیکشن کی پرچیاں ایک بند کمرے میں جا کر پوشیدہ طور پر ڈالی جایا کریں، مجھے اس سے پورا اتفاق تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ شاہان چیز رگ سے نفرت تھی اور میرا خیال تھا کہ ان مطالبات کے پورا ہو جانے سے شاہی نسل میں کمزوری واقع ہو جانے کی میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ ہے "شرین سلطنت اسلامیہ کو خوش کرنے کی خاطر ترک عنصر کو قربان بھی کر دے مگر بھی اس کا پیدا ہونا ممکن ہے یا وجود یہ حکومت ایک عرصہ سے "سبز آستین" ترکوں کو قوم سلطانیہ کے رگ میں رگ رہی تھی مگر بھی سلطنت کے مستقل انتظام کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی وجہ یہ کہ قوم سلطانیہ میں تعمیری سیاست کی استعداد مفقود تھی۔ اور اگر تھی بھی تو بہت کم یہی حالات تھے جن کی بنا پر مجھے ہر اس تحریک سے ہمدردی تھی جس کا مقصد اس غیر طبعی سلطنت کو ختم کرنا ہو۔ اس سلطنت کا تو یہ حال ہو رہا تھا کہ ایک کروڑ ترکوں کو ان کے قومی خصائص سے عاری کر دیا جائے جو ان ملک میں بحیثیت رہائی کا دعویٰ رکھتے ہوں اور یہ بھی ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں بھی ہر قوم کا لگ لگ نمائندہ ہونے لگا تو اس کا ہمارے دماغ کی مشکل سلطنت کے خاتمہ کا وقت قریب پہنچتا جاتا تھا۔ یہ خاتمہ آخر ترکوں کا کام بنا جائے گا۔ اس وقت ہمارے لیے ہمارے وطن کے دامن سے پھر وابستہ ہونے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

غرض مجھے ترکی کی اشتراکی پارٹی کی اصلی پالیسی سے کوئی واقفیت نہ تھا میری ان دنوں کی ناواقفیت اور سادہ لوحی کے باعث میرا خیال تھا کہ یہ بھائی تو غریب مزدوروں کے معیار زندگی کو بلند کرنا چاہتے ہیں پھر کیوں نہ میں ان کی حمایت کروں۔

ہاں اشتراکیوں کی ایک بات مجھے نہ بھولتی تھی وہ یہ کہ ان لوگوں کو آشرم میں جس قدر آرام رکھنے سے خدمتی یہ تھا مخلاصیوں کی ذلیل قوم سے ان کی سازوار اسوسا کے تھی یہ الیس "رفیق" کہہ کر پکارتے تھے وہ وہی جب تک کوئی غرض واسطہ رہتی خوشی ان کی خوشامدیں سنتے رہتے وہ رفیق جہاں نہ کام سے ان لگ کرنے والے عادی گدا گروں کو وہی جواب دیتے جس کے یہ مستحق تھے۔

اس طرح میں سترہ سال کی عمر تک آدرس رام کے فلسفہ سے بھی واقف تھا مجھے اشتراکیت اور سوشلزم کا باہمی فرق تک معلوم نہ تھا آخر استاد محترم نے اپنا ایک ایسا تاریک کالا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں اور عادت انسان کو بہکانے کے لیے اشتراکیت نے جو بے مثال جال پھیلا رکھا تھا اس کا راز مجھ پر آشکار ہو گیا اسی تک اشتراکی پارٹی سے میری شناسائی بس اتنی ہی تھی کہ میں ان کے بعض ماہانہ جلسوں میں ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہو جایا کرتا تھا مجھے اشتراکیت کے اصولوں یا اشتراکیوں کی ذہنیت کے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی یا ایک ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج مجھ پر ظاہر ہونے لگے۔ اس طرح چھوٹی مدتوں میں مجھے ان کے متعلق وہ باتیں معلوم ہو گئیں جو بصورت دیگر شاید سالہا سال تک نہ کھلتیں۔ معاشرتی اصلاح اور رہنمائی کی نوع کی آڑ میں ایک ایسا منصوبہ پایا جا رہا تھا جس کے استیصال میں ذرا بھی تاخیر کی جاتی تو شاید وہ ہمارے ملک میں سے اصل انسانی ہی مٹ جاتے۔

تربیتی مہم

پہلے مجھے تبلیغ کے پیشہ میں اشتراکیوں سے واسطہ پڑا۔

جب میں نے یہ کام شروع کیا تھا اس وقت سے مجھے تجربوں کا سامنا ہوتے آیا ہے ابھی تک ہوتا آ رہا ہے میں تبلیغ میں مقابلہ جو حلقہ تھا وہ ہندو تھی میں مستقل طور پر تھا میں نے موجودہ دنیوں حالی اور مستقبل میں ترقی کے امکانات پر غور کرنے میں اتنا مستغرق رہتا کہ مجھے آرہ ڈش کے فوری عوارض سے کوئی بحث نہ تھی میں مزدوری بھی اس

ہے کرتا تھا کہ وہ فوجی کی نسبت نہ پہنچے اور میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ چونکہ آہستہ آہستہ ہی سہی غرض جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے ثابت کر دیا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں میں کوئی دلچسپی لینے کی پروا بھی نہ کرتا۔ لیکن تیسرے پوتھے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے کسی ایک قطعی فیصلہ پر پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ مجھے ٹریننگ میں شامل ہونے کے لیے باقاعدہ حکم دے دیا گیا۔

اس وقت تک مجھے ٹریننگ میں کی بابت کچھ علم نہ تھا مجھے اس کے مفید یا غیر مفید ہونے کے متعلق رائے قائم کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ لیکن جب مجھے صاف کہا گیا کہ تمہیں ٹریننگ میں شامل ہونا پڑے گا تو میں نے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی کہ مجھے اس ٹریننگ سے کوئی واقفیت نہیں اور بہر حال میں کسی کام میں جبراً شمولیت نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ یہ بھی قابل اعتراض تھا کہ مجھے اس وقت قابل تو سمجھا نہیں گیا تھا شاید انہیں خیال ہوگا کہ چند روز میں اسے اپنے آپ ہی لے آئیں گے اور پھر اس کی وحشت بھی دور ہو جائے گی لیکن اگر ان کا یہ خیال تھا تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا تھے وہ لٹنے کے بعد میری قطعی رائے قائم ہو گئی کہ اگر میں پہلے ٹریننگ میں شامل ہونے پر آمادہ بھی تھا تو اب ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ میں نے ان چودہ روز میں اپنے ساتھی مزدوروں کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا اور ان کی کوئی حالت مجھے کسی بھی حماقت میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی جس کے لیے مجھ سے اس ٹریننگ میں مجھ پر ایسا ناموافق اثر پیدا کر چکے ہوں۔

میرے دل میں شروع سے ہی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔

دوپہر کے وقت میرے کچھ ساتھی جمعدار کے قریب ترین شراب خانے میں چلے جاتے اور باقی وہیں جائے قیام کے قریب رہ کر دوپہر کا کھانا کھا لیتے تھے یہ کھانا اتنا تکلیف دہ ہوتا تھا کہ پیٹ بھی نہ بھرتا ہوگا۔ اندر لوگ ٹھونسی ہوئی دوپہر کا کھانا ان کی بیویوں نے پھولے ہوئے ہاتھوں میں لے کر آتی تھیں لٹنے کے آخر میں تدریج ان لوگوں کی

قصہ ہوتا تھا جاتی تھی جو عمارت کے پاس ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے بعد میں مجھے پتہ چلا کہ کیونکہ اس کی جگہ کوئی اس وقت وہ یہی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔

کمیونسٹوں سے بحث

میں کہیں الگ کونے پر جا کر بیٹھ جاتا اور ان کی گفتگو سنتے ہوئے اپنی محرومی قسمت کی بابت سوچتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا دودھ کا پیالہ زہر مار کرتا تھا۔ پھر بھی ان لوگوں کی کافی سے زیادہ باتیں میرے کانوں میں پڑ جاتی تھیں مجھے کئی دفعہ خیال ہوا کہ ان کی گفتگو کا کچھ حصہ میرے لیے مخصوص ہوتا تھا کہ میں کسی فیصلے پر پہنچ سکوں۔ لیکن میں جو کچھ سنتا تھا اس سے میرے دل میں مخالفت کا جذبہ ہی ابھرتا تھا۔ یہاں تو ہر شے کی جڑ بنیاد تھی قوم کی مذمت یوں کی جاتی تھی کہ سرمایہ داروں کی بیوقوفی ہے (یہ سرمایہ داری کا واحد سننے سننے تو میرے کان پک گئے) مادر وطن کو اس لیے کوسا جاتا تھا کہ یہ محنت کے ہاتھوں میں غریبوں کو لوٹنے کے لیے آلہ کار ہے اختیارات قانون کی اس لیے مخالفت ہوتی تھی کہ اس سے غریبوں کو دبا کر رکھا جاتا ہے مذہب اس لیے برا ہے کہ اس سے لوگوں کو افیون کا دیا جاتا ہے اور ہر بات ان کی بحثوں میں الجھ جاتی ہے اخلاق ستم ہے اور بڑوں نہ بچارگی کا اعتراف ہے دنیا کی کون سی چیز ہے جس پر وہ کیچڑ نہیں اچھالتے تھے۔

پہلے پہل تو میں چپ رہا لیکن پھر جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ اس طرح کب تک چلے گی میں نے ان کی گفتگو میں حصہ لینا شروع کیا اور ان کے دعووں کی تردید کرنے لگا۔ تاہم مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک ہر بحث مسائل کے متعلق کچھ اصول و قلیت حاصل نہ کی جائے میری یہ کوشش قطعاً بیکار ہے ان باتوں نے میرے اس ملیح کی تحقیق کرنے پر کمر باندھی جہاں سے میرے مخالفین کو اپنی تمام دلائل مستقل سیکھ کر آتے تھے میں کتاب پر کتاب اور مطالعے پر مطالعہ کرنے لگا۔

اس دوران میں بھی میں عمارت کے پاس بیٹھ کر ہم بحث مباحثہ کرتے رہے اور

جائے، یعنی یہ کہا جائے کہ یہ لوگ قوم میں شہریت کے مستحق نہیں ہو سکتے، مانا جائے گا کہ ہماری قوم پختہ اقدار سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس ذہنی دباؤ کے تحت اور غور و تعمق کے زمانہ میں میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت ان لوگوں کا نقشہ رہتا تھا جو اپنی قوم سے برگشتہ ہو چکے تھے ان کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا اور اسی تناسب سے ان کی وجہ سے پیدا ہونے والا خطرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

کیونسٹوں کے اخبارات

اس واقعہ کے چند روز بعد جب میں نے ایک دن مظاہرہ دیکھا جس میں دو لاکھ کے قریب مزدور شریک تھے تو مجھے بالکل نئے تجربے کا احساس ہوا۔ وہ چار پانچ قطاریں باندھ کر ایک انتہائی سلیقے کی شکل میں مارچ کر رہے تھے سلوگن کی تختیاں تھامے ہوئے تھے جو میرے سامنے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں گھنٹوں کھڑا رہا۔ میں تجربے سے بت بن کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ گھنٹے تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ میں جب میں چوک سے گھر کو واپس ہوا تو نکڑ کے موڑ پر ہی کے نکڑ سے لڈ سال ہو رہا تھا راستے میں ایک تمباکو کی دکان پر مزدوروں کا ہجوم میری نظر سے گزرا۔ ان مزدوروں کی ہاتھ میں پرانی کاپی سے پھاڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ ایک سستے قہوہ خانے میں جہاں عام لوگ مل بیٹھتے تھے اور جہاں میں کبھی کبھی چلا جاتا تھا وہاں بھی یہ مزدوروں کا اخبار سامنے رکھا ہوا تھا میں آج تک اس ذہنی پیچیدگی پر کبھی دوست سے بات چیت نہ کر سکا تھا کیونکہ اس کا سارا انحصار اپنی میرے پیچھے سوہان روح تھا۔ مظاہرہ کو دیکھ کر مجھ پر ایک مایوسی طاری تھی کہ اس وقت میرے اندر ایک آواز پیدا ہوئی اس آواز نے مجھے کہا کہ تم کو کسی دکان سے اخبار خرید کر سارے کا سارا پڑھنا چاہیے۔ غرض میں یہ اخبار گھر لے آیا اور باوجود یکہ اس کی بے اندازہ روح فرسا باتوں سے ہر لمحہ میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا پھر بھی میں نے تمام کا تمام وقت اس کے مطالعہ میں صرف کیا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ اس سوسائٹی و فلسفے کی تحریک کی اندرونی حقیقت ان کے

عقائد کی تمام کتابوں کے مقابلہ میں شتراکی رسالوں کے ذریعہ سے زیادہ بہتر طور پر معلوم کی جا سکتی ہے۔

اس تحریک کا سبب یہ تھا کہ اشتراکیت اور عقائد کی کتابوں میں کوئی مطابقت نہ تھی کتابوں میں شتراکیت کے عقائد بیان کرتے ہوئے روح، تصور، اخلاق اور شرکت یزداں کی بحثوں سے خوف آتا تھا۔ محسن انسانی اور جزیرہ کا مطالعہ کرنے والوں کا جگ سے جی بھر جاتا تھا کہ یہ بیان اور دانشمندوں کی حکمت کا دھوکہ ہونے لگتا تھا۔ تصنع اور آورد کے بل بوتے پر الفاظ کا ایک ایسا چکر کھڑا کر دیا جاتا تھا جس سے پڑھنے والا چندھیا کر جال میں پھنس جاتا تھا۔ برخلاف اس کے رسالہ اشتراکیت میں اس نئی روح کو جگانے والے مذہب کی تلقین ایک عام دلچسپی کے انداز میں کی جاتی تھی۔ سہل اور مختصر عبارتوں کے لیے کوئی وسیلہ ہو سکتا تھا اس کا استعمال ممنوع ہو گیا۔ کہنہ سے کہنہ مسئلے جانتے تھے۔ ان اشتراکی نویسوں کو واقعات نے آمروز کر پڑھنے والوں کو دھوکہ میں ڈالنے کی ایسی مہارت تھی کہ صحیح معنوں میں "معمر رقم" کہلانے کے مستحق تھے عقائد کی کتابیں ان بالائی اور متوسط طبقہ کے سادہ لوح لوگوں کے لیے لکھی جاتی ہیں جو اپنے آپ کو دین دار شمار کرتے تھے اشتراکیت کا پروپیگنڈہ ان لوگوں کو پھانسنے کی خاطر تھا۔

کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے

ان اشتراکیت کی تحقیق اور اشتراکیت کے مطالعہ نے میرے اندر ہمدردی قوم کی محبت کے سرے سے بیدار کر دی۔ جو شخص یا قافلہ جو نظر آتی تھی وہی جوش خدمت کو کام لانے کا باعث ثابت ہوتی۔

جب ایک دفعہ اس تعلیم انسانی کا سکہ کو بٹھا دیا جاتا ہے تو اس کے بعد کوئی شخص بھی اس زہر کا شکار ہونے والوں کو عزم تعمیر کے کاموں میں مصروف کرنے لگتا ہے میں فکر معاش سے آزاد ہوتا گیا اور جوں جوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا گیا توں توں اس سبب کو بھی بہتر طور پر سمجھنے لگا جس کی وجہ

سے اشتراکی عقائد کو تسلط حاصل ہو رہا تھا۔ مجھ پر ان دشمنانہ پابندیوں کا راز بھی کھل گیا جن کی بنا پر اشتراکی کتابوں اور رسالوں کے سوا دنیا کی تمام کتب یا اخبارات کا مطالعہ ممنوع تھا۔ اور اشتراکی جلسوں کے سوا کسی جلسہ میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔ بے رحم اصلیت کی روشنی نے مجھ پر واضح کر دیا کہ ایسی متعصبانہ تعلیم کے لازمی نتائج کیا ہوتے ہیں۔

عوام کو متاثر کرنے کا نسخہ

عامۃ الناس کے قوائے عقلی صرف انہیں محرکات سے متاثر ہوتے ہیں جو طاقتور اور نفیس ہوں۔ ان کی مثال عورتوں کی سی ہے۔ عورت کے بنیادی احساسات کبھی عقلی استدلال سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ وہ موہوم جذبات سے اثر پذیر ہوتے ہیں یہ جذبات اس قوت کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو اس کے وجود کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے یہی وجہ ہے کہ عورت کمزور مرد پر غالب آنے کی بہت حد تک مرد کی مطلق العنانی کو رد کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عامۃ الناس بھی درخواستیں کرنے والے کے مقابلہ میں حکم دینے والے کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو عقیدہ کی مدمقابل کو برداشت نہ کرے وہ ان کے لیے زیادہ اطمینان تک کا باعث ہوتا ہے۔ نہ صرف اس کے جو عقیدہ انہیں ان کی اپنی رائے پر چھوڑ دے اس کی بابت انہیں تذبذب کا احساس کالعدم رہتا ہے۔ ان فریبوں کو کبھی پتہ نہیں ہوتا کہ قوت انتخاب کو استعمال میں لایا جائے اس لیے جب انہیں آزمودہ دی جائے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری رہبری میں کوتاہی کی جا رہی ہے انہیں عقلی ادائی کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی بلکہ انہیں کبھی خیال تک نہیں آتا کہ ان کے آزمودہ رائے کے حق کو پامال کیا جا رہا ہے اور یہ صرف ایک انسان کی شان کے خلاف ہے اگر عقیدہ میں کوئی خامی ہے تو وہ اسے ہرگز محسوس نہیں کر سکتے۔ انہیں تو صرف بے رحم طاقت اور اس کے مسلم ہونے کی ظاہرانہ شوکت نظر آتی ہے اور اس کے سامنے وہ ہمیشہ سر جھکا دیتے ہیں۔

[illegible] کے مقابلہ میں کوئی اس سے سچا عقیدہ وقف کیا جائے اور اسے بھی
اسی کی طاقت سے نکالا جائے تو کبھی بھی شدید تر کیوں نہ ہو، اثر دہ ہی عقیدہ ضرور
غالب آئے گا۔

دو سال سے کم عرصے کے اندر میں تحریک اس کے اصول، اس کے طریقے اور
اس کی کارروائیوں سے پوری پوری واقفیت حاصل کر لی۔

تشدد سے افراد ہی کو نہیں بلکہ قوموں کو بھی مرعوب کیا جا سکتا ہے

اب مجھ پر اس طریقہ کار کی ایک اور خصوصیت بھی منکشف ہو گئی جس سے یہ تحریک کھانے
پینے لوگوں کے خلاف چلی، شدت انگیزی کی جو چھاپ تھی اس کھاتے پیتے لوگوں میں
ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ اخلاقی جرأت تھی نہ روحانی سکت، تحریک کی
چوٹی پر تھی کہ وہ اپنے حامیوں میں سے جس شخص کو سب سے زیادہ اطمینان بخش سمجھتے ایک
مقررہ اشارے پر اس کے خلاف کھوٹے ہو کر اس کا ایک طوفان برپا کر دیتے حتیٰ کہ
دوسرے لوگ اس واقعہ ہو کر اس مظلوم شخص کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس
دوسرے لوگوں کو امید ہوتی تھی کہ اس قربانی کے بعد شاید خود انہیں بھیں سے چھیڑا
جائے گا لیکن ان کی یہ امید ہمیشہ ناکامیاب ثابت ہوتی کیونکہ انہیں کبھی بھیں سے نہ چھیڑا
جاتا۔

یہی چال بار بار چلی جاتی ہے حتیٰ کہ کسی ساتھی کے ڈر سے اس دیوانے لوگوں کا خوف
ہی ان کے شکار کو مطلوب کرا دیتا ہے۔

چونکہ تحریکیں کو خود اپنے تجربہ کی بنا پر قوت کی قدر و قیمت معلوم ہو چکی ہے اس
لیے وہ اپنے مخالف لوگوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں جن میں انہیں جوانمردی کے آثار نظر آتے
کی جھلک نظر آ جائے اس کے برخلاف وہ اپنے حامیوں میں سے ہر اس شخص کو اس کی
دماغی قابلیت کے لحاظ سے کمزور سمجھ کر اس پر چوٹ کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اگر ایک
ذہین روزگار دماغ رکھنے والا شخص ہمدردی کا کمزور ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں اس شخص

سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ کسی کی ذاتی مصلحت ہو چاہے معمولی ہو، لیکن بہت کام کی ہو۔ جس شخص میں ذہانت ہو، انتقام دونوں کی کمی ہو اس کی تو وہ زیادہ تعریف کرتے ہیں۔

مگر ایک بات کو یہ ظاہر کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے کہ وہ اس وطن کے واحد ٹھیکیدار ہیں۔ اگرچہ وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں لیکن یہ مقصد کبھی فراموش نہیں کرتے۔ غرض کبھی ذرا دھما کے ہو کبھی دن دہاڑے ڈاکہ ڈال کر، یہ لوگ بچے بعد دیگرے تنخواہ پر تنخواہ حاصل کیے جاتے ہیں۔ اگر اس وقت ڈالتے ہیں جب عامۃ الناس کی ہر کام میں انہماک کے باعث اس کام سے توجہ ہٹانے پر آمادہ ہوں، یا جب رائے عامہ کسی مسئلہ کو اتنا معمولی خیال کرتی ہو کہ اس پر غور کر کے ایک کیس ہو، دشمن کو بھڑکانا پسند نہ کرے۔

ان چالوں کی ہیرو انسانی کمزوریوں کے صحیح اندازے پر رکھی گئی ہے اس لیے ان کے استعمال سے کامیابی یقینی ہے لیکن وہ دوراندیش حکام جو اس کے طریق حکمت عملی سے کامل واقف ہیں، بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو کمزور طبیعتوں کو بتا دینا چاہیے کہ یہاں تو زندگی اور موت کا سوال ہے۔

مجھے یہ بھی پتا چلا کہ تشدد سے نہ صرف افراد کو بلکہ مجمعوں کو بھی توڑا دبایا جا سکتا ہے یہاں پھر انتظامیوں نے نفسیاتی اثرات کا اندازہ خوب ٹھیک لگایا تھا۔

جب تک کارخانوں، فیکٹریوں، جلسہ گاہوں اور عام مظاہروں میں اس قسم کے تشدد کا مقابلہ کسی زیادہ زبردست صورت میں نہ کیا جائے تب تک دہشت انگیزی کی کامیابی یقینی ہے۔

کمیونسٹوں کی افت میں تظلم کے معنی

اگر کبھی ایسا مقابلہ کیا جائے تو پھر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ کمیونسٹوں پر اٹھتی ہے کہ دیکھو ہم ان دیہاتیوں کو مارے گئے ہیں حکومت کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں پھر اسی کے پاس فریادیں لے جاتے ہیں ان حرکات سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان

لکھنوں میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں ہر ایک ہو جائے۔ اور یہ چھپکے سے یہ مطلب نکال لے جائیں ان کی کوشش پر ہے کہ حکومت کے عہدہ داروں میں سے کوئی ایسا شخص کا اندھا ہو آئے جو اپنے خونخوار جانبین کو قابو کر لینے کی اس حرکت پر اس میں کہ شاید وہ آئندہ کسی موقعہ پر اسے یاد رکھیں۔ اب انہیں اس مالگیر لڑنے کے رستہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے نجات دلا دے۔

مانند الوس، چاہے وہ افریقی ہوں یا مغربی، ان ہولوں کی کامیابی سے ان کے دل پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جو خود ایسی حالت سے دوچار ہو چکا ہو۔ کہ جس کا علم محض کتابوں تک محدود ہو۔ مغربی افریقہ کے حامی ان کامیابیوں کو اپنی تحریک کے برحق ہونے کا ثبوت قرار دیتے ہیں اور جو انہیں بھی اکثر مزید اطلاعت کے بے وہموں کر لے لیتے ہیں۔

جس قدر مجھے دہشت گیری کے طریقہ کار سے واقفیت ہوتی جاتی تھی، اتنی ہی میری ہمدردی اس گروہ سے بڑھتی جاتی تھی جو اس دہشت گیری کا شکار ہو چکے تھے۔

مجھے ان دنوں اس آزمائش کا تجربہ ہوا جس کے بعد گزارہوں کہ وہ کیسی ہو سکتی تھی جس کی آگ نے میرے دل میں ہمیشہ کی قوم کی محبت کا چراغ روشن کر دیا۔ مجھ پر تجربہ سے واضح ہو گیا کہ مکار لیڈروں اور ان کے گمراہ کیے ہوئے پیروؤں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

غریب محب وطن ہوتے ہیں

یہ وہ غریب تو سادہ لوحی کا شکار تھے میں نے اپنے قومی معاشرتی کاموں کے سب سے پہلے حملے کی نفسیاتی خصوصیات بیان کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے اگر میں اس کے ساتھ ہی یہ صاف نہ کر دوں کہ مجھے بہت سے ایسے لوگوں میں بھی ایک روشنی کی جھلک نظر آئی تو میں اس مبالغہ کی آمیزش رہے گی میں نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنے غریبانہ حالوں پر قانع تھے۔ انہیں کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان میں وہ بار بار دہرائی جانے والی

خوبیاں تھیں۔ ایک نسل پیچھے کے مزدوروں میں تو یہ اوصاف بالعموم پائے جاتے تھے بڑے بڑے شہروں کے عالمِ اثر کے باوجود نئی نسل سے بھی یہ خوبیاں مٹی نہیں تھیں لیکن ان میں بھی کئی ایسے تھے جن کے قلب ابھی تک صاف تھے اور جن پر مزدور کے روایتی ماحول کا سایہ نہ پڑا تھا۔ یہ لوگ ان میں سے اکثر کی مثبت خوبیوں کے باوجود تھیں ایک اور طبقہ تھیں دیانتدار تھیں ایک ایسی سیاسی تحریک کے موید تھے جس کی باگ ڈور ایسی قوم کے مشترکہ دشمنوں کے ہاتھ میں تھی جس کی عین محض یہ تھی کہ یہ شریف مزدور شتر کی خصلت پر اوزاروں کی تعلیم کی مدد سے آگاہ نہ تھے کہ قوم میں ہو کوئی ایسا مصری نہ تھا جو مزدوروں کی تلاش و کھوج کیا کرتا۔ علاوہ ازیں معاشرتی حالات ایسے ان بچے تھے کہ جو لوگ شاید بھی اشتراکیوں کے نزدیک بھی نہ پھٹکتے وہ پہلے مجبور اور پھر وہاں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے تھے آخر ایک دن ایسا آتا تھا جب مطلعی ان مزدوروں کو گھیر کر اشتراکیت کی صفوں میں داخل کر دیتی تھی۔

سرمایہ دار احمق ہیں

بار بار سرمایہ دار مزدوروں کے جائز ترین انسانی مطالبات کے خلاف بھی مقابلہ کے لیے اٹھ جاتے رہے۔ ان کی یہ جرأت کو جاہلانہ ہٹ دھرمی تھی۔ ملک میں نوبیں کہوں کا کہ مزدوری اصلاحی تھی انہیں خود بھی اس سے بالکل فائدہ نہیں پہنچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مزدور اپنے یونین کا اندرونی تصور ترک کر کے سیاسیات میں جا پھنسے۔

تھوڑے سے مزدور شروع میں اشتراکیت کے مخالف تھے لیکن ان کے علاوہ ایک ایک کر کے تو اور بھی کارکن سرگرم تعلیم کر رہا۔ اس قسم کا واقعہ سرمایہ داروں کی ان حماقتوں کی بدولت تھی جو مزدوروں کے ہر معاشرتی مطالبہ کو ٹھکرا دیتی تھی انہوں نے تو ہڑتال مزدوروں کی شرائط ملازمت کی اصلاح کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کارخانوں میں پیش آنے والے حادثات کے لیے مزدوروں کا بیمہ کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے بچوں سے مشقت لینے کی ممانعت کرنے سے انکار کیا انہوں نے مزدور

عورتوں اور خاص طور پر عامل عورتوں کی تعداد کے لیے کانوں ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ سب باتیں اشتراکیت کے لیڈروں کے لیے مفید مطلب تھیں وہ کوئی بڑی موقعہ کا فائدہ اٹھاتے تھے جس سے عامۃ الناس ان کے جال میں پھنس جائیں۔

ہمارے سرمایہ داروں کی حرکتوں نے اس وقت کی مشکلوں سے جو نقصان پہنچایا وہ ہرگز قابل تلافی نہیں انہوں نے جب ہر معاشرتی اصلاح کی مخالفت کی تو اس سے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے گئے ان کے اسی طرز عمل سے اشتراکیوں کو وہ ظاہری دلیل ہاتھ آگئی جس کی بنا پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سوائے ان کے مزدوروں کا اور کوئی حامی ہی نہیں۔

ٹریڈ یونینوں کے وجود کی سب سے بڑی اخلاقی دلیل بھی یہی قرار پائی۔

غرض مزدوروں کی تنظیم اس وقت سے اشتراکیوں کی سیاسی فوج میں بھرتی ہونے کا سب سے بڑا آسرا بن گئی۔

جب میں نے اس طرح گرد و پیش کے معاشرتی حالات کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے خود ہی کارخانہ یونینوں کے متعلق بھی کوئی ایک مستقل رویہ اختیار کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ میں ٹریڈ یونینوں کو اشتراکی پارٹی کا آلہ کار سمجھتا تھا اس لیے میں نے ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ میری رائے غلط تھی میں نے شروع سے ہی غلط راستہ اختیار کیا تھا لیکن اس اہم مسئلہ میں بھی قسمت نے یاوری کی اور مجھے ایک ایسا سبق سکھایا جس سے میں اپنی پہلی رائے تبدیل کر سکی۔

طبقاتی رقابت یا طبقاتی مصالحت؟

جب میری عمر بیس سال ہوئی تو میں اس ٹریڈ یونین میں جو ملازموں کے معاشرتی حقوق کی حفاظت اور ان کے معاش کے لیے سودمند فراہم کرنے کی خاطر قائم کی جائے اور اس ٹریڈ یونین میں جو کسی صناعت کے ماتحت میں کام کرنے والوں کی طبقاتی جنگ کے لیے سپاہی تیار کرنے کا کام دے۔ فرق کرنا سیکھ چکا تھا۔

ڈرامہ میں تحریک کی زبردست اہمیت سے اشتراکی خوب واقف تھے۔ وہ اسے ایک حربہ سمجھتے ہوئے اس پر قابض ہو گئے اور بڑی کامیابی سے اس کا استعمال کرتے رہے۔ سرمایہ دار اس تحریک کی نوعیت سمجھنے سے قاصر رہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دروازے میں گھس آئے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لوہے کی دیوار سے شاید اس تحریک کی لپٹیں ٹکرا کر رک جائیں گی اور وہ کوئی خلاف عقل قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے لیکن یہ کرشمہ کہ ڈرامہ میں تحریک نئی نسل قوم کے لیے مضر ہے، نہ صرف غلط ہے بلکہ فضول بھی ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کہ ڈرامہ میں کے ذریعہ ایک جماعت کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جائے اور اس میں کامیابی ہو جائے تو یہ کوشش وطن و قوم کے لیے کیسے بری ہو سکتی ہے۔ یہ تو صحیح معنوں میں خدمت قوم ہوئی اس لحاظ سے دیکھئے تو ڈرامہ نویسوں کا کام وہ معاشرتی فضا پیدا کرتا ہے جو قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سازگار ہے جب یہ تحریک معاشرتی مرض کے مادی اور نفسیاتی اسباب دور کر کے قوم کی روحانی صحت کا سامان کرتی ہے تو ہر حال اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یہ سوال خارج از بحث ہے کہ کیا ڈرامہ نویسوں کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے یا نہیں۔ جب تک ایسے آلہ موجود ہیں جن میں معاشرتی احساس کا فقدان ہے اور جو انصاف و ہمدردی کے خلاف طریقوں پر کار بند ہیں۔ تب تک ان کے مداحین کا بھی یہ صرف یہ حق ہے بلکہ ان پر واجب ہے کہ معاشرتی کو تباہی اور بربادی سے بچانے کا انتظام کریں۔ علاوہ یہ کہ آخر مداحین بھی تو خود قوم کا ایک عضو ہیں عضو ہیں عضو ہیں کی وفاداری اور اتحاد کا برقرار رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا صحت عامہ کا اہتمام۔

جو دلیل آلہ قومی کے وابستہ ہونے کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں رکھتے وہ معاشرتی کے ساتھ اخلاق اور وفاداری دونوں کے دشمن ہیں ان کا ذاتی مفاد غیر ذمہ داری آمیز بے پروائی کے سبب ہوتے ہیں ان سے کام کا تدارک بقینا ملک کی بہبودی میں داخل ہے۔

یہاں یہ جواب کوئی جواب نہیں کہ ہر مزدور اچھا اچھا اختیار رکھتا ہے کہ اگر اس کا آقا واقعی اس سے کوئی بے انصافی برتے یا اگر وہ خود کسی ایسی بے انصافی کا وہم کرے تو وہ بھی اپنی حفاظت کا بندوبست کر لے۔ بالفرض اگر وہ مدافعت ترک کر دے تو یہ رویہ تو اصل موضوع سخن سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک چال ہے کیا معاشرتی تنظیم کو درکار قوی معاہدے کے لیے ضروری ہے یا نہیں کہ ہم اس کے لیے کوشش کا وہی واحد طریقہ اختیار کریں جس سے کامیابی کی توقع ہے کیا مزدور کا فرد مالک کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے اس طرح پر تو جیسے ہو گا کہ حق ہر کوئی ہے کہ حق کو معیار تسلیم کر لیا جائے تو پھر جھگڑا کاہے کا تھا۔ یہاں تو سوال ہے طاقت کا اگر یہ نہیں تو پھر حد ہے انصاف خود کو اس تاریخ کو کیوں نہیں جتا دیتا۔ یہ کھینچا تانی کی نوبت ہی کیوں پہنچتی ہے؟

میں پھر کہوں گا نہیں اب لوگوں سے وہ سلوک کیا جاتا ہے جو حقوق معاشرت اور آزاد شرائط معاہدہ کے خلاف ہے اور جب کسی ہڑتال کے لیے لکھتے ہیں تو اس وقت ہماری اس فریق کے ہاتھ رہتی ہے جس کا پلہ بھاری ہو۔ اس طرح کو وہی دکام قانون بنا کر رفع کر سکتے ہیں جنہیں اس کے لیے کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس مقابلہ میں کیلے کیے مزدوروں کیلے کامیاب ہونے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو وہی ہے کہ سب کے سب سر جوڑ بیٹھیں، متحد ہو کر آقا کے سامنے جائیں جہاں تک آقا کا تعلق ہے یہ حضرت تو پہلے ہی اس صنعت یا تجارت کے دلکش میں اس کے کل منافع اپنی ذات واحد میں لپیٹے بیٹھے ہیں۔

اس طرح سے ڈیڑھ ہوشیار کاروباری زندگی میں معاشرتی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے، اس احساس کو رائج کرنے کے لیے، جو بھی نتائج کا راستہ صاف کرنے کی خاطر مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ڈیڑھ ہوشیار کا یہ تاثر اس خاصیت کو دور کرتا ہے جس سے عوام میں بیشتر بے چینی اور انقلابات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

ٹراٹسکی پارٹی کی یہ شدید ضرورت محسوس کرتی ہے کہ اس کا گناہ ان لوگوں کے سر ہے جو معاشرتی اصلاح کے لیے قانونی کارروائی کرنے کے راستہ میں حائل ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے سیاسی رسوخ سے کام لیتے ہوئے ایسی اصلاح کو ناکام بنا دیا۔

سیاست میں حصہ لینے والے سرمایہ داروں کو ٹریڈ یونینوں کی اہمیت کا احساس نہ ہوا تھا۔ جی تو یہ ہے کہ وہ اس اہمیت کا احساس کرنا چاہتے ہی نہ تھے چنانچہ اس غلطی سے ٹراٹسکیوں کو جو موقعہ ہاتھ آیا انہوں نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور وہ مزدوروں کی تحریک کے واحد لیڈر بن بیٹھے۔ ان سرمایہ داروں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ کی۔

کمیونسٹ دھوکہ باز ہیں

اس ترکیب سے ٹراٹسکیوں نے گویا اپنے لیے ایک فوجی دستہ تعمیر کر لیا۔ جب بھی صورت حالات مارکس وادی ڈھانچے میں ڈھلتے۔ غرض تحریک کا اصل مطلب فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ کوئی مقصد آ گیا۔ ہوتے ہوتے ٹراٹسکیوں کو یہ مصیبت پڑی تھی کہ وہ ٹریڈ یونینوں کے بلوائی نصب العین کے لیے جان کھپاتے پھرتے انہوں نے تو ہر جگہ سے لے کر پیرس تک تمام تحریک پر مزے سے قبضہ جما لیا اور لگے اسے اپنی سیاسی مطلب برآریوں کے لیے استعمال کرنے۔

ٹراٹسکیوں کے تجربہ کار ہاتھوں نے چند ہی سال میں ٹریڈ یونین تحریک کی کایا پلٹ کر رکھ دی جو کام انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑا کیا گیا تھا اسے انہوں نے قوم کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ اپنی اس غرض کو پورا کرتے ہوئے انہوں نے مزدوروں کے مفاد کی ذرہ بھر پروا نہ کی۔ یہ بات میں نکاحہ دے کر آگے بڑھ چکا ہوں کہ اگر کسی فریق کو اپنی بات منوانے کے لیے دوسرا فریق بے حس و حرکت ہو کر بے چارگی کے عالم میں بیٹھا رہے تو اقتصادی دباؤ ڈالنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ یہاں دونوں شرطیں پوری

تھیں۔

کمیونسٹ مزدوروں کو استعمال کرتے ہیں

موجودہ صدی کی ابتدا سے پہلے ہی ٹریڈ یونین تحریک اس مقصد کو فراموش کر چکی تھی جس کی خاطر اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ سال بسال اس تحریک میں اشتراکیوں کا نفوذ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس فرقانی جنگ میں پوری قوت صرف کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چاہے یہ تھی کہ وہ ہڑتالیں کر کے اس اقتصادی نظام کو تباہ کر دیا جائے جو انہوں نے کئی صدیوں کی محنت اور طویل مدت کے بعد کھڑا کیا ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو حکومت خود بخود برباد ہو جائے گی کیونکہ اس کی اقتصادی بنیادیں تو پہلے ہی کھوکھلی کی جا چکی ہوں گی۔ مزدوروں کے حقیقی مفاد کی جانب اشتراکی روز بروز کم توجہ دینے لگے۔ حتیٰ کہ اگلے مورخین نے بھانپ لیا کہ آزاد خیال انہیں کے معاشرتی اور تمدنی مفادات معرض خطر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ تو ہر خود غرض کی فطری سیاسی غرض کے لیے زیادہ موثر ہے کہ وہ مزدوروں کو اس مقصد کے لیے کام کرنے میں لگا دے۔ اگر وہ اس مقصد کو حاصل کر لیں گے تو پھر انہیں مجرد سیاسی تغلب کے لیے کام کرنے میں کیا دقت ہو سکتی ہے۔

جب فرقانی جنگ کے سرغنے عالمہ الناس کی بے چینی اور بے قراری کا تصور کرتے تھے تو ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ اس فرقانی جنگ کا نتیجہ انہیں کیا ہاتھ آیا تھا کہ وہ چھوٹی موٹی معاشرتی اصلاحات کی بھی مخالفت کرنے لگے۔ حالات ایسے تھے کہ انہیں اپنی ان متضاد حرکات کو جانچنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

عالمہ الناس کو یہ اپیل پڑھنی پڑی کہ وہ اپنے مطالبات کی تعداد اور انتہا پسندی میں اضافہ کرتے جائیں تبھی یہ ہوا کہ ان مطالبات کو قبول کیے جانے کے امکانات کم سے کم تر ہوتے گئے۔ جو تھوڑی بہت اصلاحات وفاق کی جاتی تھیں وہ نظروں میں نہ جچتی تھیں ان حالات میں جب کہ کئی قانون کے ذریعہ مزدوروں کے اہم ترین مطالبات تسلیم کیے جا رہے ہیں عالمہ الناس کو یہ ہونا نہایت آسان تھا کہ وہ ایک مستقل تیز قدم سے اس

www.pdfbooksfree.pk

ٹوبھائی پال کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے جوش جہاد کو بظاہر کسی شور و شر کے مزدور کر دیا جائے اور ممکن ہو تو ختم ہی کر دیا جائے۔ اگر اس حقیقت کو ذہن میں رکھ لیا جائے کہ عام انسان میں سوچنے لگنے کی صلاحیت کس قدر تھوڑی ہوتی ہے تو پھر ان اقدامات کو جو کامیابی ہوتی اس پر کوئی تعجب محسوس نہیں ہوتا۔

سرمایہ دار مطلوب ہیں

سرمایہ دار انٹرنیشنلوں کی طرف دوستانہ نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن وہ کسی عملی تحریک سے وابستہ نہ ہوتے تھے اور نہ ہی کوئی جوابی حملہ کرتے تھے حالانکہ اس طرح انٹرنیشنل مزدوروں کی زبردست طاقت سے محروم ہو جاتی تھی اس سے سرمایہ داروں کو سبق مل جاتا ہے تھا اور اصلاحات میں ایسی سرگرمی دکھائی جاتی تھی جس سے انٹرنیشنلوں کا سب سے زبردست ہتھیار رہ جاتا لیکن یہ کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

سرمایہ دار اپنے مخالفوں پر پہلے حملہ کرنے کی بجائے خود ہی دبتے اور پیچھے ہٹتے رہے۔ آخر کار انہوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ ایک عرصہ تک وقت دیتے رہے تھے کہ بالکل بے اثر ثابت ہوں اور رد کر دیے گئے غرض سرمایہ داروں کی مداخلت سے صورت حالات میں کوئی فرق نہ آیا اس سے پہلی ہڑتال ہوگئی۔

کمیونسٹوں کا انٹرنیشنل ابلہ فریبی کا شاہکار ہے

فضائے سیاست اور انفرادی زندگی دونوں پر آزاد تجارت پالیسی بیلوں کی طرح منڈلانے لگیں قوم کی اقتصادی آزادی حکومت کی بیڑیاں اور انفرادی حریت سے کہ یہی زبردست اور بہت بڑا ہتھیار تھا۔ یہی آزاد تجارت پالیسی تھیں جنہوں نے حریت کے نعرے بلند کیے تھے جنہوں نے اخوت کے نام کو پرچم بلند کر کے یہ کہا تھا کہ "آزاد ہوں اور رفیق بنا منظور نہیں تو ہمت تمہاری کھوپڑی اڑا دیں گے۔"

یوں کہنے ان حاصلوں کی قدر سے تعارف حاصل ہوا۔ جوں جوں سال گزرتے گئے میرا انٹرنیشنل کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ لیکن جہاں تک

اس مسئلہ کی بابت میری ابتدائی رائے کا تعلق ہے اس میں ہر طرح فرق نہ آیا۔

اشتراکیت کے ظاہری آثار کے متعلق جتنی میری واقفیت تھی اتنا ہی مجھے اس کے عقائد کی داخلی حیثیت معلوم کرنے کا زیادہ شوق ہوتا۔

خود اشتراکی پارٹی کی جانب سے جو کتابیں مجھے ملیں وہ اس مقصد کے لیے بہت زیادہ کارآمد نہ تھیں۔ اقتصادی مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان کے بیانات بھونڈے اور توجہ طلب ہوتے تھے۔ سیاسی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی روش میں اخلاص نہ تھی مزید برآں وہ اس حقیقت سے بھی ان لوگوں کے ذہن کو بچا نہ سکے جو ان کے طریقے میرے اندر کچھ نفرت پیدا کرتے تھے۔ انہیں دعویٰ تھا کہ ان کی موجودہ جدوجہد کے خطرے اور ناقابل تصور قسمیں عظیم انسانی فوائد کی حامل ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان کا کوئی مطلب ہوتا تھا نہ معنی۔ اس طفل دماغ کی بھول بھلیاں کو سمجھنا بھی کسی ایسے شخص کا کام تھا جو عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں رہتے رہتے ایک حد تک پاگل ہو گیا ہو۔ کہ اس قسم کے کلام کی سرسری سے اسے "روحانی قلب" بننے کی خوشبو آئے۔ ظاہر تھا کہ یہ مسلک ہماری قوم کے اس سادہ لوح گروہ کو تاک رہا ہے جسے یہ خیال ہوتا ہے کہ جو شخص جس کی کوئی بات سمجھ نہ آئے ضرور کوئی مہاپرش ہوگا۔

جب میں نے اس عقیدہ کی اصولی تاریخی اور بیرونی کا مطالعہ اس کے مظاہر کی طرف توجہ سے کیا تو بتدریج اس کے حقیقی مقاصد مجھ پر کھلنے لگے۔

اشتراکیت کی جڑ یہودی ہیں

انکشاف کے ان لمحات میں مجھے احساس ہوتا تھا کہ اس سازش کی تہ میں ضرور کوئی جیتا جاگتا کام کر رہا ہے۔ میں کسی شیطانی ہاتھ کا تصور کر کے خائف ہو جاتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسا مذہب تھا جو خود غرضی اور نفرت کی بنیاد پر تھا اس کا طریق کار ریاضی کے سوچ کر تیار کیا گیا تھا۔ اس کی کامیابی یقینی تھی لیکن اس کا تسلط انسانی کولتار کے گھاٹ اتارنے کا باعث ہوگا۔

اشتراکیت کی داخلی ماہیت اور اس کے حقیقی مقاصد صرف قوم یہود کی اصلیت
کیوں کر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

جس شخص نے بھی سرائیل کی نسل کو جانچا اس نے گویا اپنی آنکھوں کے سامنے
سے وہ پردہ اٹھا دیا جس سے اشتراکیت کی حقیقت اور مقاصد ایک لمحہ کے لیے نظر میں آ جاتے
ہیں۔ اس وقت معاشرتی نظام کی تاریکی اور دھندلا پن دور ہو کر مارکس ازم کا وہ دانت
نکالے ہوئے بھیانک چہرہ آ جاتا ہے۔

یہودیوں سے میری شناسائی

آج میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ قریب قریب کب مجھے یہ خیال آیا کہ "یہودی" کا لفظ
پہلے پہل کب میرے ذہن میں کسی خاص تصور کا مرکز ہونے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد
پڑتا ہے میں نے گھریلو زندگی میں کبھی یہ لفظ نہ سنا تھا۔ دادا اپنی طرز کے واضح دار
آدمی تھے اُن کے سامنے کبھی یہ لفظ بلکہ اس سے ملتے جلتے لفظ استعمال کیا جاتا تو وہ ضرور
ایسا کرنے والے کو غیر تعلیم یافتہ اور رجعت پسند قرار دیتے۔ وہ اپنے دور کی زندگی میں
کافی حد تک حصہ لے چکے تھے۔ ہاں قومی معاملات میں وہ کم تھے اور اس کا کچھ ہی اثر
ہو سکتا ہے جو نتیجہ گھر میں میرے ذہن نشین کرایا گیا تھا وہ مجھے اسکول جا کر بھی تبدیل
کرنے کی کوئی ضرورت درپیش نہ آئی۔

مکتب میں ضرور میں نے ایک یہودی لڑکا دیکھا تھا ہم سب اس سے الگ رہتے
تھے اس کی وجہ بھی صرف یہ تھی کہ اس کی کم گوئی اور بعض دوسری حرکات سے کہیں ذرا
ہوشیار رہنے کا ثبوت ہوتا تھا۔ اس سے آگے میں نے یا میرے ہم جماعتوں نے اس سے
متعلق کوئی خاص رائے قائم نہیں کی۔

میں چودہ برس کا ہوں گا جب سیاست پر بحث کے دوران میں "یہودی" کا
لفظ بار بار میرے کانوں میں پڑنے لگا اس سے پہلے کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا میں ان
تلمیحات کو سمجھ نہ سکتا تھا جو اکثر اس لفظ کے ساتھ ہوتی تھیں۔ نہ یہ جانتا تھا کہ مذہبی اختلافوں سے میری طبیعت ہمیشہ

سے الجھتی ہے ان دنوں مجھے یہودیوں کے متعلق اس کے سوا اور کوئی خیال نہ تھا۔

لیکن میں یہودی برادری کا ہم تھے اور جو تھے لوگوں سے صدہا برس سے گزری تھیں اس عرصہ میں ان کی ظاہری شکل و شباہت پر بھی اثر ہو چکا تھا کہ دیکھنے میں وہ بالکل دوسرے انسانوں کی طرح نظر آتے تھے حتیٰ کہ میں اکثر حیران ہوتا تھا اس وقت مجھے یوں اپنے زبردست مطالعہ کا اس لئے بھی کہ میں مذہب کے ظاہری فرق کے سوا یہودیوں کے اور ہمارے درمیان اور کوئی فرق نہ سمجھتا تھا میرا خیال تھا کہ ان عربوں کو صرف ان کے مذہب کی بنا پر غلط کہا جاتا ہے اسی لئے پہلے تو میں ان کے ہر خلاف باتوں کو ناپسند کیا کرتا تھا لیکن پھر مجھے اس بات سے گھن سی آنے لگی مجھے کبھی علم بھی نہ ہوا تھا کہ کسی عام کی حفاظت کو کیسے قاعدہ کلیہ کی شکل دی جا سکتی ہے۔

میرے یہ خیالات تھے کہ میں وائنا آ گیا۔

جب میں پہلے پہل آیا تو یہودیوں کی عمارتیں دیکھ کر مجھے ہمارے محلوں کا خیال ہوا کہ میں گھبرا سا گیا۔ علاوہ ازیں مجھے جو مصیبتیں درویش تھیں ان سے بھی دل ہٹا ہوا تھا۔ غرض اس وسیع شہر میں جو بھانت بھانت کے باشندے بس رہے تھے مجھے ان کے مختلف قومی حلقوں میں تمیز کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ اس وقت وائنا کی یہی آبادی میں سے دو لاکھ یہودی تھے لیکن مجھے کبھی ان کی جانب توجہ دینے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ میرے قیام کے شروع کے چند ہفتوں میں تو میری آنکھیں اور میرا ذہن نئے نئے خیالات کے نذر ہونے سے ہی بچ نہ سکے۔ پھر بتدریج جب میں اپنے ماحول سے مانوس ہو گیا اور خیالات کی الجھن میں نہ تب آئی تو مجھے اپنی دنیا میں نئے سرے سے تمیز کرنے کا کوئی موقعہ ملا۔ اسی سلسلہ میں یہودیوں سے سابقہ پڑنے لگا۔

میں پہلے یہودیوں کا دشمن نہ تھا

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پہلے پہل کس طرح یہ مسئلہ میرے سامنے آیا اس سے کچھ کوئی خاص تعلق ہو۔ میں ابھی تک یہودیوں کے متعلق یہی خیال رکھتا تھا کہ

کہ ان کا مذہب ہم سے مختلف ہے یہی وجہ تھی کہ جب میں ہر کوئی غلط کہا جاتا تھا تو میں سمجھتا تھا کہ اس کی وجہ محض مذہبی اختلاف ہے اور انسانی رواداری کا اصول مدنظر رکھتے ہوئے یہ جرأت مجھے ناپسند تھی وہ لکھا کرتے جو اشارات بنی نوع انسان کے خلاف لکھتے تھے میں ان کا طرز تحریر بھی ایک عظیم شان قوم کی تمدنی روایات کے خلاف قرار دیتا تھا میرے حافظہ میں وہ مقام تازہ ہو جاتے جو قرونِ وسطیٰ میں یہودیوں پر ڈھائے گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس قسم کے واقعات دہرائے جائیں بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ بنی نوع انسان کے خلاف لکھنے والے ظہورات عالم اہل کے اشارات میں شامل نہ تھے ان دنوں مجھے اس کا سبب معلوم نہ تھا میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ان کی یہ روش حسد اور عداوت کا نتیجہ ہے مجھے کیا علم تھا کہ چاہے طرز عمل غیر دانشمندانہ ہی لیکن یہ بھی خلوص کام کر رہا ہے۔

یہ دیکھ کر میری رائے اور پختہ ہو گئی کہ اعلیٰ درجہ کے اشارات اس قسم کے سوالوں کا جواب نہایت متانت سے دیتے یا خاموشی سے ٹال جاتے۔ وہ خصوص ایسے موقعہ پر خاموش رہتا تو میری نظر میں اصل ذی وقار ہستیوں کا طریق عمل تھا۔

کرایہ کے نوّاب اشارات

مانچسٹر کہلانے والے اشارات میں خاص توجہ سے مطالعہ کرتا۔ یہ اشارات اپنے طرفداروں کو اس قدر اطلاعات مہیا کرتے تھے جو اس غیر جانبدارانہ رویہ سے مختلف مسائل پر بحث کرتے تھے اس سے میں حیران رہ جاتا تھا میں ان کی تجدد روش کا معترف تھا لیکن طرز تحریر کا تصنع، مبالغہ اور چیخ چیخ کر بلند نہ تھے اس سے دل میں شک پیدا ہوتا تھا تاہم میرا خیال تھا کہ یہ سب کمزوریاں اس جلت راسخہ صافی کے غالب اثر کا نتیجہ ہیں۔

ان دنوں ان اشارات کی لغزشوں سے درگزر کرنے کے لیے میں یہی وجہ کافی سمجھتا تھا کہ وہ اکثر مجھے ایک جلت راسخہ صافی نظر آتے تھے جو اکثر اشارات ثانوی درجہ کے قدموں پر لوٹنے میں اس دلت کا مظاہرہ کرتے تھے اس سے اکثر مجھے نفرت پیدا

ہوتی۔ ہاف برگ کے محل میں کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی ہوتا اسے بڑھا چڑھا کر ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا تھا یا ایک معمولی حرکت بھی بالخصوص جب اس میں ملکہ کو تعریف کا موقع دیا گیا ہو "سب سے عقلمند بادشاہ" ہوتا تھا جس کی نظیر روئے زمین سے لے کر آج تک پیدا نہیں ہوئی "تو مجھے اس پرانی مرغے کی چپ بھیرباں ہونا" جانی نہیں جو وقت معاملہ اپنی شریک زندگی کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے۔ میں اپنی قصیدوں کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تھی میں سوچا کرتا تھا کہ ایسا ملک "اور جمہوریت کے نصب العین پر ایک کلنک کا ٹیکہ ہے میں شاہی دربار کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہ طریقہ قومی تمکنت کے منافی سمجھتا تھا۔ میں وائے کے عظیم الشان مالکیوں اور ایجادات سے ہوں تو دلچسپی رکھتا تھا لیکن ان کی یہ ایک حرکت مجھے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔

وائے کا بیٹا کرسٹن کے بیٹے اور تونی کمال سے میری دلچسپی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب میں کرسٹن کی نوخیز سلطنت کے عروج کا مشاہدہ کرتا یا کے ذہن سے کرتا تو مجھے بے حد فخر محسوس ہوتا اور تعریف کرنے کو جی چاہتا اگرچہ کرسٹن کی تاجپوشی پر میں دل خوش کر دیتی تھی لیکن اندرون ملک کے سیاسی حالات ہمیشہ ایسے کامل اطمینان نہ ہوتے تھے ان دنوں ولیم ہاتی کے خلاف جو مہم جاری تھی وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی میری نگاہ میں ولیم ہاتی قابل نفرت نہ تھا، بلکہ کرسٹن کا کوئی چیز قائم کرنے کا سوال بھی اس کے سر تھا قیصر کرسٹن کو ہوس کی پاداش میں تخت سے علیحدہ کرنے کی مخالفت کی گئی تو مجھے سخت غصہ آیا کیونکہ جن لوگوں نے یہ مخالفت کی وہ میرے نزدیک کوئی ایسا امتیاز نہ رکھتے تھے یہ وہ لوگ تھے جو مرغے کی مرغے ایک ہی نشست میں لڑکے مرغیوں کی طرح اتار دیتے اور دشوار حل ہو کرتے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کروڑ سے کروڑ بادشاہ بلکہ پورے شاہی خاندان کی صدیوں کی فراست کی سنتیں بھی ہیچ نظر آتی تھیں۔

خوشامدیوں کی صحافت

میں اس قوم کی حالت دیکھ دیکھ کر جلا جا تا تھا جہاں ہر روز نئے نئے حق حاصل تھے کہ وہ

قصیدے لکھے جاتے تھے انہیں پڑھنے سے واقعی پتہ نہیں ہوتے ہیں شروع سے لگتی تھی
کی دفعہ ایسا ہوا کہ پہلا مغیر انہیں عشق فراش کے جس ذلیل جذبہ سے ہوتے تھے
اس سے لگ کر میں نے انہیں پڑھتے پڑھتے بے پھینک دیا ہے میں اکثر اس مذکورہ
بالا رائے عام کے خلاف اس کا مطالعہ کرتا تھا تو کہ چھپ میں چھپا تھا لیکن ایسے مسائل
سمجھا رہا وہ شوخی سے بیان کرتا تھا میں اس کا بیباکیوں کے خلاف زبردست پسند تو نہ کرتا
تھا لیکن پڑھا مجھے اچھا لگتا تھا کہ اس کے دل میں بڑی تو بہ ہو رہی ہے۔

بہرصورت یہ اس اخبار کے مطالعہ کا اثر تھا کہ مجھے اس شخص اور اس تحریک سے بڑی
واقفیت حاصل ہوئی جو ان دنوں ہندوستان کی قسمت کے مالک تھے یہ شخص ڈاکٹر کارل ولکر تھا
اور اس تحریک کا نام کرسچین سوشلسٹ تحریک تھا میں پہلے دن ہی آپ کو مجھے بڑا ہے
اختلاف محسوس ہوا میرا خیال تھا کہ یہ شخص اور اس کی تحریک دونوں ناپسند کرنے
کے مستحق ہیں۔

جب میں نے اس شخص اور اس کے کام کو غور دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھ میں
ذرا بھی انصاف ہے تو مجھے اپنی رائے تبدیل کر لینی چاہیے غرض میں نے پہلے سے
زیادہ تعلیم دل کی مدد سے کھروائی کی تو آہستہ آہستہ میرا خیال بدل گیا اور میں کچھ
عرصہ بعد ان کی تعریف کرنے لگا اس کے بعد آج تک میں ڈاکٹر کارل ولکر کو اس علم و
فضل کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں جب کرسچین سوشلسٹ تحریک کے متعلق میری رائے
تبدیل ہو گئی تو اس سے میری کئی غلط فہمیاں خود بخود دور ہو گئیں۔

باوجود یکہ میری طبیعت ابھی عام کی مخالفت کے متعلق اپنی پہلی رائے تبدیل کرنے پر
ہرگز مائل نہ ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر کارل ولکر کی میری رائے میں تبدیلی آپ اس فیصلہ پر پہنچنے کے
بعد مجھے اور زیادہ شدید کشمکش میں سے گزرنا پڑا میں جذبات پر غالب تو آ گیا لیکن
کرنے مقابلے کے بعد دو سال کے بعد جذبات کی شدت نے پھر دوبارہ حملہ کیا اور جو
فیصلہ عقل نے کیا تھا اس کے متعلق پھر دوبارہ کام کرنے لگے۔

جب میرے اندر یہ کشمکش جاری تھی جس میں ایک طرف تو عقل تھی اور دوسری طرف وہ جذبات جو میرے طریق پرورش کا نتیجہ تھے۔ ان دنوں مجھے وہ تقریریں خوب کام آئے جو میں نے دانائی کی راہوں پر حاصل کیے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں پہلے کی طرح اس عظیم شان شہر میں آنکھیں بند کر کے چلتا تھا۔ جو رات کے ساتھ ساتھ نئے نئے انسانوں کا مشاہدہ بھی کرتا تھا۔

مجھے مسئلہ صیہونیت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے

ایک روز میں اندرون شہر میں سے گزر رہا تھا کہ ایک میرا ساتھ ایک ایسی مخلوق سے ہوا جس نے ایک لمبی عبا پہن رکھی تھی اور جس کے چہرے کی دونوں جانب بہت لمبی لٹکتی ہوئی قلمیں تھیں۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا کہ یہ یہودی ہے؟ بچپن میں تو ایسا ہوں نہیں کرتا ہوں گا کرتے تھے میں ٹھہر جا کر چپکے چپکے اس آدمی کو دیکھتا رہا۔ بعد میں اس کے نرالے چہرے پر نظر جما کر دیکھتا تھا اور بعد میں اس کے خدوخال کا مطالعہ کرتا تھا۔ تاہم میرے دل میں شک پیدا ہوتا کہ کیا یہ شخص بھی ترس کھانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟

میری بدقسمتی سے عادت تھی کہ میں اس قسم کے سوالات کا حل کتابوں میں تلاش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس مسئلہ کے لیے بھی میں نے بیس روپے اکٹھے کیے۔ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ میں نے چند پیسے خرچ کر کے بنی سام کے خلاف پمفلٹ خریدے لیکن بدقسمتی سے ان سب رسالوں میں شروع سے ہی پڑھنے والے کو مسئلہ یہود کا واقف فرض کر لیا جاتا تھا اور تھی بھی تکلیف گوارا نہ کی جاتی تھی کہ سمجھ پوتا دیا جائے کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ علاوہ ازیں ان پمفلٹوں کا طرز تحریر ایسا تھا جس سے میں اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ ان کے لکھنے والے جذباتی تھے۔ عقل سے بالکل عاری تھے۔ ان کتابوں کے پڑھنے میں دو ہفتے اپنے بیتے خیالات پر دوبارہ آ گیا۔ یہ موضوع ایسے اہم تھا اور اس کا اثر اتنی دور تک پہنچتا تھا کہ میں کسی غیر منصفانہ نتیجہ سے مطمئن رہنا چاہتا تھا۔ میں پھر پہلے کی طرح منتظر اور

مذہب رہے گا۔

اب مجھے اس بات میں تو کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہود محض نام نہاد مذہبی اختلاف کا سوال نہیں بلکہ ایک علیحدہ قوم کا مسئلہ درپیش ہے جو کہ میں نے اس معاملہ میں تحقیق شروع کی میرے دماغ میں وہ کانفرنس کا جو نقشہ قائم تھا اس کا رنگ ہی بدلنے لگا اب میں جہاں کہیں جاتا میری نظر یہودیوں پر بالخصوص پڑتی تھی جتنا میں اس کا معلوم کرتا تھا مجھ پر واضح ہوتا جاتا کہ وہ دوسرے شریفوں سے قطعاً علیحدہ اور ایک علیحدہ قوم ہیں۔ بالخصوص مشرقی شہروں ٹیونس اور الجزائر کی سیر کے ثانی مقامات میں تو ایسے لوگوں کی بھرمار تھی جو ہر طرح شکل وصورت میں بھی آدمیوں سے کوئی مماثلت نہ رکھتے تھے۔

اگر اس حقیقت میں مجھے کوئی تھوڑا بہت شک رہتا تھا تو وہ تو یہودیوں کے ایک گروہ کی حرکات نے دور کر دیا انہوں نے تحریک صہیونیت کے نام سے ایک عظیم الشان تحریک اٹھائی جس کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومیت پر زور دیا جائے اس تحریک کی بنا میں ایک زبردست شاخ تھی۔

بظاہر تو یہ نظر آتا تھا کہ صرف یہودیوں کا ایک گروہ اس تحریک کا حامی ہے اور عالب اکثریت کو کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اس کے منکر ہیں لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ دکھاوے کا تفرقہ جان بوجھ کر محض اس لئے کیا گیا ہے۔

یہ ظاہر داری کا پردہ ان علماء کے جواب کے نتیجہ تھا جو اگر مطالعہ دینے کی صریح نیت سے نہیں تو محض کام ٹالنے کی غرض سے مکرر کہتے تھے میرے اس بھولی کی دلیل یہ ہے کہ جو یہودی آزاد خیال کہلاتے تھے وہ بھی تحریک صہیونیت والوں کو اپنی قوم سے خارج قرار نہ دیتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ ہیں تو یہ بھی ہمارے یہودی بھائی لیکن اس طرح جو اپنے علماء کا انکار کرتے ہیں اس سے کامیابی نہ ہوگی تا یہودیوں کے لئے الجھن پیدا ہو جائے گا۔

الغرض ان کے باہمی اتحاد میں کوئی کسر نہ تھی۔

میں جلدی تحریک صیہونیت والے یہودیوں اور آزاد خیال یہودیوں کی اس جنگ زرگری سے متنفر ہو گیا جس کا وہ راستہ اختیار کیے ہوئے تھا یہودی جس اخلاقی وقار اور بلند قومی سیرت پر ناز کیا کرتے تھے اس قسم کی چالبازیاں اس کے بالکل برعکس تھیں۔

یہودی طاعون کے چھوت پھرتے جراثیم ہیں

ان کے ہاں اخلاقی اور انسانی رذیل قسم کی طبیعت کے بکثرت عملی رائج تھے اتنا تو ان کی شکل سے ہی ظاہر تھا کہ وہ بدی کے نزدیک جانے سے بھی ڈرتے ہیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ بعض اوقات ان کی شکل دیکھے بغیر بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی تھی اس لیے وہ اس قوم کے جسم سے خود بو کے لپٹے نکلتے ہیں اس سے بار بار میری طبیعت متلی کرنے لگتی تھی علاوہ ازیں ان کے لباس سے بالعموم بدبو اور صورتوں سے رذالت ٹپکتی تھی۔

یہ سارا حلیہ بھی بدنظر نہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ہر آشنا کرنے والی بات یہ تھی کہ اس عادت کے تو دے کے پیچھے سے ایک وہ اخلاقی نقیصہ کا کیڑا رینگتا ہوا سامنے آجاتا تھا جس کو "بزدلی بقوم" کا نام دیا ہے۔

زندگی کے بعض شعبوں میں یہودیوں کی کرتوتیں بھی تک میرے لیے سربستہ راز تھیں مجھے آج تک ان کا کھوج لگانے کا موقعہ نہ ہوا تھا اب مجھے پتہ چلا کہ ان کارروائیوں کی بہت بڑی تہ کی متقاضی ہے کوئی سازش ہو کوئی بدی ایسی نہ تھی جس میں کم از کم کسی ایک یہودی کا ہاتھ نہ ہو بالخصوص تمدنی عیوب کے متعلق تو یہ قاعدہ کلیہ ہو بھی ثابت ہوا۔ جب کبھی اس قسم کے بھونڈے ہتھکنڈوں کو شغر سے دور کر دیا جاتا تو جس طرح متعفن دلدل میں بیماری کرم ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی نہ میں ضرور کوئی نہ کوئی ذلیل یہودی لقمہ تھا جو اپنے ہوں غیر متوقع طور پر نمودار ہو جانے سے یک طرح بوکھلا کر رہ جاتا۔

کرنے والوں کے نام ہی نہیں تو وہ سے تحقیق کرنے لگا۔ اس تحقیق کے نتائج میری اس رائے کی مزید تردید کرتے تھے جو میں نے آج تک یہود کے متعلق قائم کر رکھی تھی آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے دل کو کیسا ہی ناگوار کیوں نہ ہو مجھ کو عقل اپنے نتائج کو قبول کرنے کے لیے آزاد ہو گی۔

کیا وجہ ہے کہ اس میں سے کوئی شخص آج تک ایک آرٹ اور سائنس یا کسی قوم تصنیف کرتی ہے جس کی تعداد اس ملک میں ایک فیصدی بھی نہیں مگر کارخانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ تعلقات کو کون نہیں جانتا ہے صنعت جب خود سونے جاتے تو اسے تعلیم کرنے کے لیے اور کوئی چور نہیں رہتا۔ اب میں نے اسی حقیقت کی روشنی میں اپنے مرحوم شیخ ماسٹیر انہ رات کی بھی چھان بین شروع کی۔

میری نگاہ جتنی گہری جاتی تھی میرے دل میں ان انہ رات کی وقعت کم ہوتی جاتی تھی میں پہلے تعریف کیا کرتا تھا ان کی طرز تحریر سے میری نفرت بڑھتی جاتی تھی میں ان کے مقالہ کو کبھی اور نے جیا فقرہ دے کر ترک کر دینے کے لیے مجبور ہو گیا میری دوہری رائے سے مجھے خطرہ نظر آنے لگی کہ ان کی اطلاعات اور محاکمہ غیر جانبدار ہوتا ہے مجھے علم ہو چکا تھا کہ ان کے لکھنے والے یہودی ہیں۔

ہزار ہا تصنیفات جن پر پہلے کبھی میں نے دھیان بھی نہ دیا تھا اب مجھے تو جہ کے قابل نظر آنے لگیں کئی دنوں پہلے میں اور ہی روشنی میں دیکھ رہا تھا اب میں ان کی تہ تک پہنچنے لگا اور ان کا اصل مطلب سمجھنے لگا۔

انہ رات کی تحریری کی روش مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آنے لگی مجھ پر واضح ہو گیا کہ ان کا محض خالص کو ثبات سے جواب دینا اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے سادہ لیکن مخلص ناظرین کو دھوکہ میں ڈالنے کی غرض سے ہے۔ ان کی یہ عبارتی قابل نفرت تھی ہاں ان کی تنقید شاندار ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں ہمیشہ ان ہوں کی مذمت اور یہودی مقاصد کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔

ولیم جانی کے علاوہ اعلیٰ طبقے کی بیٹیوں اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کی باقاعدہ و شاخوانی مستقل مضامین تھے جب ہیلف کا حصہ عام یہ مضامین سے پر ہوتا اکثر شمارے ایسے پر مشتمل ہوتا تھا کہ بیشتر مجموعی ان اخبارات کی زبان میں نیم مکھیوں کا چھتا پایا جاتا تھا عام رویہ یہ تھا کہ رسموں کی تعمیل کھلے بندوں کی جاتی تھی، اور یقیناً جان بوجھ کر کی جاتی تھی۔

آخر وہ کیا غرض تھی جس کی بنا پر اخبارات نے ایسی پالیسی اختیار کر رکھی تھی؟ جوں جوں میں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی میرا ذہن بھٹکتا ہی گیا۔

یہودی بدی کا سرچشمہ ہیں

اس مرحلہ پر مجھے یہ اتفاقات قابل ذکر لگے کہ میں جلد ہی ایک نتیجہ پر پہنچ گیا وہ اتفاقات مختلف سطحوں میں قدم بقدم جو مسلسل وقوع پذیر ہو رہے تھے ان سب کا اصل منبع کھلے کا یہ سب ریشہ دوانیاں اخلاق و آداب کے چند مخصوص عام اصولوں کا نتیجہ تھیں یہودیوں کا یہ گروہ کثیر ان اصولوں پر کھلے بندوں عمل پیرا تھا اور اس لیے یہ اصول ان یہود سے منسوب کیے جا سکتے تھے یہاں پہنچ کر میں نے بازاروں میں جو مشاہدات کیے تھے وہ میرے کام آئے مجھے تحقیق ہو گیا کہ بدی کی حقیقت ہے کیا؟

ہمارے معاشرتی نظام کا ایک شعبہ صحت فروشی بھی ہے اس پیشہ میں ہر سطح کے لوگ فراہمی کرنے میں یہودی جو بات کرتے ہیں اس کا مطالعہ اس طرح واضح میں کیا جا سکتا تھا کہ ہم ہوٹل اس کی چند بدکاریوں کو چھوڑتے ہوئے مغربی حرم میں کسی اور جگہ نہیں کیا جا سکتا یہ چند سال کے بازار میں رات کو چلتے وقت جو بے اطمینان تجسس کرے یا کرے اسے ہر موڑ پر چند ناگفتنی واقعات کا مشاہدہ ہوتا تھا ان میں ان واقعات سے قطعاً لاعلم تھے ہاں جنگ عظیم کے دوران میں نہیں مشرقی محاذ پر ایسے مشاہدات کا موقعہ ملا موقعہ یہ تھا وہاں تو ایسے مشاہدات سے بچنا ہی ناممکن تھا۔

ب مجھے محقق ہوا کہ یہودی بے وفا، بے شرم اور بے رحم یہودی ہیں جو اس عظیم
ں شہر کے خواتین سے لطف اندوز ہونے میں بھی اپنی مخصوص چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں
پہلے دن میں مرنے کے قریب ہوں تک کا سب کیونکہ میرا جسم ختنہ ہو گیا تھا۔ جب میں اپنے
آپ میں آیا تو میرے ختنہ کی جگہ بہت تکلیف دہ تھی۔

ہمیں گمراہ کرنے والے یہودی ہیں

اس کے بعد مجھے مسئلہ یہود پر پہلو سے روشنی ڈالنے میں کوئی مزید توقف نہ تھا۔
نہیں نہیں۔ اب تو میں ایسا کرنے پر تل چکا تھا۔ الغرض میں نے آرٹ اور محبت کے
مختلف حلقوں اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہر جگہ یہود کا تعاقب شروع کر
دیا۔ اسی سلسلہ میں ایک بار میں نے انہیں ایک نئی جگہ دیکھا یا جہاں مجھے ان سے
ملاقات کی کوئی توقع نہ تھی۔ آخر کار مجھ پر یہ راز کھل ہی گیا کہ اشتراکیت کے کرتا دھرتا
سب یہودی ہیں۔ اس انکشاف کے بعد مجھے روشنی چاہیے تھی۔ میری ذہنی الجھن
ختم ہو چکی تھی۔

میں نے اپنے ساتھی مزدوروں سے تعلقات کے دوران میں یہ دیکھا کہ اکثر جب
ہو کرتا تھا کہ وہ ایک ہی مسئلہ کے متعلق کس قدر جلد جلد اپنے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی
چند دنوں میں اور کبھی تو چند گھنٹوں میں ہی ان کے خیالات یکسر بدل ہوتے تھے۔
میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جو لوگ اکثریتی حیثیت میں برسر اقتدار ہوتے ہیں وقت اچھے
خاصے معقول نظر آتے ہیں۔ ہوں ہی وہ بھاگتی رتھ میں کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو کیوں
ان کے ہوش اڑنے جاتے ہیں۔ ان کی کیفیت دیکھ کر ایک دفعہ تو انسان قریب قریب
مایوس ہو جاتا تھا میں ان سے گھنٹوں جھگڑتا رہتا۔ اور جب میں برہم ہو کر انہیں لاجواب
کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لیکن دوسرے روز میں کیا دیکھتا کہ
میری ساری محنت اکارت جا چکی ہوتی تھی۔ یہ خیال کرنے سے دل بیٹھ جاتا کہ اب
انہیں پھر از سر نو تبدیل کرنا ہوگا۔ وہ ہمیشہ کولہو کے بیل کی طرح اپنی اختتام راستے کی طرف

بار بار دہرائی جاتی تھی۔

یہودی ہماری فطرت مسخ کرنے پر مامور ہیں

آخر کار مجھے ان کی مجبوریوں کا علم ہوا۔ وہ اپنی حالت زار سے بیزار تھے اور جب طبیعتوں سے مجبور ہوتے تو قسمت کو کوسنا شروع کر دیتے تھے۔ انہیں اپنے آقاؤں سے نفرت تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ آقا انہیں اپنی زندگی کے ہر شعبے میں عذاب کے بے بھاؤ شوق کے نظر آتا تھا۔ سرکاری افسروں کو وہ آکڑ کا بیان سناتے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ یہ طبقہ مزدوروں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ اگر حالات زندگی بہتر بنانے کے لئے وہ ہڑتال کرتے تھے۔ اور حقوق کے مطالبے کرتے تھے یا اپنے بارے میں ہلڑ مچاتے تھے یہاں تک کہ غریب مزدوروں کی تمام حرکات کے پیچھے بھی معقول وجوہات موجود تھیں لیکن جو بات حاکم طبقہ سے برداشت نہ ہو پاتی تھی وہ یہ کہ وہ اپنے جیسے دوسرے شہریوں کے متعلق کیوں ایسی شدید نفرت رکھتے تھے۔ وہ خود اپنی قوم کی تذلیل کیوں کرتے تھے وہ اپنی قومی عظمت کا مضحکہ کیوں اڑاتے تھے وہ کیوں اپنی قومی تاریخ پر پھبتیاں کستے تھے وہ کیوں اپنی قوم کے اعلیٰ ترین مشاہیر پر گندگی اچھالتے تھے۔

اپنے ایک دوست اور ایک پوسٹ کے بھائیوں سے، اپنی تعلیم گاہ سے اور اپنے گھر بار سے ان کی یہ مغائرت جتنی خلاف عقل تھی اتنی ہی قابل فہم بھی تھی۔ ان کا یہ طرز عمل نفسیاتی علاج کا متقاضی تھا۔

یہ مرض عارضی طور پر دور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسی شفا چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی مہمان ہوتی تھی۔ اس کے بعد ان خواص کے متعلق جنہوں نے ان کو قابل معلوں کیا ہے۔ وہ پھر پہلے جیسے ہو جاتے تھے یہ خلاف فطرت رد عمل انہیں ارسطو سے ورثہ میں ملا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ اشتراکی نظریات بالعموم یہودیوں کے ذہن کی اختراع ہیں۔ اصل

دل میں نے اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ دوسرے اخبارات کا بھی یہی حال تھا تاہم اس سلسلہ میں ایک بات قابل توجہ تھی وہ یہ کہ ان اخبارات پر یہودیوں کا تسلط تھا ان میں سے کسی کی پالیسی قومی نہ تھی اگر چہ ایسے اخبارات بظاہر قومیت کا ڈھونگ رچاتے بھی تھے تو ان کے نزدیک قومیت کا مفہوم وہ نہ تھا جو میری تربیت اور عقائد نے میرے دل پر نقش کر دیا تھا۔

ہر فساد کی جڑ یہودی ہیں

اگر چہ دل تو دہل رہا تھا مگر میں نے طبیعت پر جبر کر کے مارکس ازم کے حامی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین پڑھنے شروع کیے اس مطالعہ سے میری پہلی نفرت میں دو چند اضافہ ہو گیا۔ اب میں نے ان لوگوں کے متعلق تحقیق شروع کی جو ان شر انگیز تحریرات کو شائع کرتے تھے ناشر سے لے کر [illegible] تک وہ سب کے سب یا چھوٹے بڑے سے کل یہودی تھے۔ میں نے مارکس ازم کے لیڈروں کے ناموں پر غور کیا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ سب کے سب "برگزیدہ قوم" کے افراد ہیں۔ [illegible] میں اشتراکیوں کے نمائندوں اور ٹریڈ یونینوں کے سیکرٹریوں سے لے کر بازار میں شور کرنے والوں تک ہر جگہ وہی منحوس صورت سامنے آتی تھی۔ میں ان ناموں کی فہرست کبھی نہ بھولوں گا۔ آسٹرلز، ڈیوڈ، ایڈلر، [illegible] ایک بات تو مجھ پر بالکل واضح ہو گئی۔ وہ یہ کہ اس شہر کی پارٹی کے وہی نمائندے جن سے میں کئی ماہ سے جھگڑ رہا تھا۔ اس کی قیادت ایک غیر ملکی کے ہاتھ میں ہے۔ آخر کار جب مجھے تحقیق ہو گیا کہ یہودی ہم وطنوں میں شامل نہیں تو میرا دل مسرت سے ناچ اٹھا۔

جب انجام کار مجھے پتہ چل گیا کہ عوام کو گمراہ کرنے والی روح خبیثہ کون ہیں۔ مجھے سکون آ گیا۔ ایک ہی سال گزرا ہو گا کہ مجھ پر حسب ذیل حقیقت روشن ہو گئی۔ کوئی مزدور اپنے پہلے عقائد پر اس طرح راسخ نہیں ہوتا کہ اگر اس کے سامنے دلائل صحیح اور بہتر دلائل اور تشریح بطریق احسن پیش کی جائیں تو وہ [illegible] اپنی ہٹ چھوڑ نے

[illegible]

ہو آمادہ ہو۔ رفتہ رفتہ میں مارکس ازم کے اصولوں کا ماہر ہو گیا۔ اور اس مہارت کی مدد سے خود اپنے عقائد کو گوں کو منوانے کا کام لینے لگا۔ میں قریب قریب ہر موقعہ پر کامیاب ہوتا تھا۔ "حاملۃ الناس کی اکثریت کو ان ہو ہم مغالطہ سے بہکایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے پورے صبر و وقت کی ضرورت ہے۔"

برخلاف اس کے ایک یہودی کے عقائد پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ وہ کبھی دغا نہیں دیتے۔

یہودی ہمیشہ یہودی رہتا ہے

ان دنوں میری سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ میں یہودیوں پر بھی ان کے عقائد کی یہودیت کا ثابت کرنے میں کوشاں رہا کرتا تھا۔ اپنے ہفتہ وار ہفتہ میں اس مضمون کو بھانے کھیلنے میرا کام یہی ہوتا تھا اور سرد کرتے رہتا۔ میرا خیال تھا کہ میں دلائل سے ان پر مارکس ازم کے وہ خالص تو ضرور واضح کر دوں گا جو اس کے ساتھ ازم و مظلوم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن میری کوششوں کا نتیجہ ان کے بالکل الٹ ہوتا تھا۔ یہ ظاہر آتا تھا کہ جوں ان پر مارکس ازم کے اصول اور اس کے عمل کے تباہ کن اثرات منکشف ہوتے جاتے ہیں ان کی ہمت دھری ہو جاتی تھی۔

جتنا مجھے یہودیوں سے بحث کرنے کا اتفاق ہوتا اتنا ہی میں ان کے منطقی حیلوں سے واقف ہوتا جاتا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنے مدعا قابل کی ناگہانی سے خائف ہو جانے کی کوشش کرتے لیکن پھر جب وہ خود بے بس ہو جاتے کہ چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تو اس وقت وہ یہ چال چلتے کہ بالکل معصوم ہو جاتے۔ واقف ان جیتے کر باوجود منطقی چالبازیوں کے پھر بھی ناکامی ہوتی تو وہ یہ ظاہر کرنے کہ گویا خطاب کے دلائل ان کی سمجھ سے باہر ہیں اور اس طرح ایک نئی بحث چھیڑ دیتے۔ "مارکس ازم یا اقتصادی مادیت" ہوئی باتوں سے کیا جاتا۔ پھر جب انہیں تسلیم کر لیا جاتا تو یک لخت ان کا انداز ایسے مسائل و معاملات پر ہونے لگتا جن کا مارکس ازم کی گفتگو سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

کرنا عجیب حرکت ہوتو وہ ان کی جائے تو وہ پھر بھی کہتے تھے غرض کہیں کسی ایک معین اصول کا پابند کرنا ممکن نہ تھا۔ جو بھی ان معلمین کو کہیں ہاتھ میں مضبوط طور پر پکڑنے کی کوشش کی جاتی۔ وہ چھلاوے کی طرح پہلو سے نکل جاتے اور پھر ذرا سے فاصلہ پر ٹھوک کر سامنے آ کھڑے ہوتے۔ گر پاس دوسرے لوگ بھی بیٹھے ہوں تو ٹرمائرمی تمہاری بات مانی ہی جائے اور تمہیں قبول ہو جائے کہ بس میدان مار لیا ہے تو دوسرے روز تمہارے پہنچ جانے کا سارا مزہ کرکرا رہتا تھا پہلوی پہلے ان کی سرگذشت سے صاف کر دیتے گا۔ اور پھر وہی اپنی راگنی (پلی) شروع کر دے گا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں اگر کبھی غلطی نہ آ جائے اور تم اسے گزشتہ روز کی شکست یاد دلاؤ تو وہ متعجب ہو کر کہے گا مجھے تو یہی یاد ہے کہ میں نے کل ہی اپنے دعوے کی سچائی ثابت کر دی تھی۔ بعض اوقات تو غصہ اور جھنجھلاہٹ کے باعث میری زبان بند ہو جاتی تھی میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا مجھے ان کی حماقت سے زیادہ تعجب ہوتا تھا یا وہ بیک وقت دیکھ کر زیادہ حیرانی ہوتی تھی جس سے وہ اپنی دروغ گوئی پر دوام دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں ان سے بیزار ہو گیا۔

بدکار سے بدآموز بہتر ہوتا ہے

تاہم ان تجربات کا ایک اچھا نتیجہ بھی ہوا۔ جس قدر مجھے اشتراکیت کے لیڈروں اور معلمین سے واقفیت ہوتی گئی اسی قدر میرے دل میں اپنی قوم کی محبت بڑھتی گئی۔ ان واقعات و مصائب کی شیطانی مہارت دیکھ کر ان کے مرتکب لیڈروں کو کوئی الزام نہ دیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی بمشکل اس نسل کی مخلوق سے علیحدہ ہو سکتا تھا۔ ایسی قوم کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش فضول تھی۔ وہ تو دلائل چٹ کر جھوٹ ہضم کر لیتے تھے بھی کچھ کہتے بھی کچھ کرتے۔ اور وہ اس مادہ میں اپنے مطلب کے پیچھے ہوتی تو بھی کسی بات کو ہضم کر لیتے۔ کہیں کہیں ایسوسی ایشن سے بھی واقفیت ہوئی تو ہر دوروں کو قابل معافی محسوس کرتا تھا۔

میری رائے میں بدترین گروہ مزدوروں کا تھا۔ وہ لوگ تھے جو اپنے ایک خون اور

گیا ہے۔ اس کے بھائیوں سے اسکی رنجش کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کے خون کے پیاسے تھے بلکہ وہ اس کی نیکی کے جذبے سے بھی خوف کھاتے تھے جو ان کے نزدیک انصاف نہیں مانگتا بلکہ ان کا فرض تھا کہ یہ تفوق دور کرتے اور ساتھ ہی ساتھ مظلوموں کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر ان کو بلند کر دیتے۔

اصلاح کے لیے صرف عقل نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے

ہنری فورڈ سے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے خود ہنری فورڈ کی تعلیمات کے سرچشمہ کی پوری پوری تحقیق کرنے کی ٹھانی۔ اس کی دولتمندی کارگزاریوں و شخصیت میرے سامنے تھیں۔ اتفاق سے مشاہدہ کرنے کے باعث اس کی روزانہ ترقی مجھے صاف نظر آتی تھی۔ فورڈ کیلئے پھولوں کا ہار لیکر اس کے آنے والی سالگرہ کی مشینیں کوئی بھی کی جا سکتی تھی۔ یہ صرف ایک سوال باقی رہ جاتا تھا وہ یہ کہ آیا ان مقامات کے بانی ان سالگرہ سے واقف تھے جو آج ان کی تعلیمات کے اثر سے خاکبار ہو رہے ہیں یا خود وہ بھی کسی مغالطہ کا شکار تھے میرے نزدیک دونوں ممکنات میں سے کسی ایک کو بھی کسی طرح ترجیح حاصل نہ تھی۔

اگر دوسری بات بھی نکلتی تب تو ہر صحیح العقل شخص کا فرض صرف یہ تھا کہ وہ اس نامور کے تحریک کا مقابلہ کرے۔ اور اس کے نتائج کا تدارک کرے۔ برخلاف اس کے اگر پہلی بات ہی ثابت ہوتی تو ہمارے لئے کار آج جو تمام قوم عالم کو لاحق ہو رہا ہے اس کے وجود یقیناً مسلم ہوتا۔ ان میں اس جماعت کی ریشہ دوانیاں یقیناً ایک روز تمام بنی انسانی کا ماتم کرائیں گی اور اس دنیا کو تباہ و برباد کر دیں گی اس کا خاکہ ہرگز کسی انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ بلکہ ضرورت کسی فرض انسانی کی کوشش کی پیدا ہے۔

اگر صورت یہ ہو تو صرف ایک ہی علاج باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کوئی اعلیٰ مقصد کی خاطر اٹھ کر اس جنگ میں ہر اس ہتھیار سے کام لیا جائے جو انسانی جسم و دماغ کو ہلاک کرنے کے لیے مہیا کر سکے تیغ قسمت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ اس کے

حق میں فیصلہ کردے وہی کامیاب سمجھا جائے۔

غرض اب میں نے اس تحریک کے اصول سمجھنے کی خاطر شرکت کی ہمت و طبیعت بہم پہنچانی شروع کی میں اس مقصد میں کوئی توقعات سے بھی پہلے کامیاب ہو گیا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اب میں مسئلہ یہود میں کوئی بصیرت حاصل کر چکا تھا۔ ورنہ قبل ازیں تو اس مسئلہ میں میرا ذہن خلط ملط تھا۔ یہ صرف اس بصیرت کا نتیجہ تھا کہ میں فی الواقع حقیقت حال اور شرکت کے مابین اختلاف کے اصول میں آنے والے فرق میں کوئی تمیز کر سکا۔ مجھے علم تھا کہ یہودی الفاظ کو محض زینت سازی اور اپنے خیالات پر پردہ ڈالنے کی نیت سے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حقیقی مقاصد اس کے اقوال سے معلوم نہیں کیے جا سکتے۔ بلکہ اس کے طریقے بھی کو محض اپنی بصیرت سے سمجھا جا سکتا ہے اس انکشاف نے میرے اندر ایک نیا انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اس کا مجھے آج تک فخر ہے ہوا تھا۔ میں ایک زبردست اور صحیح عمل انسان کے ہونے کی سماعت کا کردار بن گیا۔

کیا یہود کا مقابلہ ممکن بھی ہے؟

اس کے بعد میرے لیے صرف ایک قدم باقی رہ گیا۔ یہ میری قدرت سے تھا۔ یہ میری وسعت تھا کہ مختلف خیالات کی کھچڑی نے مجھے گہرے تفکرات میں ڈال دیا۔

جب میں تاریخ عالم کی طویل لمبی داستان میں اس قوم یہود کی کارگذاریوں کا مطالعہ کرتا تو میں پریشان ہو کر اپنے آپ سے سوال کرتا کہ کیا محض تخیل تحقیق واقعات کی بنا پر جو ہم سمجھی جاتی ہو، خارجی مخلوق کی سمجھ سے باہر ہیں انکو بھی کسی فیصلہ تک نہیں کر سکی کہ آخری فتح اس قوم کی ہوگی جو ہر قوم کے ہم سمجھی جائے گی؟ کیا یہ وہ قوم ہے جس کے حصہ میں تو نہیں آئی جو ہمیشہ سے "ارض موعود" کے گھر سے پھینکی گئی ہے؟ کیا اور اپنی حفاظت کے لیے لڑنا کسی حقیقت پر مبنی ہے یا محض وہم و خیال کی ہوس ہے۔

تھا۔ اس سوال کا جواب مجھے خود میسر کر دیا۔ وہ یوں کہ تھیوڈر نے میری راہنمائی کی اور میں نے خالی الذہن ہو کر مارکس ازم کی تعلیمات اور مسائل میں یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا پورا پورا جائزہ لیا۔

مارکس ازم یہود کا فلسفہ ہے

مارکس ازم کا عقیدہ یہودیوں کی بجائے یہ عقیدہ فطرت کے قوانین مثلاً مراتب کو ترک کر کے اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے جبر و تشدد مسلط کر دینا چاہتا ہے اس کی خواہش ہے کہ کائنات خدا و رسول جن و حور کا تقدس ختم کر دیا جائے۔ انسانی شخصیت کی انفرادی قدر و قیمت اور قوم و ملک کی بنیادی اہمیت یہاں بالکل وقعت ہی نہیں رکھتی۔ بلکہ ان کی مخالفت کی جاتی ہے ایسا کرنے سے یہ عقیدہ اصل و تہذیب انسانی کی جڑ کاٹتا ہے۔ اگر کائنات کا نظام مارکس ازم کی تعلیمات کے مطابق کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ نظم و اتفاق کی کوئی ایسی صورت برقرار نہ رہے جسے انسان کا دماغ تصور کر سکتا ہے۔ ان کا قانون اس کارخانہ کو تباہ کر دے گا جس کا دماغ انسانی عالم علم سے وجود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کروڑوں کے باشندے ہلاک ہو جائیں گے۔

میں نے یہود کے مقابلہ کا تہیہ کر لیا

اگر یہودی مارکس ازم کی تعلیمات کی مدد سے اس دنیا کے رہنے والوں پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی بادشاہت کا آغاز ہو کر ہمیشہ قائم رہے گا۔ اور یہ کرۂ ارض جس طرح کروڑوں سال پہلے اصل انسانی کے بغیر فضاؤں میں گردش کرتا تھا اسی طرح پھر گردش کرنے لگے گا۔

ان وجوہات کی بنا پر آج مجھے یقین کامل ہو چکا ہے کہ میری کوششوں میں اس قادر مطلق کی مدد شامل حال ہے۔ اس نے یہ کائنات بنائی میرا یہود کے مقابلہ میں یہ انسانی کے فرائض سرانجام دینا خود کارخانہ قدرت کی حفاظت میں جنگ لڑنے کے مترادف ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب سوم :: قیام ہوائی سے اخذ کردہ سیاسی افکار کس عمر میں لیڈری اختیار کرنی چاہیے

تیس سال کی عمر سے پہلے کسی شخص کو عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو فطرت نے غیر معمولی سیاسی قابلیت بخشی ہو انہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ رکھنا چاہیے گا۔ کم از کم فی زمانہ میری رائے یہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص تیس سال یا اس کے لگ بھگ عمر کا نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس کی دماغی نشوونما زیادہ تر قابلیت حاصل کرنے اور اس علم میں سے بے بھلے کی تمیز کرنے تک محدود رہتی ہے روزمرہ کے سیاسی مسائل کو جانچنے اور پرکھنے کے متعلق کسی واضح رائے اختیار کرنے کے لیے یہ قابلیت اس کی تحقیق اور ہے۔ جب انسان یہ مرحلہ طے کر لے تو پھر وہ گویا ایک ایسی نشست پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں سے تمام سیاسی دنیا اس کے سامنے آ جاتی ہے پہلے اپنے ذہن میں عملی اخلاقی اصولوں کا ایک قرار جمع کرنا چاہیے پھر ان اصولوں کو باہم ترتیب دینی چاہیے یہ ترتیب ایسی ہونی چاہیے کہ زندگی کے متعلق شخصی نظریات اور نظریات ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کر لیں۔ گویا ایک مکمل ضابطہ حیات بن جائے۔ ان مدارج کو طے کر لینے کے بعد یہ شخص ان دماغی ہتھیاروں سے مسلح ہو جائے گا جن کے بغیر ہر روز کے مخصوص حالات کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ علاوہ ازیں اب اس میں وہ اوصاف بھی پیدا ہو چکے ہوں گے جو سیاسی عقائد اختیار کرتے وقت استقلال اور تسلسل برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ ایسے شخص کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے وہ سیاسی رہبری میں اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے مطلوبہ لیاقت حاصل کر چکا ہے۔

[illegible] حد تک ترقی کر جاتا ہے۔

پیشہ ور ایم این اے

یہ شخص کہیں پارلیمنٹ کا ممبر بن جائے تو ہر شریف انسان کی بدقسمتی ہے [illegible] [illegible] ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک تمام سیاسی جدوجہد کا [illegible] صرف یہ ہے کہ خود اس کا کچھ رزق کسی طرح سے حاصل ہو جائے۔ اس کا اور اس کے خاندان کا ذریعہ معاش یہی ممبری ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

یہ [illegible]

لیڈری اور چند بنیادی اصولوں کا تعلق

یہ ظاہر ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہے مستقل لگی ہوئی ہے۔ وہ وہ نئے نظریات کو بھی اپنے ڈھنگ پر اگر جذب کر لیتا ہے تو اس سے اس کا اقتدار اور بڑھ جاتا ہے۔ اس ارتقا کی مثال بالکل جسمانی نشوونما کی سی ہے۔ فرض مقننہ کو اس کارروائی سے یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ جس عقائد پر ایمان رکھتے ہیں ان میں مسلسل ترقی ہوتی ہے ان کی نظروں میں اس ترقی کا ہر مرحلہ ایک تازہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ آج تک جس عقائد کی تقلید کرتے رہے ہیں وہ فی الواقع صحیح ہیں۔

ناکام قیادت کیلئے آبرومندانہ راستہ

جب کوئی لیڈر اپنے سابق علی و عملی اصولوں کی بابت تسلیم کر لے کہ ان کی بنا غلط تھی۔ اس اس وجہ سے کے متعلق مزید وعظ و تلقین ترک کر لے پر مجبور ہو جائے تو اس حالت میں اس کے لیے صرف ایک ہی آبرومندانہ راستہ کھلا ہے۔ وہ راستہ یہ ہے کہ اسے اپنے سابق عقائد کے لیے پوری سرگرمی سے کوشش کرنی چاہیے۔ اسے عقائد کے لیے کسی سیاسی کارروائی میں پبلک طور پر حصہ لینا چاہیے۔ جب ایک لیڈر وہ اصول غلط کر چکا ہے تو یہ ممکن ہے پھر بھی کہیں ٹھوکر کھائے۔ بہرحال اب اسے اپنے ہمقوموں سے یہ توقع رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ پہلے کی طرح اس کی پشت پناہی جاری رکھیں۔

دوسرے آنکل کے لیڈروں کو یہ راستہ اختیار کرنا ہرگز پسند نہیں۔ اس کا ثبوت اس مسلسل کی عام و عملیاں میں ہوتی رہتا ہے آپ کو سیاسی قیادت پر مامور تصور کرتی ہے۔ ساری مسلسل میں ایک شخص بھی تو ایسا نہیں جو یہ کام سنبھالنے کے قابل ہو۔

میں نے لوگوں کو قائل کرنے کا ڈھب سیکھا

اگرچہ میں ان دنوں دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں سیاسی مسائل پر غور کرنے میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ پھر بھی میں نے کھلے طور پر سیاسیات میں حصہ لینے سے پوری احتیاط کے ساتھ احتراز کیا۔ جو امور ہمیشہ مجھ پر مسلط رہتے تھے یا جو سوالات میرے دماغ میں ہلچل مچا رکھتے تھے۔ ان کا ذکر میں صرف ایک محدود حلقہ کے سامنے کیا کرتا

تھا۔ اپنے علاقہ کے اندر وہ ہر مسائل پر بحث کرنے سے کبھی کامیاب تھے مجھے لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ عکس اس کے میں نے اپنے گرد و پیش بیٹھنے والوں کے خیالات و عقائد کو تول کر لیں آہستہ آہستہ اپنے ذہن کے سانچے میں ڈھالنا سیکھا ہے۔ اگر ان کے خیالات و عقائد بالکل مورد قبا نوی ہوتے تھے اس طرح میں نے ہر ممکن طریقہ کا مکمل اٹھائے ہوئے انسانی نفسیات کے متعلق واقفیت بہم پہنچانی شروع کی۔ اس قسم کے مطالعہ کے لیے وہ علاقہ سے زیادہ مناسب مقام تمام آسٹریا میں نہ تھا۔

آسٹریا کی سلطنت سیاست کی لیبارٹری تھی

ان دنوں یہ بھی سوچ بچار کا دور تھا۔ آسٹریا میں زیادہ وسیع تھا۔ علاوہ ازیں یہاں یہ بھی سہولت تھی کہ یورپ میں ہر شخص ہر ملک و علاقہ کے سیاسی حالات سے اس قاعدہ سے مستعد رکھتے ہیں۔ جب میں اس ضمن میں آسٹریا کا ذکر کرتا ہوں تو میری مراد اس عظیم الشان سلطنت کے اس حصہ سے ہوتی ہے جہاں جرمنوں کی آبادی غالب تھی۔ یہ حصہ اس سلطنت کا گہوارہ تھا۔ یہیں کے باشندے صدیوں سے سلطنت کی نگاہ زندگی کا عنصر رہے تھے۔ ورنہ آسٹریا کا سیاسی نظام قطعاً بودا تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا، سلطنت کے وجود و استحکام کا انحصار زیادہ سے زیادہ جرمنوں پر تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جرمن شہنشاہوں ہی کی سلطنت تھی روح رواں تھے۔

سلطنت میں دارالحکومت کی اہمیت

جو صوبے دارالسلطنت سے وابستہ تھے وہ سلطنت میں نمک کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی نمک تھا جو تمام سیاسی و ثقافتی نظام میں دوڑتے خون کو قائم رکھتا تھا۔ اسی دوڑتے خون سے اس نظام کی زندگی وابستہ تھی۔ اگر وہ نمک تھا تو وہ کانٹا دار تھا جو قوت ارادی کا قائم مقام تھا۔ اس دور میں وہ ایک مضبوط چٹان سے قوت ثابتہ پر جمود طاری تھا۔ یہ اسی شہر کا سایہ دور تھا۔ جس کے زور سے آسٹریا میں رہنے والی مختلف اقوام کی شیرازہ بندی قائم تھی۔ اس کا حسن ہاتھوں دیکھ کر انسان اس تمام مملکت کو فراموش کر بیٹھتا

تھا۔ جو سلطنت کثیریت کھوئی کیوں کہ اس کشادگی کے آثار دیکھنے سے طبیعت پر طاری ہو جاتی تھی۔

اگرچہ مذہبی طور پر سلطنت کو مختلف قوموں کی طرف سے کشمکش کمی کی طرح کھا چکی تھی۔ پھر بھی دیا کو دریا خصوص رومی کو محض دنیا کی اکثریت تصور ہی نظر آتی تھی۔ یہ اس لیے ہوتا کہ بظاہر دنیا کی شان و شوکت بجائے عروج تک پہنچ چکی تھی ہوں تو آسٹریا کے قدیمی شہنشاہوں کی یہ راجدھانی ہیبت سے قابل حترام تھی لیکن اب اس شہر کا انتظام ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھا جسے بدولت اور محلداری کا بیحد معمولی ملکہ حاصل تھا۔ اس کی جالکاریوں سے دنیا کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ کی رونق آگئی۔ یہ شخص مشرقی میں رہنے والے ترکوں کے اندر آئی تھا۔ سیاست دان ہونے کے جو معنی سرکاری حلقوں میں لیے جاتے ہیں ان معنوں میں وہ "سیاستدان" نہ تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر کارل ورکر تھا۔ وہ کاروبار حکومت اور شہری نظام کا تو پہلے سے ماہر تھا۔ لیکن ڈاکٹر کارل ورکر نے اس کے شہری نظم و نسق کو کیا اقتصادی لحاظ سے اور کیا تمدنی حالت سے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ تمام سلطنت کا قلب ایک نئی طاقت سے حرکت کرنے لگا۔ اس طرح اس شخص نے اپنے آپ کو اس زمانہ کے "مدبروں" سے بڑا اور بہتر ثابت کر دیا۔

مختلف قومیں ایک سلطنت میں نہیں رہ سکتیں

آسٹریا کا سیاسی نظام مختلف نسلوں سے مرکب تھا۔ اگر یہ نظام آئندہ کارآمد ہو گیا تو اس سے مشرقی میں رہنے والے ترکوں کی سیاسی نا قابلیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ دنیا کی تاریخ خود صورت حالات کی ذمہ داری میں مضمر تھا۔ ایک روز انسان کسی بھی سلطنت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس کے برخلاف کروڑہا شدے مختلف اور باہم مخاصمت رکھنے والی قوموں پر مشتمل ہوں۔ یہ ممکن ہونے کے لیے چند خاص شرطیں پہلے سے پوری ہونی چاہئیں اور ان شرطوں کا پورا کرنا بھی کارگر ہو سکتا ہے جب ان کا فائدہ اٹھانے کے

ہے وقت باقی ہو۔

آسٹریا میں رہنے والے ترکوں کی اہمیت اس وقت تھی وہ ایک مقیم اقلیت کی حیثیت سے سلطنت کے اندر رہائش کے عادی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان ذمہ داریوں کو خوب محسوس کرتے تھے جو ایسی صورت حالات میں ان پر عائد ہوتی تھیں۔ آسٹریا کی سلطنت میں صرف ترکوں ہی کو وفادار نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ شاہ کے ذلیل مقصد کی خاطر ان سے ہر وقت کام لیا جاتا تھا اور تمام سلطنت کو بحیثیت مجموعی نظر رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سلطنت کے اندرونی حصے سے وابستہ رہتے ہوئے اس افتادگی میں سے انہیں ایک زبردست مہم درپیش ہوئی۔ انہوں نے اس مہم کو سنبھالنے کے لیے جس تیزی کی کوشش شروع کر دی۔ وہ مہم یہ تھی کہ ان کے ہم مذہب اہل مشرق سے استفادہ کر کے ذخیرہ حاصل کرنے کے قابل رکھا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آسٹریا میں رہنے والے ترک اپنی ساری طاقت اس مہم پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے بیشتر ترکے اور دولت اپنے وطن میں رہنے والے بھائیوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ غرض گھر کی ذمہ داریوں سنبھالنے کے لیے انہیں فقط اپنی باقی قوت سے کام لینا پڑتا تھا۔

مقیم آسٹریا میں رہنے والے ترکوں کی دو حیثیتیں نظر آتی تھیں۔ ان کے تجارتی مال و متاع قریب قریب اس محل مرکب سلطنت کے تمام حلقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کم و بیش تمام اہم کاروبار ان کے ہاتھ میں تھے۔ سلطنت کے بیشتر اعلیٰ صنعتی ماہرین اور دفتری ملازم ترک تھے۔ ملک کی خانہ جنگی کا بڑا حصہ بوسنیا کے قبضہ میں تھا۔ لیکن باقی کے مالک ترک تھے۔ آسٹریا کی سلطنت کی سیاسی تیز رفتاری کا پتہ ترکوں کے دوسرے وابستہ تھی۔ آسٹریا ترکوں کے عسکری فرائض انہیں ان کے خانگی معاملات سے بہت دور تک لے جاتے تھے۔ فرض کیجیے ایک گھرانے کی کسی رجمنٹ کا افسر، ہنگری کا رہنے والا ہو، وہ اپنا وقت لے کر کالیشیا تک کہیں ہو جائے۔ بیشتر ترک کے شاہی فوج کی فوج میں اسی تک ترکوں افسروں کا عنصر غالب تھا۔ علی ہذا القیاس دفتری ملازمین

کے باوجود ان طبقوں میں بھی یہی کیفیت تھی۔ آسٹریا اور ہنگری دونوں زمینوں کے قبضہ میں تھے۔ سوائے آسٹریا کے ان کے لوگوں کے دل پر گمان ہوتا تھا۔ کہ کسی عارضی قید نے تیار کیے ہیں۔ باقی تمام جگہ فی الفور زمینوں کا مرہون منت تھا۔ موسیقی تعبیرات تک تزئین اور مصوری۔ ان سب فنون میں وہ ہمارے سلطنت کو پیرائے کرتا تھا۔ اور پھر بھی اس نے شہنشاہ کا شکر ادا کرنا ہوتا تھا۔ سلطنت کی تجارتی حکمت عملی بھی جرمن عنصر کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں سنگری کے باشندوں کی ایک قلیل تعداد تھی اور اس میدان میں سامنے تھی۔

تاہم اس سلطنت کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے تمام کوششیں بے سود تھیں۔ جب تک کہ اس مقصد کی خاطر ان قوموں کا پیچھے سے پورا کیا جا رہا ہے وہ مفقود تھیں۔

مختلف اقوام کے باہمی تعلق پر کام کیا جائے اور ان کی آزمائش قوتوں کا اندازہ کرنے کا صرف ایک ہی ممکن ذریعہ تھا۔ وہ ذریعہ یہ تھا کہ آسٹریا کی حکومت اور اس کے داخلی نظام کو جمہوریت کے اصول پر ڈھالا جائے۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ ایسا نہ تھا جس سے اس سلطنت کا وجود برقرار رکھا جا سکتا۔

جرمنی اور آسٹریا کی سیاسی ہیئت ترکیبی میں فرق

کاؤنٹ تھون کی کے لیے روشنی کے مینار نظر آتے تھے۔ اس کے ہم وطن میں دیار کے اعلیٰ حلقوں کو بھی مندرجہ بالا حقیقت کا احساس ہوتا۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر اس حقیقت کو بھول جاتے یا محو فراموش کر دیتے کیونکہ اس پر عمل درآمد کرنے میں کوئی مشکلات درپیش تھیں جس کو یہ کہا جائے تو یہ ہو کہ سلطنت کو زیادہ مستحکم کر دیا جائے۔ وہ ضرورت سے آگاہ تھی مگر یہ کہ مرکز میں کوئی ایسی مضبوط طاقت نہ تھی جو سلطنت کے تمام اجزاء کو یکجا رکھنے کے لیے کافی اختیارات حاصل ہوں۔ اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ آسٹریا کے علاوہ اس سلطنت سے قطعاً علیحدہ تھے اس کی بنیاد قرن میں اسماک نے رکھی تھی جرمن کا صرف یہی ایک کارنامہ نہ تھا کہ سیاسی روایات کو نئے

سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ ورنہ اسمارک کے زمانہ میں کل جرمنی کی تعداد اس سے پہلے سے ہی بیک تھی۔ جرمن سلطنت کے تمام حصوں کا ایک ہی نسل اور قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر کچھ اختلاف تھا بھی تو بالکل معمولی سا۔

آسٹریا کی قومی تقسیم اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس سلطنت میں جتنے بھی ملک داخل تھے ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اپنی شاندار ماضی کی روایات پر ناز کر سکتا۔ صرف ہنگری کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ اگر کسی ملک کی سابق روایات شاندار نہیں بھی تو کہیں مستند زمانہ نے بالکل دھندلا دیا تھا یا یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ ہونے کے برابر تھیں یا وہ اس وقت تک کہ قومیت کے اصول کا پرچار ہونا شروع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف اقوام ہاتھ پیر مارنے کے باوجود تھیں ہی میں قومی احساس پیدا ہونے لگا۔ ان نو انجینیقومی جماعتوں کو قابو میں رکھنا نہایت مشکل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کی حدود کے پہلو بہ پہلو ہی قومی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں جن کے باشندے انہیں لوگوں سے تعلق رکھتے تھے جو خاندان ہیپسبرگ کی سلطنت میں آباد تھیں۔ رفتہ رفتہ آسٹریا کے اندر بھی ان ہی حکومتوں کا رسوخ جرمن عنصر کے خلاف اور بھی غالب آنا شروع ہو گیا۔

اس طرح ایک بڑی جنگ کا آغاز ہوا جس میں ہنگاری زیادہ عرصہ تک حصہ دار نہ رہ سکا۔ پہلے ہنگاری کے مقابلہ میں بوہیمیا بھی برابر کا درجہ حکومت قرار پایا۔ یہ ایک ایسا طریق تھا جو سلطنت کے دو اہم ارکان کو برابر رکھنے کے لیے ایک طریق کی حمایت پر تھا ہوا تھا۔ تھوڑا عرصہ بعد یہ بیک بھی ہنگاری کی طرح مساوی درجہ کا دار الحکومت بن گیا۔ اب وہ کارنتھیا، کرنٹ، ٹی رول، وغیرہ وسیع علاقوں سے تیسرے درجہ کے دار الحکومت قرار پا گئے۔ یہ تمام شہر پہلے صوبائی مراکز تھے۔ اب ان میں سے ہر ایک جداگانہ دار الحکومت بنا دیا گیا تو ان سے جو جداگانہ قومی اکھاڑے قائم ہو گئے ان پر اپنی اپنی داخلی اور اپنا راگ الاپنے کا شوق صادق آتا تھا۔ یوں ہر جگہ کے قومی اجتماع کو اپنے جداگانہ حکومت کے اظہار کے لیے ایک محور حاصل ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مقامی قومیتوں

کا پتہ چلا عوام میں بھی بڑھ گیا تھی کہ ایک وقت ہے آیا جب مختلف ممالک کو سلطنت سے وابستہ رکھنے والے رشتہ و پیوند کے سلسلہ میں بھی کانہ مفاد کی کشش غالب آگئی جوں ہی صورت حالات یہاں تک پہنچی، اسی وقت سے آسٹریا کی تباہی ایک یقینی امر تھا۔

شہنشاہ جوزف ثانی کی وفات سے پہلے ہی نظر آرہا تھا کہ حالات کیا شکل اختیار کریں گے کس سرعت سے پیچیدگی پیدا ہوئی اس کی مختلف وجوہات تھیں۔ بعض وجوہات تو خود سلطنت کی اندرونی کمزوریوں کا نتیجہ تھیں اور بعض کا سبب آسٹریا کی خارجی سیاست عمل تھی۔

سلطنت کا شیرازہ بندی سے زبان کا تعلق

جب تک تمام اختیارات مرکز کے ہاتھ آنے کے لیے مسلسل اور سخت کوشش نہ کی جاتی اس وقت تک آسٹریا کی سلطنت کو مستقل طور پر مستحکم کرنے کی کوئی صورت نہ تھی سب سے پہلے تو یہ امر ضروری تھا کہ تمام سلطنت میں ایک ہی زبان بطور سرکاری زبان کے استعمال کی جائے گی اس طرح ممالک محروسہ کی علاحدگی اتحاد و تقویت پکڑتی۔ علاوہ ازیں حکومت کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آجاتا جس کے ذریعہ سلطنت کی سیاسی یکجہتی قائم رکھنا ممکن ہے۔ اسی طرح مکتبوں اور تعلیم و تدریس کے دوسرے اداروں سے رعیت کے اندر باہم وابستگی کا احساس پیدا کیا جا سکتا تھا۔ ایسے مقاصد جن میں سال میں پورے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ یکی کوششیں تو صدیوں کے پلے پر کی جاتی ہیں ان کی مثال یہی ہیں جیسی تو ماد یوت قائم کرنے کی۔ دونوں جگہ یکایک جوش و خروش کے بجائے مستقل عادت قدیمی زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام ملک کی حکومت اور حکم ولی قوت سے ایک ہی زبان ہونا چاہیے تھا۔

ہمیں نے ان اسباب اور وجوہات کے مطالعہ سے پوری عبرت حاصل کی جن کے باعث مذکورہ بالا ہدایات پر عمل نہ ہوتا تھا اور نہ کرایا جاتا تھا بیسویں صدی تک سلطنت کی تباہی کی

ذمہ داری انہیں لوگوں کے کندھوں پر ہے جن سے یہ طرز حکومت سروکار رکھتی ہے۔

سلطنت کی بقا کے لیے نسلی وحدت کی اہمیت

آسٹرین سلطنت کو ایک قابل مضبوط حکومت کی سخت عادت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سلطنت کے وجود کا انحصار ہی ایسی حکومت پر تھا کسی اور سلطنت کو ایک قابل اور مضبوط حکومت کی اتنی ضرورت نہ ہوگی۔ بیشتر بڑی سلطنتیں میں وحدت نسلی مختلف قومی نامانوس نسلوں کی مشقی بنیاد ہمیشہ اسی وحدت نسلی پر ہوا کرتی ہے جب یہ وحدت موجود ہوتو پھر ہے راج گدی کیسے ہی نااہل اور نالائق ہاتھوں میں کیوں نہ ہو پھر بھی نسلی وحدت سلطنت کو بچائے رکھے گی۔ اگر کسی سلطنت کی آبادی ہم جنس ہو تو ایسی قوم کا تقاضائے فطری اور خود اختیار سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح حکومت کا وجود قائم رہتا ہے بعض اوقات ایسی حکومتیں ہوتی ہیں جو خود نے مذہبی ہوں اور نظامی کے اعتبار سے بھی وہ ایک عرصہ تک زندہ رہتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کئی دفعہ ایسا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ اس سیاسی نظام میں تو ہم کو کوئی جان باقی نہ ہوگی۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسی مردہ میں زندگی جان پڑ جاتی ہے اور وہ پہلی اور اصل حالت پر واپسی کا ایسا اظہار کرتا ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔

مختلف نسلوں کو متحد کرنے کے طریقے

جس ملک کے باشندے ہم جنس نہ ہوں وہاں کی حالت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے وہاں خون کا رشتہ تو ہوتا نہیں جس ایک حکومت کے ماتحت رہنے کا تعلق ہوتا ہے اگر حکومت میں کہیں کمزوری کے آثار ظاہر ہوں تو اس کا یہ اثر نہ ہوگا کہ سلطنت کے قومی شیرازے عرصہ کے لیے منتشر ہو جائیں بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت کے اندر رہنے والے مختلف سیاسی خلیے وجود میں آنے شروع ہو جائیں گے جب تک ان مختلف نسلی عنصروں پر ایک مرکزی حکومت حکمران ہے اس وقت تک ان کے علیحدگی کے سیاسی جذبات دبے رہتے ہیں یہ خلیے سیاسی نباتات کی طرح نشوونما پاتے ہیں اس امر کو کم

وہ بھی صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم ہر کو صدیوں کو یکساں ہی تعلیم یکساں ہی ہدایت اور یکساں ہی مواد کو ٹوکر جاتا رہے۔ یہی حکومتوں کی عمر اس قدر کم ہوتا ہے ان کے وجود کا انحصار مرکز کی یا وقت اور حالت پر ہوتا ہے اگر کسی بھی قسم سلطنت کا قیام محض ایک زبردست شخصیت یا غیر معمولی قابلیت کے مالک انسان کا مرہون منت ہو تو اس صورت میں یہ حکومت بھی اپنے بانی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ گو ایسے شخص کی ذاتی عظمت میں شک نہیں لیکن اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ یہ علیحدگی کے اسباب اس کا ہوتا کر پچاسوں صدیوں کی مشترکہ تعلیم و تربیت سے بھی کبھی رفع نہیں ہو جاتے۔ اس ترکیب کا اثر صرف اتنا ہوتا ہے کہ عارضی طور پر یہ اسباب مخفی ہو جاتے ہیں جب بھی مرکزی حکومت میں کمزوری کے آثار ظاہر ہوں اس وقت ان اسباب میں از سر نو بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ مشترکہ تعلیم اور مشترکہ روایات بالائے طاق دھری رہ جاتی ہیں علیحدہ قومیت کا احساس اپنی طاقت کے زور سے پھر اپنے جداگانہ راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

خود ہمارے ملک میں ہی کیا ہوا، شاہان مہابھارت اس حقیقت سے غافل تھے۔ یہی غفلت ہوئی کہ ترم تھا اس کی پاداش میں سلطنت دیوان بکھر گئی۔

خاندان مہابھارت میں صرف ایک تاجدار ایسا تھا جس نے آخری مرتبہ بچنے کی ہدایت فرما کر اس کی راہنمائی کی۔ اس روشنی سے اپنے ملک کا مستقبل تھوڑے عرصہ کے لیے صاف نظر آیا۔ اس کے بعد علیحدگی پھر اپنی اپنی جگہ کے پھر گئی۔

غفلت کا وبال سخت ہوتا ہے

جو ظرف ہاتھی تھا تو ہر اس قوم کا تاجدار لیکن رومن الیگزنڈر کے نام سے مشہور ہے جب اس نے دیکھا کہ اس کا خاندان سلطنت کے ایک وسیع حصہ کو گھیرے میں مقفل کر دیا گیا ہے تو اسے سخت اندیشہ لاحق ہوا اس نے سوچا کہ وہ وقت قریب ہے جب اس کا تخت و تاج تباہ ہو جائے گا اس انجام سے بچنے کے لیے یہ آخری موقعہ ہے آخر یہ تو بھارت بھارت

کی قوموں کو چیلنج کیا ہے۔ اگر ہم نے اٹھائے ہوئے اقدامات کی روک تھام کے لیے
کسی سے کوئی صورت نہ نکالی تو یہی چیلنج ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس ایک ہی علاج
باقی ہے بزرگوں کی غفلت سے جو حالات بگڑ چکے ہیں ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی
جائے جو ذاتی کوشش "ہوم کا رنیشن" بھی کہتے ہیں۔ اس نے مافوق الفطرت سے
کام لیتے ہوئے اپنے مورثوں کی اچھائیوں اور برائیوں کے نتائج زائل کرنے کا
بیڑا اٹھایا۔ اس نے دس سال کے عرصہ میں وہ تمام خامیاں پوری کرنی چاہیں جو صدیوں
کی پیدا کردہ تھیں اگر قسمت سے چار بس سال بھی اس طرح محنت کرنے کی مہلت دیتی،
اور اگر یہ سلسلہ بھی وہ کام جاری رہتا جس کی اس نے ابتدا کر دی تھی تو شاید آسٹریا
کی سلطنت بچ جاتی۔ یہ اصلاح اس کے لیے کم نہ تھی۔ یہ شہنشاہ دس ہی سال کی حکومت کے
بعد مر گیا۔ اس کا جسم اور جان دونوں شل ہو چکے تھے اس کی مجبوریاں بھی اس کے ساتھ
قبر میں داخل ہو گئیں اور آج تک اس کے مقبرہ میں اس طرح دفن ہیں کہ پھر کبھی دنیا میں
ان کا ذکر تک نہیں آیا۔

اس کے مورثوں میں نہ تو یہ قابلیت تھی اور نہ اتنا استقلال تھا کہ وہ اس کام کو پورا کر
سکتے جو انہیں درپیش تھا۔

طبقاتی رقابت قومی اتحاد کی دشمن ہے

تھوڑا ہی عرصہ بعد یورپ میں ایک نئے انقلابی دور کے آثار ہویدا ہونے لگے
حکومت کی باگ ڈور آسٹریا میں جگہ جگہ ڈھیل پیدا ہو گئی جب اس آگ کے شعلے بلند
ہوئے تو ان شعلوں کو ہوا دینے والی طاقتیں معاشرتی بے چینی کی پیدا کردہ
تھیں۔ یہ ان طاقتوں کی بیداری تھی جنہوں نے قومی آزادی پر تھی۔

1848ء میں سارے یورپ کے اندر انقلابی تحریکات کارفرما تھا۔ تمام یورپین
ممالک میں انقلابی رجحانات کی بنا طبقاتی کشمکش پر تھی۔ صرف آسٹریا ایک ایسا ملک تھا
جہاں یہ انقلابی رو نے ایک نئی صورت اختیار کی یہاں انقلابی جدوجہد کی بنیاد قومی

رقابت ہو گئی۔ آسٹریا میں ترکوں کی انقلابی تحریک کی اصلیت فراموش کر چکے تھے محض بے انہوں نے شروع سے یہ اصلیت ثابت ہی نہ کی ہو یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اس انقلابی جماعت میں حصہ لینے لگے۔ غرض انہوں نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلایا۔ اس کے اس طرز عمل سے پارلیمنٹری جمہوریت آسٹریا میں بھی جڑیں پکڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹری جمہوریت نے جلد ہی آسٹرین ترکوں کا قلع قمع کر دیا۔

بے تدبیری زوال کی ابتدا ہے

آسٹریا میں ایک نہ جمہوریت قائم کر دی گئی لیکن اس جمہوری شرط کو نظر انداز کر دیا گیا کہ تمام سرکاری کاروبار کے لیے یکساں زبان استعمال کی جائے۔ چونکہ اکثریت آسٹریا میں بسنے والے ترکوں کے قبضہ اور یکساں ضرب کاری تھی۔ اس کے بعد سلطنت کا زوال تو اسی وقت سے یقینی تھا۔ اب صرف دو یا زیادہ سے زیادہ تین سال کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض ایک تاریخی دلچسپی رکھتا ہے کہ ایک سلطنت کا خاتمہ کس طرح ہوا۔

سلطنت کا شیرازہ رفتہ رفتہ بکھر رہا تھا۔ اس انتشار کو دیکھ کر ایک طرف صدمہ ہوتا تو دوسری طرف عبرت بھی حاصل ہوتی تھی۔ ہنگری نے آسٹریا کی موت کا فتویٰ دے دیا تھا۔ اب اس حکم کے نتائج ہزار ہا چھوٹی موٹی تفصیلات کی شکل میں ظاہر ہو رہے تھے زوال کی کھلی نشانیوں قوم کے سامنے آ رہی تھیں گرہا ہوا اس کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد آنکھیں بند کر کے مزے سے چل پھر رہی تھی تو اس تغافل سے صرف یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ ہوش نے آسٹریا کو جواب دے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں تفصیلات کا ذکر نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہیں میں صرف ان واقعات کو بالتفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں جو ایک مثال کا کام دے سکتے ہیں اور اس پے زمانہ حاضر کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں یہ واقعات اس وجوہات کے آئینہ دار ہیں جو قوموں اور سلطنتوں کے زوال کا باعث ہوا کرتی ہیں علاوہ ازیں ان واقعات کے مطالعہ سے خود مجھے اپنے ہی عقائد کی بنیاد قائم کرنے میں بہت کچھ مدد

ہی۔

سلطنت کے اس ڈھانچے سے اٹھارہ کے واضح اور صریح آثار ظاہر تھے ان میں آسٹریا کی پارلیمنٹ بھی شامل تھی حالانکہ یہ ایک برائے نام ادارہ تھا جسے حکومت کے باقی تمام حصوں سے زیادہ مستحکم ہونا چاہیے تھا مثلاً آسٹریا کے کوئی بادشاہ اور ملکہ اس طرح کے خیالات سے کبھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔

برطانوی پارلیمنٹ کی ہر نقل کامیاب نہیں ہو سکتی

صاف ظاہر تھا کہ یہ انتظامی نظام انگلستان کی پارلیمنٹ کا ہے لیکن انگلستان کی پارلیمنٹ تو اپنے ملک کی تاریخی ضرورت کا نتیجہ ہے اور اس کے آسٹریا میں یہ قابل تعریف نظام منتقل کرتے ہوئے ذہانی کبھی یہ نہیں سوچنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس طرح برطانیہ میں پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں اسی طرح آسٹریا میں بھی ایک تو ملکہ تھریسا کے نمائندوں کا ایوان تھا اور دوسرا ایوان رؤسا۔ یہ دونوں ایوان اپنے اپنے جلسوں میں بادشاہ کی منظوری کے لیے بل پیش کرتے تھے دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارات تھیں برطانوی مابعد تعبیرات میں کہ جب دریائے ٹیمز کے کنارے پارلیمنٹ کے ہاؤسز تعمیر کیے گئے تو اس کے قریب نظر برطانیہ کی تاریخی روایات تھیں پھر اس عمارت میں بار بار آگ لگنے اور جلنے کے واقعات ہوئے ہیں۔ ہر بار نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہے اس میں انگلستان کی تاریخ کی روایت سے تعمیر و نگار ہوتے رہے ہیں اس تعمیر و نگار میں انسانوں نے اور اقوام اور افراد نے قومی شان و شوکت کا مظاہرہ کیا ہے۔

برعکس اس کے آسٹریا کے معماروں کو پہلی دفعہ اس مرحلہ پر قومی تعمیرات کا موقع ملا تھا۔ جب وہ ملکہ تھریسا کے ان نئے نمائندوں کے لیے ایک مرمریں محل تعمیر کر چکا تو اس کی آرائش کے لیے سے قدیم یونانی اور رومی تاریخ کا زیادہ سے زیادہ مواد جمع کیا گیا۔ پارلیمنٹری جمہوریت کا یہ مقدس بانی گھر تو تعمیر ہو گیا لیکن اس کی سجاوٹ کے لیے رومی دیوتاؤں مہ پریوں اور ملکاؤں کے مجسمے اور تصویروں کی صورت

محسوس ہوتی۔ ہر دو ایوانات کی پیشانی پر ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس تصویر کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے کوئی شاعر انجمن کھڑکی کے طور پر عین ممدوح کے دروازے پر لٹکا آئے تصویر میں ایک رتھ دکھائی گئی ہے جس کے اندر چار گھوڑے جتے ہوئے ہیں اور چاروں مختلف سمتوں کی جانب منہ کر کے دوڑ کے چاروں کونوں کی طرف بھاگ رہے ہیں اس عمارت کی ہر دو ایوانی کے اندر اس قسم کی سرگرمی کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔ اس کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے بہتر کارٹون اور کوئی نہیں بنایا جا سکتا۔

سلطنت میں رہنے والی "قوام" کو معترض تھا کہ اگر ہمیں پارلیمنٹ کی آرائش میں آسٹریا کی تاریخی عظمت کا سکا بٹھایا گیا تو یہ ہماری رہنمائی اور انتقال کا باعث ہو گا۔ ترکی میں بھی کچھ قسم کے اختلاف پیش آئے۔ وہاں کی رہنمائی پارلیمنٹ کا ہال دیوانہ کی رہگزر تعمیر ہوا تھا۔ اس ہال کو ان قوام کے نام سے منسوب کرنے کی نوبت اس وقت آئی جب جنگ عظیم کی کامیابیوں پر ان کے رہنما اس وقت بھی منسوب کرنے کی رسم یوں ہوئی کہ اس کے مطلوبہ ایک تختی پر لکھوا دیا گیا۔

پارلیمنٹ اور ڈکٹیٹر شپ

جب میں آسٹریا کے دارالعوام کی کارروائی سننے کی خاطر پہلی مرتبہ گیا تو اس وقت میری عمر ابھی بیس سال بھی نہ تھی میں اس پہلے تجربے سے ہی نہایت محظوظ ہوا۔

میں پارلیمنٹ کو ہمیشہ سے ادب احترام سے دیکھتا ہوں لیکن مجھے اس اور دوسرے نظریات میں بحیثیت ایک ہندو کے میں پارلیمنٹ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں میں تو سیاسی آزادی کا پرستار تھا۔ میں پارلیمنٹ کے سوا کسی اور طرز حکومت کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ مجھے بیزار کے تمام خاندان سے خصومت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری نظروں میں کسی حالت میں بھی ڈکٹیٹر شپ کی وکالت کرنا ایک عقلی اور سیاسی جرم کے مترادف تھا۔

میری اس رائے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ہر حکومتی پارلیمنٹ کو ایک گورنمنٹ کی نظر سے دیکھتا تھا میں بھی بچہ تھا کہ اسمبلیات دیکھ دیکھ کر غیر شعوری طور پر خود بخود

یہ احترام محسوس کرتے تھا اب یہ احترام بالکل تو فراموش نہ ہو سکا تھا۔ برطانوی وار
الصدر جس سلیقہ سے اپنے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ اس سے میں بہت متاثر تھا
میرے اس تاثر میں آسٹریا کے تجربات کو بھی دخل تھا۔ یہ تجربات ایسے واقعات تھے
جنہیں میں بیان کرتے تھے میں سوچتا تھا کہ عوام کی خود مختاری کے لیے پارلیمنٹ سے
بہتر طرز حکومت اور کیا ہو گی۔

میں ان وجوہات کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ کی عزت کرتا تھا انہیں وجوہات کے
سبب مجھے آسٹریا پارلیمنٹ سے دلچسپی تھی یہاں کی پارلیمنٹ پہلی عظیم عرصہ دراز
جاری کی روایات کے مقابلہ میں قطعاً نااہل تھی اس کے علاوہ میں مندرجہ ذیل حقائق سے
بھی متاثر ہوا۔

آسٹریا حکومت میں ترکوں کے اقتدار کا تجربہ اب اس حد تک رہ گیا تھا کہ وہ
پارلیمنٹ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں جب تک ہر بالغ مرد و زن کو ووٹ نہ دیا گیا تھا اور
جب تک الیکشن کی ہر جگہ خفیہ طور پر ڈالے کا دستور رائج نہ ہوا تھا اس وقت تک
پارلیمنٹ میں ترکی نمائندوں کو اکثریت حاصل تھی۔ یہ اکثریت کبھی بھی درست نہ تھی
صورت حالات مختلف تھی۔ ترکی عنصر کا جو حصہ آسٹریا کابینہ وفاقی و قومی مسائل میں
وفد کے شامل نہ تھا آسٹریا کی پارلیمنٹ ان مسائل میں ترکوں کی حمایت کرتے تھے جو ترکی
عنصر کے پیدائشی و موروثی حقوق سے تعلق رکھتے تھے انہیں ڈر تھا کہ کہیں دوسرے قومی گروہ
ان سے چھین نہ جائیں اگرچہ اس وقت تک ہر بالغ شہری کو ووٹ کا حق نہ ملا تھا۔ پھر بھی
آسٹریا کی پارلیمنٹ کو ترکی پارلیمنٹ نہ کہا جا سکتا تھا جب ہر بالغ شہری کو ووٹ کا حق دے دیا گیا
پھر تو ترکوں کی تعداد میں جو غلبہ حاصل تھا وہ بھی چھن گیا اب آسٹریا کی حکومت سے
ترکی تسلط دور کرنے کے لیے راستہ صاف تھا۔

نمائندگی کے نظام میں ترکوں کو بحیثیت ترکوں کے کوئی حمایت حاصل نہ تھی۔
ترکی عنصر کا جو حصہ آسٹریا کابینہ وفاقی و قومی مسائل میں وفد دے جاتا تھا میں ان حالات میں

اس انتظام سے کیسے خوش رہ سکتا تھا۔ میرے اندر اپنی قوم کی حفاظت کا جو فطری احساس
ودیعت تھا وہ مجھے اس انتظام کی مخالفت پر مجبور کرتا تھا وہ جو اس کے میں یہی سمجھتا تھا کہ
پارلیمنٹری کا مرتی کہ ان تمام فوائد سے جن کا میں ذکر کر چکا ہوں، اور کئی دوسرے
فوائد سے مبرا ہے۔ ان فوائد کی ملک خود انگلستان کی حکومت میں مضمر تھی۔ مجھے اب
بھی یاد ہے جب کہ گرمجلس ہوئیت میں قوموں کی اکثریت حاصل کر لی جاتی تو پھر
سب تک کہ نئی انتظامیہ کابینہ جو ہوتی ہے اس کام کی حفاظت کی ضرورت نہ ہوگی۔

یہ تھے میرے خیالات جب میں پہلی مرتبہ ان لڑائی جھگڑے کے مقدس ایوانات
میں داخل ہوا۔ ان ایوانات کی تقدیس جس میں ان کی عالیشان عمارت اور انتظامی حسن تک
کی حد درجہ عمارت کی تھی، قوموں کی سرزمین پر ایک ہی ذہنی جوہر تھا۔

پارلیمنٹ ذہنی اختلاف کی نمائش ہے

اندر داخل ہوتے ہی مجھے جو قابل نفرت نظارہ دکھائی دیا اس سے میرے تن بدن
میں آگ لگ گئی اس وقت ایک زبردست اقتصادی مسئلہ زیر بحث تھا۔ "قوم کے
نمائندے" اس بحث میں حصہ لینے کی خاطر بینچوں کی قطاروں میں موجود تھے "ہر نمائندہ
قوم" کو حق حاصل تھا کہ جو کچھ منہ میں آئے کہہ ڈالے۔

مجھے وہاں ایک ہی روز میں جو تجربہ حاصل ہوا وہ ہمیشہ کے لئے غور کرنے کے
لئے کافی تھا۔

مباحثہ کا ذہنی معیار نہایت پست تھا کئی دفعہ تو یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ بحث میں حصہ
لینے والے معزز ارکان کیا کہہ رہے ہیں کئی معزز ارکان زبان کے بجائے اپنی علاقائی
زبان یا مقامی بولیوں میں گویا طبع آزمائی فرما رہے تھے۔ غرض آج تک جو کچھ تجربات
میں آ چکے تھے وہ آج اپنے کانوں سے سن لیا ایک پرشور ہنگامہ تھا جس میں سب
لوگ عجیب عجیب طریقوں سے ہاتھ ہوا میں ہلا کر ایک دوسرے کے خلاف گا پھاڑ رہے
تھے بیچ میں ایک بڑے میز پر بیٹھے تھے جن کی حالت دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا یہ غریب

مجلس کی وضعداری قائم رکھنے کی خاطر سوچ کر رہا تھا۔ پھر وہ کبھی کبھی آتا تھا۔ کبھی ہوتا تو خوشامد کرتا تھا کبھی وعدہ وفا سے کام لیتا تھا اور کبھی دھمکیوں پر اتر آتا تھا۔

میں یہ تماشہ دیکھ کر اپنی ہنسی روک نہ سکا۔

کئی ہفتہ بعد میں پھر ایک مرتبہ پارلیمنٹ کی زیارت کرنے گیا۔ اب کے ایک بوڑھا کلرک وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بیٹھک بھی بہت ہی ہلکی پھلکی تھی۔ قریب قریب خالی تھا۔ کہیں کہیں چند کرسیوں میں آرام فرما رہے تھے صرف چند معمولی کرسیاں اپنی جگہ پر بیٹھے تھے وہ بھی ایک دوسرے کے منہ کے پاس اپنا منہ لے جا کر جمائیاں لے رہے تھے ایک صاحب تقریر کر رہے تھے کرسی صدارت پر نہ تھا۔ اب صدر جلوہ فرما تھے جب آپ ادھر ادھر جھانکتے تھے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ تھکے ہوئے ہیں۔

اس تجربہ کے بعد میں نے تمام مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ مجھے جب کبھی فرصت ملتی میں پارلیمنٹ دیکھنے چلا جاتا۔ وہاں خاموش بیٹھ کر بڑی توجہ کے ساتھ یہ تماشا دیکھتا رہتا۔ جہاں تک ممبروں کو سمجھنا ممکن تھا میں نے بھی کام جاری رکھا۔ خواص اس امر کے متعلق جتنی جانکاری حاصل کر سکتا تھا میں نے اس سب کے منتخب کردہ نمائندوں کی ذہانت و صلاحیت کا جائزہ لیا۔ رفتہ رفتہ میں جو کچھ دیکھتا تھا اس کے متعلق میں نے اپنی رائے قائم کر لی۔

پارلیمنٹ اصول الفاظ ہے

میں نے اس مشاہدہ میں ایک ہی سال صرف کیا تھا۔ مجھے پارلیمنٹری نظام کے متعلق اپنے عقائد میں ردوبدل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب میں فقط پارلیمنٹری نظام کی اس مسخ شدہ صورت کا مخالف نہ تھا جو ہندوستان میں رائج تھی اب میں سرے سے اس نظام ہی کو تسلیم نہ کر سکتا تھا۔ آج تک میرا خیال تھا کہ ہندوستان پارلیمنٹ کی تمام مہلک خامیاں جن کا تذکرہ نہ ہونے کا نتیجہ ہیں اب مجھے احساس ہوا کہ پارلیمنٹری

کام ہی کہ اپنی اصلیت اور اصل روپ کے اظہار سے عاجز ہے۔

میرے سامنے متعدد مسائل درپیش تھے میں نے جمہوریت کے اس اصول کا مطالعہ خاص غور سے کیا کہ تمام فیصلے اکثریت آراء کے موافق ہونا چاہئیں علاوہ ازیں میں نے اس بات کی شریعت کی عقلی اور اخلاقی حیثیت کی بھی پوری پوری تحقیق کی جو "اکثریت کا ساتھ دو قوم" کہلاتے تھے اور جن کے ہاتھ میں اس قومی ادارہ کی باگ ڈور تھی۔

اس طرح ایک وقت مجھے اس ادارہ سے بھی وقتیت ہو گئی اور مجھ پر اس ادارہ کے چلانے والوں کی قلعی بھی کھل گئی چند ہی برسوں میں مجھے اس فرقہ کے متعلق صاف اور واضح حقائق معلوم ہو گئے جس کی پر تنقید کرتے وقت آج دنیا کی بے اختیاری بری جانی ہے میری مراد پارلیمنٹ کے ارکین سے ہے ان دنوں میں نے اپنے ذہن میں ان لوگوں کے متعلق جو تاثر قائم کر لیا وہ پھر میرے لیے پتھر کی لکیر ہو گیا کم از کم جہاں تک بنیادی اصول و مسائل کا تعلق ہے میں نے پھر کبھی اس تصویر میں ترمیم نہیں کی۔

یہاں پھر ذہنی زندگی سے بھٹکے ہوئے ان حقائق نے مجھے صولوں کے گورکھ دھندے میں ہمیشہ کے لیے الجھ جانے سے بچا لیا۔ بالعموم یکلی نظر میں پارلیمنٹری اصول کا گورکھ دھندا بہت دلکش نظر آتا ہے حالانکہ دراصل یہ عقیدہ محض توہم پرستانہ کا آئینہ دار ہے۔

جمہوریت اشتراکیت کا پیش خیمہ ہے

جمہوریت کی جو شکل آج کل مغربی یورپ میں رائج ہے اسے مارکس ازم کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹری نظام کے بغیر مارکس ازم کا تصور بھی ناممکن ہے۔ جمہوریت ہی وہ فضا ہے جس کی آڑ میں اس عالمگیر تحریک کے زیر پرورش پانے کو ہوا ملتی ہے جمہوریت نے پارلیمنٹری نظام اختیار کر کے خلافت و شوریٰ کی بھی ترمیم کر دی اس بھی کی شکل ہر گز کسی قسم کی پارلیمنٹری نظام کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

میں قسمت کا بے حد مشکور ہوں کہ اس نے مجھے یہ مسئلہ وقت ہی پر سمجھا دیا ورنہ اگر

میں کہیں جرمنی میں ہوتا تو ممکن تھا کہ کسی ذہنی علت سے ہی مضمحل ہو جاتا۔ اگر میں یہ حقیقت جان جاتا کہ وہ پارلیمنٹ کا اور دوسرے سے خلاف معقول ہے تو میں ممکن تھا کہ میں ایک ذہنی علت سے نکل کر دوسرے ذہنی مغالطہ میں پڑ جاتا۔ کئی دوسرے لوگ ایسے ہی مغالطہ میں مبتلا ہو رہے تھے اور ان کے پاس معقول دلیل کی بھی کمی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ سلطنت اور رعایا کی نجات کے لیے فقط ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ شہنشاہ کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپ دیے جائیں۔ اس عقیدہ کے پیروؤں کے دل سے یہ خیال تھا کہ وہ عوام الناس کی آزادیوں کی طرف سے مکمل بند کیے بیٹھے تھے۔

شہنشاہیت جمہوریت سے بھی بدتر ہے

آخر کار میں یہ مغالطہ تا "سان نہ تھا۔ میں ایک ذہنی علت سے نکل کر دوسری میں مبتلا ہو رہا تھا۔ کم از کم میں شاہ کو پارلیمنٹ پر ترجیح دینے کے لیے تو ہرگز کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ مسئلہ یہ نہ تھا کہ خانی پارلیمنٹ کی مخالفت کرنے سے حل ہو جاتا اگر پارلیمنٹ ختم بھی کر دی جاتی تو خورا سوال یہ ہوتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ خانی کی مخالفت اور اس کے خاتمہ کا صرف یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ تمام اختیارات تاجدار یورپ کے ہاتھ میں چلے جاتے۔ یہ ایک ایسا نتیجہ تھا جو میرے لیے بالخصوص ناقابل برداشت تھا۔

آخر کار میں پارلیمنٹری مسئلہ کا حل خاص طور پر مشکل تھا یہی وجہ تھی کہ مجھے اصل عمر میں ہی اس معاملہ کی تہ تک جانا پڑا۔ شاید عام حالات میں میری یہ تحقیق ہرگز ایسی جامع نہ ہوتی۔

پارلیمنٹ شخصی ذمہ داری کا انکار ہے

پارلیمنٹری نظام کی ایک خصوصیت ایسی تھی، جس نے سب سے پہلے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ مجھے اس خصوصیت پر بیحد معقول غور و خوض کرنا پڑا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ اس نمائندہ مجلس میں شخصی ذمہ داری کچھ بہت محدود تھی۔

پارلیمنٹ کوئی ہے۔ قانون بنانے کے لئے جو مشق کی جاتی ہے اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں اب یہ کون ایک شخص ہے جسے آپ انفرادی طور پر اس طرح کا ذمہ دار ٹھہرا سکیں؟ صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جسے سزا کا مستحق قرار دیا جا سکے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب کابینہ مستعفی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی حکمت عملی کے مہلک نتائج سے بری الذمہ ہو جاتا ہے مگر کیا ہم یہ قرار دیں کہ جب کوئی نئی پارٹی بنائی جاتی ہے یا پارلیمنٹ منتشر کر دی جاتی ہے تو اس سے ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے؟ ذمہ داری کو تو سوائے اس کے اور کوئی معنی نہیں کہ کسی ایک شخص کو ذمہ دار گردانا جائے۔

پارلیمنٹری حکومت میں ساری کارروائی کی بنیاد تمام رکھیں کی مجموعی خواہشات پر رکھی جاتی ہے ایک ایک قدم ان کی رضامندی اور اعلام کے مطابق اٹھایا جاتا ہے۔ مگر کسی معاملہ میں پارلیمنٹری حکومت کے کارکنوں کو کیسے ذمہ دار گردانا جا سکتا ہے؟ کیا ارکین سلطنت کا فرض یہ ہے کہ وہ تعمیری کام کرنے اور مفید قانون بنانے کے بجائے ایک انتظامیہ کے لئے کوئی نہ کوئی مشکل کھڑی کرنے کی کوشش کرتے رہیں؟ کیا ان کے لئے یہی مصروفیت مناسب ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی خوشامدیں کریں ان سے درخواستیں کریں اور پھر ان کی دعوتیں حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہیں؟

یہ اکثریت واقعی ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے؟

فرض کیجئے ایک سیاست دان عظیم الشان سیاسی تجویزیں سوچ سکتا ہے اور ان پر عمل درآمد کرانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے کیا اب اس کے لئے یہ شرط بھی لازمی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی بات سوائے اپنے میں ویسی ہی دلچسپی پیدا کرنے کی استعداد رکھتا ہے؟

وزراء کے ذریعہ جو الیکشن کئے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دیانتداری پر مبنی نہیں ہوتے اس طرح جو پارلیمنٹ منتخب ہے اس کے رجحانات محض اتفاقات پر منحصر رکھتے ہیں اگر کوئی سیاست دان ایسی مجلس کے اندر اپنی تجویز کے حق میں اکثریت حاصل نہیں کر سکتا تو کیا وہ اس ناکامی سے واقعی ناقابل ہونا ثابت ہو جاتا ہے؟

پھر مجلسیں تو ہمیشہ ان عقائد کی طرفداری کرتی ہیں جن کو پہلے سے غلبہ حاصل ہو۔ ان کے ذریعہ کسی عقیدہ کی سچائی کا صحیح ثبوت اس کی کامیابی ہے کیا کوئی ایسا نظریہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے جہاں کسی پارلیمنٹری مجلس نے کسی مستحکم یا شاندار سیاسی عقیدہ کے رائج عام ہو جانے سے پہلے اس کی حمایت کا ووٹ دیا ہو؟

کیا یہ صحیح نہیں کہ اس دنیا میں تمام مشاہیر کے کارنامے عامۃ الناس کے ہجوم کے خلاف ایک گونہ صدائے احتجاج کی نوعیت رکھتے ہیں؟

فرض کیجئے ایک سیاسی مدبر خوشحال درآمد سے پارلیمنٹری حلقے کو اپنی تجویز کی حمایت پر آمادہ نہیں کر سکتا ہے وہ کیا کرے؟ کیا وہ اس رضامندی کو حاصل کرنے کی خاطر کوئی قیمت ادا کرے؟

یا جب اس کے راستے میں دوسرے شریروں کی مخالفت بدستور حائل ہو تو کیا وہ اپنی تجویز کو خلعت جامہ پہنانے کا خیال چھوڑ دے۔ فرض کیجئے اسے یقین ہے کہ اس کی تجویز قوم کی بھلائی کے لیے ضروری ہیں۔ کیا ان حالات میں اسے گھر جا بیٹھنا چاہیے یا اپنے اختیارات پر قائم رہنا چاہیے؟

کیا ایسی صورت میں ہر دیانت دار شخص ایک کشمکش محسوس نہیں کرتا؟ ایک طرف اس کی سیاسی بصیرت آگے کھینچتی ہے تو دوسری تقوے اور شرافت اس کو پکارتے ہیں۔

"ذاتی دیانتداری اور قومی فرائض میں سے کسے ترجیح دی جائے؟"

کیا یہ درست نہیں کہ ہر شخص جس میں صحیح کام کے واسطے جوش ہو اس طرح کی کیسی ہی گہرائی کیوں نہ پیدا کرنے سے احتراز کرے گا؟

کیا اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح نہیں کہ ایسے حالات دیکھ کر ہر با استقلال لیڈر کے دماغ میں یہ سوال کہ "کھیل" کھیلنے کا ہو پیدا ہوگا؟ پھر اسے خوب معلوم ہے کہ "ذمہ داری" کبھی انفرادی طور پر اس کے سر نہ آئے گی بلکہ "ذمہ داری" تو ایسے گمنام ہجوم کے کندھوں پر ہے جس سے کبھی اس کے اعمال کی جواب طلبی نہیں کی جا

تھی۔

پارلیمنٹ حفظ مراتب کی نفی ہے

پارلیمنٹری حکومت کا یہ اصول ہے کہ تمام فیصلے اکثریت کی رائے کے مطابق ہونے چاہئیں کیا یہ اصول وہ قوت اور تجربہ کے حصول کو آسان کر دے گا؟

کیا کوئی شخص ریاضی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ انسانی ترقی کی تعداد بہت سے آدمیوں کی رائے سے ہوئی تھی اور انفرادی دماغ اس سہرے کا حقدار نہیں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ انفرادی سوچ بچار کے بغیر بھی انسانی تہذیب آگے بڑھنے کے اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

کیا حقیقت یہ نہیں کہ آج کل عمرانی تحقیق کو ہیتوں کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے؟

پارلیمنٹری اصول کے مطابق قانون سازی کا اختیار اکثریت آراء کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے گویا تمام اختیارات سمٹ کر ہر فرد کی جگہ چند گمنام لوگوں کی ایک مقررہ تعداد اکثریت کی صورت میں مسند حکومت پر بٹھا دی جاتی ہے۔

پھر عمل صریحاً قانون حفظ مراتب کے خلاف ہے حفظ مراتب فطرت کا بنیادی قانون ہے لہٰذا یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جگہ ہر شعبہ ایک انتظام کا دور ہے اس لیے یہ لازمی نہیں کہ ضرور آج کل کے دماغی جھگڑوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں ہزار عمرانی فضیلت کے حامل تصور کر لیے جائیں۔

پارلیمنٹری نظام ادنیٰ ذہنیت کی پیداوار ہے

جن لوگوں کا مطالعہ بہت محدود ہے وہ آسانی سے پارلیمنٹ کے بانیوں کی اثرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہاں اگر وہ آزاد طریقہ سے سوچیں اور دلائل اور واقعات کا جائزہ لیں تو پھر ممکن ہے کہ وہ بھی ان اثرات سے آگاہ ہو جائیں کیا وجہ ہے کہ فی زمانہ مہذب سیاست میں ادنیٰ قابلیت کے لوگوں کا یہ ہجوم ہے؟ اس کا باعث

یہی وہ بڑا سفر ہے جو ہر شخص اس کے اندر قیادت کے صحیح اوصاف کو جنم دیتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر سیاسی زندگی میں حصہ لینے سے احتراز کرنے کا مشورہ دیتا ہے کہ یہاں کسی تعمیری کام کی صلاحیت رکھنے والے سیاسی مدبر کی تو گنجائش نہیں یہاں تو ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے سودا کرنا جانتے ہیں یا کام کم کرتے ہوئے لوگوں کے مزاج کے عین مطابق ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کوشش صرف کمی پیدا کرتی ہے۔

مکاری کی قسم کی ہوشیاری

ان سیاسی بھٹک مگنوں کی حالت تو بہت ابتر ہے اور اس علم میں اس قدر رنگ ہونا کافی ہے وہ خود اپنے سیاسی سرمائے کا ٹھیک ٹھیک تخمینہ لگانے میں خوب ماہر ہوتے ہیں چونکہ وہ اپنی حیثیت سے واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ اس کام کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ جہاں یہ گہرائی استعداد کی ضرورت ہے وہاں ذہنی ذہانت کی یہاں تو فقط وہ مکاری کی ہوشیاری درکار ہے جو شہروں کے دفتری بابو اس کو ظفر لے انعام ہو کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ان سیاسی بھٹک مگنوں کے نزدیک یہ ذہنی وجدانی مکاری بڑے سے بڑے سیاسی علمداری دانش پر بھی ترجیح رکھتی ہے اس کی بدولت انہیں اپنی قابلیت کے باوجود اپنی کرتوتوں کی ذمہ داری خود برداشت کرنے کا کوئی ڈر نہیں۔ انہیں شروع سے علم ہے کہ جو ہے ان کے "قدر" کے نتائج بھگتنی کیوں نہ ہوں اجر ہمیشہ ہوتا ہے جو قسمت نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے وہ فیصلہ یہ ہے کہ بیٹ نہ ایک دن انہیں بڑا بڑا بڑا عہدہ عطا فرمائے گا۔ اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے ذہنی قابلیت رکھنے والے کی خاطر یہ دن تلاش کرنا ہوگا۔ زمانہ گفتگو کی یہ ایک اور خصوصیت ہوتی ہے کہ جوں جوں انفرادی خصوصیتوں کا معیار پست ہوتا جائے توں توں "ممتاز اور سربرآوردہ سیاست دانوں" کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ فرد افراد اس قدر سیاست دانوں کو کثرت تعداد پر انحصار رکھتا ہے اتنا ہی کسی قابلیت کا معیار گرتا جائے گا۔ ہر وہ شخص جو صحیح سیاسی قابلیت کا مالک

ہے اسے عرفوں کی اس ذلیل پالی کے درپے ہمیشہ دشمنی کرنے میں مارمحسوس ہوگا۔ یہ لوگ اکثریت کے نمائندے ہیں اور اکثریت ہمیشہ اقلیت کے حقوق کا دشمن ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ریاست کی نمائندوں کو ایک ہی درجہ کے ذریعے سے بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی شے سے نہیں ہوتی۔

نمائندوں کی وزارتیں

اگر ہر ریاست کے ان ذلیل اراکین کا سردار بھی ذاتی قابلیت کے لحاظ سے اس کونسل کا ممبر ہوتا جس میں وہ منتخب ہوئے ہیں تو اس سے ان کو تھوڑی تسکین رہتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرحلہ میں ہر ریاست کے لیے اظہار قابلیت کا موقعہ ہوتا ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر ایک کو تسلی رہتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی باری پر پہنچ جائے گا اگر ان نمائندوں پر اختیار ہوتا تو کبھی حضرت نمائندوں کی باری نہ آتے۔

جمہوریت کی کمی ایک خاص عارضہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے جو کچھ دنوں سے انگلستان تک پہنچ گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ملک کی سیاسی قابلیت کی ایک بڑی تعداد بزدلی کے مرض میں گرفتار ہے۔ جب کبھی کوئی اہم فیصلہ کرنا ہو۔ یہ لوگ اکثریت کی کھڑی کرکے اس کی آڑ میں اپنی جان بچانے کی فکر کرتے ہیں اگر یہ چال کامیاب ہو جائے تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔

ان سیاسی کنکوں کے تھکنے سے قابل دیدہ ہوتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے پیچھے اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر عجیب عجیب خوشامدوں اور حیلے بہانوں سے کام نکالتے ہیں انہیں اپنے ضمیر میں کسی ضمیر دار کو بھی شریک رکھنا ہوتا ہے تاکہ جب کبھی ضرورت پڑے ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈالی جا سکے۔ اس قسم کی سیاسی جدوجہد دلیر اور چال چلنے والے اخلاص کے دل میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ذلیل قسم کے لوگوں کے لیے یہی دکانداری خاص جاذبیت رکھتی ہے

جو شخص اپنے اعمال کی ذمہ داری خود قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ ہمیشہ کسی اور کی تلاش میں رہتا ہے وہ یقیناً لچوں اور بدمعاشوں کی فہرست میں داخل کیے جانے کے قابل ہے۔

قیادت تقلید کا نام نہیں

اگر کسی قوم کا راہنما اپنی ذہنی سطح کے سیاسی لیڈروں میں شامل ہو تو اس کے مہلک نتائج بعد میں ظاہر ہونے لگیں گے کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کا کسی کو حوصلہ نہ ہوگا اس طبقے کے لوگ ذہانت کے ساتھ کوئی صاف صاف یا کسی قطعی رائے کے بجائے مداہنی اور مفاہمت برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں یہ کوئی آدمی نہیں لگتا جو ضرورت پڑنے پر ایک مقرر اور واضح حکمت عملی کی خاطر پوری قوم اور پوری زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کرے۔

ایک حقیقت ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے اور وہ یہ کہ کثرت آرا کبھی صحیح فیصلہ نہیں دے سکتی کثرت آرا محض جہالت اور بزدلی کی آئینہ دار ہے ایک مضبوط ارادے کے مقابلہ میں دو متفق کوئی وقعت نہیں رکھتے عمل جذ القیاس کی بنیاد ہمت کے بجائے اخلاقی قوت اور انتقال کی ضرورت ہو وہاں سینکڑوں ڈرپوک کبھی کام نہیں دے سکتے۔

خدمت قوم کے بیتاب شوقین

راہنماؤں کی اکثریت ذمہ داری کا بوجھ کم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کئی لوگ ہو جو اب تک ناقابلیت کے باعث "اہل قوم" قوم کی خدمت میں شریک کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جوں جوں ذمہ داری کا بوجھ کم ہوتا ہے توں توں ان حضرات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جس خیال ہوتا ہے کہ ان کے لیے "قوم کی خدمت" کرنے کا وقت آ پہنچا ہے وہ فوقیت کی شدت سے ایسے بے صبر ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی باری کا انتظار کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے یہ "خدا یاں قوم" ایک ہی

قطار میں آگے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں ہر شخص ایک اداسی کے عالم میں کڑھتے ہوئے شور کرتا رہتا ہے کہ اس پر سیٹ رکھنے والوں کی تعداد کیوں ہے اور آخر کار خود اس کے سر حلقہ مڑنے میں تھی گھڑیاں باقی ہیں۔ اس عہدے پر اس کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں اس میں کوئی ذرا سی تبدیلی بھی ہو تو وہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں جو لوگ اس قطار میں سیٹ رکھتے ہیں ان میں سے اگر کوئی ایک امیدوار بھی کسی وجہ سے کاؤنٹر پر کھل جائے تو وہ ہزار ہزار شور مچاتے ہیں اگر کوئی شخص عہدہ داری کے موڈ جیسے پر زیادہ دیر بیٹھ جائے تو اس کی پوری کوشش قریب قریب اس مقدس عہدہ کی خلاف ورزی کے مترادف تصور کی جاتی ہے اس کی روح سے باہمی اتحاد قائم ہے انکار کرنے والے اس "عہد" کے خلاف ایک مشتعل ہو جاتے ہیں کہ جب تک سے ہمیشہ کے لیے خارج نہ کر آئیں چین سے نہیں بیٹھتے۔ جب وہ کھل جاتا ہے تو اس کی آرام دہ مسند پھر خالی عام ہو جاتی ہے اب اسے ہر گز کبھی دوبارہ یہ موقعہ نہیں دیا جاتا جو عہدہ دار ایک دفعہ اپنے عہدے سے معزول ہو جاتے ہیں وہ دوسرے اسی قطار میں آ کھڑے ہوتے ہیں وہاں اگر دوسرے امیدوار شور مچا کر باہر نکال نہ کریں تو پھر کھوری ہے۔

پارلیمنٹ سے طوائف اسمبلی تک

اس تمام کہانی کا نتیجہ کیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جس حکومت کے سرکاری عہدوں اور سرکاری مراتب میں اسی جلد تبدیلی ہو وہاں عام رائے پختہ نہیں ہو سکتی ایک اداری عمر ہے ان حالات میں کوئی مارکس حادثہ رونما ہو جائے تو انجام ہوائے تباہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یہ پارلیمنٹری اثرات صرف جاہل اور نااہل لوگوں ہی کو نہیں بگاڑتے بلکہ جو شخص صحیح معنوں میں قائد ہو وہ بھی دوسروں کی طرح اس بلا کا شکار ہو جاتا ہے کہا جا سکتا ہے کہ قسمت کہیں کسی نااہل انسان کو قیادت پر مامور کر دے تو وہ اور زیادہ نکما بن جاتا ہے اور اس قائد کی بڑی ذلت ہوتی ہے اور اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم ہو سکتا ہے مگر یہ قائد عام پارلیمنٹری معنوں سے نہیں بلکہ حقیقی قومی قسمت سے تمام پارلیمنٹری تکلفوں کے ساتھ

ل بھل کر رہے کی کوشش کرتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کی شامت آگئی۔ جوں جوں وہ ان
ممتاز نمائندوں سے بار بار کے دو بدو ملاقات کی عادت بڑھاتا ہے توں توں ان کی دلچسپی
دلچسپی ہوتی ہے وہ تو بس اپنی ہی منڈلی میں الجھ بیٹھنا چاہتے ہیں جو محض ان کی محفلوں
میں شریک ہو اور اس کی قابلیت دوسروں کے مقابلہ میں مسلم کلاں تر ثابت ہو جائے۔
اس کے خلاف وہ فی الفور جماعتی اقدار اختیار کر لیتے ہیں ان کی فہرست جہاں دوسری
باتوں میں بڑی کمزور ثابت ہوتی ہے وہاں اس معاملہ میں بھی معمولی طور پر حساس ہے۔

اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ حاکم طبقہ کا ذہنی معیار روز بروز پست ہوتا رہتا ہے یہ نتیجہ تا
قابل گرفت ہے اس پستی کی رفتار مستقل ہے۔ گزشتہ سو سال میں طبقہ حکمراں کی فہرست میں
شامل ہونے کے باعث آنکھوں پر پٹی نہ ہو تو ہم بے تکلف یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ قطعاً مشکل نہیں کہ قوم
اور حکومت کو ایسی صورت حالات سے کتنا نقصان پہنچتا ہے۔

میں نے ہی بولشویک بھیجا ہے آسٹریا کی پارلیمنٹری حکومت ہو ہوس کا کھیل تھی۔

پارلیمنٹ خوانچہ فروش سیاستدانوں کا بازار ہے

یہ درست ہے کہ آسٹریا کا وزیر اعظم خود شہنشاہ مقرر کرتا تھا لیکن اس کی تقرری کی
صلاحیت منحصر اسی تھی کہ پارلیمنٹ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ وزیر کے انتخاب
کے وقت پر ایک تازہ دنگا ہوتا تھا اور کرتے وقت ٹوپ کھیلا جاتی تھی غرض مغربی
جمہوریت کی خصوصیتوں کا پورا نقشہ کھینچا جاتا تھا۔ جیسے وہ اصول تھے اس پر عمل کیا جاتا تھا
ویسے ہی ان سے نتائج برآمد ہوتے تھے ایک عہدہ دار بنا کر اس کی جگہ دوسرا آدمی مقرر
کرنے کو جو وقت درکار تھا وہ بندرج کم ہوتا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ انجام کار اس تقرر و معزولی
کی مثال ہی ہو گئی تھی جیسے بچے باری باری گھوڑا بنتے ہیں ہر عہدہ میں جب تبدیلی
ہوتی تھی تو عہدہ دار اپنے پیشرو سے کبھی بہتر ثابت ہوتے۔ بہتر کوئی نہ آتا تھا تاوقتیکہ
آخر کار ہر جگہ انہیں دنی درجہ کے خوانچہ لگانے والے سیاست دانوں کا دور دورہ ہو گیا۔
ان لوگوں میں جستجو اور تدبر کا امتحان یہ ہے کہ کوئی شخص پارلیمنٹ میں کیسے گھوڑا پار لی

کا ہاتھ دھوت جانے کے بعد دوسرا ہاتھ کس بھرتی سے تیار کرتا ہے الغرض تخلیق ہونا چیز یہی سوہوں کے طے کرنے میں عیاری کا اظہار اس نمائندگان قوم کی واحد دلچسپی ہے۔

پارلیمنٹ چاہوں کی مجلس ہوتی ہے

اس سلسلہ میں وہ نا کا دراں صورت دیگر تمام مقامات سے زیادہ پر اثر تھا ایک خصوصیت کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ایک دوسری خصوصیت یہ تھی جس نے مجھے تماشی متاثر کیا تھا کہ یہی خصوصیت نے کیا تھا۔ وہ یہ کہ ان کے فرائض کے متعلقہ میں ان تمام نمائندگان قوم کی عملی و منقلی سطحوں اور بھوکی ہوئی حکومت ممالک اقوام سے مرکب تھی ان اقوام کے نمائندوں کی نگاہ نظری اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ نظر انداز کی جا سکتی تھی انسان ان کرنوں پر غور کرنے کو مجبور ہو جاتا تھا جس سے یہ اثرات کے لمحوں تقوی زندگی میں بار حاصل کر لے تھے۔

جس ڈھنگ سے ان معززین کے تخلیقی جوہر ملک کی خدمت کے دوران میں کھلتے تھے اس کا پورا پورا مطالعہ اور امتحان کرنا ایک نہایت شوق آموز دلچسپی تھی اس تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کے طریق کار کا پورا پورا تجزیہ کیا جائے۔

جب پارلیمنٹری سرگرمیوں کے اندرونی کارخانہ کار معلوم کر لیا جائے اور اس خصوصیتوں اور اصولوں کے مل ہو جانے پر یہ معلوم کر لیا جائے کہ ان کو بھیجنے کی روایت کے حقیقت کی روشنی میں نگاہ کر کے دیکھا جائے تو چاروں طرف اندھیری اندھیر انظر آتا ہے۔ پارلیمنٹری نظام کے حامی یوں تو ہر وقت حقیقت نمائی کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن لطف تب ہے کہ خود ان کے دعوی کی تحقیق بھی حقیقت اور محض حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کی جائے حقیقت نمائی کے اصول پر رائے قائم کی جائے اور پھر اسی بنا پر فیصلہ بھی صادر ہو۔ جب ان معززین اور ان کی سرگرم زندگیوں کے اصولوں کی چھان بین کی جائے تو انسان حیران و پریشان رہ جاتا ہے اگر ہم پارلیمنٹری اصولوں کو حقیقت

ثمانی کے معیار پر جانچیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان سے بڑا اصول شاید دنیا میں موجود نہ ہو گا۔

جمہوری تجربات اندیشہ ہوتے ہیں

اس کلیہ کی تحقیق کرتے وقت ہم ان تجربات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے نمائندوں کا انتخاب کیا جاتا ہے ہم ان طریقوں سے بھی درگزر کر لیتے ہیں جو عہدے تفویض کرتے وقت ہوتے ہیں خطابت حاصل کرنے کے دوران میں سرزد ہوتی ہیں یہ صاف ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل انتخاب سرانجام پاتا ہے اس میں عوام کی خواہشات اور ضروریات کا حل ہونے کے بارے میں ہر شخص اپنے علم الناس کی سیاسی ذہانت کا صحیح تخمینہ ہے وہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ عامۃ الناس کی سیاسی ذہانت کا صحیح تخمینہ ہے وہ آسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ عامۃ الناس کی بصیرت کی حد کہاں ہوتی ہے وہ خود کو سیاسی کلیات قائم کرنے میں۔ ہندی ان میں یہ استعداد ہے کہ وہ اپنی رائے پر عمل درآمد کرانے کے لیے صحیح کارندے چن سکیں۔

رائے عامہ ہوتی کیسے بنائی جاتی ہیں

"رائے عامہ" کی جو بھی کوئی تعریف کریں وہ ہر صورت مانا پڑے گا کہ اس رائے میں ذاتی تجربہ یا ذاتی بصیرت کو رائے دہی دخل ہے۔ اور زیادہ تر رائے عامہ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ امور متعلقہ کے متعلق عوام کو کس قسم کی "واقفیت" بہم پہنچائی جائے وہ واقفیت بہم پہنچانے کا انتظام جیسا اثر اور مستقل ہو گا ویسی ہی رائے عامہ کو اپنے نباہ کے ساتھ بنا کر لے جائے گا۔ مذہبی حلقوں میں بھی دیکھو ہر فرقہ کے عقائد اور اوہام تعلیم کا نتیجہ ہیں مذہب کی قدرتی پیاس جو ہر انسان کے اندر ودیعت ہے وہ تو اسی طرح خلقی ہے جیسے کہ خود وہ خیالات مذہب کے جنہیں وہ سکھائے جانے کا اثر ہے علی ہذا القیاس عامۃ الناس کے سیاسی عقائد بھی ہوا کرتے ہیں جو ایسے ہی تاثرات کی بدولت ہوتے ہیں جیسے مذہبی تاثرات ہیں جو ہمارا تلزم انسان

کے جذبات و رجحانات کو اپنے آہنگ پر لے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ
مافوق الفطرت مستقل مزاجی سے کام لیا جائے تو ان تاثرات کو برقرار رکھنے
میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

پارلیمنٹ دائیں اختیارات کا کھلونا ہے

سیاسی تعلیم و تربیت کا موثر ترین حربہ اشارات کے ہاتھ میں ہے اس حربہ کا مفہوم ادا
کرنے کے لیے بہترین لفظ "پراپیگنڈا" ہے۔ مقصد لوگوں کو سیاسیات کے متعلق "
واقفیت" بہم پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی اشارات ہیں گو اشارات تعلیم گاہوں
کے مشابہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ تعلیمی سرگرمی حکومت کے ہاتھ میں نہیں بلکہ
ان لوگوں پر جو اس کی حاکموں کا قبضہ ہے جس کا ایک حصہ زیادہ تر قبل جنگ سے تعلق
رکھتا ہے میں بھی وہاں موجود تھا جب سر کر رہا تھا کہ مجھے ان لوگوں کے متعلق واقفیت
حاصل کرنے کا موقع ملا جو عوام کی رہنمائی کرنے والی اس مشین کو چلاتے تھے ساتھ ہی
ساتھ میں نے ان اغراض کی بابت بھی تحقیق کی جو اس مشین کے ذریعہ پھیلائے
جانے والے نظریات سے پورا کرتے تھے۔ پہلے پہل جب مجھے علم ہوا کہ سلطنت کے اندر یہ
کسی امر کا کہ وقت ہے تو میں حیران رہ گیا اشارات تھوڑے ہی عرصہ میں جو واقعات
چاہتے تھے عوام میں رائج کر دیتے تھے اور کرتے ہوئے عوام کے اصلی واقعات اور
رایوں کو بالکل مسخ کر دیا جاتا۔ اشارات جب چاہتے کسی معمولی سے معمولی مسئلہ کو چند
ہی روز میں بڑھا چڑھا کر ایک قومی اہمیت کا سوال بنا دیتے۔ ضروری مسائل کو نظر انداز
کرتے ہوئے لوگوں کو توجہ سے ہٹا کر بس پشت ڈال دیا جاتا۔

صحافت سفلوں کی پرورش کرتی ہے

اشارات کے پاس ایک جادو تھا کہ وہ چند ہی ہفتوں میں گمنام لوگوں کے نام
مشہور کر دیتے وہ پوری کامیابی کے ساتھ ثابت کر دیتے تھے کہ عوام کی سیدھی نہیں
ناموں کے ساتھ وابستہ ہیں اشارات [illegible] کو بہادر ثابت کر دیتے کہ کوئی بھی

معنوں میں قابل شخص شاید عمر بھر میں بھی ایسی ایک ماہی حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ ماہر
ماہی یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان حالات میں کیا جاتا جبکہ یہ تمام قطعاً گمنام ہوتے تھے۔
تجربات نے جب سے انہیں ہاتھ پر چلانا شروع کیا اس سے ایک مہینہ پہلے کسی نے
کا ذکر بھی سننے میں نہ آیا تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات اور زندگی کے دوسرے
شعبوں میں پرانی اور آزمائی ہوئی تخصیصیں عوام کے حافظے سے فراموش کر دی جاتیں گویا
دوسرے جنم میں حالانکہ وہ کل تندرست اور ان کے قوی پورے چاق و چوبند ہوتے تھے
بعض اوقات ان لوگوں کو بڑی بڑی طرح ناکام کیا جاتا کہ گویا تھوڑے ہی عرصہ میں ان
کے ہاتھ دماغ قابلیت ذہین کھیلنے کے لیے ضرب المثل بن جائیں گے انہیں نہایت برے
راستہ پر ڈال سکتے تھے اس برائی کا احساس کرنے کے لیے وہ معاشی بہبود ہیں کی ایک
جانچ کی تحقیق کرنا ہوگی تھا وہ جانچ یہ تھی کہ شریف اور باعزت لوگوں پر عائلت اور بیکار
پھیلا جاتا۔ انہیں گالیوں اور بہتانوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ایک وقت ہزار اور ہزار
آوازیں ان کے خلاف ایک زبان طوفان بے تمیزی پیدا کر دیتی تھیں کہ گویا کوئی افسوں
پڑھ کر پھونک دیا گیا ہے۔

ان رہبران ذکوان کو کسی حربے کے استعمال سے عار نہ تھا۔ شرط فتح یہ تھی کہ کسی نہ کسی
طرح ان کے اپنے بنائے منصوبے پورے ہو جائیں۔

اخبار نویسوں کا "پیشہ ور راہ گزار" ایک ڈھونگ ہے

یہ لوگ خواہ مخواہ پیشہ ور خانہ بدوش راہوں کی پہچان میں کرتے پھرتے
تھے۔ جس آدمی کو انہوں نے پہچانا ہوا ہوتا جب تک اس کے خلاف کوئی مواد جمع نہ
ہو لے انہیں چین نہ پڑتا تھا۔ پھر چاہے وہ بات کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو یا اس کی
شہرت غلط کر کے ہی دم لیتے۔ اگر اس جاسوسی کا تجربہ کار اس شخص کی ذاتی زندگی
میں کوئی قابل اعتراض شے نہ پاتا تو پھر بھی ان کی زبان بند رکھنے سے بند نہ ہوتی
تھی۔ وہ کہتے تھے کہ چاہے بظاہر تو وہ بڑی اچھی ہے پھر بھی ہماری مدد کی ہوئی ہوگی اور

تو صرف کرے گی کہ تیجہ یہی ہوتا کہ ظلم غریب کے لیے اپنی صفائی کی کوشش جاری
رکھنا محال ہو جاتا تھا۔ وہ یوں کہ ایک الزام لگانے والے کے ساتھ کئی تائید
کرنے والے ہوتے۔ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد وہی بہتان نئی شکلیں بار بار دہرائی
جاتی تھیں مزید برآں یہ بہتان لگانے والے کبھی ظاہر نہ کرتے تھے کہ ان کی نیت میں کسی
ایسے مقصد کو دخل ہے جیسے کہ عام لوگوں کی دشمنی کے باعث ہو کرتے ہیں حاشا وکلا
یہاں تو جو معاش اپنے معاصرین کو ذلیل بے حیائی سے بدنام کرتا، وہ ساتھ ہی اپنے
سر پر صاف گوئی کا سہرا بھی باندھ لیتا تھا۔ وہ اس طرح کہ بظاہر تو یہ زبانی کلامی تھی
بلکہ حقیقت ایک نہ رکنے والے کے بے غرض بیان کرنے اس کے متعلق ہوا اس کی جانی
تھی بلکہ ایسی ہی دوسری مضمون باتوں سے مطلب برآری کرنی جانتی۔ جب علماء اور
کائرنسوں کے موقعہ پر یہ لوگ کندی چھریوں کثیر تعداد میں جمع ہو جاتیں تو وہاں عزت
کے ایک خاص قسم کے متعلق بہت سے مناظرہ پیش ہوتے تھے ان لوگوں نے عزت
کی اس قسم کا نام "بہادر لوگوں کا پیشہ ور" رکھا ہوا تھا بعد ازاں اس مناظرہ
بازی میں ہر ایک دوسرے کی مدح و ستائش کا دھوکہ دیا جاتا۔

یہ ہیں وہ خصوصیات جو ہم نے "عامہ" کے گھڑنے میں ہوتی ہیں زیادہ
دخل رکھتے ہیں پھر کسی رائے عامہ کے اثرات سے متاثر ہو کر ریاست کی راہ اصلاحی عالم
وجود میں آتی ہے۔

پارلیمنٹ انسانی گمراہی کا مندر ہے

اگر کوئی شخص پارلیمنٹری طریق عمل کے تمام مرحلے بیان کرنے چاہے۔ اور اس کی
کھوکھلی اور غلط بنیادوں کا پتہ چلانا چاہے تو اس کے لیے تو کئی جلدیں درکار
ہوں گی لیکن تعصبات کو نظر انداز کر دیا جائے اور سارے نظام کو ذرا کھلی نگاہ سے دیکھا
جائے تو جو کچھ میں نے اوپر کہہ دیا ہے وہ بھی کافی ہے اس سے ایک سادہ سے سادہ اور
بھولے سے بھولے انسان کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اب وہ پارلیمنٹری دھوکے کو

حقیقت شناسی کی نگاہ سے دیکھئے اس کی بیہودگی کا احساس کرنا کچھ مشکل نہیں۔

پارلیمنٹری نظام انسانی گمراہی کی یہ عبارت ہے یہ نظام جتنا بیہودہ ہے اتنا ہی ضرر رساں بھی ہے اس حقیقت کو سمجھنے کا بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ پارلیمنٹری جمہوریت کا مقابلہ قرآن جس کی اصلی جمہوریت سے کیا جائے۔

پارلیمنٹ موقعہ پرستوں کا ہجوم ہے

پارلیمنٹری جمہوریت کی سب سے زیادہ قابل غور خصوصیت یہ ہے کہ چند لوگ ..... غرض کر بھانت بھانت کے ..... جن میں اب کچھ عرصہ سے عورتیں بھی شامل ہیں ..... پارلیمنٹ کے لئے منتخب کر لئے جاتے ہیں یہ انہیں اختیار ہے کہ ہر ایک بات میں اور کسی معاملہ میں جس طرح چاہیں قطعی فیصلہ صادر کر دیں۔ بظاہر دیکھا جائے تو یہی لوگ حکومت کے وارث پر قابض ہیں اگرچہ وہ ایک کابینہ منتخب کر لیتے ہیں جو بظاہر امور حکومت کا انتظام کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو کابینہ کا کوئی وجود نہیں اصلیت یہ ہے کہ تمام زمام وزارت پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ یہی وزارت سے کوئی جواب طلبی کی جا سکتی ہے وہی ہیں کہ فیصلہ کا اختیار وزارت کو ہوتا ہے نہیں۔ فیصلہ کا اختیار تو پارلیمنٹ کی اکثریت کے ہاتھ میں ہے کابینہ محض اکثریت کے ارادے پورے کرنے کے لئے ایک آلہ کار ہے۔ کابینہ کی بساط تو بہت کا بھیارے دے کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنے تئیں کہاں تک اکثریت کے مطالبات کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ یا اکثریت کو کہاں تک اپنی تجویزیں منوا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزارت کو ایک حاکم کا سی حیثیت ترک کر کے ایک گداگر کی طرح ہر بھائی اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قدم سے پہلے کابینہ کو ہر قدم اکثریت کی رضامندی حاصل کرنے کی فکر لاحق رہتی ہے۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو پھر کابینہ کو اپنے منصب سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ نئی اکثریت قائم کرنے کی تجویزیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی کوشش کامیاب ہو گئی تب تو کابینہ

کچھ تھوڑے عرصے کے لیے ہو حکومت کرتی رہتی ہے اور نہ اکثریت حاصل کرنے میں ناکامی ہو تو اس کا مستقل ہونا لازمی ہے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی غیر حکومت کی حکومت عملی درست تھی یا غلط۔

نتیجہ یہ ہے کہ عملاً کوئی وزارت برقرار نہیں رہتی۔ ایسی صورت حالات سے کیا کیا نتائج پیدا ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ہر صاحب عقل انسان بآسانی لگا سکتا ہے۔ اس کا سمجھنا نہایت آسان ہے۔

الیکشنوں سے مدبر پیدا نہیں ہوا کرتے

چونکہ ہم نے منتخب کردہ پانچ سو نمائندے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتے آئے ہیں۔ ان کی سیاسی قابلیتوں میں نمایاں درجہ کی تفاوت پائی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ سارے ملک میں متضاد عناصر بھرے پڑے ہیں۔ اصل واقعات اس قدر کا نقش نہایت دھندلا سا کیا بیت پیش کرتا ہے۔ یقیناً کوئی شخص بھی کر سکتا کہ قوم کے یہ منتخب نمائندے کوئی بڑے دور اندیش ہیں۔ بادل دیدہ کا دماغ رکھتے ہیں۔ کون بے وقوف کہہ سکتا ہے کہ ووٹ کی صندوقچی میں ہر پہلی ڈال کر بالکل بیکار ہوں مدبر پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہر پہلی ڈالنے والے تو خود معمولی قابلیت کے مالک ہوتے ہیں اس حقیقت واضحہ کی جتنی مذمت کی جائے تھوڑی ہے کہ تمام مرد و زن کو ووٹ کا حق دے کر غیر معمولی قابلیت کے انسان پیدا کیے جا سکتے ہیں ہاں تو جس جگہ میں کسی قوم کے ہاں کوئی صحیح مدبر پیدا ہوا ہے ایک نہایت مبارک زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے مدبر ہر ملک و وقت بیکاروں کی تعداد میں نہیں لگ جایا کرتے۔ دوسرے ہر لحاظ سے قابلیت رکھنے والے شخص کے خلاف عام طور پر الناس میں ضد ایک خاصیت کا جذبہ پایا جاتا ہے کسی صحیح معنوں میں بڑے آدمی کو الیکشن کے ذریعہ تلاش کر لینے کی نسبت لاٹری کے ذریعہ میں سے گزارنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

تاریخ کے تمام ایسے واقعات جو عامۃ الناس کی معمولی سمجھ سے بالا سمجھے جاتے ہیں

کلاوہ شہر کی ایک مخصوص کی جوں بھی سے تصور پڑ ہوتے رہے ہیں۔

برعکس اس کے یہاں پر ہی سو آدمی اکٹھے ہیں کر قوم کے اہم ترین معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں بلکہ ان پانچ سو کی ذہنی قابلیت کا معیار اوسط سے بھی کم ہے یہ لوگ کابینہ منتخب کرتے ہیں اور کابینہ اس کے سامنے میں اس کو توقیر محل کی رضامندی حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

قانون سازی کے ہر مرحلہ پر اس کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے مقصد یہ کہ جس حکمت عملی پر عمل درآمد ہوتا ہے وہ درحقیقت پانچ سو آدمیوں کی حکمت عملی ہے۔

کی یہ ہے کہ اکثریت کھوئی دیکھا جائے تو یہ حکمت عملی بھی اپنے سرشت کے لحاظ سے بھی رکھی ہوتی ہے۔

پارلیمنٹ "ہر فن مولا" اہل اکھکوں کی انجمن ہے

آپ ہم بکواس کے لیے ان نمائندوں کی ذہنی قابلیت کو نظر انداز کیے دیتے ہیں اور خالی یہ دیکھتے ہیں کہ اس کام کی تربیت کیا ہے جس کے سپرد کیا جاتا ہے یہ حقیقت مد نظر رکھنی چاہیے کہ ان مسائل پر بحث و تمحیص کرنے میں کامل ہوتا ہے وہ مختلف اور قسما قسم کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو ذرا بھی شک نہیں کہ جو کام حکومت ایسے معاملات پر فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل ہے اس کی ایک کمیٹی کو سونپ دیتا ہے وہ کیا کرے گا۔ بالکل طرفہ یہ ہے کہ اس ساری مجلس میں ان لوگوں کی تعداد نہ ہونے میں نمک کے برابر بھی نہ ہوگی جنہیں وہ علم و تجربہ حاصل ہو جو ایسے مسائل طے کرنے کے لیے درکار ہے ہم سے اہم قضیہ ہی مسائل ایک ہی عدالت کے اختیار میں دے دیتے ہوتے ہیں اس کے اراکین میں سے دسویں حصہ کو بھی مکمل قضیہ ہی معلومات حاصل ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بڑی فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اتفاقی تربیت سے بھی کورے کورے ہیں۔ حالانکہ یہی تربیت مسائل زیر بحث پر رائے دینے کے قابل بنا سکتی ہے۔

یہی حال دوسرے تمام مسائل کا ہے ہمیشہ جانوں اور مالوں کی کثرت ہر قدم کا فیصلہ کرتی ہے۔ پارلیمنٹ کی تو بھی مجال ہے اس میں کوئی تبدیلی ہوتی نہیں لیکن فیصلہ طلب معاملات قومی زندگی کے ہر لمحے پیش آتے ہیں سوچ سمجھ کر رائے دینے کا امکان بھی ہو سکتا تھا اگر مختلف مسائل طے کرنے کا اختیار مختلف رکھن کو ہو جاتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ وسائل آمد و رفت پر رائے دے سکتے ہیں وہی خارجی سیاست عمل پر بھی مؤثر رکھتے ہیں یہ تو صرف بھی ہو سکتا ہے جب تمام رکھن ہر فن مولا ہوں اور ان میں سے ہر شخص ایک مروجہ کا مرتبہ رکھتا ہو۔ لیکن اس موقعہ پر یاد رکھنا چاہیے کہ مروجہ تو کہیں ہر سو سال کے بعد ایک پیدا ہوتا ہے مروجہ کا کہ پارلیمنٹ میں ہر مالی اور ان کی بھی کمی ہے یہاں تو بس زبانی جمع کے ہم رنگ مختلف ہوتے ہیں کہ تاج ہو۔ وزیر خزانہ صنعت فروش کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ معزز شرکا مسائل پر غور کرنے اور انہیں حل کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسے بے تدبیر اکثریت کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ یہ ایسے دقیق مسائل ہوتے ہیں کہ جن پر کوئی بڑے سے بڑا مالی دماغ بھی سوچنے بیٹھے تو اسے خون پسینہ ایک کرنا پڑے۔ جن اہم اور نازک لمحوں پر سلطنت کی آئندہ زندگی کا انحصار ہے ان کو نمٹانے وقت ایک ایسا ماحول ہوتا ہے کہ گویا ہوش کھیلنے بیٹھے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ قوم کی قسمت کے ناخدا بننے کے بجائے الگ بیٹھ کر تماشا ہی دیکھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اب کیا ہم یہ فرض کر لیں کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن صفاتی لحاظ سے بے عیب و مبرا پیدا ہوتا ہے؟ یہ فرض کرنا تو پیدائشی قیاس کے خلاف انصاف ہوگا۔

پارلیمنٹ جذباتوں کا تکیہ ہے

یہ کلام نظر کو ایسے معلومات پر رائے صادر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے جن کے متعلق انہیں کچھ کو قابلیت نہیں ہوتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انفرادی اخلاق گرتا چلا جاتا ہے کسی شخص کو یہ کہنے کی ہمت باقی نہیں رہتی کہ "میں نہیں جانتا" افسوس ہے ہم ان مسائل پر

گفتگو کر رہے ہیں لیکن ان کے متعلق بہ طور عہدیدار کم از کم میں اپنی رائے تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے زیر بحث معاملات میں کوئی دخل نہیں" یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ اعلان کر بھی دے تو اس سے صورت حالات میں کوئی زبردست فرق پیدا نہیں ہوگا اسی صفات کوئی ہو رازداری کی قدر کون کرتا ہے جو شخص اس طرح کھلے کھلے حق بات کہہ دے اس کی بات خیال کیا جائے گا کہ وہ ایک خاصا شریف گھرانا ہے تو سارا کھیل خراب کرنے کی اجازت نہ دینی چاہیے۔ جن لوگوں کو کسی نہ کسی کے متعلق واقفیت ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی اپنے ساتھیوں میں اچھا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا۔ بعض حلقے ایسے ہیں جہاں رازداری کو حماقت کا نشان تصور کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک نظر چالیس آدمی پر مشتمل کابینہ منتخب ہو جائے تو وہ بھی آخر کار دوسروں کی طرح عمل اختیار کرنے پر راغب ہو جاتا ہے یہ طرز عمل معاہدہ رازداری کے منافی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ شخصی طور پر کسی فیصلہ میں شرکت کرنے سے احتراز بھی کیا جائے گا تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق نہ آئے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رازداری کا تصور بالکل زائل ہو جاتا ہے جو بھی کسی نہ کسی شخص کا عہدیدار کر دیتا ہے وہ بھی مردود ہو جاتا ہے۔ ایوان کا ایک ممبر یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے کہ میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے تو مختلف نہیں ہوں میں ان کے طرز عمل میں شریک ہوں تو ممکن ہے وہ کوئی اس سے بھی بری روش اختیار کریں۔

یہاں ممکن ہے طریق مخالف کی جانب سے جواب دیا جائے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ انفرادی طور پر ہر ایک رکن اتنا علم نہیں رکھتا کہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہونے والے مختلف مسائل پر صحیح رائے کا اظہار کر سکے لیکن تمام ارکین کا فیصلہ ان کی پارٹی کے تابع ہوتا ہے ہر پارٹی ہر سیاسی معاملہ میں ان کی راہنمائی کرتی ہے علاوہ ازیں مسائل زیر بحث طے کرنے کے لیے پارٹی ماہرین کی خاص کمیٹیاں مقرر کرتی ہیں ان ماہرین کو عوام سے زیادہ علم ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ سے سازشی سیاست کو فروغ ہوتا ہے

پہلی نظر میں تو یہ دلیل معقول دکھائی دے لیکن یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب "اہم ترین مسائل کا فیصلہ کرنے کی عقل صرف چند آدمیوں میں پائی جاتی ہے تو یہ چند سو افراد کس طرح کسی مقصد کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے؟"

ہمارے زمانہ کے جدید پارلیمنٹری نظام کا مبنائے نظریہ یہ نہیں کہ وقت کار اور دیگر معاملات کی کوئی مجلس عام کی جائے۔ ہرگز نہیں۔ یہاں تو مقصد صرف یہ ہے کہ چند ایسے افراد منتخب کیے جائیں جو اپنی رائے عام کرنے کے لیے ہر وقت دوسروں کے سامنے ہوں۔ ظاہر ہے کہ خواص کا حلقہ نظر عوام سے وسیع ہوتا ہے اور ان کی قیادت کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے آج کل پارلیمنٹی حکومت عمل کا آغاز کیا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حکومت عمل کا مفہوم ہی بگڑ چکا ہے اس مقصد کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل اقتدار کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو پردے کے پیچھے رہ کر کام کرتا رہتا ہے کیونکہ وہ خود پوشیدہ ہے لہٰذا اس سے کبھی اس کے اعمال کی پرسش نہیں کی جا سکتی۔ یہی علامت کی برکت ہے کہ چاہے پتہ چل جاتا ہو کہ اصل فساد کی جڑ کون ہے، اور چاہے قوم کے سیاسی حیثیت مجموعی اس شخص کے فیصلے کے بارے میں کیسی ہی رائے کیوں نہ رکھتی ہو، پھر بھی اسے کسی ایک فیصلہ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تمام ذمہ داری کا بوجھ پارٹی کے کندھوں پر ہے۔

عملاً دیکھیے تو کوئی ذمہ داری ہوتی نہیں۔ ذاتی ذمہ داری ایک ذہنی فریضہ کا نام ہے جو کام پارلیمنٹ میں بیٹھ کر بحث کرنے والوں کے سپرد کیا گیا ہے جو کبھی اس پر ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔

پارلیمنٹ یہودی ذہنیت کا ترجمان ہے

پارلیمنٹری نظام نقطہ نظر کے ہم جنس لوگوں کے لیے جاذبیت رکھتا ہے کیونکہ انہیں کھلے کھلے بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ کوئی ایسا انسان جو اپنے اعمال کی ذمہ

داری قبول کرنے پر تیار ہو جائے گی کسی ایسے کام کی جانب راغب نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کی یہ مثل ایک ایسی نعمل کے ہاتھ میں آلہ کار بنی ہوئی ہے جو چھپ چھپ کر اپنی مقصد برآری کرنا چاہتی ہے اس خطرہ کی وجہ یہ ہے کہ اس اندرونی مقاصد کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ یہ قوم ہمیشہ صاف گوئی سے گھبراتی رہی ہے یہ عمل آمدہ بھی اسی طرح کام کرے گا جس طرح کام کرنے کی کوشش کرے گی۔ یہ کام مطلوبہ ایک بیرونی کی طرح قریب کار ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کام کی قریب ایک بیرونی ہی کر سکتا ہے۔

صاحب سیرت قیادت کی اطاعت یہی جمہوریت ہے

برخلاف اس قسم کی جمہوریت کے، ہم ان قوموں کی جمہوریت صحیح معنوں میں جمہوریت کہلانے کی مستحق ہے ہماری جمہوریت کی رو سے کام ایک کھلے انتخاب کے ذریعہ چنا جاتا ہے مگر اس قاعدہ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال اور فروگذاشتوں کی ذمہ داری قبول کرے۔ عمل صاحب مسائل حکومت قرار کے معیار سے فیصلہ نہیں کیے جاتے، بلکہ ان کا اہتمام شخصی طور پر کیا جاتا ہے۔ جو شخص یہ فیصلے صادر کرنے کی ذمہ داری سنبھالتا ہے اسے اپنی تمام دنیاوی معاملات کی ضمانت دینا پڑتی ہے حتیٰ کہ اس کی جان بھی گرو ہو جاتی ہے۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسی جان جوکھم میں ڈالنے کے لیے تو کوئی ایک شخص آمادہ بھی عمل ہو جائے گا اس اعتراض کا جواب حسب ذیل ہے

ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ ہماری قوم میں جمہوریت کا اعلیٰ مزاج خود بخود ایسے بے اصل شخص کو علیحدہ رکھتا ہے جو شخص ذمہ داریوں کا عہدہ کرنے کی فکر میں ہو۔ ایسے لوگ دماغی قابلیت کی رو سے ناکارہ اور اخلاقی حالت سے مخلص کر مطلب کے پتلے ہوتے ہیں وہ کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے حلقہ میں کی مدد سے کسی طرح قوم پر مسلط ہو جائیں۔ ہماری جمہوریت کے ماتحت ان کی دال نہیں گل سکتی۔ ان ذمہ داری کا خوف

تمام جاہل ہو گئے تو دنیا کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اگر کہیں ایسا کوئی شخص پوری چھپ کھس بھی آئے تو اسے شناخت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسے بغیر کسی روایت کے بھی فوراً نظر میں خطاب کیا جائے گا۔"

ارے او مغائل دور ہو جا۔ پیچھے ہٹ جا کہ قدموں سے اس مقدس منصب کی بے حرمتی مت کر یہ قیادت کا منبر ایک ایسی جگہ ہے جس کی شان گزشتہ اور آنے والی نسلوں کی نگاہوں میں مسلم ہے یہاں روزگار کے متلاشی بھرتی نہیں کیے جاتے یہاں تو اعلیٰ سیرت کے انسانوں کی ضرورت ہے۔"

وہ یہاں تک کہہ کا کی پارلیمنٹ کی سیر دیکھنے کے بعد یہ تھے میرے تاثرات اس کے بعد میں نے پارلیمنٹ جانا ہی ترک کر دیا۔

پارلیمنٹ سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے

رفتہ رفتہ سترہویں صدی کے آخری دنوں میں پارلیمنٹری طرز حکومت ریاست کی طاقت گھٹانے کا ایک سبب بن گیا۔ اس عنصر کا اقتدار پارلیمنٹری طریق کار کے باعث روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں یہ اقتدار کم ہوتا تھا توں توں دیگر مختلف اقوام کو ابھرنے کے مواقع ملتے جاتے تھے۔ ان کی جائیں بھرتی ہوتی تھیں۔ ان مرکزی پارلیمنٹ کے طاقت ور کرسب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئے تھے کہ گذشتہ صدی کے دوران میں ایک سادہ لوح سے سادہ لوح انسان کو بھی نظر آ رہا تھا کہ برطانیہ کی سلطنت کو مجتمع رکھنے والی صلاحیتیں، اقتدار کی قوتوں سے سرانجام دینے کے لیے کافی نہیں۔ صورت حالات اس کے برعکس تھی۔

حکومت اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے جو قوانین بناتی وہ روز بروز پہلے سے زیادہ بہت بھی کا اظہار کرتے تھے نتیجہ یہ تھا کہ اسی رفتار سے لوگوں کے دل حکومت کے احترام سے خالی ہوتے جا رہے تھے۔ یہ صرف انگریز ہی نہیں بلکہ وہ تمام دوسرے مختلف صوبے جن میں مغلیہ سلطنت کے لوگ آباد تھے اپنے آپ کو اب اس سلطنت سے جدا محسوس

طبال کرنے لگے تھے جس نے ان سب کو ایک کر رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس وزارت کے کمزور ہونے میں بھی کوئی نقصان نہ دیکھتے تھے وہ تو الٹے اس کے پیمانہ کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے وہ اس انتظار میں تھے کہ یہ سلطنت آپس میں لڑے مرے گی۔ انہیں اس کے بچاؤ ہونے کی کوئی تمنا نہ تھی۔

پارلیمنٹری سرکار زمانہ ساز بن جاتی ہے

اگر ابھی تک مکمل سرنگونی میں کوئی کسر ہوتی تھی تو وہ صرف اس وجہ سے کہ ہر قسم کے گستاخانہ مطالبات کے سامنے جھک کر وہ ذلیل ہو کر کسی نہ کسی طرح بچائی جاتی تھی۔ یہ مطالبات پیش کرنے میں ہمیشہ ڈرموں کا سرغنہ ہوا کرتا تھا۔ ملک بھر میں جہاں کہیں ضرورت ہو حکومت کے پاس مداخلت صرف یہی ہی رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ مختلف قوام کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے بحیثیت مجموعی اس طرز عمل سے ڈرموں کو زیادہ نقصان پہنچ رہا تھا۔ بالخصوص جب سے شنزہ وہ آرچ ڈیوک فرانز فرڈی نینڈ ولی عہد مقرر ہوئے جب سے تو چیک قوم کی طاقت بڑھانے کی پالیسی کو ایک منظم حکمت عملی کی شکل دے دی گئی حکومت کے نظم و نسق کے بالائی عہدوں سے لے کر نیچے تک ہر طرف چیک ہی چیک بھرے جا رہے تھے شنزہ کے ولی عہد بہادر خود اس حکمت عملی کی پشت پناہ تھے جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ڈرموں عنصر کا تقدار دبا دیا جائے کم از کم اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شنزہ وہ اس حکمت عملی کا حامی تھا آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ شنزہ کے اختیار کس قدر وسیع تھے سرکاری افسروں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے خالص ڈرمن اصلاح بھی اس پر اثر انداز میں شامل کر دیے گئے جہاں تعلیم دلائیں وہاں تھیں مگر اس عہد بندی کو قطعی قرار دے دیا گیا ہنگری آسٹریا میں بھی یہی کارروائی روز افزوں تیزی کے ساتھ جاری تھی۔ حتیٰ کہ بچوں کو سکول ہونے لگا تھا کہ وہ ان کا سب سے بڑا شر ہے۔

دین کو دنیا کے لیے استعمال کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا

خاندان ہیبسبرگ کے اس فرمانروا کے خاتمے کے ساتھ ہی چیک قوم کو آزادی مل گئی تھی۔ شہزادی کی رخصتی ایک چیک نوجوان سے ہوئی تھی۔ شہزادہ سے اس کی شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ اسے شاہی اعزاز میں سے کوئی حصہ نہ ملے گا اور اس کی اولاد بھی تخت کی حقدار نہ ہوگی وہ ایک ایسے ماحول سے آئی تھی جہاں ڈرموں کے برعکس آزادی کی حمایت بھی آئی تھی شہزادہ کے دوستوں پر یہ خیال غالب تھا کہ وسط یورپ میں ایک متوازن سلطنت قائم کی جائے اس سلطنت کی بنیاد میں خاندان ہیبسبرگ کی حکومت پر رکھی جائیں تاکہ آسٹریا کو عثمانی حکومت کے یورپی علاقوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط مرکزی قائم ہو جائے غرض جیسا کہ ہیبسبرگ خاندان کا پرانا دستور تھا یہاں بھی مذہب کو ایک خالص سیاسی مقصد برآری کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ جہاں تک ڈرموں کا تعلق تھا اس کے حق میں یہ بات ایسی زبردست کامیابی تھی اس کے نتائج کی پیشوائی سے انسان ڈر ثابت ہوئے۔

خاندان ہیبسبرگ اور بیسٹوک حکومت دونوں اس انعام سے محروم رہے جس کی انہیں توقع تھی خاندان ہیبسبرگ سے تو تاج شاہی چھن گیا اور بیسٹوک حکومت ایک بڑی سلطنت ہاتھ سے گنوا بیٹھی مذہبی جوش کو سیاسی مقاصد کی خاطر استعمال کرنے سے ایک بھی روپیہ ہوئی جو اس حکمت عملی کے مرتکبین کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

ڈرموں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک

جب آسٹریا کی قدیم سلطنت میں ہر ممکن طریقے سے ڈرموں کے خاتمے ہونے کی کوششیں ہونے لگیں تو اس کے جواب میں آسٹریا کے اندر سے ہی ڈرموں کے عالمگیر اتحاد کے لیے ایک تحریک کھڑی ہوئی۔

ڈرمن خیالات کی ابتداء انگلستان کے مشہور ماہر جغرافیہ سے ہوئی۔ ان خیالات کے اصول بانی مہتا ہوئی تھے۔ گذشتہ صدی کی نویں قرن کا ذکر ہے کہ آسٹریا میں ڈرمن خیالات ابھی عروج پر تھے ہو کہا جا سکتا ہے کہ عروج کے بعد اب زوال کا آغاز تھا جیسا

کہ قدیم آسٹریا میں قاعدہ قانون کی تحریک کے خلاف جو رد عمل ہوا وہ معاشرتی حالات کی پیداوار نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد قومی روایات پر تھی خود حاکمِ حقیقی کے ذہن نے جرمن عنصر کو پوری قوت کے ساتھ مداخلت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اقتصادی تحریکات نے آہستہ آہستہ کہیں بعد میں یہ کرامیت حاصل کی۔ پھر بھی ان کی اہمیت کالونی ہی رہی۔ یوں تو سیاسی لحاظ سے ہر طرف ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا لیکن بتدریج دو سیاسی پارٹیاں نمایاں ہو گئیں۔ پہلی میں قومیت کا رنگ غالب تھا۔ دوسری معاشرتی مسائل کی جانب زیادہ رجحان رکھتی تھی تاہم دونوں جماعتوں کی تنظیم نہایت ڈھیلی اور مستقل کے بے سبق ہموار تھی۔

اپنوں میں ہر دلعزیزی غیروں پر فتح کا نتیجہ ہوتی ہے

1566ء کی لڑائی آسٹریا کے لیے ذلت کا باعث ہوئی تھی اس جنگ کے بعد ایک عرصہ تک شاہانِ ہیبرگ میدانِ کارزار میں قدم لینے کے منصوبے باندھتے رہے۔ فرانس کے ساتھ تعلقات ہر گھڑی کڑوے ہو جاتے تھے لیکن ہیگ کے ولیم سائلنسیس کے حسرت ناک انجام نے کچھ اس قسم کی سائلنسیس کی ہوا بہم کی ہے پولیس کا اثر کوسوں سے زیادہ کام کرتا ہوا تھا جب فرانسیسیوں نے سائلنسیس کے ساتھ غداری کی تو اس سے آسٹریا میں سخت ہراسمنٹ پھیل گئی۔ باوجود اس کے خاندان ہیبرگ اب بھی موقع کی تلاش میں تھا۔ آخر 1870-71ء کی جنگ ایسی بے نظیر کامیابی پر منتج نہ ہوئی تو خاتمہ آسٹریا کا ورنہ سلطنت ہوا کی کالونی کا مدعا لینے کے لیے پھر کشت وخون کا کھیل کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا۔ جب جرمنی اور فرانس کی پوری حالات سے واقف ہوئیں تو اگرچہ چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن سطحی معلوم ہوتی تھیں ان پر اعتبار کرنا محال نظر آتا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "دنیا کے سب سے زیادہ عقل مند بادشاہ" نے کہلوایا کہ زمانہ کی اگلی کس طرف اشارہ کر رہی ہے پتا چلا جہاں تک اس کے مکان میں قیام نے حالات کی یہ موافقت بظاہر خوشی کے ساتھ برداشت کی۔

ان دو برسوں (1870-71) کی فرانسیسی جنگ نے بسمارک سے بھی بڑا مفکر پیدا کر دکھایا۔ تاجدار ولیم اول کی پالیسی میں اساسی طور پر کسی کوئی تبدیلی ہوئی نہ تھی، یہاں تو ہمیشہ خارجی حالات کے دباؤ سے حکمت عملی میں ترمیم کی جاتی تھی جس شرق میں بسنے والے جرمن قومی کی خواہش سلطنت کی ہوا خواہ شان و شوکت دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ جب انہیں اپنے باپ دادا کے خواب ایک عظیم الشان سلطنت کی شکل میں تعبیر ہوتے نظر آئے تو ان کے دلوں پر کیا اثر ہوا۔

قومی عظمت قومی اتحاد پر منحصر ہے

یہاں واضح ہو جانا چاہیے کہ اس دور کے بعد آسٹریا میں رہنے والے ہر جرمن کو احساس ہو چکا تھا کہ اگر دوبارہ ایک طاقتور سلطنت قائم کرنا ہے تو اس سلطنت کو دقیانوسی معاہدات سے مطمئن نہیں کرنا ہوگا۔ اس سلطنت کو بڑھاپے کے گہوارے سے نجات دلانا ہے تو اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے یہ راستہ آہن و خون کا ہے لیکن اس سے مفر نہیں کسی قومی سلطنت کے قیام سے پہلے تمام جرمنوں کو کسی طرح متحد کرنا ہوگا اس طرح یا کسی اور طرح سیڈان کے میدان جنگ میں فتح پا کر سارے جرمنی کو متحد کیا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب آسٹریا میں رہنے والے ہر ایک جرمن کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ خاندان ہوہنزلرن کا تاریکی دور ختم ہو چکا ہے۔ مستقبل کی سلطنت اسی شہنشاہ کے سپرد کی جا سکتی ہے جو مرد آہن کے سایہ میں پلا ہو، اور جو ہوہنزلرن خاندان کا تاجدار کہلانے کا استحقاق رکھتا ہو۔ قدرت بجا طور پر شہزادہ ولیم کی سزاوار قرار دی جا سکتی ہے کہ اس نے اس مقصد کے لیے فریڈرک اعظم کے خاندان کا ایک نونہال منتخب کیا۔ فریڈرک اعظم نے ماضی میں وہ کارہائے نمایاں سر انجام دیے تھے کہ اب اس کا خاندان آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے عظمت کا درخشاں نشان بنا ہے۔

حکومت سے عامۃ الورود سے بیعت کا فرق

1870-71ء کی جنگ کے بعد خاندان ہوہنزلرن نے جرمنی کو متحد کر دیا کہ آہستہ آہستہ ان عناصر کو مٹا دیا جائے۔ یہ لوگ کہتے ہیں اس کے لیے جدوجہد اور مجاہدات کے متعلق اب کوئی دھوکہ باقی نہیں رہا۔ میں نے "مٹانے" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ جیسا کہ ہر فی کی حکمت عملی سے جو آخری نتیجہ برآمد ہوا تھا وہ مفہوم صرف اسی لفظ کے ذریعہ ادا ہو سکتا ہے اس کے بعد وہ وقت آیا کہ اس قوم کو مٹا دینے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا تھا اس میں علامت کی جنگ لڑی گئی یہ ایک ہی جنگ تھی جس کی مثال جدید تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ قوم ہار گئی اور عنان حکومت چھن گئی۔

یہ لوگ قوم و حکومت کے باغی نہ تھے وہ اس طرز حکومت سے باغی تھے جس کے متعلق انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اس سے خود ان کی قوم تباہ ہو جائے گی جدید تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جرمنوں کی روایتی شہنشاہ پرستی اور ملک و ملت کی قومی محبت دلوں میں ایک کھلی مگر ہو رہی تھی۔

گذشتہ صدی کے آخری دس سال میں جرمنوں کے مابین ایک جو تحریک اٹھ رہی تھی اس نے صاف صاف اور غیر مبہم طور پر ثابت کر دیا کہ کوئی حکومت اپنے اختیارات کی حرمت اور بقا کی وہیں تک حقدار ہے جہاں تک یہ اختیارات قوم کے مفاد کی خاطر استعمال کیے جائیں یا کم از کم قومی مفاد کو نقصان نہ پہنچائیں۔

حکومت ایک ذریعہ ہے کوئی مقصد نہیں

حکومت کے اختیارات کبھی مقصود بالذات نہیں ہو سکتے اگر ایسا ہو تو عالم سے عالم حکومت کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی جا سکے گی سب سے مقدس تعلیم جو ہمیں ملی ہے گا۔

اگر کوئی حکومت اپنی طاقت کے بل قوم کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کرے تو اس وقت حکومت کا یہ صرف ہر شہری کا حق ہے بلکہ اس پر فرض ہے۔

رہا یہ کہ آیا ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں یا کب پیدا ہوتے ہیں تو اس کا جواب

اصولی بنیادوں سے نہیں ہو سکتا اس کا فیصلہ صرف طاقت کر سکتی ہے، ایسے معاملوں کی آخری کسوٹی کامیابی ہے۔

ہر حکومت چاہے وہ بدترین قسم کی حکومت ہی کیوں نہ ہو، چاہتی ہے کہ اس نے قوم کے مفاد سے بڑی طرح غداری کیوں نہ کی ہو، پھر بھی وہ یہی دعوے کرے گی کہ حکومت کا قیام و انتظام اور فرض ہے ہی حکومت کے جو مخالفین قوم کی جان کی خاطر لڑ رہے ہیں انہیں بھی وہی ہتھیار استعمال کرنے چاہئیں جو حکومت استعمال کرتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ اپنے راج کے خلاف کامیاب ہو سکتے ہیں اور اپنے لئے آزادی اور خود مختاری حاصل کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جس حالت کو طاقت دبا رہی ہے، جب تک وہ قانونی ذرائع پر اکتفا کرے گی تب تک اس کا مقابلہ بھی اسی قسم کے ہتھیاروں سے کیا جائے گا۔ اگر حکومت غیر قانونی ذرائع استعمال کرے تو بغاوت کرنے والے بھی بغاوت کا وہ طریقہ اختیار کرنے میں نہ ہچکچائیں گے۔

امت کی حفاظت، حکومت کی حفاظت پر مقدم ہے

ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسان کی زندگی کا واحد مقصد حکومت کا قیام نہیں، بلکہ انسان کی زندگی کا واحد مقصد اپنی امت کو قائم رکھنا ہے۔

اگر کوئی ایسا خطرہ درپیش ہے کہ امت کو مٹا دیا جائے گا یا اس کا نظم و ضبط اٹھ جائے گا تو ان حالات میں قانون کی پابندی محض ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جو حالت بر سر اقتدار ہے وہ تو ممکن ہے کہ محض مزعومہ "قانونی وسائل" پر اکتفا کرے لیکن جن لوگوں پر ستم ٹوٹ رہے ہیں وہ ہر ممکن وسیلے سے کام لیں گے ان کا خود اخلاقی کا بھی احساس انہیں یقین دلائے گا کہ ان کا طرز عمل حق بجانب ہے۔

تاریخ میں غیر ملکی حاکموں کا جوا اتار پھینکنے یا ملکی نظم و ستم کا خاتمہ کرنے کے لیے شاندار جد و جہد کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مذکورہ بالا اصول کو تسلیم کیے بغیر جد و جہد کی یہ

ہمارے ہاں کبھی کامیابی کا راز نہ سمجھتے۔

کمزور کو زندہ رہنے کا حق نہیں

انسانی حقوق حکومت کے حقوق سے بالاتر ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی قوم اپنے انسانی حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور اس جدوجہد میں فتح حاصل کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قسمت کی تلوار میں پوری اتری وہ اس عالم فانی میں زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

بیوپاریوں کے قبضہ میں دینے کے لیے نہیں بنائی گئی اس کے مالک کمزور ہیں۔

علم و ہنر حاصل کرنے والوں کے لیے نام نہاد "قانون" کی آڑ لے کر اپنی جان بچانا ہمیشہ آسان ہوتا ہے آسٹریا اس حقیقت کی ایک واضح اور روشن مثال تھی۔

ہیبزبرگ سلطنت میں قانونی اختیارات کے استعمال کی ہوا تو یارلیمنٹ ہی تھی اور یا شاہی خاندان ہی چونکہ یارلیمنٹ میں جرمن عنصر کی اکثریت تھی اس لیے اس کی روش زمروں کے خلاف تھی علی ہذا القیاس شاہی خاندان بھی زمروں کا دشمن تھا سلطنت کے تمام اختیارات انہیں دو طاقتوں کے ہاتھ میں تھے جرمن عنصر کی حالت کون دو طاقتوں کے درمیان سہارنے کی کوشش حماقت کے مترادف ہوتی جو لوگ "قانون" کے دائرے رہتے ہوئے داد رسی حاصل کرنے اور حکومت کے اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مشورہ دیتے تھے وہ کوئی مزاحمت نہ کر سکتے تھے وہ یہ کہ قانونی وسائل تک محدود رہتے ہوئے کسی قسم کی مزاحمت کرنا ممکن نہ تھا۔ قانون کی پابندی کا مشورہ دینے والوں کی رائے پر چلنا آسٹریا میں رہنے والے زمروں کی تباہی کا یقینی باعث ہوتا۔ اس تباہی میں کچھ کمی ہو بھی سکتی تھی اگر جرمن عنصر کی حقیقت تسلیم کر لی جاتی اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آسٹریا کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔

طاقت اور تشدد کا رتبہ قانون سے بلند ہے

آنکھوں پر چکیں گا کر اصولی کشمکش کرنے والے قوم کے لیے جو خون کرتے ہو

تو تیار نہ تھے البتہ اپنے تجربات کی روشنی میں مرنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

چونکہ انسان خود فانوں گھر بیٹھتا ہے اس لیے اب اسے وہم ہونے لگتا ہے کہ وہ محض فانوں کی نظر ہو چکا ہے اگر اس کارگزاری سے اصول اور عقیدہ کی دنیا میں رہنے والے اور اپنے وہم کے خول کی پوجا کرنے والے ہو چکے ہوں گے لیکن ترکوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک نے ایک سب سے بڑی خدمت یہ سرانجام دی کہ ہی ہاتھ لیوں کا خاتمہ کر دیا۔

جب خاندانی بزرگ نے اسلحہ کرنے کی وہ تمام قسمیں استعمال کرتے ہوئے جو کہ ان کے قبضہ میں تھیں ترکان عصر سے دست بدست جنگ کرتی ہوئی ترکوں کے مالکیہ اتحاد کی پارٹی نے بھی اس "اور ان عالیشان" کو بلغیر کی زمی کے بہت کاری ضرب لگائی۔

یہی پارٹی تھی جس نے سب سے پہلے حکومت کے حالات کی چھان بین کی اور پھر ان کا پتہ چلایا۔ ان کی اس کارگزاری سے لاکھوں بے شعوروں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ترکوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک نے جو عظیم الشان خدمات سرانجام دیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس نے وطن کی محبت کو اس شرمناک شاہی خاندان کے اثر و رسوخ سے آزاد کر دیا۔

تحریکوں کے عروج و زوال کا مطالعہ سبق آموز ہے

پہلے پہل جب یہ پارٹی عالم وجود میں آئی تو کثیر تعداد میں لوگ اس کے پیرو ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ ایک وقت ایسا پیدا ہو گیا تھا کہ یہ تحریک ایک نئے بادشاہ کی صورت اختیار کر جائے گی لیکن بعد میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں بعد میں ان کا تسلسل قائم نہ رکھا جا سکا جب میں دشمنا گیا تو ان دنوں ترکوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک چلانے والی جماعت کریمین یونین پارٹی کے سوشلسٹ ممبر بھی تھی اس دوران میں کریمین یونین پارٹی کے سوشلسٹ ممبر نے کہی تھی کہ یہ ہے کہ ترکوں کے مالکیہ اتحاد کی

تحریک چلانے والی جماعت اب نہ ہونے کے برابر تھی۔

جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک کا عروج و زوال اور اس کے پہلو بہ پہلو کرسچین سوشلسٹ پارٹی کی حیرت انگیز ترقی یہ واقعات میرے مطالعہ کے لیے ایک مستقل اور مستقل موضوع رہے ہیں۔ اس مشاہدہ نے میرے نظریات کی تشکیل پر گہرا اثر ڈالا۔

جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو ان دنوں میری توجہ صرف جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک اور صرف اسی تحریک کے لیے مختص تھی۔

جب میں یہ کہتا تھا کہ اس جماعت میں قیصر ولیم کے خاندان کا نام لے کر "ہاہن زولرن" کہنے کی جرأت ہے تو وہ لوگ مجھ پر ہنس چکے ہیں کہ اپنے تئیں ان حالات کا ایک ایسا جزو ایک تصور کریں گے جو محض عارضی طور پر اپنے وطن اصلی سے جدا کیا گیا ہے تو مجھ پر بڑا اثر ہوتا تھا میری رگ رگ میں محبت کی لہر دوڑ جاتی تھی یہ جماعت اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اس سے میرے دل میں ان کی توقیر و عزت کی اور ان پر میرا اعتماد بڑھتا گیا میری نظر میں قوم کو بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ جرمنوں کے متعلق تمام مسائل کی بابت اپنے حسن لوگوں کے سامنے پیش کیے جائیں اور ان کی سمجھوتہ کر لینے کا خیال بھی دل میں نہ لایا جائے جو بات میری سمجھ سے وہ تھی وہ یہ تھی کہ ایسے شاندار تاریخی کے بعد یہ تحریک ایسی جلد ٹھنڈی کیوں ہو گئی علی الخصوص یہ واقعہ بھی بڑا کم قابل فہم تھا کہ کرسچین سوشلسٹ پارٹی نے اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنی زبردست طاقت کہاں سے پیدا کر لی۔ اس پارٹی کی ہر ایک جزئی انجمن دن دونی رات چوگنی عروج پر پہنچ چکی تھی۔

معاملہ فہمی اور مردم شناسی میں فرق

جب میں نے ان دونوں تحریکوں کا باہم مقابلہ کرنا شروع کیا تو نتیجہ یہ نکلے اس حیرت انگیز معمہ کو سمجھنے کے لیے بہترین راستہ مل گیا جو پہلے نتیجہ نکلے اس راستہ پر

[illegible] سے ملاقات [illegible] کے [illegible] ہو گیا۔

میں نے [illegible] کے حالات سے [illegible] کے [illegible] جو [illegible] کے [illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] کا [illegible] ہے [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] حالات [illegible] کے [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہو گئی۔

جب میں نے ان [illegible] کا [illegible] تو میں نے [illegible] کی [illegible] نظریات [illegible] کے [illegible] سے [illegible] کا [illegible] کے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ذہنی [illegible] ہو گئی۔

[illegible] کی [illegible] کے [illegible] میں [illegible] تھا [illegible] کے متعلق [illegible] میں [illegible] تھا۔

ضرور نہیں کہ جو سمجھتا ہو وہ سمجھا بھی سکتا ہو

[illegible] کے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] تھا [illegible] کے [illegible] تھی۔

خلاف اس کے شور مصلحت اور خلاف مصلحت میں کوئی تفریق نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے بالتمیز اتحاد کے اس علمبردار کے تمام جذبات اصولاً درست تھے لیکن اس میں یہ طاقت اور تجربہ درست نہ تھی کہ اپنے جذبات عوام تک پہنچا سکتا۔ وہ اپنے جذبات کو ایسی شکل میں پیش نہ کر سکتا تھا کہ جذبہ الناس اس کی بھرپور پیروی کرتا۔ وہ ہمیشہ اکیلا ہی رہے گا۔ آسمانی ان جذبات کو سمجھ سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ شنکر کا سارا علم محض ایک صاحب طرز دانش کی حیثیت رکھتا تھا وہ کبھی اپنے جذبات کو عمل جامہ نہ پہنا سکا۔

خلق انسانی کے متعلق اس کی بصیرت کی یہی کمی تھی جس کے باعث اس نے محض تحریکوں کے پس پشت کام کرنے والی حالتوں کا اندازہ لگایا۔ اس نے نظر انداز کر دیا کہ سماج کے پرانے اداروں میں استحکام اور توازن سے جذبات خود ایک مخصوص قوت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

عوام کی پشت پناہی کے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی

شنکر کو یہ تو احساس تھا کہ وہ جن مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں وہ ایک خاص نوعیت رکھتے ہیں لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسے عقائد کو صرف کسی قوم کے جذبہ الناس ہی رائج الوقت کر سکتے ہیں یہ عقیدے قریب قریب وہی نوعیت رکھتے ہیں، جو ایک مذہب کی ہوتی ہے۔

کھاتے پیتے لوگوں میں جو وجد کا جذبہ نہایت کمزور ہوتا ہے وہ فلسفی سے اس حقیقت کے متعلق شنکر کی واقفیت بالکل ادھوری تھی۔ کھاتے پیتے لوگوں کی اس کمزوری کے سبب ان کے کاروباری مفاد ہوتے ہیں۔ ہزار بیشتر اپنے کاروباری مفاد کو نظر میں رکھنے سے چلتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کاروباری جمعیتیں انسان کے کام کرنے میں حائل رہتے ہیں بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک کسی ضابطہ حیات کے لیے جذبہ الناس یہ اعلان نہ کر دے کہ ہم اس کے علمبردار بنیں گے اور جہاں کہیں اور جس حد تک ضرورت ہو، ہم اس کی خاطر مرنے مارنے کو تیار رہیں گے تب تک اس ضابطہ

ہیت کی کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔

باشندگان ملک کے زیریں طبقوں کی اس ہیت کو سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرتی مسئلہ کے متعلق واقفیت نہایت ناقص رہی۔

اس سب باتوں میں ڈاکٹر کارل وکر کو نظر انداز کیا ہے۔ اسے انسانی طبائع کے متعلق گہرا علم تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ جنگ معاشرتی حاکموں اور رجحانات کا صحیح اندازہ کر سکتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ موجودہ لیڈروں کی قوت کا اندازہ کم لگانے کی غلطی سے بچا ہوا تھا۔ غالباً یہی وصف تھا جس کی مدد سے وہ ان لیڈروں کو اپنی سکیم کے حق میں استعمال کرنے میں کامیاب ہوا۔

تحریک کی کامیابی سے پہلے امراء کبھی ساتھ نہیں دیتے

اس نے خوب واضح طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ ہمارے زمانہ میں بالائی طبقوں کی تائید مخالفت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ کسی تحریک کے ساتھ اس وقت تک جنگ نہیں کرتے، جب تک کہ پہلے اس تحریک کو غلبہ حاصل نہ ہو چکا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی ساری جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد باشندگان ملک کے ان طبقوں کو اپنے ساتھ ملا لینے پر مشتمل تھا جن کا اپنا وجود خطرہ میں تھا۔ ڈاکٹر کارل وکر ان لوگوں کے قوائے جنگ کو مفلوج کرنے کے بجائے ان میں ایک عسکری جذبہ پیدا کر دیتا تھا جو ہمارے قدیم سے جڑ پکڑ چکے تھے ان کی مدد اور ممکن طریقہ سے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا مقصد یہ تھا کہ طاقت کے ان پرانے سرچشموں سے اپنی تحریک کے لیے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا ممکن ہے حاصل کیا جائے۔

عمائد دین کو تحریک کا مخالف نہیں بنانا چاہیے

یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے ڈوکر نے اپنی جدوجہد کو اپنی معاشرتی بنیاد متوسط طبقہ پر رکھی یا ایک ایسا طبقہ تھا جسے مٹ جانے کا خطرہ درپیش تھا اس طریقہ سے اس نے اپنے

وہ وقت بھی سے نکل چکا تھا۔

وہ راہ نیتی کے بغیر مصلحت شناسی کام نہیں آتی

یہاں لوکر کے حریف ٹیکر کی بصیرت زیادہ درست تھی ٹیکر لوکر کو بگاڑنا چاہتا تھا اس میں تو وہ بہت حد تک طریقے سے کامیاب ہو لیکن اس کارگزاری سے اسے جس نتائج کی توقع تھی وہ برآمد نہ ہوئے بلکہ اس کے شور نے اپنے سامنے جو پروگرام رکھا تھا وہ اس میں تو ناکام رہا لیکن اس اثرات کا خاتمہ تھا وہ حرف حرف سچ نکلے انہوں نے کہا کہ ان اثرات کی حمایت ایک نہ ہوئی لوگ خود ان میں درست ثابت ہوئی یوں یہ دونوں شخص اپنے متبادل مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہے لوکر آخر وقت تک اپنا ہوشیار آخر تک اپنے والے ترمنوں کو ان سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

ان دونوں پارٹیوں کی ناکامی کے اسباب کیا تھے؟ اس کا مطالعہ ایک ایسا سبق سکھا ہے جو خود ہمارے عہد کے لیے بھی قیمتی ہے۔ وہ خصوص یہ مطالعہ ہمیں رہنمائی کے لیے ایک مفید ثابت ہو گا۔ یہ کہ کئی لحاظ سے موجودہ دور کے حالات اس وقت سے مشابہت رکھتے ہیں اگر ہم ان واقعات سے عبرت حاصل کریں تو ہم ان غلطیوں سے بچ سکتے ہیں جن کے باعث مذکورہ بالا جماعتوں میں سے ایک بھی قوتم ہو گئی اور دوسری سے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

میری رائے میں ترمنوں کے عالمگیر اتحادی تحریک آخر وقت میں ناکام رہنے کی مندرجہ ذیل تین وجوہات تھیں

معاشرتی پروگرام کے بغیر تحریک میں انقلابی طاقت پیدا نہیں ہو سکتی

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس تحریک کے قائدین معاشرتی مسئلہ کی نوعیت کے متعلق اپنے ذہن میں کوئی واضح تصور نہ رکھتے تھے۔ ایک ہی تحریک میں کئی نوعیت سے انقلابی ہو۔ اس کے لیے معاشرتی مسائل کے متعلق ایک واضح پروگرام ہونا کسی خصوص ضروری ہے شاید اس کے قائدین کی یہ ایسی توجیہ کیا نے پیتے لوگوں پر مرکوز تھیں اس کا

نے شروع میں ہی یہ سمجھا کہ کامیابی کے لیے سب سے زبردست شرط اپنے مخلصین
عاملہ الناس میں سے بھرتی کرنا ہے۔ غرض تحریک کھاتے پیتے لوگوں تک محدود ہو گئی
تحریک کے وقار اور بلند پروازی کا معیار ہونے والی قرار پائی۔

الیکشن جیت کر انقلاب برپا نہیں کیے جا سکتے

ناکامی کی اس وجہ سے ہی روس کی دوسری جماعت بھی معرض وجود میں آ گئی۔

جب زمنوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک تھی تو آسٹریا میں رہنے والے زمنوں کی
حالت پہلے سے ہی ابتر تھی ہر سال پارلیمنٹ کی مشین سے کام لیتے ہوئے آسٹریا میں
بسنے والے زمنوں کی آبادی ختم کی جاری تھی اس آخری وقت میں اگر زمنوں کو بچانے
کی کوئی امید ہو سکتی تھی تو وہ صرف اسی صورت میں کہ پارلیمنٹری نظام ختم کر دیا جاتا۔
لیکن ایسا ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔

یہاں زمنوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک کو ایک بنیادی اہمیت کے زبردست مسئلہ
سے دوچار ہونا پڑا۔

سوال یہ ہے کہ اس تحریک کے حامیوں کو پارلیمنٹری نظام ختم کرنے کے لیے کیا
راستہ اختیار کرنا چاہیے کیا انہیں رائج الوقت طریقہ کے مطابق "اندر سے جا کر توڑ پھوڑ"
چاہیے تھی وہ باہر رہتے ہوئے سرے سے پورے نظام پر حملہ کرنا چاہیے تھا؟

وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوئے اور وہاں سے شکست کھا کر باہر نکلے لیکن یہ بھی ہو سکتا
تھا کہ وہ جماعت کی بنیاد ہی اندر داخل ہونے کے لیے رکھتے۔

پارلیمنٹ جیسی عمارت پر باہر سے ضرب کاری لگانے کے لیے داخل شکست ریخت
اور بغیر کسی ہوش کے قربانی کرنے والے جذبہ کی ضرورت تھی۔ ایسے معرکوں میں
دشمن کو بھی حملہ کرنے کا موقعہ دینا ہوتا ہے۔ ہوش و خرد سے بار بار زور لگائے جا
رہے ہیں گے حملہ کرنے والے بار بار ٹھوکریں کھائیں گے پھر بھی اگر ان کے دل مضبوط
ہیں تو چاہے ہڈیاں ٹوٹ جائیں وہ گر گر کر اٹھیں گے کامیابی کا منہ دیکھنے کی سعادت ایک

طویل اور سخت جدوجہد کے بعد ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ جب کسی مقصد کے لیے عظیم الشان قربانیوں کی ہو تیں تو اس قربانیوں کا پیمانہ خود کے معیار کھینچی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ قابل شکست جذبہ آخری کامیابی حاصل نہیں کر لیتا۔

ہاں اس منزل پر پہنچنے کے لیے ایک شرط لازمی ہے جیسے معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر جاندار لشکر کے سپاہیوں کی شرکت درکار ہے یہاں جس عزم و ہمت جس استقلال کی ضرورت ہے وہ مطلقاً ہی کا حصہ ہے۔ کسی خونخوار جھگڑے کو انجام تک پہنچانا یہ عام لوگوں ہی کا حوصلہ ہو سکتا ہے بڑوں کے ملگجے اتحاد کی تحریک ان جاندار لشکر کی حمایت حاصل نہ تھی اس لیے وہ پورے جوش میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی راستہ اختیار کر ہی نہ سکتے تھے۔

تحریکیں دماغ سے نہیں بلکہ جذبات کے بل پر کامیاب ہوتی ہیں

یہ بیان کرنا غلط ہوگا کہ اس کامیابی کی اور دنیا اخلاقی تبلیغ بھی تھا اس کی تہ میں کوئی سوچی سمجھی تجویز کام کر رہی تھی حقیقت یہ تھی کہ اس تحریک کے حامیوں کو پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی عمل سوجھتا ہی نہ تھا جو لوگ اس زبردست مطالبہ میں گرفتار تھے ان کے ذہن نظر محض ماہیات اور موہوم تصورات تھے ان کو یہ علم نہ تھا کہ کس طریقہ سے وہ اس نظام میں حصہ لینے کا ارادہ کر رہے ہیں جس کی وہ ہمواری مخالفت کر چکے ہیں اس سے کیا نتائج اور ثمرات پیدا ہوں گے انہیں بخوبی خیال تھا کہ اس طرح انہیں عوام کے سامنے اپنے مقاصد کی وضاحت کرنے کا موقع مل جائے گا وہ قومی مجلس کے کھڑے ہو کر حکومت کو خطاب کر سکیں گے ساتھ ہی باہر عقل اس بات کو بھی مانتی تھی کہ جب قانون ساز مجلس کے اندر بیٹھا جائے گا تو وہ باہر سے کھڑے ہو کر حملے کرنے کی نسبت زیادہ تشریح کرے گا۔ انہیں یقین تھا کہ جب انہیں پارلیمنٹ کے اندر آزادی تقریر کے حقوق حاصل ہو جائیں گے تو اس سے ان کے حامیوں کی اکثریت

حیثیت زیادہ مضبوط ہو جائے گی اس طرح ان کے ہاتھوں کی طاقت بڑھ جائے گی۔

ان سب باتوں میں حقیقت حال ان توقعات کے بالکل الٹ ثابت ہوئی۔

جرمنوں کے مالکیہ اتحاد کی تحریک کے حامی اب اس سامعین کو خطاب کرتے تھے ان کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی لیکن پہلے سے کم تعلیم یافتہ تھے۔ ہر کس صرف اسی علاقہ کو خطاب کر سکتا تھا جو اس کی بات سننے کو آمادہ ہو یا جو اس کی تقریریں ضرورت میں پڑھ سکے۔

کثیر التعداد سامعین کے کانوں میں پارلیمنٹ کو زیچ لے کی جگہ پارلیمنٹ کیس جگہ عام پبلک جلسہ ہے۔ یہیں ہزار ہا آدمی محض یہ سننے کے لیے آتے ہیں کہ کوئی تقریر کرنے والا کیا کہتا ہے۔ ہر کس اس کے پارلیمنٹ کے اجلاس میں حاضرین کی تعداد بمشکل پندرہ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے بھی اکثر محض پارلیمنٹ حاضری کا اندراج لگانے کے لیے وہاں آتے ہیں انہیں کسی "قومی نمائندہ" سے روشنی حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر اجلاس میں ہمیشہ وہی لوگ بار بار آتے ہیں ان کا کوئی نئی شے سیکھنے کا شوق نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہانت کا معیار بہت ہی کم ہو جائے تو ان حالتوں میں وہ قوت ارادی ہی مفقود ہے جو کچھ سیکھنے کی کوشش کرنے کے لیے درکار ہے۔

پارلیمنٹری چوپے اور پسو

"قومی نمائندوں" میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی بڑی سچائی کو تعلیم کرنے پر آمادہ ہو یا جو اپنے کو اس سچائی کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ نہیں اس جماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو یہ طرز عمل اختیار کرے۔ ہاں اگر یہ توقع ہو کہ کسی ایسی تبدیلی عقیدہ کا اعلان کرنے سے وہ اپنے حلقہ کی نمائندگی پر قائم رہے گا اور پارلیمنٹ میں داخل ہو جائے گا تو بلکہ دوسری بات ہے یہی وجہ ہے کہ جب آئندہ الیکشن میں پرانی پارٹی کی

گت بنے کا یقین ہو جائے تو اس صورت میں اور صرف اسی صورت میں یہ انجمن کے
مجھے "کسی بھی پارٹی کی تلاش میں نکلتے ہیں جس کے لیے الیکشن میں بہتر امکانات
ہوں۔ یاد رہے کہ جب اس تبدیلی عقیدہ کا اعلان کیا جائے گا تو ساتھی اس کو جائز
ٹھہرانے کی خاطر ہر بالائے اخلاقی مقاصد کا ایک پلاب بنائے گا خوش ہوں گی
جب بھی کوئی موجودہ پارٹی عوام میں بدنام ہو جائے اور اسے بھل رہنے والی فلکت کا
خطرہ درپیش ہو تو اس وقت ایک عام تحل ملانی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر کشتی پر سے
پارٹی کی کشتی سے چھلک چھلک کر نکل بھاگتے ہیں۔

یہ سب بکواس لیے نہیں ہوتا کہ مسائل زیر بحث کے متعلق اخبار کے علم میں کوئی
اضافہ ہو گیا ہے اور اب اس کے فاضل نظر انہوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی کر لی ہے ان
خلاباریوں کے پس پشت محض دو وجوہ ضمیری کام کرتی ہے جس سے یہ پارٹی بدلی ہو
یا وقت نظر سے "گاہو ہو جاتے ہیں اور پھر سے از کسی دوسری پارٹی کے گرم بستر
میں جا گھستے ہیں۔

ایسے ساتھیوں کے رویے تغیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گو ہو بھیس کے بدلنے میں
بھلائی ہو رہی ہے لیکن اس مقصد کے لیے جو محنت اٹھائی جائے وہ ہرگز رائیگاں نہیں ہوتی۔
وہ یہ کہ اس سے پیدا ہونے والے تاثر کبھی ختم نہیں ہوتے ہیں۔

تحریکیں عوام کو قائل نہیں بلکہ مائل کرتی ہیں

دوسری جماعتوں کے ہائیکمانڈ اتحاد کے حامیوں نے ہوتے ہوئے اپنے عمل کر
چکے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ہمارے ہاں تو انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کی تعاریف اس طرح مسخ کر
دیتے تھے کہ استدلال کا تسلسل سرے سے پیدا ہو ہی نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عوام
تھے عوام کو اس نئی تحریک کے مقاصد کے متعلق بالکل غلط اندازہ ہوتا تھا۔ اہم بات یہ
تھی کہ راجہ نئی انتخابات کھا کھا کیا کہتے ہیں ہم دیکھتے تھے کہ لوگ ان کے اقوال

کس صورت میں پڑھتے ہیں وہ صورت بھی کہ کتاب کے اختتامات بوقت سہولت
لال کر ایک بے سر و پا کی واہی تباہی بکواس کی شکل میں پیش کیے ہوتے تھے اس شرارت
کا منصفہ یہ ہوتا تھا کہ تقریر پھوہڑ پن کی بنا پر آئے جن سامعین کو صحیح معنوں میں اطلاب کیا
جا سکتا تھا۔ ان کی تعداد صرف پانچ سو یا کم تھی اور انہیں ہر مشتمل تھی اس سے زیادہ کہنے
کی ضرورت نہیں۔

ایک نئی تحریک یا ایک نیا ضابطہ حیات

مدرسین بھی سب داخل تھا

ہندوؤں کے مابین شدھی کی تحریک صرف اسی صورت میں کامیابی کی توقع رکھ سکتی تھی
جب اس کے لیڈر شروع کار سے ہی ذہن نشین کر لیتے کہ یہاں محض کوئی پارٹی قائم
کرنے کا سوال نہیں بلکہ ہمیں تو ایک نیا ضابطہ حیات رائج کرنا ہے۔ صرف اسی امنگ
سے وہ اندرونی اخلاقی قوتیں بیدار کی جا سکتی تھیں جو ایک ایسی مستحکم و انتھک جدوجہد کے
لیے لازمی ہیں ایسی جدوجہد کے لیے بہترین ہدایات دینا قابل فکست دلیری کے
مالک لیڈر درکار ہیں اگر کسی ضابطہ حیات کو مسلط کرنے کی جدوجہد ایسے اشخاص کے
ہاتھ میں نہیں جو ہر قربانی کے لیے آمادہ ہوں تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے بیرونی
عناصر داخل ہو جائے گا جو صحیح معنوں میں مجاہد ہوں اور نصب العین کی خاطر جان
دینے سے بھی دریغ نہ کریں۔ جو شخص خود اپنے وجود کی خاطر لڑتا ہے اس کے بس قوم کی
خدمت کرنے کے لیے کوئی معقول سرمایہ نہیں ہوتا۔

تحریک کی بنیاد اتحاد کی بجائے قربانی پر ہونا چاہیے

کامیابی حاصل کرنے کے لیے دشواریات سے مقابلہ ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ
نئی تحریک کے متعلق متعلقین کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ جہاں تک عزت و احترام اور
نام و شہرت کی توقعات کا تعلق ہے ہمارے دل کبھی پر نظر رکھتے ہیں اور ہمارے
رفقائے کار کو بھی کوئی معاوضہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں اس کے اگر کوئی تحریک شروع سے

ی عہدوں اور مراتب کی بلند قدر و قیمت کرتی ہے اور یہ عہدے اور مراتب آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعت میں عامل اراکین کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی اور کار ایک دن ایسا آئے گا جب کامیابی کا دروازہ کھلنے والی جماعت میں منصب پرستوں کی بھرمار ہو جائے گی اس مجاہدین نے زندگی مراحل میں عمر کے پیچھے تھے اگر وہ اپنی جماعت کو اب دیکھیں تو شاید شناخت بھی نہ کر سکیں بعید نہیں ممکن ہے کہ بعد کے آنے والے انہیں غیر مفید قرار دے کر باہر نکال پھینکیں اس کے بعد تحریک کے قابل نظر کوئی یہ مقصد نہیں رہے گا اس کی تکمیل کرنی ہے۔

پارلیمنٹ عوامی تحریکوں کا قبرستان ہے

جرمنی کے عالمگیر اتحاد کے حامیوں نے پارلیمنٹ کے رکن خاص کا انتخاب کر لیا اس کے بعد ان کی حیثیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی اب وہ ایک عام تحریک کے لیڈر اور رہنما نہ تھے اب وہ قومی پارلیمنٹ کے رکن بن چکے تھے یوں کہنے کو تو تحریک اس وقت کی دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح ایک پارٹی بن گئی اس میں وہ صلاحیت نہ رہی کہ قسمت کے تھپیڑے برداشت کرے اور بطور کسی لوٹ و بورس کے شہادت کی راہ پر گامزن ہو جائے جرمنی کے عالمگیر اتحاد کے لیڈر بننے کے بجائے اب وہ محض ہاؤس آف کمنٹ وشنید کرنے کے عادی ہو گئے تھے ان نو آموز پارلیمنٹیرین حضرات کو جلد ہی احساس ہونے لگا کہ اپنے ضابطہ حیات کے بچاؤ میں جان لڑانے کے بجائے پارلیمنٹری مصالحت و مفاہمت کے "روحانی تصور" سے کام لینا ایک زیادہ قابل عمل اور کم خطرناک طریقہ کار ہے۔ پارلیمنٹ میں تجربہ کار منتخب رہتا ہے اور بہترین صورت میں بھی کوئی دائمی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔

جب انہوں نے پارلیمنٹ میں جا کر اپنی نشستیں سنبھالیں تو ہر ان کے دل و دماغ میں عرض وجود میں آنے کی آس لگائے بیٹھے تھے قدرتی بات ہے کہ ایسے حضرات جو ممکن تھے وہ عرض وجود میں آئے اس تحریک کے دل و جان سے حمایت کا اظہار کرنے لگے تھے

تھے۔ حالانکہ یہی ایک ایسا طریقہ تھا جس سے ہر ایک فرد واحد اپنی ذاتی سرگرمیوں کی بابت بھی حالات پیش کر سکتا تھا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام جرمنوں کے مالیگیر اتحادی تحریک کا: سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے۔

بڑے بڑے انقلابات صرف قوت تقریر سے برپا ہوتے ہیں

عہد حاضر کے تقریری پہلوانوں اور سیاسی بازی گر کے لسانی دھوبیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا کے بڑے بڑے انقلابات کا انجام کبھی قلم سے نہیں لیا گیا۔ اس قسم کا کام صرف ان صوتی تصورات کا پیش کرنا ہے جو انقلاب کے محرک ہوا کرتے ہیں مذاہب و سیاست کی تاریخ میں بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ قوت گویائی کے سامان اثر سے یک بیانی روکی شکل اختیار کرتی رہی ہیں۔

عام غلطی کو متاثر کرنے کے لیے خصائص واقعات سے زیادہ کارگر ہوتے ہیں کوئی کہیں دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ انسان کے دل میں جگہ کر کے ابھرتی رہی ہیں جب مصائب کی سنگینی ہم دیوی بھولے بھٹکے کو مجبور کر دیتی ہے اس وقت انسانی جوش و اضطراب آتش فشاں لاوے کی طرح نکل کر ایک انقلابی سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے انقلاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ قوت گفتار کے شعلے اس آگ کو بھڑکائیں آج تک کوئی عظیم الشان تحریک جسمیں لطیف سے لطیف پیدا کرنے والے شیریں بیاں انقلابی داروں اور حرم سرا میں بیٹھ کر بگلیں مارنے والوں کی بہادری سے جڑ نہیں پکڑ سکی۔

جب کسی قوم پر انہی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں تو اس وقت صرف جذبات کی گرمی ہوئی بجلی میں ہی یہ طاقت ہوتی ہے کہ ان بادلوں کو چاک کر دے۔ یاد رہے کہ صرف وہی لوگ دوسروں کو جوش میں لا سکتے ہیں جن کے اپنے دل جذبے میں ڈوبے ہوں کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کے الفاظ میں لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح پگھلا کر جس طرف وہ چاہیں اسطرح موڑ لینے کی تاثیر ہوتی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

وہ خود اپنے اندر جذبات کی اتنی بڑی طاقت کو پیدا کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔

جو شخص اپنے اوپر شدید جذباتی کیفیت طاری نہیں کر سکتا اور جو شخص قوت تخیل کا مالک نہیں، اسے قضا و قدر نے ہرگز یہ ذمہ داری نہیں سونپی کہ اس کی جدوجہد کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مشیت ایزدی کے کس پشت کام کر رہی ہے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہاں مٹی پلید کی بیماری دوا سے ہی دور کیا کریں اگر انہیں مطلوبہ علم و فضل حاصل ہے تو اصولی مسائل کی چھان بین کریں انہیں فتوے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا وہ اس کام کے لیے نہیں بنے گئے۔

تحریک کا رابطہ عوام سے کبھی نہ ٹوٹنا چاہیے

جو تحریکیں عظیم الشان مقاصد لے کر اٹھتی ہیں ان کو یہ خطرہ درپیش ہوتا ہے وہ یہ کہ کہیں عوام سے تحریک کا رابطہ نہ ٹوٹ جائے۔ مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور ان کا حل تلاش کرتے وقت اس اصول کو نظر انداز نہ کر دیا جائے۔

تحریک کو ہر ایک قدم سے بچانا چاہیے جس میں خطرہ ہو کہ عوام پر ہمارا اثر کمزور ہو جائے گا اس احتیاط کا باعث کوئی غداری کی سوچ نہیں اس کی وجہ فقط یہ سادہ سی حقیقت ہے کہ ہو سکتا ہے کوئی عقیدہ کیسا ہی بلند اور عظیم کیوں نہ ہو، معاملات جب تک عمل کی تجربہ خیز حالت میں حاصل نہ ہو جائے تب تک اس کا حصول ناممکن رہتا ہے جب حصول مقصد کی خاطر کھیں تو ہے حالات کیسے ہی تلخ کیوں نہ ہوں، حقائق سے کبھی آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں اس دنیا میں مشکلات سے جان چھڑانے کی کوشش کا نتیجہ اکثر یہی نکلتا ہے کہ جو مقاصد اور آرزوئیں لے کر چلے تھے ان سے ہاتھ دھو لیتے ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ انسان کو خود اپنے عزائم ترک کر دینے کا احساس نہ ہو۔

جولیس سیزر کے ہاتھوں اتحاد کے لیڈروں نے پارلیمنٹری اصول قبول کرتے ہوئے حالات کو سمجھ کر پارلیمنٹ کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ اسی وقت سے انہوں نے بالآخر ایک نصب العین کامیابی کی خاطر قربان کر دیا۔ انہوں نے جدوجہد میں آسانی کا

راستہ اختیار کرنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آخری فتح حاصل کرنے کے قابل نہ رہے۔

میں جب وکالت میں تھا تو روسی مسائل پر گہری غور و خوض کیا کرتا تھا۔ میری یہ رائے تھی کہ زمینوں کے عالمگیر اتحادی تحریک انہیں وہ مسائل کا حل اندازہ لگانے کے باعث ناکام رہی ورنہ اس وقت جب تک میری نظر کام کرتی تھی مجھے یہی تحریک آسٹریا میں بسنے والے زمینوں کی سیاست کی مستحق دکھائی دیتی تھی۔

زمینوں کی عالمگیر اتحادی تحریک کے رہنماؤں کی ذہنیات ایک دوسرے سے کچھ تعلق رکھتی تھیں بڑی بڑی تحریکوں کو چلانے کے لیے اندرونی طاقت کیسے حاصل کی جاتی ہے اس سوال کا صحیح جواب دریافت نہ کر سکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اتحادیت رہا کرنے میں عامۃ الناس کو جو بہبود حاصل ہے اس کا پورا پورا احساس نہ کیا گیا اس ناواقفی کے سبب معاشرتی مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی جا سکی۔ نچلے طبقے کے لوگوں کے ذہن کمال تک تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناقص ہونا کافی تھیں عوام سے بھی بیگانہ رہی تھی جس کی وجہ سے پارلیمنٹری سرگرمیاں تعمیر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا پارلیمنٹری داخلی کا شریہ ہو کر عامۃ الناس کی قدر و قیمت کا احساس کم ہو گیا۔

عامۃ الناس انقلابی تحریکوں میں جس زبردست انتقال کا ثبوت دیتے ہیں اگر اس کا صحیح اندازہ کر لیا جاتا تو یقیناً معاشرتی مسئلہ کے متعلق کوئی مناسب روش اختیار کی جاتی اور پروپیگنڈہ کرنے کے لیے بھی کوئی بہتر طریقہ سوچا جاتا ایسا ہو جاتا تو پھر اپنی سرگرمیوں کا مرکز و محور بنانے میں پارلیمنٹ کا انتخاب ہونے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی تحریک کی توجہ سڑکوں پر چلنے پھرنے عامۃ الناس اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر ہی مرکوز رہتی۔

عوام کے مذہبی اوقاتِ وات سے الجھنا مناسب نہیں

عامۃ الناس کی اہمیت کا احساس نہ کرنے سے ایک تیسری خرابی بھی پیدا ہوئی عام خلقت کو کسی خاص راستہ پر ڈالنے کے لیے پہلے سے قابلیت رکھنے والے آدمیوں کی

ضرورت ہوتی ہے لیکن جب ایک دفعہ عوام سڑکوں میں آجائے تو پھر وہ قسمت کے چکر کی طرح خود بخود توازن برقرار رکھتے ہوئے جارحانہ قدم جاری رکھتے ہیں۔

جرمنوں کے مالکیور اتحاد کے لیڈروں نے بیشتر ملک جرمانیت کے مقابلہ میں ایک مختلف جدوجہد کا پروگرام کیوں اپنایا؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے جدید انسان کی روحانی ضرورت کو ٹھیک طرح نہیں سمجھا۔

اس کی ہوشی نے پاپائے روم کے خلاف جو شدید مہم شروع کر رکھی تھی وہ مسلمانوں میں وہ جوش پیدا نہیں کر سکتی تھی

جس کی خاطر اس جرمن نے آسٹریا کو ایک عیسائی ریاست بنانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور اس کے بعد اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر تمام ممکن کوششیں ہونے لگیں۔ شاید جرمن نے اپنے اس نئے آزادی تصور کی خاطر دینی داعیوں کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کیا تھا۔ انہیں سچی باتیں کہنے میں کسی قسم کی ذہنی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔

اس مقصد میں متعدد ذرائع استعمال کیے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آسٹریا بھر میں سفلاب اتحاد قائم کرنے کی خاطر جگہ جگہ یادگاریں بنوائی گئیں۔ وقت عاقبت سے آشکارا کام لیا جانے لگا۔ اس مقصد کے لیے سب ذیل طریقہ کار اختیار کیا جاتا تھا۔

خاص خاص جگہوں میں چوبیس یادگاریں مقرر کر دیے جاتے تھے یہ یادگاری جرمانیت کے مفاد میں چوبیس قوم کے مفاد کو پیش کرتے تھے اسی طرح آہستہ آہستہ ان یادگاروں اور ان کے وقف علاقوں کو جرمن اثر و رسوخ کے لیے مستقل مرکز بنا دیا گیا۔ یہ کارروائی نہایت قدمی سے جاری رکھی گئی۔

بدقسمتی سے آسٹریا کے جرمن یادگاری اس کارروائی کا مقابلہ کرنے میں بالکل ناکام

ثابت ہوئے نہ صرف انہوں نے ڈرموں کی جانب سے اس قسم کا کوئی جوابی قدم
کرنے سے گریز کیا۔ بلکہ وہ ڈیکوں کے عملہ کا نظم خود متاثر بھی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ ڈرمس عملہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی۔ اس پسپائی کی رفتار مستقل تھی۔ ڈرموں
کے یوں پیچھے دھکیلے جانے کی دو وجوہات تھیں پہلی تو یہ کہ یہ ہی علاقہ کو سیاسی
مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ ڈرموں کی مدافعت کمزور تھی یہ
جہاں تو چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی ہوتی تھیں لیکن بڑے بڑے مسائل کی
نوعیت جو ہمیں اختیار کی ہوتی تھیں وہی بھوس سے زیادہ اہمیت نہ تھیں۔

خاندان سوبرک ڈرموں کے خلاف جو اقدام کر رہا تھا بالخصوص اس سلسلہ میں
اعلیٰ رتبہ کے پادریوں سے جو کام لیا جا رہا تھا اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا گیا۔ ڈرموں کے
نمائندہ پادری پیچھے ہٹتے ہٹتے بالکل پیچھے دب گئے۔ ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی
دیکھنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام عیسائی پادری ڈرمن باشندوں کے حقوق سے
لاپروائی برتتے رہے ہیں۔

بظاہر ایسی نظر آتا تھا کہ کیتھولک عیسائیت نہ صرف ڈرموں سے کوئی ہمدردی نہیں
رکھتی بلکہ وہ ڈرموں کے دشمنوں کی امداد کرتی ہے شوکر کا خیال تھا کیتھولک
عیسائیت کی قیادت کا مرکز سے باہر ہونا اس تمام بے انصافی کی جڑ ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ
عیسائیت کی جانب سے ڈرموں کے مطالبات کی جو مخالفت کی جاتی ہے اس کی توجیہہ
کے لیے یہی ایک سبب کافی ہے۔

جیسا کہ ان دنوں آسٹریا میں ہر جگہ دستور تھا۔ یہاں بھی ثقافتی مسئلہ بالکل کشمکش
میں بدل گیا۔ اگر ڈرموں کے مخالف قوم کے لیڈروں نے کیتھولک عیسائیت کی مخالفت
شروع کر دی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عیسائیت کو سامراج کی رو سے علاقہ رکھتے تھے بلکہ اس
کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کو کس طرح ڈرموں کے حقوق کی حمایت کرنی چاہیے تھی
اس میں کوتاہی برتی گئی تھی اس پر طرہ یہ کہ ڈرموں کے حقوق پر دست اندازی کرنے

والوں یا خصوصی طور سے قوم کی جانبداری کی جاتی تھی۔

ہر ایک شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے دوران میں ہندو قوم کو بچانے کی بھی ایک صورت تھی۔ اس نے عیسائیت کے مقابلہ میں بھی اپنے کو اندر کو لے کر "شدھی" کی تحریک کے ذریعہ سے "ہندو" بنا لیا۔ "شدھی" کی تحریک عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خوفناک ترین حربہ تھا۔ لیکن سادھوؤں کی اس حربہ کا استعمال بھی سب سے زیادہ مشکل تھا۔ شدھی کی تحریک کامیاب ہو جانے سے تو ہندوؤں کے دوسرے مذہبی فرقوں کا بھی آسانی سے خاتمہ ہو جانے کا ڈر تھا۔ اس قوم اور ان سوسائٹی کی اندرونی حالت اس قدر بگڑ جانے کا اندیشہ بڑھ جانے کی۔

اس استدلال میں مقدمات اور نتائج دونوں غلط تھے۔

تحریک کے اصول اس کے مقاصد سے علیحدہ نہیں ہوتے

یہ درست ہے کہ ہندوستان کے ملک پادری اپنے قومی خصائص کی حفاظت کرنے میں غیر ملکی پادریوں اور خصوصاً یورپین پادریوں کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہندوستانی پادریوں کو ہندوؤں کے قومی مذاق کی حفاظت کا خیال تک نہ تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر وہ شخص جو حقیقت سے واقف ہے اقرار کرے گا کہ یہ کمزوری خود ہم ہندوؤں کی ایک قومی خصوصیت کی وجہ تھی وہ خصوصیت یہ ہے کہ ہم اپنی قومیت کو دوسری نظر سے دیکھتے ہیں گویا ہماری قومیت ہماری ذات سے کوئی علیحدہ شے ہے۔

جس یورپین پادری نے اپنے قومی مذاق کو ایک ذاتی رنگ میں محو کر رکھتے تھے اور عیسائیت کو محض دوسری نظر سے دیکھتے تھے وہ ہندو ہندوستانی پادری عیسائیت سے تو ذاتی عقیدے رکھتے تھے اور اپنے قومی مذاق کو دوسری حیثیت دیتے تھے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہماری بدقسمتی کے باعث ہر روز ہر جگہ مثالوں میں پیش ہوتی ہے۔

یہ حالت ہر ایک عیسائیت کی مخصوص درآمد نہیں ہمارے اندر یہ ایک ایسا نقص ہے جو

تمام داروں کو اصولی مقاصد و گمن کی طرح کھا جاتا ہے بالخصوص حکومت کے داروں پر تو اس کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اور سے سرکاری افسر اپنے ملت کی جدوجہد کے متعلق جو تیور و اختیار کیے ہوئے ہیں ہے دیکھئے پھر ذرا غور سے دیکھئے کہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے سرکاری افسر ایسے حالات میں کیا تیور و اختیار کرتے۔ کیا ہمیں آتا ہے کہ کسی دوسرے ملک کے قومی افسر قومی تمناؤں کی جانبداری سے بے اعتنائی کریں۔ اور "حکومت وقت کا احترام" جیسے الفاظ کی پروا نہ کریں۔ گذشتہ بلقان سال سے ہمارے ملک میں یہی ہوتا آیا ہے اور ہر سال یہ ہے کہ اسے ایک قابل تحسین روش تصور کیا جاتا ہے وہ ہے ایک اور مثال میں مسئلہ یہود کے متعلق ہمارے یورپ کے برادر قرنے ایک ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو نہ صرف قومی ضمیر و ہوش کے منافی نہیں بلکہ ذہبی مفاد کے لیے بھی مضر ہے۔ اس کے برعکس کسی یہودی مولوی کو دیکھئے کہ وہ یہودیوں کے متعلق سے قطعی مفاد کے متعلق کیا روش اختیار کرتا ہے۔ سالونیکی کے ہمارے بھائیوں کو چاہیے وہ کنسٹوک میں وہ بات کا رویہ بھی ملاحظہ ہو۔

جہاں کہیں کسی اصولی عقیدہ سے سامنا ہو وہاں یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔

"حکومت وقت کا احترام" "جمہوریت" "اصلی پسندی" یہی اور قومی الفاظ ایسے تمام تصورات ہمارے لیے ایک حد اور مصالحانہ نہیں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں چاہے قوم کی حالتیں کیسی ہی شدید کیوں نہ ہوں ہم ان حالتوں کو ہمیشہ ایسے ہی عقائد کی ترازو میں وزن کریں گے۔

مفاد سے بڑھ کا اعتقاد کی پرستش حماقت ہے

قومی مطالبات کو اپنے ذہن میں پہلے سے بنائے ہوئے چند تصورات کی کسوٹی پر جانچنے کی یہ عادت نہایت قابل افسوس ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیز واقعاتی علاقہ سے اصول کے علاوہ نظر آئے انسان اس کا ذاتی پہلو بھی نظر انداز کر جاتا ہے غرض وسائل مقاصد کو ہمیں پشت ڈال جاتے ہیں اگر ایسے ملت کی نظر ایک ضرر رساں اور

ری حکومت کو ختم کرنا اور ہی ہو تو دنیا کے ملت کی ہر کوشش کی مخالفت کی جائے گی۔ یہ کہ
اس سے حکومت کو ختم کرنا اور ہی ہو تو دنیا کے وقت کے احترام میں خلل آتا ہے جو لوگ
اس رویہ کی حمایت کرتے ہیں ان کی نظروں میں حکومت کا احترام کسی مقصد کے
لیے ایک ذریعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ حکومت خود ایک مقصد ہے انہیں اپنے اصولوں
کے سوا باقی تمام چیزیں دھندلی رنگ میں دیکھنے کا ایک یہ نظریہ ملا گیا ہے کہ وہ اس قسم
کی ہر دلیل دے کر خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذہنی زندگی کا صرف ہدایت کر
دیا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہے تو چاہے وہ شخص ڈیموکریٹک
اعظم ہی کیوں نہ ہو چاہے وہ ریپبلکن اکثریت رکھنے والے مدبرین منتخب ہو رہا ہو
انسان ہوں ہو چاہے ان کا دل اس سے بھی پست ہو مگر بھی یہ لوگ شور و غل مچا کر
دیں گے۔ ان دنیاوی اصولوں کی خاطر جھگڑا کرنے والوں کے نزدیک جمہوریت کا
تمدن قوم کی بہتری کی نسبت زیادہ مقدس ہے چاہے قوم تباہ ہو رہی ہو یہ شریف آدمی
ان اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے مدبرین علم و ہنر کرنے والی حکومت کی بھی حمایت ہی
کریں گے۔ مثلاً یہ کہ چاہے عارضی وقفہ کے لیے ہی سہی اگر تم حکومت وقت کا احترام
نہ کرو تو تمام بے عمل بنا دیتا ہیں اگر بہترین عالم و مدبر ہیں حکومت ان کے نظریہ جمہوریت کے
مطابق نہیں تو ان کی مخالفت کی جائے گی۔

اسی طرح جب قوم کی بہبودی خواہ فوری حالت کے تعلق سے کرنا ہی ہو اور
اس وقت مداخلت کا کوئی سامان کیا جائے تو ہر حسن پسند چاہے چیخیں گے
کیونکہ یہ مداخلت تو انسانی حالت کے خلاف ہے اور انسانی حالت کا
مطلوبی حسن پسند انجمنوں کے اصول کے خلاف ہے اور ہر ایک تمام قوموں کے سوشلسٹ
چاہے اسے بین الاقوامی سنگھ کے ذریعہ ہو کیوں نہ ہو مگر وہ فریب کا شکار رہا ہیں لیکن
ان سوشلسٹ پارٹی کی اس ہدایت سے قائل آئے گا سے بھی یہ ہاں وہ اس چیتے یا
اپنی حفاظت کرنے کا ہوں تک نہ آئے گا ہو یا ہو کہ وہ ایک . . . . . ہے۔

ثابت ان حقائق کو بار بار دہرانے سے کرداروں کو واضح کرنا کا کو تو ڑ دے۔ لیکن اگر اس عرض کا علاج کرنا ہے تو ہمیں اسی انتخاب سے کرنی ہو گی۔

جرمن مصنوعی حمایت اور حفاظت کرنے میں بادریوں کا ایک گروہ جیسا ماتر کا بات ہو اس کی مہم بھی کمزوری تھی جسے میں نے ابھی بیان کیا ہے۔

یہ طرز عمل کسی مہذب پبلک میں اس کے بس پر دہ ابتدائی حالتوں کا دکھائی کارفرما نہیں قومی انتقال و روایت قدیمی کا یہ خصوصی ہمارے طریقہ تعلیم کے تکاص کا نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ نوجوانوں میں ان کی قومیت کا ایک زندہ جذبہ پھونک دیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سے محض کورے تصورات کو بھرے کر دیے جائیں گویا محض تصورات ہی کوئی شے ہیں۔

الفاظ کے معنوں کی پرستش نہ کرنی چاہیے

موجودہ تعلیم نوجوانوں کو اس قسم کے ذہنی تصورات کا پرستار بنا دیتی ہے جیسے "جمہوریت" "میں الاقوامی سوشلزم" "صلح پسندی" "لیبر وغیرہ۔ یہ تعلیم زیادہ تر محدود اور تنگ نظر ہے اس تعلیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی بیرونی حقائق کو اپنے عقائد کی عینک لگا کر مشاہدہ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ نوجوانوں پر اس ذہنی رنگ کی تعلیم سے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پہلے مذکورہ بالا قومیت کے تاثرات ذہن میں جما کر پھر زندگی کے متعلق حقیقت مجموعی بنیادی اصول و عقائد قائم کرنے لگتے ہیں۔ بعض اس کے بس کی پہلی قومیت کے تعلق ان کا رویہ ہمدردانہ ہوتی ہے لے کر آگے تک ہمیشہ وہ تعاقبی رہتا ہے۔ جرمن صلح پسند جو ایک طرف ذہنی لحاظ سے اپنے قوم و جہان کو اپنے اصولی عقائد کی عینک چڑھا دیتا ہے وہ دوسری طرف جب کبھی خود اس کی قوم کو خطرہ در پیش ہوتا ہے وہ خطرہ کیسا ہی شدید کیوں نہ ہو۔ ہو چاہے اس خطرہ کو بیرونی طاقتوں نے فیصلہ خطرہ طرز عمل سے ہی کیوں نہ پیدا کیا ہو۔ پہلے تعاقبی رنگ میں حق و باطل کی تحقیق کرے گا اور پھر کہیں آگے قدم بڑھائے گا وہ بھی اپنی قومی کی صف میں پائمردی سے کھڑا رہے گا وہ بھی

محض خود حفاظتی کا سامان فراہم کرنے کے لئے جنگ پر آمادہ ہوگا۔

میں ایک مثال دیتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا عادات ہمارے مختلف مذہبی فرقوں میں کیسے ظاہر ہوتی ہے۔ وہابیت فرقہ کی بنیاد اور روایات دونوں ترکِ مقاصد پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فرقہ ترکِ مقاصد کی بہتر حفاظت کرتا ہے۔ تاہم جہاں کہیں ایسے معاملہ کا معاملہ درپیش ہو جو ان مقاصد یا روایات کے دائرہ میں شامل نہیں ہاں کے برخلاف ہے وہیں یہ وہابیت فرقہ کی ترکی بھی تمام ہو جاتی ہے۔

غرض جب تک ترکِ مقاصد کا تعلق اخلاقی پاکیزگی، قومی تعلیم، رسومات کی مرمت، ترکِ رواج یا رسومات کی مذمت کرنے سے ہو تب تک یہ وہابیت فرقہ ہمیشہ ترکِ مقاصد کی حمایت کرے گا کیونکہ خود یہ وہابیت فرقہ کی بنیاد انہیں مقاصد پر رکھی گئی ہے لیکن یہی یہ وہابیت فرقہ قوم کو اس کے ہندی دشمنوں کے پنجہ سے بچانے کی ہر کوشش کا سرتوڑ مقابلہ کرتا ہے، کیونکہ ہندوؤں کے متعلق اس کا رویہ ابتدا سے انتہا تک ہمیشہ کے لیے معین ہو چکا ہے حالانکہ یہی وہ مسئلہ ہے جو سب سے پہلے حل طلب ہے۔ ورنہ ترکِ عروج کی بدولت قوم کا وقار بڑھانے کی تمام کوششیں بیہودہ ہو رہے ہوں گی۔

موجودہ نظامِ تعلیم ناقص ہے

قیامِ مدارس کے دوران میں مجھے اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے کافی فرصت اور مواقع حاصل تھے میں تحقیق کے دوران میں کسی مدرسہ یا طرف داری سے متاثر نہ تھا بلکہ میں لوگوں کے ساتھ دوران عمل مدارس کے دوران جزو بنظیروں کا امتحان لے کر اپنی تمام کردہ رائے کی تصدیق بھی کر لیا کرتا تھا۔

دلی کا وہ نقطہ ماسکہ تھا جہاں زیادہ سے زیادہ قومیں جمع تھیں یہاں جو شخص آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہے وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ ہمیشہ ترکِ تعلیم یا بدی وہ ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو

آخری مرتبہ صاف کیا گیا۔ اس وقت ایک زندگی اور موت کی کشمکش درپیش تھی۔

سیاسی تنظیم کے ذریعہ دینی اصلاح ناممکن ہے

جب تک باطنی حلقے ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرتے رہے تب تک تو قوم اپنے فرائض مذہبی بخوبی پورے کرتے رہی تمام پادریوں نے بالاتفاق بیکشوک بادشاہت ہونے کے دعوی قوت مزاحمت کی تقویت کے لیے ہر ممکن کوشش کی یہ کوشش محض جنگ کی حالت میں ہی کارآمد نہ تھیں گھروں میں ان کا اثر اور بھی زیادہ ہوا۔ ان دنوں عورتیں خصوصاً بیوی بچوں کی پہلی پرورش میں دونوں مذہبی فرائض متعلق تھے۔ دونوں جنس معاشرت کو مقدس خیال کرنے میں یکتا تھے۔ دونوں اس معاشرت کی حفاظت اور استحکام کے لیے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جہاں تک آسٹریا کا تعلق ہے تو ہنگیرین آزادی کی تحریک کو اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیے تھا "کیا جب تک آسٹریا کا جنس مخالف بیکشوک فرقہ کا وجود ہے تب تک اسے زندہ رکھنا ممکن ہے یا نہیں" اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہو تو ایک سیاسی تحریک کو ہرگز مذہبی اور فرقہ وارانہ مسائل میں مداخلت نہ کرنی چاہیے ہاں اگر جواب نفی میں ہو تو پھر مذہبی اصلاح کی ایک تحریک چلانا جاری ہو سکتا تھا یا سیاسی پارٹی قائم کرنے کے کیا معنی۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ سیاسی تنظیم کے ذریعہ مذہبی اصلاح کی جا سکتی ہے اسے یکطرفہ نہیں کہ مذہبی تصورات اور دینی عقائد کس طرح ترقی کرتے ہیں عیسائیت نے ان عقائد کو کیسے عملی شکل دی۔

کوئی انسان ایک وقت دو کام نہیں کر سکتا میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ کسی پارٹی کا کیا ذکر دین کا قائم کرنا یا مٹانا یا تو ایک معاشرت کے قیام و زوال سے بھی زیادہ زبردست انقلاب پیدا کرتا ہے۔

یہاں یہ کہنا کوئی جواب نہیں کہ ہمارے حلقے محض فریق ثانی کے حملوں کے مقابلہ

میں بچاؤ کا سامان تھے۔

اپنے دشمنوں کو دین کے نام لینے کا موقعہ نہ دینا چاہیے

ویلکم ہمیشہ محض ایسے بے اصول مدعا علیہ بھی ہوتے ہیں جو مذہب کو سیاست کے کمینہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ اکثر و بیشتر دین یا سیاست کو تجارت کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں تاہم کسی مذہب یا مذہبی فرقہ کو ان مدعاعلیہ کے اعمال کا ذمہ دار قطعی طور پر ہرگز درست نہیں ہوتا جس طرح ہر اس شے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جس میں کہیں بھی تھوڑا سے کامیاب ہونے کی طرح عیسائیت کا بھی غلط استعمال کر رہے تھے۔

بار بار سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے تھے۔ جن لوگوں کو اس سے زیادہ واقفیت تھی وہ تو یہ جانتے تھے کہ انہیں اپنی بیوی مدعا علیہاں کے لیے کوئی اوٹ میسر آجائے۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ اس قربانی کے بکرے سے بھی کام لیتے ہیں جب معاملہ رفت گذشت ہو جائے اور مدعا علیہاں کے بچے یہ بار بار سنتے سنتے ذاتی طور پر ذمہ دار ہیں جب ان کا ازدواج کسی مذہب یا مذہبی فرقے کے سر منڈھ دیا جائے اور اس پر حملہ کیا جائے۔ تو وہ بیچارہ اس مکاری و عیاری سے بالکل نابلد ہوتا ہے کہ ہم نے تو کچھ کیا ہم اس میں حق بجانب تھے۔ چاروں طرف سے اعتراض ہونے لگتا ہے کہ میری ہی جاہ و ہوئی کا اثر تھا کہ دین اور عیسائیت بچ گئے۔ جب تک اس کو ہوتے ہی سمجھ میں ان کا احساس بھی ہوتا ہے جب تو تیر کمان سے نکل چکتا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں غور کرنا شروع نہیں کر سکتے کہ اصل فساد کا بانی کون ہے۔ وہ جانتے انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ازدواجی نزاع کہاں سے اٹھی تھی۔ یوں مجرم داد دے کر نکل جاتا ہے۔

ایسے مکار خوب جانتے ہیں کہ ان کی مدعا علیہاں کو مذہب سے دور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ جب اس کا تخلص مگر سادہ لوح حریف بازی مار جاتا ہے اور ایک دن لوح فساد سے ناامید ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے تو وہ اصل میں وہ پچھتا کر خوب قہقہے

گاتے ہیں۔

مذہب کے ناجائز استعمال سے مذہب کی عظمت میں فرق نہیں آتا

علاوہ ازیں فی نفسہ مذہب یا جماعت کو مطعون کرنا ایسے لوگوں کے لیے کارآمد ثابت ہوگا۔ اگر ہم اس کام کی بین علمت و وقعت کا مقابلہ فطرت انسانی کی کمزوریوں سے کریں تو ناکامی ہوگی۔ اور بھیڑوں کے مقابلہ میں بھیڑیوں کی جبلت بھی زیادہ بے یقینی کی ہوتی ہے اپنے مقدس پیشے کو اپنی سیاسی مقصد برآری کے لیے استعمال کرتے ہوں گے بدقسمتی سے کئی مذہبی متقدر ہوئے ہیں کہ انہیں سیاسی کھیل ہونی کی گزرے ہیں عقل سچائیوں کا وکیل ثابت ہونا چاہیے نہ کہ روح باطنی اور مذہبی کے مددگار بننا چاہیے مگر کبھی ہم ایسی برکاری بھیڑ کے مقابلہ میں بڑا روشن مثالیں پیش کر سکتے ہیں جنہوں نے روحانی پیشوا کے منصب پر رہے مگر وہ سیاست سے سراسر علیحدہ رہتے ہیں وہ ہمارے زمانہ کی عام گمراہی کے درمیان وہی حیثیت رکھتے ہیں جو آسمان کی تاریک فضاؤں میں نورانی ستاروں کو حاصل ہے۔

میں جماعت کو فی نفسہ برا قرار دینے پر تیار نہیں اگر کوئی جماعت باوجود ان کر قانون اخلاق کے خلاف کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو میں محض اس کی اس حرکت کو اپنی مذکورہ بالا رائے تبدیل کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ تسلیم نہیں کرتا۔ ہر جماعت کے افراد میں سے کوئی ایک اپنے ہم وطنوں سے غداری کرتا ہے اور ان پر حملہ کرتا ہے تو میں اس کے اس فعل کے لیے ایک فرد کے دوسرے فرد کو ظلم کرنے پر آمادہ ہونے کا اصل سبب نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ موجودہ زمانے میں یہ عادت ایک مرض عام کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ آج کل کی لیے ہر ایک غدار کے مقابلہ میں ہیکڑوں ایسے ہیں جن کی آنکھیں اس وقت نم ہو کر بھر آتی ہیں جب وہ اپنی قوم کے بہترین فرزندوں کی طرح شب و روز بہتری کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کب وہ دن آئے گا جب ہماری قسمت بدل جائے گی۔

دین کی اصلاح صرف دینی شخصیتوں کا منصب ہے

اگر یہاں کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ ہمیں روزمرہ زندگی کے بے حقیقت مسائل سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ ہمیں تو بنیادی مسائل و حقائق دین سے بحث ہے تو اس اعتراض کا جواب دینے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اس سے یہ سوال دریافت کیا جائے۔

"کیا تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تمہارے قلب و ضمیر کی کائنات کی ہدایت و راہنمائی کا امور کر دیا ہے؟" اگر تم واقعی ایسا محسوس کرتے ہو تو تم سے کام و صاف صاف مذہبی جماعت کا نام کرو۔ کسی سیاسی پارٹی کو کیوں اپنا آلہ کار بناتے ہو؟ اس طرز عمل سے تم اپنے منصب میں کوتاہی کر رہے ہو۔ جو شے موجود ہے لیکن وہ ہے سے چھوڑ دو۔ کوئی بھی چیز ادھوری رہ کر آدھ تک باقی رہے۔

اگر تم یہ جرأت نہیں رکھتے۔ یا اگر تمہیں خود معلوم نہیں کہ تم کیا قدم اٹھانا چاہتے ہو تو سارا معاملہ جیسا ہے ویسا ہی رہنے دو۔ ہر صورت میں ہر کیفیت میں تم میں یہ حوصلہ نہیں کہ نقاب اتار کر میدان میں آؤ تو پھر اس پیچ در پیچ راستوں سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش بھی مت کرو۔

سیاسی جماعتوں کو دینی مسائل میں دخل اور مداخلت کا کوئی حق نہیں ہاں اگر ان عقائد میں کوئی ایسی بات ہو جو فوری فطرت سے متصادم ہو اور اس سے قوم کے اخلاق و اخلاق میں فساد آجانے کا اندیشہ ہو تو پھر دوسری بات ہے۔

اگر بعض مذہبی مقتدا اپنی قوم کو ترک دنیا کی خاطر مذہبی رسوم یا دینی عقائد کا غلط استعمال کرتے ہیں تو ان کے مخالفین کو ہرگز ان کی تکفیر نہ کرنا چاہیے اور کسی ایسے اختلاف سے نہ بچنا چاہیے۔ ایک سیاسی لیڈر کو ہمیشہ اپنی قوم کے دینی عقائد اور مذہبی جذبات کی تحقیر کا احترام کرنا چاہیے۔ اسے کبھی ان جذبات و عقائد کی مخالفت نہ کرنا چاہیے اور وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ ہرگز کسی عزت کا مستحق نہیں ہاں اگر اس میں مطلوبہ صفات موجود نہیں تو ممکن ہے کہ وہ ایک مصلح ہو۔

اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہوگا، خصوصاً دشمنی میں تو یہ حقیقت اور بھی مسلم ہے۔

سیاست کی بنیاد معاشرتی مفاد ہیں، مذہب کی بنیاد ضمیر ہے

جب میں نے جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کی تحریک اور پہلے روم سے اس کی مخالفت کا مطالعہ کیا تو مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اس تحریک نے ایک بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے یہ لوگ معاشرتی مسئلہ کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھ کا ساتھ نہ نبھا سکے۔ ماضی کی ایسی تحریکوں میں عوام کی سرگرم دلچسپی حاصل کیے بغیر کام نہیں چلتا تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بیدار ہوتا گیا اور جرمنوں کے عالمگیر اتحاد کے قیدی پارلیمنٹ میں داخل ہو کر عام معاملات کی زبردست قوت عمل سے محروم ہو گئے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے پارلیمنٹری نظام کے تقاضے کا بار ملت میں اپنے کندھوں پر لے لیا۔ یہ حقیقت ہے ان کی عجیز خانی کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کے دور دراز علاقوں کے کثیر تعداد باشندوں سے مگر کی صرف یہی نہیں بلکہ اعلیٰ طبقوں کے کئی ہوشمند لوگ بھی جن میں بعض قوم کے بہترین افراد شمار کیے جانے کے لائق تھے ان سے قطع تعلق کر لیا۔ فرض اگر ہم جرمنوں کے تمدنی جہاد کے عملی نتائج پر نظر ڈالی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے ایک اخلاقی درس کو عیسائیت سے منحرف کر لیا۔ لیکن اس سے عیسائیت کو کیا نقصان پہنچا؟ عیسائیت کو ان گم کردہ راہ بھیڑوں پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس سے وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جن کے دل پہلے ہی مدت سے اندر اندر برگشتہ ہو چکے تھے اس عیسائیت اور مغرب کے تاریخی دور کی تعلیم انسان دوستی میں فرق یہ تھا کہ اس وقت تو عیسائیت کے محض بہترین افراد ہی کلیسا کی جماعت سے الگ ہوئے تھے۔ برعکس اس کے اب وہی لوگ جدا ہو رہے تھے جو پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ اور انہیں اب کسی خاص سیاسی مفاد کا بھی خیال نہ تھا۔ اگر محض سیاسی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تب بھی یہ

نتیجہ ہوتا ہے کہ ہر تحریک کا ایک مخصوص نصب العین بھی ہوتا ہے۔

ایک ہمہ گیر تحریک کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس سے قومی قوم کی اس قدر صلاحیتیں وابستہ ہوجاتی ہیں کہ ان کی ناکامی کا خیال ہی ہولناک ہوتا ہے۔ یہ کہ اس تحریک کے چلانے والوں نے اپنی توجہات کو محض حقائق اور محض حقائق پر مبنی سے مرکوز نہیں رکھا۔ برخلاف اس کے وہ ان وادیوں میں بھی ٹہلتے نظر آتے ہیں جہاں تحریک کی ہوا بھی نہیں تھی۔

تحریک کو ایک وقت دو محاذ پر لڑنا نہیں چاہیے

اگر ہمارے ہاں کی تحریک بھی انسان کی نفسیات سے کماحقہ واقف ہوتی تو کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کیا جاتا اور سب باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تو ان نفسیاتی موجودات کی بنا پر ہی یہ مناسب نہیں کہ عوام کے سامنے بیک وقت دشمن پیش کیے جائیں اس سے اس کی طاقت پارہ پارہ تقسیم ہو جاتی ہے اگر اس تحریک کے لیڈر یہ سمجھ جائے تو وہ اپنی تمام قوت طبع تقسیم کیے ایک ہی دشمن کے خلاف عمل کرنے کی خاطر جمع کر لیتے ایک سیاسی جماعت کے لیے اس سے بڑا خطرہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کی باگ دوڑ ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو باوجود یکہ لڑنے کی لیاقت بھی نہیں رکھتے پھر بھی کشتی میں ناگ لڑانے کے شائق ہوں۔

ہاں کہ مختلف فرقوں کے خلاف فی الحقیقت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر کسی سیاسی لیڈروں کو ہرگز وہ سبق فراموش نہ کرنا چاہیے جو تاریخ کا تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کسی کوئی خالص سیاسی جماعت ایسے ہی حالات میں اصلاح دین کی مہم سر انجام نہیں دے سکی اگر تاریخ کا مطالعہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ جب تاریخ کے سکھائے ہوئے سبق پر عمل کرنے کا وقت آئے تو انہیں فراموش کر دیا جائے یا قابل اعتبار نہ سمجھا جائے یہ کہنا بے کہ اس خاص معاملہ میں حالات مختلف تھے اور اس لیے ان پر تاریخ کی دائمی سچائیوں کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا تاریخ کا مطالعہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ جو سبق یہاں سے سیکھے جائیں پھر ان کا اطلاق موجودہ زمانہ کے حالات پر کیا جائے جو کوئی ایسا نہیں کر سکتا

سے بیاں لیڈر ہونے کا دعویٰ ہر گز نہیں کر سکتا وہ تو محض ایک عملی مخلص ہے اور وہ بھی ایک ایسے خود غرض انسان ہے جس کے بھی معاملات میں ذاتی ہوس کی ایک بھی بو دونوں ڈال سکتی۔

رہنمائی کا اصل راز کیا ہے؟

فن قیادت کہ ہے ہر دور کے صحیح معنوں میں بڑے بڑے ہر اعظم لیڈر اس فن کا اظہار کیسے کرتے رہے ہیں قوم کی توجہ کو ایک دشمن پر مرکوز کر دیا اور یہ یقین رکھنا کہ کسی طرح یہ توجہ ایک ایک حصوں میں منتشر نہ ہو جائے۔ یہی اس فن کا بھید ہے عوام کی طاقت پکار اس قدر کسی ایک مقصد پر متوجہ ہو جائے گی انتہائی تحمل کی متواصل کوشش سے متاثر ہو کر تحریک میں نئے لشکر بھرتی ہوتے جائیں گے اس طرح حملہ کرنے کی قوت مزید ترقی کرتی ہوئے گی ایک قابل لیڈر کو صرف یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ وہ مختلف دشمنوں کو ایک صف میں شامل کر کے دل سکے ورنہ اس کے لشکر ہو رہ مذہب مقلدین کو مختلف دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے تو امکان غالب ہے کہ انہیں خود اپنا مقصد ہی برحق و انصاف ہونے میں شبہ پڑنے لگے گا۔

عادتاً اکثر لوگوں مزاج ہوتے ہیں جب انہیں کسی ایسے معرکہ سے واسطہ پڑ جائے جہاں دشمن متعدد گروہوں پر مشتمل ہو تو ایسے حالات میں ان کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے وہ سوچنے لگتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم سب تو بھولے ہوئے ہوں اور ہم اور ہماری تحریک سچے ہوئے۔

اس قسم کے خیالات ان کی قوت پیکار مسلوب کر دینے کی طرف پہلا قدم ہوتے ہیں اگر دشمن متعدد ہیں اور مختلف گروہوں پر مشتمل ہیں تو ان سب کو اس طرح ایک ہی ظاہر کرنا ہوگا کہ یہ ایک ہی قسم کے پیچھے بے نظر آئیں مقبض عام تحریک کے پیروؤں کی بھیڑ کو ایک ہی دشمن دکھائی دے جس کے خلاف انہوں نے جنگ کرنی ہے۔

صحیح نصب العین اور کارگر طریقہ کار دونوں تحریک کی کامیابی کے لیے

ضروری ہیں

[illegible] کے [illegible] کے لیڈر اس حقیقت کو نہ سمجھ سکنے کے نتیجے میں [illegible] ناکام رہی۔ انہوں نے [illegible] صاف صاف کہا کہ [illegible] کے راستے سے [illegible] انہوں نے راستہ غلط اختیار کیا۔ ان کی منزل اس پہاڑ کی چوٹی سے دیکھی جا سکتی ہے جس کی ڈھلانیں اس جھونپڑی پر بھی ہوتی ہیں جہاں اس نے [illegible] ہے۔ اس میں [illegible] کی بھی کمی نہیں لیکن وہ اس [illegible] کو [illegible] دے رہا جو اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔ گو اس کی نظر منزل مقصود سے نہیں ہٹتی لیکن وہ راستہ کی نوعیت اور [illegible] سے بالکل بے خبر ہے۔ آخر کار وہ ناکام رہے گا۔

[illegible] کے [illegible] کے مقابلہ کی تعلیم یافتہ تحریک نے [illegible] حاصل کرنے کے لیے جو طریق عمل اختیار کیا وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے جو راستہ انتخاب کیا وہ خوب تھا لیکن اسے منزل مقصود کا صحیح تصور نہ تھا۔ قریب قریب تمام مسائل میں جن میں [illegible] کے [illegible] تحریک ناکام رہی ان کے متعلق کہیں وہ مسائل [illegible] پارٹی کی پالیسی صحیح ہو رہا تھا۔ وہ ہی۔

انہوں نے [illegible] اس کی اہمیت کا درست اندازہ لگایا۔ اس طرح انہوں نے تحریک کے معاشرتی پہلو پر شروع سے ہی زور دے کر عام طبقات کے کثیر التعداد گروہوں کی حمایت حاصل کرنی۔ خصوصاً [illegible] کے وسط طبقہ اور کاریگروں کو اپنا حلیف بنا کر انہوں نے ایسے مقلدین حاصل کر لیے جو وفادار، مستقل مزاج اور قربانی کرنے والے تھے۔ لیکن مسلمان لیڈروں نے مذہبی امور میں سے ہر قسم کا جھگڑا چھیڑنے سے احتراز کیا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں کبھی بھی عوام کی حمایت حاصل ہوگی۔ پولیٹیکل [illegible] پروپیگنڈا کی قدر و قیمت سے وہ واقف تھے۔ اپنے مقلدین کی [illegible] کے روحانی [illegible] کو جوش میں لانے کے لیے یہ لوگ صحیح معنوں میں ماہر فن تھے۔

یہ پارٹی آئندہ کی سلطنت کو اقتدار سے ہٹانے کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کی اس

کی بڑی وجہ وہ تھا جس کے طریقہ کار میں پائے جاتے تھے علاوہ ازیں ان کے ذہن میں اپنے مقاصد کے بھی صاف تصور موجود نہ تھا۔

کمیونسٹ پارٹی جب بھی سامراج کی مخالفت کرتی تھی تو اس مخالفت کی بنیاد اصول کے بجائے مذہبی اصول پر رکھتی تھی اس غلطی کے باعث ایک دوسری غلطی بھی سرزد ہوئی۔

سیاسی اختلافات کی بنیاد اصل ہے نہ کہ مذہب

کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ اگر وہ آسٹریا کو بچانا چاہتے تو انہیں اپنی ساری توجہ اصول پر رکھنی چاہیے ان کی رائے تھی کہ ایسی پالیسی اختیار کرنے سے تو سلطنت اسرعت تمام منتشر ہو جائے گی پارٹی کے بڑے بڑے سربراہ یہی سمجھتے تھے کہ وفاق کی صورت حالات کے قابل نظر تمام پہلے اقدامات سے گریز کرنا چاہیے جس سے مختلف اقوام کے مابین تفرقہ پھیلنے کا ڈر ہو ساتھ ہی ساتھ ان کا خیال تھا کہ ہر اس کوشش کی دھجیاں اڑانی چاہیے جس سے خودی کی صورت پیدا ہو۔

ان دنوں وہ انارکسٹ جو اقوام کی کثرت سے پھیلی ہوئی تھیں خصوصی توجہ کے مستحق تھے ان حالات میں ہر ایک جماعت کو جو اصول انہوں کے خلاف نہ ہو اور پھر ان تمام قومی مواقع پر بھی اپنی صلاح میں شامل کرنا چاہیے یا وہ سے زیادہ داری ظاہر کرنے کی ضرورت تھی اگر آسٹریا کو بچانا مقصود تھا تو ان مواقع کی شرکت بھی داری تھی یہی وجہ تھی کہ مدنظر رکھتے ہوئے مارکسسٹ کے اصل نظریات کی مخالفت کر کے چھوٹے تاجروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی گئیں ان تاجروں میں سے زیادہ تر چیک تھے کمیونسٹ پارٹی کا خیال تھا کہ ہم نے اپنی اس روش سے یہودیوں کے خلاف ایک ایسا محاذ کھڑا کیا ہے جو مذہبی اہمیت کے باعث تمام اقوام کو متحد کرنے کا موقعہ ہم سے چھین رہی تھیں۔

تاہم ظاہر تھا کہ یہودی دشمنی سامراج کی اس قسم کی مخالفت سے کوئی حد تک محسوس نہیں

کرتے ان کی بے فکری کے لیے یہی وجہ کافی تھی کہ اس کی مخالفت کی بنیاد خالص مذہب پر تھی اس کے یہ معنی تھے کہ اگر حالات بہترین صورت بھی اختیار کریں تو بھی مسلمہ کے پانچ کے پانچ فقرے بیکار کر اگر ساری دنیا دور کی جا سکتی ہے یہودی پھر بھی مخالفت سے بچ کر اپنا کاروبار چلا سکے گا اسے پوری قوت برقرار رکھنے میں کوئی دقت درپیش نہ آئے گی۔

تحریک کے نصب العین میں عام کشش ہونی لازمی ہے

ایسے بھی اصولوں سے اس سارے مسئلہ کو کسی معقول طریقہ پر سلجھانا اس کا کوئی علاج کرنا ناممکن تھا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی ہر قوم کی اس طرح مخالفت کی جانے لگا کوئی مذہب نہ بچ سکے اس وجہ سے انہوں نے اس میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔ چونکہ تحریک کے لیڈروں نے اپنی دنیا کی صحیح معقول اصول پر نہیں رکھی بلکہ محض جذباتی بنیادیں قائم کرتے رہے اس وجہ سے اس عقیدہ کی بنا یعنی فقط تنگ نظر حلقوں تک محدود رہی دماغی قابلیت رکھنے والے لوگ ایسی پالیسی کے اصول مخالف تھے وہ روز روشن کی طرح دیکھ رہے تھے کہ یہ ساری تحریک صرف یہودیوں کو جیسا بنانے کے لیے ایک نئی کوشش ہے یا اس کا مقصد محض دوسری مذہبی تحریکوں کا مقابلہ کرنا ہے اس طرح تمام جدوجہد میں کوئی ایسا نشان نہ رہا جس سے پتہ چلتا کہ اس کی بنا کسی اعلیٰ اور روحانی مقصد کی خاطر رکھی گئی تھی سچ تو یہ ہے کہ بہت لوگوں کو یہ تحریک خلاف اخلاق اور قابل نفرین نظر آتی تھی یہ لوگ ہرگز ایسے نہ تھے کہ انہیں یہودوفوبیا کہا جا سکتا تحریک یہ اسباب پیدا کرنے میں ناکام رہی کہ یہاں ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جو تمام بنی نوع آدم کے لیے زبردست اہمیت رکھتا ہے اور اس کے حل کیے جانے پر تمام غیر یہودی دنیا کی قسمت کا دارومدار ہے۔

بنی سام کی مخالفت کے مسئلہ میں اس لیے دونوں طریقہ سے ہاتھ اٹھانے کا انجام یہ ہوا کہ نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

بنی سام کی یہ مخالفت کس نام ہی کی مخالفت تھی اس سے تو اگر بنی سام کی مخالفت کا

کوئی دشمنی کیا ہی نہ جاتا تو اچھا ہوتا۔ قوم کو اس دشمنی سے یہ بھلائی تھی ہوگی کہ اندرونی دشمن قابو میں آگیا ہے علاوہ اس حقیقت یہ تھی کہ خود اس پر سوری کی بیماری تھی۔

یہودیوں نے جلدی ہی سامراج کی اس قسم کی مخالفت کا مزاج کر لیا انہوں نے محسوس کیا کہ ایسی مخالفت کے بعد ہو جانے کی نسبت اس کا جاری رہنا ان کے لیے زیادہ مفید ہے۔

ساری تحریک کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سلطنت کو کام رکھنے کے لیے بڑی بڑی قربانیوں کی گئیں جو مختلف قوموں سے مرکب تھی۔ زمانہ حال کے محققوں کو بھی اس سے بھی بڑی قربانیاں کرنے پر مجبور ہونا تھا۔

واقعات میں کسی مجبوب قوم ہونے کا دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ تھا یہاں کرنے میں ڈر محسوس ہوتا تھا کہ کہیں ہاں تک کی راہیں نہ نکل جائے امید تھی کہ تاریخ قومیت کا مسئلہ نظر انداز کرنے سے بہتر طرح سلجھ جائے گی اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت بھی تباہ ہوگئی اور کرسچین ہونا بھی ختم ہو گیا قومیت ہی حالت کا ایک مرتبہ شدہ ہے جس سے کوئی سیاسی جماعت مطلوبہ قوت عمل حاصل کر سکتی ہے۔ یہ تحریک اس مرتبہ شدہ سے محروم تھی۔

ایک تحریک کو ماحول اور مقصد دونوں کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں

میں ان دنوں تحریکوں کا منظم طور پر مطالعہ کرتا رہا اور دیکھتا رہا کہ وہ کیسے پھلتی پھولتی ہیں ایک سے تو مجھے اس لیے دلچسپی تھی کہ میرا دل اس کا ہوا خواہ تھا دوسری سے مجھے یوں لگاؤ تھا کہ میں اس کے بانی کی دل سے عزت کرتا تھا یہ شخص میری نظروں میں آسمان کے نیچے رہنے والے تمام بزرگوں کا ایک حسین تاک مرجع تھا۔

جب واقعاتی تبلیغ کے اس عہد کے بانی روکا شاندار حملوں کا ان ہاں سے نکل کر پیغام کا ہوا باغ عام کی جانب چلا تو جو دیکھوں انسان کھڑے ہو کر ان دل پر اثر کرنے والے منظر کو دیکھ رہے تھے، میں بھی ان میں شامل تھا یہ میں کھڑے کھڑے میرا دل بھر آیا

میرے ذہن انسانی نے مجھے صاف صاف بتایا کہ اس شخص کا سب کیا دھرا ہوا تھا۔
یہ ہونی تھی اس سلطنت کے سرعت تمام اس کے زوال کی طرف لے جا رہی تھی اگر
ڈاکٹر کارل لوکر جرمنی میں پیدا ہوتا تو ہماری قوم کے عظیم ترین قائدین میں شمار کیا جاتا
اس کی ہر اس کے مقصدوں کی ہم قسمتی تھی کہ وہ ایک ایسی ہونی سلطنت میں پیدا ہوا۔

اس کی وفات سے قبل ہی باتوں میں آگ کے شعلے بھڑک چکے تھے اور ہلاکت پھیلنے
جا رہی تھی قسمت نے اس پر رحم کیا اسے وہ نظارہ دیکھنے سے بچا لیا جس کے متعلق اسے
تمام عمر خدشہ تھا کہ میں اسے روکنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

میں نے اس حالت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جس نے ایک تحریک کو تباہ کر دیا
اور دوسری کی ترقی روک دی۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے شروع سے جو رائے قائم کی وہ
اب ایک پختہ عقیدہ کی صورت اختیار کر گئی ان دونوں تحریکوں کے راستہ میں ایک تو
آسٹریا کی قدیم سلطنت کو مضبوط کرنے کی فی نفسہ مشکلات حائل تھیں۔ علاوہ ازیں
انہوں نے حسب ذیل غلطیاں کی تھیں۔

معاشرت کی اصلاح اور جرمن نسل کا اتحاد

جہاں تک تحریک کے نصب العین کی وہ بنیادی تصورات کا تعلق تھا وہ زمانوں کے
مطابق تھا وہی تحریک وہ کل صحیح راستے پر تھی۔ یہ نصب العین زمانوں کا پابند تھا۔ لیکن اس
تحریک نے جو وسائل اختیار کیے وہ ناموزوں تھے تحریک صحیح قوم تھی مگر معاشرتی مسئلہ
پر کوئی توجہ نہ دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ یہی نام سے اس کی
مخالفت نسلی مسئلہ کے گرد ارد گرد پھیلی تھی اور کسی مذہبی اصول کی بنا پر نہ تھی تاہم یہود
پر خطائف کو عام طور پر سمجھا گیا اور ایک مذہبی فرقہ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں عام
جوش پیدا ہو گیا۔

کرسچن سوشلسٹ تحریک کو زمانوں کے ادیار کا علم ایک حد تک ضرور تھا مگر اس
بدقسمتی یہ جماعت کے اس نے اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے ناموزوں وسائل اختیار کرنے

ن سے ذہانت اور خوش اخلاقی ظاہر ہوتی تھی کہ جیسے وہ شروع تحریک کے بیچ وہاں نے معاشرتی مسئلہ کی اہمیت کو سمجھ لیکن انہوں نے بیسویں کے خلاف جدوجہد میں خاص اختیار کیے وہ سیاسی طاقت کے سرچشمہ کی حیثیت سے قومیت کے تصور کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہے۔

کرپس مشن سے پہلے نے اس ذہانت سے بعد اس کی قدر و قیمت جانچی تھی، اگر وہ اسی طرح نسلی مسئلہ کی اہمیت بھی شناخت کر لیتی اور ساتھ ہی آزاد ریاست سب قوموں کی ہونی چاہیے تھی اس کے آزادیوں کی عالمگیر تحریک نے جیسے نسلی مسئلہ کی اہمیت سمجھی تھی اور بیسویں کے مسئلہ اور قومیت کے تصور کے متعلق صحیح نظریہ کا پتہ لگایا اسی طرح وہ کرپس مشن پارٹی کی عملی ذہانت بھی اختیار کرتی اور وہ خصوصی مسائل کے متعلق ایسی عملی روش پر گامزن ہو جاتی تو پھر ایک ایسی تحریک اٹھتی جو ہماری رائے میں ہندوستان کی قسمت کا پانسہ پلٹنے میں کامیاب ہو جاتی۔

اگر ایسا نہ ہو سکا تو اس کا سارا الزام سطحی آئینہ بازی کی عادت پر ہے۔

ان دنوں کی موجودہ جماعتوں میں سے مجھے کوئی ایک بھی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے ان عقائد کی علمبردار ہو۔ اس لیے میں اپنے تئیں کسی موجودہ تنظیم میں منسلک کرنے پر راضی نہ کر سکا۔ دل ہی دل میں چاہتا تھا کہ ان کی جدوجہد میں شریک ہوں اس وقت بھی مجھے تمام تحریکوں میں وہ وسعت و قوت مطلقہ نظر آتی تھی جو ہر نسل کے لئے حقیقت صحیح اور خلوص قومی اتحاد کے پیدا کرتی تھی۔

میری وفاداری اور آرزوؤں کا مرکز شروع سے تبدیل تھا

ہر بزرگ سلطنت سے میری اندرونی نفرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اس قدر میں خارجی سیاست عملی کے مسائل پر غور کرتا تھا اتنا ہی مجھے یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ سلطنت ضرور ان کی تباہی کا باعث ہوگی مجھے روز بروز احساس ہو رہا تھا کہ ان قوم کی قسمت کا فیصلہ یہاں نہیں ہوگا بلکہ ان میں ہوگا جہاں پر اساسی عملی سیاسی مسائل پر

ی علاقی نہ رکھتا تھا کہ ثقافتی سرگرمیوں کی ہابت سوچ بھی سکے تھا۔

قومی تمدن اور تہذیب کے مسائل کی طرح میدان سیاست میں بھی آسٹریا کی سلطنت وہی بڑھاپے کا ضعف ظاہر کر رہی تھی کم از کم جہاں تک جرمن قوم کا تعلق تھا آسٹریا سے وہی ثقافتی ہدایت نہ رکھتا تھا آسٹریا کے فن عمارت پر یہ تقریباً بالخصوص صادق تھا جو عمارات میں سے کوئی بھی عظیم الشان کہلانے کی مستحق نہ تھی باغ عامہ کی تعمیر کے بعد وہ تمام جتنی عمارات بنی تھیں جب ان کا مقابلہ جرمنی کے جدید ترقی پسند نقشوں سے کیا جاتا تو وہ کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔

اس طرح روز بروز میں ایک دوہری زندگی بسر کرنے لگا ایک طرف تو حقائق اور عقل پر زور دیتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو دشت کرتے ہوئے وکالت میں پیشہ ور اور شاگردی کا زمانہ بسر کر رہا ہوں اسے جاری رکھوں مجھے قرار ہے کہ بعد میں جا کر یہ پیشہ ور نہ شاگردی میرے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی دوسری طرف میرا دل اب کہیں اور ہی لگ رہا تھا۔

مختلف نسلوں سے مرکب سلطنتیں پائدار نہیں ہوتیں

میں بے چین رہنے لگا تھا میں اس سلطنت کے کھوکھلے پن اور اس کے قبیح زوال کا احساس کر رہا تھا اتنی بھرپور ہوا میرے پھیپھڑوں میں بھر جاتی تھی مجھے یہ بات یقین ہو رہا تھا کہ یہ سلطنت مرنے مرنے بھی جرمنوں کے سر پر ہر قسم کی آفات لانے کا باعث ہوگی۔

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ بالآخر سلطنت ہر اس جرمن کو دل شکستہ کرے گی اور اس کے راستہ میں روڑے اٹکائے گی جس میں سچی عظمت کے نشان پائے جائیں ساتھ ہی ساتھ وہ جرمنوں کے خلاف ہر قسم کی سرگرمیوں کی امداد و اعانت کرے گی آسٹرین سلطنت کا دارالحکومت بھانت بھانت نسلوں کی ایک عجیب معجون مرکب تھا۔ اس جزیرہ نما میں چیک، ہنگیرین، روتھینین، سرب، کروٹ اور یہ معلوم کون کون قومیں بھری پڑی تھیں ان سب کے ساتھ جابجا اور ہر جگہ وہ اصل انسانی کو ہوا کر دینے والے

ہر شعبہ زندگی میں موجود تھے مجھے یہ ساری چیزیں دیکھ کر کچھ ہونے لگتی تھی یہ عظیم عمارتیں شکستہ حال انسانوں کی بدحالی کا ایک مرقع دکھائی دیتا تھا۔

میں بچپن سے جس زبان کو سنتا آیا تھا اور جو برسوں کے بعد میں مقامی طور پر بھی وہاں رائج ہے میں اپنائیت و محبت کی بھوک لیے وہاں پہنچا تھا جو وہاں دیکھنے کو ملی وہ اس کے برعکس تھی جس کے اس قدیم گہوارہ کا متوالا میں تھا۔ اس کے یہاں اجنبی قوموں کی جو غلط سلط بھیڑ لگی ہوئی تھی اسے دیکھ دیکھ کر مجھے اس شہر میں رہتے جتنی مدت گزرتی اتنی ہی میرے دل میں ان کی طرف سے نفرت بڑھتی تھی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ مصنوعی آمد و اپنے وجود کو کسی طویل مدت تک قائم رکھ سکے گی محض ایک احمقانہ وہم تھی۔

آسٹریا کی مثال اس حرکت کاری کے قدیم نمونہ کی ہی تھی جس میں مختلف رنگوں کے پتھر ایک مضبوط سیمنٹ کے ذریعہ جوڑ دیے گئے ہوں اور اب مستقبل زمانہ سے بے نیاز ہو کر حرکت کاری کا یہ نمونہ تشکیل پا چکا ہو جب تک اسے نہ چھیڑا جائے تب تک وہ جیسا ہے ویسا ہی قائم رہے گا لیکن جس وقت اس پر کوئی ضرب پڑی وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ فرق اب صرف یہ تھا کہ وہ ضرب کب پڑتی ہے میرا دل جرمنی میں اس روز سے مجھے آسٹریا کی شہنشاہیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی اس لیے مجھے آسٹریا کے عالم استقلال میں فنا ہی بہتر نظر آتا تھا کہ جس قوم کی نجات کی طرف پہلا قدم اٹھ رہا ہے۔

جرمنی اور آسٹریا کا الحاق

ان سب باتوں نے مل کر میرے دل میں اس ملک میں جانے کی آرزو اور بھی شدید کر دی جس کے لیے میرا دل ایام طفولیت سے ہی پیچھے پیچھے تڑپ رہا تھا۔

میں امید کی بادہستا تھا کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب میں اپنا کام پورا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا یا کم از کم وہ دن جسے قسمت نے میری زندگی کی پہلی بیاض اپنے ملک کی خدمت میں وقف کر دوں گا۔

ایک آرزو یہ بھی تھی کہ میں اس سرزمین میں جا کر رہنا اور کام کرنا چاہتا تھا جہاں

میرے دل کی بڑی تمنا رہی ہے وہ یہ کہ تحریک کی دعوت پھیل جائے وہ تمنا یہ تھی کہ میں جس ملک میں پیدا ہوا ہے ہماری مشترکہ وطن سے متعلق کر دیا جائے۔

کئی لوگ اس آرزو کی بیتابی کا تصور نہیں کر سکتے تاہم میں وطن کے لوگوں کو بالخصوص مخاطب کرتا ہوں جو ابھی تک اس سعادت سے محروم ہیں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں دوسرے وہ جو اس مسرت کے مالک تھے لیکن اب وہ قسمتی سے محروم ہو چکے ہیں میں ان تمام لوگوں کو مخاطب کرتا ہوں جو مادر وطن سے جدا کیے جا چکے ہیں اور جنہیں اپنی مقدس ترین وراثت قرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ وراثت ان کی قومی زبان ہے چونکہ وہ اپنی مادر وطن کے مہاجر ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں اس لیے اس پر ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں جب انہیں "بابا جدا" کے گھر کی آغوش میں واپس جانے کی اجازت ملے گی تبھی وہ لوگ ہیں جن کی طرف میرا رویہ ملتفت ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری بات خوب سمجھتے ہیں۔

ایک انسان ہونا اور پھر مادر وطن سے منسلک ہونے کے حق سے محروم رہنا اس کے معنی صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کے خود اپنے دل پر یہ واردات بیت چکی ہو کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ اس اجنبی ملک میں گھر ہونے کی آرزو کیسے بیتاب کر دیتی ہے دل میں رہ رہ کر ایک ہوک اٹھتی ہے جب تک اپنی گھر کے دروازے سے نکل جا نہیں کوئی خوشی اور اطمینان میسر نہیں ہوتا۔ جس کی رگوں میں ایک ہی خون رواں ہے وہ صرف اپنی مشترکہ معاملات میں ہی اس وقار محسوس کریں گے۔

میں نے وانگانوی سے بہت کچھ سیکھا

وانگانوی سے پہلے ایک کتب خانہ تھا اس نے مجھے میری زندگی کے دقیق ترین سبق سکھائے ابھی میرا بچپن مکمل ختم ہوا تھا کہ میں یہاں رہنے آیا جب میں یہاں سے گیا تو میں ایک سنجیدہ و فہمیدہ مرد بن چکا تھا میں نے وانگانوی ہی اپنے صلاحیت بیت کی بنیادیں قائم کیں بالخصوص یہاں مسائل کا تجزیہ کرنا میں نے یہیں سیکھا۔ اس وقت میں

نے جو بنیادی خیالات اور ضابطے بنائے قائم کیا وہ بلکہ میں نے کبھی ترک نہیں کیا میں آج بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ وہ پیشہ ورانہ مہارت کی بنا پر ہمارے پاس کیے گئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اس دور کا مفصل تذکرہ بیان کیا ہے۔ تلخ حقیقت سے واقف میں مجھے وہ سچائیاں تلاش کرنی ہیں جو آپ ہماری صداقت کے بنیادی اصول ہیں ہر گزرتے سال میں یہ صداقت ایک حقیر بندے سے ترقی کر کے آج ایک عظیم انسان مقبول عام تحریک بن گئی ہے اگر میں اپنی نوعمری کے دور میں ذاتی مقاصد کا ایک خاکہ جمع نہ کر لیتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ آج بیسویں اور سولہویں صدی کے الفاظ میں مارکسزم کے متعلق کیا حقیقت مجھوں میں کیا رویہ ہوتا۔ میں معاشرتی مسئلہ کی ہیئت کیا رویہ اختیار کرتا۔

درست ہے کہ مارکسزم کے مصنف نے ہزاروں کو اس راہ کے مروجہ اسباب کا مطالعہ کرنے پر مائل کیا ہوگا لیکن اس سے ہر گز وہ مکمل علم اور گہری بصیرت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو ایک ایسے فرد کے حصہ میں آ سکتی تھی جس نے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خاطر سالہا سال تک سخت جدوجہد کی ہو۔

☆☆☆☆☆☆

مجھے آرٹ سے عشق تھا

آخر میں 1912ء کے موسم بہار میں میونخ جا پہنچا۔

مجھے یہ شہر پہلی نظر ہی میں اتنا بھایا کہ گویا میں برسوں سے یہیں مقیم ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فن تعمیر کے مطالعہ کے دوران میں بار بار میری توجہ جرمن آرٹ کے مرکز کی جانب منعطف ہوتی رہی تھی۔ اگر کوئی شخص جرمنی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے ضرور میونخ کی سیر کرنے چاہیے۔ میونخ کے بغیر جرمن آرٹ کو سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔

جب میں ساری باتوں کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ جتنے عظیم سے عظیم شہر میں نے جتنی مدت یہاں گزاری وہ میری زندگی کی مسرت اور اطمینان کی بہترین گھڑیاں تھیں۔ میری سالانہ تعطیل تھی پھر بھی میں ٹکٹ کی خاطر تھوڑا بچاتا تھا۔ میں نکاسی تو اس لیے کرتا تھا کہ ضرور بہت زندگی میونخ دیکھوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے مطالعہ جاری رکھا جسے کامل بنانے کے لیے میں نے اپنے سامنے جو مقصد معین رکھا تھا اس کا انجام کار میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ روزمرہ کی زندگی میں کئی چھوٹی موٹی تلخیوں پیش آتی تھیں میں ان سے گھبراتا نہ تھا۔ میرے پاس جتنی مجھے ان کے برداشت کرنے کا حوصلہ دیتا تھا۔

علاوہ ازیں یہاں آنے ہی میں مجھے اس شہر کو پیار کرنے لگا دیا تھا۔ مجھے کسی سے نہ تھا میں دل میں کہتا تھا "یہ ایک جرمن شہر ہے! یہ وہ جگہ ہے جہاں سے جرمنی کا آغاز ہوا تھا!" جب میں اس مختلف لمحوں کے مناظر و دل کا تصور کرتا تو میرے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی تھی ایک اور خوشی کی بات یہ تھی کہ یہاں کے لوگ جرمن ہو لیتے تھے۔ یہاں وہ آسٹریا کے روزمرہ کی نسبت خود میرے طرز تکلم کے بہت زیادہ قریب تھی میونخ کے روزمرہ

سے میرے دل میں ہمارے شباب کی یاد تازہ ہو جاتی تھی خاص طور پر جب میں ان لوگوں سے گفتگو کرتا جو برسوں کے بچھڑے سے یہاں آئے ہوئے تھے تب تو وہ یاد اور بھی تازہ ہو جاتی تھی۔ ہزاروں چیزیں ایسی تھیں جنہیں میں دل سے چاہتا تھا، یا یہاں قیام کے دوران میں انہیں چاہنے لگا تھا تاہم اس بات نے میری توجہ کو سب سے زیادہ اپنی جانب منعطف کیا وہ یہ تھی کہ یہاں لوگوں کی قومی ہمدردی اور شہر کا حسن مذاق دونوں مل جل کے تھے یہ حقیقت مقامی عمارات سے بھی مترشح تھی۔ میرا دل اس شہر سے یہاں وابستہ ہو چکا تھا کہ مجھے دیوی کی وہ جگہ سے یاد آئیں جہاں اس کی وجہ یہ تھی کہ میری آج تک میری شخصی ترقی کے ساتھ متعلق رہا ہے اور شاید آئندہ بھی متعلق رہے۔ جوں ہی میں یہاں داخل ہوا اور وہاں خاص کر دیکھ کر میرا دیرینہ مسرت و طمینان سے لبریز ہو گیا اگر کوئی شخص بھی ہنوبان کی خصلتوں سے مبرا ہے اور احساس حسن رکھتا ہے تو وہ یقیناً دیوان خاص کی عظیم الشان عمارت میں ایک کشش محسوس کرے گا۔

ذاتی رشتوں کی طرح بین الاقوامی تعلقات میں بھی احتیاط برتنی چاہیے

اپنے پیشے کا روبار کے علاوہ مجھے سیاسی واقعات کی رفتار کے مطالعہ سے بھی دلچسپی تھی بالخصوص ان سیاسی واقعات کا تعلق خارجی حکمت عملی سے ہوں میں تو مجھے اور بھی زیادہ شغف تھا میں خارجی حکمت عملی کا مطالعہ کرتے ہوئے ترکی کی دوسری قوموں سے اتحادی پالیسی کو زیر نظر رکھتا تھا۔ ابھی میں آزمائش ہی تھا کہ مجھے یہ پالیسی مرتبا غلط معلوم ہونے لگی تھی پھر بھی وہ اتنا میں مجھے صاف صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ ترکی سلطنت اپنے آپ کو جھوکا دینے میں کس قدر دور نکل چکی ہے۔ اتنا میں میرا خیال تھا کہ ترکی کے ارباب اختیار جس ہم سے اتحاد کیے بیٹھے ہیں اس کی کمزوریوں سے بھی واقف ہوں گے مگر انہیں احساس ہوگا کہ وقت پڑنے پر یہ ساتھی کتنا قابل اعتماد ثابت ہو سکے گا۔ شاید میرے ان خیالات کی وجہ یہ تھی کہ میں ترکی کی عظمت کے زمانے کے بعد کی

کریں گے، یہی وجہ تھی کہ آسٹریا کی جانب سے کہیں جو بھوکا پیاسا تھا وہ اسے تسلیم کر لیتے تھے۔

میں ابھی وائنا ہی تھا کہ سرکاری تقریروں اور وائنا کے اخبارات کے مضامین یا بات چیت کر مجھے صاف لگ جاتی تھی۔ باوجود اس کے جہاں تک ظاہری حالت کا تعلق تھا وائنا بھی ایک جرمن شہر ہی سمجھا جاتا تھا۔ کہیں وائنا یا علاوہ دیگر جرمن آسٹریا سے نکل کر سلاو صوبوں میں جائیں تو وہاں اور کیا نظر آتی ہے ہر گیت کے اخبارات پر ایک ہی نظر ڈالی جائے تو اس کا سارا پول کھل جاتا تھا ہر ایک میں اس ریاست کے غداروں کے لیے سوائے گالیوں اور لعنتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ بھی صبح کی رنگ رلیاں ہی منائی جا رہی تھیں اور دونوں شہنشاہ ایک دوسرے کی چیرہ دستیوں پر سر دھن رہے تھے، کہ ان اخبارات نے صاف صاف اس اتحاد کی مخالفت شروع کر دی وہ کہتے تھے کہ جس کی رہائی جمع خرچ کا وقت گزر چکا اور کھلی اشتراک کا موقع آ گیا وہاں یہ ملی جلی کھچڑی ختم ہو جائیں گے۔

چھ سال بعد جب اس اتحاد کا پہلا امتحان ہوا تو ترکی میں سخت مایوسی و غضب کا اظہار کیا گیا اگلی یہ صرف اتحاد توڑنے سے باز رہا بلکہ اس نے دشمنوں کے ساتھ مل کر اس اتحاد کے دونوں ساتھی طرفوں کو روکے۔ جب تک کسی شخص کی آنکھوں پر سرکاری عینکیں چڑھی ہوئی ہیں وہ کیسے اعتبار کر سکتا تھا کہ جو ہر آسٹریا ہونگری بھی اس طرف کا ساتھ دے گا آسٹریا میں اس حقیقت کا خوب چرچا تھا۔

تین (۳) اقوامی اتحاد حکومتوں کے مابین نہیں بلکہ قوموں کے درمیان ہوتے ہیں

آسٹریا کی سلطنت میں محض چند بڑے خاندان اور آسٹرین جرمن اس اتحاد کے حامی تھے بڑے خاندان کا جو رویہ تھا اس کے اپنے سیاسی ضروریات کا نتیجہ تھا وہ تھی، بے آسٹرین وہ بھی بے سیاسی جبلت اور ایک قسم کی کاہلی رکھتے تھے انہیں خیال تھا کہ اتحاد کے

مارنی تھی۔

آخر یہ انتظام کرنے کا مقصد کیا تھا؟ وہ مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا یعنی آبادی کو بڑھنے سے روکنا جیسے ترقی کر سکتا ہے اس کی نسبت کسی بہتر مستقبل کا انتظام کیا جا سکے ترقی کا مستقبل کبھی بہتر ہو سکتا تھا جب ترقی قوم کی ضروریات زندگی مہیا کی جائیں۔

ضبط تولید خلاف وضع فطرت ہے

سوال صرف یہ تھا کہ جہاں تک ہماری نظر کام کرتی ہے قوم کی زندگی مستقبل قریب میں کیا شکل اختیار کرے گی؟ ہم نے کی قوم میں اس وقت ہو بھی قوانین قائم ہے اس کے اندر ترقی کی ترقی اور سوسائٹی کا قصر تعمیر کرنے کے لیے کیا قدم مفید ثابت ہوگا؟ ترقی کی خواہ حکمت عملی ان اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے تھی اگر ان کا صاف صاف تجزیہ کیا جاتا تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے

ہر سال ترقی کی آبادی میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا ہے اس لئے شہریوں کی خوراک کی ضروریات پورا کرنا ہر سال پہلے سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے اس کا انجام ہونے تباہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ زیادہ عالی اور فائدہ مند کے لئے ضروری ہے کہ آبادی کو اس بحران کی نوعیت سے بچنے کے چار طریقے ہو سکتے تھے۔

۱۔ مغربی تہذیبوں کی تقلید کرتے ہوئے ہم بھی مصنوعی طور پر نئے بچوں کی پیدائش پر قابو رکھ سکتے ہیں جس سے آبادی میں اضافہ نہ ہوگا۔

جب کسی قوم پر مصیبت آ جائے، قحط ہو، وبا، سیلاب ہو، زمین زرخیز نہ ہو تو خاص حالات میں قدرت خود بعض نسلوں اور بعض ملکوں کی آبادی بڑھنے نہیں دیتی۔ ایسے موقعوں پر فطرت جنسی وشہوانی کا توڑ دیتی ہے ویسے ہی وہ بے رحم بھی ہوتی ہے وہ تو تناسل کی قوت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کے وہ نوزائیدہ مخلوق کو بے رحم طوفان اور مصیبتوں سے دوچار کرتی ہے کہ جو کوئی طاقت یا صحت کے تقاضوں میں پورا نہ اترے وہ فی الفور عدم آباد روانہ کر دیا جاتا ہے جو کوئی زندگی کے ان

جد و جہد تو صرف تگ و دو مستحکم طرز کو زندہ رکھتی ہے ختم ہو جاتی ہے اب اس کی جگہ پہ نیا پیدا ہوتا ہے کہ "بیماری کمزور اور بیمار مخلوق" کو بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا جائے اس طرح ہوا اور آدم کو پہلے راستے پر ڈال دیا جاتا ہے جہاں ہر آنے والی نسل سے زیادہ مخلوق کا شکار ہوتی ہے کی فطرت کی رضا کو نظر انداز کرنے کی یہی سزا ہے۔

اگر اسی بیماری کو جاری رکھا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی نکل سکتا ہے کہ ایسا کرنے والی قوم آخر کار اس دنیا سے اپنا وجود ختم کر دے یہ درست ہے کہ انسان بھی عام حیوانات کے ارتقائی عمل کی قوانین کی خلاف ورزی کر سکتا ہے لیکن بعد میں اپنے کیے کی سزا بھی مل جاتی ہے کوئی حادثہ فعل اس کمزور نسل کو کالعدم کر دے گی۔ قدرت کی پیشہ ور حافظیں اس کا کام کرنے والے عام انسانی حساسات کا پتہ چلا کر کے زیر فطرت کے قوانین بحال کر دیں گی ان قوانین کا تقاضا ہے کہ کمزور کو مٹا کر اس کی جگہ طاقتور کو دے دی جائے۔

جو حکمت عملی قوم کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے پیدائش کی رفتار روک کر آبادی کم کرنا چاہتی ہے وہ قوم کا استحصال ہو گی ہے۔

قوم کی عظمت ملک کی ارضی وسعت پر انحصار رکھتی ہے

2 ایک اور غلط یہ ہے کہ خود ملک کے اندر ہی نئی بستیوں آباد کی جائیں یہ تجویز ہمارے زمانہ میں دو وجوہ پیش کی جاتی ہے ہمارے بہت سے لوگ سر ہو بھی جاتا ہے اس تجویز کو پیش کرنے والوں کی نیتیں نیک ہیں لیکن اکثر لوگ اس کے معنی نہیں سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ناقابل تصور آفتیں رونما ہوتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ کسی حد تک زمین کی زرخیزی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اضافہ محدود ہے اور اسے دوگنا نہیں بنایا جا سکتا زمین کو زرخیز بنا کر کچھ عرصہ تک ترقی کی رفتار پیدائش کے ساتھ توازن قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں خاندانی کی دولت نہ آنے

کی بھی کمی نہیں ہونا چاہیے۔ زندگی کا معیار بھی آبادی کی رفتار سے ہی بڑھ رہا ہے کہ
ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے۔ سال بہ سال ہمارے ملک کے بچے کی ضروریات زیادہ ہوتی جا رہی
ہیں جو سال پہلے ہمارے آباؤ اجداد کی ضروریات ان کے مقابلے میں بہت ہی کم تھیں
لہٰذا یہ تصور کرنا غلط ہوگا کہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ کرنے سے آبادی کے اضافہ
کرنے سے آبادی کے اضافہ کی ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔ یہ علاج بھی
ایک حد تک ہی کارگر ہے۔ زمین سے جتنی پیداوار ہوتی ہے اگر ہم اس کا ایک حصہ تو
معیارِ زندگی بلند ہونے سے پیدا ہونے والی ضروریات میں صرف ہو جائے گا یعنی
یہاں اگر ہم روزمرہ ضروریات کم سے کم کر دی جائیں اور ہماری طاقت اور محنت پوری
طور پر اسی جانب لگا دی جائے تب بھی ہم اس حد تک ترقی کر سکتے ہیں کہ ہم جائیں گے
جس سے کہ زمین کی زرخیزی میں جو حاصل ہو وہی ہم ترقی کی محنت سے کام لیں زمین
کی پیداوار اس حد سے آگے نہیں بڑھائی جا سکے گی۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ ہم زمین اور اس
کے ساتھ دوسری چیزیں بھی ہوں گی اور ہر ایک اس کا استعمال کرے گا
یہی وجہ ہے کہ اس کی حد بندی ہو گی۔ اور جب بھی کسی کو ضرورت ہو گی تو وہ لے گا
کہ جس طرح آبادی بڑھتی جائے گی ان لوگوں کے درمیان کا مقابلہ کم ہوتا جائے گا
اور کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا تو وہ اس سے نجات پائے گا ... اپنی طاقت سے
ایک دن وہ بھی آ جائے گا جب ایسی نسل ہو گی جس کی قوت سے نجات نہ ہو گی تو ہم
وقت پر ہے لیکن یہ ایک مسئلہ ہو گا کہ ہم طاقت سے قبضہ کریں گے جیسے کہ اقتدار
کس کا ہے وہ انسان کو معلوم ہے اور اپنی قوت سے وہ کام کرے گا اس سے کہ وہ
جس کو اس کی ضرورت ہو گی وہ اس کا استعمال کرے گا جس طرح وہ چاہتے ہیں۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دور ایک دن تو ختم ہو گا، آخر ہم کو قبضہ کا
سبب اس سے کیا کیا لے کر آتی ہے؟

زمین کا مالک وہ ہے جو طاقت سے اس پر قبضہ کرے

بظاہر اعتراض معقول نظر آتا ہے لیکن ہمیں حسب ذیل حقائق بھی نگاہ میں رکھنے چاہئیں۔

وثوق ایک دن یہ آئے گا جب آبادی کی مطلق فراوانی کے مقابلہ میں زمین کی پیداوار بڑھانے کی کوئی کوشش بے سود ہو گی۔ اس وقت یا تو فطرت اپنے قوانین عمل میں لائے گی یا ممکن ہے کہ انسانی خود اس خطرہ کو سمجھ کر اس کا سدباب کرے۔ مطلوبہ توازن قائم رکھنے کے لیے ہماری دست فطرت کے وسائل بہت کارآمد ہوں لیکن یہ مسئلہ تمام بنی نوع آدم کو درپیش ہو گا۔ محض اس کے لیے صرف وہی قومیں اس وقت میں پھنسی ہوئی ہیں جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے مطلوبہ رقبہ حاصل کرنے کی طاقت یا اجازت سے عاری ہیں۔ مثال کی صورت حالات میں کرہ ارض کے وسیع قطعے ایسے ہیں جن پر زراعت نہیں ہوتی ان قطعوں کو کس حال چلنے کا انتظار ہے یہ بھی ممکن ہے کہ فطرت نے یہ علاقے کسی ایک قوم کے لیے وقف نہیں کر رکھے کہ چاہے وہ ان سے استعمال نہ بھی کر رہی ہو پھر بھی نہیں آنے والی ضروریات کے پیش نظر محفوظ رکھ چھوڑے۔ یہ علاقے ان قوموں کی انتظار کر رہے ہیں جن میں ان پر تسلط حاصل کرنے کی طاقت اور زراعت کرنے کی ہمت موجود ہو۔

فطرت کسی بھی صورت کی قائل نہیں کہ اس نے تو دنیا پر زندگی کے بیج بو دیے ہیں اور ہر طرح سے دیکھ کر مختلف جانوروں کی باہمی کشمکش کی پروا نہیں کرتی ہے تو کوئی زیادہ سے زیادہ دلیری اور جرأت کا اظہار کرے وہی اس کا حقدار بنے گا ہے اور اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہو گا۔

جو قوم صلاحیت نہیں رکھے گی اسے ایک دن مفتوح بننا پڑے گا

اگر کوئی قوم داخلی بستیاں آباد کرنے میں لگی رہے گی اور دوسری قومیں نئے علاقے الحاق کر کے تمام کرہ ارض پر اپنے مقبوضات میں مسلسل اضافہ کر رہی ہیں تو ایک دن ایسا بھی آئے گا جب دوسری قومیں تو اپنی آبادی میں اضافہ کر رہی ہوں گی اور اس

کو اپنی آبادی محدود رکھنی پڑے گی یہ دن آخر ضرور آئے گا اگر کسی قوم کا معاشرہ رقبہ میں کم ہے تو اس کے لیے یہ دن جلدی آجائے گا۔ قسمتی سے دنیا کی بہترین قومیں یا علاقہ دنیا کے بہترین اقوام اپنی مذکورہ صفت پسند کے باعث داخلی امتیاز آباد کرنے میں لگی رہیں اور نئے علاقوں پر قبضہ کرنے سے احتراز کرتی رہیں حالانکہ یہی آدم کی ترقی انہیں قوموں سے وابستہ ہے برعکس اس کے ادنیٰ درجہ کی قومیں نے تمام کرہ ارض پر بستیاں آباد کرنے کے بعد نئے علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کی مقابلہ سے حسب ذیل نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

جو اقوام معیار تہذیب کے لحاظ سے برتر رتبہ کی مالک ہیں لیکن سست رفتاری سے پہچانی ہیں وہ اپنی آبادی کی ضروریات کے مقابلہ میں مادر زمین کی قلت کے باعث اپنی افزائش محدود کرنے پر مجبور ہو جائیں گی برعکس اس کے جو قومیں تہذیب کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ پر ہیں لیکن وسیع علاقوں کی مالک ہیں وہ اپنی آبادی میں بیشمار اضافہ کرتی جائیں گی بالآخر اگر یہ معاملہ جاری رہے تو ایک دن دنیا کی آدم کے اس حصہ سے بھر جائے گی جو تہذیب و تمدن میں کم رہنے کے باوجود حالت وسعت میں برتر ہوگا۔

بزدلوں کی دردمندی سے دلیر مردوں کی بیدردی بہتر ہے

چاہے یہ حالت کتنی ہی عرصہ گزرنے کے بعد رونما ہو لیکن ایک دن یہ ضرور آئے گا جب دنیا کی صورتیں باقی رہ جائیں گی یا تو دنیا پر ہمارے تصور بیت کے موجودہ تصور کے مطابق حکومت ہوگی اور ہر فیصلہ کثرت تعداد کی مالک قوموں کے حق میں ہوگا یا تمام عالم پر اقلیت کی تنظیم حاکم کارفرما ہوگا۔ یہ دونوں قومیں عالب ہوں گی جو ہر قسم کی قابل نہیں ہوں ایک مکمل زمین کی مالک ہیں۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ آدم کو اس دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے یہ ایک دن ایک خوفناک کشمکش میں مبتلا ہونا پڑے گا جس کا صرف خواہش کا اس عالب آئے گا۔ جس وقت حفظ نفس کے شعلے مدھم ہونے لگیں گے یہ ہمدردی ویسے ہی بجھ جائے گی جیسے موسم بہار کی دھوپ سے برف پگھل جاتی ہے جب ہم چاہو تو یہ دردمندی اور

انسانیت ہے بھی کیا محض فریب نگس اور حقیقت و واہمہ و ذہن و بیدی کا ایک مجموعہ انسان کی موجودہ حالت مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے اگر ہمیشہ کے لیے امن قائم ہو گیا تو انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مطالبات منوانے چاہئیں کم نہیں کرنے چاہئیں

ملک کے اندرونی اختلافات دور کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ ہم ترقی کے لیے مہلک ہے اس سے یہ مقصد واضح ہو جاتا ہے کہ ہم نے ایک ایسا علاج دریافت کر لیا ہے جو ہماری بیمار صحت کے لیے مطابق ہے یوں ہم ایک بلند مرتبہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اگر اس نظام کا ہماری قوم پر کچھ اثر ہو گیا تو ہم دیکھیں گے کہ اس مرتبہ کے مستحق ہیں اسے حاصل کرنے کی تمام کوششیں ختم ہو جائیں گی ہمارے لیے ایک موسط ترین طریق ہو گا کہ اس ترکیب سے اس کے روزگار اور مستقبل کا انتظام ہو سکتا ہے۔ جب اس ملک کے اہم ترین مطالبات پورا کرنے کی تمام کوششوں پر پانی پھر جائے گا۔ جب قوم اس روش پر قائم ہو جائے تو کسی دوسرے حقیقت مشہود خارجی مملکت عملی کی کہیں گنجائش رہے گی۔ جس قوم کا مستقبل بھی ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے گا۔

جوں ہی ہم اس داخلی اختلافات دور کرنے کے نظریہ کے نتائج سے واقف ہو جاتے ہیں ہم ایک دوسری حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے یہ محض اتفاق ہی نہیں کہ ہماری قوم میں مسموم ذہنیت پھیلانے والے زیادہ تر یہودی ہیں وہ اپنے شکار سے خوب واقف ہے وہ جانتا ہے کہ انہیں فریب کاری سے دھوکہ دیا جا سکتا ہے یہ سادہ لوح مخلوق ہر اس مشورہ کو ایک الہامی پیغام سمجھ کر معمولیت سے قبول کر لے گی جس سے انہیں فطرت کو دادے کر اپنا کر لینے کی امید دلائی جائے وہ زندگی کی سخت اور بے رحم کشمکش سے بچنا چاہتے ہیں انہیں توقع ہے کہ وہ بغیر ہاتھ توڑ کر آرام سے بیٹھے بیٹھے انجام کار دنیا کے مالک بن جائیں گے وہ سوچتے ہیں کہ جب کبھی موقع ملا تو ہم بھی اپنے کارنامے دکھائیں گے۔

اس بات پر اکتفا کر دیا جائے کہ ملک کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے سے صرف معاشرتی تکالیف کا علاج کیا جا سکتا ہے نئی بستیوں کو آباد کرنے کے لیے سب سے ضروری اور پہلی شرط یہ ہے کہ اراضی کو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نجات دلا کر آزاد کیا جائے اس طرح قوم کے مستقبل کا انتظام ہرگز نہیں کیا جا سکتا قوم کے مستقبل کے لیے تو زیادہ زمین حاصل کرنا لازمی ہے۔

اگر ہم کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں تو جلد ہی ہم اس حد تک پہنچ جائیں گے جہاں سے آگے زمین کی زرخیزی کام نہیں دے سکتی سائنس کی ترقی ایک حد تک بڑھ کر آگے ہماری آبادی بڑھنے کی بھی گنجائش نہ رہے گی۔

آخر میں حسب ذیل نتیجے کو دہرانا کوئی بیجا نہ ہوگا

قومی علاقہ محدود ہے اس علاقہ کے اندر نئی بستیاں آباد کرنے کی گنجائش بھی محدود ہے اس علاقہ میں تو محدود تناسل میں رکاوٹ ہونا لازمی امر ہے جہاں یہ دونوں باتیں مل جائیں وہاں کسی قوم کی سیاسی اور عسکری حیثیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

ملک کی وسعت، سلطنت کے دفاع میں کارآمد ہے

قومی علاقہ کی وسعت قومی کی فوجی حفاظت میں بہت بڑا دخل رکھتی ہے کسی قوم کے پاس جتنا وسیع علاقہ ہوتا ہے اس کے مواصلات کے انتظامات بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں وسیع علاقوں کی مالک حکومتوں کے مقابلہ میں جس قوم کا علاقہ محدود ہو اس کے خلاف عسکری نتائج زیادہ جلدی، زیادہ آسانی، زیادہ ہمہ گیری اور زیادہ فیصلہ کن طور سے پیدا کیے جا سکتے ہیں علاوہ بریں قومی علاقہ کی وسعت خود کسی حد تک اس امر کی ضمانت ہے کہ کوئی بیرونی طاقت ملک پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے گی وجہ یہ کہ اس صورت میں لازمی طور پر ہوگی وہ فیصلہ کن فتح حاصل کرنے سے پہلے بڑی جانی کا شکار ہو جائے گا۔ جب آبادی بڑی مہم کا بوجھ اٹھانا ہو تو ایسے جارحانہ اقدام کے لیے معمولی اسباب درکار ہوں گے یہی وجہ ہے کہ کسی حکومت کے علاقہ کی وسعت قومی

حریت و آزادی کی حفاظت کو مقابلۃً آسان بنا دیتی ہے برعکس اس کے سلطنت کا رقبہ
ظلم و تعدی کو خواہ کو مطلق العنان کے دل میں پانی بھر آتا ہے۔

سچ کے بیان کرنے کو بھی سیقہ چاہیے

حقیقت یہ ہے کہ قانون کے ماہر اور مجلس قانون ساز میں آزادی کی حفاظت اور قومی ملازمت کی
نوعیت کے تناسب کو متوازن رکھنے کی پہلی دونوں صورتوں کے خلاف تھے لیکن اس
مخالفت کے حق میں جو دلائل دیے جاتے تھے وہ میرے مذکورہ بالا استدلال سے مختلف
تھے پہلی شق کی مخالفت میں یہ کہا گیا کہ محض اخلاقی جذبات کی بنا پر ہزاروں معصوم
کیوبا کو خانہ جنگ کے اندر تباہی آباد کرنے کی تباہ کن نوعیت خصوصی دی جاتی تھیں
کیونکہ شق کیوبا کو اس طرح بڑے بڑے زمینداروں پر زور دے گی یہ مسلمہ نہیں
ہوتی جائیداد کی ہر ہر قسم کی حفاظت کا فرض خانہ جنگ کے اندر کی سختیاں آباد کرنے کی تجویز
جس رنگ میں پیش کی جاتی تھی اس کے مدنظر بڑے بڑے زمینداروں کے حقوق
بھی تھے۔

بہر صورت خانہ جنگ میں کی سختیوں آباد کرنے کی تجویز جس طرح رد کی گئی اس سے کوئی
دلچسپی کا موقع نہیں ملتا۔ اس طرح ملازمت کا جو مسئلہ ہے اس کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔
علاوہ ازیں جو عذر گزر گیا وہ بات کی تہ کو نہیں پہنچتا۔

اب صرف دو ہی طریقے باقی رہ گئے تھے جس سے یہ حق ہوئی آزادی کے پیش
نظر اک دوسرا کارگر بنایا جا سکتا تھا۔

(۱) ایک صورت تو یہ تھی کہ یہ اختیار حاصل کرنے کی فکر کی جائے جس سے ہر سال یہ حق
ہوئی آزادی کا ایک حصہ دوائش کی خاطر بھیج دیا جایا کرے

(۲) ایک دوسری صورت یہ تھی کہ خانہ جنگ کی صنعت و تجارت کو اس طرح منظم کیا جائے کہ
برآمد کی مقدار بڑھ جائے یوں دوسری منڈیوں میں جو نفع حاصل ہو اس سے قومی
پرورش کے لیے سامان فراہم کیا جائے۔

غرض مسئلہ یہ تھا کہ ملک کے عوام کو روزگار دی جائے یا غیر ملکی نوآبادیاں حاصل کرنے اور تجارت کے فروغ پر توجہ دی جائے دونوں امکانات پر غور کی گئی ان کا تقابل کیا گیا اور مختلف دلائل پیش کر کے ان کے حسن و قبح پر نظر دوڑائی گئی۔ آخر کار آخری تجویز کو اختیار کیا گیا حالانکہ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ علاقہ حاصل کرنے کی تجویز سب سے زیادہ معقول تھی۔

کاشتکار قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہے

زائد آبادی کے لیے نیا علاقہ حاصل کرنے کی تجویز میں کئی خامیاں ہیں بالخصوص اگر ہم حال اور مستقبل دونوں کو نگاہ میں رکھیں تو یہ خامیاں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اول تو اس حکمت عملی پر عمل کرنا اور دنیا جانتا ہے کہ بے شمار قوم کی بنیادیں کاشتکاروں کے مضبوط طبقہ پر رکھی جاسکیں ہماری موجودہ طرز معاشرت کی کمزوریوں محض دیہاتی اور شہری آبادی میں تناسب قائم نہ رہنے کا نتیجہ ہیں آج کل جو معاشرتی امراض پھیل رہے ہیں ان سے کسی قوم کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی نئے اور زرخیز علاقہ کے کاشتکار ہمیشہ بہترین تریاق ثابت ہوتے رہے ہیں علاوہ بریں یہی ایک ایسا علاج ہے جو قوم کی نشوونما کے اندر رہتے ہوئے قوم کے ہاں تسلسل کی ضمانت دے سکتا ہے اگر ایک دفعہ یہ شرط پوری ہو جائے تو آج کل صنعت اور تجارت کو جو غیر معمولی ترقی حاصل ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے بجائے اس کے صنعت و تجارت بھی قوم کی عام نشوونما میں اپنی مناسب جگہ پر آجائیں مالک اور ہم رسائی کے مابین ایک توازن قائم ہو جائے قوم اپنی معاش کے لیے صنعت و تجارت کی محتاج نہ رہے بلکہ انہیں اضافی آمدنیوں کی حیثیت دے دی جائے صنعت و تجارت کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ قوم کی پیداوار اور خرچ کے مابین توازن قائم رکھیں جب یہ فرض ٹھیک طرح ادا کریں تو کم و بیش قوم کی معاش دوسرے ممالک کی محتاج نہیں رہتی قوم کی معاشی حالت مضبوط ہو جائے تو یہ اس کی آزادی اور خودمختاری کی علامت ہے بالخصوص جب قوم کی تاریخ میں کوئی نازک وقت

جائے تو اس وقت یہ حقیقت ہر کسی پر واضح ہو جاتی ہے۔

طاقت کے بغیر انصاف محروم رہتا ہے

واضح رہے کہ تو سیع ملک کی یہ یا ایسی کاموں میں پوری نہیں کی جا سکتی یہ تو اس لیے ہے کہ اس کے اندر یہ تکمیل تک پہنچنی چاہیے یہ بات ذرا لطف دل سے ہر دیکھیں کھل کر سامنے آنے والی ہے یقیناً اس قادر المطلق کی تشبیہ کا نقاضا نہیں کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں اس دنیا کی ارضی پاپوس گنا زیادہ حاصل ہو آج جب کوئی شخص اس صورت حال پر غور کرتے بیٹھے تو اسے موجودہ سیاسی صورتحال کی پروا نہ کرنی چاہیے سوچنا تو یہ ہے کہ ہماری نیت سے انصاف کیا ہونے تو کیا ہونا چاہیے اگر اس زمین پر سب کے لیے کافی جگہ ہے تو ہم کیوں اس حصہ سے محروم رہیں جو ہمارے وجود کے لیے ضروری ہے کیوں اپنا جائز حصہ نہ مانگیں۔

کوئی شک نہیں کہ لوگ خوشی سے جگہ نہ دیں گے یہی وہ موقعہ ہے جہاں حفظ کس کا حق بروئے کار آتا ہے جب منزل کو خوش قسمتی سے حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہو تو جوشیلے دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے نہیں بلکہ صرف کے زور سے فتح ہو گی جس طرح ہماری موجودہ نسل صدیوں کی محنتوں میں پھنسی ہوئی ہے اگر ہمارے آباؤ اجداد بھی اپنے سیاسی فیصلوں کا اختیار ہی نہ رکھتے تو آج ہمیں جو قومی علاقہ حاصل ہے ممکن ہے اس کا بہتر حصہ بھی ہمارے قبضہ میں نہ ہوتا شاید وہ بڑی قومیں جو آج دنیا کے چپہ چپہ میں اپنے مستقبل کی فکر کرتی پھرتی ہیں آج اگر ہم جیسی مغربی اور مشرقی پاکستان کے مالک ہیں تو یہ محض زندگی کی جدوجہد میں ہمارے آباؤ اجداد کے عزم و استقلال کا نتیجہ ہے ہمارے سیاسی اور تمدنی محرومیوں سے ہمیں جو اندرونی طاقت حاصل ہے وہ بھی اسی عزم و استقلال کی مرہون منت ہے یہ اسی طاقت کا اثر ہے کہ آج ہمارے لیے زندگی کے سانس لینا ممکن ہے۔

سلطنت کا استحکام مقبوضات سے ہے

اگلی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے کہ جس کا تقاضا تھا کہ یہی حال اختیار کیا جاتا یورپ کی معاصر حکومتوں میں سے کسی کو وہ شہر کی مثال ایک نمونہ سے دی جا سکتی ہے جو اپنے قاعدے پر کھڑا ہو۔ ان حکومتوں کو یورپ کے جس علاقہ پر تسلط حاصل ہے وہاں کے مقبوضات دیہاتی تجارت وغیرہ وغیرہ کے مقابلہ میں اس قدر تھوڑا ہے کہ خیال کرنے سے ہنسی آتی ہے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نمونہ کی چوٹی تو یورپ میں ہے اور قاعدہ ہوتی ساری دنیا میں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حالت اس سے قطعاً مختلف ہے اس کا قاعدہ تو عظیم امریکہ میں ہے اور باقی تمام دنیا سے محض ہونی کے ذریعے تعلقات ہیں یہی وجہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جو استحکام حاصل ہے وہ اور کسی کو حاصل نہیں علیٰ ہذا القیاس یورپ کی اکثر و بیشتر مقبوضاتی حکومتوں کی کمزوری کا راز بھی اسی اصول میں مضمر ہے۔

برطانیہ اور امریکہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں

اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے انگلستان کی مثال نہیں دی جا سکتی یہ ٹھیک ہے کہ اگر برطانوی سلطنت کے نقشے کو محض ایک بھٹکتی ہوئی نظر سے دیکھیں تو ہمیں اور ہر کسی قوم نے مقبوضات تو دور دور تک پھیلا رکھے ہیں وہ "سمائی نگاہ" سے دیکھ جاتی ہے لیکن انگلستان کی پوزیشن کا مقابلہ یورپ کی کسی اور سلطنت سے نہیں کیا جا سکتا ہے یہ کہ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ دونوں مل کر ایک ہی رون ہر ایک ہی ثقافت کی ایک وسیع کائنات ہے۔

جنگ کرو اور مقبوضات حاصل کرو

محض دنیا کے پہلے اصول راعی کی معقول پالیسی صرف یہی تھی کہ یورپ میں تازہ علاقہ حاصل کیا جاتا مقبوضات جب تک اس قابل نہ ہوں کہ وہاں یورپ کے رہنے والے کثیر تعداد میں جا کر آباد ہو سکیں تب تک اس مقصد کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ انیسویں صدی میں ایسے مقبوضات [illegible] حاصل کرنے کی کوئی مزید

گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

اس قسم کے مقبوضات حاصل کرنے کے لیے سیج کسری جدوجہد درکار تھی۔

غرض یورپ میں تازہ علاقہ حاصل کرنے کیلئے کسری جدوجہد کرنا اور مقبوضات حاصل کرنے کے لیے جنگ مول لینے کی نسبت زیادہ آسان رہتا۔

اس قسم کے ارادہ کا خاکہ تھا کہ قوم کی تمام عاقبت اندیش طبقہ کی قسم کے اظہار خیال کرتی ہوئی اس حکمت عملی کو یا یہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر فرد و بشر کی ساری توجہ کا مرکز ہے یہاں تک کہ ہر ایک کی زندگی کے ہر دن کی روش سے کام نہیں چلتا۔ جرمن سلطنت کے سیاسی قائدین کو اس مقصد کی دھن لگی ہوئی ہے تھی سیاسی قدامات میں اس مقصد یا اس مقصد کو حاصل کرنے کی سہیل کا لحاظ کے ہوا اور کسی حرکا اختیار کرنا چاہیے تھا جرمن کو علم ہو چکا تھا کہ ایسی حربیں طبع جنگ کے لئے نہیں ہو سکتیں۔ جنگ کی تمہید کا سامان اطمینان اور استقلال سے کرنا چاہیے تھا۔

روس سے دشمنی اور انگریز سے دوستی

تمام کا سارا کلام اسی زاویہ نگاہ سے جانچا اور مقرر کیا جانا چاہیے تھا کہ یورپ میں دنیا علاقہ حاصل کرنا تھا تو ایسا کرنے کے لیے زیادہ تر روس پر پیچھے سے وار کرنی تھا جرمن سلطنت کو پوری راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس پر کسی زمانہ قدیم کے جرمن بانٹ چلتے رہے تھے اس دفعہ اس معمہ کا مقصد یہ ہونا تھا کہ جرمن تلوار جرمن تہذیب و تمدن کی عالمگیر علاقہ حاصل کرنے قوم کے لیے راہ ہموار کرے۔

اس حکمت عمل کے لیے سارے یورپ میں صرف ایک ہی قوم ممکن تھا جس کی مراد انگلستان سے ہے۔

جرمنوں کی اس نئی مقدس جنگ میں عقب کی حفاظت کا صرف یہی ایک طریقہ تھا کہ انگلستان سے اتحاد کیا جاتا۔ دوسری اس قوم کے حق میں کسی دلیل نہیں ہو سکتی جو صدیوں کے عزم و توانائی سے زیادہ زبردست تھیں ہمارے صلح پسندوں میں کون ایسا ہے جو

مشرقی سرحد پر پیدا ہونے والے بحران کی وجہ کھانے سے انکار کرنے کی بجائے ہم اس
کہ اس سرزمین پر سب سے پہلے حملہ ہونا تھا اس کا نام "نکوار" ہے

انگلستان کی دوستی حاصل کرنے کے لیے جو قربانی بھی کرنی پڑتی وہ تھوڑی تھی
مفتوحات اور جنگی صلاحیت کی امنگیں ترک کر دی تھیں مگر ہی معلومات سے مقابلہ
کرنے کی کوشش چھوڑ دی تھی۔

یہ مقصد حاصل کرنا تھا تو اس کے لیے ایک صاف اور واضح حکمت عملی درکار تھی اس
حکمت عملی کا تقاضا تھا کہ دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کا خیال دماغ سے نکال دیا
جائے۔ مفتوحات حاصل کرنے کی خواہش اور جنگی صلاحیت کے دعوے ترک کر دیئے
جائے حکومت کے تمام وسائل بری فوج پر مرکوز کر دینے چاہئیں تھے اس حکمت عملی کی
خاطر کچھ عرصہ تک جس حد تک ضروری ہوتی ایک روشن اور زبردست مستقبل کے لیے یہ
عارضی قربانی بھی بہت ہی کم تھی۔

ایک وقت ایسا تھا کہ جب انگلستان اس تجویز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سے گفت و
شنید پر آمادہ ہو جاتا انگلستان اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ جرمنی کی مسلسل فرانس
جرمنی کو یورپ میں انگلستان کی مدد سے کوئی حل تلاش کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اگر
انگلستان نے یہاں امداد سے جی چرایا تو پھر جرمنی بغیر انگلستان کی مدد کے دنیا کے کسی
دوسرے حصہ میں اپنی قوت کا حل تلاش کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

عالمگیر جنگ چھڑنے سے پہلے اس صدی کی ابتدا میں لندن نے جرمنی
کے قریب تر ہونے کی کوشش کی اس وقت جرمنی میں پہلی دفعہ اس رویہ کا اظہار کیا گیا جو
بعد میں بہت افسوسناک طریقے سے نمایاں ہوا لوگوں نے اس وقت یہ مذاق اڑانا ظاہر
کرنا شروع کیا کہ کس طرح تو ہم انگلستان کے مفاد کی خاطر آگ میں کودنے پر مجبور
ہوں گے گویا کوئی اور طبعی اصول ہمارے کسی اور رویہ کا قائم کیا جا سکتا ہے انگلستان کیا
بھی سودا کرنے پر تیار تھا لیکن انگلستان کے مدبرین میں اتنی عقل تھی کہ وہ سالوں پہلے

ضمانت کی قیمت بھی طلب کر رہا تھا۔

جنگیں اقتصادی اتحاد جنگ کی غرض سے ہوتے ہیں

ذرا غور کریں کہ 1904ء میں ہونے والی جاری حکمت عملی کی ہوشیاری سے چلی جاتی جس طرح جاپان نے یہ مطلب کیا ایسی حکمت عملی سے ترکی کو جو فائدہ حاصل ہوتے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جنگ عظیم کی وقوع میں آنی 1904ء میں جو فوجیں بھیجی گئی تھیں اس کا دسواں حصہ بھی نہ ہوتا تو 1914ء سے لے کر 1918ء تک بھیجا گیا پھر آج ترکی کو دنیا میں کیا مرتبہ حاصل ہوتا؟

بہر صورت ان حالات میں انگلستان کے ساتھ اتحاد کرنا ایک صریح غلطی تھی۔

پھر انگلستان کی حکومت کا مدد دینے کا ساتھ اس لیے وابستہ نہ تھا کہ جنگ کو کامیابی کے ساتھ سر انجام دیا جائے اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ہمیشہ ان کا غلام رہے۔ اس لیے ان کا یہ جارحانہ دعویٰ تھا کہ انگلستان میں بسنے والے ترکی عنصر کو آزادانہ طور پر اپنی مصلحتوں کے مطابق کام کرنے دیا جائے۔

اس اتحاد کو بھی قرار دینے کی وجہ بھی تھی اس حکومت میں اتنی طاقت اور استقلال بھی نہ تھا کہ وہ خود اپنی حدود کے اندر ترکی اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش روک سکے اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسری جگہ میں ترکی مفاد کی حفاظت میں کوئی عملی قدم اٹھانے پر آمادہ ہو گی خود ترکی میں قومی جذبہ یہ بھی جوش نہ تھا، جو وہ اتنے دن مفلوج تھی جو اس پیچیدہ بحران سے ایک کروڑ ترکوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی طاقت بخش سکے کے لیے درکار تھی ان حالات میں بحران حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ترکوں کے کسی علیحدہ انتظامی دلیری کے کام میں حصہ لے گی بعید از قیاس تھا قدیم ترکی نے مسئلہ شرقیہ کے متعلق جو رویہ اختیار کی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر ساری قوم کا مقصد بھی نظر میں ہوتا اس کے لیے کہاں تک جدوجہد کا حوصلہ تھا۔

تقدیر ناگزیر ہے

بہر حال مسٹر بابن نے دنیوں پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے انہیں ہرگز جاری رہنے اور سال بہ سال بڑھتے رہنے کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی بحیثیت ایک انسان کے مسٹر بابن کی بھی ایک قدر و قیمت تھی جب تک وہاں ان کا عنصر موجود تھا لیکن یہ بات قابل لحاظ نہ کی گئی۔

جنگ کے امکان سے جیسا خوف محسوس کیا جاتا تھا ویسا کسی اور چیز کا نہ تھا انجام کار یہ نہایت ہی موافق وقت پر ٹل گئی کاش کہ کوئی جانے سمجھے ہوئی انسان نے قسمت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گیا وہ اس عالم خوش رکھنے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن کوئی نہ اپنے تئیں ایک عالمگیر جنگ میں گرفتار دیکھا۔

یہ اس عالم کے خواب دیکھنے ہی کا نتیجہ تھا کہ مستقبل میں دنیا کی ترقی کے لیے جو دروازہ تیسری صورت پر طور تک نہ کی گئی یہ حقیقت تسلیم کی جاتی تھی کہ یا تو وہ صرف مشرقی بنیں ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اس کے یہ معنی تھے کہ آئندہ جنگ لڑنی پڑے گی مگر وہاں تو ہر قیمت پر امن قائم رکھنے کا ربط ہو رہا تھا کبھی دنیوں کی تاریخی علت تھی کا حصول ہو سکتا تھا کہ دنیا قوم کی بقا کے لیے تمام ممکن ذرائع بروئے کار لائے اب وہ اصول یوں تبدیل کر دیا گیا کہ امن عالم ہر ممکن ذریعہ سے قائم رکھنا چاہیے اب ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا میں اس بحث پر مفصل بحث بلکہ کسی جگہ جاری رکھوں گا۔

صنعت سازی، عالمگیر تجارت، عسکری طاقت اور مقبوضات

بھی چوتھی صورت باقی تھی اس کا تقاضا تھا کہ صنعت سازی، عالمگیر تجارت، عسکری طاقت اور مقبوضات کا جواز الحاد پایا جائے۔

بقیہ ترقی کا یہ راستہ زیادہ آسانی اور جلدی سے طے کیا جا سکتا تھا کسی ملک کو تباہ کرنا بہت سہل اور قابل عمل ہے جو بھی کبھی تو کسی صدی میں جا کر مکمل ہوتا ہے باوجود اس

جس نظر سے بھی دیکھا جائے اس صدی کے آغاز میں آسٹریا کے ساتھ اتحاد قائم رکھنا ایک عقلی ضرورت تھی۔

"امن عالم" کا نعرہ ایک ڈھونگ ہے

روس کے ساتھ انگلستان کے خلاف اتحاد کرنے کے دلیل کسی کو یہ خیال ہو کہ انقلابیوں روس کے خلاف انگلستان کو اتحادی بنانے کی فکر بھی کسی کو نہیں ہو سکتی دونوں صورتوں میں جنگ لازمی نتیجہ تھی۔ جنگ سے بچنے کے لیے ہی تجارت اور صلاحیت کی پالیسی اختیار کی گئی تھی۔ اس پالیسی کی تجارت کے ذریعہ دنیا کو فتح کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جو ہمیشہ تشدد کی جگہ کام دے سکتا ہے مگر کبھی کبھی خونخوار اور بالخصوص جب کبھی انگلستان کی جانب سے کام ہوتا ہے تو ناقابل فہم تعصبات موجود ہوتی تھیں تو اس اصول کے کارگر ہونے کے متعلق شبہات پیدا ہو جاتے تھے۔ کوئی چیز قصیر کے ہونے کی سبب ہو تھی اس سے یہ مقصد دیا تھا کہ انگلستان پر حملہ کیا جائے یا اسے تباہ کر دیا جائے اس کا مقصد خیال یہ تھا کہ اس عالم کے مذکورہ بالا تصور اور "دنیا کو پر امن طریقہ سے فتح کرنے کے اصول" کی حفاظت کی جائے یہی وجہ تھی کہ یہ چیز کیا جاتا تھا لفظ اور دوران کے اور کیا جاتا تھا صدی کے نکسر اور حدود کے اندر پابند تھا دلیل یہ تھا کہ اس طرح امن پسندی کا ایک تاثر دنیا میں پیدا ہو جائے گا۔

انگریز ہوشیار بھی ہے اور دلیر بھی!

تجارتی ذرائع سے دنیا کو پر امن طور پر فتح کرنے کی ایک بات اس حرکت کا سب سے زیادہ تھی جو کسی کی حکومت کی حکمت عملی کو اپنانے والے اصول کا دعویٰ حاصل کرنے کی جب اس پالیسی کو قابل عمل ثابت کرنے کے لیے انگلستان کو اور مثال کے پیش کیا جاتا تھا تو یہ حرکت گھڑی کے دو بجے تک چلتی ہوئی تھی ہمارا تاریخ کو حقائق کی طرح رٹے لیتا، اور تاریخ کے متعلق ہر مجلسوں کے تجربات۔ ان دونوں باتوں نے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ لوگ غلط سوچ رہے تھے کہ کس طرح تاریخ

کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ تجارتی ذرائع سے دنیا کو اس طور پر فتح کرنے کے نظریہ کے علاوہ انگلستان کی مثال ایک اصل فاتح کی حیثیت رکھتی ہے۔ انگلستان نے اپنی تجارتی فتوحات کے لیے جس ہتھیار سے استفادہ کیا وہ کسی قوم نے نہ کیا ہوگا۔ انگلستان نے یہ فتوحات تلوار کے بل پر [illegible] حاصل کیں بلکہ اس نے جس رنگ میں سے اپنی فتوحات کی حفاظت کی وہ اپنی جگہ آپ ہی ہے [illegible] کی خصوصیت نہیں کہ وہ سیاسی طاقت سے اقتصادی مفاد اور اقتصادی [illegible] سے سیاسی قوت حاصل کرنے کی [illegible] سے خوب واقف ہے یہ تصور [illegible] ہماری غلطی تھی کہ انگلستان اپنے اقتصادی پھیلاؤ کی خاطر اپنا خون بہانے کی زحمت گوارا کرے گا۔ انگلستان کے پاس فوجی فوج [illegible] تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اصل چیز یہ نہیں کہ اس کے پاس اپنی [illegible] فوجی طاقت موجود ہو اصل چیز یہ ہے کہ [illegible] طاقت میسر ہو اسے استعمال کرنے کا ارادہ اور استعمال کرنے کا حوصلہ ہے۔ انگلستان ہمیشہ وہ ہتھیار حاصل کر لیتا رہا ہے جس کی اسے ضرورت ہو [illegible] استعمال کرتا رہا ہے جو جنگ کے لیے ضروری تھے جب تک [illegible] کام [illegible] انگلستان [illegible] کے پاس [illegible]۔ جب بھی کامیابی کے لیے ساری قوم کے [illegible] خون کی ضرورت ہوئی انگلستان نے اپنا خون زیادہ سے زیادہ [illegible] کافی مقدار میں دیتے رہے [illegible] کی قربانی کے لیے آمادہ [illegible] جنگجوئی کا حوصلہ، [illegible] استقلال اور وحشیانہ عزم کا استعمال [illegible] ہمیشہ [illegible] کے [illegible] یہ سب چیزیں موجود رہی ہیں۔

فریب سے عظمت و سطوت کی تعمیر ناممکن ہے

جرمنی میں [illegible] کے ذریعہ [illegible] کا ایک یہ تصور قائم کیا جا چکا تھا کہ اس سے [illegible] مستقل طور پر جرمنوں کے [illegible] یہ ہوا کہ ہم نے اندازہ لگانے میں وہ غلطی کی

[illegible]

جس کے لیے ہمیں سخت سزا بھگتنی پڑی۔ لوگوں کو بکریاں دھوکہ ہو چکا تھا کہ وہ
مگر یوں کو ایک ہوشیار دکاندار لیکن سوداگری سے بے نیاز دوروں پر لے جاتے تھے۔ قسمتی
سے ہمارے ساتھ پڑھنے والے بعض پیشہ ور استاد اپنے شاگردوں کے ذہن پر
کچھ بات نقش نہ کرتے تھے وہ یہ کہ سلطنت برطانیہ جیسا عالیشان کارخانہ دھوکہ دہی
اور فریب کاری سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر بعض دفعہ اساتذہ یہ فرض سر انجام دینے
بھی تھے تو باتوں کی بڑھوتری ہوتی تھی اور ہمیں خاموش کرا دیا جاتا تھا کیونکہ خوب یاد
ہے کہ ایک دن کلاس میں جب پہلی بار مگر یوں سے آنے والے کا ذکر
ہوا تو میرے ساتھی لڑکوں کے چہروں پر کیسی حیرت برس رہی تھی تھوڑے ہی دنوں کے
بعد ان بچوں کو اسمبلی ہونے لگا کہ سرکاری اعلانات اور عرائض اخبارات میں
مگر یوں کا ذکر نشر کیا جاتا تھا یہ اسکاٹ لینڈ کے باقی اس سے قطعاً مختلف ہیں۔

اس موقعہ پر میں نے پراپیگنڈا کی مختلف اقسام کے کم و بیش کارگر ہونے کے متعلق
اپنی رائے قائم کی جو اب بھی محض اتفاقی صورت پر مشتمل تھی۔

فقط دیانت اور تجارت سے بھی دنیا مسخر نہیں کی جا سکتی

تاہم ہمارے پڑھانے والوں کا اس بات سے جو مقصد تھا کہ اس سے غرض تھی
مگر یوں کا جو حلیہ وہ پیش کرتے تھے وہ بھلا ہی ہو لیکن اس سے پتہ ثابت کیا جا سکتا تھا
کہ دنیا کو ہم اس وقت سے تجارتی وسائل اختیار کرتے ہوئے تسخیر کر سکتے ہیں۔ مگر یوں
جس طریقہ سے کامیابی حاصل کر چکے ہیں ہمیں اس میں کیوں ناکامی ہوئی ہے۔ ہم تو
ان سے زیادہ دیانتدار ہیں بلکہ تجارتی مگر یوں کا خاصہ ہے ہم اس عیب سے بھی
پاک ہیں۔ غرضیکہ ہم مگر یوں سے بازی لے جائیں گے ہمارے ان فضائل کے باعث
ہمیں چھوٹی چھوٹی قوموں کی بھاری اور بڑی قوموں کا اعتماد حاصل کرنے میں آسانی
رہے گی۔

ہمیں یہ احساس نہ تھا کہ جب ہم خود اپنی دیانتداری پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس سے

دوسری اقوام سخت بیزار ہوتی ہیں باقی کی دنیا ہماری اس روش کے متعلق یہ رائے قائم کرتی ہے کہ ہم ریا کار فریب کار کی کا اچھا نمونہ ہے جب ترکی میں انقلاب برپا ہوا تب دوسری اقوام ہماری حالت دیکھ کر حیران رہ گئیں یہاں تو خلوص صداقت کی حد تک پہنچی ہوا تھا۔ اس سے بھی آگے۔

اگر ایک شخص ہم پر اس لئے حملہ کر دیا کہ ہم اس کی تجارتی ترقی سے تغیر کرنے کی صداقت کس طرح سر چڑھ کر بولتی تھی تو پھر یہ کہنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ روشنی کا دوسرا نمونہ بھی اتحاد ثلاثہ کس طرح سے وجود میں آیا۔ آخر کس حکومت سے اتحاد قائم کیا جاتا تھا؟ آسٹریا کے ساتھ اتحاد کا مطلب یہ تھا کہ ہم پر سب سے بڑی عسکری دولت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہی حقیقت اتحاد ثلاثہ کی اندرونی کمزوری کی خاص وجہ تھی۔ بسمارک کی قابلیت کامیاب رہنمائی ضروریات کے پیش نظر اس قسم کی دقتیں دور کر سکتا تھا لیکن اس کے جانشینوں کے لئے یہ دقت کہاں جا رہتی تھی خصوصاً اس تو وہ جانبداری اٹھ چکی تھی جس پر بسمارک نے اتحاد ثلاثہ قائم کیا تھا۔ بسمارک کے زمانہ میں آسٹریا کو پھر ایک دشمن ریاست قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد تو بتدریج ہر ہائی مرد ان کو دوست کا حق حاصل ہونے کے دعوت پر فلک ایک چڑیا خانہ بن گیا تھا۔ اس کارخانے میں دشمن عنصر کی آواز کون سنتا تھا۔

اصلی حکمت عملی کی نظر سے دیکھو تو آسٹریا کے ساتھ یہ اتحاد ہونے تجارتی کے ہو گیا تھا اس کے معنی صرف یہ تھے کہ دشمن سلطنت کی سرحد کے قریب ایک جدید سفارت روس پر حملہ کرنے کی جارت دے دی گئی۔ وقت گزرنے پر جرمنی عسکری قوت دشمنی کے متعلق جو رویہ اختیار کرتی وہ یقیناً دوسری حکومتوں مثلاً روس کے رویہ سے مختلف ہوتا۔ اس اتحاد کے واسطہ جرمنی آسٹریا دشمن ذہنیت رکھنے کے باوجود باقاعدگی کے ساتھ اسلحہ کارخانوں سے باہر نکالے جا رہے تھے۔ ان حالات میں اتحاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہونا ایک لازمی امر تھا۔

بین الاقوامی معاہدات میں مستقبل کو فراموش نہ کرنا چاہیے

1900ء کے لگ بھگ جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد بھی اسی مرحلے تک پہنچا تھا جس تک آسٹریا اور اٹلی کا اتحاد تھا۔

یہاں بھی ایک ہی راستہ کھلا تھا۔ یہ تو ہر بڑے خاندان کی جذباتی کی جاتی، اور یہ آسٹریا میں بڑی عصری جو ختم ہوتے جا رہے تھے اس کے خلاف احتجاج کر رہا کیا جاتا۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص یہ ایک طرف رہنا اختیار کرے اسے ضرور عملی جنگ میں حصہ لینا پڑتا ہے۔

لیکن اگر اس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو بسمارک کا بنایا ہوا معاہدہ جو بظاہر مستحکم اور موجودہ صورت حالات کو قائم رکھنے تک محدود ہوا، کچھ زیادہ اہم بات نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ذریعہ تو صرف اس کے ترکی معاہدہ پر دستخط کرنے والے فریقین کو توقع ہو گی کہ وہ اس کے ذریعہ توسیع مملکت کا عملی نتیجہ حاصل کر سکیں گے تو پھر اس معاہدہ کی باہم متحد رکھنے والی کشش اس خطرہ کے نشوونما کے ساتھ ساتھ بڑھنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی وہی اصول عائد ہوتا ہے جو دیگر میں ہر جگہ منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اگر کامیاب حاصل کرنا ہو تو مداخلت کو چھوڑو، اور جارحانہ قدم کی فکر کرو۔

کئی حلقے ایسے تھے جو اس حقیقت سے واقف تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان میں قوم کے نام نہاد نمائندے شامل نہ تھے۔ 1912ء میں ہی وزیر خارجہ نے جو اس وقت ایک کرنیل اور عسکری اتاشی کا ایک رکن تھا۔ اتحاد کے بیکار پہلو ایک معروضہ کی شکل میں پیش کیے لیکن مدبرین وقت نے اس معروضہ کو ہرگز قابل اعتنا خیال نہ کیا۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا بجا ہو گا کہ عقل کی استعداد فی الحقیقت عام لوگوں میں ہی پائی جاتی ہے، مدبرین کا طبقہ اس سے قطعاً عاری ہے۔

پھر قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ جب 1914ء کی جنگ چھڑی تو اس کی بنا آسٹریا سے ہوئی۔ خاندان ہیبسبرگ مجبور تھا کہ وہ اس میں حصہ لے۔ وہ ہر جنگ کسی اور شکل

میں شروع ہوئی تو فرانس نے کنارے ہی رہ جانا تھا۔ بڑی طاقت ہرگز کبھی کسی ایسی جنگ میں شرکت نہ کرتی جس کے آغاز کا ذمہ دار اتحادی ہوتا۔ بعد میں اٹلی کی غیر جانبداری کا اتنا غلط طعن کیا گیا۔ وہ آسٹریا سے پہلے ہی سرد ہو چکی تھی۔ بالخصوص اگر فرانس کسی اپنے مفاد کی خاطر اعلان جنگ کرتا تو آسٹریا بے خبر ہی رہتا۔ اگر وہ یہ اعلان کرتا تو جوں ہی جنگ شروع ہوتی وہاں انقلاب برپا ہو جاتا۔ سلطان عثمان فرانس کی مدد کرنے کی بجائے تین بڑی طاقتوں کو اپنا دشمن بنا لیتا۔ آسٹریا کے ساتھ اتحاد سے پیدا ہونے والے ان تمام امکانات کو ماریا تھریسا اس وقت کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔

دوستی قائم کرنے سے پہلے دوست کے دشمنوں کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے

اول تو آسٹریا کے دشمن بہت زیادہ تھا۔ وہ اس دن کے بعد سے اب تک اس طرح سال سلطنت کا ورثہ آپس میں تقسیم کرنے کا موقع ڈھونڈتا رہا۔ یہ لوگ روز روز فرانس کے کسی حلیف ہو گئے تھے۔ جب بھی کہ آسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی ہر ایک کو توقع اور ضرورت تھی۔ لیکن فرانس کے باعث ان کی تمنا پوری ہونے میں نہ آتی تھی۔ فرانس آسٹریا کو بچائے ہوئے تھا لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے تو ان کو بھی پامال کرنا چاہے گا۔

دوسرے اس اتحاد میں شامل ہو کر فرانس نے دیگر اتحاد قائم کرنے کے بہترین اور زریں موقع ہاتھ سے کھو دیے۔ اب روس اور پرشیا کے اتحاد کے مکالمات کی جگہ کشیدگی لے رہی تھی۔ اور اگر روما میں آسٹریا کی جتنی مخالفت تھی اتنی ہی فرانس سے موافقت تھی آسٹریا کی مخالفت ہر اطالوی کے سینہ میں پلی ہوئی تھی اور وہ خاموش غصہ سے بھرا ہوا تھا۔

یہ کہ تجارت اور صنعت ہماری کی حکومت عملی تعمیر کی جا چکی تھی اس لیے اب روس سے لڑنے کی کوئی وجہ باقی نہیں تھی [illegible] روس اور فرانس کو لڑانے کی خواہش

صرف ان ممالک کے دانشوروں ہی کے دل میں پیدا ہو گئی تھی حقیقت یہ ہے کہ محض یہودی اور مارکس ازم کے پیروی ان دونوں ممالک کے مابین مخاصمت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔

تیسرے اس اتحاد کے باعث جرمنی کے تحفظ کو ایک مستقل خطرہ درپیش تھا۔ جو حکومت بسمارک کی بنائی سلطنت کی مخالفت ہو وہ جرمنی کے اتحادی آسٹریا کی سلطنت میں سے ہنگری کو الگ کر دے۔ دوسری حکومتوں کا ایک پورا اتحاد جرمنی کے مقابلہ پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ خطرہ ایسے تھے جن سے جرمنی کو ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا۔

اس طرح تمام مشرقی یورپ بالخصوص روس اور فرانس کو آسٹریا کے خلاف میدان میں لے آنا ممکن ہو چکا تھا۔ اگر جرمنی کا اتحادی آسٹریا ایسا تو ڑ دیا جاتا تو جرمنی کی بربادی کی پیشگوئی جو ہالبرسٹیڈ نے کی تھی وہ ضرور پوری ہوتی۔ یہی وجہ تھی جس نے جرمنی کو بھارت بھارت کی حکومتوں کو بوجود دیکھ کر ان کے مقاصد مختلف تھے مگر ایک مسئلہ پر خوش کی شکل دے دی۔ ہر کسی کو توقع تھی کہ اگر وہ جرمنی کے خلاف محاذ میں شریک کرتا ہے تو اس عوض اسے آسٹریا کے حصے بخرے کرنے کے بعد جائیداد بنے کا موقع مل جائے گا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ترکی بھی آسٹریا کے ساتھ جرمنی کے اس مخالف اتحاد میں شریک تھا۔ اس سے جرمنی کو ہر بھی زیادہ خطرہ لاحق تھا۔

یہودیوں کا بین الاقوامی مالیاتی نظام جرمنی کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی منصوبہ بندی کے لیے کسی بڑی جنگ کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے اس میں دوسری حکومتیں جرمنی سے برسرپیکار ہو جائیں یہ چاہتا اسے آسٹریا کی سلطنت کی شکل میں بھی آگئی تھیں بین الاقوامی سودکاروں کے پیروکار ہٹلر اس لیے جرمنی کے دشمن تھے کہ اس نے ابھی تک ان کے سامنے اس طرح سر تسلیم خم نہ کیا تھا جس طرح انہیں دوسری حکومتوں کی بابت یہ حاصل تھا۔ غرض یہاں اس نقطے کو ہمیشہ مضبوط اور دلیر بنا دیا گیا دلیری کی یہ خاصیت تھی کہ وہ دشمن کو زیر کرنے کے حوصلے دیتی تھی۔

خود حفاظتی پہلا فرض ہے

میں ابھی آسٹریا میں ہی تھا کہ میں تاج برطانیہ کے ساتھ اتحاد سے متنفر ہو چکا تھا۔ میں اس اتحاد سے سخت متوحش تھا۔ میں اس پر مسلسل غور کرتا رہتا تھا یہ اسی سوچ بچار کا نتیجہ تھا کہ میں نے خود کو وہ انسان محسوس کیا۔

ان دنوں میری ملاقات کا حلقہ محدود تھا میں نے اس حلقہ میں کئی مرتبہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ عقیدہ ایک ٹھوس عقیدہ ہے جس سلطنت کی بنیاد نسلی نہیں ہوتی اس کے ساتھ اتحاد کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آخر کار وہ وقت علیحدگی نہیں ہو جاتا تو وہ خود کمزور ہو جائے گا۔ میرے اس پختہ عقیدہ میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ باوجودیکہ جنگ عظیم کے طوفان نے محض کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ جوش اور ولولوں کا دور دورہ کر دیا تھا اور ان لوگوں نے ٹھنڈے دل سے محض واقعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے رائے قائم کرنی تھی، وہ بھی اسی حالت میں تھے میں پھر بھی اپنے خیال پر قائم رہا۔ حلقوں میں بھی میری رائے بدستور رہی اور جب کبھی موقعہ ملتا رہا میں اس کا اظہار کرتا رہا۔ میرا عقیدہ تھا کہ اگر تاج برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے سے آسٹریا کے اپنے مفادات میں کمی ہو جائے تو یہ کوئی بڑا سودا نہ ہوگا۔ جس کھوکھلی بنیاد پر انہوں نے ہاتھ میں تلوار لی تھی۔ وہ ایک طویل عرصہ تک ان کو قائم رکھنے نہ دیتی تھی۔ ان کے قومی نقطہ نظر تو اس قوم کی بجائے تھی۔

جنگ سے پہلے بھی کبھی کبھی ایسا موقعہ ہوتا تھا کہ جب ان عوام کا کم از کم ایک حصہ آسٹریا سے الحاد کی سیاسی دانش کے متعلق قدرے مشکوک نظر آتا تھا مگر تھا تو وہ ان کے قدامت پسند طبقے تصور کرتے رہتے تھے کہ اس اتحاد کی اہمیت کو زیادہ مبالغہ نہ دو۔ ان دنوں تو ہر معقول بات سے انکار کی کا رتا کیا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی جاتی تھی۔ میں سوچا ہی تھا کہ تعلیم عام کے بعد صحیح قدم اٹھایا جائے گا۔ اس ترکیب سے قومی کمزوری ہٹے گی اور کلاسیانی سے مقابلہ ہو گی۔

ملت کی شوکت حکومت کی عظمت سے وابستہ ہے

یہاں پھر غریب "ماہ واقف" عوام کیا کر سکتے تھے وہ تو صرف چپ چاپ کھڑے رہ کر یہی دیکھ سکتے تھے کہ ان کے "نمائندے" کس طرح سیدھے راستے کے گڑھے کی جانب بڑھ رہے ہیں اور ان کی بیچاری قوم کس طرح مست ہو کر ان کے پیچھے پیچھے جا رہی ہے۔

اگر ہم غور کریں کہ دنیا کو "تجارتی غول" کے ہاتھوں ورغلانے کی یہ صلاحیت کس طرح عوام پر مسلط کی گئی اور اس عالم کو برقرار رکھنا کیونکر ممکن ہوا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کی بنیادیں اس فعل پر استوار تھیں، جو جرموں کے تمام بیاری طلکار پر مدت سے طاری تھا۔

یورپ میں دستکاری اور صنعت نے جو تیز ترقی کی۔ اس نے جہاں کہ دنیا کی ترقی کی۔ وہاں تجارت روز بروز عروج پر تھی۔ ان سب باتوں نے ہمیں فراموش کر دیا کہ کامیابی کی پہلی شرط ایک طاقتور حکومت ہے۔ برعکس اس کے کئی حلقوں نے یہ عقیدہ پھیلانا شروع کر دیا کہ حکومت کا وجود ہی مذکورہ بالا سرگرمیوں کا مرہون منت ہے حکومت تو ایک اقتصادی ادارہ ہے اور اسے اقتصادی مفاد کے موافق ہی قائم رہنا چاہیے۔ حکومت اقتصادی ڈھانچہ کی متاع ہے ایسی صورت حالات کی تعریف کی جاتی تھی جس سے ایک موزوں حد تک نظم قرار دیا جاتا تھا۔

حکومت کیوں قائم کی جاتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کوئی ایسا کسی خاص اقتصادی تصور یا کسی خاص اقتصادی تاریخ کا نتیجہ نہیں ہے۔ حکومت ہر طرح کے ہاتھی کے بھی عہد و معاہدے سے نہیں بنتی۔ حکومت کے لیے کسی معین مقصد کی ضرورت نہیں حکومت اقتصادی مفاد کی خاطر قائم نہیں کی جاتی۔ حکومت ان جانداروں کی ایک مشترکہ جماعتی تنظیم ہے جن کی جسمانی اور روحانی فطرت ہم جنس ہو۔ ان کی تنظیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی جنس کو قائم رکھے۔ نہیں اس

طرح منظم کر دیا گیا ہو کہ قدرت نے ان کی خاص نسل یا نسل کی ثابت کے ہر دو طرز عمل کیے ہیں۔ انہیں سر انجام دیا ہے۔ یہی وہ واحد بھی ایک حکومت کا واحد مقصد ہے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو کچھ درکار ہیں ان میں سے ایک اقتصادی سرگرمی بھی ہے اس وراثت کی حیثیت محض ذریعہ ہے۔ اقتصادی سرگرمی کبھی کسی حکومت کا سرچشمہ یا مقصد نہیں ہوا کرتی یہ دوسری بات ہے کہ کسی حکومت کی بنیاد شروع سے ہی غیر فطری اور غلط اساس پر رکھی گئی ہو۔ یہی حقیقت ثابت کرتی ہے کہ کسی حکومت کے وجود کے لیے کوئی خاص معین قطعہ ارض درکار نہیں۔ یہ شرط محض انہیں قوموں کے لیے لازمی ہے جو اپنے جسم جانوں کی قوت اور بیوت اپنی محنت سے پیدا کرتی ہیں وہ انسانی حیات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کام کرتے ہیں وہ لوگ دوسروں کی طرح انسانی کی معاشرت کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں سے کام نکلواتے ہیں اور اس کے لیے مختلف بہانے تراش سکتے ہیں وہ بغیر کسی معین قطعہ ارض کے بھی اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں یہ بالکل خاص طور پر اس نکتہ چینوں کی قوم پر عائد ہوتا ہے جو ہمارے عہد میں بالخصوص بنی نوع آدم کے دیانتدار طبقوں کا استحصال کر رہی ہے۔ میری مراد قوم یہود سے ہے۔

نکتہ چینوں کی قوم

یہودیوں کی حکومت کبھی مکانی حدود کی پابند نہیں ہوئی۔ وہ تمام دنیا پر پھیل رہی ہے۔ اس کی کوئی سرحد نہیں اس کی حکومت ہمیشہ صرف ایک نسل کے اندر محدود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ یہودی ہمیشہ دوسری حکومتوں کے اندر ایک اپنی حکومت قائم رکھتے ہیں ان کی یہ چال عیاری کی ماہرترین مثال ہے کہ وہ یہودی سلطنت کو مذہب کا لبادہ اوڑھا کر اپنے لئے اس رواداری کا مستحق ثابت کرتے ہیں جو آریا نسل ہمیشہ مختلف مذہب کی نسبت ظاہر کرنے پر آمادہ رہتی ہے مگر وہ تو شروع سے یہودی نسل کی حفاظت کے قانون کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شریعت معاشرتی سیاسی اور اقتصادی علوم کے ان تمام موضوعات پر حاوی ہے جو اس کے اصلی مقصد سے متعلق ہیں۔

حکومت نسلوں کے انتظامی پیکر کا نام ہے

انسانی گروہوں کو اجتماعی شکل دینے کی بنیادی علت کیا ہے یہ علت انسان کا وہ فطری احساس ہے جو اسے اپنی جنس کی حفاظت پر اکساتا ہے غرض حکومت ایک نسلی پیکر ہے وہ کوئی اقتصادی نظام نہیں۔ ان دونوں صورتوں کے مابین کسی قدر زبردست تفاوت ہے کہ اسے ہمارے موجودہ ذہن نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اقتصادی نظام ہی کی بنا پر حکومت قائم کی جا سکتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت ہمیشہ جنسی قوتوں کے سہارے قائم کی جاتی ہے جو جنس ہر نسل کو قائم رکھنے والی قوت ارادی کے اندر ہیں یہ قوتیں کبھی زندہ رہ سکتے ہیں اور کام دے سکتے ہیں جب مردانہ اوصاف کا شعور ہو انہیں تہذیبی خود غرضی سے کوئی واسطہ نہیں صنف جنس کا ہمیشہ یہی تقاضا ہوتا ہے کہ فرد اپنے تئیں قربان کر دینے پر آمادہ رہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع

"اسے بچا نہیں سکتا جسے مرنا نہیں آتا"

حکومت نسل اور سیرت کے اتحاد سے بنتی ہے

نسل کو باقی رکھنا ہو تو افراد کی قربانی لازمی ہے غرض حکومت قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ایک سنگین کا سا اساسی یکساں شرط ہے اس اساس کی بنیاد نسل و سیرت کی وحدت کو ہر قیمت پر بچانے کے عزم بالجزم پر ہوتی ہے جو قوم اپنے علاقہ میں آباد ہے اس کے اندر یہ احساس مردانہ اوصاف پیدا کرے گا جس کی بدولت قوم دوسروں کا لہو پی کر زندہ رہتی ہے اس کے اندر یہ احساس ہر قسم کی غداری اور مکاری کے خون کی صورت میں رونما ہو گا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہمیں فرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ خصائص ان کی فطرت میں مضمر ہیں دوسروں کا لہو پی کر زندہ رہنے والی گروہ میں ان مختلف سیاسی شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہیں وہ سب ان کی داخلی فطرت کے خارجی مظاہر ہیں مشکل ہیں کم از کم اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ ابتدا میں کسی حکومت کی بنیاد ان مردانہ اوصاف کے بغیر نہیں رکھی جا سکتی۔ جن کا میں نے ذکر کیا ہے جو لوگ زندگی کی جدوجہد میں

ناکام رہیں انہیں ناری سزا ملتی ہے۔ اس طرح ان کے متعلق جملہ وہ ہمت جانے کا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کشمکش کے بارک دور میں مروجہ اصلاحوں کا انکار نہیں کرتے۔ وہ دھروں کا خون پی کر موٹی ہونے والی جونکوں کے ہم قریب ہیں پھنس جاتے ہیں اس جال میں پھنسنے کی وجہ بھی ان کے ذہنی قویٰ کی کمزوری نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ جرأت و استقلال کے فقدان کے باعث ہارے ہوتے ہیں اس کمزوری کی حقیقی اصلیت کو چھپانے کی خاطر اسے "نرم دلی" کا نام دیا جاتا ہے۔

طاقت یا عظمت کے لیے دولت شرط نہیں

کسی حکومت کے قیام اور بقا کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہوتی ہے انہیں اقتصادی حالات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ کسی حکومت کی اندرونی طاقت اور اس کا اقتصادی پھیلاؤ شاذ و نادر ہی ایک وقت نظر میں آتے ہیں۔ ہر عکس اس کے کثیر مثالیں ایسی دی جا سکتی ہیں جہاں اقتصادی خوشحالی حکومت کے ڈوبتے ہوئے زوال کا قوی ثبوت ثابت ہوئی۔ اگر کسی قوی جماعت بندھوں کی بنیادی حقیقت اقتصادی حالتوں پر ہی منحصر ہوتی تو پھر حکومت کے فقدان کا زمانہ بھی وہی ہوتا جب اقتصادی خوشحالی کا دور دورہ ہوتا۔ صورت حالات اس کے برعکس نہ ہوتی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جس ملک کی اپنی تاریخ ہر عکس ثبوت مہیا کر رہی ہو وہاں یہ عقیدہ کیسے رائج ہو سکتا ہے کہ حکومتیں اقتصادی حالتوں سے بالا ہو کر قائم رہا کرتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ بالخصوص صاف صاف ثابت کرتی ہے کہ حکومتیں قوموں کے اخلاقی جوہر سے بنا کرتی ہیں نہ کہ اقتصادی حالات سے اقتصادی سرگرمیوں اخلاقی خوبیوں کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہیں اور جب تک قوم میں سیاسیات کی تخلیقی استعداد ہوتی ہے تب تک جاری رہتی ہیں۔ اس کے بعد اقتصادی نظام بھی زوال پذیر ہو جاتا ہے یہ صورت حالات ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خوفناک مثال سے روشن ہو رہی ہے پہلی نوع انسان کے مادی مفاد وقتی شخصی مصلحتوں کے سایہ میں ہی ترقی کر سکتے ہیں جو ذہنی مادی مفاد

زندگی کا واحد مقصد ان جائیں وہ خود پر قربان کر دیتے ہیں۔

دولت جائیداد سے اور جائیداد قربانی سے پیدا ہوتی ہے

جب کسی قوم کی سیاسی قوت بالخصوص عروج پر تھی تو اس وقت وہاں کی اقتصادی حالت بھی بہتر تھی۔ جوں ہی محض اقتصادی مفاد قوم کے مطمع نظر قرار پائے اور انہوں نے برتر مقاصد کو پس پشت ڈال دیا وہیں حکومت ختم ہو گئی اور اقتصادی تباہی کے آثار بھی وہیں پیدا ہو گئے۔

اگر ہم اس سوال پر غور کریں کہ حکومت کی تخلیق اور بقا کے پیچھے کون سے حقائق کی حقیقت کارفرما ہیں تو ہم مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچیں گے فرد کو مفاد کی خاطر اور اجتماع پر قربان کر دینے کی استعداد اور رضامندی ان خصائص کو اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں ثابت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں مادی مفادات کی خاطر قربان کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا بالخصوص اگر وہ کسی مقصد کی خاطر تو مرنے کو تیار ہے لیکن کسی کاروبار کی خاطر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں۔ مگر ہوں نے اس طرح جنگ عظیم میں اپنی ہوکالت کی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں جدید انسان کی نفسیات پر قابو پانے کا کیا ملکہ ہے۔

انگریز پراپیگنڈا کا استاد ہے

ہم اپنے روزگار کی خاطر لڑ رہے تھے لیکن انگریز کہتے تھے کہ وہ "حریت" کی خاطر جنگ کر رہے ہیں اور حریت بھی پھر اپنی نہیں بلکہ وہ بیچاری تو چھوٹی قوموں کی آزادی کی خاطر لڑ رہے تھے اور جس وقت ان کی اس اصطلاح پر ہنستے تھے اور ناراض ہو جاتے تھے ان کی اس حرکت سے ثابت ہوتا تھا کہ ہمارے دماغ انگلستان کی سیاسی خوابیدہ جنگ سے قبل بھی کبھی خلل پذیر ہو چکی تھی اس وقت انگریز کو ناک بھوں چڑھانا تھا کہ وہ کیا حماقت ہے جو انسان کو خود اپنی مرضی اور خوشی سے موت کا سامنا کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

1914ء کی جنگ میں جب تک جرمن قوم کا یہ دعویٰ رہا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر لڑ رہے ہیں تب تک وہ ثابت قدم رہے لیکن جونہی انہیں بتایا گیا کہ وہ ان شہنشاہ کی

خاطر جنگ کر رہے ہیں ان میں انہوں نے جو جذبہ سے متاثر ہوا شروع کر دیا۔

اور اسے صاحب دماغ "مدبر" لوگوں کے جذبات میں یہ انقلاب دیکھ کر سخت حیرت ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب انسان کو خالص مادی مقاصد کی خاطر مرنے کو کہا جائے تو وہ کتنی آسانی سے موت سے بچنے کی کوشش کرے گا۔

موت اور کی کامیابی سے مادی فائدے حاصل کرنا یہ دونوں تو منتشر تصورات ہیں کروڑوں کروڑ عورتیں بھی اپنے بچے کی جان خطرے میں دیکھ کر فوراً کی دوڑ پڑتی ہے امت کی حفاظت اور امت کو بیرونی دشمن یا حکومت کی حفاظت کی ایسی چیزیں ہیں جن کی خاطر انسان ہمیشہ دشمن کی تلوار کا سامنا کرنے پر آمادہ ہوتا رہا ہے۔

حکومت نفعی مفاد کا آلہ کار ہے

ذیل میں ایک ہی حقیقت بیان کی جاتی ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی

آج تک کبھی کوئی حکومت خالص تجارتی سودے سے اور محض تجارتی مقاصد کو صحیح پائیداری کے درجہ پر کرنے کی خاطر قائم نہیں ہوئی۔ حکومتیں ہمیشہ نفعی حفظ کو برقرار رکھنے کے احساس سے عالم وجود میں آتی ہیں چاہے یہ احساس طاعت کی شکل میں ظاہر ہو اور چاہے مکاری و عیاری کا چولا اوڑھ لے۔ پہلی صورت کی مثال "مدینہ" حکومتیں ہیں جو محبت اور خالق ارتقاء کی بنیادوں پر قائم ہیں دوسری مثال یہودی بستیوں کی ہے جو دوسروں کا خون پی کر زندہ رہتی ہیں جو بھی کسی قوم یا حکومت کے اقتصادی مفاد کو نفعی یا خالص اساسات پر حاصل کرتے ہیں وہیں ناپائیدار اور مظلومی مسلط ہونے لگتی ہے۔

سلطنت کی بنیاد شجاعت پر ہے

جنگ سے پہلے جرمنی میں خیال پھیلا ہوا تھا کہ یہ امن "تجارتی دلال" اور لوٹ مار دولت قائم کرنے کی پالیسی سے جرمن دنیا کو مسخر کر سکتے ہیں اس خیال سے ظاہر ہوتا تھا کہ جرمن حقیقی وسائل سے حکومتیں قائم کی جاتی ہیں اور برقرار رکھی جاتی ہیں وہ جرمن میں وہ بہ اختلاط ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فراست قوت، روحانی اور عملی

نقطہ جو ان اوصاف کا خاصہ ہے وہ بھی تبدیل پذیر ہے جنگ عظیم اور اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ سب اسی انحطاط کا قدرتی انجام تھے۔ جرمن قوم کا یہ روحانی مرض عام کی صورت میں پیدا ہوا تھا۔ مگر ہٹلر کی طرح ایک ہی شخص میں یہ مرض اس قدر شدید تھی جو محض ہنگامی کی حکمت عملی سے معرض وجود میں آئی تھی یہ شیدائے حسن سلطنت کو زندہ رکھنے پر تلا تھا اور یہ شیدا شاید اور تو سب کوششوں سے بڑھ کر جانتا تھا۔ سے مالی یا اقتصادی عہدہ پر ان نے ترقی دی تھی خود جرمن سلطنت اس قیادت کا مرہون احسان تھی جو سر حرب و ضرب کی حکمت عملی پر کارفرما رہی تھی۔

یہودی موت کے جراثیم ہیں

پھر ایسی جرمن قوم کے سیاسی اسلوب کیوں اس طرح تبدیل پذیر ہو گئے؟ یہود صرف انحطاط کی کوئی ایک نشانی نہ تھی بلکہ تمام سیاسی پیکر میں یہی مرض کی علامات ظاہر کے طور پر رونما ہو رہی تھیں وہ قوم کے جسم کو ناسور کی طرح کھائے جا رہی تھیں اپنے نظر آتا تھا کہ کسی نے سر رہا تھا نے اس تندرست جسم میں ایسا زہر داخل کر دیا گیا ہے جو رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے یہی وجہ ہے کہ عقل اور خود حفاظتی کا بنیادی احساس بھی مفلوج ہو گیا ہے۔

میں 1914-12ء کے دوران میں خود ولیم کی حکمت عملی سے متعلقہ مسائل اور جرمن سلطنت کی اقتصادی پالیسی پر مسلسل غور کیا کرتا تھا۔ ایک روز میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس معمہ کا حل وہ حالت ہے جس سے میں دانستہ میں روشناس ہو چکا ہوں فرق صرف یہ ہے کہ وہ بجلی روشنی ایک دوسرے زاویہ نظر سے تھی یہ حالت مارکس کی تعلیمات کا نفاذ دنیا اور تمام قوموں میں اس کا منظم عمل تھا۔

میں اپنی زندگی میں دوسری مرتبہ پھر اس تباہی کی تعلیم کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ ہم اس دفعہ میرے مطالعہ کا محرک میرے ذاتی ماحول کے حالات نہ تھے۔ بلکہ اس دفعہ میں جرمن کی سیاسی زندگی کے عام حالات کے مشاہدہ سے اس طرف راغب ہوا تھا میں

نے اس عالم کو کے عقائد کی کتابوں میں پھر ایک مرتبہ غوطہ لگایا۔

اس کے محکم نتائج کا اندازہ لگانے کی کوشش کی میں نے مارکس ازم کے مقصد کے اصولوں اور سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی معاملات میں اس کی سرگرمیوں کے اثرات کا باہم مقابلہ کرنا شروع کیا۔

اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اپنی توجہ ان کوششوں کی طرف مبذول کی جو اس عالمگیر وبا کے استیصال کے لیے جاری تھیں۔

میں نے اسمارک کے بنائے ہوئے خاص قوانین کا مطالعہ کیا میں نے ان قوانین کا بنیادی تصور، ان کا محرک اور ان کے نتائج سب کچھ دیکھا بھالا۔ بعد میں نے خود اپنی رائے قائم کرنے کے لیے ایک جیوری کے سامنے ان کی مکمل مقدمہ کارروائی ہوئی ہے اس کے بعد بحیثیت مجموعی مجھے اس مسئلے کے متعلق کبھی اپنی رائے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی میں نے قوم پرستوں اور مارکس ازم کے باہمی تعلق کا بھی مزید اور زیادہ عمیق تجزیہ کیا۔

مارکس ازم شروع سے قوم کے وجود کے لیے خطرہ تھا

اس دنوں میں وہ نا میں مقیم تھا میں جرمنی کو ایک ناقابل شکست پہلوان تصور کرتا تھا۔ تاہم ان دنوں بھی مجھے وردی ٹھوک آشوبش میں ڈال دیا کرتے تھے میں اپنے دل میں اور اپنے ملاقات کے حلقہ و علاقہ میں جرمنی کی تاریخی حکمت پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا میری رائے میں مارکس ازم کا علاج ایک نہایت سخت عمل سے کیا جانا تھا۔ لاکھ یہ اس وقت جرمنی کا سب سے اہم مسئلہ تھا میں اس مسئلہ پر بھی نکتہ چینی کیا کرتا تھا میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ خطرے کو دیکھ کر بھی کیسے اندھا دھند آگے بڑھے چلے جاتے تھے مارکسزم اپنے مقاصد کا اعلان یوں کرتا تھا کہ یہ مقاصد عملی جامہ پہن لیں تو اس کے نتائج نہایت اہم ہوں گے۔ میں اس زمانے میں بھی اپنے اردگرد کے لوگوں کو متنبہ کرتا تھا آج بھی میں جب سے زیادہ زور کے ساتھ اپنے ہم خیالوں کو متنبہ کرتا ہوں یہ

مشتعل کرنے والا فقرہ مقصد حاصل ہے کہ "ہمیں کچھ ضرر نہیں پہنچ سکتا" یہ بے خبری اور بے تدبیری کی نشانی ہے ایسی ہی دشمن یا ری پہلے بھی ایک زبردست سلطنت کو تباہ کر چکی ہے ذہنی ان قوانین پر عمل سے کیسے بچ سکتا ہے جو ہر قسم انسانی معاملوں پر حاوی ہیں۔

مارکس ازم بغلی گھونسہ ہے

میں نے 1913ء سے 1914ء میں پہلی مرتبہ اپنی رائے مختلف حلقوں کے سامنے پیش کی ان میں سے کچھ لوگ بالشویک سوشلسٹ تحریک کے رکن تھے میری رائے یہ تھی کہ کسی قوم کا مستقبل بھی تباہ کیا جا سکتا ہے جب پہلے یہ تصور عمل کرایا جائے کہ مارکس ازم کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے میری رائے میں تو اس کی بہترین حکمت عملی مارکس ازم کی تعلیمات کے برعکس کرنے والے اثرات کا نتیجہ تھی اور اب کہا جاتا ہے کہ یہ تعلیم صحیح ثابت ہوئی اور اقتصادیات کی جڑیں کاٹ رہی تھی جو لوگ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے وہ اکثر خود یہ نہ سمجھتے تھے کہ ان کے مقاصد اور اعمال اس نظریہ حیات کا نتیجہ ہیں وہ بھلے بندوں کی طرح کام کرتے تھے۔

جس قوم کا اخلاقی اور روحانی انحطاط ایک مدت سے شروع ہو چکا تھا وہ جیسے کہ اکثر ہوا کرتا ہے اس لوگوں کی اس رو میں بہہ چکی تھی وہ بڑی حد تک اس حقیقت سے بے خبر تھے انہیں علم نہ تھا کہ کوئی طاقتیں ان کی جڑ کھوکھلی کر رہی ہیں اصل مہلک رجحانات و علامات کا علاج کر کے مرض دور کرنا چاہتے تھے چونکہ کوئی شخص اصل مرض سے واقف نہ تھا اور نہ ہی واقف ہونا چاہتا تھا اس لیے مارکس ازم سے مقابلہ کرنے کا طریقہ وہی کارگر تھا جیسے کسی بلم حکیم کا علاج ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب پنجم :: جنگ عظیم

"صلح پسندانہ رقابت"

مجھے یاد ہے جولائی کی سرخوشی میں ایک ہی تردد سے آزردگی رہا کرتی تھی میں سوچتا تھا کہ ہر ایک ایسے زمانہ میں ہوتی جب دیا گیا حکم کھلا فیصلہ کر چکی ہے کہ سوائے فوجداری اور سرکاری ملازمت کے شرفت عام کو اور کوئی راستہ نہیں۔ ایسے نظر آتا تھا گویا تاریخی مشاہیر کی فہرست پر اب ہمیشہ کے لیے ترک کی مہر ثبت ہو چکی ہے مستقبل میں سے ترقی کی صرف ایک شاہراہ دکھائی دیتی ہے اور وہ ہے "قوام عالم کے مابین صلح پسندانہ رقابت" یہ "صلح پسندانہ رقابت" کیا تھی ایک دوسرے کو دھوکہ دہی سے اور خود غرضانہ طاقتی کے لیے کسی تشدد کی نوبت نہ آنے دینا۔ ہر قوم تجارت کا ڈھونگ رچا رہی تھی اس "تجارت" کے دوران میں ایک دوسرے کی منڈیاں غصب کرنی جاتیں کالونیاں چھین لی جاتیں اور "مراعات" حاصل کی جاتیں اس کاروبار کے دوران میں کسی نہ کسی ہنگامہ پر دریغ بے ضرر شور و غل بھی مچایا جاتا تھا۔ صورت حالات کا یہ رجحان بظاہر مستقل تھا عوام بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے دکھائی دیتے تھے کہ یہ دنیا سب تک سوداگروں کی منڈی ہی رہے گی اس "تجارت" میں جن لوگوں کی بالادستی کے لیے ان کے حکمے غصب کیے جائیں گے وہ کون ہوں گے؟ غلام رعایا کے مولیٰ مستحق تو وہ ضرور ہوں گے مگر وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عیار ثابت کریں گے اس کے بعد ان سرکاری طبقوں کی باری آئے گی جو زیادہ سے زیادہ بے ضرر ثابت ہوئے۔ سوداگروں کی نمائندگی مگر کریں گے سرکاری طبقوں کی نیابت تو ان سر انجام دیں گے، بے چارے پیشہ ور تو وہ کارکنوں کے لیے حقیقت منصب پر فائز کریں گے انہیں ہمیشہ شکایت رہتی ہے کہ وہ کچھ نہیں کما سکتے حالانکہ بڑی محنت کرتے ہیں مگر وہ

غیر روایتوں میں مہارت رکھتے ہیں یہ بھی تو ایک کمال ہے۔

میں "میاں صبح کل" نہ تھا

میں اپنے جی میں سوال کیا کرتا تھا کہ میں آج سے سو سال بعد پیدا نہ ہوا۔ جب جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اور جب آسمان دکان کا مالک ہونے کی بھی کارآمد ہو سکتا تھا۔

میں کڑھتا تھا کہ میں اس کرہ ارض پر بہت دیر سے پہنچا۔ نہ معلوم میں کس ناکردہ گناہی سے اس محرومی قسمت کا سزاوار ٹھہرا۔ میرا دل اس خیال سے بیٹھا جاتا ہے کہ میری زندگی کی گھڑیاں اس ہموار سکون میں ہی کٹ جائیں گی جس میں بچپن میں جا بے بکھرا تھا لیکن کیوں صبح کل "نہ ہو کر رہ گیا تھا مجھے اس کا کھوج لگانے کی تمام کوششیں کاوشیں ناکام رہیں۔

اسی دوران میں ہوا فق پر بجلی کی چمک کی طرح نمودار ہو گئی۔ میں ہر روز اخباروں کے مطالعہ میں غرق رہتا۔ جنگ کی خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ اس طرح بھوکا رہنے پر بھی میری خوشی کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا میں مسرور تھا کہ گو زندگی مجھ سے کوسوں دور ہے تاہم زندگی میں ایک مرتبہ ایک مرد میدان جنگ آزادی کے مشاہدہ کرنے کا موقع تو ملا۔

جب روسیوں اور جاپانیوں میں لڑائی چھڑی تو میں ہوش سنبھال چکا تھا اور خود سوال پیدا کر سکتا تھا اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو میں اپنے قومی مفاد کے پیش نظر جاپانیوں کی جانبداری کرتا۔ میرا خیال تھا روسیوں کو شکست ہوتی تو اس سے آئندہ ہمارے حکمرانوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔

طوفان سے پہلے سکون کی گھڑیاں

دفعتہً روسو جاپان جنگ کے کئی سال بعد میں یورپ پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ میں زوال کا صحیح تصور کیا کرتا تھا۔ طوفانوں سے پہلے سکون کی جو گھڑیاں تھیں

بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ آسٹریا کی ناوبی حدود پر سربیا ایک خطرناک دشمن تھا۔ جو ہر وقت ہنگری و آسٹریا کو جنگ کرنے پر آمادہ کرتا تھا۔ اس نے اب تک چین نہ لیا تھا جب تک آسٹریا سلطنت تباہ نہ ہو جاتی۔ آسٹریا کو معقول وجوہات کی بنا پر خطرہ تھا کہ یہ بادل کسی وقت بڑھے شہنشاہ کی موت کے ساتھ ہی آ جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو ڈر تھا کہ اس وقت شہنشاہیت مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی گذشتہ چند برسوں سے شہنشاہ فرانسس جوزف کی ذات ہی آسٹروہنگری سلطنت کا مجسم وجود بن چکی تھی عوام کی نظروں میں تو ان بزرگوار کی موت کو خود سلطنت ہی کی موت تصور کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں نے بڑی چالاکی سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ آسٹرین سلطنت کا وجود ہی شہنشاہ معظم کی ذات پر منحصر ہے کہ ان کا ایک کرشمہ ہے جادو اگر مر گیا تو وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ بلغراد میں یہ خوشفہمی پائی جاتی تھی۔ اس کا بھی خیال نہ تھا کہ شہنشاہ نے واقعی جو خط و کتابت ہنگری میں اس قصیدہ خوانی کو ان سے کروا لی تھیں۔ اس شیریں بیانی کی یہ بیل جو بڑی پیچیدہ تھا اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ کوئی نہیں کہتا تھا کہ اگر سلطنت کا وجود ہی ایک دانائے روزگار شہنشاہ کی انتظامی خوبیوں کا مرہون منت ہے تو اس روز موت کے فرشتے نے اس کے محل کے دروازے پر دستک دی اس دن سلطنت کا کیا حشر ہوگا۔ شاید یہ غلط بھی تبادل عام تھی۔

آسٹرین سلطنت کا تو خیر اس کے تاجدار معظم کے تصور بھی ہم جنس ہو گیا تھا۔ یہی فکر آتا تھا کہ جیسے ہی فرینز کا جوزف سر ہو گا ہنگری الگ ہو جائے گی۔

جنگ سے بچنا ممکن نہیں

وائنا کی حکومت کو جنگ شروع کرنے کا الزام دیا اور کہا کہ جنگ تک کی تھی بے انصافی ہے جنگ تو ٹل بھی سکتی ہے شاید ایک دو سال کے لیے ملتوی کر دینا ممکن تھا لیکن جو آسٹرین مدبرین کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ امتحان کی گھڑی ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھے نتیجہ یہ تھا کہ آسٹریا کا ایسا کوئی مدبر نہیں تھا جو سارا جائزہ حالات میں تھا

لڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

حق یہ ہے کہ جو لوگ جنگ روکنا چاہتے تھے انہیں جنگ روکنے کے نتائج برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے تھا۔ ان نتائج کا ایک خلاصہ تو یہ تھا کہ آسٹریا سے دست برداری اختیار کی جاتی جنگ اس کے بعد بھی ملتوی ہوتی رہتی ہوں اس جنگ میں تمام قوم عالم ہوا سے خلاف صف آرا ہوتیں شاہان ہیبرگ کا خاندان مٹ جاتا فرانسیسوں کے پاس صرف یہ فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا کہ آیا وہ شاہان ہیبرگ کا خاندان برقرار رکھنے کی کوشش کریں یا وہ خود ہی اپنا مقدر اپنے قسمت کو اپنا کام کرنے دیں۔

آج جو لوگ سب سے زیادہ بلند نعرے لگاتے ہیں اور اسباب جنگ کا مذاق اڑانے میں پیش پیش کام کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں ریشہ دوانیاں جنگ کی سب سے بڑی مہلک وجہ تھیں۔

ماہ مئی سے جرمن شہنشاہی جمہوری پارٹی روس سے جنگ ملتوی کرنے کی تجاویز سازشوں میں مصروف تھی مرکزی جرمن پارٹی اپنے مذہبی مقاصد کے پیش نظر آسٹرین ریاست کو جرمن حکومت میں کامگور دینا چاہتی تھی ہے ان دونوں کا خیال تھا کہ "وقت" ہمارا ساتھ دے رہا ہے جو کچھ ہو وہ ہمارے حق میں ہی ہوگا تھا۔ ہونی سے کوئی واقف نہ تھا۔ جرمن حکومت کا کچھ قصور تھا تو یہ کہ محض حفظ امن کی خاطر اس نے بار بار جنگ شروع کرنے کے اچھے مواقع ہاتھ سے گنوا دیے دوسری طرف اس نے خاموش رکھنے کے معاہدہ میں اپنے تئیں پھنسا لیا۔ اور آخر کار اس عالمگیر اتحاد کا ذکر ہوئی جو قوموں کی حفظ امن کوششوں کا حاصل تھا۔ اور عالمگیر جنگ شروع کرنے پر تلا ہوا تھا۔

آسٹریا کی حکومت اتنا سخت آئینی معاملہ سمجھتی تھی اس سے بگاڑ نہ پیدا ہو۔ ہونے والے عام ضرور مگر جانی عوام ہو اس آئینی معاملہ کو بھی ضرورت سے زیادہ اہم قرار دیتے تھے بہر حال وہ اسے خاندان ہیبرگ سے متعلق ہر گز نہ سمجھتے تھے اگر آج کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو یا وہ ایک سادہ لوح انسان ہے جس کا مطالعہ کام نہیں کرتا اور یا وہ جان بوجھ کر

بھوت بولتا ہے۔

جنگ ایک سعادت ہے

1914ء کی جنگ پر آخر عوام کی خوشی کی بھی حقیقت یہ ہے کہ عوام خود جنگ کے خواہاں تھے۔

ہر طرف جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اسے ایک مرتبہ دور کرنے کی خواہش عام تھی اگر یہ بات نہ ہوتا تو کیوں لاکھوں نوجوانوں اور مردوں کی خوشی سے فوج میں بھرتی ہو کر اس مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ قربان کرنے پر آمادگی ظاہر کرتے۔

میرے اپنے تو لڑائی کا اعلان جس حالت میں مجھے اس خبر کی سے چھٹکارا ملا جو میرے نام جوانی کو پامردہ کر رہی تھی مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی شرم نہیں ہوتی کہ میں اس وقت حد درجہ کی رو میں بہہ گیا میں نے گھٹنے ٹیک کر آسمان کا بار بار شکریہ ادا کیا کہ مجھے اس زمانہ میں زندگی بسر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

آزادی کی جنگ اب شروع ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی شروع ہو چکی تھی اس کی مثال اس سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہ تھی جوں ہی قسمت نے یہ کام شروع کیا اسی وقت سے ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب آندھیاں اور مصیبتیں کا سامنا نہیں ہے کہ اس قوم کا وجود ہلاک ہو جائے۔

مدتوں آنکھیں بند رکھنے کے بعد اب قوم کو آنے ہوئے واقعات صاف دکھائی دینے لگے یہی وجہ تھی کہ جب یہ زبردست لہر کی شروع ہوا تو پہلے تو فوری جوش کا مظاہرہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی قوم کو احساس ہوا کہ قصہ کے حل سے کام نہ چلے گا۔ جلدی جوش نے ذرا ٹھنڈے ہو کر ایک مستقل جرمانہ عزم کی صورت اختیار کر لی حالات کی نزاکت سمجھنا نہایت ضروری تھا عوام کو ابھی یہ بھی علم نہ تھا کہ جنگ کتنا طول کھینچے گی عام خیال تھا کہ کرسمس سے پہلے پہلے ہی گھروں کو واپس لوٹ آئیں گے اور مزے سے پھر روزگار کا کام شروع کر دیں گے اس کا نہ تو کسی کو علم تھا اور نہ کسی کو خیال آتا تھا۔

جنگ نسبی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے موقع ہے

انسان جو چاہتا ہے اس کی توقع رکھتا ہے اور اسی کا معتقد ہوتا ہے لوگوں کی غالب اکثریت ایک عرصہ سے سیاسی مسائل کے عدم تعین اور ہر روز کی تشویش سے تنگ آ چکی تھی یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی آسٹریا اور سربیا کی جنگ ہتوی ہونے کا امکان تسلیم نہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ بھی عام خیال تھا کہ جلدی اکھل کا نتیجہ برآمد ہو جائے گا جس کی دکھوں مخلوق کے ساتھ بھی آرزو کرتا تھا۔

جوں ہی سرائیوو کے حادثہ کی خبر یورپ کی تمام سرحدوں میں دوڑ گئی تو ایک تو یہ کہ جنگ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں دوسرے یہ کہ ہر ایک حکومت اپنے معاہدہ کی پابندی پر مجبور ہو جانے کی مجھے خوف ہوا کرتا تھا کہ کہیں اس معاہدہ کی وجہ سے جس خود کبھی اپنے جھگڑے میں پھنس جائے جس کا آسٹریا سے براہ راست واسطہ نہ ہو ایسی صورت میں مجھے ڈر تھا کہ آسٹرین حکومت اپنے داخلی سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے حلیف کی مدد سے معذوری نہ ظاہر کر دے۔ لیکن اب ایسا کوئی خدشہ نہ تھا یہ بڑا سیاسی تدبر ہے کہ حکومت چاہے اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔

جنگ کے متعلق میرا اپنا زاویہ نگاہ بھی بالکل واضح تھا مجھے یقین تھا کہ یہ نہاں سربیا سے آسٹریا کے مطالبات تسلیم کروانے ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ خود ہمارے اس قوم کی حیات و ممات، اس کی آزادی اور استقلال، اس کی ہستی برقرار رکھنے کا سوال ہے بسمارک نے جس کام کی بنیاد رکھی تھی وہ ہر قیمت پر جاری رہنا چاہیے ہمارے آباؤ اجداد نے ویسن برگ، ہیوان، ہوریوں کے معرکوں میں دشمن کو شکست دیتے ہوئے جس خون کی قربانی دی تھی آج ہمارے نوجوانوں نے ثابت کرنا تھا کہ ہماری رگوں میں بھی وہی خون کھول رہا ہے اگر ہم نے یہ جنگ جیت لی تو ہماری قوم یورپ کی بڑی قوموں میں سب سے آگے ہوگی۔ پھر وہ وقت بھی ہوگا جب ہمارے سیاست اپنے پاؤں کے زور سے کھڑا ہونے کا حوصلہ پائے گی۔

جنگ حق و باطل کی پل صراط ہے

لیکن اس وقت مجھے اس کا انتظار نہ تھی کہ موقعہ ملے تو ثابت کروں کہ میرا قومی جوش خالی ڈینگ ہی نہیں۔ بسا اوقات مجھے خود یہ گمان محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے اس احساس کے لیے دلیل نہ دے سکتا تھا مگر دلیل لانے والے کو جب تک خود لانے کا حق نہیں پہنچتا جب تک وہ حق دوست کی پل صراط پر اپنا حق ثابت کرے۔ جہاں ہر ایک گزرنے والوں کے لیے پل ٹوٹنے کا کوئی راستہ نہیں اور جہاں قسمت کی دیوی قوموں اور شخصیتوں کے خلوص کی بے رحمانہ آزمائش کرتی ہے۔ آنکھوں نے ان نوجوانوں کے ساتھ جب مجھے اس پل صراط کی طرف جاتے دیکھا تو میرا دل مسرت سے اچھل پڑا میں نے اپنی کا قومی نہ ادعا قومی امنگ اور اپنی زبان سے ادا کیا تھا اب مجھے یہ ثابت کرنا اور نعرہ لگانے کا حق ثابت کرنے والے امتحان میں شرکت کا موقعہ ملا تو میں نے محسوس کیا کہ میں عمل اور وقت اپنے حقوق استعمال کرنے کا کما حقہ ادا کر رہا ہوں۔

یہ مجھے شروع سے ہی معلوم تھا کہ جنگ میں شامل ہونا ہے تو کن لوگوں کو کھانی دینا ہو گا اب میری جگہ وہاں تھی جہاں میرے ضمیر کی آواز نے مجھے طلب کیا تھا۔

جنگ اقوام عالم کا شاہانہ دنگل ہے

آسٹریا سے میری محبت روز بروز سیاسی وجوہات کی بنا پر تھی۔ اب جنگ چھڑ گئی تو مجھے اپنے سیاسی عقائد کے مطابق اس کی مدد عمل کرنے کا موقعہ مل گیا میں ہر گز شہنشاہیت کے پیار نے سے متفکر تھا لیکن میں اپنی قومی نسل اور قومی سلطنت کے لیے جان تک دینے پر آمادہ تھا۔

3 اگست 1914ء کو میں نے ملٹری معلم لوگ تاری شاہنشاہ یا کی خدمت میں ایک ضروری درخواست پیش کی کہ مجھے بویریا کی ایک رجمنٹ میں بھرتی ہونے کا موقعہ دیا جائے میں دنوں محکمہ وار نے ایسی درخواستوں کے طومار لگا دیے ہوئے تھے۔ اس لیے جب مجھے جواب ملا کہ میری عرضی منظور ہو گئی ہے تو میں اور بھی خوش ہوا میں نے

کا پہنچے ہوئے ہاتھوں سے تعاون کرو۔ اس لڑائی میں اس وقت کی مسرت بیان نہیں کر سکتے جب میں نے ہوا کر مجھے بیک ہوا میں رخصت میں جانے کیا تو یہ بے پناہ خوشی اور میں وہ وردی میرے ساتھ تھی جو کہ چودہ برس تک اتارنے کی نوبت نہ آئی تھی۔

اب میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جو ہر انسان کی طرح میرے لیے سب سے زیادہ قابل یادگار ہے اس زندگی کے کچھ حصوں سے ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں جن سے کوئی روی۔ آج اس زمانہ کو بیس سال گذر چکے ہیں پھر بھی جب میں ان دنوں کا تصور کرتا ہوں تو دل ایک مست کر دینے والے فخر سے بھر جاتا ہے مجھے جنگ کے وہ ہنگامی لفظ یاد آجاتے ہیں جب قوم اور ملک کے خواہ جنگ میں مجھے بھی حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

گولیوں کی سرسراہٹ اور توپوں کی گرج

جب وہ نظارے یاد آتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے گویا ابھی کل کی بات ہے جب کبھی میں اپنے آپ کو اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، کبھی ایسی ہی کوئی مشق میں ہاتھیاں لیتی ہے اور وہ دن بھی آپہنچتا ہے جب ہمیں محاذ جنگ پر روانہ ہونا تھا۔

ان دنوں ہم لڑکوں کی ہوا میں کی طرح مجھے ایک ہی فکر دامن گیر تھی وہ یہ کہ کہیں ہمارے محاذ جنگ پر پہنچنے سے پہلے ہی جنگ ختم نہ ہو جائے بار بار مجھے یہی خیال ستاتا تھا۔ فتح کا بگل بجنے کی کیا لطف آئے گا اور جب مزید توجہ کی تو یہ تھی اور شدید ہو جاتی۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب مجھے میرٹھ سے محاذ جنگ پر جانا تھا میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دریائے رائن دیکھا۔ ہم مغرب کے رخ سفر کر رہے تھے اس وقت رائن دریا کے سامنے ہمیں اپنے روایتی دشمن کا مقابلہ کرنا تھا جب سورج کی پہلی کرن پانی کی سطح پر چمکی یادگار میں کھڑی ہوئی ہماری فوج نے ایک آواز ہو کر گانا شروع کیا۔ رائن دریا کے پار چلو مجھے اس وقت ایسے محسوس ہو گویا میری روح تن میں سما نہیں رہی۔

کھلی رات کی خنکی اور بھیگی وردی کا بوجھ ہم نے خاموشی سے برداشت کیا۔ ہم نے ستاروں کے سائے میں مارچ کرتے رہے صبح کی روشنی کے ساتھ ہی آبی گولوں کی ایک خوش آمدید نے ہمارا استقبال کیا گولے ہمارے دائیں بائیں پھٹتے تھے اور ہم زمین میں دھنس جاتے تھے ابھی گولے کا دھواں ختم نہ ہوا تھا کہ دوسرے بادلوں نے ہمیں اپنے رسوخ کے اس پہلے پیغام کی خوشی میں خیر مقدم کیا اس کے بعد گولیوں کی سرسراہٹ اور توپوں کی گرج کے ساتھ ساتھ ہواؤں کے گانے کی آوازیں آنے لگیں ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے ہماری رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی آخر ہم وہاں پہنچے جہاں قریب ہی جنگ ہو رہی تھی کمپنیاں اور بٹالین اور پلٹنوں کی یلغاریں ہمارے پیچھے رہ گئی تھیں۔ دور سے ایک گیت کی لے سنائی دی ایک پلٹن کے ساتھ دوسری پلٹن ہمنوا ہوتی جا رہی تھی ملک الموت نے اپنا کام شروع کیا تو ہم نے بھی اپنی فتح کا قومی ترانہ گانا شروع کر دیا۔ ہم سے سن کر یہی گیت ہمارے پاس والوں نے بھی گانا شروع کر دیا اور یوں یہ سلسلہ جاری رہا۔

جنگ دلیری اور بزدلی کی کشمکش کا نام ہے

چار دن لڑائیوں میں بسر کر کے ہم واپس ہوئے ہمارے قدم تک سب ہل چکے تھے ستر و ستر و سال کے لڑکے عمر رسیدہ سپاہی دکھائی دیتے تھے میری رجمنٹ کا نام اس رجمنٹ تھا اس رجمنٹ کو پوری فوجی تربیت نہ ملی تھی لیکن اس کے سپاہی تجربہ کار مردوں سپاہیوں کی طرح جان دینا جانتے تھے۔

یہ تو ابھی ابتدا تھی اسی سال میں سال کے بعد سال گزرنا شروع ہوا تنگ دلی کی خواہش کی جگہ خوف نے لینی شروع کی آہستہ آہستہ خوف غلط ہو گیا۔ ہر وقت کے موت کے منہ میں جانے پر کی جگہ ذہن نے کام شروع کر دیا ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہم میں سے ہر ایک کے اندر حفظ جان اور اجتماعی فرض کی خواہشوں میں کشمکش ہو رہی تھی مجھے اس اضطراب کا بھی تجربہ ہوا جب موت چاروں جانب اپنا جال پھیلانے کی سعی میں مشغول تھی

فخر محسوس کرتی رہے گی۔

میں تب ایک سپاہی تھا اور سپاہ کے معاملات میں دخل دینا میرا کام نہ تھا۔ اس کے باوجود اسی وقت بھی بارگاہ قیصر میں آج بھی عقیدہ ہے کہ میں دلوں کی خوشی اصطبل میں گھوڑے کے اوپر کام کرنا، اسکی کاٹھی بنانے کی نسبت قوم کی بہتر خدمت سرانجام دے سکتا تھا میں ان کاٹھیوں کے ٹکڑوں کو بیدلی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن اس امتحان کے وقت میں جب ہر شریف انسان بادشاہ کے مقابلہ میں مصروف تھا، یہ خاموش کوئی سرگرمی ادا کر رہا تھا میں ان بیکاروں کا وجود برداشت نہ کر سکتا تھا مجھے ان سپاہی گھوڑوں سے نفرت تھی اگر میرا بس چلتا تو میں ان سب کی ایک بار چھٹی کرا دیتا۔ جہاں یہ دل کھول کر شور مچاتے لیکن ٹرکاری کی زندگیوں تک نہ کر سکتے۔

ان دنوں مجھے سیاسیات کی پروا نہ تھی لیکن بعض مسائل ایسے تھے جن کا تعلق صرف ساری قوم ہی پر نہ تھا بلکہ ہر ایک فرد سے بھی ان کے متعلق سے محفوظ نہ تھے ان مسائل پر میں اپنی رائے قائم کرنے سے باز نہ رہ سکتا تھا وہ میں ایسی تھیں جن سے مجھے سخت نفرت رہا کرتی تھی اور جن کو میں اپنے قومی مفاد کے لیے مضر سمجھا کرتا تھا۔

"قلم کے سر کنڈے پر پھدکنے والے باز گیر"

فتوحات کا پہلا جوش ختم ہوا تو ہمارے اخبارات میں سے بعض آہستہ آہستہ عوام کا جوش ٹھنڈا کرنے کی تدبیریں کرنے لگے شروع شروع میں کئی لوگوں کو اس کا احساس تک نہ ہوا یہ شرارت بھری تھی۔ ہوا خواہی اور تشویش کے پردے میں بھلائی جاتی تھی عوام کو بتایا جاتا کہ فتوحات کی خوشیاں زیادہ منانا خام سے ہوا خیل کا وقت ہے ایک زبردست قوم کو ایسے چھچھورے پن سے باز رہنا چاہیے فرانسیسیوں کا انتقال ہو بیماری تو مسلمہ امور ہیں ان پر خوشیاں منانا چہ معنی؟ اخباروں میں دنیا کی رائے عامہ کے ان جنٹلمینوں کی خبریں چھپنے لگیں گی تو کیا کہے گی؟ کہ وحشیانہ خوشیاں منانے سے دنیا کی رائے عامہ ہم سے متنفر ہو جائے گی اور پھر اس کے بعد ہم نے فتوحات کا مظاہرہ کیا تو

سے ضرور پسند کیا جائے گا۔ یہ اظہار کیسے جنگ ہر گز نہ ہوں نے شروع نہیں کی تھی اور
ب ہم اقوام عالم کے سامنے اس قوم کرنے پر رضامندی ظاہر کریں تو اس میں شرم کی
کوئی بات نہیں مگر میں حالات فوج کے بہادر سپاہیوں کو مناسب خوشی کے اظہار
سے موت کرنا ہرگز قرین مصلحت نہیں۔ دنیا کی دنیا اس طرح ہم سے بدگمان ہو جائے
گی جب کوئی فاتح اکسار اور خاموشی سے اپنی کامیابی اصول کر مصلحت پر عمل کرتا ہے
تو اس کی بڑی قدر ہوتی ہے اس کی تعریف کا سب سبب بھی ہوتا ہے۔

ہونا یہ تھا کہ ان بڑھاؤں کو ان کے گھروں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کسی
عقوبت خانے میں لے جاتے اور پھانسی کے پھندے سے ان کی ناپاک زندگیاں ختم کر دیتے
تاکہ قوم کے کانوں جوش و خروش میں اس ظلم کے سرکنڈے پر پھدکنے والے درندوں
کے جبڑوں سے کوئی مضمون نکل نہ پاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ ہمارے اخبارات "نامناسب" "اور"
غیر شائستہ" انداز سے فتح کی خوشیاں منانے کے خلاف لکھنے لگے۔

بعض دیوانگیاں فرزانگی سے اچھی ہوتی ہیں

کسی کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ جب عوام کا جوش ایک مرتبہ ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر
ضرورت محسوس ہونے پر اسے کسی حیلے سے نہیں بلوایا جا سکتا۔ عوام کا جوش تو ایک
دیوانگی ہے اور اسے جنون کی حالت میں ہی زندہ رکھا جا سکتا ہے اگر یہ جنون نہ ہو تو جنگ
کی وہ طویل جو عام حالات میں انسانوں کا بھرکس نکال دیں قوم کس طرح برداشت کر
سکتی ہے؟

مجھے عوام کی ذہنیت سے کوئی واقفیت نہیں میں جانتا ہوں کہ عوام کو سرگرم عمل رکھنے
کے لیے کس جوش کی ضرورت ہے وہ "فراخدلی" اور "نکاست پسندی" سے پیدا نہیں
کیا جا سکتا مجھے تو یہی نظر آتا تھا کہ عوام کا جنون ہر بلوا کرانے کی تدبیریں کیوں اختیار
نہیں کی جاتیں پھر یہ عوام کا جوش معتدل پڑنے کی حکمت عملی کون سے کیے گئی
تھی۔

دوسری بات جس سے مجھے چڑ تھی وہ یہ تھی کہ اشتراکیت کو برداشت کیا جا رہا تھا اور اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ کیا جاتا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ قوم کو اشتراکی دعوت کی اصلیت کا علم ہی نہیں۔ لوگ اس مغالطہ میں گرفتار تھے کہ جنگ کے دوران میں ہر قسم کی قربانیوں کو برداشت کرنے سے اشتراکیت بھی ہماری ہی طرح مورد مشکور ہوگی ہے۔

"علمائے کرام" کی ذہنی پسماندگی

یہاں یہ دقت کیا سوال تھا یہاں تو عقیدہ اور اصول ہی مختلف تھا اس عقیدہ کی تصحیح ہی انسانیت کو تباہی سے برباد کرنے کی غرض سے ہوئی تھی اشتراکیت کے خطرے سے اس اعمی کا سبب یہ تھا کہ ہماری یونیورسٹیوں سے پڑھے ہوئے نوجوانوں میں مسئلہ کا یہ پہلو بچھڑا ہی رہا تھا اور ہمارے سرکاری دانشوروں کے شرفاء میں کا خیال تھا کہ جو مضمون یونیورسٹی کے نصاب میں شامل نہ ہو اس کا مطالعہ ہی کیا ہے۔ انتخاب کی یہ زبردست روح کی آنکھوں کے سامنے ایک ہلاکت خیز سیلاب کی شکل اختیار کر رہی تھی لیکن ہمارے علماء اپنی دنیا سے ہوئے تھے ہیں ہی نہ آتے تھے یہی وجہ ہے کہ سرکاری کام ہمیشہ شخصی کام سے پیچھے رہ جاتے ہیں ان فضلائے کرام کا تو اصول ہے کہ "کل ہو عمل پیار" "کل جو شے ہم دیکھتے ہی نہیں وہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہے" اگست 1914ء میں خیال کیا جاتا تھا کہ جرمن مزدور مارکس ازم کی تربیت کی اشتراکیت کے بعد ہیں یہ قطعاً غلط تھا جب مصیبت کا وقت آیا تو جرمن مزدور نے ایک لمحے کے لیے بھی مارکس ازم کے زیر پلے جنگ سے روگردانی نہ کی اگر ایسا نہ ہوتا تو جرمن مزدور بھی اس صلاحیت سے جنگ میں شریک نہ ہوتے جب اپنی حماقت سے یہ سمجھ جانے لگا کہ مارکس ازم ہی قومیت پر تی کی شکل اختیار کر چکا ہے اس مثال سے واضح ہے کہ ہمارے حکام نے بھی مارکس کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرنے کی تکلیف ہی برداشت نہ کی اگر انہوں نے ایسا مطالعہ کیا ہوتا تو کبھی ان سے یوں فاش غلطیاں سرزد نہ ہوتیں۔

مزدوروں کو مارکس ازم سے بچایا جا سکتا ہے

مارکس ازم کا مقصد ہمیشہ سے تمام غیر یہودی مخلوق کی تباہی اور بربادی رہا ہے۔ اس کے مقصد ہمیشہ یہی رہے گا۔ مارکس ازم نے عرصہ سے جرمن مزدوروں میں اپنی عیاری کا جال پھیلا رکھا تھا لیکن جولائی 1914ء میں جرمن مزدور یہ تمام بندھن توڑ کر وطن کے لیے کمربستہ ہو گئے یہ سب کچھ مارکس ازم کی آنکھوں کے سامنے بہت ہی تیز رفتار کے ساتھ ہو گیا چند ہی دنوں میں قومی غداری کا یہ جادو دلوں پر کر گیا اور یہودی سازشیوں نے دیکھا کہ وہ کیے دھرے پر پانی پھر گیا ہے ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے چھ سال سے جرمن قوم اس لعنت اور بوجھ کو اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تھی وہ بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ جرمن مزدوروں کو ورغلانے والوں کے لیے یہ ایک نہایت ہی محزون دن تھا لیکن جوں ہی مکار اور سازشی یہودی لیڈروں کو اندازہ کا احساس ہوا انہوں نے مداہنت اور دھوکہ کی نئی راہ اختیار کی اور بچے کھچے قوم کی بیداری کی تحریک میں حصہ لینے کا دعویٰ کر دیا۔

یہ وقت تھا کہ یہودیوں کی اس تمام منڈی کے خلاف قدم اٹھایا جاتا جو وہ باقی تمام جرائم کی طرح قومی زندگی میں اختیار کر رہے تھے یہ قدم سختی سے اٹھا کر اٹھانا چاہیے تھا کسی ذمہ داری یا گرفت کا متعلق خیال بھی نہ آیا تھا اگست 1914ء میں جرمن مزدوروں نے دیکھا کہ یہ بین الاقوامی اتحاد کے جو سبز باغ دکھائے گئے تھے وہ سراسر بے بنیاد اور جھوٹی باتیں ہیں۔ چند ہی روز بعد ان کے کانوں نے اتحاد کے ان دلکش نعروں کی بجائے امریکی گولیوں کے کھائے ہوئے اپنے بھائیوں کی چیخیں سنیں۔ یہ تھے بین الاقوامی اتحاد کے تحفے اب جب کہ جرمن مزدور قومیت کے راستہ پر لوٹ کر آ رہا تھا تو حکومت کو عوام کا کچھ خیال ہونا چاہیے تھا کہ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی جذبہ کی مخالفت کرنے والی ہر طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی۔

قوم کے اکثر حصہ جب محاذ جنگ پر لڑ رہے تھے تو کیا گھر والوں کو یہ معمولی سا کام ختم کرنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے ملک معظم

حضور قیصر نے ان بے انتہا مجرموں کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور یوں انہیں موقع بہم پہنچایا کہ اپنے کھوئے ہوئے حواس بحال کر لیں۔

اس طرح ان سانپ کے بچوں نے پھر سے زہر اگلنا شروع کیا اب وہ ایسا کام زیادہ احتیاط لیکن ساتھ ہی بڑھی ہوئی تباہ کاری سے کرتے تھے ایک بہت بڑی ان سے ملاپ کے خواب لے رہے تھے اور یہ وہی مجرم انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔

مذہب شکست کا بہترین خمیر ہے

میں اسلحہ حکومت کی مذہبانہ روش سے مطمئن نہ تھا لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے کبھی خیال نہ تھا کہ اس غلطی کے نتائج اتنے ہولناک ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا بھی کیا جا سکتا تھا کیا بڑے بڑے لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اخباروں پر مقدمات چلائے جاتے اور یوں قوم کو ان سے نجات دلائی جاتی۔ شرارت کا خاتمہ کرنے کے لیے پوری سختی سے قومی تحفظات کے جاتے تمام سیاسی مصلحت بینوں ختم کر دی جاتیں تو ان پارٹیوں کو بظاہر ختم ہوتے ہوئے تو دیکھ لیتے لیکن سچ مچ ختم نہیں ہو جاتیں اگر پارٹیاں کوئی اصول ختم ہی کر دیا جاتا اور بھی اچھا ہوتا۔ جس طرح آج کل کی جمہوری حکومت جب ضرورت محسوس کرتی ہے تو سیاسی جماعتیں ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان دنوں بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ قوم کا جو دشمن نمبر ایک ہے اگر ایسے ہی اقدامات کیے جاتے تو ان کے لیے پوری وحدت ہوتی اور تمام ان تباہیوں کو جن کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں بھی کسی نعرے سے ختم کیا جا سکتا ہے کیا کسی ضابطہ حیات اور ضابطہ گیر فلسفہ کو دوسری قوت سے جھٹلایا جا سکتا ہے؟

ان دنوں میں اس سوال میں بار بار پہلو سے غور کیا کرتا تھا میں نے تاریخ سے بہت سی مثالوں کا مطالعہ کیا کئی مثالیں جو مذہبی اختلافات سے پیدا ہوئی تھیں انہیں میں نے اور بھی غور سے جانچا آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا۔

اعتقادات کو محض تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا

پہلے کہ یہ طریقہ کار ناکام ہے کی جستجو کوئی شروع نہیں کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلے پہلے ہر مخلوق کی طرح عقائد کا خاتمہ بھی ان کے نشوونما کے ابتدائی مدارج میں ہی ممکن ہے جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس کی قوت مدافعت بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک عقیدہ کی عمر پوری ہو چکتی ہے تو نئے عقیدے اس کی جگہ لے لیتے ہیں ان نئے عقیدوں کی جڑ میں بھی دراصل وہی پرانا عقیدہ ہوتا ہے جو اب کسی اور غرض سے نئے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

تشدد تبھی کارگر ہوتا ہے جب اس کی پشت پر کوئی عقیدہ ہو

نتیجہ یہ کہ کسی عقیدہ پر روحانی بنیاد کے بغیر حملہ کر کے اسے ختم کرنے یا اس کے کام کو روکنے کی کوشش جو عموماً مقصد کے برعکس اثر کرتی ہے اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی ہے اگر کسی عقیدہ کے رواج کو تشدد سے روکا جائے تو تشدد مستغنی اور منظم ہونا چاہئے بغیر منتظم اور منظم کے اس طریقہ کار سے کام نہ چلے گا۔ اگر تشدد میں تدبر شامل ہو گیا ہو تو عرصہ دراز سے کام لیا ہو اور پھر تشدد استعمال کرنے والے نہ صرف اس عقیدہ کے خلاف کوشش جاری رکھے سے منطقے کا سوفیصد حل چاہے گا بلکہ جو دراصل عقیدہ کے بعد وہ لوگ اس عقیدہ کو اختیار کر لیتے جائیں گے جنہیں یہ ظلم و ستم ہاتھ گرفتار ہو رہا ہے عقیدہ کے قدیم پیرو اپنے پہلے سے زیادہ تنگی محسوس کریں گے اور یوں پہلی عقیدت میں زیادہ پختہ ہوتے جائیں گے غرض تشدد استعمال کیا جائے گا تو کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ مسلسل تشدد جاری رہے۔ یہ تسلسل بھی ممکن ہے جب تشدد کی پشت پر روحانی قوتیں کام کر رہی ہوں جو وہ تشدد اس کی مار روحانی قوتیں ہی ہو ہمیشہ غالب اور غیر تغیر پذیر رہتا ہے ایسا تشدد بیکار نہیں ہوتا بیکار تشدد انہیں لوگوں کا حصہ ہے جو کسی ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ کے دل سے معتقد ہوں جو تشدد ان شر کا سے جاری ہو وہ محض فردی خصوصیت اور نکاہیت پر منحصر ہوتا ہے اس لیے اس میں تسلسل نہیں ہوتا۔

ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے ہر ضابطہ حیات اور ہمہ گیر فلسفہ چاہے وہ مذہبی

ہو چکا ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ سیاست اور مذہب کے ڈانڈے کہاں جا ملتے ہیں۔ اپنے مخالف عقائد کی تباہی سے زیادہ خود اپنے عقائد کی ترویج کے لیے برسرکار رہتا ہے یوں عقائد کی جنگ میں بھی یہ اصول بلا استثنا کارفرما نظر آتا ہے جہاں ایک فریق کی ہار جیت کا فیصلہ ہو جائے تو زیادہ کامیابی ہوتی ہے جہاں جدوجہد میں منزل مقصود ہمیشہ سامنے رہتی ہے برعکس اس کے مخالف عقائد کو ختم کرنے کی کوشش میں یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ منزل مقصود کہاں ہے اور کیسے وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو ضابطہ حیات اور رہبر گیر فلسفہ جارحانہ اقدام کا قائل ہو اس کا پروگرام بھی زیادہ واضح ہوتا ہے اور اس کا طریق کار بھی زیادہ قوی اور فیصلہ کن ہوتا ہے برعکس اس کے جہاں ضابطہ حیات اور رہبر گیر فلسفہ کا نصب العین واضح ہوتا ہے اور نہ اس کا طریق کار اتنا قوی اور فیصلہ کن تشدد سے دوسرے کسی عقیدے کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش صرف اسی حالت میں کامیاب ہوتی ہے جب تشدد کرنے والے خود ایک جامد دینی عقیدے کے مبلغ اور علمبردار نہ ہوں۔

ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ کسی ضابطہ حیات اور رہبر گیر فلسفہ کو تشدد سے مٹانے کی ہر وہ کوشش ناکام رہے گی جس میں تشدد کا استعمال یک بالکل نئے ضابطہ حیات اور رہبر گیر فلسفہ کو نافذ کرنے کے لیے نہ ہو جب اصل جنگ دو ضابطہ ہائے حیات اور دو رہبر گیر فلسفوں میں ہو تب اور صرف تب ہی جیت اس فریق کی ہوتی ہے جو مستقل بغیر کسی رعایت کے اور غالب تشدد استعمال کر سکے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو برٹس ازم کے خلاف جدوجہد میں آج تک نظر انداز کیا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ نشہ آلیت کے خلاف اسمارک کے بنائے ہوئے قوانین ناکام رہے۔ چاہے وہ خود ان قوانین کی ناکامی تھی یا خود ان کی نوعیت میں مضمر تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان قوانین کے پس پشت کوئی ایسا ضابطہ حیات اور رہبر گیر فلسفہ نہ تھا جس کی ترویج کے لیے یہ قوانین کام کرتے یہ تو ایک خلا پیدا کرنا تھا کہ محض "حکومت کے اختیارات" [illegible]

قانون سازی کا نام لے کر ایک موت و حیات کی جنگ لڑی جا سکتی ہے ایسی جنگ تو کسی روحانی عقیدے کے نام پر ہی لڑی جا سکتی ہے اس لئے یہ مہم کارخانے کے محض اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے والے افسروں سے ہی ممکن تھا۔

چونکہ اشتراکیت کے خلاف قانون سازی کی اس مہم کی پشت میں کوئی روحانی عقیدہ کارفرما تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسمارک کے یہ قوانین کا استعمال ان لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جو خود مارکس کی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہدی میں حکومت نے اشتراکیت کے خلاف اپنی کوششوں کی جگہ روز کھاتے پیتے لوگوں کی بدلتی ہوئی جمہوریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دی تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ کوئی ایسا انتظام کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایسا سابقہ حیوانی اور ہمہ گیر خلفشار موجود تھا جس کی بنیاد معاشی اور جس کے مرجع ان سابق مارکس ازم کی جگہ سے اخذ کرنے پر تلے ہوئے تھے تب ہر کیا بھی کیا جا سکتا تھا خود ہی اشتراکیت کے خلاف اسمارک کی مہم سرے سے ناکام اور کمزور ثابت ہوگی۔

اوقات وہی نزاع کا حقیقی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں

بدقسمتی سے جنگ عظیم کی ابتدا اور اس کے دوران میں بھی حالات بالکل پہلے سے زیادہ مختلف نہ تھے۔

ہمیں بار بار غور کرنا کہ حکومت وقت کو اشتراکی جمہوریت کی جانب اپنا رویہ بدلنا چاہیے کیونکہ مارکس ازم ہی فلسفہ کی نئی آزمائش کا شکار کیا جاتا ہے ہر بار مجھے احساس ہوتا کہ اشتراکی جمہوریت کا فلسفہ ترک کیا جائے تو اس کی جگہ لینے کو دوسرا کوئی فلسفہ موجود ہی نہیں کوئی ایسی تحریک بھی ایسی نظریہ کی حیثیت بھی نہیں ہے توقع کی جا سکتی کہ اشتراکی جمہوریت کا فلسفہ ترک کرنے کے بعد بھی بڑا بڑا مزدور طبقہ لیڈروں کے رہ جائیں گے نہیں کوشش کر سکے۔ اور کامیابی سے اپنے دامن میں سمیٹ لے یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک فلسفہ جو ابھی ابھی اہم اقتدار حاصل کر چکا تھا۔ اور جس نے حال ہی میں اپنی فتوحاتی

نہیں ہے تک یہ احساس نہیں کرتی کہ جس سماج سے وہ کس رہا ہے اس کی موجودگی میں کمانے پینے لوگوں کا قائم رہنا کیسے قائم ہو سکتا ہے۔

مزدور اور سرمایہ دار کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے

پڑھے لکھے لوگوں کی حمایت میں ہونے سے آپ کو اس بات سے بھی خوشی محسوس کرنی چاہیے کہ اگر کبھی مزدور عوام کو اپنی اطاعت پر آمادہ کریں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مزدور اور سرمایہ دار کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ فرق بھوکا ننگا رہنے اور بھرپور خوشحالی۔ دونوں فریقوں کو ایک ہی تمنا ہے اور یہ لگن ہے ایک دوسرے سے لڑنے کی اس لڑائی میں فتح اسی فریق کی ہوگی جو تادیر متحد رہے گا مارکس نے کہا۔

1914ء میں اٹلی کی جمہوریت کے خلاف جدوجہد کی تیاری کا ایک خاص ماحول تھا جو ہر تھی لیکن اٹلی کی جمہوریت کی جگہ لینے کو دوسرا کوئی نظام موجود نہ تھا اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ جدوجہد کتنا عرصہ جاری رکھی ہوگی اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

جنگ سے کئی سال پہلے سے میری یہی رائے تھی یہی عقیدہ تھی کہ میں اس وقت کی کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہ ہوا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں میری یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی صاف نظر آ رہا تھا کہ یہاں اٹلی کی جمہوریت کا مقابلہ ممکن ہے کچھ معنوں میں متاثر کرنے کے لیے ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو نہ تو پارلیمنٹری پارٹی سی نہ ہو نہ ہی کوئی تحریک اس وقت موجود تھی۔

میں اس کی کمی کو اکثر ایسے بے تکلف ساتھیوں سے کیا کرتا تھا اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آئندہ سیاسیات میں کام کرنا ہے تو بہتر ہے کہ میں پہلے بھی اپنے دوستوں کو کسی مرتبہ بتا دوں کہ میرا ارادہ کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا اس نے جنگ کے بعد مجھے اپنے پیشے کے علاوہ کسی اور میں کام کرنے پر آمادہ کیا مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی غور و فکر کے بعد کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ششم :: جنگ اور پراپیگنڈا

سیاسیات کی بنیاد پراپیگنڈا ہے

میں نے سیاسی واقعات کی رفتار کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ محسوس کیا کہ سیاسیات کی بنیاد ہی پراپیگنڈے پر ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کیونکہ اس حربے کے ماہر کامل ہیں وہ اس سے کام بھی خوب لیتے ہیں۔ فوج میں مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ پراپیگنڈا کا صحیح استعمال بجائے خود ایک مستقل فن ہے۔ ہمارے کئے جانے والے دماغ سیاسی پارٹیوں کو اس فن سے واقفیت تو کجا آشنائی بھی صرف کر نہیں سوشلسٹ پارٹی اس حربے سے بخوبی کام لیتی رہی بالخصوص وکٹری کی راہنمائی میں انہوں نے پراپیگنڈا کا صحیح استعمال کیا۔ اس پارٹی کی کامیابی کا یہ سبب بھی تھا۔

ہمیں دراصل جنگ عظیم کے دوران میں پتہ چلا کہ پراپیگنڈے کا جال درست سے بچھایا جائے تو کیا عظیم الشان نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مدتوں سے عوام سے معاملات کی طرح یہاں بھی دشمن ہم سے بازی لے گیا۔ ہم نے اس فن پراپیگنڈے سے کام ہی نہ لیا اور جو لیا تو وہ نہ لینے سے بدتر تھا۔ ہزاروں کا مجمع اطلاعات بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ یہ ناکامی ہر تماشائی سپاہی کے سامنے صاف عیاں تھی میں نے اسی ناکامی سے متاثر ہو کر پراپیگنڈے کے علم پر پوری توجہ اور ہر پہلو پر غور کرنے کی ٹھان لی۔ مجھے تجربے سے پیش بینی کا جو بھی موقع ملا اسے غنیمت دیکھتے دشمن نے ہمیں اس کتاب سے وہ سبق پڑھایا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ دشمن اس قابلیت سے ہماری کوتاہی کا فائدہ اٹھا رہا تھا کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے حالانکہ اس نے اس موقع پر جس خوبی سے پراپیگنڈے کا جال بچھایا ہم نے اسے عبرت حاصل کرنے کے لیے بہترین کتاب تصور کیا۔ یہ تعجب کے باعث ہمارے ملک کی ذی استعداد ہستیوں اس کتاب سے کوئی سبق

سمجھنے کو تیار نہ تھیں وہ سیاسی باتوں سے بالاتر تھے وہ سیاسی شعور رکھنے کے مالک تھے کہ انہیں کسی استاد کی معاونت کی بھی کم از کم نہیں بلکہ سمجھنے کی جب صلاحیت بیدار ہوئی تھی۔

اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ کیا سرے سے ہمارا کلچر پروپیگنڈا ہوتا ہی تھا تو مجھے بعد افسوس کہنا پڑے گا کہ جو کچھ دیکھنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ پروپیگنڈا کے نام پر جو کچھ کیا جاتا تھا وہ شروع سے ہی ایسا کافی ہوا تھا کہ اس سے فائدہ کی نسبت نقصان زیادہ پہنچا۔ ہمارے پروپیگنڈے کا موضوع ناکافی تھی۔ اس کی نفسیاتی بنیاد غلط تھی جن پروپیگنڈے کی بھاگ ڈور تھی وہ بیشتر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری قوم سے تو یہ بنیادی سوال بھی قطعیت کے ساتھ طے نہ کیا تھا کہ پروپیگنڈا کیا ہے خود کوئی مقصد ہے یا حصول مقصد کا ایک ذریعہ۔

پراپیگنڈا محض حصول مقصد کا ذریعہ ہے

پراپیگنڈا فقط حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کا انداز ہمیشہ ان مقاصد کی روشنی میں کرنا چاہیے جن کے حصول کے لیے یہ ذریعہ اختیار کیا جائے۔ پراپیگنڈا کا نظام ایسا ہونا چاہیے جو حصول مقصد کے لیے کارگر ہو۔ یہ واضح ہے کہ خود مقاصد کی اہمیت قومی حالات کے تناظر سے ہی حقیقی رنگ لیتی ہے اس حالات میں کس پراپیگنڈے کے لوازمات کیا ہیں اس کا تعین جنگ عظیم کے دوران میں ہم نے جس تلخ انداز میں کیا ہے اس کا ذکر میں نے وہاں کیا ہے۔ دنیا میں کامیاب ترین کلچر جس نظام نے اپنے ملک کی تربیت اور استقلال کی خاطر سر بفلک کیے تھے ہم نے مشکل میں پڑی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی کے تحفظ کی نیت سے تعمیر اٹھائی تھی ہم اپنی قومی عمارت کی لاج رکھنے کر سے نکلے تھے حالانکہ ہماری کہیں دنیا میں قومی آن کا کبھی وجود ہے اگر کہیں تو کہیں اس کا وجود قائم کیا ہوگا اس قوم کی آن کہیں اس قوم کی تربیت اور استقلال چند روز کے مہمان ہیں عمل پیرا کا تقاضا ہے کہ بے جا تعلیم منصب آزادی سے محروم کر دی جائیں تو غلامی پر رضامند ہے وہ عزت کا سزاوار نہیں کیونکہ غلام بھی ذلت

کھیریں تو وہ عزت سے محروم ہو جاتے۔

صالح تصورات صالح امتوں کے وجود سے وابستہ ہیں

جرمنی کا لائے کس کی خاطر بر سر پیکار تھا اس حالت میں ڈائی کے جنگی پروپیگنڈا کا مقصد جذبہ جہاد کا استحکام اور غلبہ مجاہدین کا اتمام ہوتا چاہیے تھا جب قومیں زندہ رہنے کی خاطر پنجہ آزما ہوں، جب زندگی اور موت کی تلوار ہاتھ لے کھاری ہوں تب انسانی رواداری اور حسن و خوبی کی باریک تمیز میں فرصت ضائع کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ جب اس کی ظاہر ہے یہ خیالی بات نہیں ہوا میں معلق نہیں۔ ہمیں جاننا ہے کی خاطر خاک کے ساتھ ملنے کا تجربہ ہوا ہے اگر انسان مٹ گیا تو خلق کس کے سہارے زندہ رہے گا تباہ ہوتے ہوئے کھلے کی تمیز سے عاری ہے یہ عادت نہ صرف چھوٹی قوموں بلکہ نسلوں کے حصے میں آئی ہے صالح تصورات صالح امتوں کے دم قدم سے باقی ہیں اگر یہ امتیں روئے زمین سے کو ہو گئیں تو حسن و خیر اور انسانیت بھی بے حضور دلوں کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھ جائیں گے۔ ہمارا یہ اصول ان اصولوں کو جمع کرنے والی اور حافظہ رکھنے والی نسلوں کی زندگی ہی سے وابستہ ہیں۔

جہاد کے اصولوں کو اخلاق کے اصولوں پر ترجیح حاصل ہے

جب کوئی قوم اپنی بقا کے لئے جنگ میں مصروف ہوتو اس قسم کے اصول محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان اصولوں کی پیروی سے قوم کے جذبہ جہاد میں خلل پڑ رہا ہو تو فوراً اس کا ترک کرنا چاہیے دوران جنگ میں کسی اصول کے جاری ہونے کی صرف ایک ہی کسوٹی ہے اور وہ یہ اس کی تکلیف یا ترک سے جنگ میں کامیابی کہاں تک قریب ہوگی۔

جہاں تک بمباری شہروں کے مسئلہ کا تعلق ہے میں مشہور جرمن جرنیل مولٹکے کے قول کا ہمنوا ہوں اس نے کہا تھا کہ میں اولین فرض یہ ہے کہ اپنے حسب منشا فیصلہ جلد از جلد حاصل کیا جائے اس لیے ہمارا رویہ یہ ہے جو زیادہ میں شدید ترین

طریقے اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح جنگ جلد ختم ہو جاتی ہے جب اپنے استداد کے مقابلہ میں لوگ حسن و قبح اور خیر و شر کے وہم و بالکل و عادی کے تذکرہ پھیلا نہیں تو انہیں صرف ایک ہی چیز دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں کسی قسم کی کوشش برے بھلے کے معیار کی پابند نہیں کی جا سکتیں ماری سے بڑھ کر کوئی عادت نہیں ہے سب سے پہلے آتے ہیں اور آئندہ بھی ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا کیا آج بھی اس دلدل میں گرفتار ہے اسے غلاظت و مدرسہ کے فضول کاموں کا کیا کرنے والے یہ لوگ کون سے "مستحق" قبول کرتے ہیں؟ پھر جنگ میں فتح حاصل کرنے کی خاطر ان اصولوں کو توڑنا اچھے اصولوں کی روح میں شکست کھا کر اس حالت کو پہنچا کر ہیں یہ سوال بیوقوفوں سے کیسے دریافت کر سکتا کیونکہ وہ تو خود تہذیب و ثقافت کا یہ پھل کھا کر ان کی خوشبو دنیا میں پھیلانے والے ذات شریف ہیں ان کا تو وجود ہی علامات الٰہی کے جاری شریعت پر روانی کا وجہ ہے۔

ثابت ہوا کہ انسانیت حسن و قبح کے تصورات کو جنگ میں بالکل دخل نہیں اس لیے تصورات دوران جنگ میں پروپیگنڈا کو جانچنے کے لیے معیار بھی نہیں بن سکتے۔

شدید ترین اقسام بہترین اقسام ہوتے ہیں

دوران جنگ میں پروپیگنڈا اپنے مقصد کا ایک ذریعہ تھا یہ مقصد اپنی قوم کی بقا کے لیے جدوجہد میں کامیابی پر مشتمل تھا اس لیے پروپیگنڈا کے مفید و غیر مفید ہونے کا معیار صرف یہی مقصد قرار پا سکتا تھا ایسے موقع پر شدید ترین اقسام انسانیت کے قرین ترین ہوتے ہیں ہاں ایک شرط ہے وہ یہ کہ ان اقسام کے استعمال سے فتح کی گھڑی قریب آنے کا یقین ہو فتح کے بعد وہی طریقہ کار "بھلا" بھی ہے اور "مفید" بھی جس سے قوم کی طبیعت اور مزاج بنا ہے اس زندگی اور موت کی دوڑ میں جنگی پروپیگنڈا کا انتظام صرف اسی روشنی میں ہونا چاہیے تھا۔

آرمینیا روپ تقدیر کو مٹانے کر دیا مصدر حقیقی کی کچھ ہوتی تو جنگی پروپیگنڈے کی شکل

یا استعمال کے متعلق انہیں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ انگلی پر اپیگنڈے کو بھی ہتھیار ایک ہتھیار کے شکل دیتے اور اسی طرح اس سے کام لیتے۔ انگلی پراپیگنڈا اگر ایک ہتھیار نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں جو اس کا استعمال جانتے ہوں یہ ان کے ہاتھ میں ایک خوفناک ترین ہتھیار ہے۔

اور یہ فیصلہ کن سوال ہے کہ یہ پراپیگنڈے کا رویہ کن بڑے کھلے ذہن حقائق کی جانب ہونا چاہیے تھا یا اس حقائق کی طرف ہو رہا ہے ذہن نہیں؟

اشتہار دینے کے گر

پراپیگنڈے کا رویہ کن ہمیشہ عوام الناس کی اکثریت کی جانب ہونا چاہیے ذہن حقائق یا جس حقائق کو آج کل ذہین کہا جاتا ہے پراپیگنڈے کے محتاج نہیں ان کے سامنے تو مسائل علم و استدلال کی روشنی میں پیش ہونے چاہئیں پراپیگنڈا علم و استدلال سے تہی دور ہے۔ فرض کرو ایک بازاری اشتہار نون لیفٹ سے میرا یہ قول اشتہار کی ظاہری صورت سے متعلق تھا اور میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اشتہار کی اس ظاہری صورت کی تیاری کے لیے بھی علم و استدلال درکار ہے۔ بازاری اشتہار تیار کرنے والے کا کمال یہ ہے کہ لوگوں کی آسائش اور اشتہار کے بیچنے والے عوام کے لیے جو اسے نظر ثابت ہوں فرض کیجئے نون لیفٹ کی ایک نمائش ہونے والی ہے اس نمائش کے لیے جو کی ظاہر ایک اشتہار جاری کیا جاتا ہے کیا اس اشتہار کا صرف نمائش کی اہمیت ثابت کرنے کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ ہو سکتا ہے یہ اشتہار اس مصرف کو جس حد تک پورا کر سکے تاہم اس کو ایک کامیاب اشتہار کہیں گے اشتہار تو عوام کو نمائش کی طرف لانے کی غرض سے شائع کیا گیا ہے اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اشتہار خود نمائش کی خوبیاں بھی پیدا کر لے تو آپ کی عقل پر رونے کا مقام ہے۔ اشتہار بھی نمائش کے ہال میں جانی ہوئی شے نہیں ہے سکتا وہ ایک دوسری چیز ہے۔ اگر نون لیفٹ کے لوگوں کا مشاہدہ مطلوب ہے تو نمائش گھر کے اندر تشریف لے جائیں۔ اشتہار پر اپنا وقت ضائع نہ کیجئے

آپ کا مقصد فقط نمائش گھر کی سیر سے ہو تو ہر ہوائی کا مشاق تو نمائش کے ایک ایک کھلونے کو پرکھ دیکھتا ہے کاتب کہ وہ ان کی اصلی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکے گا۔ یہی حال پروپیگنڈہ کا ہے۔

پروپیگنڈے کا مقصد تعلیم دینا نہیں تائید حاصل کرنا ہے

پروپیگنڈا افراد کے علم میں اضافہ کا نام نہیں تو عوام کی توجہ مخصوص مسائل پر مرکوز کرنے کا نام ہے یہ کام پروپیگنڈا ہی کر سکتا ہے۔

یہی حالت ہیں پروپیگنڈے کا فن یہ ہے کہ ایک مسئلہ عوام کے سامنے اس وضاحت اور شدت کے ساتھ پیش کیا جائے کہ اکثریت کو کسی دوسرا عقیدہ کا یقین آجائے کسی ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے یا کسی صورت حال کے حق یا عدل و انصاف ہونے میں شک باقی نہ رہے لیکن یہ فن ہونے خود کوئی مقصد نہیں اس کی حیثیت وہی ہے جو بازار کے اشتہار کی ہے یہ تو عوام کی توجہ مرکوز کرنے کا حیلہ ہے پروپیگنڈا افراد کی علمی تشفی بجھانے سے قاصر ہے۔ اگر کسی مسئلہ پر کسی شخص نے کوئی علمی رائے قائم کی ہے یا وہ افراد واقعی مطالعہ کے بعد کسی رائے قائم کرنے کا مشتاق ہے تو اس کا راستہ جدا ہے پروپیگنڈا تو علم و استدلال کی نسبت تخیل و جذبات کے ساتھ زیادہ واسطہ رکھتا ہے۔

پروپیگنڈے کا اسلوب عوامی ہونا چاہیے پروپیگنڈا کی ذہنی سطح ایسی ہونی چاہیے کہ جن لوگوں سے مخاطب ہے ان میں کم سے کم ذہین کی ذہنی سطح بھی اس سے نیچی نہ ہو اس طرح پروپیگنڈا اپنے مخاطبین میں سب سے زیادہ کند ذہن شخص کے ذہنی معیار کے مطابق ہوگا۔ جب ساری قوم کو پروپیگنڈے کے دائرہ کے اندر لانا ہو جیسا کہ جنگی پروپیگنڈے کے موقع پر عادت ہوتی ہے تب بھی احتیاط یہ کرنی چاہیے کہ علم و فضل کا تخیل قریب سننے والوں کے ذہن سے بعید نہ ہو۔

اگر پروپیگنڈا اس علم و فضل کی جانچ کرے جو اس کا روئے سخن عوامی جذبات کی طرف ہے تو ناکامی کا ضرور فیصلہ کریں گے درحقیقت فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے وہ ذہنی

پراپیگنڈے کی اصل کمزوری ہے جذبات اور فن کے پتلے اگرچہ کبھی کبھی ابھار دھندلی
رائگی پر ابھی سر دھنتے رہیں تو اس سے کیا حاصل؟

جذبات کو بھڑکانا اور تخیل کو اکسانا ہی پراپیگنڈا ہے

پراپیگنڈے کا فن کا کمال یہی ہے کہ عوام کا جذبات بھڑکا کر ان کے تخیل کو راستہ پر
لگا دو جائے اس کے لیے عادت راتی ہے وہ ٹھیک نفسیاتی اسلوب حاصل کرنے کی جو
عوام کی توجہ اپنی طرف کرے وہ قوم کی اکثریت کے دلوں کو موہ لے آج ہماری قوم کے
مدبر ان لوگوں کی ذہانت کی پوری داد تحسین دی جاتی ہے وہ اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں یہ
غلط ہے اس امر کا ثبوت ہے کہ جو ہے ان کی ذہانت کی پوری تعریف ہو لیکن آنکھوں پر
غرور اور جہالت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

جب ایک دفعہ ذہن نشین ہو جائے کہ پراپیگنڈے سے عوام کو مائل کر کے ان کی
اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانا ہے تو پھر معلوم ہو جاتا ہے کہ دلیل قوت کا تحمل کس حد تک
ہونا چاہیے۔

پراپیگنڈا کا ہتھیار اس طرح کرنا کہ گویا تمام قسم کے علم ہی سے کام لیا جا رہا ہے اصلی
ہوگی۔ عوام فریب کی استعداد ذہول محدود ہے ان کی سمجھنے کی قوت کمزور ہے وہ بہت جلد
تھک جاتے ہیں ان حالات میں اگر پراپیگنڈا سے کوئی اثر پیدا کرنا ہے تو چند اشد
ضروری باتیں چن لی جائیں اور جہاں تک ہو سکے ان کے لفظی کی طرح الجھی سلجھا
میں ان کو بار بار دہرایا جائے پھر ان نقطوں کے ساتھ اس وقت تک وہ رہنا
چاہیے جب تک ہر فرد ان کا مطلب خوب سمجھ جائے یہ اصول ہر گز فراموش نہ کرنا چاہیے
کہ قافلے کے لیے وضع کرنے اور عقلی اصول سمجھانے کی کوشش شروع کر دی تو پراپیگنڈا
بے اثر رہے گا عوام تو یہ تحمل عقل ہم نہ کریں گے دوسرے جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ
سے یاد رکھنے میں ناکام رہیں گے یہی وجہ ہے کہ ہمارا پراپیگنڈا کا موضوع وسیع ہو
ناہی یہ ضروری ہوتا ہے کہ مخصوص حالات سے کارگر نتائج پیدا کیے جائیں ایسی صورت
میں ہر ذی فکر کے بعد بہترین اسلوب اختیار کرنے سے ہی کام چل سکتا ہے۔

حقائق سے منہ موڑنا اچھا پروپیگنڈا نہیں

مثال کے طور پر دشمن کی قوت برداشت کا اندازہ لگانا ایک بنیادی غلطی تھی۔ شکست یا ہار کے مزاج کے اظہارات نے پروپیگنڈا کا مطلب ہی یہ سمجھ رکھا تھا کہ دشمن کو بزدل قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جائے۔ یہ ایک عمومی غلطی تھی جب ہمارے سپاہیوں کو دشمن سے مقابلہ کا اتفاق ہوا تو ان پر روشن ہو گیا کہ دشمن بزدل نہیں ہیں اس غلطی سے مہلک نتائج پیدا ہوئے جب جرمن سپاہی کو ذاتی مشاہدہ سے معلوم ہو گیا کہ کس خوفناک قریب کا سامنا ہے تو اس نے محسوس کیا کہ جو لوگ دشمن کو بزدل اور شکست خوردہ کرتے تھے وہ مجھے دھوکہ دے رہے تھے غرض یہ پروپیگنڈا سپاہی کے دل کو ابھارنے اور سہارا دینے کے بجائے اس کا اعتماد متزلزل کر دینے کا موجب بنا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سپاہیوں کے دل چھوٹے ہو گئے۔

برعکس اس کے انگریزوں اور امریکیوں کا جنگی پروپیگنڈا نفسیاتی لحاظ سے حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جرمن وحشی درندے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے سپاہیوں کو میدان جنگ کی ہولناکیوں کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جرمنی پر ہوائی حملہ کی خاطر کے گھر کی سیر تھوڑی ہے ان سپاہیوں کو میدان جنگ میں خوفناک ترین ہتھیاروں کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا تھا تو وہ یہ سوچ کر اپنے دل کی اداسی بہلا لیتے تھے کہ ہمارے ملک کا پروپیگنڈا یہ تھا اس طرح اپنی حکومت پر ان کا اعتماد اور زیادہ بڑھتا تھا جرمنوں کے جنگی ہتھیاروں سے پیدا ہونے والی بزدلی سے بڑی تباہی ان کے سپاہیوں کے لیے ایک مزید مصیبت تھا کہ واقعی یہ وحشی اور درندہ قوم ہے حالانکہ ان کی خود اتحادیوں کے صنعتی مراکز جرمنوں سے کم درندگی یا کم وحشیانہ نہ تھے لیکن یہ جاننے کی فرصت کسے دی جاتی تھی اس طرح برطانوی سپاہی کو شبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کے ملک سے آنے والی خبریں کبھی غلط بھی ہو سکتی ہیں جرمنوں کے بارے معاملہ بالکل الٹ تھا۔ پروپیگنڈا کا رخ نفرت یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ برطانوی سپاہی اپنے ملک سے آنے والی ہر اطلاع کو معمول سے بڑھ چڑھ کر بیان کرنے لگے تھے

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان حکومتوں نے اس گھڑے کو اس پہلے لکھ دیا جائے پروپیگنڈا کا اصل تصور کر لیتی تھی۔ گھڑے میں اپنی "خاص خاصیتوں" کا ذکر کرتے، بھولتے بھاتے یا اتفاق سے ایک عدد اعلیٰ عہدے کے حکام کی کمان پھیلانے کا مقصد ہوتے تھے کوئی نہ ہوتا تھا کہ پروپیگنڈا کے پیغام کے بہترین ذرائع کار ہیں۔

پروپیگنڈا میں رواداری کی گنجائش نہیں

غرض جرمنی کے نازی پروپیگنڈا کا کام ایک بے نظیر مثال تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ حقیقت حاصل کی جا سکتی تھی کہ پروپیگنڈا میں کیا دیکھنا چاہیے کہ یہ جانا تھا کہ پروپیگنڈا روشنی پھیلانے کی غرض سے کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس سے کوئی روشنی نہ پھیلتی تھی بلکہ یہ کہ تعصبانی نوازوں کی روشنی پھیلانے کے اہتمام میں ہر امر کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔

جن لوگوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور جن کی قوت مشاہدہ خوف زدہ نہ ہو چکی تھی وہ سارے چار سال تک نازی کے پروپیگنڈا کے بیلاب کے تھپیڑے کھا کر اس حقیقت کی بابت بہت سے کارآمد اسباق سیکھ گئے۔

بہترین مصلحت یہ تھی کہ ہماری قوم اس شرط میں سے حاصل تھی تو ہر قسم کے پروپیگنڈا سے پہلے لازم ہے وہ یہ کہ اس مسئلے کے متعلق پروپیگنڈا کیا ہو اس کے ہر پہلو کے متعلق بالکل ایک طرف رہ کر اختیار کر لینا ضروری ہے پہلے یہ جان بوجھ کر اور مستقل طور پر ایک طرف ہونا چاہیے ہمارے ہاں جنگ سے ہی اس سلسلے میں اتنی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ صرف اعلیٰ حکام کو ان کے لیے ذمہ دار ٹھہرانا کافی معلوم نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر فرض کیجیے ایک نئی قسم کا صابن ایجاد ہوا ہے اور آپ اس کا اشتہار دینا چاہتے ہیں اب آپ اس اشتہار کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ جس کی بنا مقابلہ پر چلنے والے دوسری قسم کے صابنوں کی تعریف سے شروع ہو یا شروع اس اشتہار کے مصنف کی عقل پر سرپیٹ لینے کو دل چاہے گا یہی اصول اس قسم کے سیاسی اشتہارات

میں بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔

پراپیگنڈا کا مفہوم یہ نہیں کہ کسی مسئلے کی عدالت میں فریقین کے دعوے پیش کر کے اس کا منصفانہ فیصلہ طے کرنا ہے کسی کا حق فراموش نہ ہو جائے یہاں تو اس حقوق کی وکالت ہی آپ کا مقصد ہے صرف انہیں پر زور دینا ہے پراپیگنڈا حقیقت حال کی ضابطہ تفتیش کا نام نہیں نہ ہی یہاں وہ حقیقت کی تلاش کرنا ہے جو بے لاگ اور منصف کے وجدانی قواعد کے مطابق مدعا علیہ کے حق میں جاتا ہے اس کا بھی تذکرہ ضرور کیا جائے پراپیگنڈا کو فقط سچائی کے اس پہلو سے غرض ہے جو اس کے مقاصد کے موافق ہے۔

یہ طے کرنا ایک بنیادی مسئلہ تھا کہ جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری کس فریق پر ہے گو تیجے کے طور پر اعلان بھی کیا جاتا تھا کہ صرف جرمنی ہی اس گناہ کا مجرم نہیں بلکہ بھی بڑی آگ بھڑکانے کے جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری ہر سر دشمن کے سر پر ڈال دینی چاہیے تھی۔

پراپیگنڈا اور لیل بازی نہیں

اس تذبذب اور دوہری کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام الناس کی اکثریت نقادین پر مشتمل ہے اور نہ وہ فریب دہی کے فنون کے پروفیسر ہیں وہ ہر معاملہ پر فعل کی مدد سے رائے قائم کرنے کے قابل بھی نہیں وہ تو گھڑی تو گھڑی نہ شمر سیدھا بچوں کا ایک ہجوم ہے جو ہمیشہ ہر قسم کے خیالات کے مابین بھٹکتا رہتا ہے جس روز ہمارے پراپیگنڈا میں ہلکا سا اشارہ بھی اس امر کا پایا گیا کہ کسی حد تک ہمارے دشمن کا دعویٰ بھی حق ہے انصاف ہے اس روز گویا ہم نے خود اپنے دعوی کی سچائی کو جھٹلانے کی بنیاد رکھ دی عوام الناس کی اکثریت یہ نہیں دیکھتی کہ دشمن کا قصور کہاں شروع ہوتا ہے اور ہمارا قصور کہاں سے شروع ہوتا ہے وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے مدعا سے قرار گناہ کر رہے ہیں ایسی حالت میں وہ پہلے تذبذب اور پھر بدگمان ہو جاتے ہیں وہ خصوص جب دشمن ایسی غلطی کا مرتکب نہ ہو

کے حوصلے بلند رکھنے کی مہم چلاتے تھے ہمارے حلیف اس طرح نفرت انگیز کارروائیوں کا اعادہ بھی مضبوط کرتے تھے اس کے علاوہ وہ دشمن کو ہار، جنگ، بکھیڑے کا ذمہ قرار دیتے تھے، وہ ایک یہ ایک بے بنیاد جھوٹ تھا مگر بھی جس کا اعادہ سے وہ اس کا اعلان کرتے تھے، وہ عوام کو قائل کرنے کا بے انتہا کارگر تھا وہ خوب جانتے تھے کہ عوام اپنے جذبات میں انتہا پسند ہوتے ہیں اس طرح کیسے ان کی ہمدردی بھی ہے اب لوگ بھی اس سفید جھوٹ پر یقین کرنے لگے۔

اس قسم کے پراپیگنڈا کے موثر ہونے کا یہ زبردست ثبوت ہے کہ ساڑھے چار سال کے بعد بھی دشمن نے اس کو جاری رکھا حتیٰ کہ خود جرمنی میں لوگ اس الزام سے متاثر کرنے لگے۔

اگر ہمارے پراپیگنڈا نے اس قسم کے شاندار نتیجے پیدا کیے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہمارا کوئی مول پراپیگنڈا اپنے دعویٰ ہونے میں ہی پوری تاثیر صلاح کر چکا تھا اس کا کوئی مضمون بھی عوام کو مطلوبہ حد تک متاثر کرنے کے ناقابل تھا ہمارے ماہر مدبرین کے مواد یا میں ہر کوئی یقین کر سکتا تھا کہ جنگ کا بوجھ شرارت پسند میدان جنگ میں دشمن کے نام پر سر کانے والا ہوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔

پرستاران فن اور کارگران دشمن پراپیگنڈا کے بے بیکار ہیں

غرض ہمارا پراپیگنڈا مخصوص ہی نہیں بلکہ مصر بھی تھا

پراپیگنڈا کے محکمہ میں کیسی ہی قابل ہستیوں کیوں نہ بھرتی کر لی جائیں اگر مدد کو دوا بنیادی اصول نظر انداز کر دیے گئے تو کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا پراپیگنڈا کے موضوعات محدود ہونے چاہئیں ہمارے کارکنوں کو ہمارا مرکز ہونا چاہیے دنیا کے ہزار دوسرے کاروبار کی طرح یہاں بھی استقلال کی کامیابی کی پہلی اور سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔

پراپیگنڈا کے انتظام میں "پرستاران فن" اور "کارگران دہن" کے لیے کوئی گنجائش نہیں پرستاران فن تو بڑی خیر و خوشی سے پراپیگنڈا کے زبردست اثر سے کو

ان اصولوں کی پیروی کرنے سے ہم ان پر عمل سے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے پراپیگنڈا کے ان اصولوں کی پابندی ہمیشہ توجہ سے کرنی چاہیے بہت اختصار بھی مدنظر رہے اگر احتمال سے کام لیا جائے تو ایک دن اچانک غیر متوقع اور غیر ممکن کامیابی نصیب ہوگی۔

اشتہار چاہے تجارتی ہو یا سیاسی اس کی کامیابی کیسانیت اکثر اور مستقل مزاجی سے پابندی پر منحصر ہوتی ہے۔

پراپیگنڈا کا موضوع محدود ہونا چاہیے

اس نقطہ نگاہ سے بھی ہمارے دشمنوں کا پراپیگنڈا اجمالی طور تھا اس کے موضوعات محدود تھے یہ موضوعات عوام کے مزاج کے مطابق ہوتے تھے اور تحمل استقلال سے ان کو بار بار دہرایا جاتا تھا ایک دفعہ جب انہیں یقین ہو گیا کہ بنیادی طور پر موضوع اور اسلوب بیان کا انتخاب ٹھیک ہوا ہے تو پھر ساری جنگ کے دوران میں وہ ذرہ بھر تبدیلی کے بغیر انہی موضوعات اور اسالیب پر قائم رہے۔ شروع شروع میں ان کی یہ مستقل مزاجی غلط معلوم ہوتی بہت جہالت تصور کی جاتی کبھی کبھی تکلیف دہ اور گھوڑا پن محسوس ہوتی مگر بعد میں وہ جو کچھ کہتے تھے انہیں مانا جاتا۔

نگلستان میں ایک اور کمزوری دریافت کر لیا گیا وہ یہ کہ اس پروپیگنڈا کے ہتھیار کا استعمال صرف دشمن پر کیا جائے یہ ممکن ہے اس صورت میں کامیابی حاصل ہوتی ہے مگر اس طرح طریق زیادہ آتا ہے لیکن نتیجہ میں اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

مگر ہر پراپیگنڈا کو ایک اہم ترین فریضہ سمجھتے تھے ہمارے ہاں یہ کام بے روزگار لیڈروں کو ملازمت دینے کا آخری سہارا سمجھا جاتا تھا یا جو ٹریبلے ڈیر میدان جنگ سے جان بچانا چاہتے تھے وہ اس گوشے میں آرام سے بیٹھ کر پروپیگنڈا کرتے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے پراپیگنڈا کے تین گھٹیا کے رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

کامیابی کے ساتھ کامیابی کا چرچا کرنے کی بھی ضرورت ہے

1915ء میں دشمن نے ہمارے سپاہیوں کے اندر پروپیگنڈا شروع کیا۔ 1916ء میں یہ پروپیگنڈا شدید تر ہو گیا 1918ء کی ابتداء میں اس نے ایک بے پناہ طوفان کی شکل اختیار کر لی اس تبلیغی مہم کے نتائج اب بتدریج ظاہر ہو رہے تھے یہ دن وہ بھی آیا جب ہمارے سپاہیوں نے بالکل اسی طرح سوچنا شروع کر دیا جیسا دشمن چاہتا تھا کہ وہ سوچیں۔ دشمن کی طرف سے کوئی جوابی پروپیگنڈا نہ ہو رہا تھا۔

ان دنوں عسکری دماغ ہمارے قابل ہو رہے تھے اعلیٰ حضرت سپہ سالار کے زیر قیادت پروپیگنڈا کے محاذ پر بھی جنگ کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ تھے وہ خود تشنہ تو تھے لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس وہ وسائل نہ تھے جن سے وہ اپنی آرزو کو عملی جامہ پہنا سکتے علاوہ ازیں اگر عسکری دماغ کو ذہنی تربیت کا بوجھ بھی سنبھال لینے تو ایک تکنیکی غلطی ہوتی پروپیگنڈا موثر ہونے کے لیے اس کا ہدف قوم ہی کی جانب سے ہونا چاہیے تھا چار سال سے بلا توقف اعلانات شجاعت کا ثبوت دے رہے تھے وہ قوم کی خاطر ہر قسم کی محرومیاں برداشت کر رہے تھے اگر ان میں پروپیگنڈا کامیاب ہوتا تھا تو اس کا نشانہ قوم ہی کی جانب سے ہوتا لیکن قوم کیا کر سکتی تھی؟ کیا قوم کی اپنی وفا صرف سماعت کا نتیجہ تھی یا اس میں غداری کو بھی دخل تھا؟

1918ء کے موسم سرما کے عین وسط میں جب ترکی افواج دریائے کارن کے جنوبی کنارے سے پسپا ہو گئیں تو ترکی حلقوں سے جو پہلی تقریر کی وہ صرف خلاف مصلحت ہی نہیں بلکہ مابعد تک احمقانہ بھی تھی میں روزانہ درجنوں مختلف حیثیت سے ان دنوں اپنے آپ سے ایک سوال کیا کرتا تھا ایک ہمارے لیڈر کی کوئی ہستی نہیں جو ہمارے

جو ہمارے پادریوں میں بے دلی پیدا ہونے کی اس کڑی میں محدود کر دینے کی طاقت رکھتی ہو۔

جرمن کی شکست جب تک من و عن تسلیم نہ کر لی جائے کارگر نہیں ہوتی

جب 1914ء میں ہماری فوج نے فرانس پر حملہ کیا اور جہاں فتح پر فتح حاصل ہو رہی تھی تو وہاں کیا ہوا جب اس موج کے مقابلہ پر اگلی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں تو وہاں کیا ہوا۔ پھر جب 1918ء کے موسم بہار میں دشمن طاقتوں نے دوسری مرتبہ بڑھ کر فرانس کے مرکزی علاقہ پر قبضہ کر لیا اور ہماری فوجیں پیرس کے پھاٹکوں پر کھڑی تھیں، تو وہاں کیا ہوا۔

ان تمام مواقع پر پسپا ہونے والی فوجوں کے بہت سے سپاہی اور سرکردہ حکام کے کیے جب وطن کے اٹھے تھے ان قوم کے پروپیگنڈے اور عوام پر اثر انداز ہونے کی غیر معمولی قابلیت نے ٹوٹی ہوئی صفوں میں ایک نئی زندگی روح پھونک دی۔ ان کے پادریوں کے دلوں میں آخری فتح کا یقین کامل آ گیا۔

ان ایام میں ہماری قوم نے اس معاملہ میں کیا کیا؟ کچھ نہیں! اکثر اس سے مجھے بار بار غصہ آتا تھا میں غضبناک ہو جایا کرتا تھا جب میں تاریخ پڑھتا تو مجھے احساس ہوتا کہ عوام اور پادریوں پر ان واردات کا رد عمل عام کامرحلہ ہو رہا ہے ایک اور خیال سے بھی مجھے الجھن ہوتی تھی میں سوچتا تھا قدرت اگر مجھ کو دوبارہ پیدا کرے اور جدید تعمیر میں وہ مجھ کو ان کے بجائے دشمنوں کے پروپیگنڈے کا انتظام مجھے سونپ دے تو شاید ساری جنگ کا نظام بدل جائے۔

ان ایام میں پہلی مرتبہ مجھے تقدیر کے خلاف کچھ محسوس ہوا میں یہاں محاذ جنگ پر کسی کالے یا گورے کی گولی کا نشانہ بن سکتا ہوں حالانکہ ایک دوسرے منصب پر میں وطن کی بہتر خدمت کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو چکی تھی کہ مجھے یقین تھا میں پروپیگنڈا کا گر کچھ ہاتھوں اگر یہ کام مجھے سونپا جائے تو میں اسے کر سکتا ہوں۔

لیکن میں تو ایک گمنام شخص تھا میں تو آخر روزی کی قوم میں فقط ایک فرد تھا اس پے

میری لائبریری میں تھی کہ جو منصب و فریضہ مجھے سونپا گیا ہے وہاں جیسا کہ میں
تمہیں لکھ چکا ہوں کام کرتا چلا جاؤں۔

اشتہار بھی ہتھیار ہے

1919ء کے موسم گرما میں پہلی مرتبہ دشمن نے ہماری سرحدوں پر اشتہار پھینکے ان
اشتہارات میں اسلوب بیان کی تھوڑی بہت تبدیلی سے ایک ہی قصہ بار بار پیش کیا گیا
تھا وہ قصہ یہ ہوتا تھا کہ جرمنی میں تیزی کے ساتھ یہ وبا پھیل رہی ہے یہ عالمگیر جنگ کا
نتیجہ ثابت ہوگی جرمنوں کی فتح کا امکان ہر روز کم ہوتا چلا جا رہا ہے جرمنی کے عوام صلح
چاہتے ہیں مگر بیت کے پجاری اور قیصر عوام کی یہ خواہش پوری کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا
جرمن عوام کی اس مجبوری سے واقف ہے اس لیے دنیا کی تمام سلطنتیں جرمنی کے عوام
کے خلاف نہیں لڑ رہیں وہ تو صرف اس کیے قیصر کے خلاف برسرپیکار ہیں جو
حقیقی مجرم ہے جب تک اس وحشی اور عالمگیر صلح کا یہ دشمن ختم نہیں ہو جاتا صلح کا کوئی
امکان نہیں تاہم جنگ ختم ہو جانے کے بعد دنیا کی جمہوریت بالخصوص امریکہ کا
عوام عالمگیر صلح کی خاطر جرمن قوم کو لیگ آف نیشنز میں اور رفتہ رفتہ دوسرے کاموں میں شامل کریں گی
جوں ہی یہ شیطان عسکریت کے پجاری اقتدار سے ہٹائے جاتے ہیں جرمن قوم کو عالمگیر
برادری میں شامل کر لیا جائے گا۔

ان دلائل کے ثبوت اور وضاحت کی خاطر دشمن کے پروپیگنڈا کے اشتہارات کے
ساتھ ساتھ اخبارات اور رسالے بھی دیا کرتے تھے جو جرمن سپاہیوں کو ان کے
گھروں سے آتے تھے یہ رسالے اور اخبارات ان دعاوی کی تائید کرتے تھے۔

بحیثیت مجموعی ہم دشمن کی کوششوں کا مذاق اڑاتے تھے اشتہارات کا مطالعہ کیا
جاتا پھر ان کو فوری صدر مقام پر بھیج دیا جاتا اور جب تک ہوا کے تازہ جھونکے ان
اشتہارات کی کئی قسط ہماری خندقوں میں نہ پھینکتے ہم ان کو قطعاً فراموش کر دیتے وہ عام
یا اشتہارات جن حوالی جہازوں کے ذریعہ پھینکے جاتے تھے جو اس مقصد کے لیے خاص

طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

دشمن پھوٹ ڈالتا ہے

اس پروپیگنڈا کا ایک پہلو خاص طور پر قابل توجہ تھا وہ یہ کہ محاذ جنگ پر جہاں ہر فریق کے صوبے سے تعلق رکھنے والے سپاہی تعینات تھے وہاں دشمن کا پروپیگنڈا کرنے والے پرشیا کے خلاف جذبات بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے کہا جاتا تھا کہ جنگ شروع کرنے اور جاری رکھنے کی ذمہ داری پرشیا کے سر ہے پرشیا ہی اس گناہ کا مجرم ہے بویریا والوں سے تو کسی کی کوئی دشمنی ہی نہیں لیکن جب تک بویریا کے باشندے خود ہی پرشیا کے مفاد کی ملازمت میں ہیں اور پرشیا کی خاطر اپنے سر لے رہے ہیں تب تک بویریا کے باشندوں کی بھی کون مدد کر سکتا ہے۔

1919ء میں اس مسلسل پروپیگنڈا کا ہمارے سپاہیوں پر واضح اثر ہونے لگا۔ بویریا سے آنے والے سپاہیوں کے جذبات پرشیا کے خلاف برانگیختہ ہو چکے تھے یہ بات صاف نظر آ رہی تھی مگر پھر بھی اروپ حکومت نے اس کے تدارک پر مطلق توجہ نہ دی یہ بات صرف ناقابل فہم سمجھ کر نظر انداز کرنے والی نہیں تھی بویریا والوں کی اس قسم کی سخت سزا پرشیا کے باشندوں کے ساتھ ساری جرمن قوم نے برداشت کرنی تھی غرض دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تو خود بویریا کے باشندے اس غفلت کے نتائج سے محفوظ نہ تھے۔

اسی طرح ایک عرصہ سے وطن سے آنے والے خطوط کا اثر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ دشمن کو یہ ضرورت نہ تھی کہ وہ اشتہار چھپوا کر ان خطوط کا اعتماد دلاتا۔ وطن سے آنے والے ان خطوط کا بھی کچھ علاج نہ کیا گیا بھی کیا جا سکتا تھا کہ حکومت نے انتہائی حماقت سے ان پر چند مرتبہ تبصرہ کر دی۔ سارا محاذ جنگ اس زہر سے مسموم ہو رہا تھا جو وطن کی عورتیں گھروں میں تیار کر کے اپنے خاوندوں کو بھیج رہی تھیں ان عورتوں کو کیا علم تھا کہ ان کی ان تحریروں سے دشمن کی جنگ کا رخ تبدیل آ رہا ہے یا ان کو کیا پتہ تھا کہ اس

طرح وہ محاذ جنگ پر لڑ رہے تھے وہ ہوائی جہازوں کے مصنوعی میں اضافہ کا باعث ہو رہی ہیں یہاں مصنوعی کو تبدیل دے رہی ہیں۔ ان کے ناقصات العقل کے کھلے ہوئے بیلوں ہمارے کھوکھلے پاپیوں کے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہوئے۔

مساوات کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی

اس طرح 1916ء میں ہی آثار بہتر ہونے ظاہر ہو رہے تھے سارے محاذ جنگ پر کامیابیاں ہو رہی تھیں بے چینی ظاہر ہو رہی تھی بے اطمینانی کی کئی وجوہات تھیں لیکن یہ کامیابیاں ہو رہی تھیں سپاہی تو محاذ جنگ میں ہی سب کچھ قربان کر رہا تھا گھر پر اس کے اعزہ و اقربا تکالیف میں دن کاٹ رہے تھے۔ برعکس اس کے اعلیٰ افسر دوسرے گھروں میں دعوتوں اور جشن کے مزے اڑا رہے تھے محاذ جنگ پر بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے قحط مساوات کا ہوک سا ہو رہا تھا۔

جنگ کے ابتدائی مراحل میں ہی بعض مواقع ایسے ہوئے تھے کہ فرانس کی فوج کو بہت پیچھے ہٹنا پڑا تھا لیکن زیادہ تر یہ کہ پیچھے ہٹنا بہت محدود ہوتا تھا جو محض دو گز کی پسپائی سے بڑھ کر ہوتا تھا۔ اطمینانی ہوئے فرانسیسی فوج اس خاموشی سے یہ کام کر رہی تھی کہ کوئی کچھ ہوا ہی نہیں چند ہفتے پہلے جس رسالہ میں بے چینی کے آثار نظر آ رہے تھے وہی اب اپنے کیمپ کی خندق کی حفاظت میں یہاں ڈٹا رہا ہے گویا زمین کی قسمت اس چند گز زمین سے وابستہ ہے جس میں توپ کے گولوں نے گڑھے کھود دیے ہیں ہر چاروں طرف بکھر ہو رہے ہیں ابھی تک زمین کی قدیم تقسیم یعنی فوج میدان میں تھی یا ایک دوسرے دشمن حالات میں ایک تبدیلی رونما ہوئی جس نے مجھے دشمن خود اس قدیم فوج اور وطن کی حالت میں فرق دیکھنے کا موقع مہیا کر دیا۔ ستمبر 1916ء کے آخیر یا مہینہ میں وہ نظم جس کے اندر میں بھی شامل تھا سوم کے معرکہ میں حصہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ ہمارے لیے یہ معرکہ گویا دست معرکوں کے ایک سلسلہ کی ابتدا تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا گویا جنگ کی جسم سے سلطنت ہو گیا ہے۔ ہاتھوں ہمچو توپ کے گولوں کی بارش میں کامیاب قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے کبھی کبھار ہم تھوڑا پیچھے ہٹ جاتے لیکن پھر تیزی سے آگے بڑھ جاتے

ہمرکھی میدان نہ چھوڑے تھے۔

جنگ خاتمہ پر گھر نہیں

۱۹۴۵ء کو میں رہا ہو گیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اتحادی افواج کے پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنے ملک واپس آ گیا۔ یہاں سے سوئٹزرلینڈ کے ذریعہ مجھے جرمنی بھیج دیا گیا۔

مجھے گھر چھوڑے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ان دنوں کے حالات میں یہ ایک لمبی مدت محسوس ہوتی تھی۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ میرے والدین کیسے کیسے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر میز کے مقام پر ایک درمیانی عارضی اسپتال تھا۔ یہاں جب میں نے ایک نرس کی آواز سنی تو بے اختیار رو پڑا۔ وہ میرے قریب ایک زخمی سے باتیں کر رہی تھی۔ دو سال کے بعد میں نے پہلی مرتبہ عورت کی آواز سنی تھی۔ جو کہ بہت ہی شیریں تھی۔ میں جوان ہو گیا۔

ہماری ایمبولنس ٹرین نرنبرگ کی سرحد سے تقریباً قریب ہوتی جاتی تھی اتحادی ہم میں سے ہر ایک کی بے تابی بڑھتی جاتی۔ راستہ میں ہم ہر اس مقام کو پیچھے چھوڑتے جاتے تھے۔ جہاں آج سے دو سال قبل ہم نوازوں رضاکاروں کی حیثیت میں گزرے تھے۔ ہر اسٹیشن، ہر ریلوے جنکشن، ہر کارخانہ، ہر مکانات کی مخصوص ساخت سے ان کو پہچان کر ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ گھروں کی چھتوں پر لگے ہوئے بھورے کھڑکیوں کے طرز صورت سب ہم سے مانوس تھے۔ ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ یہ اور وطن ہے۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں یہ سرحد عبور کرتے وقت ہم خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے۔ لیکن آج خاموش اور گہرے جذبات سے ہمارے سینے بھر رہے تھے۔ ہر فرد سوچ رہا تھا۔ کہ نظر نے بچا کر اس سرزمین کی زیارت کا موقعہ دیا اس کی حفاظت کی خاطر اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ہر ایک اپنی ہم جلیسوں سے چھپانا چاہتا تھا۔ زخمی ہونے کے قریباً دو سال بعد میں ان کے قریب ہی کے اسپتال میں داخل ہوا۔

بزدلی کا تدارک ازحمی ہے

ایک دنیا بدل گئی تھی۔ کہاں تو سونے کے میدان جنگ کا پیکر اور کہاں اس عالیشان عمارت میں یہ ہلکے سبز۔ پہلی مرتبہ کمرہ میں داخل ہوتے وقت تو بے اختیار ایک جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس نئی دنیا سے تدریج اور آہستہ آہستہ مانوس ہونا ہی ممکن تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ دنیا محض دوسری باتوں میں بھی مختلف تھی۔

میدان جنگ میں فوج کا جذبہ یہاں مفقود تھا۔ یہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہاں پہلی مرتبہ میں اس حرکت سے متعارف ہوا۔ جس کی محاذ جنگ پر کبھی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یعنی اپنی بزدلی پر غور کرنا۔ محاذ جنگ میں کبھی شکایت ہو بھی تو سننے میں آتی تھی۔ لیکن اس میں بزدلی پر اکسانے کی بہت کوئی دخل نہ ہوتا تھا۔ بقیہ باتوں کو چھوڑ دو اس کو پروا نہ تھی کہ بھاگو یا نہ بھاگو۔ مگر یہاں۔ محاذ جنگ پر ایک بزدل ہر صورت ایک بزدل ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کوئی دوسرا کردار ممکن نہ تھا۔ اس قسم کی کمزوری پر دانستہ اصرار کرنا۔ اس طرح کی دلیری پر چاروں جانب تحسین ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہاں بیچاروں میں اس معاملہ پر ذرا اختلاف تھا۔ وہ آبگ دھویدا راجے چاہیوں کا غذاتی زمانے میں مصروف تھے۔ کم بخت اور بزدل گھوڑوں کی شان میں قصیدے تصنیف ہوتے تھے۔ بلکہ عزت کی اس تحریک کی راہنمائی وہ بدبخت انسانی نما مخلوق کے سپرد کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو فخر تھا کہ اس نے جان پر کھیل کر اپنا ہاتھ خارداروں کے جال سے الجھ کر رہا تھا کہ اسے اپنا ہاتھ بھی دینا پڑا۔ اگرچہ اس کا زخم معمولی تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ دو سے یہاں ہے۔ اور ابھی نجانے معین مدت تک یہیں رہے گا۔ جس فریب سے وہ ایمبولنس میں بیٹھ کر یہاں آ گیا تھا وہ بھی اسی قسم کی کوئی بدمعاشی اسے یہاں رکھنے کے انتظام کے متعلق بھی کرنی گئی تھی۔ اس دوائی باز نے کو یہاں تک ترقی ہو چکی تھی کہ وہ اپنی چالاکی کو اپنی دلیری سمجھ رہا تھا۔ اور سچ مچ ہی وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھا کہ ایسی دلیری شہیدوں کی موت مرنے سے بہتر ہے۔ کئی

اس کی باتیں سن کر چپ ہو رہتے تھے۔ لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو اس کی سنتے سنتے مذاق اڑانے لگتے تھے۔ اس کی ہنسی کرتے تھے۔

مجھے کبھی محسوس ہوتی تھی کہ اس قسم کے دقیانوسی خیالات پھیلانے والے کو ایسی جگہ کیوں رہنے کی اجازت ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ ہسپتال کے افسروں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کون ہے۔ درحقیقت وہ جانتے بھی تھے پاہو اس کے کوئی تذکرہ نہ کرتا تھا۔

ہر کلرک کوئی یہودی تھا اور یہودی ایک کلرک

جوں ہی میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ میں نے رخصت جانے کے لیے درخواست حاصل کی۔

ہر جگہ اتحادی فوجوں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دارالحکومت کی سڑکوں پر مخلوق بھوک کے عذاب میں گرفتار تھی۔ سپاہی اس ہوٹلوں و مہمان خانوں میں ٹھہرتے وہاں ہر جگہ وہی ہسپتال وہی کشمکش مختلف ہو رہی تھی۔ ایسا دکھائی پڑتا تھا کہ یہ اثر بیت پھیلانے والوں نے اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے محاذ جنگ کے متعدد حصے اپنے لیے قائم کر رکھے ہیں۔

میونخ میں صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔ جب میں صحت یاب ہو کر ہسپتال سے چلا آیا تو مجھے میونخ میں ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ کے اندر ٹھہرنے نہ دیا گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا گویا کسی اجنبی شہر میں آ گیا ہوں۔ ہر جگہ فلسفہ نے اطمینانی اور شکایت کا رنگ تھا۔ کسی عرصہ تک اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ چھوٹے درجہ کے فوجی افسروں نے ابھی محاذ جنگ دیکھا بھی نہ تھا وہاں سے واپس آنے والے سپاہیوں سے مناسب سلوک کے قابل تھے۔ دوسری طرف پرانے سپاہیوں میں بھی اخلاقوں کے اندر رہتے رہتے بگڑ خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ لوگ فوج کے افسروں خصوصیتوں کا اندازہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ اس کے جو افسر جنگ دیکھ آئے وہ ان خصوصیتوں کو ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتا تھا۔ یہی سمجھتی کہ پیچھے کو لڑنے کے فوجی افسروں کی نسبت وہی محاذ جنگ سے آنے والے افسروں

کی زیادہ عزت کرتے تھے۔ ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے عام فضا ایسی ناک تھی۔ جن بچانے کو عبادت اور فرض شناسی کو کمزوری یا کمزوری کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ تمام سرکاری عہدوں کا معاملہ یہودیوں پر مشتمل تھا ہر یہودی ایک فوج تھا اور ہر فوج کوئی یہودی۔ میں ہر گز یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ جنگوں کو یہودی نظر سے دیکھ کر جنگ ہی ان کی تجارت بار کیے طبیعت ہو گئی۔

کاروباری میدان میں حالات اس سے بھی زیادہ خراب تھے۔ یہاں تو یہودیوں کے علاوہ کام نہ چلتا تھا۔ وہ قوم کے مسامات سے جونکوں کی طرح خون چوس رہے تھے۔ جنگ کے کاروبار کے لیے تجارتی کمپنیاں چلانے کا ایک باقاعدہ رواج چل رہا تھا۔ اس ترکیب سے قومی تجارت کا گلا گھونٹ کر آزاد کاروبار ختم کیا جا رہا تھا۔

یہودی قوم کو لوٹ رہے تھے

کہا جاتا تھا کہ سب کاروبار ایک مرکز کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اس پر زور دیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ہی ساری قومی پیداوار یہودی سرمایہ کے پنجہ میں آ چکی تھی۔

ان سب باتوں سے لوگوں کو جو طیش محسوس ہوتا تھا اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی کہ اگر جلد قدم نہ اٹھایا گیا تو قومی دولت اور خوشحالی کی گھڑی ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے گی۔

یہودی قوم کو لوٹ رہے تھے۔ یہودی استبداد کے پنجہ سخت کس رہے تھے۔ لیکن عوام کو پولیس کے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا۔ جس طرح جنگ میں اس زہریلے پروپیگنڈہ کی کوئی روک تھام نہ تھی۔ اسی طرح یہاں گھر میں بھی سرکار اس کا تدارک کرنے سے قاصر تھی۔ کوئی سوچتا تھا کہ پولیس کی شکست یہودیوں کے عروج کے باعث کس طرح ہو گی۔ اگر پولیس نے بغاوت اٹھائی تو پھر یہودیوں کہاں بچے گا۔

اس طرز عمل سے مجھ پر گہرا اثر ہوا مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہودی عوام کی توجہ اپنی ذلت سے ہٹانے کے لیے یہ چال چل رہے ہیں۔ پولیس اور فوج کے باشندے آپس

کے جھگڑے میں الجھے ہوئے تھے اور یہودی دونوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان کی
ناک کے نیچے دنیا کا گھر لوٹ رہے تھے۔ یوں یہ تو نیا کو برا بھلا کہنے میں مصروف
رہا۔ اور یہودیوں نے اقتدار پر قابض ہو کر ایک طرف سے یورپ اور دوسری دنیاؤں کو فتح کر
لیا۔

میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچوں کے درمیان پیدائشی امتیاز کو
نہ دیکھ سکا۔ اس لیے میں نے فوج میں بھرتی ہونے کے فوراً بعد محاذ جنگ پر حاضر ہونے پر
آمادگی ظاہر کر دی۔ میں اوائل مارچ ۱۹۱۷ء میں پلی پہنچا۔ جہاں سے مجھے محاذ جنگ پر بھیجا جانا تھا۔

نحوست کے کوؤں کا شور و غم بڑھ رہا تھا

۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں یہ واضح ہو چکا تھا کہ گو محاذ جنگ پر ہماری فوجوں کی مدتوں سے
گزر چکی ہیں۔ روس کی شکست کے بعد ہماری فوج میں ایک نئے حوصلے اور امید کی
روح دوڑ گئی۔ بتدریج ہر ایک کو یہ بات یقین ہو چلا تھا کہ آخری فتح ہماری ہوگی۔ ہماری
صفوں میں اس نوگمانی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نحوست کے کوؤں کا شور و غم
بڑھ رہا تھا۔ ماضی کے مستقبل پر ہماری یقین تازہ ہو رہا تھا۔

۱۹۱۷ء کے موسم خزاں میں اٹلی کو بھی شکست ہوگئی۔ اس طرح اس حیرت انگیز حقیقت
ثابت ہو گیا کہ جرمن روسیوں کے علاوہ دوسرے دشمنوں کا محاذ بھی توڑ سکتے ہیں۔ اس
حیرت انگیز واقعہ سے محاذ جنگ پر ہزارہا سپاہی سرشار ہو گئے۔ وہ اب اطمینان سے
۱۹۱۸ء کے موسم بہار کا انتظار کرنے لگے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ دشمن کے دن گنے جا رہے
ہیں۔ موسم سرما میں برفانی معرکوں کی لپ جھپک رہی۔ یہ جھٹکے چلنے سے پہلے فضا
میں پیدا ہونے والا سکون تھا۔

غداری بدترین آفت ہے

میں اس وقت تک کہ اس یقینی جنگ کو ختم کرنے کے لیے آخری یلغار کی تیاری

دشمن کامیابی سے بچنے کی خاطر پیچھے ہٹ رہے ہوں گے یا پارٹیوں کو اس وقت بھی سر کھپائے رہنا چاہیے؟

دوسرا سوال یہ تھا کہ اس حرکت کا دشمن پر کیا اثر ہوا؟

دیوالمانیہ نے روسی جنگ کو مؤخر کرایا

۱۹۱۴ء کے موسم سرما میں حلیفوں کے سر پر مایوسی کی گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔ وہ پیرس سے دیوالمانیہ کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ وہ آج تک اس کا لشکر نہ اکھاڑ سکے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے ان کے خلاف اپنا بچاؤ کرتا رہا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کبھی مشرق اور کبھی جنوب کے محاذ پر دشمنوں کے خلاف لگو رہتا رہا تھا۔ آج وہ ان دشمنوں کو مار بھگا چکا تھا۔ اب اس کا مقصد محض یہ تھا۔ وہ مغرب کے محاذ پر اپنے حریفوں سے نپٹنے کے لیے بالکل آزاد تھا۔ یہ دن دیکھنے کے لیے خون کی ندیاں بہادی گئی تھیں۔ لیکن آخر کار دیوالمانیہ جو آج تک مغربی محاذ پر محض بچاؤ کی جنگ سے کام لیتا رہا تھا اب اپنی تلوار کے جوہر یہاں بھی دکھا سکتا تھا۔ دشمن یہ محاذ توڑنے میں دو دفعہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب جرمنوں نے حملہ کرنا تھا۔ دشمن کا کلیجہ دہل رہا تھا۔ وہ زور بہ قدم تھا۔ اسے جرمنوں کی کامیابی سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

پیرس اور لندن میں کانفرنس پر کانفرنس ہو رہی تھی۔ دشمنوں کے ہر اجتماع میں بھی بجکچاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اب یہ بات کہنا ذرا مشکل تھا کہ جرمنوں کا کامیابی کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ اتحادیوں کی محاذ آرائی سے کام لے کر ہم تو تھا۔ ان کے سپاہی تک خاموش تھے۔ ان کی حکومتوں کے گستاخانہ جوش و خروش میں کمی آ چکی تھی۔ یہ ناگوار حقیقت اس پر آشکار ہو رہی تھی کہ جرمن سپاہی کے متعلق ان کی رائے بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ آج تک انہیں سمجھایا گیا تھا کہ جرمن سپاہی تو ایک بے عقل کا لٹھ ہے جس کی ہتھی چھٹی ہے۔ لیکن آج ان کا مقابلہ اس جوانمرد سے تھا جس نے ان کے روسی حلیف کو مار کر بھگا دیا تھا۔ جرمنوں کے عسکری مبصر نے حالات سے مجبور ہو کر صرف مشرقی محاذ پر

جارحانہ اقدامات اختیار کرنے کی جس پالیسی پر شروع سے عمل کیا تھا۔ اب اتحادیوں کو
یہ دکھائی دیتا تھا کہ گویا جرمنی کی وہ پہلی قدرت کا شاہکار تھی۔ جرمن تین سال سے متواتر
روسی محاذ کے ساتھ پر سرکار رہے تھے۔ پہلے وہ ایسے نظر آتا تھا گویا کامیابی کی کوئی
صورت ہی نہیں۔ ان بے تحاشہ کوششوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ خیال تھا کہ آخر کار روسی
جن محض اپنی کثرت خون کے بل پر ہی غالب آجائے گا۔ جرمنی کا تانا خون بہہ بہہ کے
کمزور اور نڈھال ہو کر رہ جائے گا۔ واقعات بھی دشمن کی ان امیدوں کا ساتھ دیتے معلوم
ہوتے تھے۔

حریف کی امیدوں پر پانی پھر گیا

ستمبر ۱۹۱۸ء کے اوائل میں کہیں برگ کی لڑائی کے بعد جنگی نیوزیوں کی اتحادی
اخباریں دشمن میں داخل ہوئیں۔ اس کے بعد تو یہ محسوس ہوتا تھا گویا یہ معرکہ کبھی ختم نہ
ہوگا۔ جوں ہی ایک فوج کو شکست دے کر ختم کیا جاتا ایک دوسری فوج اس کی جگہ لینے کو آ
جاتی۔ لاکھوں کی غیر معمولی وسیع سطح پر لڑائیوں کا ایک غیر معمولی طرز تھا۔ جنگ کی
دیوی کے سامنے ہمیشہ نئے سے نئے کوتاہ و نادار و بیکار ہو جو رہتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ
جرمنی اس قسم کے مقابلہ کب تک جاری رکھ سکتا ہے۔ کیا ایک دن ایسا آجائے گا جب
جرمنوں کی فتح پانی کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ لیکن روس کے بارے میں بھی آخری دن
کے لیے خوش ہوتی ہوں گی؟ پھر کیا ہوگا؟ انسانی ہمت کے اندازے کے مطابق جرمنی
پر روس کی فتح میں تاخیر تو کی جا سکتی تھی لیکن بالآخر اس سے چارہ محال دکھائی دیتا تھا۔

روس سے جو امیدیں وابستہ تھیں آج سب خاک میں مل گئیں۔ اتحادیوں کے جس
حلیف نے باہمی معاہدوں کی مجموعہ اشت میں سب سے زیادہ خون قربان کیا تھا آج اس کی
طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ زمین پر مرنے کے بل پڑا تھا۔ اس کا مختلف دشمن بالآخر
غالب آچکا تھا۔ اتحادیوں کے سپاہی جو آج تک مذبحے اتحاد میں سرشار رہا کرتے تھے
آج ہا امیدی اور خوف سے لرز رہے تھے۔ انہیں آنے والے موسم سرما کا دھڑکا لگا ہے

جا رہا تھا۔ جب تک اس مغربی اتحاد پر اپنی تمام قوت یکجا نہ کر سکتے تھے تب تک یہ اتحادی سپاہی جرمنوں کی صفیں توڑنے میں ناکام رہ چکے تھے۔ آج ان کی طاقت کے بادل کے اس جرمن کی ملک کی جگہ منظم خوف سے ساتھ تھا کامیابی کی امید کون کر سکتا تھا۔ جرمن مغربی محاذ پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں جمع کر رہے تھے۔

جنوبی یورپ میں اطالوی ترکیل کندھا دینے کی فوجوں نے جس بری طرح ہزیمت اٹھائی تھی آج بالکان کے محاذ پر اتحادی سپاہیوں کے مایوس چہرے اس کی شہادت دے رہے تھے۔ وہاں کے واقعات کا اثر یہاں محسوس ہو رہا تھا۔ یا تو وہ کسی فتح پر ایمان رکھتے تھے یا آج آنے والی شکست سے ڈرنے لگے۔

جو غیروں سے نہ ہوا تھا اپنوں نے کر دیا

یہ موقع تھا۔ سردی کی ان راتوں میں جب اس عظیم طوفان حملہ کرنے کے لیے بڑھتے ہوئے جرمن فوجوں کی ہلچل سنائی دینے کا گمان ہوتا تھا جب خوف سے لرزہ براندام ہو کر فیصلہ کی گھڑی کا انتظار ہو رہا تھا عین اس وقت جرمنی میں ایک بجلی کوندی جس کی کرنوں نے دشمن کی صفوں میں توپ کے گولوں سے پیدا ہونے والے اندھیرے سے اندھیرے گھروں میں بھی اجالا کر دیا۔ وہاں عین اس وقت جبکہ جرمن لشکروں کو عظیم طوفان حملہ کرنے کے لیے آخری ہدایات دی جا رہی تھیں جرمنی میں عام ہڑتال ہو گئی۔

پہلے تو دنیا حیرت سے تک رہی تھی کہ دشمن کے پروپیگنڈا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آخری گھڑی آنے سے پہلے وہ اس کی داستان کو لے اڑا۔ اتحادی سپاہیوں کے ڈوبتے ہوئے حوصلے بحال کرنے کے لیے ہر لمحہ ایک نئی بات آ گیا تھا۔ فتح کا امکان اب یقین کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ ٹلنے والے واقعات کے متعلق پریشانی اور تشویش کو قبل یقین سے دور کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے کو جرمنوں کے ان حملوں کا سامنا تھا جن کی ہلچل محسوس کرنے سے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے اب ان سپاہیوں کے دل میں یہ خیال پیدا

کیا جا سکتا تھا کہ جنگ کا فیصلہ جن محاذوں کی لڑائی سے نہیں ہوگا وہاں مقابلہ کرنے والوں کے صبر سے ہوگا۔ جرمنوں کو دل بھر کر فتوحات کر لینے دو۔ ان کے وسائل کو اب حاصل خوراک کا ذریعہ نہیں۔ وہ بس ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔

برطانوی، فرانسیسی اور امریکی افواج نے اب ہوائی حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ساتھ ہی سمندروں کے راستے جرمنی کا محاصرہ بھی بڑی تاثیر سے کیا جا رہا تھا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کے سپاہیوں کے حوصلے تمام کر رہا تھا۔

"جرمنی کے سر پر عقاب منڈلا رہا ہے"۔ "اتحادیوں کی فتح ناگزیر ہے"۔ "وہ اگر ہماری آبی گزرگاہ کو بند کر دیتا تھا تو ہم بھی اس کا وہی حشر کر سکتے ہیں اس کو اس کے پانی پر کھڑا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر ہتھیار اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہماری بالٹیں اور گن شپ جہاز بھی ملک پر سایہ فگن تھیں۔ لیکن اب اس بار ان کا نشانہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کی جگہ بیٹھ کر مقابلہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اس مقابلہ کے پیچھے بے مستقل عزائم کی جھلک تھی۔

یہ کھلا بلاوے کے کارخانوں میں ہڑتال کا پھل تھا۔ تمام دشمن ممالک کو اب پکا فتح کا یقین ہو گیا۔ ان کے عزائم پائدار ہو گئے۔ اتحادیوں کی صفوں میں ہلچل کر دینے والی جس مایوسی کا دورہ روس پر ہوا تھا وہ دور ہو گئی۔ اس طرح یہ ہڑتال ہزارہا ان سپاہیوں کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس ہڑتال نے جنگ کے فاصل کو تاخیر کرتا دھرتا انقلاب کے بعد جرمنی میں بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں کے امیدوار بن بیٹھے۔

مدمقابل کو گرتے گرتے سہارا مل گیا

آغاز میں جرمن سپاہی ان واقعات کے نتیجے سے بے خبر تھا۔ لیکن دشمن توان واقعات سے ایک مستقل فائدہ حاصل کر چکا تھا۔ اب اس کی قوت مدافعت ایک ایسی فوج جیسی بن گئی تھی جس کی آنکھوں کے سامنے شکست دکھائی دے رہی ہو۔ اس نے فتح کے بے پناہ قربانی دینے کا عزم بالجزم کیا تھا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ انسانی عقل کے ہر اندازے

کے مطابق ترکوں کی طرف سے بھی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مغربی محاذ ترکوں کے حملہ کے سامنے مدافعت کے چھ مہینے کسی نہ کسی طرح گزار دے۔ اتحادی ممالک کی حکومتوں نے بھی بہتر مستقبل کا احساس کرتے ہوئے اس پراپیگنڈہ کے لیے بڑی بڑی رقوم منظور کر دیں جس سے ترکی کا داخلی انتظام درہم برہم کیا جانا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے مغربی محاذ پر ترکوں کے پہلے دونوں حملوں اور پھر آخری حملہ میں بھی حصہ لینے کا موقعہ ملا۔ ان حملوں میں شرکت کے تاثرات میری زندگی کے عظیم ترین تاثرات ہیں۔ میں ان تاثرات کو عظیم ترین اس لیے کہتا ہوں کہ اب آخری مرتبہ جنگ نے مدافعت چھوڑ کر جارحانہ پہلو لیا۔ حملہ کی طرح آج ہم پھر حملہ آور تھے۔

تین سال تک خندقوں اور کھائیوں کے جہنم میں محصور رہنے کے بعد اب دشمن سے دو بدو ٹکرانے کا وقت آیا تو ہر ترک سپاہی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک مرتبہ پھر فوج کے مختلف دستے جوش و خروش سے نعرے لگا رہے تھے۔ جو حملہ سے کامیابی کی مقدس یاد کے لیے وقف ہو چکے تھے آج ان پر آخری مرتبہ پھولوں کے ہار چڑھانے گئے۔ ایک دفعہ پھر مارچ کرنے والے سپاہیوں کی ابتدائی قطاروں سے حب وطن کے گیت آسمان کی طرف بلند ہوئے۔ رب العزت نے آخری مرتبہ اپنے ناقابل تسخیر بندوں پر رحمت کی بارش کی۔

شہدائے جنگ اور کفن چور

۱۹۱۸ء کے موسم گرما کے بیچ وسط میں سارے محاذ پر ایک حس کی کیفیت تھی۔ وطن میں خانہ جنگیوں نے ایک آفت برپا رکھی تھی۔ افواہ تھی کہ محاذ جنگ پر سپاہیوں کی طرف گاڑیوں میں اس موضوع کے خوب چرچے تھے۔ "اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ کسی بیوقوف کو فتح کی امید باقی ہو سکتی ہے تو مرگ سے بے تعلق ہو چکی ہے۔ صرف بادشاہ اور سرمایہ دار جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں"۔ یہ تھے وہ خیالات جو وطن سے ہمارے

پاس بھیجے جاتے تھے۔ مگر چوبیوں میں اس سوال پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا۔

شروع شروع میں تو کوئی ان باتوں کی پروا بھی نہ کرتا تھا۔ بھلی عام رائے دہندگی کا نتیجہ نکل جائے تو کیا کہ وہ ہوگا؟ ہم چار دیواری سے اس غرض کے لیے تو نہیں نکلے تھے۔ اس قسم کے دعوے ان مقاصد کو نظر انداز کر دیتے تھے جنہیں لے کر شہدے جنگ گھروں سے نکلے تھے۔ ان کمن چوروں کی پیدا کردہ حرکت فریبوں کی قبروں کو ٹھوکر لگانے کے مترادف تھی۔ جو سپاہی کے محاذ پر جب ہمارے سپاہی تیقنی موت کے منہ میں جا رہے تھے تو کیا اس وقت ان کیلئوں پر یہ فخر تھا کہ "حق عام رائے دہندگی ۔۔۔ ہر گز نہیں وہ تو پکار رہے تھے کہ

دیکھنے میں تو یہ معمولی فرق دکھائی دیتا ہے لیکن ذرا اس کی اہمیت پر غور فرمائیے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آج عام رائے دہندگی کے نعرے لگا رہے ہیں لڑائی کے وقت کون سے بلوں میں گھسے ہوئے تھے۔ ہم محاذ جنگ پر رہنے والے تو اس سیاستدانوں کے بھوسے بھرے دماغ میں اب مکمل تو ان بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے تو ان پارلیمنٹری شرکائیں سے تو بہت کم ذات شریف وہاں دکھائی دیتے تھے۔

ان پرانے سپاہیوں کو جنہوں نے محاذ جنگ پر لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ حضرت پیدائشی یہ یقین نہ رہا تھا کہ لفظ وطن وغیرہ کے تصنیف کردہ حقوق کے کوئی دلچسپی تھی۔ ہم جیران تھے کہ یہ لفظ پیچھے رہنے والوں نے فوج کی پروہ کیلئے خود ہی تمام جانبازانہ اختیارات کیوں استعمال کیے۔

ہمارے ہی اس مسئلہ کے متعلق میرا ایک مخصوص اور واضح عقیدہ تھا۔ ان دو بڑی پارٹی لیڈروں کے نتیجے نے عوام سے غداری کی تھی ان میں سے ہر دل سے نفرت کرتا تھا۔ بڑی دیر سے جان پڑا تھا کہ اس معمولی قوی مفاد کی کوئی پروہ نہ تھی۔ ان کو تو فقط اپنی جیبیں بھرنے کی پروہ تھی۔ میری رائے میں ان کو تختہ دار پر کھینچا جانا چاہیے تھا۔

بہترین ساتھی اس خاک میں مدفون ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو وہ بچے ہی تھے۔ یہ وہ سپاہی تھے جن کی آنکھیں جوش عشق سے دمک رہی تھیں۔ اور حال یہ کہ وہ جن کی خاطر موت کے منہ میں بخوشی رخصت ہو گئے تھے۔ اب ہم اس مقدس مقام پر پہنچے جہاں ہم نے کھڑے ہو کر "تادم مرگ وفاداری اور فرض شناسی" کا حلف اٹھایا تھا تو ہم میں سے جو بڑی عمر کے سپاہی شروع سے اس رجمنٹ میں شامل رہے تھے ان کے دل بھر آئے تھے۔ تین سال گزر چکے تھے جب رجمنٹ نے حملہ کر کے یہ علاقہ فتح کیا تھا۔ اب ایک جان گداز خاموشی میں ہم اسی علاقہ میں بہ نعمت پا مور کیے گئے تھے۔

مگر ہوں نے تین ہفتے تک توپوں سے گولہ باری کر کے کام شروع کر دیا۔ اگلے حملے کی تیاری جاری رہی۔ ہمیں ایسے محسوس ہوتا تھا گویا امریکنوں کی رو ہمیں قبروں سے نکل کر وہاں پھر ایک مرتبہ زندہ ہو گئیں۔ ہماری رجمنٹ بچ بچ میں خالی کھود کر وہیں ڈٹ گئی۔ چاروں طرف توپ کے گولوں سے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ زمین میں سوراخ ہو رہے تھے۔ لیکن سپاہی اپنے مورچوں سے ٹانگ چھوڑ ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ہاں روز بروز ان کی تعداد کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ آخر ۳۱ جولائی ۱۹۱۷ء کو مگر ہوں کا حملہ شروع ہوا۔

اگست کے شروع میں ہماری جگہ دوسری فوجیں آ گئیں۔ ہمیں سستانے کے لیے واپس بھیج دیا گیا۔ رجمنٹ میں چار سو کی جگہ ساڑھے تین سو کی گنتی رہ گئی تھی۔ جو سپاہی اب بچ رہے تھے ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور انسانوں کی بہ نسبت بھوتوں سے زیادہ مشابہ نظر آتے تھے مگر پچھلے سو گز زمین کے سوا اس حملے سے اور کوئی انعام حاصل نہ کر سکے۔

پاؤں تلے زمین نکل گئی!

اب ۱۹۱۸ء کا موسم سرما تھا۔ ہم تیسری مرتبہ اسی علاقہ میں کھڑے تھے جس پر ۱۹۱۶ء میں ہم نے حملہ کیا تھا۔ کامبرے کا گاؤں جہاں سے ہم نے پہلے حملہ شروع کیا تھا

آج میدان کارزار کے علاقہ میں ٹہل رہا تھا۔ گرد و پیش کے ماحول میں بہت کم تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں سپاہیوں میں بڑی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اب وہ سیاسیات پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اور سب مقامات کی طرح وطن سے آنے والا زہریلا بھی یہاں اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ وہ روپہلی دھواں زہر سے سر سر مسموم ہو چکے تھے۔ وہ وطن سے تازہ تازہ آئے تھے۔

۱۳ اکتوبر کی درمیانی شب کو انگریزوں نے پانچ میل کے جنوب میں زہریلی گیس چھوڑ کر حملہ کی ابتدا کی۔ انہوں نے پہلی گیس استعمال کی جس کے اثر سے تب بھر بے واقف تھے۔ کم از کم کسی کو اس کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اس رات مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا۔ دروک کے جنوب میں ایک ٹیلے پر ۱۳ اکتوبر کی رات کو ہم ہی کی گھنے تک زہریلی گیس کے گولوں کی زبردست بارش کی گئی کبھی کم اور کبھی زیادہ یہ گولہ باری ساری رات جاری رہی۔ آدھی رات تک وہ میں سے کئی سپاہی ناکارہ ہو چکے تھے۔ بعض تو ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گئے۔ صبح کے قریب مجھے بھی درد محسوس ہونے لگا۔ پھر وہ درد منٹ کے بعد بڑھتا ہوا جاتا تھا۔ سات بجے صبح کے قریب میں نے لڑکھڑاتے ہوئے دو آخری دو فرلانگ تک پہنچا دیا جو اس جنگ میں میرا آخری کام تھا۔ وہ مجھے ہسپتال لے جا رہی قسمت میں لکھا تھا۔ اس وقت میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ پھر بھی آنکھوں میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ گویا میری آنکھیں باہر نکلے ہوئے انگارے ہیں۔ مجھے بخار بھی ہو رہا تھا۔

مجھے پیرس جانے کے قصبہ باسے وہ کے میں ایک ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ مجھے نمونیا میں مبتلا ہو جانے کی خبر ملی۔

آسمان پھٹ پڑا

ایک عرصہ سے فضا بہت معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے تو بخار کی وجہ سے کچھ نہ آتا تھا لیکن لوگ کہہ رہے تھے کہ آسمان دو چند دنوں میں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ پتہ تو مجھے نہیں کہ کس قسم کی بارش موسم بہار میں کی گئی تھی شاید وہی کی بارش دوبارہ کی جائے گی۔

کہا جاتا تھا کہ اگر جنگ نہ ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔ وہاں سے مسلسل یہ خبریں آ رہی تھیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ جنگ کے بادل گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہسپتال میں سب لوگ جنگ کے خاتمہ کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ اور امید کرتے تھے کہ اب جلد ہی جنگ ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ کسی کو خیال نہ تھا کہ کوئی اور ہی یہ فیصلہ ہو جائے گا۔ میں خود اس کے لئے تیار تھا۔

نومبر میں عام انتظار سے ترقی کر گیا۔ اسی حالت میں ایک روز بلاہٹ ہوا۔ بغیر کسی اطلاع کے آسمان پھٹ پڑا۔ ملٹری موٹر لاریوں میں بیٹھ کر آئے۔ اور انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ ہسپتال کو فوراً خالی کر دو۔ قوم کے وجود کو خطرہ ہے۔ ہر ایک کو جنگ کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اس حکم کے سرخ ہونٹ بھی ہمدردی کا ایک لفظ نہ بولے تھے۔ ان میں سے کوئی محاذ جنگ پر اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔ اور اب فرلو کے لئے ہسپتال کی مدد سے ہی گھر واپس بھاگ آئے تھے۔ اب دوسرے رنگ کے چھکڑے گاڑی لے کر یہاں چلے آئے تھے۔

کچھ دنوں سے میری حالت بہتر ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں کی بصارت اور درد میں اب افاقہ تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے آس پاس کی چیزوں کے دھندلے خاکے بھی دکھائی دینے لگے۔ اب یہ امید ہو چلی تھی کہ میری بینائی اس حد تک ٹھیک ہو جائے گی کہ اس سے میں کوئی پیشہ اختیار کر سکوں۔ دوبارہ تاریخ کے کالج جانے کی تو اب کوئی امید باقی نہ تھی۔ غرض میں اس سانحہ کے رونما ہونے کے وقت بہتر حالت تھا۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ غداری کا مظاہرہ مقامی حد تک محدود ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی یہی سمجھا کر قائل کرنا چاہا۔ ہسپتال کے ہر ایک صوبہ سے تعلق رکھنے والے ساتھی بالخصوص میری باتوں پر توجہ دیتے تھے۔ وہ انقلاب کی حمایت کی کوئی نیت نہ رکھتے تھے۔ مجھے یقین آتا تھا کہ میونخ میں بھی اس دیوانگی کا زور ٹوٹ سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہاں خاندان اہل باش کے نوجوانوں کا رونما ہونا بہت سے یہودیوں کی خوشامد سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ میں بے اختیار اب بھی یہی یقین رکھتا تھا کہ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ستار کی طرح قبول کر رہے ہیں اب ہم را کو ہمیشہ کے دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنے اب وہاں ٹھہرنا اور کچھ سننا ناممکن ہو چکا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اپنے کمرہ میں واپس آیا اور خاموش ہو کر اپنے بستر پر گر پڑا۔ مجھے چاروں جانب تاریکی چھائی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا میں تکیہ اور کمبل کے درمیان منہ چھپا کر لیٹ گیا۔

جس روز میں نے اپنی ماں کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہائے تھے تب سے لے کر آج تک میری آنکھ کبھی گیلی نہیں ہوئی تھی۔ میرے بچپن میں جب کبھی مجھے فلک سے تارا میری خواہش مقدور سے مضبوط تر ہو جاتی۔ ساری جنگ کے دوران میں موت کی مکمل دہشت اور ساتھی ہماری صفوں سے چھین لیے گئے۔ لیکن میں نے حرف شکایت لبوں تک نہ آنے دی آنسو کبھی نہ بہائے۔ کیا وہ زندگی کے لیے جانیں فدا کر رہے تھے۔ اس دہائی جنگ کے آخری دور میں جب میں ہر بری گیس کے پنجے میں آ گیا۔ اور میری آنکھوں پر اس کا اثر ہونے لگا تو بینائی کے لیے خدا حافظ ہو جانے کے خوف سے ہوا سے ہوش خطا ہو گئے لیکن اس وقت بھی میرے ضمیر نے فی الفور مجھے للکارا اے غافل رحم و مروت تیرے جیسے ہزاروں دوسرے فرزندان وطن تجھ سے دور جنہیں تیرے ہیں کیا تو اپنی اس بے بصری پر رو دیئے بغیر رہ پائے گا۔ فرض میں نے قسمت کا لکھا سمجھ کر برداشت کیا۔ مجھے احساس تھا کہ مجھے یہی کرنا چاہیے۔ قومی مصائب کے مقابلہ میں انفرادی مصائب کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

کیا قربانیاں اکارت جائیں گی

وہ سب کچھ اکارت تھا۔ وہ قربانیاں اور وہ کھیل اکارت تھا۔ اس گت میں لاکھ پیاس برداشت کرنا اکارت تھا۔ جب موت کے ڈر سے روح کانپتی تھی تب فرض شناسی کے جذبہ سے مورچوں پر ڈٹے رہنا اکارت تھا۔ اپنے فرض کی کوشش میں میں لاکھ جوانوں نے سر کٹانا اکارت تھا۔ ذرا لاکھوں بیویوں کا تو بیوہ اور ماؤں کے

متحدہ ہندوستان سے باہر نکل پائے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ ان شہیدوں کی قبریں بہت جانی پہچانی ہیں تاکہ ان کی وہیں خون اور کیچڑ سے لتھڑی ہوئی وطن واپس آ سکیں۔ اور ان قابل نفرت غداروں سے جنہوں نے وطن کی خاطر قربان کی سب سے بڑی قربانی ضائع کر دی۔ کیا گست اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہندی سپاہی اس لیے ہوئے تھے۔ کیا اسی سال کے سوم مرس میں رضاکاروں کے رسالوں نے اپنے ہمشیروں کی نگاہ اسی لیے کی تھی۔ وہ سترہ سترہ سال کے نوجوان کیا اسی غرض سے لاکھ لاکھ کی تعداد میں مل گئے تھے۔ جن ماؤں نے مادر وطن کی خاطر جب بھرے ہوئے دلوں سے سوار کو رخصت کیا تھا اور ان کے بچے لوٹ کر آئے تھے تو کیا اس وقت ان قربانی کا یہی ثمرہ ان کے پیش نظر تھا۔ کیا یہ سب کوششیں غلط سلط تھیں تاکہ قابل نفرت مجرموں کی ایک ٹولی مادر وطن پر مسلط ہو جائے۔

پچھلے دنوں گرمی اور امس سے کروٹیں لیتے ہوئے برف باری میں کیا فرنٹی سپاہی اسی مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ کیا لوگ یوں سردی کی سختیوں کی بے قراری اور دلوں کی سلگتی ہوئی تمنا اسی غرض سے برداشت کی تھی۔ توپوں کی گولہ باری کے جہنم میں کیا اسی لیے دن گزارے تھے۔ زہریلی گیس کے حملوں میں سانس گھٹ جانا اور تڑپ اسی لیے تھا۔ حق چھوڑ بیٹھے کا غم نہ لیا ہر حد مادر وطن کو دشمن کے حملے سے بچانے کے لیے ڈٹے رہنا۔ ان شجاعت کے بیٹوں کی لوح مزار پر تو حسب ذیل کتبہ لکھا جانا چاہیے تھا

"مسافر! جب تو فرنٹی پہنچے تو دل و جان سے کہنا کہ ہم مادر وطن کو اپنے فرض سے خلاص کا حق ادا کرتے ہوئے یہاں پڑے ہیں"۔ اور اس وطن نے کیا کیا؟

میرے اندر نفرت کا تخم کھولنے لگا

پھر کیا صرف ان قربانیوں کو ہی مدنظر رکھنا ہے۔ کیا فرنٹی کی تاریخ کا کوئی تقاضا نہیں؟ کیا فرنٹی کا ماضی سے تعلق ہے؟ کیا سماج کی ماضی کی روایات میں فخر محسوس کرنے کے مستحق ہیں؟ ہم پہلی اس فرنٹ کے بعد والوں کے سامنے کیا پیش

جو زرخیز کریں گے؟

یہ جاگیروں کی کوئی کمی قابل نفرت اور نئے ہو ہے!

جو زہر وہ گزارہ تھا ت رہ ہو چکے تھے۔ جوں جوں ہم نے متعلق مزید اطلاعات فراہم کرتا ہوں توں توں میرے بدن میں آگ سی لگ رہی ہے۔ ان ناپاک ارادات کے مقابلہ میں میری آنکھوں کا رہا دیشت رکھتا تھا۔

اس کے بعد ایک دن اور ایک رات گزارنا میرے لیے دشوار تھا۔ سوراخ پر نظر جمع کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں تو زکر بیٹھ جانا ایک یہ مشورہ تھا۔ جو صرف نرم اور دماغ کو ہی دے سکتے تھے۔ بے تابی ان لمحوں میں میرے دل میں ایک نفرت کا نور کھولنے لگا۔ یہ نفرت اس بزدلانہ ارادات کے ارتکاب کرنے والوں کے خلاف تھی۔

آنے والے دنوں میں میری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہ بات اب آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو گئی تھی۔ میرا ذاتی مستقبل جس کی مجھے آج تک کبھی فکر تھی اس کی مجھے اب ذرا پروا نہ تھی۔ ایسی حیوانوں پر کسی عمارت کھڑی کرنے کی سعی فضول تھی۔ "ذکار" مجھ پر ہویدا ہونے لگا کہ یہ ہولی شدنی تھی۔ گو اسے وہ نے کوئی نہ چاہا تھا لیکن مجھے ہمیشہ اس کا انتظار رہتا تھا۔

شیشہ دو نیم ہوئی پہلا تر من تاجدار تھا جس نے مارکس ازم کے لیڈروں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ تو روس کی پیش پا مشتمل ہے جس میں وضع داری کا کوئی خیال نہیں۔ جب وہ ایک ہاتھ بڑھا کر شیشہ سے مصافحہ کر رہے تھے اس وقت کسی اس کا دوسرا ہاتھ کمر میں خنجر ٹول رہا تھا۔

بھیڑیے کے ساتھ کھوٹ کا کوئی امکان نہیں۔ یہ تو صاف صاف مرنے یا مارنے والی لڑائی ہے۔

جہاں تک میرا تعلق تھا میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اب میں سیاست میں حصہ لوں گا۔

☆☆☆

باب ہشتم :: میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز

گمنامی رازنمائی کے راستے میں رکاوٹ ہے

میں نومبر کے اخیر میں میرٹھ واپس آ گیا۔ سوچا تھا کہ رجسٹر کے کھاتے پر بیٹھا جس کا انتظام اب سپاہیوں کے ہدایت کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ چونکہ مجھے یہ کام ناپسند تھا اس لیے جس قدر جلد ہو سکا میں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی میرا زمانہ جنگ کا بیکار و بےاثر وقت مضطرب میرے سر پر تھا۔ ہم دہلی سائن آ گئے۔ ہر کیمپ لوٹنے تک یہی شمار ہے۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں ہم پھر میرٹھ لوٹ آئے۔

یہاں کی صورت حال موجودہ کی پر زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہوتھ کا کاش سیوان یہ تھا کہ انقلاب کا سیلاب رو بہ تنزل ہو جائے گا۔ اس کی موت سے یہ تبدیلی ہو رہی تھی سے وقوع ہو گئی۔ آخر کار ہر جگہ باغیوں کی ڈسپلن شکست تام ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر دو جانب بہادریوں کا رواج تھا۔ اگرچہ وہ اثر پذیر کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی لیکن در اصل انقلاب پیدا کرنے والوں کا بیوروی مقصد یہی صورت حال پیدا کرنا تھا۔

ان دنوں میں دماغ میں ان گنت تجویزیں آیا کرتی تھیں۔ میں سارا سارا دن بیٹھا یہی سوچتا رہتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر تجویز اس پتھر پر سر ٹکرا کر رہ جاتی کہ میں بالکل گمنام تھا۔ میں نتیجہ خیز عمل کے لیے پہلی ضروری شرط بھی پوری نہ کر سکتا تھا۔ میں یہ صراحت بعد میں کروں گا کہ جو سیاسی پارٹیوں اس وقت موجود تھیں میں ان میں سے کسی میں شامل ہونا کیوں پسند نہیں کرتا تھا۔

میرٹھ میں سرکاری انقلاب اپنے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ اسی دوران میں مرکزی ہدایت میری سرگرمیوں سے ناراض ہو گئی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو میری گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے۔ مجھے گرفتار کرنے کے لیے تین کارندے پہنچے لیکن جب میں نے پستول نکال کر گولی مارنے کی دھمکی دی تو تینوں بھاگ گئے۔

میونسپل کمیٹی سے آزاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے چند ہی روز بعد مجھے ایک تنظیمی کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا گیا۔ یہ کمیٹی لیبر پارٹی کی پارلیمانی جماعت میں قائم کی گئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ انتخابی سرگرمیوں پر نگرانی رکھے۔ ہم سیاسی سرگرمیوں سے مبرا نہیں ہو سکتے تھے۔

سماجی انقلاب پارٹی

ایک روز بعد مجھے بلیکروں کا ایک معمولی سا حکم وصول ہوا۔ ان بلیکروں کا اہتمام فوجیوں کی خاطر کیا گیا تھا۔ اور مقصد ایسے بیوری اصول وضع کرنا تھا کہ جس پر ایک سپاہی کے سیاسی عقائد مبنی ہونے چاہئیں۔ مجھے اس حکم کا مقصد یہ ہوا کہ سپاہی بھائیوں سے ملنے کا ایک موقع ہاتھ آیا۔ وہ بھی میری طرح سوچتے تھے۔ میں ان سے حقیقت حال کے متعلق بے تکلف تبادلہ خیالات کر سکتا تھا۔ ہم وہیں ہم سب متفق تھے کہ لوہر کے علاوہ جس حصہ لینے والے باروں کو ان فوری ضرورت سے بچانے کے لیے ہمیں جس وقت ترقی کے سرمایہ دار ہے تھے اس میں شتر ائی جمہوری پارٹی بھی شامل تھی اور اعتدال پسند پارٹیاں بھی۔ ہم سب کی یہ رائے تھی کہ اگر کھاتے پیتے طبقے کے قوم پرستوں کی جنگیں سو فیصدی ٹھیک ہوں تب بھی جو نقصان ہو چکا ہے وہ اس کی تلافی کرنے کی استعداد سے محروم ہیں۔ یہ نقصان پورا کرنے کے لیے تو امداد درکار تھی جس کے لیے یہ کام نہ ہو سکتا تھا۔ کھاتے پیتے طبقے کے قوم پرست ان لوازمات سے عاری تھے۔ ہمارے اس وقت جو رائے قائم کی تھی وہ آنے والے برسوں میں سچ ثابت ہوئی۔

ہم نے اپنے حلقہ میں ایک پارٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اس وقت ہمارے سامنے دو سوالات تھے جن پر بعد میں ہماری پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم جو تحریک چلانا چاہتے ہیں اس کے ہاتھ میں عوام کے لیے ایک کشش ہونی چاہیے۔ اگر یہی شرط پوری نہ ہوئی تو ہماری سب کوششیں اکارت جائیں گی۔ اسی نقطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے سماجی انقلاب پارٹی کا نام تجویز کیا۔ پیغام پہنچ

کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری معاشرت ان اصولوں پر مبنی کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ وہ بالکل نظرانداز ہیں۔

دولت مزدوروں کی محنت کا دوسرا نام ہے

اس کے علاوہ ایک اور اس سے بھی زیادہ بنیادی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ابتدائی عمر میں اقتصادی مسائل کا جو مطالعہ کیا تھا وہ زیادہ تر مالی حالات سے براہ راست پیدا ہونے والے اقتصادی نظاموں تک محدود تھا۔ جب میں نے بعد میں جرمنی کی انتظار معاشرہ کی پالیسی کا مطالعہ کیا تو اقتصادیات کے متعلق میرے علم میں مزید وسعت پیدا ہوئی اس پالیسی کی رو اقتصادی صورت حال کے سرسری مطالعہ کرنے سے پتہ چلتی تھی مختلف میں جرمن قوم پر ورق کہاں سے حاصل کرے گی اس مسئلہ کے حل کی ہدایات بھی دیوانے لکھے ہوئے تھے۔ سارے استدلال کی بنیاد اس تصور کو اور زیادہ وضاحت کرنے پر لگی گئی تھی کہ سرمایہ اور دولت تو کسی مزدوری یا محنت کا دوسرا نام ہے چونکہ محنت اور مزدوری پر سارے تمام حالات کا اثر پڑتا ہے جن سے انسان کو کام کرنے میں سہولت اور دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لیے سرمایہ بھی انہی حالات کے تابع ہے۔ یہ حالات حکومت اور قوم کے عروج و زوال کے پابند ہیں۔ لہٰذا سرمایہ بھی حکومت یا تنظیم قوم کے استحکام کی حکمت عملی کا تابع ہے۔ اس لیے جب قومی مفاد سے سرمایہ اور دولت کے رشتہ پر غور کرنے بیٹھیں تو یہ پہلے سے فرض کر لینا چاہیے کہ سرمایہ دار اپنے پیارے تو خود اپنے بچوں اور ترقی کی خاطر قوم اور حکومت کے وفادار ہیں"۔

اگر یہ تصور قبول کر لیا جائے تو سرمایہ سے متعلق حکومت کے فرائض واضح اور آسان دکھائی دیتے ہیں۔ حکومت کو اس سے زیادہ کچھ نہیں آتا ہے۔ کہ سرمایہ کو سلطنت کے ماتحت رکھے سرمایہ کو قومی مفاد پر غالب آنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ غرض سرمایہ کی بابت حکومت کی سرگرمیوں حسب ذیل حدود کے اندر رہنی چاہئیں۔ ایک طرف تو حکومت کا فرض ہے کہ ملک کے اقتصادی نظام کو زندہ اور آزاد حالت میں قائم رکھے۔

دوسری جانب مزدوروں کے مالی حقوق کی نگہداشت بھی حکومت کے ذمہ ہے۔

سرمایہ کی دو قسمیں

مارکس نے اس سرمایہ کی دو بھائی اقسام میں فرق کیا ہے۔ ایک تو وہ سرمایہ ہے جو کارآمد محنت مزدوری سے پیدا کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ کی ایک قسم اور بھی موجود ہے۔ سرمایہ کی یہ دوسری قسم سراسر ساہوکاری کی پیداوار ہے۔ مجھے کئی سال تک بھی اس فرق پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔ غور کرنے کا موقعہ تب ملا جب کسی ہمدرد سے میری توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول ہوئی۔

میں نے بینکروں کے اس سامان کا ذکر کیا ہے۔ اس میں سے ایک بینکر دینے والے کا نام تحریر نہیں تھا۔ اس شخص کے حالات نے مجھے بھی مرتبہ وہ کسی بہت محسوس کروائی جس سے میری توجہ سرمایہ کی دو علیحدہ انواع کی جانب مبذول ہوگئی۔

میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس شخص سے ساہوکاری اور سود خوری کے لیے استعمال کیے جانے والے سرمایہ کا حال سنا۔ اس نے ان صدموں کی بھی داستان کہی جن سے اس قسم کے سرمایہ دار کے کاروبار کا دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فیڈر کا پیدا کیا بینکر سننے کی میرے دماغ میں فی الفور خیال آیا کہ مجھے ایک نئی پارٹی قائم کرنے کے لیے وہ مصالحہ مہیا ہو گیا ہے جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

فیڈر کی طرف میری نگاہ میں پہلی کمزوری یہ تھی کہ وہ بظاہر کئی پہلی رکھنے ساہوکاری اور سود خوری سے پیدا ہونے والے سرمایہ کے دوہرے مزاج کا پوری شدت سے چاک کر دیتا تھا۔ فیڈر کا دریافت کردہ انکشاف یہ تھا کہ اس قسم کا سرمایہ ہمیشہ سود کا دوسرا نام ہوتا تھا۔ بنیادی طور پر فیڈر کے دماغ ایسے معقول تھے کہ لوگ اس پر کبھی یقین کرتے تھے وہ کبھی صولات اس کے بیانات کی صحیح تعبیر کرتے تھے۔ انہیں صرف یہ شک تھا کہ ان اصولوں پر عمل کرنا ممکن ہے۔ گویا دوسرے لوگ یہ اس کی کمزوری بیان کرتے تھے۔ لیکن مجھے جو فیڈر کے بیانات کا یہی پہلو اس کی بڑی کا قائل کرتا تھا۔

حق کی جستجو اور اس پر عمل دو علیحدہ فعل ہیں

ہر شخص ایک اصول پر اگر متفق کرتا ہے یہ اس کا فرض نہیں کہ وہ اس پر عمل کے مختلف راستے بھی بیان کرے۔ اس کا منصب محض ایک مسئلہ کا عقلی حل تلاش کرنا ہے۔ لیڈر ہو تو صرف منزل متعین کرے گا۔ راستہ ڈھونڈنا اس کے ذمہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا اس کے نتائج عملی طور پر درست ہیں یا غلط۔ رہی یہ بحث کہ ان نتائج کو عملی جامہ پہنانا آسان ہے یا مشکل۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ جب ایک اصول یا عقلی حل جستجو کرنے والے کی کاوش اور مصلحت اندیشی کی بھینٹ میں چڑھ جاتا ہے تو پھر وہ حق مطلق کی تلاش سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتائج ان لوگوں کی دسترس میں قاصر رہ جاتے ہیں۔ جو اصول راہ عقلی روشنی کے متلاشی ہوں۔ اس کی تحقیق کے نتائج بھی شب و روز کی زنجیر میں گرفتار مایوں کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی تحریک کا اصول پر قائم رہنے والے کو فقط نصب العین پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ پھر سیاسی لیڈروں کا فرض ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کا راستہ دریافت کریں۔ غرض نظری لوگ عمل کا خاکہ تیار کرنے والا صرف اپنی دماغی خلاقی ظاہر کرے گا۔ یہ عمل اس کے سیاسی لیڈروں کی سرگرمیاں ہمیشہ بھی گنجائش اور حالات کے تقاضوں کے ماتحت اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

سیاسی لیڈر اور سیاسی فلاسفر کا فرق

اصول حاصل کرنے والے کی عظمت اور اس کے نتائج کی فی نفسہ سچائی ہر عصر ہے۔ سیاسی لیڈر کی برتری کا معیار یہ ہے کہ وہ جس اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا خواہاں ہے اگلی نسلیں کہاں تک واقعات کو کامیابی تک پہنچنے کے لیے ٹھیک طرح استعمال کرتا ہے۔ اور خود واقعات کے متعلق اس کا اندازہ کہاں تک صحیح ہے۔ ہم اس سیاسی لیڈر کو جانچیں گے اس کی تجویزوں اور کوششوں پر غور کریں۔ ہم پوچھیں گے کہ کیا وہ اپنا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس کے ایک سیاسی فلاسفر

کے لئے انعام کا حصول تو کبھی ہے یہ جنت تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی عقل ان بلندیوں اور منزلوں تک پہنچ سکتی ہے۔ جہاں انسان کی کمزور اور ناقص قوتوں کی رسائی محال ہے۔ انسانی کردار کی عظمت ان بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش میں مضمر ہے۔ مگر وہ عقل کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کی چونچوں پر مذہب کی کمند ڈالنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ جتنا کوئی عقیدہ اصول سچا ہے اتنا ہی وہ زیادہ دست رس ہوگا۔ جس قدر کوئی عقیدہ زیردست ہوگا اتنا ہی اس پر عمل سے عاجز رہا ہوگا۔ کم از کم جہاں تک زیردست عقیدوں کے پورے کرنے کا انحصار بندہ پر ہے وہاں تو انسانی نظر کا یہی حال ہے۔ ایک بیوی جو شوہر کا مرتبہ اس کی تنہا ہی کی کامیابی پر منحصر نہیں۔ اس کے مرتبہ کی پہچان تو یہ ہے کہ اس نے کہاں تک حق مطلق کا انکشاف کیا اور اپنے ذاتی کائنات کے ارتقا پر کیا اثر ہوا۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم دنیا کے مذاہب کو کمتر درجہ کے انسان کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ کسی اخلاقی تعلیمات پر کبھی سو فیصدی عمل نہ ہو سکے گا۔ سو فیصدی کا کیا ذکر ان تعلیمات کا ناقص نمونہ پیش کرنا بھی بڑی بات ہے۔ جس کو ہم کسی مذہب کو ہم "دین شفیق" کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بھی درحقیقت اپنے ماں جیسی ہی کے مقابلہ کی محض ایک دھندلی عکس ہے۔ مذہبی حالات کو دین عیسیٰ کی عظمت کے پیش کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو یہی کہ اس دین نے انسانی تہذیب انسانی اور انسانی خوبیوں کا صحیح راستہ دکھایا۔ اگر اس راستہ پر چلنے میں کوئی کمی رہ جائے تو یہ عیسائی مذہب کا قصور نہیں۔

ایک بیوی کا شوہر اور ایک سیاسی لیڈر کے فرائض کا یہی وہ اہم تفاوت ہے کہ جس کی وجہ سے ان دو مختلف فرائض کو سر انجام دینے کی صلاحیتیں شاذ و نادر ہی کسی ایک شخص میں جمع ہوتی ہیں۔ چھوٹے درجہ کے سیاسی لیڈر تو بالخصوص کبھی اس جمع سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ ایمرسن نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ سیاسیات عموماً معاملات کے فن کا نام ہے۔ جن چھوٹے درجہ کے سیاسی لیڈروں کی سرگرمیوں کبھی کبھی معاملات کے دائرہ سے

تبدیل نہیں کرتیں۔ اس قماش کے پالیسی ساز ذہنی طور پر اتنے محدود ہوتے ہیں کہ ان کی کامیابی آسمان ہو جاتی ہے۔ یہ کامیابی جلد حاصل ہوتی ہے اور دیرپا ثابت ہوتی ہے اس کے منافع بھی وافر ہوتے ہیں۔ لیکن ان وجوہات کی بنا پر یہ کامیابی کبھی بھی ناقابل تسخیر نہیں ہوتی۔ اکثر یہ کامیابی بڑا حکم کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ان سیاسی مدبرین کی کارگزاری آئندہ نسل کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی وجہ یہ ہے کہ یہ کامیابی فوراً حاصل ہی ہم سے کل کو پس پشت ڈال کر کی جاتی ہے۔ غور و فکر کا معیار اتنا پست رکھا جاتا ہے کہ یہ غور و فکر کے نتائج آئندہ نسلوں کے حالات پر حاوی نہیں ہوتے۔

چھ چھ کے پیالے اور تم کو کی چھم کا پیالہ

ایسے لوگ جن کی پیروی کرنا تو آئندہ نسلوں کے معمار کا کی ذمہ داری رکھے ہوئے ہیں وہ سیاست کاروبار نہیں۔ جو شخص پیمبر کرنے نکلتا ہے سے شاذ و نادر ہی عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ عوام سیاسی اقتدار کو ہمیشہ چھ چھ کے پیالے اور تم کو کی چھم کے پیالے سے ناپتے ہیں۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی عوام کبھی بھی پروا نہیں کرتے یہ کہ اس کا فائدہ آنے والی نسلوں کو پہنچے گا۔ اور وہ کبھی معلوم نہیں کر سکتے۔

جبلت اور فطرت قریب تر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہوشیار سیاسی مدبرین مستقبل کی بہتری کی تمام تباہی سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد مشکل ہو۔ دراصل اس تدبیر کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔ کہ انہیں اپنی ناکامی ہر دھڑی کی صورت ہو جانے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے سیاسی مدبرین اس لائق ہوتے ہیں۔ وہ مستقبل کے لیے کوئی ہدایت نہیں رکھتے۔ چھوٹے حوصلے کے لوگوں کو اس وقت کی پروا نہیں ہوتی وہ تو وقت گزارنے میں لگے رہتے ہیں اب کی بار کے ساتھ وہ رب کی خدا جانے۔

قیمہ بھرے رکھنے والے یہ سیاسی مدبر سنگری پوزیشن اس سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ اس کی کارگزاری تو مستقبل کے بلڑے میں تلتی ہے وہ آنے والے زمانہ کے خواب دیکھتا

ہے۔ وہ تیتی کاشی کی طرح دنیا کے تغیر سے دور رہتا ہے۔ سیاسی مدبرین کی قابلیت مملکت کا تعین کرنے کی مہارت میں مضمر ہے۔ وہ یہ سیاست دان جو تاریخ کو صرف اس لیے پڑھتے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ مملکت کی تمنا اور مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں شہرت سے محروم رہتے ہیں۔ ہاں اگر ان کی تعلیمات باقی رہتے والی ہیں تو وہ آنے والی نسلوں سے ضرور خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔

عدالتوں عدالتوں نے انسانیت کے دامن میں کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ سیاسی مدبر اور سیاسی فلاسفر دونوں کے جوہر ایک ہی ہستی میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسی شخصیت میں دونوں قابلیتوں کی آمیزش جتنی مکمل ہو گی۔ اتنا ہی اس کا سیاسی کام زیادہ دشوار ہو گا۔ ایسا شخص جس مقاصد کے لیے سرگرم عمل ہوتا ہے وہ ہر ایسوں کے دل میں گھر نہیں پا سکتے وہ تو ایسے ایسے مقامات میں جا نکلتا ہے جن کی تڑپ اکا دکا بیرے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کی زندگی کلفت اور محنت کشیدگی میں پایان ہو جاتی ہے۔ ایک طرف اس کے معاصرین اس پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا اپنا قلب آنے والی نسلوں کی قدر دانی سے بے نیاز رہتا ہے۔ آنے والی نسلیں ہی اس کی صحیح قدر بھی پہچانتی ہیں۔

آنے والے زمانہ کے لیے کسی شخص کی خدمات جس قدر زیادہ مرتبہ ہوں گی اتنا ہی وہ اپنے معاصرین کی قدر شناسی کا گلہ رہے گا۔ اسی تناسب سے اس کی جدوجہد زیادہ مشکل ہو گی۔ اسی اندازے کے مطابق اس کی کامیابی کا امکان بھی کم ہو گا۔ کوئی ایسا شخص صدیوں کے بعد کامیاب ہو جائے تو وہ بھی کبھار اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے آنے والی شہرت کا بالکل عکس جیتے جی ہی دیکھ لیتا ہے۔ ورنہ اکثر ایسی عظیم شخصیتیں اپنی قربانیوں کے پھل سے محروم رہتی ہیں۔ اگر معاصرین میں کسی ان کے لیے پھولوں کے ہار بھی لے آئیں تو یہ صورت ہمارے لیے کے وقت ہی آتی ہے۔

زمانہ کے دشمن لوگ وہ ہوتے ہیں جو معاصرین کی قدر دانی سے محروم رہ کر بھی اپنے

طبیعت اور کائنات کے بارے علم حاصل کرنا زندگی بسر کرتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لیے ایسی ہی شخصیتوں کی یاد سے معمور رہیں گے۔ جب ہر فرد یہی محسوس کرے گا کہ اس عظیم قوم کے معاصرین نے اس کی جو بے قدری کی تھی اب وہ گویا اس کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ ان عظیم ہستیوں کی وفات کے بعد ان کی زندگی اور خدمات کا مطالعہ وقت گزاری اور مدح خوانی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جب کسی قوم پر گھٹن گھڑی آتی ہے جب نامعلوم کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے دلوں کا سہارا ایسے ہی عظیم مایہ ناز لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کے تذکرے سے مایوس قوم میں نئی امنگ اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔

سود کی غلامی سے نجات

اس فہرست میں نہ صرف تمام بلند مرتبت سیاسی مدبر شامل ہیں جو صحیح معنوں میں ایسا کہلانے کے مستحق ہیں بلکہ ہر اعلیٰ پایہ کا مصلح بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ مثلاً فریڈرک لسٹ، کارلائل، لوتھر اور چارلز ڈکنز۔

گو فریڈرک لسٹ کے پہلے پہلے جگر کا عنوان تھا "سود کی غلامی سے نجات" لیکن جس نے یہ جگر سنا مجھے اسی وقت یہ یقین ہو گیا کہ اس جگر میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ جرمن قوم کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر قوم کی اقتصادی زندگی کو ایک دفعہ سٹہ بازی سے پیدا ہونے والے سرمایہ سے پاک کر دیا جائے تو پھر جرمنی کے تجارتی کاروبار کو بین الاقوامی اثرات سے بچایا جا سکے گا۔ یعنی جرمنی کے تجارتی پروگرام پر بین الاقوامی ہونے والوں کا کوئی قابو نہ رہے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس طریقہ پر چلنے سے فی الحال سرمایہ کو نقصان نہ پہنچے گا۔ اور نہ سرمایہ بالکل ختم ہو جائے گا تو ہمارے قومی اقتصاد کو ضرور پیدا ہو جائے گا۔ جرمنی کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے وہ مجھ پر آئینہ کی طرح روشن ہو گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ بین الاقوامی سرمایہ کے خلاف ہماری جدوجہد بھی بیکار نہ ہو گی قوم کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے جو مقصد مطلوب تھا وہ فریڈرک لسٹ نے مجھے مہیا کر دیا۔

یہاں پھر بعد کے واقعات سے میری اس وقت کی رائے کی تصدیق ہوئی اور سے کھانے پینے طبقہ کے سیاست دانوں میں سے کوئی آج تک اس موضوع پر اور مذاق اڑانے کی ہمت نہیں کرتا۔ یہ بڑے بڑے لوگ اگر دل کی بات مان لیں تو حقیقت ہے کہ وہ کھل چکے ہیں کہ میں واقعی سرمایہ داری سے پیدا ہونے والا سرمایہ جنگ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اب جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی بات کے زمرہ میں ان کو مجرم کا نمونہ بنا رکھا ہے۔

سود خواری اور سرمایہ داری دشمن ہیں

جس قوم نے حریت اور اقتصادی آزادی کے لیے جو جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ اس کے پروگرام میں بین الاقوامی سرمایہ داری اور سودی قرضے کے خلاف جہاد اہم ترین مد ہے۔

جو لوگ اپنے آپ کو بعض مصلحتوں کے ماتحت کہہ کر اس اعتراض کیا کرتے ہیں ان کے لیے مسلم لیگ کا جواب کافی ہے۔ سودی سرمایہ کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے خلاف موجود اقتصادی تنگی کے تمام خدشات لاحق ہیں۔ پہلے تو یہ سوچنا چاہیے کہ جن اقتصادی اصولوں پر آج تک عمل درآمد ہوتا رہا ہے وہ جس قوم کے حق میں کون سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ جس اقتصادی مرض سے آج اس قوم کا وجود دوچار ہو رہا ہے جب اس کے لیے کوئی نیا علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ تو اس قسم کے اعتراضات سننے میں آتے ہیں کہ جو اس وقت کیے جاتے تھے۔ جب ریل پہلی دفعہ ایجاد ہوئی تھی مثال کے طور پر ہوریا کے علمی کالج کے ماہر معیشت نے ریل کے سفر کے خلاف مشورہ دیا تھا دانش مندوں کی اس مجلس نے ان خدشات کا اظہار یا تھا ان میں سے ایک خدشہ بھی پورا نہ ہوا۔ نہ تو بھاپ کے گھوڑے پر سوار ہونے والوں کو وہاں سر کا درد لاحق ہوا۔ نہ ہی اس پاس کھڑے ہونے والوں میں کوئی بیماری پھیلی۔ حتیٰ کہ ریل کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے شروع شروع میں اس کی دونوں طرف اونچی دیواریں کھڑی کیے گئے تھے۔

بھی بالکل اتار دیے گئے۔ یوں جو پردے "مارکس" کی عقل کے پڑے تھے وہ آج بھی
بدستور باقی ہیں۔ "مارکس" کی فکر کے ہوں یا اس کی عقل کے پردے ہمیشہ پڑے رہتے
ہیں۔ ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے ہر اصول حقیقت کسی مقصد کے حصول کا
ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے حصول کو مقصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود کوئی مقصد
فرض کر لیا جائے تو وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتا ہے۔ میں ہوں یا نیشنلسٹ
سوشلسٹ پارٹی کا کوئی دوسرا رکن ہمارے نزدیک مقصد فقط مادر وطن اور قوم کی سربلندی
ہے۔ باقی تمام اصول صرف حصول مقصد کے ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہماری جدوجہد کا منشا یہ ہے کہ ہماری نسل بھولوں پر مرے۔ ہماری قوم کو پھولے
پھولے اور بڑھنے کے وسائل میسر ہوں ہمارے بچے پیٹ بھر سکیں۔ ہماری قوم کا خون
غیروں کی آمیزش سے محفوظ رہے۔ مادر وطن کی حریت اور استقلال بحال ہو جائے۔
مختصر یہ کہ خالق نے ہماری قوم کو جس حیثیت کے لیے پیدا کیا ہے وہ پوری کی جائے۔

عقیدت اور فکر کی تمام قوتیں اخلاقی اور علمی کی ساری صلاحیتیں صرف اس مقصد کے
لیے وقف ہونی چاہئیں۔ ہر معاملہ کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اسی طرح کوئی
اصول ہمارے لئے کارآمد ثابت ہو گا۔ ہر اقدام کا فیصلہ اور عمر کی زندگی کی عملی
ضروریات کے پیش نظر کیا جائے گا۔

یوں تو فریڈیگر کی رائے نے مجھے ایک ایسے مسئلہ کی جذباتی تحقیق کرنے پر مجبور
کیا جس پر آج تک میں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔ نہ اس سے قبل میں اس مسئلہ سے
دوچار ہوا تھا۔

اس یہودی بچہ کارل مارکس کی اصل شرارت

میں نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ پھر مطالعہ شروع کیا۔ اب مجھے پہلی دفعہ ٹھیک پتہ
چلا کہ اس یہودی بچہ کارل مارکس کی ساری زندگی اسی جدوجہد کا اصل مفہوم اور مقصد کیا
تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی کتاب "سرمایہ" میری سمجھ میں آئی۔ اس روشنی میں یہ مسئلہ

بھی عمل ہو گیا کہ جمہوری نظر کی اقتصادیات کے قومی نظام کی ہر صورت کی مخالفت کیوں کرتے ہیں اس جنگ سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ہیں بقومی سرمایہ داری سے پیدا ہونے والے سرمایہ کا تحفظ کرنے کی طرح مسلط ہو جائے۔ بیگمروں کا یہ سلسلہ ایک اور پہلو سے بھی میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوا۔

ایک روز میں نے بھی یہ نام اسٹیج میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں لکھوا دیا۔ ایک اور صاحب بھی اسٹیج میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کو زعم تھا کہ سیاسیوں کی حمایت میں بڑی دھواں دار تقریر کریں گے۔ پہلے کچھ لوگوں نے سیاسیوں کی حمایت میں بڑی ہی پھیکی تقریر شروع کر دی۔ حاضرین کی طرف سے کھلبلاہٹ نے میرے دماغ کی تائید کی۔ اس سارے قضیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی روز بعد مجھے میونخ کے ایک رجمنٹ کا "تابعدار" مقرر کر دیا گیا۔

ان دنوں سپاہیوں میں عاجلت کا جذبہ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ درمیانی عرصہ میں ہوکو ہی کے پیغامبروں کی سرگرمیوں کا رنگ خام ہونے کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ گزشتہ "نومبر کی بے وقت کاوش" کے دوران میں عسکری نظم و عاجلت کی جگہ ایک کی طلاق کھڑی کی گئی تھی۔ رضاکارانہ عاجلت اس رضاکارانہ عاجلت کی جگہ فوجی نظم و نسق اور سرخ فوجی نظام سے ہی قائم کیا جا سکتا تھا۔ سپاہیوں میں سب وطن اور قومیت کے جذبات بھر سے بیدار کرنے کی ضرورت تھی۔ میرے سامنے فوراً اصل کام دو مقاصد کی تکمیل پر مشتمل تھے۔

میں نے تقریریں شروع کر دیں

میں نے بڑی مستعدی اور خوشی سے یہ کام شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مجھے سامعین کی خاصی تعداد کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یوں تو مجھے پیشہ ہی سے قبول تھا کہ میں تقریر کا ملکہ رکھتا ہوں لیکن تجربہ سے میرا یہ قبول پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔ سپاہی کیمپ ہوسٹلے سے ہال میں جمع ہو جاتے۔ میری آواز اب اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ میں جو بھی

ریاں کرتا ہوں کے ہر گوشہ میں بیٹھے ہوئے لوگ کھو جاتے تھے۔

مجھے اس سے بہتر اور کیا کام مل سکتا تھا۔ قومی دنوں میں فوج مجھے دل سے عزیز تھی۔ اب میرے لیے سوفیصد فوج سے سبکدوش ہونے سے قبل اس ادارے کی کچھ مفید خدمت بجا لاسکوں۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ میری تقریریں کامیاب رہتی تھیں۔ میرے سامعین سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہم وطن فوج اور عوام کے معمول میں واپس لوٹ آئے۔ میں نے ان سپاہیوں کی جو سے قومی کاز کو بحال کر دیا۔ پھر جب بحال کر میں نے ملک کا نظام بحال کرنے میں مدد دی۔

یہیں مجھے کئی پرانے ساتھیوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا جو ہمارے ہمراہ یال تھے۔ کئی سے کئی اس پہلے تھے کے بعد ان کے۔ جس سے پتہ ایک آگے چلتی۔

☆☆☆

سپاہی انقلابیوں کے ہتھے نہ چڑھے

ایک روز مجھے اپنے افسر من اعلیٰ کی جانب سے ایک انجمن کی طرف سے تحقیقات کرنے کا حکم ملا۔ تحقیق یہ کرنا تھا کہ یہ کس قسم کی انجمن ہے۔ ظاہر ہوا ایک سیاسی انجمن معلوم ہوتی تھی۔ انجمن کا نام جرمن مزدور پارٹی تھا۔ عنقریب ہی اس انجمن کا جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔ جلسہ میں گوٹفرائیڈ فیڈر نے تقریر کرنا تھا۔ مجھے حکم ملا کہ میں شرکت کروں اور صورت حالات کے متعلق حکام بالا کے سامنے ایک رپورٹ پیش کروں۔

ملٹری حکام کو ان دنوں سیاسی انجمنوں کے متعلق جو تجسس رہتا تھا اس کی معقول وجوہات تھیں۔ انقلاب کے بعد سپاہیوں کو سیاسیات میں عملی حصہ لینے کی جو عادت پڑ چکی تھی۔ اس عادت کا استعمال زیادہ تر فوجی کرتے تھے۔ انجمنیں سیاسیات کا ذوق بھر تقریر یہ تھا۔ اعتدال پسند پارٹی اور جمہوری شوریٰ کی پارٹی تعلیم تو کر ہی چکے تھے ہاں ان کی مرضی کے خلاف آخر واقعات نے انہیں یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ سپاہیوں کی ہمدردیاں انقلابی پارٹی سے ہٹ کر قومی پارٹی اور قوم پرستی کی تحریک کی جانب مائل ہو رہی ہیں۔ اب انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں سوشلسٹ کا سیاں سوشلسٹ اپنا رسوخ انہوں نے فوج سے چھین لیا ہے دوبارہ بھی واپس نہ لے لیں۔ اور یہ بھی سرگرمیوں کی بھی مخالفت کرتی۔

اعتدال پسندوں اور رجعت پسندوں کی باہمی پیوند کاری کا عمل جاری تھا۔ فی یہ ہے کہ گروہ سپاہیوں کے شوریٰ حقوق کلیتاً ختم کرنے تو چاہتی تھی لیکن اس حکومت کا ہٹ کر دیا جانا۔ جو نومبر ۱۹۱۸ء میں قائم ہو گئی تھی۔ ایسا ہو جاتا تو قوم کی ذلت اور بے عزتی کی گھڑیاں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتیں۔ شوریٰ حقوق" سے مراد وہ سیاسی حقوق تھے جو انقلاب کے بعد فوجیوں کو دلا دیئے گئے تھے۔ ان دنوں سپاہی اس بات کے خواہاں تھے کہ قوم کو ایسے نمائندے منتخب کرنے کا موقع ملے جو ہمارے آستین سے نجات دلانے کے لئے

جنہوں نے ملک کے اندر دشمن کے بالمقابل اپنے فرائض سر انجام دیے تھے وہ قدم اٹھائیں جو اس مقصد کے لیے بہترین ہو سکتا تھا۔ سر صرف ایک ہی راہ کھلی تھی کہ الیکشن میں وہ امیدوار جو سابق فوجیوں نے نامزد کیے تھے، ان کی حمایت کی جائے۔ اس فیصلے کے حق میں بڑے جوش سے ووٹ دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ فوج قومی زندگی کی نظر انداز کرنے سے عاجز رہی۔ یوں تو یہ بات ہو گئی کہ کسی ذمہ دار عنصر کو مداخلت کرنے کی روک تھام کرنے کا یہ مہلک انجام ہوتا ہے۔

قوم پرستی کا جذبہ فوج کے لیے ضروری ہے

کھاتے پیتے متوسط طبقہ کا ذہن ایسا کبیر کا نظریہ اپنا چکا تھا کہ وہ بے چارے زمانہ سے پیچھے رہ گئے تھے وہ ابھی تک اس وہم میں مبتلا تھے کہ فوج بھی پہلے کی طرح ہے جس فوج کا ہر ایک سپاہی قوم کے لیے ایک حصار کا کام دے سکتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ اعتدال پسند پارٹی کا مقصد وحید یہ تھا کہ فوج میں سے قوم پرستی کا ذہن نکال دیا جائے حالانکہ جب کسی فوج میں قوم پرستی کا جذبہ نہ ہو تو فوج ملک کے اندر کوئی شر کے فرائض انجام دیتی رہے۔ لیکن اور ایک عسکری تنظیم کے کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ برگز نہیں کر سکتی۔ بعد کے واقعات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح ثابت ہو گئی۔

شاید ہمارے وہ ہم نوا قوم پرست لیڈر اس مغالطہ میں گرفتار تھے کہ قوم پرستی کے علاوہ فوج کی ترقی کسی دوسرے رخ پر بھی ممکن ہے۔ یہ مغالطہ اس وجہ سے ممکن تھا کہ وہ جن جنگ میں وہ ملوث ہوئے تھے کی بجائے روایتی طرز جنگ میں مصروف رہے تھے۔ وہ مغالطہ دیگر وہ تو عظمت رفتہ کی یاد دلاتی تھی وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ کہ ایک دن ایسا بھی تھا کہ جب ہندوستان کی دیہاتی دنیا کے سنگھوں کی صف میں شمار ہوتا تھا۔

ایک نئی پارٹی

میں نے اس پارٹی کے جلسہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جس تک مجھے اس پارٹی

کے حالات کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اس روز شام کو جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو کچھ ہی تعداد میں حاضرین موجود تھے۔ جن کی اکثریت غریب طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ جلسہ گاہ میں ایک ساقی شراب خانہ کے گاہکوں کے جھٹکے والے کمرہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس شراب خانہ کا نام سزگری بڑی پوری تھا۔ آج یہ عمارت ہماری تحریک کے لیے ایک تاریخی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

فیبیان کے لیکچر کا مضمون تو پہلے سے مجھے معلوم تھا کیونکہ لیکچروں کے اس سلسلہ کا عنوان ہی تذکرہ دیا گیا ہے۔ میں اس میں اس کا لیکچر سن چکا تھا۔ اس لیے میں نے پوری توجہ سے انجمن کے کوائف کا مطالعہ شروع کر دیا۔

اس مطالعہ کو کئی سے گھڑی بھر ہی ہوا ہو گا کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان دنوں جو بہت سی دوسری انجمنیں بنائی جا رہی تھیں۔ انہیں میں ایک انجمن یہ بھی تھی۔ ان دنوں ہر شخص جو صورت حالات سے برگشتہ ہو کر موجودہ پارٹیوں سے بدگمان ہو جاتا۔ وہ ایک نئی پارٹی بنا لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ چاروں جانب نئی انجمنیں قائم ہو رہی تھیں۔ اور پھر بدقسمتی یا نتیجہ کے اس تجزیہ سے ختم بھی ہو جاتی تھیں۔ یہ انجمنیں ایسی انجمنوں کے بانی بہت سے لوگوں کو کسی تحریک یا جماعت چلانے کی غرض سے جمع کرنے کے لیے اصولوں سے سراسر ناواقف ہوتے تھے۔ ان انجمنوں کے ختم ہو جانے کی وجہ یہ صحیح صورت حالات کے تقاضوں پر قابو پانے کی قابلیت مفقود تھی۔ ان کی اس کوتاہی پر قائم کرنے کو جی چاہتا تھا۔

میری پہلی سیاسی تقریر

قریباً دو گھنٹہ تک جلسہ کی کارروائی دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ انجمن مزدور پارٹی کی اس دوسری انجمنوں جیسی ہی ایک انجمن ہے۔ جب فیبیان نے لیکچر ختم کیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں انجمن کا مطالعہ ختم کر چکا تھا۔ اور جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ مجھے کہا گیا کہ جو شخص سوال کرنا چاہے اسے مذاکرہ کا آغاز کرنے کی

جارت ہے۔ یہ سن کر میں بھی ٹھٹھر گیا۔ بحث ابھی کسی تعاقل ذکر واقعہ کے جاری تھی کہ
) یک بہ دفعہ پروفیسر صاحب نے ٹھوکر کو بڑھ کر طمانچہ شروع کر دی۔ فیاض نے جو پوچھا تھا پہلے
تو لوگوں نے اس کے متعلق شک کا اظہار کیا۔ فیاض نے ایسا جواب دیا کہ پروفیسر
صاحب کا منہ بند کر دیا۔ یہاں پروفیسر نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا کہ بحث کی بنیاد
"حقائق" کی بازیابی کرنے سے قبل پروفیسر نے اس نئی انجمن کو یہ تاکید سے
مشورہ دیا کہ وہ اپنا کوئی نیا نام تجویز کر دینے کا مطالبہ پارٹی کے پروگرام میں ایک اصولی
شق کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔ پروفیسر بڑی خود فریبی کے انداز میں اصرار کر رہا تھا
کہ اس طرح آسٹریا کے اس لفظ میں ڈس "ہاری کی کراہت ہے اسے پوری طرح حق
کرنا آسان ہو جائے گا۔ ہوں اس کا کلام چلا ہی رہا تھا کہ پروفیسر نے ایک
سی کی اور مباحثہ ختم ہو گیا۔ اس مرحلہ پر میں نے بھی بولنے کی اجازت
حاصل کی۔ جب میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو اس قماش کی مخلوط کی ہیئت جو کچھ میرے
دل میں تھی کہہ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صدر پروفیسر بھگی بلی اس کرسی سے ایک لفظ کہے
بغیر کود کے بھاگ گئے۔ میں بول رہا تھا اور محض ہر تین گوش تھے اس کے چہرے قہر کی
تصویر تھے۔ جب میں بے تکلفی کر کے جلسہ سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو ایک
شخص نے جلدی سے میرا تعاقب کر کے مجھ سے اپنا تعارف کرایا میں نام تو بھول گیا
لیکن اس نے میرے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا جو کوئی رسالہ معلوم ہوتا
تھا۔ اس نے بڑے خلوص کے ساتھ مجھ سے درخواست کی کہ میں اس رسالہ کو ضرور
پڑھوں۔

میں نے خوشی رسالہ لے لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جلسوں میں فضول مارے مارے
پھرنے کے بجائے اس رسالہ سے انجمن کے متعلق تمام کوائف معلوم ہو جائیں گے۔
علاوہ ازیں میں نے اس شخص سے جو کہ شکل و ہیئت سے مزدور نظر آتا تھا بہت اچھا تاثر قائم
کیا تھا۔ اس کے بعد میں ہال سے باہر آیا۔

مجھے پوچھے بغیر پارٹی کا ممبر بنا لیا گیا

ان دنوں میں دوسری پیدل رجمنٹ کی بارکوں میں مقیم تھا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس پر اتھارٹی نے اپنے واضح نقوش چھوڑ دیے تھے۔ میں وہاں کھڑکی کے پاس بیٹھا لکھ رہا ہوتا۔ باہر میں بھلے نظارے ہوتے۔ اسّی نوّے گز کی پیدل رجمنٹ کی قواعد کا وقت ہو جاتا۔ وہاں میں ایسے جلوس اور پیکجوں میں شرکت کرنے روانہ ہو جاتا جو فوج کے کسی دوسرے شعبہ میں منعقد ہو رہے تھے۔ میں اپنی قیامت گاہ پر صرف رات بسر کرنے آتا تھا۔ ہر روز صبح کو کھڑکی کے پاس ہی کھل جاتی تھی۔ میرے چھوٹے سے کمرے میں کئی کئی چڑیاں کھیلتی رہتی تھیں۔ مجھے عادت ہو گئی تھی کہ میں ان کی حرکتیں دیکھ کر دل بہلاتا۔ میں مشکل روٹی کے چھوٹے ٹکڑے بچے کھچے کمرے کے فرش پر پھینک دیتا تھا اس طرح لمحوں سے لطف اندوز ہونے کی جانوں کا قرض اور کھیل کود دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کئی مختلف جگہوں پر رہائش کی تھیں کہ میں وقت کے معنی خوب سمجھتا تھا۔ اس کمی کی تلافی کو پیدا کر کے جو میرے اندر پیدا ہو گئی میں اس کا پورا تصور کر سکتا تھا۔

جس جگہ کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس سے لگے ہوئے صحن پختہ میں بچے اسٹرٹ میں بھاگ رہا تھا۔ اور چڑیوں کے جھنڈ ایک دوسرے پر جھپٹتے لے جانے کی کوششوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ خیال آتا کہ آج کا دن بہت اچھا ہے۔ یہ بھی مجھے وہ لطف یاد آیا جو جب میں ایک مزدور لے رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا لطف تھا۔ اس کا مصنف وہی مزدور تھا۔ اس رسالہ میں اس نے بیان کیا ہے کہ کس طرح اس نے کیڑے مکوڑوں کے لگی کو کھڑکی کے شیشے میں ایک دفعہ پھنس کر اپنی جان دینے سے بچانے کی اور کس طرح اس کا ساتھی قوم پرستی کے نصب العین پر دوبارہ قائم ہوا۔ اسی بنا پر رسالہ کا نام بھی "بھوری سیاہی بھوری" رکھا گیا تھا۔ میں نے مطالعہ شروع ہی کیا تھا کہ لطف نے میری توجہ جذب کر لی۔ میں نے پورا رسالہ دلچسپی سے پڑھا۔ یہاں جو سرگزشت بیان کی گئی تھی وہ اس سال تھی کی میری روایت سے مختلف نہ تھی۔ جب جو کچھ مجھ پر گزری تھی اس کا تجربہ

ب اس مزدور کو ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ جیب کی طرف بڑھ گئے۔ اس روز دن میں کئی مرتبہ مجھے اس پمفلٹ کا خیال آیا جو میں نے اس میں سے کوئی حاصل کیا تھا۔ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ لیکن ہر بار میں نے یہ سوچ کر اسے محو کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کو اب ایک ہفتہ گزر چکا تھا کہ مجھے ایک پوسٹ کارڈ ملا۔ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ مجھے ترکش مزدور پارٹی کا ممبر بنایا گیا ہے۔ مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ اس خط کا جواب فوری کروں۔ نیز اگلے ہفتے کے روز پارٹی کی مجلس عامہ کے اجلاس میں بھی شامل ہو جاؤں۔

ممبر حاصل کرنے کی اس ترکیب سے تو میں ہنس پڑا۔ مجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر تصاویر اور انگلی کی بجائے کیا قدم اٹھایا جائے۔ آج تک میرا ارادہ کسی موجودہ پارٹی میں شامل ہونے کا نہ تھا۔ بلکہ میں خود ایک پارٹی قائم کرنے کی تجاویز سوچ رہا تھا۔ کمیت کی اس قسم کی دعوت آج مجھے موصول ہوئی تھی اس قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

پہلے میں نے تو ہر ہی جواب بھیجنے کا ارادہ کیا۔ پھر تجسس کی خواہش نے مجھے مجبور کیا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ آج مقررہ جلسہ میں شامل ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اپنے آدمیوں کو میں خود اپنے رویہ سے آگاہ کر سکوں۔

پارٹی کا دوسرا اجلاس

وہ بھی آ گیا۔ آج کا جلسہ پھر ایک شراب خانہ میں منعقد ہوا تھا۔ جس کا نام "اتے روزن ہاف" تھا۔ اور جو ہوں سڑاسے کے بازار میں واقع تھا۔ ایسے اکھڑی رواج تھا کہ شراب خانہ میں کبھی کبھار کوئی مجلس یا جلسہ کا بھی آ جاتا ہوگا۔ 1919ء میں یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی طوائف کی کمی تھی۔ یہ طوائف دنیا بھر کی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گاہکوں کی کشش کا کوئی سامان نہ تھا۔ بہر حال اس شراب خانہ کا تو میں نے نام بھی آج پہلی مرتبہ سنا تھا۔

میں داخل ہوا تو گاؤں کے چبوترے کے کمرہ میں روشنی کا انتظام بھی ٹھیک نہ تھا۔ ایک گاؤ تک موجود تھا مگر وہ تک پہنچنے کا راستہ میں نے مشکل سے تلاش کیا۔ یہاں محفل منعقد ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک دھندلے گیس لیمپ کی روشنی میں چار نوجوان ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک پھلات کا معلم تھا اس نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے ان مزدور پارٹی کے ایک جلسہ کی صدارت سے فوراً آمد پر کہا۔

جب مجھے بتایا گیا کہ پارٹی کے "صدر اعظم" بھی تقریب میں آئے تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ بہر حال میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کوئی امکان میں اپنے جذبات ظاہر نہ کروں گا۔ مگر صاحب صدر بنگ کے یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے انتخابی تقریر کے موقع پر سڑکر برنی جوری کے شراب خانہ میں جلسہ کی صدارت فرمائی تھی۔

میں کارروائی شروع ہونے کے منتظر تھا میرا تجسس کا شوق اور بڑھ رہا تھا۔ اس سارے ہنگامہ کی تہہ میں جو لوگ کام کر رہے تھے مجھے اب ان کے نام معلوم ہو چکے تھے۔ انجمن کے قومی صدر اعظم کا نام گرانی مسٹر بارتھا۔ صنعتی مزدوروں کے صدر کا نام ملس ڈاکسلارتھا۔

عنایت جلسہ کی کارروائی پڑھ کر سنائی گئی۔ سیکرٹری نے حساب ظاہر کرنے کے لیے ایک قرارداد پیش کی۔ خزانچی صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی انجمن کے پاس روپے کی نقد رقم موجود تھی۔ خزانچی کو بھی یقین دلا دیا گیا کہ اسے اس رقم کا اختیار حاصل ہے۔ یہ قرارداد روئیداد میں درج کرنے کا فیصلہ ہوا۔ صدر نے جو تین خطوط کے موصول ہونے کی خبر سنائی تھی۔ ایک خط کیل کے شہر سے آیا تھا دوسرا ڈن ڈرونف سے آیا تھا۔ اور تیسرا برلن سے بھیجا گیا تھا۔ حاضرین نے تینوں خطوط کے جواب سے لائق رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے خطوط پڑھے گئے۔ ان کی تعداد اکیس تھی۔ ایک کیل سے دوسرا ڈن ڈرونف سے اور تیسرا برلن سے۔ حاضرین نے ولایت سے خطوط موصول

ہونے پر بہت خوش نظر آتے تھے۔ بلطوطی پر تھا اور دوسرے تھے وہ تو تھے جمہوری پارٹی کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا پتہ دیتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بعد تاریخ کے جمہوریت کی تعمیر ہے ہر لمحہ بحث مباحثہ ہوتا رہا۔

یہ تمام کارروائی بے انتہا صبر آزما تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سبزی منڈی کی ہے تجھ کب تک سن رہے ہیں کیا مجھے بھی اسی طرح اعلیٰ کمیٹی کی رکنیت کی دعوت دی جارہی تھی؟

اس کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔ یہ کوہا مجھے یاد میں پھنسنے کا جلسہ تھا۔

پارٹی رہنمائی کی محتاج تھی

میں نے سوالات پوچھنے شروع کیے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں تو سوائے چند عام اصولوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی پروگرام ہے نہ کوئی پالیسی ہے۔ کوئی شے مطبوعہ نہیں۔ ممبر شپ کا کوئی کارڈ نہیں۔ حتیٰ کہ پارٹی کی ممبر بھی نہیں۔ سوائے ایک بیچ اور ایک اور دوست کے باقی کچھ نہیں۔

اب میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں۔ کیونکہ سارا اضطراب اس چار دیواری میں پھیلی ہوئی ہاں کامل اور پارٹی تعلق کی شہادت نہ دے رہا تھا جو تمام سیاسی پارٹیوں کے پروگرام تنظیمات اور سرگرمیوں کی بہت قوت میں پھیل چکی تھی۔ یہ انجمن بنانے کی کوشش بظاہر مضحکہ خیز تھی۔ لیکن جو نوجوان اس کوشش میں مصروف تھے ان کے جذبات بے اندرونی پکار کو بیک کہہ رہے تھے۔ یہ انوار عشق کے راستہ سے نہیں بلکہ ضمیر کے واسطے سے ان نوجوانوں کو بتا رہی تھی کہ پارٹی بازی کا جو کام آج تک چلا آیا ہے۔ اس میں اب یہ سکت نہیں کہ وہ ان قوم کو پھر سے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ نئی پارٹی بازی کا پیغام ملت اسلامیہ کے ان تقاضات کی ترجمانی کر سکتا ہے جو آج تک قوم کے دماغی محور پر کارفرما رہے ہیں۔ جنہوں نے اسے پہچانے ہیں۔ پارٹی کا منشور ان اصولوں پر مشتمل تھا

میں نے بھرپور ان کا مقابلہ کیا۔ یہ اصول ناپ شدہ صلاحیت پر مبنی تھے۔ یہاں پھر میں نے محسوس کیا کہ کمزوری ہے اور کمتری بھی لیکن جو جذبہ و جوش ہے اس کی نوعیت کا کچھ اور نہیں۔ میں خود بھی کبھی ایسی جذبات محسوس کر چکا ہوں اس کے ساتھ یہ دلکام کر رہے ہیں۔ آج قوم کو ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو صرف ایک پارٹی ہی نہ ہو۔ آج تک ہم سیاسی پارٹیوں کا جو مصب سمجھتے آئے ہیں اب اس قسم کی پارٹیوں کا وقت نہ رہا ہے۔

اس روز شام کو جب میں خونی پارکوں کے بعد اپنے کمرہ میں داخل ہوا تو میں اس انجمن کے متعلق ایک واضح رائے قائم کر چکا تھا۔ میری زندگی کا مشکل ترین مسئلہ میرے سامنے تھا کیا میں اس پارٹی میں شامل ہو جاؤں یا انکار کر دوں؟

عقل نے پہلو سے مجھے انکار کی ہدایت دی تھی۔ لیکن میرے جذبات نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ جتنا میں اس انجمن کی اصولوں کی مخالفت کرتا تھا۔ اتنا ہی میرا دل اس کی طرف بھاگتا جاتا۔ کئی روز تک مجھ پر یہی اضطرابی کیفیت طاری رہی۔

پارٹی میں اصلاح کی گنجائش تھی

میں نے موافق و مخالف دلائل پر غور کرنا شروع کیا۔ یا یہ بات میں بھی حصہ لینے کا فیصلہ تو میں نے عرصہ سے کر رکھا تھا۔ یہ بات بھی مجھ پر واضح تھی کہ میری خواہشات کی تکمیل ایک ہی تحریک کے ذریعہ ہو سکتی تھی۔ لیکن آج تک مجھے کوئی قدم اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آج تک ایک کام شروع کرتے ہیں۔ اور دوسرے روز اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دھندے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ایک نئے کام میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ میرے لیے اس قدر مشکل تھا کہ نئی تحریک یا تو میرے تمام خوابوں کی تعبیر ثابت ہونی چاہیے۔ یا پھر بہتر ہے کہ اسے شروع ہی نہ کیا جائے۔ میں خوب جانتا تھا کہ میں نے ایک دفعہ شرکت کا فیصلہ کر لیا تو پھر ہمیشہ کے لیے پابند ہو جاؤں گا۔ ایک مرتبہ آگے بڑھا تو پھر پیچھے نہ ہٹوں گا۔ میں

فضول کوئی تبصرہ نہ کیا جائے۔ میں تو صدق دل سے یہ چاہتا تھا کہ میں اس کے
وقف ہو جاؤں۔ مجھے شروع سے ہی لوگوں کے خلاف ایک طبعی نفرت کا احساس
رہا ہے جو ہر شے میں بڑھتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کوئی کام انجام تک نہیں پہنچاتے۔ مجھے
ایسے ہر دلچسپی سے گھن آتی ہے۔ میرے نزدیک اس تماشے کے اخراج تو کر کچھ
کرنے کی نسبت کچھ نہ کرنا ہزار درجہ بہتر ہو۔

مجھے اب ایسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ تقریر خود میری زندگی کی ترجمانی کر رہی ہے۔ میرا مقصد یہ تھا
کہ جو بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں پہلے سے ملک میں موجود ہیں میں ان میں ہرگز شامل
نہ ہوں گا۔ میں اپنے اس فیصلہ کی وجوہات بعد میں بیان کروں گا۔ کنگ کے ممبروں والی
اس مستقل غیر محسن میں بے مثال خوبی تھی۔ وہ خوبی یہ تھی کہ ابھی اس کی تنظیم میں
"جماعت بندی" کی کرختگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی کی گنجائش تھی۔ ایک فرد
کی شمولیت کے لیے ابھی یہاں جگہ تھی۔ میں یہاں کوئی نتیجہ خیز عمل کر سکتا تھا۔ اگر
تحریک ابھی تک چھوٹے پیمانے پر تھی تو اس وجہ سے اس کو جدید خطوط پر ڈھالنا اور
آسان تھا۔ تحریک کی نوعیت اپنی مرضی کے مطابق آسان ہو سکتی تھی۔ اس کے اغراض و
مقاصد ابھی تشنۂ تکمیل تھے۔ اس کی راہ ابھی متعین کرنی تھی۔ جو دو سو سیاسی پارٹیاں
پہلے سے موجود تھیں ان میں سے کسی پارٹی میں یہ سب باتیں ممکن نہ تھیں۔

میں جتنا اس مسئلہ پر غور کرتا اتنا ہی میری رائے یہ ہوتی جاتی تھی کہ موجودہ کے پاؤں
پر کھڑا کرنے کے لیے اس قسم کی تحریک ہونی چاہیے۔ عام حالات میں ایسی تحریک کامیاب
ہو سکتی ہے۔ پارلیمنٹری سیاسی پارٹیاں بھی یہ کام بخوبی انجام دے سکتی تھیں۔ کیونکہ وہ تو
وجود میں آتی ہی اس لیے ہیں کہ موجودہ نظام کے ساتھ وابستہ رہیں۔ اور اس لیے وہ اس نظام کو برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن ایک جدید
تحریک کی ضرورت تھی۔ ایک ایسی انقلابی تحریک کی ضرورت تھی جو موجودہ نظام کو
ختم کرنے سے قاصر
رہتا۔

ہمت ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانا خاصی ہمت کی متقاضی تھی۔ اس کام کا بیڑا اٹھانے کے لیے میری قابلیت کی سند کیا تھی؟

ضرورت ہے سند یافتہ بدھوؤں کی

اگر میں مخلص تھا۔ اگر میں وسائل سے محروم تھا تو میں سے برداشت کر سکتا تھا لیکن میری کاہل کمزوری ایک ایسی رکاوٹ تھی جس کو دور کرنا دشوار دشوار تھا۔ میں اس لاکھوں کی تعداد میں بسنے والی مخلوق میں شامل تھا جن کی زندگی کا مقصد کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے کا کسی کو احساس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک وقت یہ بھی تھی کہ میں نے باقاعدہ تعلیم یا قاعدہ حاصل نہ کی تھی۔

عام طور تعلیم یافتہ طبقہ میں اس شخص کو انتہائی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس نے مدرسہ میں تعلیم پا کر ڈگری حاصل نہ کی ہو۔ اور "علم" کی مظلوم پتلون اس کے بدن پر نہ ہو۔ یہ سوال کبھی نہیں پوچھا جاتا کہ کوئی انسان کیا کر سکتا ہے۔ ہمیشہ یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ کیا تم نے بڑھا کہاں تک ہے؟ جن لکھے لوگ ہر اس بدھو کی قدر کرتے تھے جس کے پاس بہت سی علمی ڈگریاں ہوں۔ جس نوجوان کے پاس یہ قیمتی دستاویزات نہ ہوں اس کی قدر نہیں۔ چاہے وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو۔ میں اس حالت میں کبھی تصور کر سکتا تھا کہ ہر بھی کسی مخلوق میرا استقبال کیے کرے گی۔ اس حالت میں اگر مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی تو صرف اتنی کہ میں انسان کو جو کچھ سمجھتا تھا وہ حقیقت میں اس سے بھی زیادہ ذہین ثابت ہوا۔ جو لوگ اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہیں وہ اپنی خصوصیت کی بنا پر مقام رکھتے ہیں انسانوں کا ایک گروہ ساری عمر تعلیمی دانیت کی گاڑی کھینچتا ہے۔ اگر دوسرا گروہ حقیقت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ میں ان دونوں گروہوں میں تفریق تو ہمیشہ سے کرتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ فرق مجھ پر واضح ہوتا گیا۔

میں پارٹی کا ساتواں رکن تھا

دو دن کی گہری سوچ بچار کے بعد میں نے آخر یہ قدم اٹھا لینے کا فیصلہ کیا

مجھے بھی سوچنا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

یہ میری زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ میرے لیے اب واپس جانے کا کوئی راستہ باقی نہ تھا۔

جس جرنیلی پارٹی نے مجھے کرکٹ کی جو پیش کش کی تھی وہ میں نے قبول کر لی تھی۔ مجھے کرکٹ کی عارضی سند دے دی گئی تھی۔ میں اس پارٹی کا ساتواں کھلاڑی تھا۔

☆☆☆

باب دوم :: دوسری جرمن سلطنت کی تباہی کی وجوہات

عروج و زوال کی داستانوں سے عبرت حاصل کرو

تاریخیں ہمیشہ ہنسی ہوں کے پیمانے سے ناپی جاتی ہیں۔ عروج کا کمال ہی زوال کی ابتدا ہوتا ہے۔ کہاں سے گرے تھے اور کس جگہ جا کر لگے۔ ان دونوں حیثیتوں کا فرق ہی انحطاط کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ قوموں اور سلطنتوں کی سرگزشت بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہے۔ سلطنتوں اور قوموں کی تاریخ لکھنا چاہتے ہو تو پہلے یہ معلوم کرو کہ ان کا عروج کس حد تک تھا اور کس حد تک ان کی کیا حالت تھی۔ ہم نہیں دیکھ سکتے کہ زوال شروع ہونے سے قبل عروج کے انتہائی کمال کی حد کہاں تک پہنچی تھی۔

وہ شخص کامل واقف رکھنے والا ہے جو صرف زوال کی ان علامتوں کی اہمیت تسلیم کرے گی جس سے یہ معلوم عروج کے امکانات باقی ہی تھے کہ کمال ترقی سے زوال شروع ہو گیا۔ دوسری جرمن سلطنت کی تباہی ایک تڑپا دینے والی چوٹ تھی۔ اس چوٹ کی تڑپ ان دلوں کو زیادہ محسوس ہوتی ہے جو اس پر غور کرتے ہیں اور اس کے درد کا شعور رکھتے ہیں۔ دوسری جرمن سلطنت کی تباہی اور بربادی پر پہنچنے کے بعد واقع ہوئی جس کا تصور بھی عبرت اور رات کے موجودہ زمانہ میں ناممکن ہے۔

قیصر کی سلطنت ایک عظمت کبریٰ تھی

دوسری جرمن سلطنت مختلف شاہان والیان ملوک کے ہاتھوں میں قائم ہوئی تھی۔ ساری قوم اس کی کامیابی سے سرشار ہو کر فخر سے جوش میں آ جا رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے بے مثال فتوحات حاصل ہوئیں۔ سلطنت جرمنی جنگ میں عدیم المثل شجاعت کے صدقے ملا ہوئی اور اسی حیثیت میں اس کی عظمتوں کے بیٹوں اور پوتوں کو ورثہ میں ملی۔ ملی تڑپ ڈوب جاتے تھے کہ ان کی سلطنت کی ہر قلعہ بیرونی گست و شہید کا خون تھی۔ نہ ہی یہ سلطنت باربار کی سرگرمیوں کے ذریعہ حاصل کی گئی تھی۔ یہ سلطنت ایک کے

دوسرے خطوں کے سیاسی اداروں سے مختلف تھی۔ اس سلطنت کو جو خصوصیت دنیا کے بیشتر ملکوں کے سیاسی نظام سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اس کا قیام زیادہ تر جنگ یا دوسرے کامرہوں منت تھا۔ یعنی یہ سلطنت دماغی منصوبوں کے بجائے خون بہا کر حاصل کی گئی تھی۔ رہی یہ بات کہ رومن قوم کا یہ احساس کہاں تک شعور طور پر ان کے ذہن میں صاف تھا۔ تو یہ ایک غیر متعلق امر ہے۔ جب دوسری رومن سلطنت کی نوبت آتی رہی تھیں تو یہ اس وقت فضا میں بلند ہونے والا فلک پابوس عمارتوں کی تاج کاری پر مشتمل نہ تھا۔ اس وقت تو جنگ کی بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ تصادم کے دھماکے ہو رہے تھے۔ یہ اس مرحلے میں تھا۔ اس ماحول میں سیاست کی ایک منزل طے ہوئی۔ رومن نوابوں اور رومن عوام نے باہمی تعاون سے ایک آزاد ملکی سلطنت کی بنیادیں رکھیں۔ تاج شاہی کا نشان پھر زندہ کیا گیا۔ اسمارک کی قوم کردہ ریاست جگہ جگہ اور بڑھوں کی غداری یا غارت گری کا پھل تھی۔ یہ ریاست تو محض جنگ پر تلے ہوئے فوجی رہنماؤں کا شاہکار تھی۔ غرض دوسری رومن سلطنت کی پیدائش ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ دنیا میں اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھر اس سلطنت کی تربیت جنگ کی آگ سے گزر کر ہوئی تھی۔ ان خصوصیات کے باعث اس سلطنت کی تاریخ تصویر کے رخ مظلومیت کا ایک باب کھینچ گیا ہو جو ہر نئی پرانی سلطنتوں کو بھی نصیب رہا تھا۔

یہ تو اس سلطنت کی پیدائش تھی۔ اس کے بعد ترقی کا ایک بے مثال دور شروع ہوا۔ جو ملکی دولت رومن کو جو لوٹ مار حاصل تھی اس کے باعث گھر میں ایک بے مثال دور شروع ہوا۔ ملک کی آبادی بڑھ گئی۔ قوم کی دولت میں اضافہ ہوا۔ ہماری فوج سلطنت و قوم کے وقار کی محافظ رہی۔ یہی رومن سلطنت دوسری رومن سلطنت کے درمیان سد قائم رہی فوج تھی۔

ہمیشہ زوال کی کوئی وجہ ہوتی ہے

آج دوسری رومن سلطنت اور رومن قوم کا زوال اس بستی کو پیغام دیتا ہے کہ ہماری

تعریف اور اس کے نتائج سے کرتی ہے۔ یہ بھی بڑی علامت کو سب سے بڑی اخلاقی غلطی کی ایک مثال ہے۔ عوام ان اخلاقی تناقضات اور سیاسی طاقتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اس کے زوال کا حقیقی باعث ہیں۔ عوام میں سے کم لوگ ہی شعور رکھتے ہیں اور نہ عوام ان طاقتوں کا صحیح اور پورا اندازہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

اگر عوام علامتوں ہی کو تہذیب کے زوال کا سبب سمجھ رہے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت تک صورت حالات میں کوئی اصلاح نہ ہو سکے گی جب تک عوام کی رائے میں یہ بات نہ آ جائے کہ قوم کے ذہن سے بھی تہذیب کے زوال کو ایک اقتصادی سانحہ سمجھے جانے لگیں۔ اس وجہ سے وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اقتصادی علاج سے اور علاج کا زوال دور کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی اس وقت تک کوئی امید نہیں جب تک یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اقتصادی طاقتوں کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ اور اصل اہمیت اخلاقی اور سیاسی طاقتوں کو حاصل ہے۔ جب یہ سمجھ میں آ جائے گا تو بھی ان تدبیروں کے اسباب کا صحیح اندازہ ہو گا جو آج کل پیش ہو چکی ہیں۔ جب آنکھیں کھل جائیں گی تو پھر مرض کے علاج کا نسخہ ہر روز نئی دھوم دھام سے پیش نہ ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب کے زوال کے اسباب کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی سیاسی تحریک اس زوال کو دور کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے یہ تحقیق خاص طور پر لازمی ہے۔

جنگ میں شکست زوال کے اسباب کا نتیجہ ہے ان کا باعث نہیں

جب واضح کی جاتی ہیں تہذیبی شکست کے اسباب تلاش کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے تو تاریخی علامتوں کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے سے بچنا چاہیے۔ یہ تاریخی علامتیں تو ہوتی ہیں لیکن ان علامتوں کی تہہ میں دوسری طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ جنگ میں ہار کا کوئی بڑی آسانی سے موجودہ مصائب کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے عام لوگ زوال کی اس توجیہ کو قبول کرنے کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان تکلیفات

باوجود ان کوششوں کے آج یہ لوگ ہمارے زوال کا باعث عسکری شکست کو قرار دے رہے ہیں۔

ان محسنوں کے ساتھ بہت بُرا ہوا تو کل بے کار ہے۔ یہ لوگ بھی جو کچھ کہتے ہیں ایک مدت بعد اس کی تردید کر لے گئے ہیں۔ میں ان کا تذکرہ بھی نہ کرتا اگر کچھ لوگ ان کی سکھائی ہوئی باتیں طوطے کی طرح دہرانے کی عادت میں گرفتار نہ ہوتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان کچھ لوگوں کی نیت میں ہمیشہ فتور نہیں ہوتا۔ میں وہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کا مخاطب ہم پڑھے لکھے نوجوان ہیں جو کل آج کل زبان سے کچھ کہا جائے تو اسے آمنا صدقنا کر اس کا مطلب ہی سمجھ لیتا ہے۔

اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ ہمارے زوال کا باعث جنگ میں ناکامی ہے تو اسے حسب ذیل جواب دینا چاہیے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک کے سفید فام کے ہر جنگ میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن جنگ میں ناکامی بھلے خود تو کوئی عیب نہیں۔ یہ ناکامی بھی بعض اسباب کا نتیجہ ہے۔ یہ کچھ دیر ہوش مند آدمی پر سوچتا تھا کہ اس زندگی اور موت کی لڑائی کا کیا مطلب ہوگا۔ تو اس کے بعد تباہی آئے گی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ذہن وقت پڑنے پر کام کرنے سے جواب دے گئے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو پہلے تو جنگ کی اس نوعیت پر شک ظاہر کرتے تھے۔ بعد میں اس کا بالکل کھلا انکار کرنے لگے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل میں شکست کے خوف تھے جب ان کی یہ خواہش پوری ہو گئی تو اب ان کا ہاتھ کیسے مصائب کا سامنا کر رہا ہے خود دشمن کے ساتھ ان کی پہلی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔ تباہی کا اصل سبب ایسے ہی لوگ ہیں نہ کہ جنگ میں ناکامی اگر چہ وہ ساری مصیبتوں کا باعث جنگ میں شکست کو قرار دیا چاہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جنگ میں شکست بھی انہیں کی ریشہ دوانیوں کے سبب ہوئی۔ اب یہ کہتے ہیں کہ شکست کا باعث نااہل جرنیل تھے۔ یہ غلط ہے۔ دشمن بھی

ہے جس کے ہم سزاوار ہیں۔ ہم اس شکست کے مستحق ہی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یہ شکست مسلسل ناکامیوں کے بعد ناگہانی جھٹکا ثابت ہوا تھا۔ انحطاط کی نشانیاں عیاں تھیں۔ لیکن قوم کی اکثریت نے ان کو نظر انداز کرنے میں عافیت سمجھی۔ انہوں نے شتر مرغ کی طرح سر چھپا کر سمجھا تھا کہ ہم صرف وہی کچھ دیکھیں گے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔

آؤ ہم ذرا اس ملامت کو دیکھیں جو اس وقت ذہنی میں لہو رنگیں جب ترکی قوم نے شکست قبول کر لی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ کئی حلقوں میں اپنائی بے ترحمی سے ملامت وطن کی رسوائی کا خیر مقدم کیا گیا؟ کیا یہ طرز عمل کسی سزا کا مستحق نہ تھا؟ کیا کچھ لوگ ایسے نہ تھے جنہوں نے اس حد سے بھی تجاوز کیا اور جو فخر کرتے تھے کہ انہوں نے محاذ جنگ کو کمزور کرنے اور شکست کو دعوت دینے میں حصہ لیا ہے؟ خوش بختی ہمارے سروں پر دشمن نے مسلط نہیں کی۔ بلکہ یہ ہمارے اپنے ہموطنوں کی کرتوت ہے۔ اگر بعد میں وہ خود بھی مصیبت بھگت رہے ہیں تو کیا وہ اس مصیبت کے مستوجب نہیں۔ کیا تاریخ میں کبھی پہلے بھی ایسی کوئی مثال ہے جب کسی قوم نے اپنے آپ کو جنگ ہارنے کا باقاعدہ تعلیم کیا ہو؟ حالانکہ اس کا ضمیر اور علم اس بہتان کی تائید نہ کرتا ہو۔ اور اس کے ضمیر اور علم کا فیصلہ زیادہ صحیح بھی ہو؟

نہیں اور ہرگز نہیں! شکست کے بعد جس قوم کے رد عمل سے صاف ظاہر ہے کہ دوسرے رذیل کا سر جھکا نہیں ہوتا تھا۔ فقط کسی عسکری یا تدبیر کی ناکامی یا کچھ مورچوں کا چھن جانا شکست کا باعث نہ تھا۔ قوم کی تباہی اگر فقط محاذ جنگ پر شکست کا نتیجہ ہوتی تو پھر جس ملت اس شکست کا سامنا ایک بالکل مختلف جذبہ سے کرتی۔ اس سانحہ کے باعث جو تکلیفات برداشت کرنا پڑیں۔ ان کا سلسلہ یاد دلاتا کہ یہ ہم سے حال ہوا۔ اگر وہی تقدیر یا زمانہ کے اتفاق نے اس دشمن کو فتح دی تھی قوم کا دل اس کے خلاف نفرت و غصہ کے جذبات سے لبریز رہتا۔ اس طرح کبھی عالمی جنگ کے ذمہ داروں نے قوم کا وقار برقرار رکھنے کی خاطر دشمن کے ہاتھوں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ اسی عزم و

نقطوں سے جرمن شکست خوردہ افواج کی واپسی پر جرمن عوام کا استقبال کرنی۔ فوج کو تقسیم کی جاتی کہ وہ کیونکہ سلطنت کے ساتھ تسلی وفاداری میں رتی بھر فرق نہ آئے۔ اگر عقل اور بصیرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے کے فیصلہ کی نوبت بھی آجاتی تو اہل مشنوں میں انتقام لینے کی سپرٹ زندہ رہتی۔

جنگ میں شکست محض ایک ناکامی تھی۔ کا نتیجہ ہوتی تو اس کا سامنا کو وہ اندازے کیا جاتا۔ شکست کی تقریب پر خوشیاں نہ منائی جاتیں۔ رقص نہ کرنے والی۔ بیرونی پر فتح کا اظہار نہ ہوتا۔ اور شکست کو نہیں عزت فرض نہ کیا جاتا۔ محاذ جنگ سے لوٹنے والی فوجوں کا استقبال نہ کیا جاتا۔ اور ان کے حوصلے کی بے حرمتی نہ کی جاتی۔ یہ کی بات مظاہرہ ہوتا ہے دیکھ کر ایک انگریز فوجی افسر کرنل ری بلک نے حقارت سے کہا تھا کہ ہر جرمن ایک خدا ہے۔ ایسی گھٹیا ذہنیت کا حامل ایک سپاہ کی شکل اختیار کر سکتا۔ گزشتہ پانچ سال میں اس طوفان بدتمیزی نے پوری دنیا میں جرمن قوم کے وقار کو بالکل مسمار کر دیا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جنگ میں ناکامی کو تسلیم کرنے کے امکان کا سوچ قرار دیا جا سکتا ہے قریب ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جرمن قوم میں ہٹلر کی ہوس ملک گیری اور جرمن کے جواب پیدا ہو چکے تھے۔ جنگ میں شکست بھی انہیں کا نتیجہ تھی۔ قوم میں اپنے آپ کو بچانے کی جس مردہ ہو چکی تھی۔ قوم اخلاق موت کی علامت تھی۔ جنگ قوموں کی زندگی سے پیدا ہونے والی جاتی کی وہ کلی علامت تھی۔ جسے سب نے دیکھا۔ بنیادی طلق کی سال پہلے سے مت ور سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔

چھوٹے جھوٹ کی نسبت بڑا جھوٹ زیادہ کامیاب رہتا ہے

یہ وہ باقی کی کامل مہارت رکھنے والی یہودیوں اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والے ان کے رفقا بھی کیونکہ شوں کی عیاری ہے کہ وہ دوسروں کی ذمہ داری سر اس آدمی کے سر پر تھوپ رہے ہیں جو کیا محض تھا جس نے باوجود اعلیٰ عزم سے جنگ کو

اس حقیقت سے واقف ہیں یہ لوگ کھوٹ کے ذریعہ مذہبی مقاصد پورے کرنا خوب جانتے ہیں۔

دروغ اور بہتان کا استعمال کرنے میں یہودی دنیا کی تاریخ سے سب ہی واقفیت رکھتے ہیں۔ کہاں کا وجود ہی اس دروغ عظیم پر مبنی نہیں کہ وہ ایک مذہبی فرقہ ہیں۔ درآں حالیکہ وہ ایک قومیت ہیں۔ اور قومیں بھی کیسی اس بنی نوع انسان کے لیے بہت بڑے مفکر یہی نہیں بلکہ بڑے بڑے یہودیوں کے متعلق ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس قوم ایک گہری اور پکی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ اس نے کہا تھا "یہودی کذب و علم کے خطاب کے مستحق ہیں" لوگ اس قوم کی صحت سے واقف نہیں ہیں اس کو ماننے پر آمادہ نہیں وہ بھی حقیقت حال کے انکشاف میں معاون ثابت نہیں ہو سکتے۔

زوال کو بھی کمال کا زینہ بنایا جا سکتا ہے

پھر اس قوم کی اندرونی خوش قسمتی ہے کہ اس کا ہر افسانہ اتنی جلدی ایک خوفناک تباہی کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ اگر صورت حال کی وہی پہلی تحسین برقرار رہتی تو یہ درست ہے کہ قوم کے انحطاط کی رفتار زیادہ سست ہوتی۔ لیکن ایسے بتدریج زوال سے جو بھی آتی پھر اس کے تدارک کی بھی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مرض مزمن ہو جاتا۔ تباہی میں تعجیل ہو اس کی شدت کا اندازہ یہ ہوتا کہ بہت سے دلوں میں زوال کا احساس پیدا ہو گیا۔ یہ محض کوئی اتفاق نہ تھا کہ جاہلوں سیاہ کا اندازہ تو انسان نے جلد دریافت کر لیا تھا۔ لیکن سیاہ رنگ کا اندازہ آج تک دریافت نہ ہوا تھا۔ جاہلوں سیاہ موت کا ایک ایسا خوفناک سیلاب تھا۔ جس نے ساری انسانیت کو زلزلہ بداماں کر دیا۔ یہ عکس اس کے سیاہ رنگ ہمیشہ اثر کرتی ہے۔ اسی وجہ سے مقدم الذکر سے زیادہ ہوتا ہے اور موخر الذکر سے اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلوں سیاہ کے مقابلہ میں انسان اپنی ساری طاقتیں بروئے کار لے آیا تھا۔ اور سیاہ رنگ کے دلدل میں غلطاں ہوتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جاہلوں سیاہ پر بہت جلد کامیابی حاصل کر

ہو گیا تھا اور اب وہی تیغ بھی انسان پر غالب ہے۔

قوام کی مرض بھی اسی اصول کے ماتحت ہوتی ہیں اگر بیماری کی نوعیت خوفناک نہ ہو تو یا شدہ آہستہ آہستہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو کر اس کا شکار بن جاتے ہیں۔ اس لیے جب تک ہر فرد الحطاط کی رفتار میں مداخلت کر کے اس کو تیز کر دے اور یوں جس تباہی آنی ہے اسے قبل از وقت مرض کے لہم اے دوچار کر دے تو یہ درحقیقت اس کی خوش قسمتی ہوگی۔ اگرچہ اس علاج کو ہر شخص محسوس ہوگی۔ اس قسم کی تباہی کا نتیجہ اکثر یہ نکلتا ہے کہ خود اعلاج کی تلاش اور علاج سے مرض کے مداوت کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔

قدرت کی جانب سے ایسی خاص تدابیر ہے بھی اس صورت میں کام کر دہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب دماغ کے اندر وہ اسباب پہلے سے متشکل ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ بیماری اسباب اور ان سے پیدا ہونے والے خرابی حالات میں تمیز کی جائے۔ مرض کے زیر تعلیم بتدریج عرصہ قوم کے جسم میں موجود رہیں اور ان کو قوم کے گوشت پوست کا حصہ بنے کا اتنا زیادہ موقع دیا جائے کہ تباہی مرض کے اسباب اور ان کے نتائج میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زہریلے مادے جسم دراز سے قوم کے بدن میں اس طرح سرایت کر جائیں کہ ان کو شناخت کرنا مشکل ہو جائے۔ وہ اجزاء بدن ہی تصور کر لیے جائیں۔ وہ ان کو ایک ایسی برائی سمجھ جانے لگے جس سے چھٹکارا محال ہے۔ اس طرح ان زہریلے مادے سے نجات حاصل کرنے کے لیے شدید قدم اٹھانا سرے سے غیر ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم سے قبل طویل عرصہ تک ملک میں امن رہا۔ اس دوران میں جگہ جگہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک دو خرابیوں کو چھوڑ کر باقی شناخت کرنے والے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش نہ کی گئی۔ ان خرابیوں کی تحقیق کی بھی گئی وہ زیادہ تر قوم کی اقتصادی زندگی سے متعلق تھیں۔ اور اس وجہ سے ان پر فکر کی نگاہ زیادہ پڑتی

تھی۔ اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں کی طرح اپنے بھی تھے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

احمد دو صنعتی کارخانہ داری ایک لعنت ہے

انسانی کی نشانیاں ایسی تھیں جن پر توجہ دی سے غور کیا جانا چاہیے تھا۔ جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے سب دلیل کات کے قائل تھے۔

جنگ سے پہلے ترکی کی آبادی میں جرت انگیز اضافہ ہو۔ سیاسیت اقتصادیات اور فکر جمل کے ہر شعبہ میں ہاں شویہ مہیا کرنے کا سلسلہ اور زیادہ اہمیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا۔ وہ اس کے واحد صحیح حل سے ہی چڑتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی آسان نوکے سے اس کا تصفیہ ہو جائے۔ مزید علاقہ حاصل کرنے کی تجویز ترک کر دی گئی۔ اس معقول تجویز کی جگہ یہ حماقت انگیز پیدا کر دیا کہ تھوڑے سے تجربہ کرایا جائے۔ اس غلط فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں احمد دو صنعتی کارخانہ کا جال بچھ گیا۔

یہ سب سے اختیار کرنے کا سب سے پہلا اور مہلک ترین نتیجہ یہ تھا کہ کاشتکار دہقانی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جوں جوں شہری رقبوں میں کارخانے بڑھتے گئے مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی توں توں کاشتکاروں کا رول مدر صورت اختیار کرتا گیا۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ ملک قوم کی بقری کے لیے مزدوروں اور کاشتکاروں کے مابین جو تناسب قائم رکھنا ضروری تھا اس میں فرق آ گیا۔

غریبوں اور امیروں کے درمیان جو بے رحمانہ تھی وہ اب اور بھی ہولناک ہو کر ایک کے سامنے آ گئی۔ غریب اور امیر اس قدر قریب آ گئے تھے کہ ان کی طبقاتی سے پیدا ہونے والے نتائج کا فوراً ہی ہو جاتا تھا۔ صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری نے قوم کے اندر ایک عظیم پیمانہ پر بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر دی۔ قوم سیاسی طبقات میں بٹ گئی۔ تاریخ کا تاریخی ارتقاء کے ہر دور میں ہمیشہ یہ المیہ رونما ہوتا رہا ہے۔

کا وہ صورتحال پیدا ہو گئی جب ہر ایک کو یقین تھا کہ معاملات موجودہ کی طرح زیادہ دیر نہیں چل سکتے لیکن یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ ہو گا کیا۔

شخصیت اور حکایت کا رشتہ منقطع نہیں ہونا چاہیے

ہر طرف پھیلے ہوئے اضطراب کی پرتو دو کہانیاں تھیں جو کہانی دے رہی تھیں۔ ان سے بدرجہا کارآمد تھے جو قوم میں تحقیق کا بنیادی جذبہ پیدا ہوئے۔

جیسے جیسے تجارت حکومت پر حاوی ہوتی گئی اس کے ساتھ ہی روپیہ ایک یہ خدا بن گیا جس کی پرستش ہر عبادت ہر شخص پر واجب تھی آسمان پر بسنے والے خدا تو بے ہوتے جا رہے تھے۔ ان کو طاق پر رکھتے ہوئے لکشمی دیوی کی پوجا کا رواج عام ہو رہا تھا۔ اس طرح زوال کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس کے لیے خاص طور پر تھوڑا رہوں تھا کہ انسانوں کی گھڑی سر پر کھڑی تھی اور قوم ہمیشہ سے زیادہ بیکار ہو جانے کی عادت تھی۔ ہر ان حالات میں ہاں شیخ سلمانے کا حق حاصل کرنے کے لیے ہر ایک کوشش کر رہا تھا۔ سے تھوڑے کے زور سے کامیاب بنانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے تھا۔ یہ ملکی یہ تھی کہ روپیہ کے حقدار کو وہاں سے بھی تھوڑی بہت پشت پناہی حاصل ہو گئی جہاں سے اس کے استیصال کا بندوبست ہونا چاہیے تھا۔ سے ساہوکاروں کے نمائندوں کو روپیہ کا مرتبہ عطا کرنے کے حصول توفیر نے غلطی کی۔ یہاں کہا جا سکتا ہے کہ یہ غلطی تو بسا اوقات سے بھی ہو گئی تھی۔ یہ عذر اس قابل ہو گئی ہے۔ بہر صورت عملی نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کے سامنے تمام محاسن اخلاق ہالوی حیثیت دیے جانے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر اس پر بھی وہ صدمہ عمل درآمد ہوتا رہا تو ساہوکار رہنموں کے مقابلہ میں تھوڑے ہی شرفا بھی کمر تہ کیے جائیں گے۔

میدان جنگ کے اندر رام پیدا کرنے کی نسبت ساہوکاروں میں کامیابی زیادہ آسان ہے۔ اس لیے کسی سچے جمہوریت یا اعلیٰ سیاسی مدبر کے پیدا ہونے سے باعث فخر نہ تھا کہ ایک یہودی ساہوکار اس کا اہم ترین فریق رہا کرے اس کے پہلو میں مسند نشین ہو۔

جو ہر قیمتی کھی سے تحفظ اور حفاظت حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وہ تو ایسے موقعہ کی تلاش میں رہتا جب وہ اپنے شکار کے لئے کوئی جال بچھا سکے۔ سرکار کی اس روش سے اعلیٰ خاندانی روایات قائم رکھنے کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکتی تھی۔ رجسوں کے خاندان روز بروز اس اصل اخلاص سے عاری ہوتے گئے جس پر ان کا جواز مبنی تھا۔ نتیجہ یہ نکلا اس قماش کے شرکاء درحقیقت کھیلنے کے زیادہ مستحق تھے۔ مخصوص اور مستقل اقتصادی مفاد بتدریج اخلاص کے قبضہ سے نکل کر ملک کے سارے اقتصادی نظام کو مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے ماتحت لانے سے تمام کے اندر شدید اقتصادی انتشار رونما ہو گیا۔

اس طرح مزدور بے بضاعت طبقہ طوروں کی سودا بازی کا نشانہ بن گئے۔ محنت سے محبت کا رشتہ منقطع ہونے کی وجہ سے کمپنیوں کو اختیار حاصل ہو گیا۔ اور انہوں نے دھیرے دھیرے قومی زندگی کے ہر پہلو پر کامل تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا۔

سرمایہ داری اور کمیونزم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے

جنگ سے پہلے جرمنی کا اقتصادی نظام مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں کے عالم گیر جال کے چند کی حیثیت میں اقوامی بازیچہ کا دان پڑا تھا۔ یہ درست ہے کہ چند جرمن کارخانہ داروں نے اس نظام کو روکنے کی پوری کوشش کی لیکن آخر کار ان کو بھی روپے کی بھوکی سرمایہ داروں کے مشترکہ محاذ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے کیونکہ اس کشمکش میں سرمایہ کاروں کو ان کے کلرکوں اور مزدوروں کی بھی کمیونسٹوں کی امداد بھی حاصل تھی۔

جس طرح کمیونسٹ جرمنی کی اقتصادی زندگی کو بین اقوامی سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اس کی بنا پر ہوئی کہ جرمنی کی اعلیٰ صنعتوں کے خلاف مسلسل شورش بپا ہوتے لگی۔ تاہم کمیونسٹوں کے انتخاب میں جو کامیابی حاصل تھی وہ اس شورش کے مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کافی ثابت نہ ہوئی۔ آج کل میں یہ اطلاع فراہم کر رہا ہوں۔ سرکاری ریلوے پر کمیونسٹوں کی یلغار کا زور ہو چکی ہے۔ عنقریب یہ ریلوے بین

اقوامی سرمایہ داروں کے قبضہ میں دی جائے گی۔ یوں کیمونسٹوں کی ان اقوامی جمہوریت کی تحریک اپنی منزل مقصود کی جانب ایک اور قدم بڑھا چکی ہے۔

جب جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کے بڑے بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں نے دیکھا کہ ظاہری طور پر تو صرف تجارت جرمنی کو بکلی اس کے پاؤں پر کھڑا کر سکتی ہے۔ اس ایک مثال سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جرمن قوم تجارت کا شکار بنانے کی سازشیں کس حد تک نظر سے اوجھل کر چکی تھیں۔ ایک طرف تو فرانس اور روس اپنے علیحدہ علیحدہ کے لئے قوم پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوششوں میں منہمک تھا۔ اور دوسری طرف جرمنی میں اس قسم کی اعتماد کو اس سے تقویت کی جا رہی تھی کہ قوم ہی زندگی کا دارومدار تجارت پر ہے تاکہ خلق خدا راہ راست پر رہے۔ جنگ کے بعد جنرل جوفر نے جو اعلان جاری کیا تھا اس سے غلط فہمی پیدا ہوئی تھی۔ ان تمام بیوقوفوں نے جنہیں "سیاسی مدبر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جو فوجی نقطہ نظر سے نقصان کے بعد جرمنی پر مسلط ہو چکے تھے نئی طور اس اعلان کو مشعل ہدایت بنا لیا۔

جنگ سے پہلے جرمنی کے اخبارات کی بڑی خدمتوں میں سے ایک یہ بھی کہ جو کام انجام دیا جاتا تھا۔ اس انجام دینے میں کی جانے والی تھی جو چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بے چینی اس بات کی تھی جو مختلف اسباب کی بنا پر قوم میں نمودار ہو چکی تھی۔ جرمنی کا تعلیمی نظام اس بات کی کوشش کرنے والی دیکھا تھا۔

جنگ سے پہلے جرمنی کا تعلیمی نظام بے اندازہ نقائص سے بھرپور تھا۔ یہاں تک ذہانی طلبہ سکھائے جاتے تھے۔ اور اس کو بھی کافی سمجھا جاتا تھا۔ عملی استعداد کی تربیت کی جانب کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی۔ انفرادی کردار کو جس حد تک انسانی کوشش سے پختہ کرنا ممکن ہے اس کی بھی کوشش نہ کی جاتی تھی۔ ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے اور قوت ارادی کو مضبوط بنانے اور قوت فیصلہ کو بڑھانے کا تو کوئی انتظام ہی نہ تھا۔ اس طریقہ تعلیم کا اثر یہ تھا کہ سوائے اطاعت کے آدمی تیار ہو رہے تھے۔ جنہیں ہر وقت یہی حکم دیا جاتا تھا

کہ ہر قسم کا علم "جانا" کریں۔ اور جنگ سے پہلے دنیا میں ہتھیاروں کی قدر اور استعمال بھی اسی معیار سے کیا جاتا تھا۔ فن پسند تو کیے جاتے تھے کیونکہ ان سے کام خوب لیا جا سکتا تھا لیکن ان کے کردار کی اس خامی کے باعث ان کا کچھ احترام نہ تھا۔ اس حقیقت میں ہنر عورت کے لیے ایک بہت بڑا سیاسی پیچیدہ ہے کہ بعض ممالک کے اندر جانے کا تناسق ہوتو قوموں کے مقابلہ میں آنے سے پہلے ہی قومیت ہار مانے آمادہ ہو جاتے تھے ان ہار کی ایک اور اہم وجہ ضرب المثل بھی ہے۔ اس ضرب المثل کا مفہوم یہ تھا کہ "مورب انسان چاہے کوئی جنگلی ہی ہو لیکن سے مزے کی زندگی گزار سکتا ہے"۔

وہ شعاری اور خوشامد ایک چیز نہیں

اس قسم کے آداب محفل کے معروضہ تقاضاؤں کے باعث شاہی دربار کے لیے جو رسوم و رواج وضع کیے گئے وہ اخلاق مہلک تھے۔ ان قواعد کی رو سے ملک معظم کے حضور میں کسی بات کی تردید ممنوع تھی جہاں بادشاہ سلامت کی کاسہ لیسی کرتے ہیں وہاں میں ہوں ملا دی جائے۔ حالانکہ بادشاہ کی مصاحبت وہ منصب خواجہ جس کا امانت دیانت کے مقابلہ میں مردانہ مقابلت کی زیادہ حاجت تھی۔ شاہی دربار میں خوشامد پیشہ درباری بادشاہوں اور عہدے کے بھوکوں کو فریب دیتے ہیں۔ جو ذلیل انسان بادشاہ اور شہزادوں سے میل ملاپ رکھتے ہیں شاہی دربار کے اعلیٰ حلقوں کے خوف کو تسکین دیتے ہیں انہیں بھی ہی مسلک اپنانا پڑتا ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ "عاجز" مخلوق ہوتی ہے اپنے آقا اور رازق کے سامنے گھٹنے ٹیکے رہتی ہے لیکن دوسرے انسانوں کے لیے ہمیشہ بے انداز غرور کا اظہار کرتی ہے۔ یہ مغرور کس بے حیائی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف وہی بادشاہ کے سچے وفادار ہیں۔ یہ خود تو "بادشاہ بننے" کے امید وار اپنی حیثیت سے تجاوز کر کے ان حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں ان میں سے یہ گھناؤنا سب سے زیادہ قابل نفرت ہے کہ وہی بادشاہ کے دشمن خیر خواہ ہوتے ہیں۔

بادشاہوں اور بادشاہتوں کے زوال کا قریب ترین سبب اسی قماش کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی صحت کا تجزیہ سوائے تحقیق کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی فن کا پیشہ اختیار کرتا ہے چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو چاہے وہ بھی اس اصول کے تابعدار کے سامنے ذہن پاک رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جو شخص بلیدگی سے کسی اور کو غلام رکھنا چاہتا ہو اس کا حقیقی خیر خواہ ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس راستے کے تابعداروں میں کچھ نقائص یا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں تو وہ ان خرابیوں اور نقائص کے دور کرنے سے پہلی وفاداری اور خیر خواہی میں فرق نہیں آنے دیتا۔ یہی وہ بادشاہ کے بعض مجبور دوستوں کی طرح ان عیوب کا پتہ چلا کر دنیا کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ تو خود بھی سلطنت ہوتا جا رہا وقت کے پاس جا کر اسے صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کرے گا۔ غلط کے تدارک کی ترغیب دے گا۔ وہ یہ تسلیم نہ کرے گا کہ بادشاہ ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ چاہے تجربہ کوئی کیوں نہ ہو۔ برعکس اس کے کہ اس منصب کے آدمی کا ہمیں ذکر کرنا ہوں وہ تو بادشاہت کو خود بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رکھنا بھی اپنا فرض تصور کرے گا۔ وہ اس کوشش میں اپنی ذات کو خطرہ میں ڈالنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ اگر بادشاہت کے نظام کی قدر و قیمت محض بادشاہ کی ذات پر موقوف ہوتی ہے تو اس سے بہتر کوئی نظام حکومت نہ تھا۔ ہم مانیں یا نہ مانیں یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہم دانش و حکمت اور صاحب کردار بادشاہوں کی ناقدری کرتے رہے ہیں۔ پیشہ ور کاسہ لیس اور خوشامدی لوگ ضرور اس حقیقت سے منکر ہیں۔ لیکن دیانت دار افراد جو کہ قوم کی اصلی طاقت ہیں کبھی یہ عذر ہرگز تسلیم نہ کرے گا کہ سارے بادشاہ ناکارہ ہوتے ہیں۔ وجیرو وجیرو۔ دیانتدار افراد تاریخ کو صحیح سمجھ کر دیکھتے ہیں تو پتا ہے اس کا ذمہ بادشاہوں پر ہی کیوں نہ پڑتا ہو۔ سازگار تقدیر سے اگر کسی قوم کو واقعی کوئی عظیم بادشاہ کوئی بڑا آدمی میسر آ جائے تو اسے دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو خاص عنایت کا مورد سمجھنا چاہیے۔ اور شکر کرنا چاہیے کہ قسمت نے مدتوں تک ان پر مسلط نہیں کر

دیا۔

بادشاہ بھی قوم کا ایک خادم ہوتا ہے

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بادشاہت کی اصلی حیثیت کسی ایک بادشاہ کی ذات پر موقوف نہیں ہو سکتی۔ ملک کی فریدرک اعظم جیسے ماری ہوئی بادشاہ بھی جیسے دنیا کے سر پر تاج رکھ دیتے ہیں دوسری ہوتے ہیں۔ ایسا تو کئی صدیوں کے بعد ہو سکتا ہے۔ ہر روز ممکن نہیں بادشاہت کا اصول بادشاہ کی ذات پر ترجیح رکھتا ہے کیونکہ کسی ادارے کی قدر و قیمت خود اس ادارے کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ اس لیے بادشاہ کو بھی قوم کے خادم ہی کے زمرہ میں شمار کرنا چاہیے۔ وہ بھی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اس پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ اسے بھی اسی مقاصد کے حصول کی خاطر اپنی حیثیت پر قناعت کرنا لازم ہے۔ اگر اسے کوئی اہمیت دی جائے اور اسے بجائے "ذات مقدس" کی کا کر شمہ فرض کر لیا جائے تو پھر کسی بادشاہ کو معزول کرنا بھی ممکن نہ ہوگا۔

حالات موجودہ اس حقیقت پر زور دینا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے ماضی قریب میں بادشاہت کا تخت الٹا تھا۔ وہ بے پر کا سودا رہے بدل یہ لوگ بھولے بن کر اب بھی "اپنے بادشاہ" کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں کہ یہ "بادشاہ" وہی شخص نہیں جس نے انہوں نے بڑی دھوم دھام سے تاجپوشی کی رسم ادا کی تھی۔ جو کوئی ان کے راگ میں ان کے سر کے ساتھ سر نہ ملائے اسے فی الفور "بے حمیت" "بے دین" کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ یہ اثر مرتے والے وہی بھگوڑے ہیں جو ۱۹۱۸ء میں میدان چھوڑ گئے تھے اور انہوں نے اپنے کندھے پر ہل رکھ لیا تھا۔ تب ان کا عقیدہ تھا کہ ویرانی کی بجائے زمانی بہتر ہوتی ہے۔ قیصر پر کیا بیتے گی اس کی انہیں کچھ پروا نہیں۔ انہوں نے "صلح پسند شریف" کا روپ دھار لیا تھا۔ یا وہ ایسے روپ میں آ گئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ ایک بادشاہت کے پرخچے اڑنے سے کبھی نہ ٹلتے تھے۔ ہر جھک جھک کر اور جائی جائی کر بادشاہ کے یہ "خادم اور مشیر"

کمزور ہوئے تو کہ بادشاہت کی روایتی طاقت کا بار سر نہ اپنے کندھے پر اٹھا سکیں۔
لیکن یہ حقیقت بھی ہوئی کہ جب دوسروں نے بادشاہ کے مخالفوں کے سامنے سپر ڈال
کر انقلاب کو قبول کیا۔ عوام کا راستہ صاف کر دیا۔ تب یہ طاقتیں اپنی جگہ موجود تھیں۔
اور حسرت سے مرغن قورمہ کی خوبصورت تھالیں بردار کے بادشاہ کی ذمہ داری
میں بھگان ہونے لگے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک ایک روز کارل
ہاؤس کو عروج حاصل ہو گیا۔ اس وقت بادشاہ کے قصیدہ خوانوں کا یہ حال ہو گیا کہ
جیسے ہی کوئی بچہ کر پھوں کو جلوس نکل جاتا ہے۔

ایسی صورت حال پیدا ہو جانے کی ذمہ داری اگر بادشاہوں پر نہ ہوتی تو بادشاہ
رعایا کے مستحق تھے۔ لیکن خود بادشاہوں کو بھی تو ہوش ہونا چاہیے کہ اپنے حامیوں کی
مدد سے تخت پر بیٹھ تو سکتا ہے لیکن گیارہ ان کو وہاں بیٹھا نہیں سکتا۔

اس قماش کی وفاداری غلط ہے اور سراسر ہمارے نظام تعلیم کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے
نظام تعلیم کی اس خامی سے کسی بالخصوص نقصان پہنچا ہے۔ ایک طرف تو مختلف
بادشاہوں کے درباروں میں وفاداری کے تاثر نکلنے رہتے تھے اور دوسری طرف
بادشاہت کے نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ جب بادشاہوں کے سنگھاسن ہی
ڈگمگانے لگے تو یہ نکلنے ازخود ختم ہو گئے۔ خوشامد سے اور ہی حضور بے کسی بھلے
آدمیوں کی خاطر جان دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ بادشاہوں کی جاں ہمیشہ سے یہی رہی
ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں نہ سمجھنے کی وقت کوشش کرتے ہیں۔

غلط نظام تعلیم کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص ذمہ داری سنبھالنے سے گھبراتا تھا۔ زندگی
کے ہر موڑ پر نئے مسائل سے نپٹنے میں بھی کمزوری دکھائی جاتی تھی۔

اس وبا کی ابتدا پرائمری درجوں سے ہوئی جہاں ذمہ داری سے فرار کی عادت
خاص طور پر ایک رائج کی جاتی تھی۔ بدقسمتی سے یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل
گیا۔ قومی اور ملکی سطح پر تو اس کا نمایاں اثر ہوا۔ ہر جگہ ذمہ داری سنبھالنے سے

گریز کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب کام ادھورے چھوڑ دیے گئے۔ بات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش میں غیر ذمہ دارانہ روش اختیار کی جاتی رہی۔ شخصی ذمہ داری کو ہر ذمہ داری سے گھٹانے کی بھی ہوئی تھی۔

کئی صدیوں سے ہم قومی زندگی میں گھر کر چکے تھے۔ ان بیماریوں کے علاج میں تساہل سے کام لینا کوتاہی سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم اس کوتاہی پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ دھوکے قدم اٹھانے اور ذمہ داری قبول کرنے سے فرار کے نتائج کیسے مہلک ہو سکتے ہیں۔ یہی متعدد بیماریوں اور عیوب کی نشوونما کی تصدیقات میں سے صرف ایک کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کی صحافت ایک شر عظیم ہے

صحافی حلقوں کا دستور ہے کہ اخبارات کو سلطنت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا ہے کہ صحافت کی طاقت سے انکار نہیں مگر اس طاقت کا اندازہ میں عقلاً مبالغہ کیا جاتا ہے کم ہے۔ صحافت دنیا کے نظام تعلیم کا اہم جزو ہے۔ اخبارات پڑھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ لوگ جو بلکہ پڑھتے ہیں اس رہا کر وہ کالم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو کسی بات کا یقین نہیں کرتے۔ اور تیسرے وہ لوگ کہ جو بلکہ پڑھتے ہیں اس کا فوراً تجزیہ کرتے ہیں۔ اور پھر اس تجزیہ کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

تعداد کے اعتبار سے پہلا گروہ سب سے بڑا ہے کیونکہ اس قوم میں عوام شامل ہیں ذہنی لحاظ سے یہ طبقہ قوم کے سادہ لوح افراد پر مشتمل ہے۔ ان گروہوں کی تقسیم پیشہ کے لحاظ سے نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ذہانت کی استعداد کو مدنظر رکھا گیا ہے پہلے گروہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو پیدائشی طور پر اپنی رائے خود قائم کرنے کے اہل نہیں۔ یا یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ لیکن اس کو استعمال کرنے کی عادت نہیں بھگتی۔ یا کسی حد تک جہالت اور کسی حد تک طبیعت کی افتاد کے باعث جو بلکہ مطبوعہ پڑھتے ہیں اس پر بحث سے

بغیر سے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے طرز فکر کی اس گروہ میں شمار کرنے چاہئیں جو گہرے غور و فکر کی استعداد رکھتے ہیں لیکن محض کاہل ہونے کے باعث دوسروں کی فکر کے نتائج کو شکریہ سے قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرا مفکر طرز کے باعث سمجھتے ہیں کہ دوسروں نے جو کچھ سوچا ہوگا اور حاصل غور و خوض کے بعد ہی سوچا ہوگا۔ ان سب لوگوں پر سماجت کا ترس بے اثر ہوتا ہے۔ قوم کا غالب حصہ اسی پہلے گروہ پر مشتمل ہے۔ ان میں یہ مادہ ہی نہیں ہوتا کہ جو کچھ ان کے سامنے پیش کیا جائے اس میں کھوٹ اور کھرے کی تمیز کریں۔ یا وہ خود یہ تکلیف برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لیے دوسرے مسائل جو درپیش آتے ہیں ان کے متعلق ان کی رائے ہمیشہ غلط ہی اثرات کا عکس ہوتی ہے۔ اگر اطلاعات ناقص کا کچھ سچائی اور نتیجہ گی پر استوار ہوتا ہے تو اس گروہ کی محفلوں سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یہ کام روح گوپیوں کے ہاتھ میں ہو تو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

دوسرا گروہ تعداد میں بہت کم ہے۔ اس گروہ میں کچھ تو وہ لوگ ہیں جو پہلی گروہ میں شامل تھے۔ لیکن مسلسل تلخ تجربوں کے تجربے کے بعد اب کسی مقصد پر اطلاع پر یقین کرنے کو آمادہ نہیں۔ انہیں سب اخبارات سے نفرت ہو چکی ہے۔ یا تو وہ اخبارات پڑھتے ہی نہیں رہا اس اخبار پڑھ کر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اخبارات جھوٹ کا پلندہ ہیں اور روح پلندوں کی گھڑی ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو تجزیہ میں دلچسپی مشکل ہوتا ہے۔ انہیں تو کبھی یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے وہ کسی تعمیری کام کے قابل نہیں ہیں۔

تیسرے گروہ کی تعداد سب سے تھوڑی ہے۔ اس میں وہ تین لوگ شامل ہیں جنہیں تعلیم نے اپنی رائے خود قائم کرنا سکھا دیا ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر خود غور و فکر کرتے ہیں اور جو کچھ پڑھتے ہیں اس کا تنقید سے تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ مضمون نگار کے تاثرات کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر کسی اخبار کا مطالعہ نہیں کرتے۔ ستارہ

لکھنے والوں کو بے لوگوں کے معیار کے مطابق مضمون لکھنے میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ اخبار نویس اس نوع کے قارئین کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں۔

ایسی بات جو کچھ کی سمجھ میں آسکتی ہے اس کا اس قسم کے گروہ پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہر اخبار نویس کو ایک رہنما سمجھتے ہیں جو کبھی کبھی غلط بول جاتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ اس قسم کے قارئین کی اہمیت محض ان کی تعداد کے پیش نظر ہے۔ ورنہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ فی زمانہ عقل و دانش سے عاری عوام کثرت کے ہاتھ میں ہے۔ آج کل تو تمام معاملات میں عوام کے ووٹوں کی ہی بنیاد سے فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت اس گروہ کے ہاتھ میں ہے جس کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔ یہ ہم اکثر دیکھ چکے ہیں کہ تعداد پہلے گروہ کی زیادہ ہے جو ہر دعوی پر یقین کر لینے والے سادہ لوح عوام کا ایک گروہ ہے۔

آزاد ہی صحافت ایک عظیم اور جوہر ی چیز ہے

یہ ایک قومی فرض اور سرکاری معاملہ کا اہم حصہ ہے کہ قوم کو جاہل رکھنے اور جہالت مطلق کے گڑھے میں گرنے سے بچایا جائے۔ لہذا سرکار پر واجب ہے کہ عوام کو معلومات فراہم کرنے والے ہر قسم کے ذرائع کی نگرانی کرے۔ اور اس ضمن میں ہر قسم کے ذرائع کے ارتکاب کی روک تھام کرے۔ اس سلسلہ میں صحافت خاص توجہ کی مستحق ہے کیونکہ عوام پر اس کا زبردست اثر ہے۔ بلا دیگر تمام اثرات سے مقابلہ میں صحافت کا رسوخ زیادہ ہے۔ اور درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحافت کا اثر کبھی کبھی نہیں بلکہ مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ صحافت کی زبردست اہمیت کا راز اس کی تلقین کے تسلسل، ہمہ گیریت اور تکرار میں مضمر ہے۔ صحافت کے مسئلہ کا حل کرنے میں سرکار کو اس مقصد کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ تمام ذرائع کا مقصد ایک ہونا چاہیے۔ سرکار کو آزاد ی صحافت کا نام رکھنے والی عظیم و جوہری چیز کی تلاش میں سرگرداں ہونا چاہیے۔ ذی ہاتھ لگانے والوں کے فریب میں پھنس کر اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت کرنی چاہیے۔ یہ قوم کو کسی نیک یا

منفیہ قدم سے محروم رکھنا چاہیے۔ بلکہ ہر ایسی بے رحمی سے اور بغیر کسی جھجک کے عوام کو معلومات فراہم کرنے کے اس وعدے پر پورا اترنا چاہیے۔ اور قومی مفاد کے تحفظ کے لیے استعمال میں لانا چاہیے۔

آپ نے اس خون خرابے کا بار بار ذکر کیا جو جنگ سے قبل قومی صحافت پر قارئین کے پے بچھاوا کرتی تھی۔ کیا یہاں کی بدترین اور بدترین زہر سے مسموم نہ ہوتی تھی؟ جب دوسری قومیں آزاد تھیں لیکن ہمارے عوام کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لیے تنگی تیار کر رہی تھیں۔ تو کیا یہاں بدترین اور بدترین آمریت کے دور نہیں بیتے جاتے تھے یا خود سرکار کے متعدد اداروں کی بابت عوام کے دلوں میں دور دور تک کی بدظنی کے بیج میں صحافت نے ٹھوس وشبہات پیدا نہ کر دیے تھے؟ اس طرح سرکار کو سرکاری حقوق کا بیجا استعمال کرنے سے لاچار نہ کر رکھا تھا۔ کیا یہ قومی صحافت نہ تھی جس نے ہمارے عوام کو مطلق العنانیت سے بیزار نہ کر رکھا تھا۔ کہ وہ آخر ہماری جذبات کی ماری ہوئی قوم اپنا مستقبل بھی لیگ آئینہ کو پیش کرنے پر آمادہ ہو گئی؟ کیا یہ صحافت قوم میں اخلاقی انحطاط پیدا کرنے کا ذمہ دار نہ تھی؟ کیا اخلاق عوام کا شعور نہ زائل ہو جاتا تھا؟ ایسی قوموں کو ایک گزرے ہوئے زمانہ کی یادگار نہ سمجھا جاتا تھا؟ کیا ان کی ترقیات کا اثر نہ تھا کہ ہماری قوم بھی "تجدد" کا شکار ہو گئی تھی؟ کیا ان وجوہات نے مسلمان ریاستوں سے سرکاری حقوق کی جڑیں ایسی کھوکھلی نہ کر دی تھیں کہ جب کافر قوموں کی کسی بھی طرف سے حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا؟ کیا انہوں نے ہر ایسی قوت کو ہر قوت سے مخالفت نہ کرنے دی تھی جس کا مقصد یہ ہو کہ سرکار کو کامل سرکاری اختیارات استعمال میں لانے کی اجازت دے دی جائے؟ کیا وہ مسلمان تھے جنہوں نے فوج کی شرکت کو باطل نہ کر دیا تھا؟ عام جمہوری دور بندی میں روڑے نہ اٹکائے تھے؟ اور عسکری انتظامات میں تخفیف کا مطالبہ نہ کرتے تھے؟ اور پھر وہ کیا تھا؟ کہ ان کی ساری شکایتیں بیجا نکلیں کوئی جا نہیں۔

کام ہے۔ آزاد خیال صحافت کا کام یہ تھا کہ وہ قوم اور سلطنت کی قبر کھود کر تیار کرتی رہے۔ جھوٹ بولنے والے کیونکہ سچ بولنے والوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ جھوٹ اس کا مایہ حیات ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد وحید یہ ہے کہ قوم کی جیبوں میں دراز ہو جائے اور اس طرح مٹ جائے۔ اقوامی سرمایہ داروں اور ان سرمایہ داروں کے سرمایہ داروں جنہیں یہودیوں کا خاندان کہا جاتا ہے۔

عوام کے ذہن اس طرح سرسر مسموم کیے جانے کی اس مہم کا ادراک سرکار کیا کر رہی تھی؟ کچھ بھی نہیں۔ بالکل کچھ بھی نہیں! توقع یہ تھی کہ وہ بیدار ہونے کی رو سے عاجز و راضی ہو کر مل جائے گا۔ خوشامد سے "اخبار کے اخبار مرتبہ" کا اعتراف کرکے اس کی "اہمیت" تسلیم کرکے صحافت کے "معلمانہ منصب" کا پرچار کرکے غرض ہر طرح کی مراعتوں سے اس بڑے بے درماں کو ملوث کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہودی یہ تمام حیلے ایک ہی معنی سکرات سے قبول کر لیتا تھا اور جواب میں تعریف ادا کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔

سرکاری مسائل تذبذب سے طے نہیں ہوتے

سرکار کی اس ذات "غیر ملکت" کی بدولت سے صرف یہ نہ تھی کہ اخبار کا احساس نہ کیا جا رہا تھا۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جاتا تھا وہ ادھورا اٹھایا جاتا تھا اور جو تجویز اختیار کی جاتی تھی وہ بھی ہر بار ناکام ہوتی تھی۔ کسی میں یہ جرأت ہی نہ تھی کہ مستقل بنیادوں سے کوئی بنیادی علاج کرے۔ ہر شخص کی نہ کسی پہلو سے زمام سازی میں کوتاہی تھا۔ جائے فعل کا سر کچلنے کے لیے ہر بار نئے طریق اختیار کیے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کی چوں کی توں رہی اور سلطنت کی قوت بجائے گھٹنے کے اور بڑھتی ہی چلی گئی۔

صحافت پر یہودیوں کا قبضہ تھا اور وہ آزادی صحافت کا ستیاناس کر رہی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حکومت جو قدم اٹھاتی تھی اس کا کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی ہاتھ

زادہ ہوتا تھا۔ اور نہ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد۔ صورت حال کا سرکاری اندازہ بالکل غلط تھا۔ نہ انہیں اس الجھن کی شدت کا پورا احساس تھا۔ نہ انہوں نے صحیح وسائل تیار کیے اور نہ ہی انہوں نے کسی قسم کا کوئی نقشہ بنایا۔ وہ عارضی چھاپے مار کارروائیاں چاہتے تھے۔ جب کوئی بہت بھوکا ہو تو اگلے وقت تک جانا تو کجا وہ ایک یا دو معمولی سیلوں کو چند گھنٹوں یا منٹوں کے لیے خالی کر دیتے تھے۔ لیکن وقتی کے زہریلے قبیلے کو بھگا دینے کی جانی تھی کہ وہ یہیں سے یہ کام کرتا رہے۔

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ اس پیمانے پر ہو رہا ہے کہ ایک طرف تو یہودیوں کے مکانات بظاہر معمولی تھے اور دوسری طرف سرکاری حکام یا تو بے وقوف تھے اور یا بالکل بھولے بھالے۔ یہودی ایسے ماہر تھے کہ وہ ایک وقت تو ہم ابابارات پر حملہ ہونے کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ جب صحافت کے ایک اور رکن کو کوئی آفت آتی تو دوسرا اس کی پشت پناہی کو آ جاتا تھا۔ کیونکہ ابابارات ہر معقول چیز پر انتہائی قابل ترین اسلوب سے پردہ ڈالتے ہیں۔ ریاست اور حکومت پر حملے کرتے تھے۔ قوم کے مختلف طبقات کو آپس میں لڑا دیتے تھے۔ ریاست اور حکومت پر حملے کرتے تھے۔ قوم کے مختلف طبقات کو آپس میں لڑا دیتے تھے۔ برعکس اس کے کہ وہ پیٹ بھروں کے جھوٹے ابابارات حقیقت پسندی اور اعتدال کا بھیس بدل کر سامنے آتے تھے۔ قصہ ان ابابارات کی بہودیوں کا تھا۔ ایسے ابابارات کے اداریوں میں کبھی بالغ کا نام تک نہ ہوتا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ وہ اس صرف ظاہر پر قیاس کرتے ہیں اور کسی شے کے اصلی و حقیقی معنی تک پہنچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ جب وہ اس کی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہتے وہ اسے باہر سے دیکھ لینا کافی سمجھتا ہے۔ اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ اس کے اندر کیا ہے۔ ان ابابارات نے اس انسانی کمزوری کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اور وہ اپنے اس علم کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی خوب جانتے تھے۔

انسان فطرت کا مالک ہے اس پر حاکم نہیں بلکہ اس کے تابع ہے

سے آزاد نہیں کر سکتا۔

جائز اور ناجائز نشاط

بہبودی پیدا کرنے والی اشیاء کو "طبی صلاحیت" کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ اشیاء جو کسی مخصوص مرض کے لیے سامان مداوا مہیا کرتے ہیں انہیں جائز روپ نشاط کہا جاتا ہے۔ فرانس فرانز تک ہماری زندگی بلکہ ہر قسم کے اشیاء اسی قماش کے لوگوں کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ ان کا اسوب تحریر عوام الناس کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے۔ اس حلقوں میں ان کو سوجھ حاصل ہے وہ کوئی ایسا اسوب تحریر اختیار نہیں کرتے جسے اس کے قارئین بخوبی سمجھ سکیں۔ مریض کے حلق میں زہر اتارنے کے لیے اس سے زیادہ دل پذیر دھوکہ اختیار کیے جاتے ہیں بلکہ ایسے خوش نما الفاظ سے قارئین کو دھوکے میں ڈال کر یہ یقین دلایا جاتا ہے۔ کہ ایسے اشیاء کی پیدائش محض خلق خدا کی بہبودی علم کی جستجو اور خلق حق پر مبنی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشیاء بھی محض اس کی مخالفت کا احساس دلانے کے لیے پیدا کیا جاتا ہے جو بہبودی انسان کے اشیاء کے خلاف پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔

وقار اور حکمت کے اس دھوکے سے عام انسان قارئین کو یہ "سائنٹی فک" دیا جاتا ہے۔ کہ محض دوسرے اشیاء جس "افراط و تفریط" کے مرتکب ہو رہے ہیں وہ کبھی بھی نہیں اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا ضروری ہو۔ قانونی قدم اٹھانے سے قبل آزادی صحافت میں فرق آجانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ آزادی صحافت ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی پیروی کرتے ہوئے قوم کے ذہن کو مسموم کرنے والے اور اسے معاشرہ کو دھوکہ دینے والے اشیاء بآسانی قانونی سزا سے بچ جاتے ہیں۔ حکام ان دھوکوں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں اسی بنا پر متامل رہتے ہیں۔ حکام کو ہر وقت یہی خوف کھائے جاتا ہے۔ کہ کہیں "اظہار آزادی" کے بعد وہ یوں سے محروم نہ ہو جائیں جو آزادی کے بعد ہی ہو سکتی ہیں۔ یہ کہ کوئی اشیاء اس آزادی کے کسی رکن کے خلاف

کبھی کوئی اقدام اٹھایا جائے تو باقی سارے اس کی مدد کو دوڑتے ہیں۔ وہ اس کی پالیسی کی حمایت نہیں کرتے۔ یہ تو فقط آزادی صحافت اور رائے عامہ کی تربیت کو مضبوط رکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ وہ فکر ہے جس کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جب یہ فکر و "تعریف اشارات" کے ہتھوں سے باندھ دی جاتی ہے تو اس میں کیا تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔

غرض قوم کے خون میں زہر سرایت کرتا رہا۔ رائے عامہ کے اندر ایک اچھوت بجلی رہی اور حکومت کو روکنے کے لیے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا گیا۔ جو مقدمہ نیز اخبارات کے لکھے گئے وہ بھی اختصار کی ان قوتوں کی مخالف دکھائی دیتے تھے جو مطلعت کے لکھنے والے پر حاوی ہوتی تھی۔ جب کوئی ادارہ براہ راست تشدد سے جو اس کے قبضہ میں ہو پبلی مخالفت نہیں کرتا تو گویا وہ اپنی موت کو خود دعوت دیتا ہے۔ یہ ادارہ اقدام اس اندرونی انحطاط کی بیرونی علامت ہے جو درپردہ ظاہری بناوٹ میں گھل سی جاتا ہے۔

اگر ہماری موجودہ نسل کی ذہنی حالت صحیح طور پر کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس خطرہ کو بھانپ سکتی ہے۔ یہ نسل بھی ایسے امتحانات سے گزر چکی ہے کہ ہر وہ شخص جس کی عصبی قوت اس امتحان کی نذر نہیں ہو گئی اب ضرور پہلے سے زیادہ مضبوط اعصاب رکھتا ہے۔ مجھے شک نہیں کہ جب اس وقت اور وقت کن صحافت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی یا سرکار نے رائے عامہ کے بنانے اور بگاڑنے کی اس مشین پر قبضہ کر لیا تا کہ انہیں اور قوم کے دشمنوں کو اس میں کوئی دخل نہ رہے تو ہماری نسل اپنے تمام ذرائع کے ذریعے زبردست ہنگامہ برپا کریں گے۔ وہ اپنے مخطوط بھیجتے رہے، تھوڑا جلاوطنی خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے امید ہے کہ جب ایسا موقعہ آیا تو ہمیں اس سے بچانے کے لیے آزادی کی نسبت زیادہ آسان ہوگا۔ وہ ایک لمحے تو پ کے گولے کی قیمت ایک ہزار ہموطنی صحافت کے آزاد حملوں کی چھاپہ سے زیادہ وحشت ناک ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ میدان جنگ کا مطالعہ کرتے ہیں اب ان اخبارات کا مطالعہ کرتے

کر سکتا۔

جذبۂ نسل کا مقدس جذبہ کوئی مال تجارت نہیں

جنگ سے پہلے دنیا میں ہر قومی مسائل کو حسن تدبر اور کامیابی سے حل کیا جاتا تھا اس کی ایک اور مثال حسب ذیل ہے۔ اگر ایک طرف قوم کو اخلاقی اور سیاسی گھن کھا رہا تھا تو دوسری طرف قوم کی جسمانی صحت بھی کئی برس سے زہریلی چھوت کا شکار ہو رہی تھی۔ بڑے شہروں میں خاص طور پر آتشک کا زور تھا۔ اس کے ساتھ ہی قریب قریب ملک کے ہر حصہ میں سوزاک نے سوت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

قوم ان دونوں بیماریوں کا ہولناک شکار ہو رہی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی میں اس علت کا رخ موڑنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کی ہمت ہی نہ تھی۔

بالخصوص آتشک کے سلسلے تو عوامی اداروں نے اور سرکار دونوں نے تغافل ہی دیے تھے۔ صورت حال کی اصلاح کے لیے فی الواقع جو کچھ کیا جا رہا تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر انتظامات کی ضرورت تھی۔ کسی زبردست لعنت کا مقابلہ کرنے کے لیے محض مٹھی بھر دواؤں کو فراہم کر دینا کافی نہ تھا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تشخیص کا اہتمام بہت خوب تھا۔ یہاں ایک دفعہ پھر ضرورت یہ تھی کہ مرض کی علامتوں کا علاج کرنے کی بجائے اس کے اسباب دور کیے جاتے۔ اس مرض کا بنیادی سبب عشق کے پاکیزہ جذبوں کا ناپاک استعمال تھا۔ صحت فروشی سے پیدا ہونے والی بیماری قوم کو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ختم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ صحت فروشی ہماری روحانیت کے دامن کو بدبودار کے اثر سے داغدار کر رہی تھی۔ تو لعنت تاسل کے طبعی اور نسلی جذبہ کی پوتجارت دریا بار دوڑنے والی نسلوں کا قلع قمع کر دے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تندرست اور سعید الفطرت بچوں کی جگہ قوم کی آغوش میں ایک ایسی انسان نما مخلوق کا ہجوم ہو جائے گا۔ جس کی پیدائش اقتصادی جمع خرچ کے گھپلوں کی مرہون منت ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم زوجین کی شرطوں اور بنیادی اساس اقتصادی جمع خرچ

کے کھیت تباہ کر رہے ہیں۔

عشق نے ان پابندیوں سے بیزار ہو کر اپنے لیے نئی راہیں اختیار کی ہیں۔ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح یہاں بھی بگڑی ہوئی صورت سے فطرت کی بالادستی کرنا ممکن ہے لیکن ہر بار وہ قدرت کے شدید انتقام کا سامنا کرتا ہوگا۔ انسان کو اب اس حقیقت کا ادراک آتا ہے جب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

نظامِ فطرت کے مطابق ازدواج کی بنیادی شرائط پوری کرنے سے مسلسل انحراف کے نتائج کیسے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ہمارے رؤسا کے خاندان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ رؤسا کے خاندان میں ہم صاف صاف اور بالشافہ توالد و تناسل کی ان عادات کے اثرات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو اقتصادی تنگ طرح کے گھروں اور ماحول کی پابندی پر مبنی ہوتی ہیں۔ ماحول کی پابندی سے تو پیدائشی ظاہرات خاندانی وصف بن جاتے ہیں اور اقتصادی تنگ طرح کے گھروں سے خون میں گھوٹ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ حضور نواب صاحب کے خاندان کا ذکر کرنے کے لیے منڈی کے بہبودی دواخانہ کی لڑکی نواب صاحب کے ورثہ کا جوڑ کھا جاتی ہے۔ اس تنگ طرح کا پس منظر نواب زادے کے چہرے پر کھدا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ خاندانی وصف میں بالکل ہڈی بگڑ جاتی ہے۔ ہمارے متوسط حال طبقے بھی آج کل یہ کھیل کھیلنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان کا بھی یہی انجام ہوگا۔

اس ناخوشگوار حقیقت کو جہالت تو مزید خطرناکیت کے ساتھ نمودار کر دیا جاتا ہے۔ کوئی آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت حال کو کیسے بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہمارے بڑے بڑے شہروں میں قحبوں کے باشندے اپنے جذبہ عشق کی تسکین کے لیے مصنوعی ذرائع کی جانب روز بروز رجوع کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہوانی امراض کی بھرمار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ عوام کے اندر ان امراض کی بھرمار دیکھ کر ہمیں جاننے کے دو سچے نتائج ایک طرف تو یہ کہ خاص میں

دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے معصوم [illegible] کا مشاہدہ گھروں کے اندر پلنے والے معصوم بچوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو وقت ہماری مہاشرتی زندگی کو ہر طرح معصوم کر رہی ہے اس کی رفیعہ دوسرے معاشروں کی طرح ہمارے معاشرے سے بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا میں نے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ معصوم بچے اپنے والدین کے گناہوں کا عذاب بھگت رہے ہیں۔

اس ماحول میں دوسرا ناک صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد بھی ہیں۔ کئی لوگ آنکھیں بند کر کے چلنے لگتے ہیں۔ تاکہ کہیں کچھ نظر نہ آ جائے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ تو کچھ دیکھتے ہی نہیں اسے نہ دیکھنے کے برابر رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ آسان اور سستا علاج ہے۔ بعض دوسرے لوگ پرہیز گاری کی چادر میں منہ چھپانے لگتے ہیں۔ یہ پرہیز گاری بھی ایک مستحکم نیز ہے جس کے متعلق وہ کہتے ہیں یہ سب گناہ کی باتیں ہیں اگر کوئی ان حقیقت حال سے دوچار کروانے کی جرات کرے تو وہ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ وہ نظریں ملانے کراہت کا اظہار کرتے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر رب ذوالجلال سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر اس کا کوئی بس چلتا ہے تو جس طرح اس نے قوم لوط اور دوسرے نافرمانوں پر عذاب نازل کیا تھا اسی طرح ان گناہگاروں پر آگ کی بارش اور پتھروں کا مینہ برسا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دے۔ اگر یہ عذاب ان پرہیز گاروں کی موت کے بعد تک بھی ملتوی ہو جائے تو انہیں خدا سے کوئی خاص گلہ نہیں۔ غیر میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اس لعنت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ لوگ بے بسی کا اظہار کر دیتے ہیں کہ ہمیں اس خطرہ کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں۔

دنیا میں صرف تندرست اور توانا قومیں باقی رہیں گی

بے شک یہ قوم بہت سے بیماریوں میں مبتلا ہے۔ ہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آنے والے خطرات کے مقابلہ میں اس بیماری قوم کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی

ہے۔ یہ بھی کہ دوسری قوموں کا حال ہم سے بہتر نہیں ہمارے پاس انتظام کا مادہ نہیں۔ البتہ دوسری قوموں سے بھی زیادہ اس امر کی اپنی زبان حال کو ضرور زیادہ قابل برداشت بنا دیتا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے کیا کوئی قوم رہنمائی کرے گی اور کون سی قومیں اس کا شکار ہونے سے بچیں گی۔ تمام صورت حال کا لب لباب یہی مسئلہ ہے زمانہ حال اسی اقدار کے پیمانے آزمائش ہو رہا ہے۔ جو قوم اس امتحان میں ناکام ہو جائے گی وہ تباہ ہو جائے گی اور اس کی جگہ تندرست اور زیادہ توانا نسلوں کے سپرد کر دی جائے گی جو حالات کا مقابلہ بہتر طور پر کرنے کے قابل ہوں گی۔ اس سوال کا تعلق آنے والی نسلوں سے زیادہ تعلق ہے۔ اس کے بعد اس معاملہ میں کسی قسم کی کوتاہی سرزد ہوئی تو وہ ان غلط کاریوں کی فہرست میں شامل ہوگی جن کی ہولناک سنگینی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے گناہوں کی سزا ان کی ہوا دیکھوں پشتوں تک ملتی ہے۔ یہ ہے وہ عظیم ذمہ داری جو نسل اور قوموں کی طرف سے ہر ایک کی ذمہ داری کرنے کی پاداش میں نازل ہوتی ہے۔

اس دنیا میں خون اور نسل کا گناہ ایک بڑی گناہ ہے جو قوم اس گناہ کی مرتکب ہو اس سے زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ جنگ سے پہلے ہر ملک کے اہم ترین مسائل میں تھا۔ ہر ملک اس کے حل کے لیے جو روش اختیار کی گئی وہ قابل شرم ہے۔ اس ہلاکت کے نوجوانوں تک پہلے کو ہلاک کرنے کے لیے بڑے بڑے شہروں میں کیا قدم اٹھائے گئے؟ ساری مہذب زندگی کو خاطر اور تباہی کے قابل میں ڈالنے والے اسباب کا تدارک کا کیا انتظام کیا گیا؟ تندرست اور توانا نسلوں کے بجائے آنکھ ساری قوم میں سرایت کر چکی تھی اس کے سد باب کا کیا انتظام ہوا؟ ان سوالات کے جوابات کو جانچنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جو کچھ کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کا مختصر بیان کر دیا جائے۔

ہر ملک کو اس مسئلہ کا حل بے لگے بندھے سے تلاش کرنے کے بجائے اپنا حال رکھنا چاہیے

جاتا کہ سب کچھ ہی مسئلہ کو حل کرنے پر موقوف ہے۔ انہیں کوئی شک نہ رہتا کہ آگر دیا تو ہماری قوم بہت تندرست آپ کی مدد پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائے گی۔

اگر ضرورت محسوس ہوتی تو یہ ابتدائی اقدامات مسلسل کی صدیوں تک جاری رہتے۔ صرف اسی طریقہ سے ہم اپنے عالمہ ہو قومی مزاحمتی قوتوں کو بیدار کیا جا سکتا تھا۔ اب یہ حالتیں ہیں تو صرف اسی صورت میں پاکستانی کے ساتھ واضح اتحاد سے ہاتھ ملا سکتے تھے۔ ورنہ شاید کہ اس ساری کوشش سے عوام کی ہمدردیوں منقطع ہی ہو جائیں۔ یا قوم کا ارادہ سست پڑ جائے۔ پھر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت کے عداوت کا کر زبانی ڈالنے کے لیے ہمارے ہوائی جہازوں کو بیچنے پر مشتعل ہونے کی عادت ہے۔

آتنک کے خلاف قدم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ مصنوعی فروشی اور ہم پر مبنی ہوم پر مبنی انجکشن پر مبنی تمام تعصبات اور ضمیر کی پرہیزگاری ان سب کے خلاف ایک وقت عداوت جنگ قائم کرنا ہوگا۔

سرکار کو اس وقت تک جدوجہد کی پہل شروع کرنے کا حق حاصل نہیں جب تک پہلے نوجوانوں کو چھوٹی عمر میں لاحق کرنے کی سوئیں مہیا نہیں کی جاتیں۔ اس رہبری کے بعد لاحق کی رسم ہی کسی پہلو سے غور کیا جائے۔ یہ رواج انسانیت کے لیے وحشت ناک ہے۔

مصنوعی فروشی انسانیت کی لعنت ہے۔ اس کا مذاق علمی یا تجرباتی وسائل سے ناممکن ہے۔ پہلے اس کو تاریخ میں لانے اور پھر ختم کر دینے کے لیے بہت سے ایسے گروہوں کے حالات کا مطالعہ کرنا لازمی ہے جو اس کے معاون ہیں۔ اولین شرط تو یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن سے صنعتی میں لاحق کرنا آسان ہو جائے۔ بالخصوص لڑکوں کو بچپن میں لاحق کرنے کے قابل بنانے کے لیے موجودہ حالات میں بڑی بڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ

کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جو آگے وہ ایک ایسی حکومت تشکیل کی تخلیق کے لیے راہ ہموار کرتا ہے جس کی قوت مدافعت مفلوج نہ ہو۔ وہاں یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ جب تک دوسرے سماجی تبدیلیاں نہ کی جائیں تب تک صفائی کے نظام کو عام رواج نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مکمل سماجی تبدیلیوں کے بغیر صفائی کا نظام ممکن ہے۔ بالخصوص دیگر کو نظام یہ مسئلہ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا حل صحیح سماجی معاشرت کا پس منظر بدل کر ہی ممکن ہے۔ ان تبدیلیوں پر غور کر کے اندازہ کرنا چاہیے کہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ اس لیے ضروری ہے۔ کہ ہماری آج کل کی ناموزوں رہائشی عوام کے لیے رہائشی مکانات بھی مہیا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ جب مکانات ہی نہیں تو نظام اخلاق جو ہمارے زندگی کہاں سر کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ کوتاہیاں جن سے صحت فروشی کو فروغ دینے کا راستہ صاف کیا جاتا ہے۔

صفائی کے نظام کو ممکن ہونے کی ایک اور بھی ہے۔ یہ ہمارے ہوا کی متعلقہ شرح مقابلہ ہے۔ کچھ ہو صفائی کرتے وقت یہ خیال ہی نہیں کیا جاتا کہ کچھ ایک خاندان کے گزارہ کے لیے کافی ہے۔ صحت فروشی کا قدر مشترکہ نقطہ صرف صفائی کے نظام کو عام رواج دینے کے لیے ممکن ہے اور صفائی کے نظام کو بھی عام رواج دیا جا سکتا ہے۔ جب پہلے بنیادی اور انقلابی معاشرتی اصلاح کے ذریعہ مجموعی فکر کا رواج زیادہ آسان ہو جائے۔ صحت فروشی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے یہ پولیس داری اور بنیادی شرط ہے تین پر ایک نظیر چار دیوار۔

پبلک تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت لازمی ہے

دوسری شرط یہ ہے کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے متعلق رائج اعلام خلاف نظریہ کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اس طرح کسی نے آج تک توجہ نہیں دی۔ ہمارے تعلیمی نصاب میں دماغی تعلیم اور جسمانی تربیت کے مابین توازن قائم کرنا ہوگا۔

جس ہمارے کو آج کل مکتب کہا جاتا ہے اس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی۔ لیکن مکتب

کی موجودہ شکل ایک دیہی گاؤں کے اس تصور کی توہین ہے جو قدیم یونان میں رائج تھا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہ بغیر تندرست جسم کے کوئی تندرست دماغ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ چند مستثنیات کو چھوڑتے ہوئے قوم کے عوام خاص طور پر اس قاعدہ کے حامل ہیں۔

جنگ سے پہلے جرمنی میں کوئی اس حقیقت پر غور نہ کرتا تھا۔ جسم کی تربیت میں بھرپور محنت کی جاری تھی۔ قوم کی عظمت برقرار رکھنے کے لیے دماغ کی ایک طرح نشوونما کو کافی سمجھا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جس کا خمیازہ دو جنگ سے پہلے بھگتنے کی نوبت آئی تھی۔ یہ کوئی اتفاقی حرکت نہیں کی وہ تعلیمات میں ان عناصر میں زیادہ فروغ پاتی ہیں جہاں کے باشندے گھٹیا ہوں۔ اور جو قومیں کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ وہ جرمنی جیسی عظیم اور زبردست قوموں کی طرح ایسے ہی جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہودیوں کی بے پناہ بڑھی ہوئی چھوت کی ذہنی بیماری کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کر سکے۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ خود پڑھے لکھے طبقات بھی انسانی طور پر ضعیف ہیں جو قومی کے جسم نہیں بلکہ ذہنی پرورش کی خاطر ہماری قوم کے بالائی طبقات کی تربیت ذہنی تعلیم تک محدود ہونے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ قومی زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کی طاقت سے عاری ہو چکے ہیں۔ کیونکہ عہد حاضر میں انسانی حالت کی فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ذہنی زور۔ یہ لوگ بالواسطہ زندگی میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھنے کی مستقل طور رکھتے ہیں وہ آگے ترقی کرنے کی۔ یہی کمی جسمانی کمزوری ہمیشہ انسان کو زوال پذیر بناتی ہے۔

محض ذہنی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دینے اور اس وجہ سے جسمانی تربیت سے سراسر غافل رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کی عمر میں ہی ان کا جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ جس بچوں کی پرورش اور کھیل کود سے مضبوط اور تربیت یافتہ جسم بچے ہوں ان کی شوخ کا بچہ اپنے گھر بیٹھے رہنے والوں کی نسبت کم ہی ہوتا ہے جو ہمیشہ ذہنی محنتوں ہی کرتے رہتے ہوں۔ کوئی صالح نظامِ تعلیم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ بھی نہیں

بھولا ہوا ہے کہ ایک نوعمر لڑکا جوان کسی عورت سے جو توقعات رکھتا ہے وہ ان توقعات سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جو کہ اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کسی لڑکے والی ہاتھ آتی ہے پرورش ہوتی ہیں۔

غرض تعلیم کے ہر شعبہ میں تدریس کے روزانہ نصاب کو اس طرح ترتیب دینا چاہیے کہ ایک بچہ کا دماغ وقت اس کے جسمانی قوی کو مفید نشوونما دینے میں صرف ہو سکیں۔ اس عمر میں اسے آوارہ پھرنے شوق عام پر شرر نہیں کرنے یا سیاسیات میں وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں جب وہ روزمرہ کا کام ختم کر چکے تو اسے پورا حق ہونا چاہیے تاکہ سیر تفریح کرنے پر وہ مجبور نہ ہو۔ ہر تعلیم کا فرض ہے کہ وہ بچے کو یہ ضرورت پوری کرنے کے قابل بنائے اور بنی حقیقت یہ ضرورت پوری کی کرے۔ ہمارا نظام تعلیم عقل کی پیاس بجھانے والا نظام نہیں۔

ہمارے مکتبوں کو یہ اصول بھی ترک کر دینا چاہیے کہ جسم کی تربیت ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جسے انفرادی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کسی فرد کو یہ آزادی حاصل نہیں کہ وہ آئندہ نسلوں کے خلاف گناہ کا ارتکاب کر کے ان کو نقصان پہنچائے۔

جسم کی عصمت بچانے کی لیے ذہن کی معصومیت کی حفاظت لازمی ہے

جسم کی تربیت کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ذہن کی تربیت کے سامان بھی فراہم کرنے چاہئیں آج کل ہماری تمام جسمانی زندگی کو مہیاشیوں کے ایک ایسے تلپ سے تعبیر دی جا سکتی ہے جو فقط جنسی تصورات اور جنسی محرکات کو بھڑکانے کے لیے قائم کیا گیا ہو۔ سینماؤں تھیٹروں اور دوسری تفریح گاہوں کے مناظر کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس میں عنوان پر جانی جانے والی فلم شامل نہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو تو بالخصوص ان سے پرہیز واجب ہے۔ شہنشاہ ہوا کے مختلف طریقوں سے عوام کی توجہ بہت [illegible] اپنی طرف منعطف کرنے کی

ہے۔ جو خلل شباب کے ارمان دل محو کہیں کر پایا وہ کچھ سکتا ہے کہ ایسی ملکات کے
نتائج کتنے خوف ناک ہوتے ہیں۔ یہ شہوت انگیز اور ورغلانے والی فضا ہمارے
نوجوانوں کے ذہن میں کیسے خیالات داخل کر رہی ہے کہ جس سے ابھی نہیں وہ واقف
رہنا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی "تعلیم" کے نتائج ہمارے نوجوانوں میں کھلی دیکھے
جا سکتے ہیں۔ جو وقت آنے سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اور اس لیے وقت آنے
سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پندرہ اور پندرہ سال کے بچوں کی روحانی
کیفیات کے متعلق گاہ گاہ ہمارے کارکنوں کے دل میں ایسے ایسے اضطرابات
پیدا ہو جاتے ہیں جس سے گھن محسوس ہوتی ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا کچھ باعث
تعجب نہیں کہ اس عمر کے بچے بھی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچے جسمانی طور پر
صحیح ہوں مگر اخلاقی لحاظ سے مگر ہمارے نوجوانوں کی کثیر تعداد دیکھ کر خوفناک شرم محسوس ہوتی
ہے جنہیں بڑے بڑے شہروں کی گلیوں میں آوارہ پھرتے ہوئے سر بازار سے اٹھا کر
دیتی ہیں۔ ان میں جو عصمت فروشی کو ختم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان
سب سے پہلے وہ روحانی علل دور کرنے میں مدد دینا ہوگا جن کے باعث عصمت فروشی
فروغ پاتی ہے۔ انہیں غور کرنا ہوگا اجتماعی خوشی سے اپنا منہ موڑ کر ہمارے بڑے
بڑے شہروں کی "تہذیب" کو اخلاقی گندگی سے پاک کرنا ہوگا۔ اگر ہم اپنے
نوجوانوں کو ان کے موجودہ ماحول کے گندے اثرات سے بچا نہ سکے تو تباہ ہو
جائیں گے۔ جو لوگ ان لڑکوں کو بچوں کو دیکھ کر دیتے ہیں وہ دراصل ان کی روح
قتل کرتے ہیں۔ وہ عصمت فروشی کے نتائج آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کے مجرم
ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کی حفاظت موجودہ نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر کیسے ممکن ہے؟
ہماری ثقافت کو پاکیزہ بنانے کی یہ مہم قریب قریب زندگی کے ہر شعبہ میں جاری کرنی ہو
گی۔ تجربہ گاہوں لیبارٹریوں "سماجی اصلاحات اور انتظامات ان سب سے گندگی کے ڈھیر
دھونے چاہئیں۔ اور ان سب سے قوم کی خدمت ہو قوم کی تہذیب کی خدمت کا کام ہوگا

ہو سکے۔ قومی زندگی کو جدید تقاضوں کی روشنی میں نئی خطوط پر استوار کرنا یا
ہمہ وقت سے بکسر پاک کرنا ہوگا۔ ان سب اقدامات میں مقصد کار اور طریقہ کار
دونوں کا تعین خالص قومی مفاد اور اسلام کے مفاد کے نقطۂ نظر سے ہونا ہوگا۔ دونوں
فریضہ اسلامی کی ادائیگی ہے۔ شخصی آزادی کا حق دوسرے درجہ پر آتا ہے۔

جب ان اقدامات پر پوری طرح عمل درآمد شروع ہو جائے تو اس کے بعد ہی اس امت
کے علمی علاج کی مہم کو بھی کامیاب بنانے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ یہاں پھر دوسرے
اقدامات سے کام پڑے گا۔ دوسرے دو اہم فیصلے کرنے ہوں گے۔ ایک تو علاج مریضوں
کو پیش نظر رکھے کہ وہ ایک کے بعد دوسرے تدریجی انسان تک پہنچ جائیں
تو یہ دوسرے اقدامات کا وقت ہوگا۔ یہ ان قوتوں کی اندرونی تشکیل ہوگی جو ایک بیمار کا
ہی رہنے کو بیشتر ان تندرستی قربان کر دیتی ہے۔ یہ مطالبہ نہایت معقول دلائل رکھتا ہے
کہ ناقص اشخاص کو ناقص ہونا پیدا کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ ایسے پابندی نافذ
کرنے کا بندوبست اندرونی تشکیل کا بہترین ثمر ہوگا۔ ناکارہ بچے کا وہ تکلیف دہ دور سے بچ جائیں گے۔ قومی صحت میں بھی تدریجاً ترقی ہوگی۔ اگر اس تجویز پر مضبوطی
سے عمل کیا جائے تو امراض خبیثہ کی مزید نشوونما رک جائے گی۔ بلکہ صرف پندرہ سال کی
رہ جائے گی کہ علاج مریضوں کو باقی آبادی سے جدا کر دیا جائے۔ ممکن ہے ان چند
شخصیوں کے حق میں تو یہ ایک حوصلہ شکن ہوگا۔ لیکن یہی اقدام ہوگا جو آئندہ
نسلوں کے لیے باعث رحمت ہوگا۔ اس طرح موجودہ صدی میں تھوڑا سا دکھ برداشت
کر کے آئندہ ہزارہا نسلوں کو دکھ سے بچا لیا جائے گا۔

محض قانونی پابندیوں سے مہلک اثرات کا خاتمہ ناممکن ہے

یہی نوع انسان کو جو عظیم انسان کسی دوائی میں ان کے تدارک میں سے آتشک کا
تعاقب اور آتشک کو ختم کر دینے کی اصل مہم اپنی مصلحت فراموش کا تدارک ہی ہے۔
میں اس مہم کو عظیم الشان اس لیے کہتا ہوں کہ یہاں صرف کسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کا

تک مجبوت خود اس کے شوہر کے ذریعہ پہنچی ہو تو اس کی مشکل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیا ایسی حالت میں عورت خود اپنے شوہر کے خلاف بھی فرد جرم عائد کروانے کی کوشش کرے؟ یا پھر وہ کیا کرے؟؟

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے وہاں ایک اور ہی دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مدفعتی سے وہ اس مرحلہ کا عموماً نشہ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت انہیں پہلی "ضرب محبوبہ" کا معائنہ کرنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ ہر مرد کی خواہش اس بارے میں "خوب" کا ہونی ہے۔ مرد وہ اس پے خان خان کر شراب کے نشہ میں مدہوش مردوں سے کام نکالتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ صبح ہے مرد کو بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کی "محمد مصطفیٰ" کون تھی۔ برلن اور میونخ جیسے بڑے شہروں میں آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ عورتوں کے بہت سے ادارے ان بیرونی اضافوں سے نمٹنے میں مدد شری زندگی کے جہنم میں اسیر ہو کر بالکل ہی گم سم ہو جاتے ہیں۔ ایسے سادہ لوح مرد ہیں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

بڑی بات تو یہ ہے کہ کون کہہ سکتا ہے کہ کسے مجبوت لگ چکی ہے یا نہیں۔ کیا ایسی واقعہ دشمنوں کا ثبوت موجود نہیں جہاں بظاہر ایک شخص علاج سے تندرست ہو گیا تھا لیکن بعد میں پھر بیمار ہو گیا اور اس نے اپنی میں بے اندازہ نقصان پہنچایا۔

یہی وجہ تھی کہ عطاران قوانین کے بنانے والے تھے۔ مصنف فرولی پر قابو پانے کی کوشش کا بھی یہی حشر ہوا۔ حالات موجودہ بھی علاج بالظاہر شفا یابی ناقابل اعتماد ہے۔ کم از کم مشکوک ہیں۔ یعنی مرحلہ یہ ہے کہ وہ جو اس قسم کی کوششوں کے بعد اتنے زیادہ گھبلتی جا رہی ہے۔ اس ایک حقیقت کا احساس انسانی قوانین کو کالعدم قرار کے ناکارہ قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ لوگ اس موضوع کو بالکل اہم نہیں سمجھتے انہیں اس مرض کی شناعت کے بعد دوشنی کا معائنہ کرنا چاہیے۔ گزشتہ ایک صدی میں اس کے فروغ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اور پھر یہ غور کرنا چاہیے کہ آئندہ اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

اگر کوئی شخص غیر معمولی طور پر بیوقوف نہ ہو اور اس کے سامنے صورت حالات کی وضاحت کی جائے تو اس مسئلہ کے متعلق معمولی معلومات کے بعد ہی اس کے ذہن میں کنجی کی لہر دوڑ جائے گی۔

جنگ سے پہلے ڈنمارک میں اس قریبی کے تمدن کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اسے یقیناً انسانی ترقی کی شہادت کہنا چاہیے۔ جب ان تمدنی کی عناصر جمع و جمع کرنے کی ترکیب بھی ہاتھ آ جائے تو اس انسان کی دنیا میں زندہ رہنے کا حق ثابت ہو جاتا ہے۔

ثقافت کا عروج و زوال قوموں کے عروج و زوال کی نشانی ہے

قدیم یورپین سلطنت کے انحطاط کی کھلی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی کہ تہذیب اور ثقافت کا نام و نشان آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔ جب میں ثقافت کا نام لیتا ہوں تو اس سے میری مراد وہ تہذیب نہیں ہوتی جسے آج کل یہ نام دیا جاتا ہے۔ یہ نام نہاد ثقافت اور تہذیب تو اسے زندگی کے روحانی ارتقاء میں حائل ہے۔

گزشتہ صدی کے دوران میں دنیا کے اندر ایک نئی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس کا کسی کو آج تک وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور جو ہمارے لیے بالکل اجنبی تھی حالانکہ اس میں بھی حسن و خوبی کی خلاف ورزیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن یہ خلاف ورزیاں اس طرف میں بھی ایک نئے راستے کی تلاش کر سکتی تھیں لیکن یہ پوری بحث انتخاب صرف فنی طور پر مکمل نہ تھا۔ بلکہ معنوی انحطاط کا بھی ترجمان تھا۔ اس کے محض ہونے تو وجدانی منہوم سے سرسر عاری تھے گویا آنے والے زوال کی نشانیاں سب سے پہلے ثقافتی حلقوں میں نمودار ہونے لگی تھیں

کیونکہ صرف ایک ہی قسم کی روحانیت اور ثقافت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ یہ تمدن لطیفہ کو بھی کیونکر ہم کے رنگ میں رنگ دے۔

اگر کسی شخص کو یہ دعویٰ عجیب معلوم ہو تو اسے صرف ان دو قسم کے ملکوں پر نظر دوڑانے

کی ضرورت ہے تو کیونکر اس کا انکار ہو سکتا ہے۔ وہ جلد ہی پیدا کر لیا جائے گا۔ کیونکہ ان ممالک میں اب تک جن میں ابھی دماغ کے مریض فن کاروں کی بے تکی اور ذہنی تخلیقات کے سوا تون لطیفہ کے کوئی متوازن نمونے تیار نہیں ہوتے۔ آرٹ کی وہ تمام مسخ شدہ اور مکمل صورتیں جنہیں انطباعی تصوری یا عمومی تصوری کا نام دیا جاتا ہے اور جو موجودہ صدی کے آغاز میں نمودار ہونے لگی تھیں ان ممالک میں سرکاری طور پر فنون لطیفہ میں داخل تسلیم کر لی گئی ہیں اور ہماری کمزور سے حکومت تھوڑے ہی دن زندہ رہی۔ لیکن وہاں بھی اس "آرٹ" کا زوال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ ملک خانہ جنگی کے خطرے سے دوچار ہو رہا ہے۔ خانگی دوکان میں بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ اس دوکان کی چھت تمام سرکاری اشتہارات کے پوسٹروں کی تصویروں اور اعلانات سے بھری ہوئی تھی۔

آج ہم اس پوری دوکان اور خانگی کوٹھڑی سے دوچار ہیں۔ آج سے آٹھ سال قبل کسی کو اس کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ یہ خانگی کوٹھڑی ۱۹۰۰ء سے انطباعی تصوری کی صورت میں رائج ہو رہی ہے اگر آج سے آٹھ سال قبل کوئی شخص اپنی بدیانت قلب تصوری یا تصوری کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا یا ایسی تصوری کی نمائش منعقد ہوتی تو اس کا قلع قمع کر دیا جاتا۔ ایسی نمائش کے منتظمین کو پاگل خانہ بھیج دیا جاتا۔ ان دنوں ہر گز اس قسم کے رجحانات کو پنپنے کی جازت نہ دی جاتی۔ نہ اسے عام طور سے برداشت کرتی۔ ہر حکومت خاموش رہتی۔ مگر ایک حکومت کا یہ بھی تو فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کو ایسے خطوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھے۔ اس قسم کے آرٹ کو قبول کرنے سے سوائے دیوالیہ کے اور کس چیز کا رجوع ہو سکتا ہے۔ ایسا آرٹ تو انسانی تاریخ میں مدتوں انحطاط کا پیش خیمہ ہوگا۔ اپنے فنون لطیفہ کے رجوع کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانی ذہن راہ راست پسندی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس طرح انسان کے جنون بدل تو گئی تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اگر ہم گزشتہ پچیس سال میں اپنی خانگی زندگی کا مطالعہ کریں تو یہ دیکھ کر

تجربہ ہوا ہے کہ ہر کس قدر روایت پسند ہو چکے ہیں۔ چاروں جانب ان کی ظلم کی شدت کے آثار دکھائی دیتے ہیں جس سے قوم کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ اور جو دیرینہ روایات کی تہذیب کو ختم کرنے کے مترادف ہے اس علامت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو آہستہ آہستہ کھا جانے والے گھن کی نشانی ہوتی ہیں۔ جو قومیں وقت پر ان کے اسباب کو روک نہیں سکتیں ان کی موت کی گھڑی قریب ہوتی ہے۔

کوئی اچھی تحریک قدیم خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتی

قرآن کریم ثقافت اور فنون لطیفہ کے ہر شعبہ میں ہمارے لیے بہتر نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نئے کے عروج کا وقت گزر چکا ہے۔ اور اب انحطاط کا زمانہ شروع ہے۔ اس صدی کے شروع میں تصویروں کو دیکھیے تو وہاں بھی زوال کی بندش ہو چکی تھی اور وہ بھی ثقافت کے اس کارشتہ کٹ چکا تھا۔ ہاں دریائی تصویر اس قاعدے سے مستثنیٰ تھے کیونکہ وہاں قومی ورثے کو وہاں مسخ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ان مستثنیات اور چند دیگر شاذ و نادر امور کو چھوڑ کر جو ہمیں نمونے دکھائے جاتے تھے ان کی بابت یہی کہنا کافی ہے کہ اگر قوم کو انہیں دیکھنے کی اجازت نہ ملتی تو بہتر تھا۔ بدقسمتی سے ان علامتوں میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی کہ فنون لطیفہ کے اکثر مراکز کے دروازے ہر کس و ناکس پر بند تھے اور ہاتھوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان اداروں کے متعلق یہ احتیاط برتنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جن کا بنیادی مقصد ہی نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ہوا کرتا تھا۔ نہ کہ محض بڑی عمر کے لوگوں کے لیے سامان تفریح فراہم کرنا۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہ پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اگر ماضی کے بڑے بڑے نامور لوگوں کو ان حالات کا علم ہوتا تو وہ ان پر تعزیر بھیجتے۔ وہ کبھی ایسی پابندیاں پسند نہ کرتے۔ شاید کوئی کوالٹ کا پتہ چلاتا تو وہ کیسا مرد ہوتا۔ مرد کے کون سے وصف ہیں تو وہ یقیناً مگر پر ہے ہوتا لیکن شرگوشے یا مکھیر کی صورت میں لڑکے کے شاعر کے سامنے کیا حیثیت ہے؟

ماضی کے ہر اس تواصل قدر ورثہ کے خلاف اندھی نفرت پیدا کر دیتا ہے جو اس کی اپنی اختراع سے بہتر ہو۔ مثال کے طور پر جب تک تاریخ میں فریڈرک عظیم کے کارناموں کی یاد تازہ رہے گی فریڈرک جیسا بادشاہ کون ہو سکے گا؟ سائنس موسیٰ کی یادگار استی کے سامنے بڑی نہیں کہ اس کے سامنے مصور بت پسندوں کی تو ہمی اہمیت رکھ جو سورج کے سامنے چاند کی۔ چاند نی تو جب ہی چمک سکتی ہے جب دھوپ غائب ہو چکی ہو۔ اس سے یہ سمجھنا کچھ بہت مشکل نہیں کہ انسانی تاریخ کے رہنماؤں کو آقاؤں سے کیوں دشمنی رہتی ہے۔ جہاں تک ہو یات کا تعلق ہے اگر نظر ہیں ہ اسنوں کو بھر پنے کے خواہاں ہوتے ہیں بلکہ جہاں اس چلے پی کر توں کے خلاف ہر قسم کی تنقید کا سد باب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کی ذہن ہر کار نے تو ہمات کے نام سے جو قانون بنایا ہے وہ اس دعوی کا ثبوت ہے۔ ہر پیغمبر عقیدہ و فلسفہ اور سیاسی و اقتصادی تحریک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو ماضی کے تمام مسلمات کا انکار کر دے انہیں تغیر ہو رہا کا ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ انسانی ارتقاء کے حق میں ہر مفید اختراع کی ابتدا اسی مرحلہ سے ہوتی ہے۔ جہاں انسان اس سے پہلے پہنچ چکا ہو۔ جو سچائیاں ثابت ہو چکی ہیں انہیں تسلیم کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ تمام انسانی کوشش ہو خواہ انسانی زندگی کے طویل نشوونما کے تسلسل کا نتیجہ ہے۔ ہر زمانہ نے اس عظیم الشان عمارت کے کوئی نہ کوئی منزل تعمیر کرنے میں مدد دی ہے۔ انقلاب کا مقصد اور مطلب یہ نہیں کہ ساری عمارت مسمار کر دی جائے۔ بلکہ انقلاب کا مطلب تو صرف اتنا ہونا چاہیے کہ عمارت کا جو حصہ ناموزوں ہے یا بیکار ہے اسے ہٹا دیا جائے۔ اور اس طرح جو جگہ خالی ہو اس کو از سر نو تعمیر کر دیا جائے۔ اس تعمیر کے بعد بھی ساری عمارت کو اکثریت بھوی ترقی دینے کی ہمہ وقت کوشش جاری رہنی چاہیے۔

اس اصول کو تسلیم کیے بغیر ارتقائے انسانی کے کوئی معنی نہیں سمجھے جاتے۔ اگر اس اصول کا انکار کر دیا جائے تو دنیا ہمیشہ جہنم زار میں مبتلا رہے گی کیونکہ ہر نئی نسل ماضی سے

www.urdufanz.com

طرف اپنا حق تصور کرے گی۔ کوئی بھی کام شروع کرنے سے قبل تمام ساتھی کارکنوں کو اپنے علاوہ کی طرح ذمہ دار سمجھا جائے گا۔

بالشویکی آرٹ اپنی افتتاح کا ترجمان ہے

جنگ سے پہلے اسی تہذیب کی جو درگت بن رہی تھی۔ اس کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ یہ صرف خون لطیف کے نمونے اور تہذیب دنیا کے نوادرات تیار کرنے والی تخلیقی قوتوں کا خاتمہ نہ تھا بلکہ ماضی کے عمل نمونوں سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان کی مذمت ہوتی تھی اور ان کی بیخ کنی کی کوشش کی جاتی تھی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں قوم کو خود پسندی پر بھی شرمسار رہنے کا بڑا شوق رہا تھا۔ ماضی کے نمونوں کی بے قدری اور انہیں تقریباً پامال کرنے میں انہماک تھا۔ بالخصوص تعمیر اور تصویر کا تو یہی حال تھا۔ غضب یہ تھا کہ شرمناک انحطاط کے اس دور میں کوئی بلند پایہ شے تیار کرنے کی ذرہ بھر استعداد نہ تھی۔ ماضی کو زمانہ حال کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش اس امر کا ثبوت تھی کہ مصنفین کے ان خطوط نویسوں کی بیخ کنی ان علامات سے صاف ظاہر تھا کہ سوال بگڑے ہوئے ثقافتی تصورات کے رواج پکڑنے کا نہ تھا بلکہ یہاں تو انسانی بیت کی جڑوں پر کلہاڑا چلایا جا رہا تھا۔ انسان میں آرٹ کا جو احساس آج تک کبھی نہ کبھی معقول بنیادوں پر استوار تھا اب بالکل غلط ملط کر کے بالشویکی نظریات کے لیے راستہ ہموار کیا جا رہا تھا۔ اگر یونان میں فن کا تخلیقی جذبہ وہاں کی تعمیرات کی صورت میں ظاہر ہوا تھا تو بالشویکی عہد کی ترجمان مکمل صورتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ پھر ہماری قوم اس خاص جذبہ کی بیخ کنی کی جانب توجہ مبذول کروانے کی جسارت کرتی ہے جس نے تعلیم یافتہ اور صاحب منصب ہونے کی حیثیت میں ہماری فطانت اس بے رحمی کو روکنا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس خطرہ کی روک تھام کے لیے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا جسے خطرہ کا مقابلہ کرنے کا نام دیا جا سکے وہ سمجھتے تھے کہ یہ قابل نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جس کے اس طرح کی ہونے کی وجہ

تھے۔ اس رویے کا نتیجہ یہ تھا کہ اب سکاٹ لینڈ کے لوگ اپنے ملک سے بے تعلقی سے عاری ہو گئے۔

گھر اور وطن سے الفت کی علت کیا ہے

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسی نشانیوں کی بہتات ہے جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم پر زوال شروع ہو چکا ہے۔

یہ بھی ایک عجیب ہی نکتہ ہے کہ علامت کا ذکر آتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے دوران میں یورپ کے بہت سے بڑے بڑے تجارتی اور تہذیبی قوموں کے مراکز کی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لئے محض ایسی عمارتوں کی مثال اختیار کرتے جا رہے تھے۔ نوزائیدگی کے اس کارنامے کے لئے قائم کی گئی ہوں۔ عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں عوام کو اپنی قومی مکان سے کوئی وابستگی نہیں۔ انہیں گھر سے پیار نہ ہونے کی وجہ سے ہے کہ ان کے گھر ان کے لئے محض ایک اتفاقی اور عارضی رہائش گاہ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کے معاشرتی حالات کی وجہ سے انہیں کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ گھر بدلنا پڑتا ہے۔ یہ حالات ہی نہیں تھی کہ اس شہر میں لکھنے والوں میں سے کوئی طبقہ پیدا ہو۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں کی سطحیت اور غیر فنی ماحول سے وابستگی کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جرمنی کی جنگ ہائے آزادی کے دوران ہمارے قصبے اور شہر فرانسیسی چھاؤنی تھے۔ اور ان کی آبادی کم تھی۔ ان شہروں کو تھی بڑے بڑے شہر کہا جا سکتا ہے۔ وہ علاقے کے نوابوں کے دارالحکومت بھی تھے۔ اس وجہ سے ان شہروں میں تہذیب و تمدن پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اور فنی لحاظ سے ان کا ایک مقام بھی ہوتا تھا۔ ان شہروں کی آبادی پچاس ہزار نفوس سے زیادہ تھی۔ وہ آج کل کے اتنے ہی بڑے شہروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ صحت بخش اور انسان سے مالا مال ہوتے تھے۔ لیپزگ کی آبادی سوا لاکھ ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی کہ یہ شہر اس وقت بھی جرمنی کے تین لطیفہ کاسب سے بڑا مرکز ہونے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ آج کل قریباً ہر متمدن شہر کی آبادی اتنی یا اس سے زیادہ ہو گی۔ لیکن ان میں سے کسی شہر میں کوئی قابل ذکر ادیب یا فنکار نہیں۔ شہر کو بڑا کرنے کے مقابلہ میں ہر ایک

دوسرے میں گھسی ہوئی روشنی کو گھڑیوں کے سنگھٹے ہیں۔ جہاں ہر کونے کھدرے میں ایسے بے معنی مقام رہائش سے اگر کسی کو انس پیدا ہو تو تعجب سے کم نہ ہوگا۔ اب ایک جگہ اور دوسری جگہ میں رہنے والے کو فرق ہی نہیں جب کسی شہر کی اپنی کوئی خصوصیت ہی نہیں اور جب کوئی ملی دل آویزی کی شان پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تو کسی کو ایسے مقام رہائش سے کیا انس پیدا ہوگا۔

پھر صرف اتنی ہی بات نہیں۔ خود بڑے بڑے شہروں کی آبادی میں جوں جوں اضافہ ہوا توں توں وہ حقیقی فن کی یادگاروں سے خالی ہوتے گئے۔ وہ بڑے بڑے پیمانہ پر عمارتیں دینے والے کہاں ہیں جنہوں نے دلکش نقشے تعمیر کرنے کے جو دراصل چھوٹے پیمانہ پر چھوٹے صنعتی قصبوں کی شان امتیازی ہے۔ عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں کے تہذیب و تمدن میں جو اضافہ کیا ہے وہ بہ پیمانہ سے داخل ہے ہمارے تمام قصبات کی شرعت عہد ماضی کی ان عمارتی یادگاروں کے سہارے قائم ہے۔ اگر شاہ ملوک کا نام زندہ ہے تو یادگار آج کل کے میونسپل سے منادی ہوئے تو ہم یہ بھول کر بھول جائیں گے کہ اس وقت سے لے کر آج تک ہر عمارتی یادگاروں کی تعداد کتنی قلیل ہے۔ بلکہ ہمارے اکثر دوسرے شہروں کا بھی یہی حال ہے۔

ملت کے اتحاد سے شاندار تاریخی عمارات کا گہرا رشتہ ہے

اس عہد میں ہر ایک کو سب سے زیادہ

عہد حاضر کے بڑے بڑے شہروں میں ایسی کوئی نمایاں جگہ نہیں جو شہر کے سارے منظر پر چھائی ہوئی ہو۔ کسی ایک دوسرے کی ترجمان سمجھی جائے۔ نہ کسی کے ہر قدیم قصے کی شان دہرانے کے لیے کوئی نہ کوئی یادگار کھڑی کر دی جاتی تھی۔ قدیم شہروں کے مخصوص حصوں کا اظہار افراد کے مکانات کی تعمیر میں نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس مقصد کے لیے شہر میں عوامی یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔ یہ یادگاریں کسی عارضی دلچسپی کے لحاظ سے نہ بنائی جاتی تھیں بلکہ ان میں ایک مستقل شان پیدا کرنے کی کوشش کی

جاتی تھی۔ مطلب یہ تھی کہ ایسی کوئی یادگاروں سے کسی ایک شہری کے قتل کی نشانی مقصود نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو مقوم کی عظمت اور شوکت کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہی وجہ پائی جاتی کہ ایسی یادگاریں قائم ہوگئیں جو ہر باشندہ کو اس کے ذاتی نقصان سے اس طرح مانوس کر دیتی تھیں جس کا اندازہ کرنا بھی آج کل ممکن نہیں ہے۔ عام شہریوں کی نگاہیں اونچی دیواروں کی ایسی متعدد عمارتوں پر لگی رہتی تھیں جن کا مالک کوئی فرد واحد نہ ہو۔ بلکہ وہ ہر روز ان شاندار یادگاروں کا مشاہدہ کرتے تھے جو ساری قوم کی ملکیت ہوتی تھیں۔ ان کے مقابلہ میں افراد کے مکانات قطعاً ہیچ حیثیت رکھتے تھے۔

جب ہم قدیم زمانہ کی قومی عمارت کی وسعت کا مقابلہ اس دور کے انفرادی مکانات سے کرتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قومی شان کو ظاہر کرنے والی قومی سرگرمیوں سے متعلق یادگاروں کو دوسری تمام عمارت پر ترجیح دینے کا اصول کتنا اہم سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم کی وہ شاندار عمارتیں اور وسیع کھنڈرات جن کی عظمت و شوکت دیکھ کر ہم آج بھی مبہوت ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی سوداگرانہ عمارت کے آثار نہیں۔ بلکہ بادشاہوں کے معبد ہیں۔ اور یا سرکاری عمارات ہیں۔ ان عظیم الشان عمارت کی مالک خود قوم ہوتی تھی۔ روم کے دور کے عہد میں بھی معمار شہریوں کی کوٹھیاں اور عمارات وہ نمایاں شان نہ رکھتے تھے جو بیکلوں، نمائی ہالوں، تماشہ گاہوں، حماموں اور تالابوں کے لئے مخصوص تھی۔ یہ سب عمارتیں سرکاری ملکیت کی ہوتی تھیں اور جن سے ان کے مالک یعنی قوم میں کثیر قوم کے دوست ہوتے تھے۔

اگرچہ اس زمانہ کے فنی نظریات بالکل مختلف تھے لیکن قرون وسطیٰ کے اندر بھی یہی اصول رائج تھا۔ قدیم زمانہ میں قومی جذبہ معبدوں یا جلسہ گاہوں کی تعمیر میں ظاہر ہوتا تھا۔ قرون وسطیٰ اسی جذبہ کی ترجمانی گرجا کرنے لگے۔ اس زمانہ کے مشہور شہروں میں یہ کوہ پیکر یادگاریں چھوٹی چھوٹی مشتی اور چوبی عمارت کے ہجوم میں کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ اگرچہ اب ان کی عظمت روز بروز رہائشی کوٹھریوں کی

کثرت کے سبب ماند پڑتی جارہی ہے۔ لیکن ایسی عمارت آج بھی ان شہروں میں باقی ہیں وہاں ان کی برتری کی شان برقرار ہے۔ ان کا رنگ ان کے ماحول اور فضا کے رنگ پر چھایا رہتا ہے۔ گنبد قمقموں کے برج اور دروازے ہر ملک کی منفرد یوں کی شاندار عمارت ایک بے جان پتھر کو ظاہر کرتی ہے جو عہد قدیم کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔

طرز کی مکمل کہ عمارت کے مقابلہ میں آج کی عوامی عمارت صناعت اور دولت دونوں کے لحاظ سے سخت ناقص ہیں۔ جو چند روز پہلے آئی تھی اگر کبھی برلن بھی اس کا شکار ہو گیا تو آنے والی نسلیں کسی بیمہ کی دوکان یا مشترکہ سرمایہ سے چلنے والے ہوٹل کی عمارت ہی کو ہمارے زمانہ کی شاندار عمارت کا نمونہ یادگار رکھنے پر مجبور ہوں گی۔ خود برلن میں اگر سرکاری عمارات کا مقابل موجودہ اور سوکار کی عمارات سے کیا جائے تو نتیجہ دیکھ کر شرم آتی ہے۔

عوامی عمارات پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے وہ کثیر ہوتی اور مستحکم چیز ہوتی ہے۔ آج کل عوامی عمارات اس لیے نہیں بنائی جاتیں کہ وہ ایک یادگار کے طور پر تا دیر قائم رہیں بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی ہنگامی ضرورت پوری کی جائے۔ ان عمارات کو تعمیر کرانے والوں کے قلب میں اس سے بلند تر اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

ملکی کے مدعوؤں کا تکیہ

جس زمانہ میں برلن شہر تعمیر ہوتا تھا اس وقت کے حالات اور ان تصورات میں زمین آسمان کا فرق ہے جن کے ماتحت ہمارے زمانہ کے لئے کتب خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے۔ وہاں تو ان پارلیمنٹ کے ایوان کی تعمیر کے پیش نظر کبھی منظور نہیں کی جاتی تھا کہ یہ ایوان جرمنی کی سب سے زیادہ شاندار عمارت ہونا چاہیے تھا۔ اور اس کو بناتے وقت یہ کوشش ہونی چاہیے تھی کہ صدیوں تک قائم رہے۔ جب اس ایوان کو ہٹلر سے آراستہ کرنے کا سوال پیدا ہوا تو ہٹلر نے فیصلہ کیا کہ پتھر استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے دیواروں کو ماربل کی سلیب دیا جائے۔ اگر کبھی

بادشاہت کا یہ فیصلہ اس لحاظ سے نہایت موزوں تھا کہ جس جگہ میں مٹی کے مادھوؤں کا مجمعہ قائم ہوتا ہو وہاں کی دیواریں نگینوں سے مزین ہوتا ہے۔

ہمارے زمانہ کے شہروں میں قوم کو بحیثیت قوم کے برتری حاصل نہیں۔ اس لیے ترقوی عمارات کو شاندار عمارات کی فہرست میں شامل کرنا غیر ضروری سمجھا جاتا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ اگر یہ رواج اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے شہری مکانات بے نشان ہو جائیں گے کہ ہر شہری حب الوطنی سے بیگانہ ہوگا۔

موجودہ زمانہ کے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں منہمک رہتے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ہر وقت روپے کے ارد گرد میں غلطاں رہتے ہیں یہ بھی ہمارے عام قومی انتشار اور ثقافتی انحطاط کا ایک ثبوت ہے۔ جب تک دوست کے بت کی پرستش جاری ہے تب تک بیگانہ شاعرت کے خلاف ہر کیا تیز آگ جلائی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہمیں کاٹ رہیں جو کل ہم نے بویا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کی تباہی سے پہلے مذکورہ بالا تمام علامات پر شہادت دے رہی تھیں کہ قوم کو کسی وسیع و ہمہ گیر ضابطہ حیات پر ایمان نہیں رہا۔ اسی وجہ سے چاروں جانب سے بے چینی کا دور دورہ تھا۔ پے بعد دیگرے جب کسی وقت کے بڑے بڑے مسائل پر غور کرنے کی نوبت آتی اور ان کے متعلق کوئی فیصلہ کن پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو اس بے چینی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ اسی بے چینی کے باعث دھوئے قدم اٹھانے کی عادت عام ہو گئی تھی۔ اس عادت کا پورا شکار ہمارا نظام تعلیم تھا۔ نظام تعلیم کے طفیل نئے ملک میں نوجوانوں کی ایک نئی نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ذمہ داری قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگی۔ المیہ یہ ہے کہ ان چاروں جانب پھیلی ہوئی بے اطمینانی کو بھی بڑی حد تک اس کوتاہ بین تعلیم کا نتیجہ کہا جا سکتا تھا۔ دنیا کی ہر بڑی انسان ایک فیشن بن گیا۔ بے چینی کو ضروری سے زیادہ اہمیت دے

چنے اور طرز کی دل آزاری سے مبالغہ آمیز پرہیز کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں کا مستقل قربان کر دیا گیا۔

دین کے بغیر دنیاوی ترقی بھی ناممکن ہے

جنگ سے پہلے کے زمانہ میں دین کی حالت کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس شعبہ حیات پر بھی انتشار کی عام ہوا طاری ہو چکی تھی۔ ایک عرصہ سے قوم کی کثیر تعداد کا کوئی متعین مذہب نہ رہا تھا اس کی کوئی عملی زندگی نہ تھی۔ باقی کے ساتھ وہ زندگی کے متعلق اپنے تصورات قائم کرتے۔ اس معاملہ میں بہت سے لوگوں کا کیسا سے قطع تعلق کر لینا اس قدر قابل توجہ نہ تھا جتنا کہ اس سے بھی زیادہ تعداد کا کیسا سے متعلق یا غیر متعلق رہنے میں کوئی فرق نہ سمجھنا باعث تشویش تھا۔ عیسائیت کے دعوں بڑے بڑے فرقے ایک طرف تو اشتراکیت اور طریقت میں تبلیغی کمیں روانہ کر رہے تھے تاکہ دین میں نئے پیرو داخل کیے جا سکیں اور دوسری طرف کیسی فرقوں کے لاکھوں معتقد ان مبلغوں کے پیچھے والے فرقوں کے وطن میں ہر طرح ہو رہے تھے دین کو چھوڑتے جا رہے تھے۔ دین سے یوں برگشتہ ہونے والے لوگ یا تو خاموشی سے دین کو زندگی کا عملی مقصد تسلیم کرنا ترک کر دیتے تھے۔ اور یا وہ دین کے متعلق بے چینی محسوس کرتے تھے۔ ملک کی اخلاقی زندگی ان حرکتوں سے براہ راست متاثر ہوئی۔ یہاں بھی مغربی ممالک کے طرح یہ کہنا بے موقعہ نہ ہوگا کہ یہ واقعات میں عیسائیت کی تبلیغ کمیں جتنے لوگوں کو عیسائی بناتی تھیں اس کے مقابل وہیں ان علاقوں کے باشندوں کی بہت زیادہ تعداد دہریت اور لامذہبیت کو قبول کر رہی تھی۔

واضح رہے کہ ان مسلمات پر دینی تعلیمات پر بھی ہیں ان کی تاج گلی کی محرومی اور روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی حالانکہ دین پر عمل کے بغیر اس دنیا میں انسان کے وجود کا تصور بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ کسی قوم کے سب عوام مطمئن نہیں ہوتے۔ بالخصوص زندگی میں عوام کی اخلاقی قدر تو دین کے طفیل ہرگز برقرار نہیں رہ سکتیں۔ آج تک دین

کے ہو مختلف مدل قوانین کے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد
ہم پر توقع کر سکیں کہ یہ مذہب کے مذاہب موجود دنیا فرقوں کی نسبت زیادہ بہتر یا مفید
ثابت ہوں گے۔

دین کے مسلمات میں خود رائی کو دخل نہیں

اگر عوام نے اپنے اعمال کی بنیاد دین اور دینی تعلیمات پر رکھی ہے تو مسلمات دین
پر غور شروع کرنا ایسا ہی واجب ہے اور ان مسلمات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا بھی
واجب ہے۔ ایسے پاکیزہ لوگوں کی تعداد جو ہمیشہ برسر پیکار رہتی ہو گی جو روز مرہ زندگی میں
عام دستور العمل کے طور پر بھی شاید و باید اور ربانی کے مل پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔
ان کے برعکس کروڑہا انسان ایسے نہیں کر سکتے۔ اعتقادی مسلمات کو دین میں وہی مقام
حاصل ہے جو بنیادی آئین کو سرکاری کاروبار میں اور رسوم و رواج کو روز مرہ زندگی میں
حاصل ہے مگر روحانیت پر مبنی ایمان ایک ایسی شمع ہے جو کامل تجرد سے ہے۔
جس کی انعکاسی جلوہ گاہیں کی جا سکتی ہیں۔ روحانیت پر ایمان کو فقط دین کے بنیادی
مسلمات کے ذریعہ ہی کوئی شکل دی جا سکتی ہے۔ دین کی واضح اور ٹھوس
شکل کے بغیر کوئی روحانی مذہب کبھی ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا۔ دینی مسلمات کی
ٹھوس شکل سے علیحدہ ہو کر روحانی مذہب فقط ایک مابعد الطبیعیاتی تصور یا تخیلاتی رائے
رہ جاتا ہے۔ مذہبی حالات جو محض دین کے مسلمات پر اعتراض کرتا ہے اس کی وہی
حیثیت ہے جو سلطنت کے بنیادی آئین کے خلاف بغاوت کرنے والے کی ہو سکتی
ہے۔ اگر سرکار کے خلاف غداری کی جرم سے کامل بری الذمہ ہونا ممکن ہے تو دین سے
انحراف کا نتیجہ بھی موجب مذہبی خارجیت ہو سکتی ہے۔

دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے وقت سیاسی قائدین کو اس کی معمولی کوتاہیوں
پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ کیا دین کا کوئی تجربی اور قابل عمل نظم و نسق
بھی موجود ہے یا نہیں۔ جب تک کوئی تجربی اور قابل عمل نظم سامنے نہ ہو کوئی حق

یا پھر ہی رائج الوقت دین کو ترک کرنے کی تلقین کر سکتا ہے۔۔۔

آج کل دین کی حالت قابل اطمینان نہیں۔ اسکے ذمہ دار وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے دین کو دنیاوی آلائشوں سے ملوث کر دیا۔ یہ انہیں کی حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ سائنس اور دین میں ایک سرد مخفی تصادم رونما ہو چکا ہے۔ یہ تصادم تشدد کی شکل میں نہ ہو لیکن اس کے نتیجے کے طور پر نتیجہ ہمیشہ سائنس کی ہی ہو گی۔ جو ظاہر ہے کہ وہ لوگ سائنس کی سطح کے نیچے کی بنا کو سمجھ نہیں کر سکتے وہ سائنس اور دین کا تصادم دیکھ کر دین سے بدگمان ہو جائیں گے۔

دین بیچ کر خریدنا ایک ذلیل سودا ہے

سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں نے پہنچایا ہے جو دین کو محض کاروبار کر سیاسی مقاصد بنا کر ذاتی نفع حاصل کرتے ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے والے منہ پھٹ بے حیا ساری دنیا کے سامنے بیچ بیچ کر ہر عام انسان کے کانوں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے عالم دین ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ ضرورت ہو جائے تو اپنی زندگی دین پر قربان کر دیں۔ لیکن یہ بیوپاری تو وہ اس لیے بیوپار کرتے ہیں کہ تا کہ اس دنیا میں ان کی اپنی زندگی دوبارہ آسائش سے بسر کرنے کا انتظام ہو جائے۔ وہ تو بروقت کسی سیاسی بہروپیے کے عوض دین کا سودا بیچنے کو آمادہ ہیں۔ اگر ان کو اسمبلی میں دن نشست حاصل کرنے کی توقع ہو تو وہ کیمونسٹوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ دین کے جانی دشمن ہیں۔ اور اگر انہیں وزارت میں ایک منصب حاصل کرنے کی امید ہو تو یہ دین ہوں کے زمرہ میں سے بھی عار نہ ہوگا۔ شرط یہ ہے خود انہیں اس سے سوا کچھ حاصل کرنے کا تصور نہ کرنا پڑے۔

سچ ہے کہ جنگ سے پہلے قوم میں دین کی موجودہ حالت کی لوگوں کے دل میں کھٹکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کا نام لیتے ہوئے سیاسی پارٹیوں نے عیسائیت کو ذلیل مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ یہ ان کا اپنے آپ کو کیتھولک

عیسائیت کی وحدت جاوہ دار سیاسی پارٹی ظاہر کرنا بھی بڑا مضحکہ خیز تھا۔

پوائنٹ بھیڑ کی کوششیں مہلک ہیں۔ ممکن ہے کہ ان لیڈروں سے کوئی سیاسی پارٹی عمل کی چند نشستوں پر قبضہ کر لے لیکن اس روش میں دین کا سراسر زیان ہے۔

اس صورت حال کے نتائج ساری قوم کو بھگتنے پڑے۔ ایک ایسے مارکس مرحلہ پر جبکہ ہندوستان کی ہندو دین مل رہی تھیں۔ اعلیٰ پیمانہ کا تعلق اور تعلق درسوم کی جڑیں کھوکھلی ہو کر ان کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ دین میں کسی وحدت کا آنا محال ہو گیا۔

سیاسیات حصول ممکنات کا فن ہے

اگر ہمیں اس مرحلہ پر قوم کے نظام کو غیر معمولی بوجھ سنبھالنے کی ضرورت نہ پڑ جاتی تو باوجود معاشرت کے نظام میں یہ سب دراڑیں اور شگاف پیدا ہو جانے کا کوئی خطرہ نہ رہتا۔ ہاں قوم کو غیر معمولی حادثات سے عہدہ برآ ہونے کی نوبت آ جائے تو اس وقت قوم کے داخلی اتحاد کے بل بوتے پر ہی اس کی کمر کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ موقعہ آیا تو معاشرتی نظام کی یہ درزیں تباہ کن ثابت ہوئے۔

لیکن ہمیں نگاہیں ارکان سلطنت کے سیاسی معمار پر بھی محض ایسے نقائص کا مشاہدہ کر رہی تھیں جو بروقت اصلاح اور تدبیر کے بغیر ہلاکت کا سبب بن سکتے تھے۔ قوم کی داخلی اور خارجی حکومت عملی کا تقاضا ہے کہ اس نقص پر جوں خاطر جمع پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا ہو۔ ہر ممکن صورت کی روش اختیار کرنے کے حق میں بظاہر مسمار کا یہ قول نقل کیا جا سکتا تھا کہ سیاسیات کے حصول کے پیے ممکنات کے فن کا نام ہے۔ اس اصل میں اس قدر مغالطہ ہے کہ مسمار کے جملہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہونے والے لوگ مسمار کے کلے لطے کی مخلصیں ہیں۔ خصوصیت کے اس فرق کی خاطر جوں مسمار کی سیاسی روی کو پیش پا افتادہ کی ہنوا قرار دے لیتا تو کوئی ہرج نہ تھا۔ وہاں دوسرے لوگوں نے جب مسمار کی تائید کی کوشش کی تو اس کی زبان سے ادا ہو کر مسمار کے رشحات کے معنی ہی بدل گئے۔ جب مسمار نے یہ بات کہی تھی تو اس کی مراد یہ تھی

کہ کسی واضح سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر تمام ممکن ذرائع استعمال کرنا یا استعمال کرنے کی کوشش کرنا جائز ہے۔ اس کے پیروکاروں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ مقولہ بھی کوئی متبرک وظیفہ ہے جس کا ورد کر لینے کے بعد مرے سے کسی سیاسی اصول یا کسی سیاسی مقصد کی پیروی کی حاجت ہی نہیں۔ جس سلطنت کے اس دور کے سیاسی قائدین کی کوئی دور رس یا بلند پایہ سکیم عمل نہ تھی۔ اور اس پایہ کی سکیم عمل جس کی پیروی کی جا سکتی ہے یہاں وہ بنیاد بھی مفقود تھی یعنی کوئی واضح نصب العین خواہ وہ ان سیاسی قیادت کے سیاسی کردار کے اصولوں کا گیرا ہو وہ واضح علم بھی نہ تھی جس سے یہ قائدین محروم تھے۔

سلطنت کی سیاسی پالیسی چلانے میں جس ذہنی انحطاط اور عقلوں مزاری کا اظہار کیا جا رہا تھا صورت حالات سے کئی دانش ور اس کی مذمت کرتے تھے۔ انہیں اس حکمت عملی کی اندرونی کمزوری اور ناکامی کا احساس تھا۔ لیکن یہ لوگ سیاسیات کی صف اول میں نہ تھے ملک کی حکومت پر خاص لوگ یا ان کے نمائندے یعنی فوجی جیسے مقتدرین کی زبان کردار اور حکمت کے اصولوں سے بے بہرہ ہوتے جیسے کہ آج کل کے سیاسی قائدین ہیں۔ ان لوگوں میں اتنی عقل ہوتی ہی نہیں کہ طرز سوچ کیسی ہونی چاہئے اور کس سیاسی ابھار کا رخ کس طرف موڑنا ہے کہ کسی سے کچھ بھی نہیں۔ سویلین کے وزیر اعظم اکسن سیزر نے جب کہا تھا کہ ساری دنیا کی حکومت چلانے میں صرف رتی بھر سے زیادہ عقل تم نہیں ہو تو اس نے ایک ذہنی حقیقت کا بیان کیا تھا۔ بادشاہ کی قدیم مجلس مشاورت کا ہر رکن کم از کم رتی بھر عقل یا اس کے کسی شوشہ کا مالک تو تھا لیکن جب سے فوجی ایک مسلمہ طاقت بن گیا ہے تب سے تو عقل کا یہ شوشہ بھی مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے غلط مشکلات کا خود ہی بنا رکھا تھا تاکہ کوئی ایسا مسئلہ حل میں نہ آ جائے۔ جس سیزر کی طرف نسبتی تھی کہ وہ آج کل کسی بھی ملک میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتا۔

پارلیمنٹ بیرونی تہذیب اور غیر ذمہ داری کی درس گاہ ہے

جنگ سے پہلے یہ محض کوتاہ نظر تھا کہ جرمن پارلیمنٹ پارلیمانی کام حکومت کی کمزوری کی ذمہ دار تھی۔ حالانکہ اس قومی ادارہ کو جرمن سلطنت کی قوت کا امانت دار ہونا چاہیے تھا۔ پارلیمنٹ کی بیرونی اور ذمہ داری سے فرار کو اس طرح برداشت کی مقدار میں ملک کی قومی زندگی میں داخل کر رہی تھی کہ کیا مجال ہے جو دونوں کے اندازہ میں بال برابر بھی فرق ہو۔

آج کل حماقت کے جو مزین قول سننے میں آ رہے تھے ان میں سے ایک یہ ہو بھی تھا کہ انتخاب کے بعد جرمنی میں پارلیمنٹری کام چلانا بند ہو گیا ہے۔ اس پر بے کا مطلب یہ ہوا کہ گویا انتخاب سے پہلے صورت حال مختلف تھی۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا کام ایک بھی دن ملک کی تباہی کے سوا کسی مقصد کے لیے کام ہی نہیں کیا۔ یہ پارلیمنٹری کام صرف انہی دنوں میں یہ مقصد پورا کر سکتا ہے۔ جب لوگ ڈھیلے ہوں یا انھیں بھڑکانے کے بجائے کچلنے سے انکار کر دیں جرمن لوگ کے دماغ کی ذمہ داری بہت بڑھ اس پارلیمنٹری نظام پر ہے۔ ملک کی تباہی میں جو تاخیر واقع ہوئی اس کا سہرا پارلیمنٹ کے سر نہیں۔ ملک ان لوگوں کے سر ہے جنہوں نے اس ادارہ کی حفاظت کی۔ یہ پارلیمنٹ تو اس کے دور میں ہی جرمن قوم اور جرمن سلطنت کی قبر کھودتی تھی۔

پارلیمنٹ واسطہ یا وسیلہ تو وہ کن خرابیوں کے راستہ کر دینے کا باعث تھی۔ میں ان خرابیوں میں سے صرف ایک خرابی کا بیان کرتا ہوں جو اس ادارہ کی خصوصیات کی آئینہ دار ہے اور غیر ذمہ داری کی بے مثال نظیر ہے جس خرابی کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا مشاہدہ اس خوفناک تہذیب اور کمزوری کی صورت میں کیا جا سکتا تھا۔ جس سے سلطنت کے اندرونی اور بیرونی مسائل کا اصرام کیا جاتا تھا اس خرابی کی سب سے بڑی مد پارلیمنٹ کا محل عمل تھا۔ یہ خرابی ملک کی ہر قسم کی تباہی کے بڑے بڑے اسباب میں شامل تھی۔

ہر وہ مسئلہ جس میں پارلیمنٹ کے ارکان کو دخل ہو وہ ہمیشہ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کسی پہلو سے بھی دیکھا جاتا تھا یہ حقیقت واضح تھی۔ دیگر ممالک کے ساتھ اتحاد کرنے کے متعلق خارجی حکمت عملی جرمنی کے تہذیب کی ایک مثال تھی۔ وہ اس کے متمنائی تھے لیکن اس دھوکے دھوکے کے عمل کے گرد گھومتی ہے۔

پارٹی کے متعلق حکمت عملی بھی دھوکے اقدامات سے پوری تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ پارٹی وہ ہوں سے وجود قائم ہوئی تھی۔ جرمنی کو فتح حاصل ہونے کے بعد سے دشمنی مول لے لی گئی۔

اس میں ہٹلر اور ان کے مسئلہ کو بھی دھوکے اقدامات سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک دفعہ تو یہ بھی اڑا دیا گیا کہ ہٹلر کیل کر ایس ایس ہٹلر اور ان کو دوسری جرمن ریاستوں کے برابر حقوق دینے کے بجائے یہ دونوں کام دھوکے چھوڑ دیے گئے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہ تھا کیونکہ جرمنی کی اپنی صفوں میں ملک کا سب سے زیادہ رجعتی اعتدال پسند پارٹی سے تعلق رکھنے والا ہٹلر بھی شامل تھا۔

شہیدوں کی روحیں قبروں سے نکل کر غداروں کے گریبان پکڑ لیں گی

تاہم ملک ان سب خامیوں کے باوجود بھی بچ نکلتا اگر طیکہ دھوکے اقدامات اختیار کرنے کی یہ پالیسی اس حماقت کو منتشر نہ کر دیتی جس پر دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی طاقت کا انحصار تھا۔ وہ حماقت تھی جرمنی کی فوج۔

صرف ایک مسئلہ میں جرمن پارلیمنٹ نے جس جرأت کا ارتکاب کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے تاریخ جرمن قوم کی طرف سے بھیجتی رہے۔ پارلیمنٹری پارٹیوں کے ان نمائندوں نے ایک بل پیش کیا جو دھوکے کا سہارا لے کر قوم کے ہاتھ سے وہ اختیار چھین رہا تھا۔ اور ہٹلر کے حوالے کر رہا تھا جو اس کا استعمال قائم رکھنے کے لیے کر رہی تھی۔ اور جس نے قوم کی حریت اور آزادی برقرار رکھی جا سکتی تھی۔ اگر آج کا جرمنی کی وادی میں قبروں کے منہ کھل جائیں تو خاک و خون میں تھرتھراتے ہوئے شہیدوں کی روحیں ایک ایک جرمن سے تعبیر

یا بہتری جذبوں اور پابندیوں کو تسلیم سے کام لیں گی تو یا تو اس منصب کے اہل نہ تھے جس پر متمکن ہو گئے تھے یا محض دھوکا دینے کی قابلیت رکھتے تھے۔ ہم ان پر الزام لگائیں گے کہ تم نے جرمن فوج کے لاکھوں بہترین نوجوانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ یہ نوجوان دوسرے لاکھوں جرمن محض اس لیے قتل ہوئے یا ہاتھ سے گئے کہ تم نے اور اس طرح ملک و وطن کی خدمت کے قابل نہ رہے کہ عوام کو فریب دینے والے چند سو مکار پارٹی رہنماؤں کا جال پھیلا کر تیلے وصول کرتے رہیں یا قوم کی غداری کر کے اپنی گلچھرے اڑتے رہیں۔

یہودیوں نے اپنے کمیونسٹ اور جمہوری نظریات کے ذریعہ دنیا بھر میں جرمن عسکریت کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ انہوں نے جرمنی پر الزام دھرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان حرکتوں کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ اور جمہوری پارٹیوں نے وہ قانون منظور کرنے سے انکار کر دیا جو ہمارے قومی دفاع کے لیے کافی عسکری تربیت فراہم کرنے کی خاطر ضروری تھا۔ ان لوگوں سے جو ہونا کہ جرمنی دوبارہ اس قابل ہو جائے تو یہ آسان تھا کہ جنگ کی نوبت آنے پر ساری قوم کو تصور لگانے کی ضرورت محسوس ہوگی مگر یہ بھی واضح تھا کہ ان لوگوں کی کمیسہ سودی کی خاطر انہوں نے خود اپنی ماؤں کو موت کے لیے تیار کر دیا ہے۔ لاکھوں جرمن اس حالت میں دشمن کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ان کے پاس تصور ہوں گے اور نہ انہیں عسکری تربیت ہی پوری ملی ہوگی۔ ان یہودی لیڈروں نے جس وحشیانہ اور سنگدلانہ بے پروائی کا ثبوت دیا ہے اس سے قطع نظر یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ جنگ کے آغاز میں ہمیں کامل تربیت یافتہ سپاہیوں کی قلت جنگ میں ناکامی کا منہ دیکھنے گی۔ جنگ عظیم چھڑنے پر شکست کا یہ ہولناک طریقہ سے حقیقت کی صورت سامنے آ گیا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ جرمن قوم کو اپنے ملک کی تربیت اور استقلال کے تحفظ کی خاطر

سب جنگ میں کودنا پڑا تو اس جنگ میں شکست کے باعث وہ اجھوری ہو گا فلس پالیسی تھی جو اس کے زمانہ میں قوم کو دریائی قوت کی تنظیم اور سمندری تربیت کے متعلق اختیار کی گئی تھی۔

بحری بیڑے کی تعمیر کے اصول کیا ہونے چاہئیں

بری فوجوں کے لیے تربیت یافتہ لڑنے والوں کی تعداد بہت کم تھی صرف یہی نہیں بلکہ بحری بیڑے کے متعلق بھی اسی قسم کی مدبرانہ روش اختیار کی گئی۔ اور اس طرح قوم کو بچانے والا یہ اختیار بھی کمزوری نہ کا شکار کر دیا گیا۔ مستقبل سے بے خبر بحری دشمن بھی اسی دھوکے میں آنے کی وجہ سے کاشکار ہو چکے تھے۔ جو بحری جہاز لکڑی سے بناتے تھے اس کے مقابلے میں ہمارا رجحان یہ تھا کہ اپنے بحری جہاز اس سے کچھ بڑے بنائیں۔ یہ پالیسی کوئی دور اندیشی کی پالیسی نہ تھی۔ جو بحری بیڑا طاقت اور تعداد کے اعتبار سے اپنے اس حریف کے برابر ہو جس سے اس کی ٹکر کا امکان ہے۔ اسے اپنی بری اپنے برتر بحری طاقت سے زیادہ قوی بنا کر پیش کرنی چاہیے۔ بحری جنگی جہازوں کی جنگ کرنے کی طاقت پر بالخصوص توجہ دینی چاہیے۔ محض بحری روایات پر بھروسہ کرنے سے کام نہ چلے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فنی زمانہ سائنٹفک ترقی کے باعث تمام مہذب سلطنتیں ایک مساوی سطح حاصل کر چکی ہیں کہ اب ان میں سے کوئی ایک سلطنت بھی ایسے بحری جہاز نہیں بنا سکتی جن کا دوسری سلطنتوں کے بحری جہازوں کے برابر ہو لیکن جنگ کرنے کی قوت ان سے بہتر ہو یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے دوسری سلطنتوں کی نسبت چھوٹے جہاز تیار کیے جائیں اور وہ خود اس کے ان چھوٹے جہازوں کی جنگ کرنے کی قوت دوسری قوموں کے زیادہ بڑے بحری جہازوں کے برابر ہو۔

دراصل ہمارے جنگی بحری جہاز صرف وزن ہی میں چھوٹے نہ تھے بلکہ رفتار دونوں کے اعتبار سے بھی اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کم حیثیت تھے۔ ان کے زمانہ میں جنگی جہازوں کی تعمیر کا اہتمام ان بحری دشمنوں کے پیش نظر غیر منطقی طور پر

کا ایک بڑا ثبوت وہ اسلوب استدلال ہے جو یہ لوگ اپنی پالیسی کی حمایت میں استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے "ٹینک پر کوئی بھینگے کے لاد سے توپوں کی لمبی نالیاں لگی ہوں کی ۱۵۵ ملی میٹر والے توپوں پر ترجیح رکھتی ہیں"۔

کہ ان کا یہ قول صحیح تھا۔ اب بھی جرمنی کو ۱۵۵ ملی میٹر کے والے موبل لمبی توپیں ضرور بنانی چاہیے تھیں۔ لیکن مقصد یہ تو نہیں کہ ہماری فوجی طاقت دشمن کے برابر ہو جائے۔ بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ ہمیں فوقیت حاصل ہو۔ اگر ہمارا مقصد فوقیت حاصل کرنا نہ ہوتا تو بڑی فوجوں کو ۱۵۵ ملی میٹر والے توپوں سے مسلح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جرمنوں کی ۱۵۵ ملی میٹر والے توپیں بھی تو ۱۵۵ فرانسیسیوں کی بڑے والے توپوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ قلعہ کشائی کا کام بھی ۱۵۵ ملی میٹر والے توپوں سے انجام دے سکتی تھیں۔ بہتر ہے کہ جرمن حکام نے یہ اصول فراموش کر دیا کہ دشمن پر صرف نشانہ بازی میں فوقیت کافی نہیں بلکہ ہماری توپ کے گولے کے تحمل اور رفتار کو بھی دشمن پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ عسکری حکام سے یہ غلطی اس لیے سرزد ہوئی کہ انہوں نے ایک اور غلط اصول کو تسلیم کر رکھا تھا۔ وہ غلط اصول یہ تھا کہ جرمنی تیاری میں محض پہلوؤں سے فوقیت حاصل کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ابھی جنگ شروع بھی نہ ہوئی تھی اور جرمن حکام نے پہلے ہی حملہ کرنے کے اصول کا غلط طریقہ کار اپنا لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب جنگ چھڑی تو جرمنی کے بڑے بڑے کو تاہ بینی سے دفاع پر قناعت کر بیٹھے۔ کامیابی کبھی دشمن پر حملہ کیے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی۔ لہٰذا حملہ کرنے کے اصول کو طریقہ کار بنانے کا مطلب یہ تھا کہ جرمنی نے خود اپنی کامیابی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جس جرمنی جہاز کی رفتار کم ہو اور زرہ بھی کمزور ہے اب بھی کسی ایسے جہاز سے مقابلہ ہے جس کی رفتار تیز ہے اور زرہ مضبوط تو جہاز ہمیشہ اس قابل ہوگا کہ اس کی زد میں آئے بغیر مناسب فاصلہ پر رہتے ہوئے اس کے بھاگتے ہوئے جہاز کو تباہ کر دے۔ یا اس کو مجروح کر دے۔ بہت سے جنگی

جہازوں کافی موثر اس تجربہ کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے زمانہ میں عمری نظام کے نظریات کس قدر علط تھے اس کا ثبوت دوران جنگ میں مہیا ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ پرانے جہازوں کی رفتار سے ہی مجبور ہوئے۔ اور جہاں بھی موقع ملتی تھا وہاں نئے جہازوں کو زیادہ موثر رفتار پیدا کرنے کا بنایا گیا۔ اگر سامی کی جنگ کے معرکہ میں جرمن عمری جہازوں کا ذیل اول میں کی رفتار اور ان کی رفتار برطانوی عمری بیڑے کے برابر ہوتی تو ۳۸ جرمنی جہاز کے ڈوبنے اور ٹھیک نشانہ لگانے والی جرمن توپوں کی گولہ باری برطانوی بیڑے کو سمندر کی تہہ میں غرق کر دیتی۔

جاپان کی عمری پالیسی جرمنی سے مختلف تھی۔ جاپان نے اپنا عمری جہاز بناتے وقت اس عمر کی پوری احتیاط برتی تھا کہ جاپانی عمری بیڑہ ہر ممکن پہلو سے امریکہ پر غالب رہے جس سے کہ جنگ کی نوبت آ سکتی ہے۔ جاپان کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ جاپانی عمری بیڑہ بحرالکاہل کے ہر حملہ آور کے دانت کھٹے کر سکا۔

جرمنی کی بری فوج کے نظام ایک حد تک اس کے ہوائی بیڑے پر منحصر تھے۔ اس وجہ سے جرمن عمری بیڑے کو پارلیمنٹ میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جرمنی کا عمری بیڑہ بھی انہیں حالتوں کا شکار ہو گیا جس کا پارلیمنٹ میں رواج تھا۔ جرمنی کے عمری بیڑے کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر نہ کیا گیا۔ جب اس عمری بیڑے کو استعمال کرنے کی نوبت آئی تو وہاں بھی وہ کمی اور غیر مستقل مزاجی سے کام لیا گیا۔ اگرچہ ان خامیوں کے باوجود عمری بیڑے نے اتفاقی شہرت حاصل کی تو اس کا سہرا جرمن ملاحوں اور عمری افسروں کی بے مثال شجاعت اور قابلیت کے سر رہا ہے۔ اگر سابق جرمن سمیر ایڈمرل کی اس قابل کا مالک ہوتا تو عمری بیڑے قریب قریب ناقابل شکست ہو جاتے۔

بالآخر اس میں ایڈمرل کی پارلیمنٹری ہوشیاری کا مظاہرہ کرنا تھا وہی جرمنی کی تباہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ عمری بیڑے کی تعمیر میں بھی ذاتی مصلحتوں پر بالکل عمری مصلحتوں کو ترجیح دینے کا رواج چل گیا۔ نتیجہ یہ ہے غیر مستقل عمری اور کمی معقول پالیسی

کو سنڈھے چڑھانے کی ناقابلیت پر لیبیا کی انقلاب کی خصوصیات ہیں۔ یہی خصوصیات
بڑی دلکام میں بھی سرایت کر گئیں۔

مجرم دوسروں پر الزام لگا کر خود بچتا چلا جاتا ہے

جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ بڑی فوج کے دلکام اس قسم کے بنیادی امور پر
غلط فیصلوں سے گریز ہونے سے بچتے رہے۔ لیبیا کی ارف ب فرس بریگیڈ فوجی
اسلاف میں ایک کرنل تھا۔ بارہا ایسے اہم فوجی معاملات میں جن کے نتائج سے کام
چلتے ہوئے نقصان پہنچانے والے فیصلے صادر فرمایا کرتی تھی اس کے حلوف لیبیا
ارف نے سرحدی بازی لگائی کہ اس عسکری پیچیدہ ناکامی کی ذمہ داری
صرف بارنیت ہے۔ باس وقت کے وزیر اعظم ریلے میں ہوا کی بھوڑی اور ضعیف
حکومت تھی۔

باوجود اس حقائق کے جو لوگ دراصل جرائی کی تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ وہ بغیر کسی
ہچکچاہٹ کے سارا الزام ایک آدمی کے سر منڈھ دیا چاہتے ہیں جو فوجی معاملات سے غلطات
کے خلاف مضبوطی سے ڈٹا رہا۔ یہ سب لوگ ارف ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ
سمجھتے ہیں اگر ان کے بیوقوفانہ خیال میں ایک کھوٹ باقی کی کمی بیشی واقع ہو گئی تو
اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ شخص جسے ان قربانیوں کا بخوبی علم ہے جو ہماری قوم کو ان غیر
ذمہ دار افراد کی مجموعی غلطانہ غلطات کی وجہ سے برداشت کرنا پڑیں۔ وہ شخص جو کسی ان
لوگوں کا خیال کرتا ہے جو اپنی ماں کے پاس واپس نہ آسکے یا ہاتھ ہو گئے وہ شخص جسے اس جگہ پر ش
ذلت اور بے عزتی کا احساس ہے جس کا ہم دوش رہے ہیں۔ وہ شخص جو اس اتحاد
عصبیت ارسکت پر مضطرب ہے جس میں آج ہماری قوم گرفتار ہے۔ وہ شخص جو
جانتا ہے کہ بارنیت میں چند بے اصول اور جاہ طلب متنازعین منصب کے لیے بھوکے
نشستیں حاصل کرنے کی خاطر ہماری پوزیشن بن گئی ہے۔ وہ ایسا شخص اقرار کرے گا کہ
یہ بہانے کے خواہ اپنی ہی ہر مکر مکانے کے ہر کسی انقلاب کے مستحق نہیں۔ قوم کی

ہلاکت سے نجات کرنے والے خدا وند کے مقابلہ میں ہر طرح ایک شریف انسان ہے۔

صورت حال کا یہ ایک عجیب پہلو تھا کہ قدیم جرمنی کے یہ تمام قبائل اس وقت مظہر عام پر آئے جب ان کے تذکرہ سے قوم کے داخلی افراد کو ایک خطرہ کا اندیشہ تھا۔ عیسائیت وقت پر عوام کے کانوں میں یہ خوشخبری سنانے کا انتظام کرنا شروع ہو۔ جرمنی جب اس معاملہ کی اصلاح کا موقعہ تھا تو شرمناک اندار میں اس کی پیروی کی جاتی تھی۔ یہاں کے وحشی کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ جن سرکاری حکام ایسے مسائل میں پروپیگنڈے کی نوعیت اور اس کے استعمال سے بالکل جاہل تھے یا محض وہمی واہمی وقعیت رکھتے تھے۔ صرف یہودیوں کو یہ معرفت تھی کہ پروپیگنڈے کا استعمال کامیابی اور انتقال سے کیا جائے تو لوگوں کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ بہشت دوزخ ہے۔ اور دوزخ بہشت۔ بدترین بدحالی کی نسبت یقین دلایا جا سکتا ہے کہ یہ تو جنت کا نمونہ ہے۔ یہودی اس راز سے واقف تھا اور اس سے کام بھی لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمن سرکار کو اس بھید کا پتہ بھی نہ تھا۔ جنگ ہار جانے پر اس جہالت کی پاداش میں خوفناک ترین سزا بھگتنی پڑی۔

قدیم جرمنی میں کئی خوبیاں بھی تھیں

جنگ سے پہلے جرمنوں کی زندگی کو تمدن کی طرح کھا لینے والے جن مفاسد و نقائص کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان سے قطع نظر بعض خوبیاں بھی موجود تھیں۔ اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ ہمارے بہت سے نقائص دوسرے ممالک اور دوسری اقوام میں بکثرت سرایت کر چکے تھے۔ کئی جگہ تو وہ حالت ہم سے بھی بدتر تھی۔ بعض میں ان کے ایسی ان ہی پہلوؤں سے زیادہ قوت حاصل تھی۔

جرمن کی سب سے بڑی خوبی تو یہ تھی کہ تمام یورپین اقوام میں سے صرف جرمن ہی ایک ایسی قوم تھے جنہوں نے اپنے اقتصادی نظام کو ایک قرارداد قومی کے عملی صورت

میں بچائے رکھنے کے لیے جدوجہد کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں جرمن اقتدار سرمایہ داروں کا تسلط زیادہ کم تھا۔ کوئی شخص میں یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ بعض ناپسندیدہ علامات رونما ہو چکی تھیں۔ بہرحال جرمنی کی اقتصادی خودمختاری خطرہ سے باہر نہ تھی۔ یہاں کارٹل کی یہی خوبیت جنگ عظیم کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی۔

اقتصادی مسائل میں جرمنی کی قومی خودمختاری کے علاوہ دوسری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بھی ایسی خوبیاں تھیں جن کی برتری عیاں تھی۔ ان خوبیوں کا اظہار تعلیم داروں کے ذریعہ ہوتا تھا جو قوم کی مسلسل ترقی کی علامت تھے۔ ہر لڑکا اپنے دائرہ میں سولہ سال تک پہنچا ہوتا تھا۔ اور ایک حد تک کہہ سکتا ہے کہ بے مثال تھا۔

پہلی اور دوسری طور پر اس سرکاری منصوبہ تکمیل پر تھا۔ جس سرکاری اس وقت تکمیل نے عہد جدید میں نشوونما پائی تھی۔ اس ضمن میں ایسی ان بادشاہوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے جو بحیثیت انسان کے انسانی کمزوریوں اور بیماریوں سے محفوظ نہ تھے۔ اگر ہم ایسی کسی روایت پر ہوں تو پھر ہم موجودہ نسل کو تمام سال ہی قابل مذمت ٹھہرائے گی۔ جو شخصیتیں آج کل برسر اقتدار ہیں ان میں سے بیچ وپیچ انسانوں کے ذاتی کردار اور قابلیت کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی ہوگی۔ ان سے زیادہ کمزور انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر جرمنی کے نظام کو ان عناصر کی شخصی استعداد اور ذاتی بیکی کی کسوٹی پر رکھا جائے جو نومبر ۱۹۱۸ء سے لے کر آج تک قوم کے سامنے آئے ہیں تو مدت سے سر جھکا لینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ یوں کہ جب تحفظ محنت کا قانون عورتوں کا کام بند کرنے کے بعد باقی نہ رہا تو آئندہ انتخابات کے متعلق کیا رائے قائم کریں گی۔ بلکہ آئندہ انتخابات میں فیصلہ کریں گی کہ ان نوواردرائے دہندوں کی ذہانت اور دیانت اتنی ہی کم ہے جتنی وہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ ہماری رائے کے حق دار ہیں۔

جرمن بادشاہت کی بعض کمزوریاں

یہ ماننا پڑتا ہے کہ کئی صدیوں سے عوام خصوصاً خواص سے بادشاہ کا رشتہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہوں کے پاس ہمیشہ ایسے لوگ نہیں پہنچتے تھے جو بادشاہوں کے معاملوں کا چال چلن ہمیشہ ٹھیک رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے خوشامد کرنے والوں کی بادشاہ خوشامدیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے "معلومات" فراہم کرنے کے ذرائع بھی ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ جب ہماری دنیا میں پرانے حالات بدل رہے تھے اور اس انقلاب کا اثر درباری رسوم پر بھی پڑ رہا تھا تو معلومات فراہم کرنے کا یہ ذریعہ بند ہو گیا تھا۔ مثال کے طور پر جب سولہویں صدی کے آغاز میں کوئی شہزادی خوش وردی زیب تن کر کے اور گھوڑے پر سوار ہو کے پریڈ کے میدان میں سپاہیوں کو اپنے سامنے سلامی دینے کا حکم صادر کرتی تھی تو اس سے ایک عورت کے بارے میں کوئی خوش عقیدگی کی توقع پیدا ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ عام باتیں رہنے والے لوگ عوام کے ذہنوں پر کیسی پریشانیوں سے بالکل بے وقف تھے۔ ورنہ اس قسم کے افسوس ناک واقعات کی تصویر کشی کی جاتی۔ عالم بالا کی یہ مخلوق جذباتی اور خیالی بھروسوں کا ہونا نہ ہونا ذہن میں رکھتی تھی۔ اس سے جانے کیوں نفرت کرتی تھی۔ مثال کے طور پر جب عورتی شہزادی سپاہیوں کے کسی لشکر کا معائنہ کرنے کی زحمت گوارا فرماتی تھیں اور پھر اپنے منہ سے سلامی لیتے اس منظر کے قریب میں دو چار مرد جمع ہو کر فرماتی تھیں۔ تو شاید اسی قسم کی حرکتیں کسی گزرے ہوئے زمانہ میں اچھا اثر پیدا کرتی ہوں لیکن اب تو ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا تھا وہ بالکل اس کے الٹ تھا۔ جس کی خواہش میں یہ ہوا کرتا تھا۔ اگر بالفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہماری شہزادی صاحبہ اس حقیقت سے واقف تھیں کہ اس زمانہ میں سپاہیوں کی خوراک بگڑتی تھی اس دن روزمرہ جیسا کہ ہوا کرتا تھا تو کم از کم اس کا تاثر نہیں دیا جا سکتا کہ دوسرے لوگ اس بھید سے واقف تھے۔ ان باتوں سے بہترین ارادے بھی نتائج تخریب و باعث انفعال ہو جاتے ہیں۔

بادشاہ کی ضرب المثل حکایت شعاری صحیح خبری باشد و رعایا کی کڑی مشقت کے تفصیلی تذکرے کو بیکار خاص طور پر دور دور پیشوائش ظاہر کرتا کہ وہ کہیں تکلیف طعام سے علیل نہ ہو جائیں لوگوں میں ایسی گفتگو کا موضوع بن جاتے تھے جو کوئی اچھا انسان نہ تھی۔ بادشاہ سلامت کیا نوش فرماتے ہیں اور کس طرح نوش فرماتے ہیں۔ یہ جاننے کی کسی کو خواہش نہ تھی۔ اگر بادشاہ بیمار ہو کر اپنا کھانا اسب ضرورت آرام کرتا تو کسی کو اعتراض نہ تھا عوام کی خوشنودی تو اس میں مضمر تھی کہ بادشاہ بحیثیت ایک فرد بشر کے اپنے فرائض ٹھیک انجام دیتا۔ بادشاہ کے متعلق جو عنوانات مشہور کیے جاتے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا ہونا چاہیے۔

یہ اور قسم کی دوسری باتیں تو خیر کچھ ایسی اہم نہ تھیں۔ ہاں قوم کے وسیع حلقے میں یہ رواج عزیز اور اعتقاد بہت زیادہ مہلک تھا۔ کہ ہر فرد کو ساری زندگی کی تمام ذمہ داری بادشاہ سلامت نے اپنے اوپر محسوس کر لی ہے۔ اس لیے اسے کسی اور کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں جب تک سرکاری نظام ٹھیک تھا یا کم از کم جب تک نظام کی بہت ٹھیک تھی تب تک کسی کی ذاتی اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جب ہر ایک وزارت میں کی بہت بڑھ گئی اور اس کی جگہ ایسے لوگ برسر اقتدار آ گئے جن کا کردار ایسا حامل اعتماد نہ تھا تو ملک تباہی کے کھلے راستے پر گامزن ہو گیا۔ تب یہ فرمانبردارانہ اطاعت اور اطمینان جو اس کے باعث قوم کو ہر مسئلہ میں سر اطاعت خم کر دینے کی عادت تھی ایک ایسا مہلک عیب ثابت ہوا جس کی ضرر رسانی تصور سے بھی باہر تھی۔

تاہم ان تمام اور بعض دوسری خرابیوں کے باوجود کچھ ایسی خوبیاں بھی موجود تھیں جن کا انکار ممکن نہیں۔

ملوکانہ نظام حکومت کی خوبیاں

پہلی خوبی یہ تھی کہ ملوکانہ نظام حکومت قومی امور کی انجام دہی اور قومی سلامتی میں تسلسل اور استقامت کی ضمانت ہے۔ اس نظام حکومت کا فائدہ یہ ہے کہ سرکاری

کیتے تھے۔ اس سے نفرت کرتے تھے اور اس کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے ڈرتے بھی تھے۔ قوم عالم کو نئے ہتھیار سے مزید مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر وہ سامی میں جو جرمن لاقوامی کیمپ سے رہا ہوئے انہوں نے بھی جرمن فوج ہی کو خاص طور پر اپنے لئے منتخب کرنا مناسب سمجھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جرمن فوج ہماری قومی تربیت کو جرمن لاقوامی شہریوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے والا واحد قلعہ تھی۔ اگر قوم کو متحد کرنے اور مقابلہ پر ابھارنے کے لیے فوج سے ہوئی تو وہ سامی کے نمائندگان کے مقاصد مشکوک جلدی پورے ہوئے اس سے بھی پہلے پورے ہو گئے ہوتے۔ جرمن قوم کی صحت تک جرمن فوج کی مرہون منت ہے۔ اس حقیقت کو صرف ایک ہی مثال ظاہر کر سکتا ہے اور وہ مثال ہے سب کچھ!

جرمن فوج قوم کی تربیت کا گہوارہ تھی!

جب قوم میں ذمہ داری کا احساس مفقود ہو چکا تھا اور جب ہر شخص کی ذمہ داری سے انکار کی عادت عام ہو چکی تھی۔ اس وقت صرف فوج ہی قوم کو ذمہ داری کی تربیت دے رہی تھی۔ بغیر ذمہ داری کی عادت پارلیمنٹ کے عدم ثبوت کے ساتھ پھیلی تھی۔ کیونکہ پارلیمنٹ تو خود غیر ذمہ داری کی مجسم نمونہ ہے۔ فوج اس وقت قوم کو انفرادی شجاعت کا سبق پڑھا رہی تھی۔ جب کہ بزدلی کی خصلت ایک وبا کی طرح عام ہو چکی تھی۔ اور جب ذاتی مفاد کو قومی بھلائی کے لیے قربان کرنا قریب قریب ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ہی شخص کو دین سمجھا جاتا تھا۔ جو فقط اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہو۔ فوج ہی وہ واحد قوت تھی جو ہر جرمن کو یہ بتا رہا تھا کہ قوم کی حیات "دین الاقوامی اخوت" کے بے بنیاد نظریات میں مضمر تھی۔ وہ صحیح جرمنوں تک پہنچیں اور مگر یہ ہوں کو ایک ہی برادری میں منسلک کر دینے سے ممکن ہے۔ بلکہ خود قوم کو صحت و روح تحفظ دینے میں پوشیدہ ہے۔

فوج ہر فرد کی قوت کا فیصلہ کیا کرتی تھی اور ترقی دیتی تھی۔ یہ کام اس دور میں

جرمن جو ڈھنگ تھے ہاں کی آنکھوں پر تعصب نے پٹی باندھ رکھی تھی تسلیم نہ کرتے تھے کہ لیکن دنیا کی دنیا اس حقیقت سے خوب آگاہ تھی کہ جرمن قوم کی عزت اور وقار کا سب سے زبردست ہتھیار جرمن سپاہیوں کے رزق کی صورت میں فوج تھی۔

جرمن کا دیوانی نظام

ایک تیسرا قابل تعریف اور دیکھنے کی چیز فوج اور بادشاہ کے بعد دیوانی نظام تھا۔ یہ جرمن سرکاری عہدیداروں کا قبیلہ تھا۔

جرمن نظم و نسق کی تنظیم اور کارگزاری دوسرے ملکوں کے نظم و نسق سے بہتر تھی۔ ممکن ہے کہ شہروں کی رسم پرتی پر کچھ اعتراضات ہوں لیکن اس لحاظ سے جرمنی کی حالت زیادہ سے زیادہ دوسرے ملکوں جیسی تھی۔ اس سے بہتر نہ تھی۔ دوسری سلطنتوں کے سرکاری مدرسین میں وہ اتحاد عمل نہ تھا۔ جو جرمن دیوانی عمل میں موجود تھا۔ نہ ہی دوسرے ممالک میں دیوانی عملہ ایسا با اصول اور دیانت دار تھا۔ تھوڑی سی دفتری رسم پرتی اس کے ساتھ دیانت اور وفاداری وہ چیز تھی جس کی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری اور زمانہ سازی سے بہتر ہے جو جہالت ناقابلیت اور کرپشن میں مبتلا ہو کر رہتی تھی۔ اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ جرمن نظم و نسق دفتری رسم پرستی، افسر سے تسلی نہ ہونے کے باوجود اس کی کارگزاری قابل تعریف نہ تھی۔ تو میں ایسے معترض کو جواب دوں گا کہ دنیا میں ہر کون سا ملک ہے جو جرمنی کی سرکاری ریلوے کے مقابلہ میں بہتر طریقہ سے منظم تجارتی کاروبار کا مالک ہے۔ انگلستان نے اس سرکاری ریلوے کی بہت سے بہتر بنائی۔ حتیٰ کہ سرکاری ریلوے قوم سے بیچ کر خواہی نخواہی ملکیت بنا دی گئی لیکن لوگوں نے جرمن ریلوے کو ملک بنا رکھی ہے اس کے دل میں عوامی ملکیت کی ایک خاص معنی ہیں۔ وہ معنی یہ ہیں کہ جس میں اتفاقی یا بازاری دباؤ سے وزارتوں نے جرمنی میں انتخاب پایا کرتا تھا ان کے بدلے گھٹیا لیاقت والے جا سکیں۔ دیوانی نظم و نسق کے محکمہ میں سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ وزارتی تبدیلیوں سے بالکل متاثر نہ ہوتے تھے۔ جرمن

کے سرکاری ملازمین پر حکومت کے سیاسی مزاج کا بڑا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اب انتخاب کے بعد وہ کیفیت بدل چکی ہے۔ ہر وقت سرکار گری کی جگہ ذمہ داری نے لے لی ہے۔ سرکاری ملازمین میں بڑی بڑی اصول پر مبنی سرکام کرنے کی قابلیت کی کوئی قدر نہیں۔ بلکہ اسے بے وصف سمجھتے ہیں۔

حکومت کا اقتدار عوام کے اعتماد پر مبنی ہے

ہندستان کی قدیم سلطنت کی تمام اصول حاکمہ اور اقتدار سرکار کا نظام حکومت تحفظ اور دبدبہ کی بنیاد پر مبنی تھا۔ سرکاری اقتدار کی وہ قوت جو تاج مقتدر ہے کن کن ستونوں پر قائم تھی۔ اقتدار سرکار اس مثل لیمپ سے تعبیر کیا جا سکتا جو مرکزی پالیسی یا صوبائی حکومتوں میں جلایا جاتا ہے۔ تحفظ حکومت کے قانون سرکاری اقتدار کی علامت نہیں ہوا کرتے ہوا جیسے لوگ سرکاری اقتدار کے منکر ہوں کہیں عدالتوں میں سزائیں دلوا کر اس اقتدار کی دھاک نہیں بٹھائی جا سکتی۔ اقتدار سرکار تو اس عام اعتماد کا نام ہے جو نظم و نسق کی خوبی اور قومی مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ اعتماد اس یقین کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت اور نظم و نسق بے غرضی دیانت داری اور خیر خواہی کی راہ پر چلائے جا رہے ہیں۔ اور ملک میں جو قانون رائج ہے وہ تو قوم کے اخلاقی معتقدات کا ترجمان ہے عامۃ الناس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو حکومتیں تشدد کے بل بوتے پر قائم نہیں رہتیں۔ بلکہ حکام قومی مسائل کے دیگر انصرام کرنے والوں کے خلوص اور دیانت پر قوم کے اعتبار سے زندہ رہتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ ماضی قریب میں جنگ سے پہلے ممالک مفتوحہ قوم کی اندرونی طاقت کو گھن کی طرح کھا کر کھوکھلا کر رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جرمنی کے مقابلہ میں دوسری حکومتوں کی حالت ان ٹربیوں کی وجہ سے بہتر تھی۔ باوجود اس کے جب امتحان کی گھڑی آئی تو وہ دوسری حکومتیں بیکار ثابت ہوئیں اور تباہ ہو گئیں۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ سے پہلے جرمنی میں جو نظائم

تھے ان کے مقابلہ میں طویل زیادہ تھیں۔ اس لیے ہمیں جاپان کے تعلقی اسباب کسی دوسری جگہ تلاش کرنے چاہئیں۔ دراصل جاپان کے اسباب کی نوعیت دوسری ہی تھی۔

جاپان کے رول کی تعلقی اور سب سے گہری وجہ یہ تھی کہ تعلقی مسئلہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور یہ نہ سمجھا گیا کہ قوم کے تاریخی ارتقاء میں تعلقی اصول کو کیا زبردست دخل حاصل ہے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے واقعات حادثات کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اصل اور نوع کی افزائش اور حفاظت کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی جبلتوں اور اعمال کو شعوری طور پر رکھے یا نہ رکھے اس سے ان اعمال اور جبلتوں کی ارتقائی امکانات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

☆☆☆

قانون ہموس نوعی

زندگی کی روزمرہ کی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جو اتفاقیہ ہوتی ہیں کہ انہیں ہر ٹالے جانے والا دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ان حقیقتوں کے اس طرح نمایاں ہونے کے باوجود بھی لوگ انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ یا کم از کم ان کے شعوری احساس سے محروم رہتے ہیں۔ بعض سادہ حقائق کی طرف روزمرہ کی زندگی میں لوگ اس طرح اندھے ہوتے ہیں کہ جب کوئی انہیں اس طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹھٹھک کا کھو رہ جاتا ہے۔ ہر انسان ان حقائق سے ہر شخص کو آگاہ ہونا چاہیے تھا۔ کولمبس نے انڈے کو ایک سرے پر کھڑا کرنے کی جو ترکیب بتائی تھی۔ اس جیسی آنکھوں دیکھی مثالیں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کے لیے کولمبس جیسے مصر کہاں ملتے ہیں۔

کائنات فطرت میں معمول قدرتی کرتے ہوئے ہمیشہ سے لوگ اس خوبصورتی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو ہوتا ہے۔ عادتاً ان میں سے غالب اکثریت ان کھلے اصولوں سے جاری ہے جن کے مطابق قدرت اپنا کارخانہ چلا رہی ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک بڑے اصول کو جو ہر زندہ جنس حیوانی پر حاوی ہے۔ "قانون ہموس نوعی" کا نام دیا جا سکتا ہے۔

یہ سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ فطرت کی آزمودہ سے لمبی زندگی کی جس حالت شکل میں ظاہر ہوتی ہے وہ سب ایک حیوانی قانون کے تحت ہیں اس قانون کا فطرت کے کل قانون کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کا تقاضا ہے کہ ہر نوع حیوانی اپنی نسل کی حفاظت اور توالد و تناسل کے لیے جو کوشش کرتی ہے اس میں کبھی اپنی نوع سے باہر کسی دوسری نوع کی شمولیت گوارا نہیں ہوتی۔ ہر حیوان اپنا جوڑا صرف اپنی ہی نسل میں تلاش کرتا ہے۔ پودا صرف پودوں سے زاد و توالد کرتا ہے۔ چڑا

صرف چڑیا کو دیکھتا ہے۔ انکا فطرت کے بارے میں کہنا ہے کہ جنگلی چوہا صرف جنگلی چوہیا کا رشتہ قبول کرتا ہے گھریلو چوہا گھریلو چوہیا سے ہی گھر بسا کرتا ہے۔ الگ الگ نوع الگ سے شادی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

محض خاص حالات میں اس قاعدہ سے کسی انحراف ہوتا ہے۔ یہ انحراف یا تو جبر کا نتیجہ ہوتا ہے یا فریب کا۔ یا جب کوئی دوسری رکاوٹ کے سبب نوع کے افراد میں باہم توالد و تناسل ناممکن ہو جائے تب ایسا ہوتا ہے۔ اس صورت میں بھی فطرت اس غیر فطری زوج کے خلاف اپنی پوری قوت سے احتجاج کرتی ہے فطرت کا احتجاج اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مختلف النوع والدین کی دوغلی اولاد بانجھ ہوتی ہے یا اس کی قوت تولید محدود رہتی ہے۔ اکثر مقامات میں دوغلی مخلوق اور اس کی اولاد مختلف امراض کی سبب معمول قوت سے بے بہرہ ہوتی ہے یا بیرونی حملے کے خلاف اپنی حفاظت کی بھی صلاحیتوں سے محروم رہتی ہے۔

مظاہرات فطرت کے نظر آنے والے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ جب دو الگ الگ نوع کا زوج ہوتا ہے اس کی تاثیت مساوی نہیں تو ان کی اولاد کا مادہ والدین کی خصلتوں کی اوسط کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے جو بھی رنگ نسل کے تخم و میں اپنی منصب رکھتا ہو اس کے مقابلہ میں اولاد کی خصلت کم ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہتر نوع سے تعلق رکھنے والے ماں باپ سے اولاد کی خصلت کم ہوگی۔ لہٰذا اعلیٰ نوع کے مقابلہ میں یہ دوغلی نسل زیادہ بہتر خصلت والی ہوگی۔ مگر ملاوٹ والا نوع توالد و تناسل فطرت کی ان کوششوں کے خلاف ہے جو دونوں والدین کی اعلیٰ طرز کو ترقی دے کر زندگی میں رنگا رنگ کے خواہاں ہیں۔ یہ رنگا رنگی جاری رہ سکتا ہے اگر اعلیٰ طرز ادنیٰ طرز کے ساتھ اختلاط قبول نہ کریں۔ بلکہ اعلیٰ نوع کو دنیا پر کامل غلبہ حاصل کرنے دیں۔ جو زیادہ طاقتور ہے اسے کمزور پر مسلط ہونا چاہیے نہ کہ اس سے مخلوط ہو کر اپنی اور فطرت کو بھی نیچا دکھانا چاہیے۔ یہ

اصول صرف انہیں لوگوں کو کامیاب ہوتا ہے جو پیدائشی طور پر ناخلص فطرت ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی طبیعت کمزور ہے اور ان محدود ہے اس لیے وہ ایسا میلان کرتے ہیں۔ ورنہ اس اصول کی راستبازی کے طبیعی زندگی کے ارتقا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات کی زیادہ میں اس کو اس طرح آمیزش سے پاک رکھنے کی ترکیب نکالی ایک نوع کو دوسری نوع سے ہی ممتاز نہیں کر دیتی بلکہ ہر نوع و اصل کی داخلی مماثلتوں کو بھی زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔ بھری بھری ہی رہتی ہے۔ بنا بنا ہی رہتی ہے۔ اور پھیلتا ہمیشہ پھیلتا ہی رہے گا۔ ہر نوع کے افراد میں باہم اگر کوئی امتیاز باقی رہ جائے تو وہ جسمانی حالت قوت، بیرونی ذہانت کی وقت اور بہت وغیرہ وہ صاف تک محدود ہو گا۔ ان سے افراد بہتر و برتر ہو سکتے ہیں۔ ایسی بھری تلاش کرنا محال ہے جو انگوں پر مشتمل ہو۔ اور ان کی حفاظت کیا کرے۔ اسی طرح کسی بھی روئے زمین پر نہیں اس کی پوجا ہوں سے ہوتی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف نوع کے وہبی تخلیل کسی باہمی مجامعت کا نتیجہ نہیں بلکہ عشق اور اشتہا سے پیدا ہوتی ہے۔ تخلیل ان دونوں جذبات میں سے کسی وجہ سے پیدا ہو فطرت جرے سے تماشہ دیکھتی ہے اور جو نتیجہ بھی برآمد ہو۔ اس سے محظوظ ہوتی ہے۔ روزانہ رزق حاصل کرنے کی جدوجہد کروڑوں جانداروں اور ذی روحوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ ترجیح ماد و تخلیق کے لیے باہم جنگ کرتے ہیں تو غلبہ اس کو حاصل ہوتا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہو۔ اس طرح جو سب سے زیادہ طاقت ور ہو سے کم از کم ایک موقعہ دیا جاتا ہے کہ وہ اولاد پیدا کرے۔ اس جدوجہد سے نسل کی صحت اور قوت مدافعت ترقی کرتی ہے۔ یوں باہمی تخلیل زندگی کے اعلیٰ مقامات کی جانب ترقی درجات کا ایک ذریعہ ہے۔

فطرت ضعیفوں سے طاقت وروں کا اختلاط ناپسند کرتی ہے

اگر ایسا نہ ہو تو ترقی کی رفتار رک جائے اور ناپید ہونے کا دور شروع ہو جائے۔

کیونکہ دوسری کی تعداد ہمیشہ اعلیٰ کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر دونوں کو بھی تو تعداد کا فرق اور خود حفاظتی کی وہی سہولتیں حاصل ہوتیں جو اعلیٰ کو حاصل ہیں تو پھر ادنیٰ کی تعداد اور بھی کثرت سے بڑھ جاتی۔ الہام یہ ہوتا کہ اعلیٰ کو پیچھے ہٹا کر ادنیٰ برسر اقتدار آ جاتے۔ فطرت نے یہ اصولی حماقت اس طرح نہیں اپنائی ہے کہ زندگی کی راہیں دشوار بنا دی ہیں تاکہ ان پر چلتے ہوئے کروڑ پیچھے رہ جائیں اور ان کی تعداد گھٹ جائے جو کروڑ باقی بچیں ان کی فراوانی نسل بھی بڑھ جائے۔ کیونکہ یہاں بھوکی اور پہلے سے بھی زیادہ سخت پابندیاں محنت اور جفاکشی کا تقاضا پہلے کہیں زیادہ ہوتیں۔

اگر فطرت کی کروڑوں اور جفاکشیوں سے اربوں کی اجارہ داری نہیں دیتی تو وہ کسی اعلیٰ نسل کا یک طرفی عمل سے انتظام بھی برداشت نہیں کرتی۔ کیونکہ اس طرح تو فطرت نے کروڑہا سال سے نسلی کر کے اعلیٰ مخلوق پیدا کرنے کا جو اہتمام کیا ہے وہ سب یہاں چھن جائے گا۔

اس قاعدہ کے ثبوت میں تاریخ سے اتنی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ تاریخ حیرت انگیز وضاحت سے یہ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی آریوں نے کسی ادنیٰ نسل کے ساتھ اپنے خون کی آمیزش کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ برتروں کے علمبردار ہو گئے۔ شمالی امریکہ کے باشندوں کی غالب تعداد آج بھی حاصلی نسل ہے۔ انہوں نے ادنیٰ نسلوں سے بہت کم اختلاط کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کی تہذیب ہندوستان کالونیوں اور جنوبی امریکہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں انگلی نسل آباد کاروں نے وسیع پیمانے پر ملک کے قدیم باشندوں سے رشتہ داریاں قائم کر لی ہیں۔ نسلوں کے امتزاج سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اس کا فیصلہ کن مرقع مشاہدہ آج شمالی اور جنوبی امریکہ میں کیا جا سکتا ہے۔ شمالی امریکہ کا غالب عنصر اس نے اپنی خون پر قائم رکھا ہے اور کسی دوسری نسل سے اختلاط نہیں کیا۔ آج سارے امریکہ پر اعظم پر غالب ہے۔ اور اس وقت تک غالب رہے گا جب تک وہ اپنے خون کو ملوث ہونے کی عادت نہیں

گرفت نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ فطرتی قوانین سے بغاوت حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں

(الف) عمل اصل کا معیار پست ہو جاتا ہے۔

(ب) انسانی ہر دلعزیزی کا خط شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اور بتدریج لیکن یقینی طور پر زندگی کی قوتے کی ہوتیں منسلک ہونی جاتی ہیں۔

جس عمل کی پاداش میں سزا بھگتنی پڑتی ہے وہ خالق مطلق کے حکم کی نافرمانی ہے۔ اس لیے یہ عمل ایک جرم ہی نہیں بلکہ ایک گناہ بھی ہے۔ انسان جب فطرت کے کل قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ ان طاقتوں کے ساتھ ٹکراؤ مول لیتا ہے۔ جن پر خود اس کی اپنی زندگی کا دارومدار ہے۔ فطرت کے قوانین کے خلاف جہاد کر کے وہ اپنی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

اس موقعہ پر اکثر وہ کتنا نادان اعتراض سننے میں آتا ہے جو بیوقوفوں کی تخلیق کا نتیجہ ہے اور جو صرف ان پر ستوں کی ذہنیت کا مخصوص نمونہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان تو فطرت کو بھی مسخر کر سکتا ہے۔

انسان فطرت کے تابع ہے اس کو مسخر نہیں کر سکتا

بعض لوگوں نے بیوقوفوں کی یہ ہوا اس طوطے کی طرح رٹ لی ہے۔ اور طوطے ہونے کے باعث وہ اس کو دہرا کر نہیں کرتے ہیں کہ کم از کم ایک بیوقوف نے تو فطرت کو مسخر کر لیا ہے۔ حالانکہ فطرت کے ساتھ ٹکرانے والے ان سورماؤں کے پاس ہوائی جہاز کے سوا کوئی ہتھیار نہیں۔ اور یہ ہوائی جہاز بھی سراسر وہم ہے اگر ان کا یہ وہم دنیا سے تسلیم کرا لیا جائے تو یہ کارخانہ ہی بند ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان آج تک کسی بیوقوف نے فطرت کو مسخر نہیں کر سکا۔ انسان نے جتنے بڑے سے بڑا کارنامہ یہ کیا ہے کہ کبھی کبھی اس ظالم کو گھٹنے کو ہاتھ لگا لیا ہے یا شاید کبھی کبھار اس کے کسی کونے کو اٹھا کر دیکھ لیا ہے تو فطرت نے اپنے چہرے پر

ڈال رکھا ہے۔ فطرت کے اتنی بھید اور بھی معمے آج بھی اس کتاب کے پہلے ہوئے ہیں۔ انسان کبھی کسی شے کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ ہاں انسان ان جانداروں کو ضرور تخلیق کرتا ہے جن کا علم بھی وہاں تک نہیں پہنچا جہاں انسان فطرت کے کسی قانون یا بھید کو کھوج کر رسائی حاصل کر پایا ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر انسانی سوچ کبھی بھی حقیقتوں پر قابو نہیں پا سکتی جو خود انسانی وجود اور ارتقاء کے پیچھے ہوتی ہیں۔ کیونکہ انسانی سوچ خود انسان کی محتاج ہے۔ اگر انسان ہی نہ رہا تو اس کی سوچ اس دنیا میں کہاں سے پیدا ہوگی۔ لہٰذا جب سوچ کا وجود انسان کے وجود کے تابع ہے تو کائنات ہو کہ انسان کا وجود ان قوانین کے ماتحت ہے وہ انسانی سوچ پر بھی حاوی ہیں۔

پھر صرف یہی نہیں۔ بعض نباتات بعض ستون تک محدود رہتی ہیں جو نباتات کے ماہرین کے بقول تحقیق کے متعلق ہیں بلکہ وہ جس کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں وہ تو خاص طور پر صرف چند ستون تک محدود ہیں۔ اگر اس موقعہ پر ایک رائج الوقت محاورہ استعمال کیا جائے تو یہ مضمون بیکار ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسے نباتات کسی "نباتات فلک" کے زمرہ میں ہوتے ہیں۔ ان نباتات کا تعلق فلک سے نہیں بلکہ وہ محض جڑوں کا اظہار ہیں۔ مثلاً رے بھیجے کی تمیز اور بیگی مدی کا فرق وغیرہ وغیرہ وہ انسان کی سرشت میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ ان کا علیحدہ تصور محال ہے۔ ایسے نباتات کا وجود انسان کے تخلیقی تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے نباتات کو زندہ رکھنے کے لیے بعض لمحوں اور خاص قسم کی خصوصیتوں کا وجود ازحد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جو شخص مکالمہ نویسی کا شوق رکھتا ہے کہ دنیا میں امن ہی قبول جائے۔ اس کا جس تک کس چلے سے چاہیے کہ وہ ستون تو تیز عام میں مدد دے کیونکہ اگر تو امن مٹ گئے تو دنیا میں سے ساتھ ہی امن ہی بھی مٹ جائے گی میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ بدقسمتی سے اس طرح ہماری قوم امن پسند کا ہے اس طرح دنیا کی اور کسی قوم کے امن کا وہ نہیں۔ اگر آپ دنیا میں امن قائم کرنا چاہتے

ملک کا نظر تو انسان پر کشادگی کیوں نہ ہو پھر بھی مختلف قسموں پر ایک ہی ملکی اثر کے نتیجے قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ کسی خطہ کا بگڑا ہوا یا کمزور نسل کو محنت مشقت اور جفاکشی پر مائل کرکے اعلیٰ ترین نمونوں کے دوسرے کھول سکتا ہے تو وہی اس کے برعکس اس کے زمین کا یہی بگڑا ہوا کسی دوسری نسل کے پیروں میں عیش و راحت طلبی کا باعث بن سکتا ہے اسے مسکت کا شکار بھی بنا سکتا ہے۔ بیرونی حالات کسی قوم پر جو اثر کرتے ہیں اس کا انحصار ہمیشہ اس قوم کی داخلی خصوصیات پر ہوتا ہے۔ جو حالات ایک نسل کے لیے جفاکشی کا باعث بن جاتے ہیں وہی حالات کسی دوسری نسل کو محنت سے مائل کر دیتے ہیں۔

زندگی بغیر کشمکش کے ناممکن ہے

یا کی تمام پرانی تہذیبیں اس لیے زوال پذیر ہو گئیں کہ جن نسلوں نے شروع میں ان کی بنیاد رکھی تھی وہ اپنے خون کو پاک نہ رکھ سکیں۔ اور اس لیے انحطاط کا شکار ہو کر مٹ گئیں۔

اس تجربہ کا سب سے زیادہ اہم اور سبق آموز پہلو یہ تھا کہ قوم اس اصول کو بھول گئی کہ تہذیب و تمدن کی بنیاد انسان ہے نہ کہ انسان کی بنیاد تہذیب و تمدن پر۔ وہ خاندان یا گروہ جو کسی خاص قسم کی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنا چاہے اس کا فرض ہے کہ انسانیت کے اس نمونے کو محفوظ رکھے جس پر اس تہذیب و تمدن کا انحصار ہے۔ وہ انسانیت کے خاص نمونے کو بچانے کی کوشش میں فطرت کے اس مقدس قانون کو نہ بھولنا چاہیے۔ کہ صالح وہی آدمی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے بہتر ہونے کے باعث بقا کا حق حاصل کر چکا ہو گا۔

جو زندہ رہنا چاہتا ہے اسے لڑنا بھی ہو گا۔ اس دنیا میں زندگی کا مستقل قانون کشمکش ہو چکا ہے۔ یہاں جو شخص جنگ پر آمادہ نہیں اسے زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی محسوس ہوں پھر بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ حقیقت یہی ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اس زعم میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ وہ فطرت کو تسخیر کر سکتا ہے وہ اس طرح در

حقیقت فطرت کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے اس کا انجام اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتا ہے۔ فطرت اس گستاخی کی سزا فوراً تسکنت ہوہ کی صورت میں نازل کیا کرتی ہے۔

جو شخص نسل کے کانوں کی پرواہ نہیں کرتا یا اس قانون کو حقیر سمجھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے کو اس مسرت سے محروم کر رہا ہوتا ہے جس کی تلاش میں ہے۔ اعلیٰ نسلوں کی بقا کا صرف یہی راستہ ہے۔ اس کا کہ وہ انسان کی ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ وہ اپنے کندھوں پر نہایت بھاری انسان کے لئے علم اٹھا لیتا ہے۔ کمزور کے بوجھ سے دب کر ہی بستیوں میں گر ہوتا ہے جہاں ترقی کا کوئی امکان ہوتی نہیں رہتا۔

آریا نسل کو انسانیت کہنی کا مقام حاصل ہے

اس راستہ میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں کہ وہ کون سی نسلیں تھیں جنہوں نے شروع میں انسانی تمدن کی بنیادیں ڈالیں اور اس طرح سے ہر اس نئے کی بنا کی جسے ہم کسی طرح انسانیت کے تصور سے متعلق کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ آج کے زمانہ پر اپنی توجہ مبذول کریں۔ یہ کیا جائے تو پھر اس سوال کا جواب نہایت آسان بھی ہے اور بالکل واضح بھی۔ انسانی تہذیب و تمدن کا ہر نمونہ تمام نمونوں بلکہ وہ تمام نمونے جو آج دنیا میں ہمارے سامنے موجود ہیں دراصل آریوں کی ایجاد ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف آریوں نے ہی اعلیٰ قسم کے انسان پیدا کئے ہیں اور فقط انسان سے ہمارا جو کچھ مفہوم ہو سکتا ہے۔ اس کا اصل نمونہ آریا ہی ہیں۔ نسل آدم کے باقی ہر رہا آریا ہیں اور آریوں کی یہ پہلی بیشتر اس قوانین بھی کے لوٹ سے ہوئی ہے۔ جو ہر عہد میں علم کی روشنی کی صورت اختیار کر کے انسان کی شب تاریک میں چمکا کرتی رہی ہے۔ اور اس طرح غیب کے پردے پر سے نقاب ہٹا کر انسان کو وہ قوت دیتی رہی ہے کہ وہ اس کرۂ زمین کی دوسری مخلوق کی حاکم بن جائے۔ اگر دنیا سے آریا مٹ گئے تو کائنات پر ظلمت چھا جائے گی۔ پانچ ہزار سال میں ہی انسانی تمدن مٹ جائے گا۔ اور دنیا ایک دم انسان کر

رہ جائے گی۔

اگر ہم انسانوں کو تین انواع پر تقسیم کریں تو اول وہ جو تمدن کی مار رکھتے ہیں دوسرے وہ جو تمدن کی مار تو نہیں رکھ سکتے لیکن پہلے سے قائم شدہ تمدن کو قائم رکھنے یا بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ تیسرے وہ جو تمدن کو تباہ کر دیتے ہیں تو پہلی قسم میں صرف معماروں کا نام شمار کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تمدن کی عمارتیں معماروں نے بنائیں اور انہوں نے ہی اس عمارت کی دیواریں استوار کیں۔ مختلف اقوام نے اپنی انفرادی خصوصیات سے فقط اس عمارت کے اندر رنگ و روغن کا کام دیا ہے۔ ارتقائے انسانی کا عنصر تعمیر کرنے کے لیے سارا نقشہ معماروں نے ہی بنایا۔ اور انہوں نے ہی وہ تمام مواد فراہم کیا ہے جو اس محل کی تعمیر کے لیے ضروری تھے۔

دوسری قسموں نے فقط یہ کام سر انجام دیا ہے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق معماروں کی مرتب کردہ ہدایات پر کم و بیش عمل کیا ہے۔

جاپان کا تمدن مصنوعی ہے

مثال کے طور پر سارے مشرقی ایشیا نے پچھلی برسوں میں وہ تمدن قبول کر لیا ہے جس کی بنیاد یونانی علوم اور عیسائی خون میں ہے وہ اس تمدن میں ایسے گھل مل گئے ہیں۔ کہ اسے اپنا تمدن ہی سمجھتے ہیں۔ صرف تمدن کے معماری کا کام ہے کسی حد تک ان کی جغرافیائیت بھی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جاپانیوں کا تمدن تو اپنا ہے فقط انہوں نے یورپ سے آرائی مواد مستعار لے لیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ جاپانیوں کی موجودہ تہذیب سراسر یورپ کے علوم و فنون پر مبنی ہے۔ صرف کہیں کہیں اس پر جاپانی تمدن کے نقوش کا ملمع پھیر دیا گیا ہے۔ آج جاپان میں زندگی کی حقیقی قدریں وہ نہیں جو جاپانیوں کے آبائی تمدن کی تھیں۔ اگرچہ آبائی تمدن کے ظاہری آثار ابھی تک باقی ہیں۔ جب کوئی یورپین جاپانی تہذیب کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ پہلے تاثر سے جاپانی زندگی کے بعض مخصوص آثار سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے یورپ کی زندگی

سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جاپان ہندوستان یا یورپ اور امریکہ یعنی آریائی اقوام کے تعلیم یافتہ لوگوں پر حاوی ہیں۔ مشرق کی ان قوموں نے فی زمانہ ترقی کا کوئی مقام حاصل کیا ہے۔ انہوں نے پہلے آریاؤں ہی کے کارناموں سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت ٹھیک کی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے علوم و فنون ہی دراصل کمال ہیں جس کے سہارے اہل مشرق آج کل رونق لگا رکھتے ہیں۔ آج اہل مشرق کے دنیا کمانے کے ڈھنگ اور طور طریقے یورپ اور امریکہ سے مستعار ہیں۔ یہ ان آلات اور چیزوں کی ظاہری صورت جاپانیوں نے اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے حاصل کی ہے۔

اگر آج جاپان سے آریاؤں کا اثر ختم ہو جائے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ یورپ اور امریکہ تباہ ہو جائیں تو جاپان کے موجودہ علمی اور فنی ترقی کا بھی تھوڑے عرصے کے لئے تو ہراس ہے لیکن چند ہی برسوں میں اس ترقی کے بانٹنے مٹ جائیں گے۔ اور جاپانیوں کی اصلی خصلتیں ابھر آئیں گی۔ اس کے ساتھ ہی جاپانیوں کی موجودہ تہذیب پہلے تکبر کی تاثیر ہو کر پھر اسی غفلت کی نیند سو جائے گی جس سے آج سے ستر سال پہلے آریائی تمدن کے سامنے جاگ اٹھنے سے بیدار کیا تھا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح جاپانیوں کی موجودہ ترقی آریائی اثر کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح زمانۂ قبل تاریخ میں کسی بیرونی اثر ہی سے جاپانیوں کا اس دور کا تمدن بھی قائم ہو گیا ہوگا۔ اس قیاس کے حق میں ایک مضبوط دلیل یہ ہے کہ جاپانیوں کی قدیم تہذیب فی الواقع پہلے پامردہ ہوئی اور پھر بالکل مردہ ہو گئی۔ ایسی صورت کے ظہور بھی ہوتے ہیں جب کوئی قوم خون کے اس جوہر سے محروم ہو جائے جس نے پہلے اس میں تخلیقی قوتیں پیدا کی تھیں۔ یہ وہی بیرونی اثر ہوتا ہے جس نے کسی خطہ میں کسی قدیم تمدن کو برقرار رکھا تھا۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک قوم نے تمدن کے بنیادی اوصاف بھی نسلوں سے حاصل کئے ہیں۔ اس نے یہ تمدن پوری طرح جذب کر لیا ہو اور اسے کہیں

کہیں ترقی بھی ہوئی لیکن بعد میں جب کبھی بیرونی اثر رک گیا تو یہ مستعار تمدن بھی پہلے مردہ ہو کر مرجھا جاتا رہا تو اس کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایسی قومیں تمدن کی حامل تو ہو سکتی ہے لیکن خالق نہیں ہو سکتی۔

اس زاویہ نگاہ سے اگر مختلف قوموں کو جانچا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ بعض قومیں نے کبھی خود کوئی تمدن ایجاد نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ کسی دوسرے تمدن کی خوشہ چینی رہی ہیں۔

ساری کاروائی کمپوزیشن جب ذیل طریقہ سے سرانجام پا رہی ہے۔

دنیا میں تمدن کی ابتدا کیسے ہوئی؟

آریائی قبیلے جن کی مادری ملک ہمالیہ کی وادی ہے اچھی قوام کو مطیع کر لیتے ہیں۔ نئے ملک کی طرز رہن سہن سے متاثر ہو کر وہ اپنی رسموں کے کثیر التعداد حصہ کو بھول جانے کا عادی ہو جاتے ہیں آریاؤں کی وہ باتیں جو ہر نسلی قوم میں پائی جاتی ہیں جو آج تک ان کے اندر موجود ہیں۔ ملک کی جو خصوصیتیں نو واردوں کو متاثر کرتی رہیں ان میں زمین کی زرخیزی موسم وہوا وغیرہ شامل ہیں۔ چند ہزار سال یا اس سے کچھ زیادہ صدیوں میں آریاؤں نے ان تمدنوں کی بنیادیں ڈال دیں جن کی ظاہری خصوصیتوں سے آج ہم پتہ چلاتے ہیں کہ ان کے بانی کون تھے۔ گو یہ درست ہے کہ ہر جگہ مفتوحین کے جداگانہ اوصاف اور عادات کے خیال و حالات کے باعث ہر خطہ میں اس ایک ہی جڑ سے پھیلنے والے تمدنوں کی شاخیں مختلف ہو گئی۔ آریا کاریگروں نے ان اصولوں کی تلاش و تری کی جن کی وہ پہلے پابند ہوا کرتے تھے جیسی رسموں یا پرانی مثل کو ہاتھ سے نکلنے سے محفوظ کیا۔ انہوں نے مفتوحین کے ساتھ اختلاط شروع کیا۔ اس طرح ان کا جداگانہ وجود مٹ گیا۔ کیونکہ جب سے انسان بہشت میں نکلی ہوئی اس خطا کا مرتکب ہوا تھا تب سے لے کر آج تک اس کی گناہ کی ہر فطرتیں کو ہمیشہ وطن سے اخراج کی صورت میں بھگتنی پڑتی رہی ہے۔

ایک ہزار سال بعد یا اس سے بھی زیادہ مدت گزر جانے کے بعد آج ان قدیم عمارتوں کی وہ نشانی مفلوجین کی کھلتی ہوئی رنگت کی صورت میں وقوع پذیر ہے۔ یہ رنگت ان مفلوجین کے آباؤں سے وراثت میں پائی ہے۔ دوسری نشانی آبادیوں کے قائم کردہ قلعوں کے وہ بقیہ کھنڈر ہیں جو اب کلیر کے فقیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب ان لوگوں کا ان مفلوجین کے ملکوں سے مغلوب ہو گیا جس کے صرف جسم ہی نہ تھے عظمت کے حامل تھے بلکہ جن کی روح بھی عمارتیں شوکت رکھتی تھی تو تب وہ پہاڑی بھی ختم ہو گئی جس سے انسانی قدموں نے ترقی کی منزل روشن تھی۔ جس حد تک سابق کا نہیں کی وہ ادبی رگوں میں کھوئی ان کے آباؤ اجداد کے خون کا تر بتر ایک یادگار اور نشانی کے باقی ہے۔ ج ان کی کھلتی ہوئی رنگت سے ظاہر ہے اس عہد جہاں کے تمدنی انحطاط کی رفتار کی سست و تیز ہے اس تاریکی میں اگر کچھ دھندلی روشنی ہے تو اس کی کرنیں دراصل اس تمدن کی بجلی جوت جگانے والوں کے آثار سے پھوٹ رہی ہیں۔ مفلوجہ نسل جس بربریت کی طرف راجعت کر چکی ہے اس کے اندر جہاں تک قدیم تہذیب کی کچھ جھلک باقی ہے جس سے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید تمدن کے جو آثار دکھائی دے رہے ہیں ان کا سرا موجودہ نسل کے سر پر ہے حالانکہ وہ کچھ وہاں کے آپ ہی دیکھتے ہیں دراصل محض ماضی کا ایک عکس ہے۔

ہو سکتا ہے کہ تاریخ کے تاریخ حوادث اس بہم متمدن نسل کو پھر ایک جلد یا ایک سے زیادہ مرتبہ اس اعلیٰ نسل سے فیض یاب ہونے کا موقع مہیا کریں۔ جس سے پہلی مرتبہ اس بہم متمدن نسل نے اکتساب تہذیب کیا تھا۔ یہ علم نہیں کہ اس تاریخ وقت کے وقت بہم متمدن نسل کو شعوری طور پر وہ پہلا اتصال بھی ہو گا۔ ایسا ہو تو قابل آنے پر پہلی بار اعلیٰ نسل کے بچے کھچے ورثا ایک نئی کشش سے اعلیٰ نسل کے تمدن کی طرف کھنچے آئیں گے اور اس طرح وہ تعلق پھر مرتبہ جدید سے قائم ہو انتخاب ربط و ملت تازہ کیا جائے گا۔ تمدن کی ایک نئی لہر اٹھے گی اور اس وقت تک اپنا جلوہ دکھائے گی جب تک کہ

حقیقت کو یہاں یوں کہا گیا ہے اس کی بہترین مثالیں جنگ کے دوران میں ملتی ہیں۔ تکلیف کی گھڑیوں میں جب دوسرے مایوس ہو جاتے ہیں وہ بظاہر معصوم نظر آنے والے لوگ جان لیتے ہیں اور اپنے عزم صمیم اور موت کے منہ میں دلیری اور مصائب کے ہجوم کے اندر حوصلے سے دماغ سے سوچنے کی غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کر کے دیکھتے دیکھتے ناموروں اور اوروں کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر یہ امتحان کی گھڑی سر پر نہ آتی تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بے ہنر لڑکے کے سینے میں ایک نامور اور اوری روح موجود ہے۔ کسی قابل انسان کو مشہور کرنے کے لیے ہمیشہ کسی خاص تکلیف کی ضرورت ہوتی ہے قسمت کا اشارہ جہاں دوسروں کو تباہی اور بربادی کر دیتا ہے وہاں بعض اوقات اسے اپنے خوابیدہ انسانوں سے بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ جو اس کے برابر کی چوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ جب کوئی مرد کی زندگی کا طائف پھٹ کر تیلیدہ ہو جاتا ہے تو اس کے اندر چھپا ہوا وہ گوہر بے بہا کل کر سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر دنیا ششدر رہ جاتی ہے۔ گردش والے یہ کارنامے دیکھ کر بہت دفعہ گواہی دیتے ہیں۔ اور یہ مانے سے انکار کرتے ہیں کہ جو انسان ہمیشہ سے ان جیسا تھا۔ درحقیقت وہ اس غیر معمولی قابلیت کا مالک ہے جو اب بکلیت ظاہر ہو رہی ہیں۔ یہ وہ ہیشہ کا دستور ہے جس سے ہر غیر معمولی قابلیت کے انسان کو سابقہ پڑتا ہے۔

گو یہ درست ہے کہ جب کوئی موجد اپنی اختراع کو مکمل نہیں کر لیتا تب تک اسے شہرت نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ جب تک اسے شہرت نصیب نہ ہوئی تھی تب تک وہ اس قابلیت کا مالک بھی نہ تھا۔ ذہانت کی چنگاری تو پیدائش کی گھڑی سے ہی اس کے اندر موجود تھی۔ اور یہ چنگاری ہمیشہ شروع سے ہی اس شخص کے اندر موجود ہوتی ہے۔ جسے حقیقی تابانی و دیعت کی گئی ہوں۔ غیر معمولی قابلیت ایک ذہنی اور دماغی ملکہ ہے جس کا کتاب تعلیم و تربیت سے بھی تعلق نہیں۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ صرف فکر ہی اس اصل کے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا

خالق نسلوں ہی کی ہے۔ قومیں اپنی تاریخ کے مخصوص دور میں تخلیقی قوتوں کا اظہار کرتی ہیں وہ دراصل پورے سے تخلیقی طاقت کی مالک تھیں۔ جاپانی لکھاریوں اس کے درک سے قاصر رہی ہوں مگر بھی تخلیق کی یہ صلاحیت وہیں ان کی طبیعت میں ودیعت تھی۔ جیسا کہ بھی افراد کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقوام کو بھی شہرت تب حاصل ہوتی ہے جب وہ کوئی عملی کارنامہ سرانجام دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی کی دنیا قابلیت کو بحیثیت قابلیت کے دیکھنے والے حواس سے محروم ہے۔ دنیا تو صرف قابلیت کا عملی اظہار دیکھ سکتی ہے مثلاً یہ ایجادات اختراعات نظریات تصورات وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عملی آثار کا یہ اظہار بھی مدتوں بعد کیا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک فرد جو بیش معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے جسے قدرت نے بھی خاص استعداد ودیعت کی ہے۔ خاص حالات کی عدم موجودگی کے باعث اپنی قابلیت تسلیم نہیں کروا سکتا۔ اسی طرح قوم کی تخلیقی استعداد اور قوت بھی اس کی زندگی میں تب تک بروئے کار نہیں آتی جب تک اس کو حرکت دینے کے لیے کوئی خاص حالات موجود نہ ہوں۔

اس سچائی کی سب سے بڑی مثال اس نسل کی زندگی سے ملتی ہے جو ہمیشہ سے انسانی ترقی کا علم بردار رہی ہے۔ یعنی آریائی نسل جب بھی تقدیر اس نسل کو خاص حالات سے دوچار کرتی ہے تو اس کی صلاحیتیں ترقی کرکے نئی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہیں یہ وہی نسل ہے جو تہذیب و تمدن کے نئے نئے کارنامے سرانجام دیتی ہے وہی ہے جو ملک کی آب و ہوا اور مقامی قوموں کی خصوصیتوں سے متاثر ہوتے ہیں سب سے نمایاں اثر مقامی قوم کی فوجیت کا ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا قیام جس ماحول میں ہو وہاں فنی کاریگری اور آلات کی جس قدر کمی ہوتی ہے اسی قدر ہاتھ سے کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ مشینی طاقت کی جگہ کثیر مزدور رکھ کر کام چلایا جاتا ہے۔ آریا اگر دنیا کی نسلوں کو فتح کرکے کثیر تعداد میں ملازم بنا کر رکھ سکتے تو کبھی اس راستہ کی منزل بھی طے نہ کر پاتے جس پر چل کر انہوں نے تہذیب و تمدن کی بنیادیں رکھیں۔ نوکروں کی ضرورت

مثال موجود ہے جس طرح بعد مناسب پالتو جانوروں کے استعمال کے بغیر مشینی
طاقت کی اختراع ناممکن تھی کوئلہ میں مشینی طاقت نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ اب
جانوروں کے بغیر بھی کام چلا سکتا ہے۔ ٹیکسپیر نے اپنے ڈرامے جولیس میں ایک جگہ
معنی جملہ لکھا ہے۔ چاہے کسی کو پسند ہو یا نہ ہو مگر ہر بحث اس جملہ کا احاطہ نہیں ہو
سکتا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے کہ مصائب سے جو کام لیا جا سکتا ہے کبھی اب اسے یہاں سے
دفعہ کرو۔ ہزار ہا سال سے گھوڑا انسان کا وفادار خادم رہا ہے۔ گھوڑے نے انسان کی
ترقی کی منزلیں طے کرنے میں انسان کو قابل قدر مدد دی لیکن اب موٹر کی بیوفا
گھوڑے کو بیکار کر دیا ہے۔ چند سال اور گزر گئے تو گھوڑے کے استعمال کا بالکل رواج
نہ رہے گا۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج انسان ترقی کے جس مرحلہ پر پہنچ گیا ہے
وہاں گھوڑے کے قدموں کے طفیل نہ پہنچ سکتا تھا۔

غلامی جائز ہے

جن تمدنوں کے قیام کے لیے ان نسلوں کا وجود نہایت ضروری تھا۔ مشینی دور کے
غیر موجودگی میں صرف وہی نسلیں اس کی کوہ پیما کر سکتی تھیں۔ جس کے تعاون کے بغیر کسی
قسم کی ترقی ناممکن تھی۔ یہ صرف تخیل ہے کہ انسانی تمدن کے قیام کے ابتدائی مراحل میں
ترقی کا انحصار اس قدر پالتو جانوروں پر نہ تھا جتنا کہ وحشی نسل کے کاندھوں پر تھا۔

پہلے مفتوحہ نسلوں کو غلام بنایا گیا۔ اس کے بعد جانوروں سے بھی کام لیا جانے لگا۔
بعض لوگ یہیں اس کے الٹ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا اندازہ درست نہیں۔
پہلے وحشی مفتوحہ دشمن سے کام چلایا جاتا تھا۔ بعد میں گھوڑے سے یہ کام لینے کی نوبت
بعد میں آئی۔ چاہیں چاہیں کرنے والے ان ہر دو نسلوں کے سوا اور کوئی شخص اس حقیقت
حال کو انسانی ارتقا کی علامت قرار نہیں دے سکتا۔ یہ لوگ کھلے سے قاصر ہیں کہ
نرنگاری کی منزلیں تہذیب کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے لازم تھیں جس کا نام جاری
کرنے والا کریہ ہیوہ گو اعظم دنیا کی تو اپنی ترقیات کی جانب سے بند دل کرنا چاہتے

ہیں۔

انسانی ارتقا کی مثال ایک ایسی سیڑھی پر چڑھنے سے دی جا سکتی ہے۔ پہلے پہل قدم رکھنے کے لیے کوئی شخص دوسرے پائے تک نہیں پہنچ سکتا۔ آریاؤں کے اس زمانہ کے حالت کے مطابق جو راستہ انہیں نظر آتا تھا۔ انہیں اس پر چلنے کے لیے مجبور تھے۔ وہ اس راستہ پر چل سکتے تھے اس کے علاوہ آج کل کے اس پرست دیکھ رہے ہیں پہنچ ہے کہ ہی ہی کے راستہ پر چلنا مشکل اور دشوار ہے۔ لیکن جو دنیا کو اپنے خوابوں کی منزل تک پہنچانا چاہتے ہوں وہ اس ہی ہی کے راستہ پر چل کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں مالک کو یہاں مارنے والے لوگ تو انسان کو اس منزل پر پہنچانے کے بجائے اسے اس منزل سے ہی بے نیاز بنا دیتے ہیں۔

یہ محض ایک اتفاق ہی نہ تھا کہ تہذیب کا اولین شعور ان مقامات پر ہوا۔ جہاں آریاؤں نے اپنی آنکھوں سے پہلے قائم کیا اور انہیں فتح کر کے اپنی حاکمیت پر مجبور کیا۔ اپنی آنکھیں وہ پہلے ہو رکھتے تھے ان سے کام لے کر اعلیٰ تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار کیں۔

خواجگی و بندگی میں اختلاط مضر ہے

آریاؤں کو اس راستہ پر چلنا تھا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے بحیثیت فاتح کے اپنی نسلوں کو یہ سبق پڑھایا۔ اور پہلی راتوں میں ان کی جسمانی طاقت کو واضح راہوں پر ڈال کر انہیں اپنے رویے اور مقصد کی قبولیت پر مجبور کر دیا۔ آریاؤں نے مفتوحین کو اس زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا وہ اگرچہ سخت کش کی زندگی تھی لیکن ساتھ ہی ایک منظم زندگی بھی تھی۔ مفتوحین کی طاقتوں کو ایک طرح استعمال کر کے آریاؤں نے نہ صرف اس کو قتل کرنے سے اختراز کیا بلکہ ثابت مفتوحین کی یہ اطاعت کی زندگی ان کے "آزادی" کے زمانہ سے زیادہ آرام دہ بھی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ آریا پہلی برتری کی بڑی سنگ دلی سے قائم رکھتے تھے۔ لیکن وہ رے "غلامی" نہ تھے۔ ہر ملک کے تہذیب و تمدن کا قیام اور ارتقا،

بھی انہیں کے دم سے وابستہ تھا۔ دنیا میں تہذیب و تمدن کا وجود تو ہے ہی آریوں کی برکت سے باقی۔ لہٰذا آریا نسل کا تحفظ اور اعلیٰ تہذیب و تمدن کے تحفظ و بقا کے مترادف ہے۔ جوں ہی رہوار نے ترقی کر کے گھوڑوں کی دوسری کا درجہ حاصل کرنا شروع کیا۔ جس کا پہلا مرحلہ جانوروں کی رسن کا استعمال تھا اس کے بعد آتھ اور لگام میں اضافہ کے ہوتے ہتے گئے۔ آریوں نے اپنی نسل پاک۔ کھلے جس غلاظت کی۔ اور اس طرح وہ اس باغ جنت میں رہائش کے حق سے محروم ہو گئے۔ جسے انہوں نے خود تعمیر کیا تھا۔ آریا نسلی تحفظ اور آمیزش کا ارادہ کے راستہ رفتہ ان کی وہ تخلیقی صلاحیت ختم ہو گئی جس سے کائنات پر حاوی تھی۔ حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ اپنی اور خود اپنے علاقہ سے آریا پنے آباؤ اجداد کی نسبت مقامی باشندوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ جن کو انہوں نے کبھی فتح کیا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ تمدن کی باقی ماندہ روشنی کے سہارے گزارہ کرتے رہے لیکن اس کے جلد ہی بعد ان کی تہذیب مرجھا کر قصہ کہانی میں غرق ہو گئی۔

اس طرح تہذیبیں اور سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں اور ان کی جگہ نئی سلطنتیں اور تہذیبیں قائم ہو جاتی ہیں۔

قدیم تمدنوں کے زوال کی وجہ تو یہ خون کی آمیزش اور نسلی انحطاط ہے۔ قومیں کسی جنگ سے تباہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہمیشہ قوت مدافعت کو جھٹکے سے مٹ جاتی ہیں۔ اور قوت مدافعت انتظام نسلی خون کا کرشمہ ہے۔ اس دنیا میں ہر وہ شے جس میں ناک کی طرح حقیر ہے جس کے لب میں خلل ہے۔ دنیا کا ہر تازہ رنگی وعدہ جو ایسا ہو یا کہ ہمیشہ نسلی تحفظ کے جذبہ کا شکار رہے۔

ایثار کے بغیر اقتدار حاصل نہیں ہوتا

اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ آریاؤں کے غلبہ کی بنیادی وجہ کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آریاؤں کا غلبہ اتنا تو وہ طاقتی ہے کہ نسلی جذبہ کے باعث انہیں اتنا کہ اس جذبہ کے قصہ کے خاص اسلوب کے باعث ہیں۔ آریاؤں کا نسلی جذبہ تحفظ نسل ایک سمجھوتے

ہوتا ہے۔ تحفظ نفس کے جذبہ پر اگر تحفظ کرنے والے کے راہ پیغام سے
ٹکرا رہا ہو تو اپنے آپ کو بچانے کی خواہش ہر قسم کی مخلوق میں یکساں پائی جاتی
ہے۔ ہاں اس خواہش کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ادنیٰ ترین جاندار مخلوق میں تحفظ نفس
کے جذبہ کا مکمل روحانی بچاؤ کے لیے انفرادی جدوجہد سے آگے نہیں بڑھتا۔ زندگی کے
اس مرحلہ پر تولید و توالد کی بھی کوئی صورت نہیں ہوتی ہے کہ دوسرا جاندار بھی کچھ نہیں رہتا۔
مطلب یہ ہے کہ مستقبل کو حال پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ جانوری زندگی فقط اس کی پہلی
منزل ہے۔ وہ خوراک کی تلاش میں تبھی نکلتا ہے کہ جب اسے بھوک لگتی ہے۔ جانور کا
پیٹ محض اپنی ذات کے بچاؤ کے لیے ہے۔ جب تک تحفظ نفس کا جذبہ صرف ہی مطلب
سے ظاہر ہوتا ہے۔ تب تک تولید بندی کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ زندگی کی ولیں گروہ
بندی بھی خاندان بھی اس مرحلہ پر وجود میں نہیں آتا۔ جب زر مادہ کا رشتہ تاسل سے
بڑھ کر ازدواج کی شکل اختیار کرتا ہے تو تحفظ نفس کے جذبہ میں بھی وسعت پیدا ہو جاتی
ہے۔ زوجین جس طرح پہلے محض اپنے انفرادی بچاؤ کے لیے علیحدہ علیحدہ کوشش کرتے تھے
اب وہ ایک دوسرے کا بھی بچاؤ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی نر زر مادہ کے لیے خوراک بھی
مہیا کرتا ہے۔ والدین اکثر اولاد کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔ وہ سب ایک
دوسرے کی حفاظت پر آمادہ رہتے ہیں۔ یہ انسانی و مکمل اجتماعی شکل ہے کی ایک سادہ
سی مثال ہے جب یہ جذبہ مزید وسعت پا کر خاندان کی حدود سے باہر نکلتا ہے تو ان
رشتوں اور تعلقات کی بنا ہو جاتی ہے جن سے بالآخر ریاست اور سرکار وجود میں آتی
ہے۔

انسانیت کے ابتدائی ترین نمونے اس جذبہ کی نہایت ہی مختصر مقدار سے بہرہ ور ہوتے
ہیں۔ یہ وہ وقت ہے ان کی زندگی کے رشتے خاندان کے قیام سے آگے نہیں بڑھتے۔ جوں
جوں افراد کے فوری مفاد کو پس پشت ڈالنے پر آمادگی بڑھتی جاتی ہے۔ توں توں زیادہ
وسیع گروہ بندیاں وجود میں آتی رہتی ہیں۔

ے ذاتی مفاد کو ضرورت پڑنے پر اپنی جان کو بھی دوسروں کی خاطر قربان کر
نے کا جذبہ قربانی میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ قربانیوں کی عظمت اس
کی بھی متعدد پہلو نہیں ہے بلکہ اس کی جذبہ قربانی تمام قوموں اور قوم کی زندگی کے لیے
وقف کر دینے کا جذبہ ہے۔

ذاتی پیشہ ور قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں

حفظ نفس کا جذبہ قربانیوں کے ہاں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں پایا جاتا ہے۔ قربانی
اپنے نفس کو ہر صلاحیت قومی مفاد کے وقف کر دیتا ہے۔ ہر ضرورت پڑنے پر قوم
کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔

قربانیوں کی تعمیری صلاحیتوں کی بنیادیں اٹھانے کے لیے ان کی مخصوص
قابلیت محض ان کی ذہانت پر مبنی نہیں اگر قربانیوں کا خلوص محض ان کی ذہنی برتری کا
نتیجہ ہوتا تو قربانی صرف تخریب کر سکتے تعمیر کی قابلیت سے عاری ہوتے یہ ہو سکتا ہے
ممکن ہے جب ضرورت ذاتی مفاد ہو ذاتی رائے قربان کر کے جماعت کی خدمت پر آمادہ
ہوں۔ قربانی معاوضہ یا شہرت کے وسیلہ سے حاصل کرنے مثال کے طور پر جب
قربانی کام کرے تو ذاتی مفاد کی غرض سے کام نہ کرے بلکہ اپنے کام کو حق کسب کا ذریعہ
کسب کو کاندھا بنا لے۔ اس جذبہ کو لفظ "کسب" سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کسب کے یہ
معنی نہیں کہ کوئی شخص محض اپنی روزی کمانے میں مشغول ہے کسب سے مراد وہ تخلیقی عمل
ہے جو قومی مفاد سے متصادم نہیں۔ جب انسان کی ہمت صرف خود غرضی کی تسکین پر مائل
ہوتی ہے تو اس کا کسب رذیل ہوتا ہے اور اسے رذائل ذاتی کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

حقیقی انسانی تہذیب وقتوں کے لیے وہ طبعی میدان شرط اول ہے جو خود غرضی کو اپنی
پشت ڈال کر عشق کے کلاغ کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی جذبہ کی تکمیل انسان نے وہ عظیم
کارنامے کر دکھائے جن سے ان کا کارنامہ کرنے والوں کو شاید ہی کوئی فائدہ پہنچا ہو
لیکن آنے والی نسلیں ان سے برابر فیض یاب ہوتی رہیں۔ یہ صرف اسی کا کرشمہ

ہے کہ یہ انسان ہو جو ذاتی کے دولت داری سے ایک ایسی زندگی بسر کرتا چلا جاتا ہے جہاں اسے اپنی محنت کے ثمر یا دوسرے معاوضہ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ایسے ہی پیشہ وروں کی محنت سے قومی دولت کی بنیادیں قائم رہتی ہیں۔ ہر مزدور، ہر موچی، ہر بڑھئی، ہر کاریگر، کاریگر جو ایسے کام کرتے ہیں جن سے وہ اپنی خوشی سے محروم کر دیا جاتا ہے وہ اس اعلیٰ جذبہ کا کہ انسان نے پیدا کیا ہے سے خود پیدا کرنے کی بجائے اس کی اہمیت کا احساس تک بھی نہ ہو۔

اس قسم کے پیشہ وروں کے لیے تعلیم راہ نما ہو سکتی ہے۔ یہ وہ بنیادی ضرورت ہے جو پوری ہو سکتی ہیں جن کی تکمیل انسانی ترقی کے لیے ضروری ہے ایسے پیشوں کی جو تعریف کی جائے اس سے بھی زیادہ تعریف کا مستحق وہ پیشہ ہے۔ جو انسان اور انسانی تمدن کا باعث ہے۔ ایسے کے جذبہ کا بہترین اظہار یہ ہے کہ انسان اپنی جان بھی قوم کی خاطر قربان کر دے انسان اپنی محنت سے جو کچھ تعمیر کرتا ہے اس کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے۔ انسان بہادری کی روشنیوں اپنی محنت کے پھل کو محفوظ رکھنے کا اس سے بہتر راستہ اور کوئی نہیں۔ ہماری قومی زبان میں ایک لفظ ہے جو اس جذبہ کے بنیادی مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ وہ لفظ ہے "ایثار" اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی مفاد پر مشترک مفاد کو ترجیح دی جائے اپنے مفاد پر دوسروں کی ترجیح دینا جذبہ خود غرضی کا ضد ہے۔ ہم سے ہم اصول پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فرد اپنے جنس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ ہو۔

اصول پرستی کے بغیر ذہانت کبھی کامیاب نہیں

اس امر پر بہت زور دینا نہایت ضروری ہے کہ اصول پرستی کبھی جذبات پرستی سے قطعاً علیحدہ ہے۔ اصول پرستی کے بغیر تہذیب و تمدن ناممکن ہے جذبہ انسانیت کا لفظ اگر کچھ مفہوم رکھتا ہے تو اصول پرستی کے لفظی معنی دنیا میں بنی نوع آدم کا تصور ہے۔ ذہانت کو ذہن سے سہارے رہتی ہے۔ نہ صرف آدمیوں کا اثر ہے کہ تعمیر کی اصطلاحی قوتیں اعلیٰ

یہ لازم ہے کہ طرز معاشرت کی خاطر قربانی دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہیں اور ان باتوں کے مقابلہ میں جو طرز معاشرت سے بھی زیادہ اہم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ طرز معاشرت کے تقاضے پر کامیابی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

جب کبھی اصول پر قائم رہنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ جو قوم کے وجود اور اس کی بقا کے لیے لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حالت کے بغیر انسانی تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ جوں ہی کسی قوم میں خود غرضی کا جذبہ پھیل جاتا ہے وہیں معاشرت کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اور انسان اپنے ذاتی عیش کی تلاش میں جنت سے نکل کر دوزخ میں جا گرتا ہے۔

یہودی خود غرض اور حریص ہیں

آنے والی نسلیں ان لوگوں کو یاد رکھیں گی جو صرف ذاتی مفاد حاصل کرنے میں منہمک رہے۔ بلکہ آنے والی نسلیں ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں گی۔ جنہوں نے اپنے عیش قربان کر دیے۔

یہودی کی فطرت آرہاؤں کے بالکل الٹ ہے۔ تاریخ دنیا میں کسی دوسری قوم کا جذبہ خود غرضی اتنا پروش پاتا نظر نہیں آتا کہ جتنا کہ یہودی قوم کا۔ اس دعویٰ کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ یہ نسل آج بھی زندہ ہے۔ کیونکہ آج روئے زمین پر کوئی دوسری قوم بھی ایسی موجود ہے جس کے اندر گزشتہ دو ہزار سال میں اتنا اضافہ اور کروڑ کے لحاظ سے اس قدر کمی تبدیلی آئی ہو۔ جتنی کہ یہودیوں میں؟ اور باوجود اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے انقلابات میں یہودیوں نے دوسری تمام قوموں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ان بیسیوں نے ہی نوع انسان کو اپنے کردار میں سے بار بار گزرنے کے باوجود یہودی آج بھی وہی ہے جو ہمیشہ تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں اپنی نسل زندہ رکھنے کا کتنا بے پناہ عزم صمیم موجود ہے۔

یہودی کے قوانے والی ہزار سال کے تربیت یافتہ ہیں آج کل یہودی کی ہائی

خصوصیت سے کارفرما نظر آتی ہے۔ اور ایک خاص معنوں میں تو وہ ہمیشہ سے کارفرما رہی ہے۔ باوجود اس کے اس کی ذہنی حالتیں کسی مدوّنی ارتقا کا نتیجہ نہیں بلکہ ان تجربانی اسباق کا نتیجہ ہیں جو بیوقوفوں نے دوسروں سے سیکھے ہیں۔ انسانی روح تدریج قدم اٹھائے بلندیوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ہر دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے اس کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں پہلا قدم اٹھا کر پہنچے تھے۔ یہ پہلا قدم ہمیشہ ماضی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں ماضی کے لفظ کو اس وسیع معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کے لحاظ سے یہ پہلا قدم کسی ایک فرد کے اس کی موت نہیں ہے۔ بلکہ روایتوں کے عام تمدن کی سیج کا نام ہے۔ فکر انسانی کا بہت قلیل حصہ ذاتی تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ زیادہ تر انسانی غور و فکر کا انحصار زمانہ گزشتہ کے جمع کیے ہوئے تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی تمدن کا عام معیار ایک فرد کو بنا بنایا معلومات کے ایسے انبار مہیا کرتا ہے جن کے سہارے وہ انسانی ترقی کے آگے اور راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ گو فرد کو خود اکثر اس حقیقت کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آج کل کا ایک بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے وہاں اسے آلاتی معلومات کے وہ ذخیرے فراہم کر دیے جاتے ہیں جو گزشتہ صدی میں مہیا ہوتے ہیں۔ ان معلومات سے وقف ہو کر وہ بہت سے ایسے امور کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جو آج سے ایک سو برس پیشتر کے بڑے سے بڑے عالموں کے لیے بھی ناقابل رسائی تھے۔ ان امور کا علم آج کل کی مسلمہ حقیقتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے بے اندازہ اہم ہیں۔ جو ہماری گزشتہ ترقی کے راز اور رخ کو سمجھ کر آئندہ ترقی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر گزشتہ صدی کا کوئی لائق ترین آدمی آج اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر نکل آئے تو اس کے لیے ہمارے زمانہ کو سمجھنا آج کل کے کسی چودہ سالہ معمولی خواندہ نوجوان کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہوگا۔ ماضی کا یہ لائق انسان پہلے وہ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کا محتاج ہوگا جو آج کل ایک نوجوان عہد حاضر کے تمدن اور تہذیب میں پرورش پاتے ہوئے خود بخود سیکھ جاتا ہے۔

یہودی نے آج تک کبھی اپنی کوئی تہذیب یا تمدن قائم نہیں کیا۔ اس کی وجہ میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہودی ہمیشہ اپنے ذہن کو دوسروں کے فکر سے کرد و ادھار استعمال کرتا ہے۔ اس کی ذہانت ہمیشہ ان خالق کاموں کے سہارے بڑھنے کا آئی رہی ہے جو اس کو اپنے گرد و پیش میں دوسروں کی بدولت نظر آتے ہیں۔ تاریخ میں کبھی اس کے خلاف نہیں ہوا۔

یہ درست ہے کہ یہودیوں میں دماغی کمی کا تعلق اساساً دوسری قوموں کے مقابلہ میں کمزور نہیں رہا بلکہ بڑھ رہا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ذہنی قوتیں بھی کم از کم دوسری نسلوں کے مساوی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودی اس خصلت سے عاری ہیں جو ایک قوم کو مہذب بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یعنی ایثار کی خصلت۔ یہودی کا جذبہ دروں اس طاقت سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہودیوں میں اکثر کسی اتحاد کا خواب اساس پایا جاتا ہے۔ وہ بھی دراصل نہایت ادنیٰ درجہ کی خونی گروہ بندی سے بلند نہیں۔ یہ اسی قسم کی گروہ بندی ہے جو محض جانوروں میں پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ خونی گروہ بندی کا احساس جانوروں کو آپس میں اتنا گہرا رکھتا ہے جب تک کوئی مشترکہ دشمن سامنے نہ ہو اور اس خطرہ کا مقابلہ کرنے پر یہ جانور مجبور نہ ہوں یہ اس کو ایک دوسرے کی مدد کرنے میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہ دیتا ہو۔ بھیڑیوں کی وحشی جوڑی اپنے شکار پر اکٹھے ہو کر جھپٹتی ہے جب یہ بھیڑ بھر جائیں تو فوراً منتشر بھی ہو جاتی ہے۔ گھوڑوں کا بھی یہی حال ہے اگر انہیں کوئی خطرہ درپیش آ جائے تو مل کر مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن ادھر ادھر دوڑتے رہتے ہیں اور ادھر ان میں سے ہر ایک اپنی راہ لیتا ہے۔

یہودی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا جذبہ یہ ترکیب نہ ہونے کی ہے۔ یہ جذبہ اس وقت بھی بروئے کار آتا ہے جب بظاہر اس کے فرد کے لیے زندہ رہنا ناممکن ہو جائے۔ جوں ہی مشترکہ دشمن نے شکست کھائی اور ہر ایک یہودی کو جو اس وقت زندہ رہا تھا موقع ملا وہ بھاگ کر یا نکل آیا

تو اسی وقت یہ لکھ دے کا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے۔ اور یہ صورت پہلے بھی وقوع پذیر آتی ہے۔ یہودی کبھی باہم تعاون کرتے ہیں جب کسی مشترکہ دشمن سے ان کی جان خطرے میں ہو۔ یا جب کسی مشترکہ شکار کو پکڑ کر اس کی رقم بٹ رہی ہے۔ جہاں یہ دونوں محرکات موجود نہ ہوں۔ وہاں یہودی فی الفور دشمنانہ طور پر خونی کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ جو لوگ تھوڑی دیر پہلے یک جان ہو کر کھیل رہے تھے وہ کتوں کی طرح ایک دوسرے کے لئے بھونکنے لگتے ہیں۔

اگر دنیا میں صرف یہودیوں ہی کی نسل ہوتی تو یہ لوگ ہمیشہ گندگی اور کیچڑ میں لت پت رہتے۔ ایک یہودی دوسرے سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا۔ دوسرا پہلے کو قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح ایک مستقل اور قطعی انتشار ہمیشہ جاری رہتا اگر کسی مشترک دشمن کبھی کوئی دھمکی دے جاتی تو محض اس وجہ سے کہ جدا جدا رہنے کے باعث یہودی سخت پریشان ہیں اور اس لئے ان میں وہ دلیری کبھی نہیں جو لڑنے بھڑنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔

اس لئے کسی بیرونی خطرے سے تصادم کے موقعہ پر یہودی ایک دوسرے کی جو مدد کرتے ہیں اس کو اصول پر مبنی یا اتحاد کا نام دینا غلط ہوگا۔ وہ مدد دیتے وقت بھی دراصل ایک دوسرے سے نفع اٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

یہودی نقال ہیں

ایسے موقعہ پر یہودی دراصل اپنے اندرونی خود غرضی کے جذبہ کی تسکین کر رہا ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہودی سرکار کی کوئی ریاضی صدر نہیں۔ یہودی سرکار میں اہم نظم کا فقدان ہے۔ اس کا کام یہودی عمل کو محفوظ رکھنا ہے اور اسی طرز عمل کی تلقین کرتا ہے۔ کسی سرکار کی ریاضی صدر وہی وقت مقرر کی جا سکتی ہیں جب اس سرکار کو کام کرنے والی نسل میں کچھ اصول پرستی کا جذبہ موجود ہو۔ علاوہ ازیں ایک سرکار کو قائم کرنے والی نسلیں میں کچھ اصول پرستی کا جذبہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں ایک سرکار کے قیام کے لئے کسی اور

ہے۔ یہودی ذہنیت میں بھی دیگر کئی یہودیوں کی طرح تخلیق کار نے سے بہتر ہونے کی کوشش قابل قدر نہیں کی جاتی۔ اعلیٰ درجے کے ذہنیت تیار کرنے کے لیے جس کیلئے ہر وجدان کی ضرورت ہوتی ہے یہودی اس سے عاری ہیں۔ اس لیے ذہنیت کے میدان میں بھی یہودی کوئی اعلیٰ اور تخلیقی قابلیت کا پاپا نہیں رکھتا۔ بلکہ محض ایک نقال ہے جو اپنی چالاکیوں اور بھیس بدلنے کے باوجود یہ حقیقت چھپا نہیں سکتا کہ اس کے فن کا سرمایہ کوئی اپنا نہیں رکھتے۔ اس مرحلہ پر یہودی اشارے سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہاں اللہ یہاں اللہ کا شور مچا کر اپنی ہونی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا یہودی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور گلے لگا کر اس وقت تک رہنے جاتے ہیں جب تک ساری دنیا یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اس شخص کی اتنی تعریف ہو رہی ہے وہ ضرور کوئی بڑا فنکار ہوگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ سارے شور و غوغا کے پیچھے کوئی ہونی دبا کا ہاتھ چھپا ہوتا ہے۔

نہیں! یہودی اس تخلیقی قابلیت سے عاری ہیں جو کسی تمدن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں وہ حسن پرستی کا جذبہ نہیں ہے نہ کبھی ہوگا۔ جو انسانیت کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر لے جانے کے لیے درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی کی ذہانت ہمیشہ تخریبی ہوتی ہے۔ کبھی تعمیری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہودی کی ذہانت کے کرتب کبھی کبھار انسانی ذہن کو انگشت بدنداں کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس نکتہ کا سمجھ بھی انہیں معنوں میں یہودی کے سر پر رکھا جا سکتا ہے جن معنوں میں مشہور فرانسیسی شاعر گوئٹے نے وہ مصرع کہا تھا کہ سب کا مطلب ہے کہ

[illegible]

اگر انسانیت کو ترقی کرنی ہے تو یہ یہودیوں کے کارناموں کے طفیل نہیں بلکہ یہودی کارستانیوں سے بچ نکلنے کے طفیل ہے۔

یہودی خانہ بدوش نہیں بن بلائے مہمان ہیں

خانہ بدوش کبھی نہیں رہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک مستقل
آبادی میں قیام کرتے رہے۔ لیکن آرمینیا کسی زمانہ میں بھی یہودیوں سے خالی نہ تھا۔ یہودی
خانہ بدوش نہیں ہیں۔ کیونکہ خانہ بدوشی تو نسب کا ایک خاص تصور رکھتا ہے۔ اور جب
مطلوبہ ماحول پیدا ہو جائے تو اسی تصور کی تشکیل اس کا تحفظ کرتا ہے۔ خانہ
بدوش کے عام رویہ میں ایک خاص حد تک اصول پرستی پائی جاتی ہے۔ چاہے یہ اصول
پرستی بالکل ابتدائی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس وجہ سے خانہ بدوش کا کردار آریاؤں
کے لیے ہوا ہے اجنبی ہو لیکن نفرت انگیز نہیں ہوتا۔ لیکن یہودیوں کے کردار میں تو اصول
پرستی کا نام تک نہیں۔ یہودی کبھی خانہ بدوش نہ تھا۔ بلکہ ہمیشہ مخلوط معاشرت کو رہا ہے۔
وہ دوسروں کا خون پی پی کر موٹا ہوتا ہے۔ اگر یہودی جہاں پہلے آباد تھا وہاں سے کبھی
کسی انقلاب یا ہجرت کی وجہ سے نکل مکانی پر رضامند ہی سے ہوتی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ
وہاں کے باشندے مختلف قوموں کی میزبانی کا فائدہ اٹھانے والے اس مہمان سے تنگ
آکر اس کو اپنے علاقہ سے نکال دیتے رہے۔ یہودیوں کی فراش نسل بھی ہجرت نوری کا
ایک اور نمونہ ہے۔ کیونکہ یہودی ہمیشہ اپنی نسل کے لیے نئے دیار و اوطان کی تلاش کرنے
کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

ان باتوں سے یہودی کے خانہ بدوش ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ یہودی
جب ایک خطہ کی علاقہ میں آباد ہو جائے تو خود بھی اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ
یہاں جانے کیا کیا جتن کر بیٹھ جاتا ہے کہ اگر اس کے خلاف زبردست تشدد بھی استعمال کیا
جائے تو وہاں سے نہیں ہلتا۔ وہ نئے علاقوں میں بھی پہنچتا ہے جب وہاں اس کے لیے مقدمہ کے
پہلے سے بگڑے ہوئے حالات موجود ہوں۔ یہ عین خانہ بدوشوں کے عام حالات میں
وہ نئے علاقہ کے پرکشش ہونے کے باوجود اپنی سابق اقامت گاہ ترک نہیں کرتا۔ وہ
ضدا کیک مخلوط معاشرت کو رہے اور پھیلنے کی حالت پر قائم رہتا ہے۔ وہ ایک ایسا تکثیف دو
مرکز مادہ ہے جو وہی کیڑے مکوڑوں کی طرح زیادہ سے زیادہ رقبہ پر پھیلتا ہی چلا جاتا

ہے۔ جہاں اسے کوئی بھی جگہ نظر آتی ہے وہ اس کی طرف لپکتا ہے۔ اس کا خود کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے جو کسی مردار خور اس کی موجودگی کا ہو سکتا ہے۔ وہ جہاں اڑ جائے اسے مہمان نظر آنے والی قوم کا خون زدہ بدبودار پوس کرائے موت کے گڑھے میں گرتا ہے۔

یہودی ایک مذہبی فرقہ نہیں

اس طرح یہودی ہمیشہ سے ان ملکوں میں حکومت چلا رہا ہے جس کی بنیاد دوسری قسمیں رکھتی ہیں۔ پھر سلطنت کے اصلی کام کے لئے وہ اپنی سرکار کا ایک عہدہ کا نظام قائم کرتا ہے۔ یہودی سرکار کے منہ پر ہمیشہ "مذہبی فرقہ" کا نقاب پڑا رہتا ہے۔ یہ نقاب اس وقت اٹھایا جاتا ہے جب بیرونی حالات اس سرکار کی اصل حقیقت کے انکشاف کے لئے سازگار ہوں جس کی یہودی محسوس کرتا ہے کہ وہ اتنی مضبوط پختہ جگہ پر قائم ہو سکتا ہے تو وہ اپنے چہرہ سے پردہ ہٹا کر اپنی اس حقیقی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس میں اس سے پہلے کی لوگ اسے دیکھنے کا کبھی تصور نہ کر سکتے تھے یا یقین نہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی خون یہودیوں کا اصلی روپ ہے۔

دوسری قوموں اور سلطنتوں کی کمائی پر ایک مخصوص مدت تک دوسرے کی طرح پلنے کے بعد یہودی خود زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ شرف حاصل ہوتی ہے جس کی تربیت کرتے ہوئے مشہور جرمن فلسفی شوپن ہار نے یہودیوں کو "کذاب اعظم" کا خطاب دیا تھا۔ یہودی جس نوع کی زندگی بسر کرتا ہے اس کی وجہ سے باقاعدہ دوسرے کوئی پیشہ مجبور ہے ویسا ہی مجبور جیسا کہ جغرافی حالتوں کے باشندے گرم ہوا میں پہننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

دوسری قوموں اور سلطنتوں میں جب ہی زندگی بسر کر سکتا ہے جب انہیں یقین دلائے رکھے کہ یہودی کوئی جدا قوم نہیں۔ وہ تو صرف ایک ملحد مذہب کے ماننے والے ہیں اور اس وجہ سے صرف ایک جدا مذہبی فرقہ ہیں اگرچہ اس فرقہ میں بعض عجیب خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

در حقیقت یہودیوں کا یہ دعویٰ وہ پہلا جھوٹ ہے جس سے ان کی دروغ بافیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

وہ اپنا اصلی کردار اور طرز زندگی چھپانے کے لیے مجبور ہیں تاکہ دوسری قومیں ان کے اندر ایک گھلو مٹ جانے کی طرح رہنے سے منع نہ کر سکیں۔ جتنا کوئی یہودی فرد زیادہ ذہین ہوتا ہے وہ دوسروں کو دھوکہ دینے میں اتنی ہی مہارت سے کام لیتا ہے۔ یہودیوں کی اس پردہ پوشی میں اس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے ان کی میزبانی قبول کر رکھی ہوتی ہے وہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ یہودی بھی عام فرنسیسی انگریز جرمن یا اطالوی ہیں۔ لفظ ایک ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ان ممالک میں رائج ہے۔ جن ممالک کے ہاتھ میں سرکاری انتظامات ہوتے ہیں وہ تو شاید ہی اس علم تاریخ سے بہرہ ور ہوتے ہیں جس کے سامنے یہودی بالخصوص بڑی مہارت سے اپنے اس فریب کا قفل کھولتا ہے۔ سرکاری حکام بھی اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان کی نگاہیں اپنی عقل سے کام لینا ایک گناہ ہے کیونکہ سرکاری قوانین میں کہیں اس کی عبارت درج نہیں اور ملازمت میں ترقی ہر حال سرکاری قوانین کے مطابق نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ اس تعجب کی یہ وجہ ہے کہ مثال کے طور پر ہر یا کے سرکاری دفاتر میں آج بھی کسی کو شبہ تک نہیں کہ یہودی جانے اور ایک جدا قوم ہیں۔ اور محض کسی طرح سے تعلق نہیں رکھتے۔ اتہامات پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اگر کسی میں ذرا سی عقل بھی ہو تو اس اتہامات پر ایک نظر ڈالنے سے اس امر کی شہادت مل جاتی ہے۔ کہ یہودی دین کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے یہود کے نام سے جو اتہام لگتا ہے وہ ایک سرکاری اتہام نہیں اور اس لیے یہ ہر دو ممالک سرکار ہوا کسی دیگر سرکاری اتہام سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی غلطی کے مرتکب کس طرح ہو سکتے ہیں۔

یہودی یہودہ سے ایک جدا قوم اور ایک جدا امر ہے ہیں۔ وہ کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے کے باعث علیحدہ نہ تھے۔ بہت پہلے زمانے کا ذکر ہے کہ یہودیوں

نے دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کی خواہش سے مجبور ہو کر کسی ایسے ذریعہ کی تلاش شروع کی جس سے وہ اپنے آپ کو چھپا سکیں۔ اگر وہ اپنے آپ کو چھپانا سیکھ لیتے تو لوگ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ لوگوں کے متوجہ ہونے سے یہودیوں کو اپنے آرام میں خلل پڑنے کا خطرہ تھا۔ ان حالات میں اپنے آپ کو شک و شبہ سے بالاتر رکھنے کا اس سے زیادہ موثر حربہ کیا ہو سکتا تھا کہ مذہبی فرقہ کا لبادہ اختیار کر کے اس سے کام دیا جائے۔ یہ مذہبی فرقہ کا تصور بھی یہودیوں نے دوسروں سے مستعار لیا ہے یہودیوں کی تو گھٹی میں ہے۔ ہمارا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہودیوں کی ہر شے دوسروں کے گھروں کی چرائی ہوئی ہے۔ اب یہودی ہر قسم کی اصول پرستی سے عاری ہیں تو بھلا وہ محض اپنے ضمیر سے کوئی مذہب یا مذہبی فرقہ کس طرح پیدا کر سکتے تھے۔ کوئی ذہین سے ذہین آدمی اپنے مذہب کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو کسی عمل میں ہوتے ہوئے مرتے ہی بخشش نہ رکھتا ہو۔ کیا تورات میں ایسے کوئی قوانین درج نہیں ہیں جن کے ماتحت انسان دنیا میں آخرت کی زندگی کے لیے تیاری کر سکے۔ اس کتاب میں تو صرف دنیا کے اندر ایک مکمل و عاقل بردشت زندگی بسر کرنے کے قوانین درج ہیں۔

یہودیوں کا دین اخلاقی تعلیمات سے عاری ہے

یہودیوں کی مذہبی تعلیمات زیادہ تر یہودی خون کو پاک رکھنے کے بے جا ہدایات کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ باقی میں یہودیوں کو باقی دنیا کے وحشی تعلقات پر بحث ہے۔ گویا یہودیوں اور غیر یہودیوں کے وحشی رشتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ دین یہود کو اخلاقی مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں تو ساری توجہ اقتصادی مسائل پر مرکوز ہے۔ اقتصادی مباحث میں سے بھی زیادہ تر تجارت اور تبادلی مسائل پر ہی زور صرف کیا گیا ہے۔ یہودیوں نے اپنی مذہبی تعلیمات کو اخلاقی قدر و قیمت پر ہونے میں کبھی بھی اس سے صاف مطلب پیدا نہیں ہوتا۔ ان مذہبی تعلیمات کی حقیقی قدر و قیمت کے متعلق ہمیشہ سے ایک مسلسل تضحیک موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کا

مذہب "ربانوں کے بیان کا کامل نمونہ ہے۔ یہ وہی تربیت گاہ ہے جو موسیٰ نے تیار کرنی تھی۔ ان کی بہترین مثال خود یہودی ہیں۔ اس دنیا میں یہودی کی زندگی ہر یہودی کی ذہنیت جسمانیت سے آگے کی چیز ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ تقریباً اس کا کردار آج سے دو ہزار سال قبل خداوند یسوع کی نگاہ میں ایسا ہی تھا۔ قوم یہود کے متعلق خداوند یسوع کا جو خیال تھا وہ خداوند نے پوشیدہ نہیں رکھا۔ جب خداوند نے ضرورت محسوس کی تو اپنی قوم کے ان دشمنوں کو خداوند نے بیت اللہ سے نکال دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیشہ کی طرح تب بھی یہودی دین کو اپنی دوکانداری کی رونق بڑھانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے یہود کے خلاف جو دو بدو اختیار کیا تو اسی کی وجہ سے انہیں صلیب پر کھینچ دیا گیا۔ آج کل کے عیسائی جب پارٹی بازی کی سیاست میں داخل ہوتے ہیں۔ اور الیکشن کا زمانہ آتا ہے تو یہی عیسائی یہودیوں سے دو قدم آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہیں۔ یہ تمام نام نہاد عیسائی یہودی مہاجنوں کے ساتھ سازشوں میں شریک ہو کر خود اپنی عیسائی قوم کے مفاد کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

نئی زبان سیکھ کر نیا ذہن حاصل نہیں ہوتا

یہودیوں کے پہلے اور بنیادی جھوٹ کا مطلب ہی ہے کہ لوگوں کو یقین دلا دیا جائے کہ یہودی کوئی الگ قوم نہیں بلکہ فقط ایک مذہب کے پیرو ہیں۔ مگر اس جھوٹ کی بنیاد پر دوسرے جھوٹوں کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان دوسرے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ اس زبان سے متعلق ہے جسے یہودی استعمال کرتے ہیں۔ یہودی کے لیے زبان اظہار خیالات کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ خیالات کو پوشیدہ رکھنے کا وسیلہ ہے۔ یہودی منہ سے فرنچ بول رہا ہوتا ہے مگر اس کے خیالات جو ہوتے ہیں وہ جب وہ فرنچ زبان میں تقریر کر رہا ہوتا ہے وہ اپنے اس کردار کو بیان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

جب تک یہودی دوسری قوموں کو مغلوب نہیں کر لیتا تب تک وہ ان کی زبانیں بولتے ہیں

منتظر رہا ہے ان کی بھی ایک ہی گت بنتی رہی ہے۔ یہودیوں کی کارستانیوں کا مطالعہ تجزیہ کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کی حرکتوں کا اور بہتر مطالعہ کیا جائے اس مقصد کی تکمیل میں سہولت کی خاطر ہم ان مدارج کا تذکرہ وقوعہ بعد کی ترتیب سے کریں گے۔

جس علاقے کو الجزیرہ کہا جاتا تھا وہاں یہودی پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں حسب دستور سوداگروں کے بھیس میں آئے۔ جب جرمن قوم کی ہجرت تعلیم شروع ہوئی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نئے آبادی کے دور میں یہودی کہیں گم ہو گئے۔ اس بے خبر پر کھنے میں حق بجانب ہیں کہ مرکزی اور شمالی یورپ پر یہودیوں کے دوبارہ اور مستقل تسلط کا عمل اور وقت شروع ہوا جب جرمن اپنی اندرونی سیاسی تنظیمات قائم کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد وہ عمل شروع ہوا جو ہمیشہ جب دوہرایا جاتا ہے تو غیر ملکی اقوام سے یہودیوں کا رابطہ ہو جاتا ہے۔

(الف) جس جس قوموں نے پہلی مرتبہ مستقل طور پر یہودیوں کو اپنے ہاں آباد کیا تھا ان سب میں یہودی بھی بتدریج اور بتدریج طور پر آ جمعے۔ شروع شروع میں تو وہ سوداگروں کے بھیس میں آئے۔ اور انہوں نے اپنی قومیت پوشیدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بھی یہودی کھلے طور پر یہودی تھا۔ شاید کسی حد تک اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ تاجر سے مقامی لوگوں پر کوئی خطرہ متوقع نہ تھا۔ ممکن ہے کہ ایک سبب یہ بھی ہو کہ دوسری نسلوں کے لوگ یہودی کے ساتھ اشتراک رکھنے سے ڈر رہے ہوں۔ ان حالات میں یہودی ایک اجنبی سوداگر کے سوا اور کوئی بھیس کامیابی سے اختیار نہ کر سکتا تھا۔ ان قوموں کے ہاں یہودی تنظیم تھی ان کی ناقابل یقین مکاری اور یہودی کی عیاری و مکاری کے باعث یہودی کے لیے کھلے طور پر اپنے یہودی پن کو پوشیدہ رکھنا بہت مفید تھا۔ یہ ممکن ہے کہ یہودی کو اس حیثیت میں بہت زیادہ فائدہ رہا ہو کیونکہ اس زمانہ میں آبادیوں سے غیر ملکی کا سوگ نہ رکھا جاتا تھا۔

سود خوری اور دولت خوری یہودیوں کی ایجاد ہیں

(ب) آہستہ آہستہ لیکن پورے استقلال کے ساتھ یہودی نے گردوپیش کی اقتصادی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔ یہودی کوئی شے پیدا نہ کرتا تھا۔ بلکہ دلالی پر اکتفا کرتا تھا۔ ہزار ہا سال سے دلالی کے فرائض سرانجام دینے کے باعث یہودی کو تاجر یا بیوپاری کا پیشہ قدرتی طور پر حاصل ہو چکا تھا کہ آریہ تو اس میدان میں اس کا مقابلہ ہی نہ کر سکتے تھے۔ آریہ اس لحاظ سے بالکل سادہ لوح اور احمق ہیں۔ آریاؤں کی دولت داری کی کوئی حد ہی نہیں۔ غرض تھوڑے ہی عرصہ بعد ہی نظر آنے لگا کہ تجارت تو گویا یہودی کے لیے وقف ہے۔ یہودی سود پر قرضہ دینے لگا۔ سودی قرضہ دینا تو یہودی کی مستقل تجارت ہے۔ قرضہ کے روپیہ پر سود وصول کرنا یہودیوں ہی کی ایجاد ہے۔ اس بدعت سے جو خطرات پیدا ہو سکتے ہیں شروع شروع میں کسی نے اس کا احساس نہ کیا۔ بلکہ الٹا اس بدعت کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ کام قومی طور پر اس میں خود مختار آتا تھا۔

(ج) اب وہ مرحلہ آیا کہ یہودی ذات کر جم گیا۔ بعض شہروں اور قصبوں میں تو اس نے اپنے علیحدہ محلے آباد کر لیے۔ اور منڈی میں بھی اس کے لیے مخصوص حصے مقرر کیے گئے۔ اس طرح یہودی نے تدریج قومی بلکہ ملت کے اندر ایک دوسری سلطنت قائم کر لی۔ وہ تجارت کی تنظیم و اپنی ہی تصور کرنے لگا۔ اور نقد لین دین کے تمام معاملات اپنے مخصوص اختیارات کے ماتحت کرنے لگا۔ اس نے پوری سختی کے ساتھ عائد و نظام۔

(ح) اب وہ مرحلہ آیا کہ عیسائیت اور تجارت یہودی کی جاگیر بن چکے تھے۔ آخر کار یہودی کی شرح سود سے بیزاری کے باعث مخالفت شروع ہوئی۔ یہودی اب جس روز افزوں گستاخی اور بے باکی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے اس سے عام ناراضی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہودیوں کے خلاف حصول سے مخالفت کو مدد پہنچی۔ جب یہودی نے جائیداد غیر منقولہ کو بھی اپنی تجارتی اجناس میں شامل کر لیا تو زمیندار کی مخالفت سے بھی ایسی بہت کر لی کہ اسے منڈی کا پابند بنا دیا۔ تو اس وقت یہودی کے مظالم کا

جام لبریز ہو گیا۔ یہودی نے خود بھی کبھی اراضی کی کاشت نہ کی تھی۔ یہودی تو زرعی اراضی کو بھی ایک ہی شے سمجھتا تھا کہ جس سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جا سکے۔ یہودی کا اصول تھا کہ زمین کی ملکیت خود حاصل کرنے کے بجائے کاشتکاروں کو اس شرط پر حاصل رکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مالک کو اپنی خالصہ پیداوار خراج ادا کرتا رہے۔ یہودی کی ان حرکتوں سے اس کے خلاف عوام کی نفرت بڑھتی گئی۔ اور آخر کار کھلی دشمنی کی صورت اختیار کر گئی۔ یہودی کا ظلم اور استحصال بالکل ایسا ناقابل برداشت ہو چکا تھا کہ لوگوں نے اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کے خلاف جسمانی تشدد پر بھی اتر آئے۔ عوام نے سب سے زیادہ غور سے اس اجنبی کا معائنہ شروع کر دیا جس کی فطرت اور جبلی خصلتیں اور عادتیں اس پر کھلنے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہودی اور اس کے میزبانوں کے درمیان بیزاری کی ایک خلیج حائل ہو چکی تھی۔ جس کو پاٹ کر باہمی تعلقات کی بحالی ناممکن ہو گئی۔

بالعموم ہر ملک کے ہر دور میں یہودیوں کے خلاف ہمیشہ عوامی غصہ کی لہریں اٹھتی رہیں۔ جمہور خانوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر یہودی کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے تھے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں یہودی کو برباد کر دیتے تھے۔ جمہور کا خیال تھا کہ یہودی سے مقابلہ کر کے اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے ہے۔ صدیوں سے پلتے رہتے سہتے عوام یہود کے لیے ان کے تھے لیکن اب یہودی کے متعلق جو قلبیت حاصل تھی اس کی وجہ سے اب کبھی اس پر کوئی مصیبت آتی تو وہ یہود کے بجائے قوم کے لیے وبال تصور کرتے تھے جیسے کہ طاعون۔

(۲) اب یہودی پہلی حیثیت میں کھلنے لگا۔ وہ حکومت کی تنظیم کرتا تھا۔ کاری طبقوں کی خوشامد کرتا تھا اور اپنے روپے کے زور پر اپنا اثر و رسوخ مضبوطی سے بڑھاتے چلا جاتا تھا۔ ان حیلوں سے یہودی اپنے لئے بار بار فائدہ اٹھانے کا کوئی اختیار یا قاعدہ حاصل کر لینے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اگرچہ عوام مشتعل ہو کر اس کے خلاف

کے خلاف اٹھتے تھے اور اسے باہر نکال دیتے تھے لیکن ان کی رسوں کے بعد انہیں مقدمات پر پھر سوار ہو جاتا تھا اور پہلے کی طرح مزے سے اپنا کاروبار چلانا شروع کر دیتا تھا۔ اس کے خلاف کتنی ہی شکایتیں کیوں نہ کی جائیں وہ لوگوں سے جائیداد خالی کروانے کا پیشہ ترک کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اسے کتنا ہی تنگ کیوں نہ کیا جائے اسے کسی علاقہ سے مستقل طور پر نکالنا ناممکن تھا۔ وہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد پھر واپس آ جاتا تھا۔ اور ہر مرتبہ پھر وہی پرانی داستان دوہرائی جاتی تھی۔

رئیس اور نواب زادے بھی یہودیوں سے کم مجرم نہیں

یہودی کی موجودگی کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے کئی قانون بنائے گئے جن کے رو سے یہودی کو اراضی کا قبضہ لینے کی اجازت نہ تھی۔

(۰) جوں جوں بادشاہوں اور نوابوں کے اختیارات میں اضافہ ہوا توں توں یہودی بھی ان کے ساتھ پستا گیا۔ یہودی کبھی تو شاہی فرمان حاصل کرتا تھا اور کبھی عرضداشت طلب کرتا تھا۔ بادشاہ اور نواب یہودی مہاجنوں میں پھنسے رہتے تھے اور اس وجہ سے جب انہیں معاوضہ میں کافی رقم مل جاتی تھی تو یہودی کی یہ ساری زیادتیاں بادشاہ درگزر کر لیتے تھے۔ یہودی کو کتنی گراں ہی قیمت ادا کرنے پر مجبور کیوں نہ کیا جائے وہ بھاری رسوں میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود وہ حاصل کر لیتا ہوتا تھا یہ صرف اصل وصول کر لیتا تھا بلکہ سود در سود بھی نہ چھوڑتا تھا۔ یہودی وہ شخص ہے جو اپنے بدقسمت شکار کے جسم سے جب ایک مرتبہ چمٹ جائے تو پھر اس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہت وقت ایسا بھی ہوا کہ جب ان رئیسوں کو بعد میں پھر ضرورت نے مجبور کیا تو انہوں نے اس طرح پی پی کر موٹی ہوئی جونک کی رگوں سے سب ضرورت کے موافق خون حاصل کیا۔

یہ کھیل اتفاقی طور پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ تمام بادشاہ اور نوابوں نے اس گندے کھیل میں حصہ بٹایا ہے اور یہ کھیل اتنا ہی قابل نفرت ہے جتنا کہ اس سلسلہ میں

یہودیوں کا کردار ۔ یہ لوگ بھی قوم کے حق میں ایک لعنت سے کم نہ تھے۔ ہمارے زمانہ کی حکومت کے بعض وزراء بھی ان ہی خوبیوں کے بھوکے ہیں

ان خوبیوں کی بدولت جرمن قوم نے آپ کو فطرتاً یہود سے آزاد پایا۔ کسی بدفطرتی سے بعد میں بھی اس صورت حال میں کوئی فرق نہ آیا۔ البتہ کارل خوبیوں کا وہی نظام ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ کارل کی تو یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنی قوم کے خلاف جس جرم کا ارتکاب کیا تھا اس کی وجہ سے وہ اس سے ہزار گنا زیادہ سزا کے مستوجب تھے۔ انہوں نے ہٹلر سے اتحاد کر کھا تھا اور آخر کار انہوں نے اپنے آپ کو ہٹلر ہی کے ہاتھوں میں ہلاک ہوتا پایا۔

(۲) خوبیوں نے اپنے آپ کو یہودیوں کے خیال میں شریک بنا کر خود ہی اپنے زوال کا اہتمام کیا۔ انہیں اپنی قوم میں جو حیثیت حاصل تھی آہستہ آہستہ وہ کھو گیا۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ یہودیت کے مفادی خیالات سے متاثر ہو رہے تھے۔ یہودی بڑے اطمینان سے بیٹھا ان خوبیوں کے زوال کے وقت کا حساب لگاتا رہا۔ جہاں تک اس کا بس چلتا تھا اس نے ان کے زوال کو قریب تر لانے کی کوشش کی۔ اس نے ان خوبیوں کو روپیہ کے ذریعہ سے بار بار کر ان کی ہر ممکن امداد کی۔ اس نے انتہائی فراخدلانہ خوشامد سے ان کو یہ باور کرایا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ذہین اور دانش کے مظاہرے کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وجہ سے کہ خوبیوں کی بجائے خوبیوں کے لیے یہودی مدد کے بغیر کام چلانا مشکل ہو گیا۔ روپے کے معاملہ میں یہودی کا ذہن اتنا تیز تھا کہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ روپے کے معاملہ میں یہودی اتنا ہی معصوم تھا کہ وہ ہمیشہ ان خوبیوں سے آمدنی کے لیے ذرائع کے استعمال کی عبارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا رہا۔ یہودی ان ذرائع سے روپیہ وصول کرتا تھا اور جس قدر بعد ممکن ہو اب صاحب سے ذریعہ کرواتا تھا۔ ہر دور میں ایک عدد یہودی "دور بری فیم ری" کے بھیس میں موجود تھا۔ یہ فیم ری بھی کسی حالت سے کم نہ تھے۔ وہ اپنے بے کناہ تعلق کو

ں طرح ستاتے تھے کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جیل کے وہ سارے عملہ کے کالے گورے بھی مسلم جی جی کے بہروپ تھا جن پر ان نوجوانوں کی ساری رقمیں کھل جاتی تھیں۔ ان حالات میں کیا عجب ہے کہ مسلم جی کو مسلم انسانی کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ تمام سرکاری عہدار ان پر بھاور کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں عام دنیاوی معاملوں میں بھی جھگڑے کی صورت دے دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ صرف رئیسوں کا معاشرتی منصب مستحکم نہیں سمجھا جانے لگا بلکہ مذہب سے بھی اس کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔

قدرتی بات تھی کہ یہودی نے جب یہ حیثیت حاصل کر لی تھی تو اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اپنی ترقی کی طرف لے گا۔

آخر کار ایک دن وہ بھی آیا جب یہودی نے بیشمار فوائد حاصل کر لیا۔ اس طرح اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو اس قوم کے نوجوانوں کا حصہ تھیں بننے والے ہیں اس نے کمر باندھ رکھی تھی۔ یہودی دیکھ رہا تھا کہ اس کا پودا ایک نہایت کامیاب درخت بن رہا ہے یہودی اکثر یہ سوچا کرتا تھا۔ یہودی کی اس تجارت کو دیکھ کر کسی سیانے نے کہا تھا کہ یہ مکڑی کا جالا ہے جس میں ایک دن شیر پھنس جائے گا اور یہودی کی بھوک مٹ جائے گی۔ یہودی نے ایک بار مذہب حاصل کر لیا دوسری طرف یہودی بھی بھوکا نہ تھا کہ اس کا کرشمہ کامیاب ہو گیا۔

زبان بدلنے سے شجرہ نسب تو نہیں بدل جاتا

اس مرحلہ پر عالم یہود میں ایک بڑا انقلاب آنا شروع ہوا۔ آج تک وہ یہودی تھے جبکہ اس وقت تک یہودی کے سوا کچھ اور بننے میں یہودی کوئی خاص فائدہ محسوس نہ کرتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ جن خصوصیات کے باعث وہ دوسری قوموں سے ممیز تھے انہیں چھپانا آسان نہ تھا۔ اسی کمی کی وجہ ہے کہ فریڈرک اعظم کے زمانہ تک یہودیوں کو ایک الگ قوم سمجھا جاتا تھا۔ جب جرمنیوں اور یہودیوں کے درمیان نکاح کی قانونی ممانعت ہٹا دی گئی تو مشہور مؤرخ ٹریٹ کو کے نے اس کے خلاف احتجاج کیا

تھا۔ یعنی گوئے کوئی روحانی پیشوا اس وقت نہیں تھا۔ گوئے کی زبان تو عقل اور عقل کے تقاضا اس کی ترجمانی کر رہی تھی۔ درباری حلقوں میں جو شرمناک واقعات پیش آتے رہتے تھے ان کے باوجود قوم کو ایک بھی احساس تھا کہ یہودی قوم کے جسم میں باہر سے داخل ہونے والا ایک خارجی جزو ہے۔ یہودی کے متعلق قوم کا رویہ قوم کے اسی احساس کا نتیجہ تھا۔

قسمت میں یہ تھا کہ اب تبدیلی آئے گی۔ ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ مہمانی کا لطف اٹھاتے ہوئے یہودی اب اپنے میزبانوں کی زبان میں کچھ کچھ بولنے لگا تھا کہ اسے خیال پیدا ہوا کہ اب اپنے یہودی ہونے کی نسبت عیسائی ہونے پر زور دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ گو شروع شروع میں یہودی کے اس حرکت مستعمل خیز سے وقتی تسکین ضرور ہوئی ہوگی لیکن یہودی یہ نہ جانتا تھا کہ اس نے بلا تکلف اپنی شخصیت کا عمل عیسائی نفس میں جا ملایا۔ یہودی عیسائی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں عیسائی ہوں۔ اس طرح ایک ایسی جعلی سازی کی صورت بھی گئی جس کے بارے میں کسی مثال کا پتہ چلانے میں نہ ملے گی۔ یہودی میں ڈرامہ کے کردار کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے صرف جس زبان کو تو زمرہ کر لیا تھا وہ یہودی سب جس زبان استعمال کرتا تھا تو اس سے مختلف تھی۔ زبان کے سوا جرمنوں کی اور کسی خصلت کا تو یہودی پر سایہ تک نہ پڑا تھا۔ جس جرمن زبان کی عبارت ہی تھی اس کی بنا پر یہودی جرمن ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ لیکن ایک قومیت کے ارکین صرف زبان ہی کے بل بوتے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے تعاون کا سارا نظام کے رشتہ پر ہوتی ہے۔ کوئی ہو، کچھ ہو، یہ کچھ لیکن یہودی اس حقیقت سے خوب واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہودی اپنی ہوں کو بچانے سے کبھی باز نہیں آتا ہے وہاں وہ اپنے خون کو دوسری نسل کے ساتھ ملا ملا ہونے سے بچانے کے لیے بڑی پوری کاوش کرتا ہے۔

کبھی انسان کو کسی دوسری زبان سیکھنے میں بھی اتنی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن کسی

زبان سیکھ کر بھی وہ فقط اپنے ہی خیالات کی اس کی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی زبان سیکھ کر انسان کی فطرت نہیں بدل جایا کرتی۔ اس کا بہترین ثبوت بھی خود یہودی کی ذات شریف ہے۔ یہودی چاہے ہزار روپ بھی بھر لے لیکن اس کی یہودانہ فطرت ہمیشہ بجنس باقی ہے۔ یہودی کی نمایاں خصوصیتیں جو کچھ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس وقت تھیں جب وہ دنیا کے بازاروں میں عبرانی زبان میں گفتگو کرتے کچھ مفروضات کیا کرتا تھا۔ ان میں اب بھی شوشہ برابر فرق نہیں آیا بلکہ وہ جرمن زبان کی مالک تو بن بیٹھی ہے کی فکر کرتا ہے۔ وہ شوروی یہودی ہے کہ یہ بس کا کوئی اثر یہ جرمنی کی موجودہ حکومت کے کسی محکمہ کا ایک معمولی پیدا کر اس کی تھی حقیقت کو نہیں کر سکتا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ایک بھی سر ہے۔ جرمنی کی موجودہ حکومت کے سرکاری ملازمین میں سے اس طرح دو بھی کا مقابلہ ہے اور ہر قسم کے نیلی اس سے ماری ہے وہ یا قوم کا اور کوئی طبقہ عاری نہیں۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا ثبوت فراہم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

یہودی ایک وقت شاہ کا مصاحب بھی تھا اور مزدور کا بھی رہنما بھی

جس مرحلہ کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں اس مرحلہ پر اگر یہودی نے اپنا یک پہ فیصلہ کر لیا کہ اسے ایک جرمن کی جون بدل لینی چاہیے تو اس کی وجہ تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ یہودی نے محسوس کر لیا ہے کہ قوموں کی طاقت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ اس پر اس نے اور گرد بھانپنا شروع کیا۔ کہ قوم کے معاشرتی نظام میں کوئی ایسا دھرا ہے جو زور دکھانے کی بجائے جہاں وہ آزادی سے پنپ رہا ہے کے مزید پر یں قوم کی اقتصادی زندگی کے ہر یہودی کا فی الفور اب معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت تک جب اس کی سابق تعلیم شان تو حیات کو قائم رکھا جا سکتا ہے اور ہی ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک اسے شریعت کے کامل حقوق مل جائیں۔ یہودی پہلی تو حیات کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اور ان میں مزید توسیع کا بھی خواہاں مند تھا۔

تھی۔

یہودی کی خیرات میں بھی کرامات چھپی ہوتی ہیں

لیکن دراصل میں یہودی قوم کے عوام کے خلاف اس تمام کا مرحلہ ہو چکا تھا اب اس نے کھلے بندوں اس کا کاروبار کرنا شروع کیا۔ اس نے اپنی جوں ہو لے کی کارروائی کا آغاز یوں کیا کہ پہلے "محسن انسانیت" کا بھیس بدلا چونکہ ہمدردی کی یہ روش اختیار کرنے سے اس کے دل میں یہ واضح منصوبہ تھا اس لیے وہ انہیں کی اس ہدایت پر عمل کرنے سے معذور تھا کہ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کی خیرات کا علم نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے عوام کی مصیبتوں کا غم کھائے جا رہا ہے۔ وہ مخلوق کی مدد کرنے کے لیے کتنی ذاتی قربانیاں کرنے پر آمادہ ہے اس نے اپنی خوبیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا کہ ہر اندھا دنیا کو بھی اس پر یقین ہو گیا کہ مسیحا کی یہ شان تو گویا یہودی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اگرچہ لوگ یہودی کی اس کایا پلٹ پر اعتبار کرنے سے انکار کرتے تھے تاہم اس کی بابت عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اس طرح تھوڑا عرصہ بعد یہودی نے یہ پایا کہ خود مظلوم کا روپ دھار لینا اور یہ کہنا شروع کیا کہ یہودیوں پر تو ہمیشہ سے ظلم ہوتا آیا ہے ایسے شخص کی بھی کمی نہیں جو بدقسمت نے چاہے اور غریب یہودی پر بھی ترس کھانے لگے۔

یہاں ایک حقیقت قابل ذکر ہے وہ یہ کہ یہودی ذاتی قربانیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود بھی کوئی مالی نقصان نہیں ہونے دیتا۔ اسے کوئی نہ کوئی راہ مل ہی جاتی ہے کہ اس کا رفاہی خرچ کی مد میں بڑی حد تک پورا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات تو وہ اس کا دوہرا فائدہ اٹھاتا ہے جس میں اس کمائی کی جو صرف اس نے کیسے میں ڈالی جاتی کہ اسے زائد فاضل تصور کرتے ہوئے واپس کھینچنے کی عادت ہوتی ہے۔ بلکہ اس لیے ڈالی جاتی ہے کہ اس سے پیداوار میں معمولی سی اضافہ کی توقع ہوتی ہے۔ بہر حال بالآخر عرصہ بعد دنیا کو یہ یقین دلانے

میں بڑی کامیابی حاصل ہوگی کہ یہودی تو بڑا محسن اور بھروسے کا ہے۔ اللہ اللہ یہ کتنا بڑا دھوکا تھا۔

وہی حالات کہ جو دوسرے لوگ انجام دیں تو ایک فطری عمل متصور ہوتی ہیں جب کسی یہودی سے سرزد ہوں تو فوراً جاسوسی ہو جاتی تھی۔ یہ وجوہات ان حالات کو محض اس لیے سر انجام دیتا تھا کہ ایک یہودی سے تو اس کی توقع ہی نہیں ہوتی تھی کہ عام انسانوں کی نسبت یہودی کی ہمدردی زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی تھی۔

یہودی نے "ملکیت" اور "ملازمت" کا مفہوم مسخ کر دیا ہے

بہر حال یہ کیس پڑھنے ہو گیا۔ ملکیت یہودی ترقی پسندگی بن جائے۔ اس نے پرچار شروع کر دیا کہ رنگا نسل انسانی کی بہبود اختیار کرنی چاہیے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک جہاں تو کی تقسیم کا علم بردار بن بیٹھا۔

اسی دوران میں اس اقتصادی نظام سے قوم کے عملی مطالبات سے زیادہ بہتر ہیں یہودی نے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہودی نے مختلف قومی کاروباروں میں حصے لینے شروع کیے۔ اس طرح یہودی کو قومی دولت پیدا کرنے والے حلقوں میں رسوخ حاصل ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے قومی پیداوار کی ہر شاخ میں حصہ داری کے اصول پر بھی شروع کی۔ فطرتی قوم جو اپنی محنت کرتی تھی وہ یہودی کے پیسے قومی داری کے رائج سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ یوں یہودی نے وہ یہودی کھوکھلی کر دی جس پر قومی ملکیت کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ یہودی ہی کی برکت ہے کہ مزدور سوشلزم میں دلچسپی لینی شروع ہو گئی جس نے بعد میں طبقاتی کشمکش کی سی صورت حال اختیار کر لی۔

انجام کار سرمایہ کی منڈیوں پر تسلط ہونے کے باعث یہودی تمام اقتصادی کاروبار میں روز افزوں نفوذ حاصل کرتا چلا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی یہودی قومی عملی قوتوں پر مالکانہ حقوق حاصل نہ کر سکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ قوم کی قوت کار پر بہت کافی حاصل کر

دیا تھا۔

"رواداری" اور "رائے عامہ" چال بازی کے حربے ہیں

پی سوی دیشیت مزید مستحکم کرنے کی خاطر یہودی اصل و فرضی اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہوا۔ کیونکہ یہ اقتدار ہر پہلو سے اس کی ترقی میں حائل تھا۔ اس مقصد کے لیے یہودی نے اپنی مخصوص کاہنانہ قدیمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذہبی رواداری کا نعرہ لگا کر شروع کیا۔ اس مرحلہ پر فری میسن کی تنظیم کامل طور پر یہودی کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ مذہبی رواداری کے بہانے اصل و فرضی اقتدار کو ختم کرنے میں یہ تنظیم یہودی کی مقصد برآری کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہوئی۔ کھاتے پیتے لوگ ریاست و تجارت کے اعلیٰ حلقے اور دیگر اہل فری میسن کے جال میں پھنس کر بے اختیار یہودی کا شکار ہو گئے۔ اس خود فریبی کا بھی نہ ہو سکا جو کیا رہا ہے۔

صرف قوم کے عوام ہی نہیں بلکہ اپنی قوت کا احساس کر رہا تھا۔ انہوں نے حال ہی میں اپنے اختیارات و حقوق کے تحفظ کے لیے لڑنا شروع کیا تھا۔ تاحال یہود کے پاؤں میں زنجیر ہونے سے بچے ہوئے تھے۔ کم از کم یہودی کا روحانی زمانہ حال نہ عوام کی دسترس سے محفوظ تھا اور نہ ان پر پوری طرح حاوی تھا۔ یہودی اس صورت حال سے مطمئن نہ تھا۔ یہودی کی حکمت عملی کو منظم طریقے پر چلانے کے لیے سب سے ضروری مسئلہ یہ تھا کہ عوام پر قابو پایا جائے۔ یہودی کو الہامی علم تھا کہ سلطانی جمہور کے منصب پر فائز ہونے سے قبل وہ کچھ منصب حاصل کر لے ہوں گے۔ پہلے اس کا امکان تھا کہ کھاتے پیتے لوگ وسیع تعداد میں اس کے مرید بن گئے تو انہیں میں سے منصب بھی حاصل کر لیں گے۔ لیکن فری میسن کی تنظیم کے ذریعہ یہودی نے جو خفیہ جال بچھایا تھا اس میں ہوا ہے اور پھر تک نہ پہنچ سکے۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان لوگوں کے لیے کوئی زیادہ موثر اور سخت قسم کے ذرائع اختیار کیے جائیں اس کام کے لیے فری میسن کے علاوہ اور کسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہودی نے فیصلہ کیا کہ اس نئے تنظیم کی

ضرورت اشارات سے پوری کرنی چاہیے۔ غرض یہودی نے اپنی ثاقب قدری اور ہوشیاری سے کام لے کر صحافت پر قبضہ جمایا۔ رفتہ رفتہ اشتہارات کے ذریعہ یہودی کی زندگی کے ہر پہلو پر مستولی ہو گیا۔ یہودی نے حصول مقصد کے لیے جو راہ منتخب کی تھی اس پر سفر طے کرنے کی خاطر اس نے تاریخ صحافت سے کام لینا شروع کیا۔ اب یہودی وہ صحافت مسلط کر سکتا تھا جس آج کل رائے عامہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن آج سے چند قرن پہلے اس کا پتہ نہ تھا اس کا نام و نشان تک معلوم نہ تھا۔

ادھر یہ کارروائی جاری تھی۔ ادھر یہودی نے اپنے آپ کو متمدنی علم ظاہر کرنا شروع کیا۔ یہودی ہر پہلو سے "ترقی" کی تحریکوں کے پیش رو رہے گا۔ وہ ترقی کے ان پہلوؤں کا خصوص پر چار کرتا تھا۔ جس سے اس کے دوسروں کی تباہی ہوتی تھی۔ یہودی ہر ترقی اور نشوونما کا جائزہ اس معیار سے لیتا ہے کہ اس سے اس کی قوم کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جب اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ علم کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ہر اس تہذیب کا دشمن ہے جو اپنا ہے تعلقی تہذیب ہو۔ لیکن جس میں اس کے نفع کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو وہ دوسروں کے مدرسوں سے جو علم حاصل کرتا ہے سے صرف اپنی نسل کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

یہودی نسلی جمعیت کا دشمن ہے

اب یہودی پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو کر اپنی یہودی قوم کے تحفظ میں مصروف تھا۔ گرچہ بظاہر وہ "عرفان" "ترقی" "حریت" اور "انسانیت" کا نعرہ برابر بلند کرتا رہتا تھا لیکن درحقیقت اب بھی اگلی ہوئیں کو نہیں اپنی قوم کی نسلی سعادت کو برقرار رکھنے پر مرکوز تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسری جماعت کو چھانسنے کے لیے اس کی خدمت میں کوئی یہودی عورت اور تحفہ پیش کرتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہودی مردوں کا عمل شخص ہمیشہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک رکھا جاتا تھا۔ یہودی دوسروں کے خون سے تو آمیزش کرتا تھا لیکن اپنا خون ملاوٹ سے محفوظ رکھتا تھا۔ یہودی کبھی کسی غیر مالی

ذکی سے شادی نہیں کرے گا۔ لیکن جب یہودی لڑکیوں کو بیوی بنانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جو وہ قابل عمل پیدا ہوتی ہے وہ ہمیشہ یہودیوں کی طرف داری کرتی ہے۔ اس عمل سے ملنے والے روسی کی ایک خاص تعداد تو بالکل ہی اخلاق باختہ ہو گئی۔ یہودی اس حقیقت سے خوب واقف تھا۔ کہ وہ اپنی حریف نسل کی فکری قوتوں کو مفلوج کرنے کے لیے یہ طریقہ استعمال کرتا تھا۔ اپنی جیلوں پر پہرہ دار مقرر کر کے اپنے شکار کو اخلاق باختہ بنانے کے بعد یہودی اس ورثے سے قطع نظر کر لیتا ہے "دم کا مرد ہو جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ دنیا میں ایسے سادہ لوح بھی موجود ہیں جو یہودی بچے یہودی کے ہاتھوں پر بخوشی لے آتے ہیں۔

چونکہ یہودی کی فطرت میں مذہبی حیثیت کی ایسی چیز ہوتی ہے کہ اگر عوام کو اس کے نزدیک دیکھا جائے تو ہمیشہ ہی پھر بھی اس کے جال میں پھنسنے پر آمادہ ہوں اس لیے یہودی اس عبارت کو استعمال میں لاتے ہوئے جمہور کے سامنے اپنی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو حقیقت حال سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن اس کی مطلب برآری کے لیے بہت موثر ہے۔ مذہبی عبارات کے ذریعہ بالخصوص اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ دوسری نسلوں کی طرح اس میں بھی محض انوکھی عادتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہودی ایک بے ضرر نسل ہیں۔ چاہے ان کے اخلاق و عادات کچھ کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی مذہبی عبارات کہتے ہیں کہ یہودی دل کا بہت ہی طبیعت کا معزز ہے۔ یوں بھی عام طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ یہودی کو بے حقیقت ثابت کر کے اس کے خلاف کیے ہوئے کو پوشیدہ رکھا جائے۔

یہودی کی نشوونما کے اس دور میں اس کا بڑا مقصد یہ تھا کہ جمہوریت کو فتح حاصل ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ پارلیمنٹری نظام حکومت کی خوبیاں مسلم ہو جائے۔ یہودی کے ذہن میں جمہوریت کا جو تصور ہے وہ پارلیمنٹری نظام حکومت کے سوا اور کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ پارلیمنٹری نظام حکومت یہودی کے ارادوں کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ

ن نظام حکومت میں شخصیت کا عنصر تو خارج ہو جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ صلاحیت اور کارکردگی کی اہلیت اور قریب کاری کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ موروثیت کے خاتمہ کے ساتھ کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔ ملوکیت نے تو بہر حال دیرپا رہنا ہی تھا۔

ملازمین کو پنشن دینے کا رواج کیسے چلا تھا؟

(ی) ایک وہ زمانہ تھا جب اقتصادی ترقی نے قوم کے معاشی کام کی کایا پلٹ دی۔ دستکاروں کا قبیل حرفہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا اور اس کی جگہ کارخانوں کے مزدوروں نے لے لی۔ کارخانوں کے ان مزدوروں کو پنشن کا اجرا نہ ہونے کی وجہ قائم کرنے کی کوئی صورت نہ بنتا تھا۔ وہ تو روز روز کمپنیوں کی ایک فوج کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کارخانے کے مزدور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے روزگار کی کوئی ایسی مستقل سبیل نہیں ڈھونڈ سکتا جو بڑھاپے میں اس کی ایک لاٹھی بن سکے۔ وہ بیچ کی قوم کا باقی شدہ فرد ہوتا ہے۔ اس کا بڑھاپا اس کے بچپن سے کم نہیں۔ اس کی پچھلی عمر کی زندگی کو تو زندگی کہنا بھی درست نہ ہوگا۔

پرانے زمانہ میں بھی ایک مرتبہ ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس کا حل تلاش کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اور آخر کار ایک حل ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ وہ قحبہ پیشہ تھا کہ کارخانوں اور دستکاروں کے پہلو بہ پہلو بتدریج مصنوعات اور ملازمت پیشہ لوگوں کا ایک طبقہ بھی وجود میں آ گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر مختلف محکموں کے سرکاری ملازمین شامل تھے۔ یہ طبقہ بھی بیسویں صدی میں قوم کا باقی شدہ فرد کہلانے کا مستحق تھا۔ اس موقعہ پر سرکار نے اس ناگوار صورت حال کا یہ حل تلاش کیا کہ جس سرکاری ملازم کی ریٹائرمنٹ ہو جائے کہ بڑھاپے میں اس کے معاش کا اب کوئی سہارا باقی نہیں رہا تو اس کی خدمات کے مرکش خود سرکار انجام دیا کرے گی۔ اس طرح پنشن اور ریٹائر ہونے کے بعد وظیفے کا دستور قائم ہو گیا۔ انفرادی کاروبار میں بھی روزگروں

ہو سکتی تھی کہ جنگی اب عہد حاضر کے طریقوں سے ممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم نظام کے ماتحت چودہ یا پندرہ گھنٹے جو مہینہ کی خدمت گزاری ناقابل برداشت نہ تھی۔ لیکن حالات موجودہ تا عرصہ کام کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا۔ کیونکہ اب تو ایک ایک گھر میں پوری محنت سے محنت کرنی پڑتی تھی۔ پرانے وقتوں کا یوں جو یہ حالات پر اطلاق دو طالب سے مبلغ کا بات ہوا۔ ایک تو اس طرح مزدوروں کی محنت بچ جاوے گی۔ دوسرے اس وجہ سے مزدوروں کو یہ اعتبار رہا کہ ملک میں کفایت کے کسی قانون کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ مزدوروں کو تو تھوڑی مزدوری ملتی تھی اور آقا کو پہلے سے بہت زیادہ نفع ہو رہا تھا اس وجہ سے طرفین کے بود و باش اور طرز زندگی میں بھی زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔

دیہات کی کھلی فضا میں بھی کوئی معاشرتی مساوات نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تو زمیندار اور مزارع دونوں مل جل کر ہمیشہ محنت کرتے تھے۔ دونوں ہی ہل چلاتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات ایک ہی دسترخوان پر بھی اکٹھے بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن جو یہ نظام کے ماتحت زندگی کے معاشرتی پہلو کے لحاظ سے بھی مزدور اور کارخانہ دار کے حالات میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا تھا۔

ہاتھ سے محنت کرنے میں کوئی عار نہیں

آج کل ہر جگہ نظر آتا ہے کہ خود بندہ کی یہ واہی تفریق ابھی زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت نہیں کر پائی۔ خود بندہ کی یہ تمیز دراصل یہودی خصوصیت ہے۔ ہماری قوم یہودیوں کی اس عادت کی کسی حد تک شکار ہو چکی ہے اس کی علامت یہ ہے کہ ہاتھ سے محنت کرنے والے کی نہ صرف کوئی عزت نہیں بلکہ اسے کمتر شمار کیا جاتا ہے۔ یہ رواج ہندوؤں کی فطرت کے مطابق نہیں۔ ہماری قوم میں اس رسم کے رواج پانے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگیوں میں ایک خارجی عنصر داخل ہو چکا ہے۔ یہ خارجی عنصر یہود کے خیالات سے پیدا کیا ہے۔ کبھی ہماری قوم میں دستکاروں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔

ہے اس قدیم دستور کی جگہ یہ خیال لے لیتا ہے کہ اسے مالی محنت کرنے سے اس کی کمیت
ورزا قابل بن جاتا ہے۔

اس طرح قوم کے اندر ایک نیا معاشرتی طبقہ پیدا ہو گیا ہے جسے حقارت کی نگاہ سے
دیکھا جاتا ہے۔ اگر یہ حالت اسی طرح جاری رہی تو ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے
جب ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا یہ طبقہ قوم کے معاشرتی نظام میں شامل ہے۔ یا معاشرتی
مرتبہ کا فرق ایک ایسی لکیر ہے جو اس طبقہ کو ہمیشہ کے لیے دوسرے طبقات سے جدا
کر دے گی۔

ایک بات بہر حال یقینی ہے وہ یہ ہے کہ قوم کے موجودہ معاصر ہرگز اس طبقہ میں
شامل نہیں بلکہ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ یعنی اس طبقہ میں قوم کے سب سے
زیادہ پست اور پسماندہ لوگ شامل ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں نے جو بے نیازی
چاروں طرف پھیلا رکھی ہے۔ اس کا تو ابھی اور بہت کئی برس تک اس طبقہ پر نہیں
پڑے گا۔ اس وجہ سے کہ اس کی کثیر تعداد ہاتھ سے محنت کرنے والے مزدوروں پر مشتمل
ہے۔ یہ لوگ ابھی تک اس پرتی کے نفسی دماغ کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ بنے کے ہیں اور
ضرورت پڑنے تو دشیا دین سے بھی عار نہیں۔

سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھانے والے بھی سرمایہ دار ہیں

ہمارے متوسط طبقہ کے کھاتے پیتے لوگوں نے تو اس اہم مسئلہ کی کوئی توجہ نہیں دی
اور اپنا پوری طرح سے حالات کو اپنی رو میں بہنے دیا۔ لیکن یہودی نے پوری مستعدی سے
کام کر صورت حال کے ان امکانات سے فائدہ اٹھایا جو اس کے مستقبل کے لیے انتہائی
مفید ہو سکتے تھے۔ ایک طرف تو یہودی نے ہزار ہا منافع اندوزی کے لیے سرمایہ دار کے
طریقہ کار کی تنظیم کو انتہائی معراج تک پہنچا دیا اور دوسری طرف اپنے اقتدار اور بالا دستی
کے شکار یعنی مزدوروں کو خود اپنے ہی خلاف بھڑکا کر ان کی جدوجہد کی قیادت بھی
یہودی نے ہی سنبھال لی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہودی نے اپنے خلاف تحریک کی

قیادت خود سنبھال لی تو محنت کا مفہوم بدل گیا۔ یہ لفظ محض استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر حکمران اپنے آپ کو معصوم ظاہر کرکے دوسروں کو گناہ گار ثابت کرنے کا فن خوب جانتا ہے۔ چونکہ اس نے دنیا سے اپنے خلاف تحریک میں عوام کی رہنمائی خود کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی اس لیے یہ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ وہ ایک ایسے پاپائے فریب کا نظارہ کر رہے ہیں اس کی مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ درحقیقت وہ ایک ایسے ہی بے نظیر منظر کا نظارہ کر رہے تھے۔

جوں ہی عام اقتصادی صورت حال کے باعث یہ نیا طبقہ وجود میں آ گیا اور معاشرتی نظام میں اس کا ایک جگہ و مقام معین ہو گیا تو بیوروکریٹس نے فوراً محسوس کیا کہ انہیں خود اپنی ترقی جاری رکھنے کے لیے "نجیب" کہاں سے مل سکتے ہیں اب اس نے مزدوروں کو کسانوں کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ اس طرح اس نے کسانوں کی زمین سازشیں کرکے خود ہتھیانے کے لیے تھے اس طرح اسے توقع تھی کہ مزدور زندہ رہنے کی خاطر جدوجہد کریں گے اس میں شمولیت اختیار کرکے وہ تحریک پر اپنا قبضہ جما لیں گے۔

آخر کار ایک دن یہ ہو گیا کہ بیوروکریٹس کی سازشیں بڑھ گئیں تو مزدوروں کی ساری کوششوں کا مقصد صرف یہ رہ جائے گا کہ کسی بیوروکریٹ کا مشغل محفوظ ہو جائے گا۔ مزدور کہاں بچ سکے اپنی طاقت کے ہاتھوں قتل ہو رہا ہے جس کے خلاف وہ لڑتا ہے کہ لڑ رہا ہے۔ بظاہر مزدور کو سرمایہ داری کے مفاد کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اقتصادی سرمایہ داری کے خلاف منظم لڑائی ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس کام کا اس لڑائی کو اقتصادی خودمختاری حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اقتصادیات کا قومی کنٹرول کرکے اس کی جگہ بین الاقوامی سرمایہ داری کا کنٹرول قبضہ کر دیا جائے۔

کیموزم کیسے ایجاد ہوا؟

یہ کام انجام دینے کے لیے یہودی نے حسب ذیل طریقہ اختیار کیا

یہودی نے مزدور کے سامنے کورنش بجالانی شروع کی۔ وہ مزدور ہے اور مزدور کی قسمت ہی اس کمانے کا نعرہ لگانے لگا۔ حد یہ ہے کہ مزدور کی غربت اور زبوں حالی پر یہودی غم و غصہ کا اظہار کرنے لگا۔ یہ تھیں وہ چالیں جن سے یہودی نے مزدور طبقہ کا اعتماد حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ یہودی ایسے ظاہر کرتا تھا کہ گویا وہ مزدوروں کی جائیداد کی مخالفت نہیں معلوم کرنے کے پیچھے ہے۔ اس میں یہ کوئی تعجب نہ تھی کہ کون سی ذہنیات ہیں اور کون سی تخلیق۔ یہودی نے مزدوروں میں یہ خواہش پیدا کرنی شروع کی۔ کہ اس عمارت کے ساتھ اس کو زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اس میں تبدیلی آنی چاہیے۔ یہودی بڑی عیاری کے ساتھ معاشرتی انصاف کی اس حس کو مشتعل کرتا تھا جو مزدور کی ایک مخصوص نشانی ہے۔ جوں ہی یہ احساس بیدار ہوجاتا پھر اس کو ان لوگوں کے خلاف مقابلے کے جذبہ میں بدل دیا جاتا جن کی زندگی کے حالات بہتر تھے۔ اگلا قدم یہ تھا کہ معاشرتی ڈرامہ کے دور کرنے کی جدوجہد کو واضح طبقاتی رنگ دے دیا گیا۔ اسی ضرورت پوری کرنے کے لیے مارکس ازم کا عقیدہ اختراع کیا گیا۔

مارکس ازم کے اصولوں کو معاشرتی تحقیق ہی کے نتائج کی حیثیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہودی کو ان اصولوں کا ثابت کرنے میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ لیکن اسی طریقہ کار کے باعث یہودی شرعاً کی جانب سے مخالفت کا بھی سامنا رہا۔ یہ شرعاً ان مطالبات کو اس شکل میں اور اسی نام نہاد فلسفیانہ آمیزش کے ساتھ قبول کرنے کے منکر تھے۔ کیونکہ وہ اس فلسفیانہ آمیزش کے ساتھ اور اس شکل میں ان مطالبات کو غیر منصفانہ اور ناممکن العمل تصور کرتے تھے۔ یہ چاہتے ہیں کہ صرف معاشرتی اصلاح کا نعرہ لگائیں لیکن اس کے پیچھے تخریبی عزائم کارفرما ہیں۔ یہ تخریبی مقاصد کھلے طور پر

حالات کو بہتر بنانے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہے اس کے ساتھ مزدوروں کو رعایتیں بھی دینی پڑتی ہیں لیکن دراصل اس تحریک کا مقصد غیر یہودی نسلوں کو غلام بنا کر رکھنا ہے۔

کیمونزم تشدد سے پھیلتا ہے

عام زندگی تعلیم یافتہ طبقہ میں پہلے فری میسن جو بڑے بڑے کام کیا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فری میسن کی اس پرتی کی تنظیم نے تعلیم یافتہ طبقہ میں سے قوتِ فکر کا قریباً اسی فیصد ختم کر دیا۔ اب یہی تنظیم انتخابات کے ذریعہ سے عام مزدوروں اور کسانوں میں پھیلائی جانے لگی۔ انتخابات کے قریب قریب ہر جگہ یہودیوں کے قبضہ میں تھے۔ یہودیوں نے اپنی دولت کو دو اکثریتی چالوں کے ساتھ ایک تیسری چال بھی شامل کر لی جو پہلی دونوں چالوں سے زیادہ خطرناک تھی۔ وہ تیسری چال یہ تھی کہ عوام کو مرعوب کرنے کی خاطر دہشت انگیز جسمانی طاقت کو مظاہرہ کی شکل دے دی گئی۔ کیمونسٹوں کی فوجیں فسطائی رضاکاروں کی طرح مسلح تھیں۔ ان کے ان دستوں پر جنہیں بول وی کہتے تھے جس کے پہلے دو حصوں سے فتح حاصل ہو چکی تھی ان تمام مختلف حالتوں کو بھڑکا کر جس کاریگری سے ایک وقت ان سے کام لیا گیا اس پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کاریگری نے ایک وقت ان سے کام لیا جو ہمارے ہمیشہ سے سرکاری فنکار کے روایتی امانت دار رہے ہیں۔ اگر ان حالات میں ان پر بھی کیمونسٹوں کا تسلط ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ ان کے یہودی کو پہلی تباہ کاری کی مہم چلانے کے لیے بڑا سائنٹی تھوت کے مقابلہ پر بلکہ اعلیٰ ترین افسروں میں سے نہایت فرمانبردار قسم کے آلہ کار مل جاتے ہیں۔ یہ حکام ہمیشہ افسر ہوا کے سامنے جھکنے لگ جاتے ہیں اور مالکوں کے سامنے غرور و تکبر سے بڑے کشیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی صلاحیتیں دیکھ کر رونا آتا ہے۔ ان کے ساتھی سارا وقت سنے پر خود غلط ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

سرکاری نظام کی یہ خصوصیت ہیروی کو اس کے ساتھ لپٹنے میں بڑی مدد دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہیروی سرکاری طرزوں کو ہمیشہ اپنی صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے بعد جو شکل شروع ہوئی اگر مجھے اس کا سرسری نقشہ کھینچنا ہو تو میں اسے حسب ذیل صورت میں بیان کروں گا۔

ہیروی نے اقتصادی لحاظ سے دنیا کو تین گروہ پر تقسیم کیا ہے۔ ایک اسے دنیا کی سیاسی تقسیم کا بھی شوق ہے۔ ہیروی کیمونزم کے بنانے سے عوام کی تنظیم کر کے جو اقتدار حاصل کرتا ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اقتدار کی یہ دو قسمیں دو جداگانہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کو عملی جامہ پہنانا ہیروی کے ذہن میں اس ساری جدوجہد کا حاصل ملتا ہے۔ بظاہر یہ دونوں مقاصد دو مختلف تحریکوں کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ دونوں مقاصد کے مفہوم میں کامل تضاد ہے ان دونوں مقاصد میں سے پہلا مقصد تو سیاسی تحریک کی کامیابی ہے اور دوسرا مقصد ترقی پذیر ملکوں کی تحریک کی تشکیل ہے۔

مزدوری بھدروی سرمایہ دار کے اقتدار کی پیڑھی کس طرح بنتی ہے؟

ترقی پذیر ملکوں کی تحریک سے رنگروٹ بھرتی کیے جاتے ہیں۔ مزدوروں کو متحد ہو کر برقرار رکھنے کے لیے روزی کمانے کی خاطر جو بیکار جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کی تحریک اس جدوجہد میں ان کو مدد دیتی ہے اور ان کی پشت پناہی کرتی ہے۔ مزدوروں کو اس جدوجہد کی ضرورت محسوس ہونے کے باعث ان کی اور تنظیم کار خانہ داروں کی کثرت ہے۔ یا تو مزدور زندگی کی ان آسائشوں کو بھی ترک کر دیں جن کے بغیر فطرت انسانی کی عیرت و حمیت کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکتے اور اپنے آپ کو بالکل ان قانون کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جنہیں کثرت و بیشتر انسانی ذہن اداریوں کا کامل احساس نہیں ہوتا اور جو ایسے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں انسان کی عادت مندی کی ذرہ بھر پروا نہیں ہوتی اور یا مزدور مجبور ہو کر اپنے مفاد کی حفاظت کا [illegible] خود ان میں

کیونکہ تمدن و معاشرت کا کوئی بھی شعبہ مزدوری کی ضروریات سے سرِ مو غافل نہیں ہے۔

نام نہاد "قوم پرست" کھاتے پیتے لوگ بھی اپنی دولت کی ضروریات سے اندھے ہو کر مزدوری کی زندگی یا موت کی جدوجہد میں اس کی حمایت کرتے ہیں۔ اور مزدور کے راستہ میں سخت رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ ہمیشہ تمام قوانین بنانے کی مخالفت کرتے ہیں جن سے کارخانوں میں مزدوروں کی محنت کے اوقات کم کرنے کی کوشش کی جائے (حالانکہ آج کل کارخانوں میں مزدوری کے اوقات ایسے طویل ہیں کہ ان سے مزدوروں کے خلاف انسانیت ظلم ہوتا ہے) یا جن کے ذریعہ بچوں کی مزدوری سے منع کیا جائے یا بچے کے ماتحت مزدوری کرنے والی عورتوں کی حفاظت اور امداد کا بندوبست کیا جائے یا جن کی رو سے مزدوروں کے مکانات اور کارخانہ جات میں صفائی صحت کے انتظامات کو ترقی دی جائے۔ جب کھاتے پیتے لوگ اس قسم کی مثال میں منسلک ہوتے ہیں تو چالاک یہودی مخلصوں کی وکالت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ یہودی بتدریج ترقی پا جاتا ہے اور تحریک کا لیڈر بن جاتا ہے۔ یہ کام اس کے لیے بالکل مشکل نہیں کیونکہ وہ بظاہر مخلصانہ طور پر معاشرتی نقائص کی اصلاح کی تو فکر ہے نہیں۔ اسے تو صرف ایک دشمن مارنا ہوتا ہے جس کی دولت کی ایک ہی صناعت نیچ کی جائے اور مظلوم کی جائے جو اس کے دماغ کے ماتحت خود مختار قومی اقتصادی نظام کو برباد کرنے کے لیے ایک موثر حربہ ثابت ہو۔ اسلام کا معقول حل تو صرف یہ تھا کہ دو متضاد قابل فکر کو کوئی اعتدال کا راستہ دریافت کیا جاتا۔ پہلا مقصد تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی محنت اور خوشحالی کا ایک مناسب معیار قائم ہو جائے۔ دوسرا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم کی اقتصادی خودمختاری کے تحفظ کا فکر۔ واقعی اہتمام کیا جائے۔ یہودی نے ان دونوں مقاصد میں سے کسی ایک کی پروا بھی نہیں کرتا۔ اس کی ہمیشہ کوشش یہ ہے کہ ان دونوں مقاصد کو پورا نہ ہونے دیا جائے۔ قومی اقتصادی نظام کی خودمختاری کی حفاظت کے بجائے وہ

سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بحیثیت لیڈر ہونے کی تحریک کا لیڈر ہونے سے
سے ایسے حالات پیش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی جو کہ صرف قوم کے مفاد
مفاد سے تجاوز کرتے ہیں جو قوم کے اقتصادی نظام کو اپنے طور پر بے ہی نہیں ہو
سکتے۔ علی ہذا القیاس یہودی قوم کی صحت اور تندرستی کی نشوونما کا بھی کوئی خیال نہیں
کرتی قوم کے سوچنے والے دماغ جانے والے سوشیالوں کا ایک ریوڑ بن جائے تو یہودی
مطمئن ہوگا کہ اب اس کو مطیع کرنا زیادہ آسان ہے چونکہ یہودی کی اصل نیت یہ ہے کہ
اس وجہ سے وہ بے ہودہ سے بے ہودہ مطالبات پیش کرنے سے بھی نہیں جھجکتا۔ وہ
خوب جانتا ہے کہ یہ مطالبات کبھی پورے نہیں ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اس وجہ
سے ان مطالبات کو پیش کرنے سے اصل صورت حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں
زیادہ سے زیادہ ان مطالبات کا اثر یہ ہو سکتا ہے کہ عوام میں بے چینی پھیلا دی جائے۔
عوام میں بے چینی پھیلانا ہی اس پارٹی سے یہودی کا اصل مقصد بھی ہے۔ یہودی
دیانت داری سے معاشرتی حالات میں کسی حقیقی اصلاح کا طالب ہرگز نہیں۔

سیاست میں ڈنڈے کا مقام

جب تک عوام کو اپنائی و سچ پر مبنی حقیقت حال سے واقف کرنے کی مہم نہیں
چلائی جاتی تب تک یہودی لیڈر ہو یا نہ ہو تحریک کا سلسلہ لیڈر رہتا رہے گا۔ ایسی مہم کے ذریعہ
عوام کو ان کی زبوں حالی کے اصل اسباب سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اگر سرکار
یہودی ہو اس کی کارستانیوں کا خاتمہ کر دے تو اس صورت میں اس فتنہ سے نجات
حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک عوام کی اکثریت کی وہی حالت رہے گی جو آج کل ہے اور جب
تک سرکار عوام کی اکثریت کے زیر کنٹرول رہے گی جیسی آج کل حالت ہے تب تک
مجبوراً اس لیڈر کی پیروی پر آمادہ رہیں گے جو اقتصادی مسائل میں ان کے سامنے
زیادہ سے زیادہ مبالغہ آمیز وعدے کرے۔ یہودی اس فن میں بڑی دسترس کا ماہر ہے اور بلا
جھجک اپنی سرگرمیوں میں کسی اخلاقی پابندی کا بھی لحاظ نہیں۔

قدرتی طور پر اس صورت حال کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہودی تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس میدان میں اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر انہیں بے دخل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ یہودی کی طبیعت کی عام خصوصیت اور طوطا چشمی کا تقاضا ہے کہ وہ ڈیموکریسی کی تحریک کو آہستہ آہستہ ایک انسانی تنظیم کر دے وہی تنظیم میں داخل کر دیتا ہے۔ جن لوگوں کی عقل سلیم نے ابھی تک آمریت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا ہے اب انہیں ڈنڈے کے زور پر مطیع کیا جاتا ہے۔ ڈنڈے کے زور سے جو کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کی کچھ حد نہیں۔

کمیونزم کی سیاسی تحریک کے لیے روپیہ کہاں سے آتا ہے

اس کارروائی کے ساتھ ساتھ سیاسی تنظیم کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ سیاسی تنظیم اور ڈیموکریسی کی تحریک چلتی ہیں۔ ڈیموکریسی کی تحریک عوام کو سیاسی تنظیم کے لیے تیار کرتی ہے۔ عموماً اوقات سیاسی تنظیم میں زبردستی داخل کی جاتی ہے۔ سیاسی تنظیم کے زبردست کارخانہ کو چلانے کے لیے جس روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ڈیموکریسی کی تحریک ہی مہیا کرتی ہے۔ ڈیموکریسی کی تحریک وہ مشین ہے جس کے ذریعہ سے ڈیموکریسی کی تحریک کے تمام ارکان کی سیاسی سرگرمیوں پر قابو حاصل کر لیا جاتا ہے اور عوام کو مختلف سیاسی مطالبوں کی خاطر اٹھایا جاتا ہے۔ الغرض ڈیموکریسی کی تحریک اقتصادی مفاد کے لیے اپنی جدوجہد ترک کر دیتی ہے۔ اور یہ سب سے بڑا حربہ ہے جس کام کرنے سے انکار ہو کر عام ہڑتال کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے سیاسی تحریک کے ہاتھ کر دیتی ہے۔

سیاست میں صحافت کا دخل

ان تمام تنظیموں کے علاوہ یہودی کے پاس ایک اور حربہ بھی ہے یہودیوں نے بے شمار اخبارات جاری کر رکھے ہیں جن کے ذریعہ جاہل سے جاہل پڑھے لکھوں کو بھی یہودیوں کا سودا بیچنے میں دقت پیش نہیں آتی۔ ہوتا یہ ہے کہ ان اخبارات کا مدیر جاہل

یہودی طبعی طور پر فی الفور ہر اس شخص کی دعوت بھانپ لیتا ہے جس کے پاس تھوڑا بہت مرد کی زندگی میں اسے منہ لگنے کا استحقاق ہو۔ اس لوگوں کا مزاج یہودی مزاج کے مطابق نہ ہو انہیں وہ اپنے دشمنوں کی فہرست میں شامل کر لیتا ہے۔ چونکہ یہودی کسی حملہ ور کا شکار نہیں بلکہ خود حملہ آور ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف انہیں لوگوں کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا جو اس پر حملہ کریں بلکہ اس کو بھی اپنا حریف سمجھتا ہے جو اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ ایسے حریفوں کی کمر توڑنے کے لیے یہودی وہی ذرائع استعمال نہیں کرتا جو عام طور پر شریف لڑائیوں میں استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ یہودی کے خلاف مقابل شاستہ اور دیانت دار ہوں ان کے خلاف وہ بہتان فروشی اور دروغ بافی کے کرتے استعمال کرتا ہے۔

یہودی کو کسی حربے کے استعمال سے عار نہیں اس کا کلیہ اور پیمانہ طرز عمل یہ ہے کہ اگر ہماری قوم یہودی کو مسلم شیطان اور بدی کا نشان تصور کرتی ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں

اگر بہت سے لوگ یہودی کی دروغ گوئی کی مہم کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں تو اس کی وجہ ہے کہ ایک طرف تو عوام یہودی کی اندرونی فطرت سے پوری طرح واقف نہیں اور دوسری طرف وہ بے حد دقیق صلاحیت اور ذہنی احساس سے عاری ہیں۔

جب یہودی کسی شخص پر اپنی بہتان تراشیوں اور دروغ گوئیوں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے تو ہمارے عام طبقات تو اپنی ذہنی بزدلی کے باعث اس فریب کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ تو کسی حد تک اپنی جہالت کے باعث اور کسی حد تک اپنی سادہ لوحی کے باعث جو کچھ انہیں کہہ جائے ہمیشہ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ سرکاری حکام یا تو خاموشی سے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور یا پھر یہودی نامہ اعمال کے حملوں سے بچنے کی خاطر اکثر ان کے ایجنٹ بن کر خود بھی دوسروں پر ظلم ڈھانے لگتے ہیں بے وقوف سرکاری افسروں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ اس طرز عمل سے سرکاری مشنری کی حفاظت

سے کامیاب ہو جائیں گے۔ عوام میں عدم تحفظ قائم رکھیں گے۔ رفتہ رفتہ یہودی کے ہاتھ میں کیونزم کی لگام ایک ایسا ہتھیار بن جاتی ہے جس سے سب سے زیادہ لوگ ڈرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ حالت ہے جو یہودی کا خوف ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یا کابوس کی طرح ان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ لوگ اس خوفناک دشمن کے سامنے زیادہ بے دم ہو کر یا آسانی اس کا شکار بن جاتے ہیں۔

فلسطین کی یہودی سلطنت بین الاقوامی تحفظ کا ادارہ ہے

(ک) اس مرحلہ پر یہودی معاملات سرکار میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اب نہ صرف وہ ایک عرصہ پار کھلے بندوں اپنے آپ کو یہودی کہہ سکتا ہے بلکہ اب تو وہ اطمینان کی بھی بات ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے چوٹ اصلی اور سیاسی مسائل پر بھی اپنے خیالات ظاہر کرنے لگتا ہے۔ یہودیوں کا ایک گروہ کل نکل کر اپنے ایک جداگانہ قوم ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ یہاں بھی ان کے ہاتھ سے بھوت کا دامن نہیں چھوٹنے پاتا۔ جب تحریک صہیونیت کے حامی دنیا کو یقین دلا چکے ہیں کہ فلسطین میں ایک یہودی حکومت کے قیام سے یہودیوں کے قومی شعور کی تسکین ہو جائے گی تو پھر بھی وہ نوع غیر یہودیوں کے دماغ کا ایک جزو بنی رہتی ہے۔ یہودیوں کا ہمدرد یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ فلسطین میں کوئی ایسی سلطنت قائم کریں جہاں وہ مستقل رہائش اختیار کریں۔ یہودیوں کا اولین مقصد تو صرف یہ ہے کہ لنگ باری اور اجارہ داری کے لیے یہودیوں کو بین الاقوامی مرکز کا ایک مقام قائم کر دیا جائے۔ اگر فلسطین میں یہودیوں کی متحد مہمان سلطنت قائم ہو گئی تو ظاہر ہے کہ اس پر کسی دوسری حکومت کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔ یہ یہودی سلطنت ان تمام لنگوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دے گی جن کا راز فاش ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں لنگ باری کا ایک نہایت محفوظ مکتب بھی قائم کیا جا سکے گا۔

اپنے آپ کو محفوظ یہودیوں کے ہاتھوں میں دیکھنے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ان کا ایک

گروہ کھلے بندوں اور کھلم کھلا اپنی یہودی قومیت کا اعلان کرتا ہے۔ دوسری جانب یہودیوں کا ایک اور گروہ سیاست کا یہ انوکھا رنگ اپنائے ہوئے ہے کہ وہ بظاہر فرانسیسی یا انگریز ہیں۔ اگر مصلحت وقت کا تقاضا ہو تو وہ کوئی دوسری قومیت بھی اختیار کر لیتے ہیں اب یہودی دوسری قوموں کے ساتھ اپنے رشتوں میں ایک ایسا تسلسل برقرار رکھتا ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنی نسلی بقا کی فکر بے حد عزیز ہے۔

حمیت اور ناموس کا جنازہ کب اٹھتا ہے

کالے بالوں والا یہودی نوجوان جس معصوم بھولی لڑکی کو ورغلانے کی فکر میں ہوتا ہے وہ گھنٹوں اس کی تاک میں شست لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔ وہ بلی کی طرح اگلی دو جھپٹا مارنے کی طرف دیکھتا ہے اور وہ اس کے خون میں کچھ گرمی پیدا کرنے کے لئے اس کی قوم کے متعلق سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ یہودی کو جس قوموں میں داخل حاصل ہو جائے وہ ان کی نسلی بہبودی تباہ کرنے کے لئے کوئی چال چلنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں کو برباد کرنے کی منظم کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کی خاطر وہ یہودیوں اور دوسری قوموں کے مابین ہر قسم کے پردے ہٹا دینے کی جدوجہد کرتا ہے۔ رائن بیلٹ کے بعض علاقہ میں عیسائیوں کو یہودیوں ہی نے ذکر آمد کیا تھا تاکہ جس سلیبی قوم سے یہودیوں کو نفرت ہے اس کی نسل کو برباد کر دیا جائے۔ نسل داغی ہو جانے سے وہاں کے باشندوں کو قومی اور سیاسی معذور بنا جائے۔ اور اس طرح یہودیوں کو برسر اقتدار آنے کے لئے میدان صاف ہو جائے۔ جب تک کسی قوم کی نسل میں کوئی ملاوٹ نہ ہو اور جب تک ان میں ان کے خون کے ناموس اور حمیت کا احساس باقی ہو تب تک یہودی انہی پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس دنیا میں یہودی صرف دو ہی قوموں پر غالب آ سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی دوسری قوموں کی نسل میں کھوٹ ملانے کے لئے منظم جدوجہد کرتا ہے۔ قوم طراری کے مخمصہ کا نام ہے۔ اس لئے قوم کے خون میں کھوٹ ملانے کی خاطر یہودی قوم کے افراد کے خون میں کھوٹ ملا

دیتا ہے۔

"کمال شاہی" کا نعرہ ایک ڈھونگ ہے

یہ بات کے میدان میں ہے یہودی "جمہوریت" کی جگہ "کمال شاہی" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ عوام کو کیمونزم کے چنگل سے بچانے کے لیے یہودی کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آجاتا ہے کہ اب اسے جمہوریت کی ضرورت نہیں۔ اب تو وہ شاہ وقت کے زور سے لوگوں کو اپنا مطیع بنا کر وہ ڈکٹیٹروں کی طرح حکومت کر سکتا ہے۔ یہودی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے، تقریباً دو طریقوں سے انتخاب کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس کا پہلا طریقہ کار اقتصادی ہے اور دوسرا طریقہ کار سیاسی۔

اگر یہودی کی داخلی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے میں کوئی قوم اپنی سخت جان ثابت ہو کہ اس پر یہودی کا پانسہ کوئی داؤ نہ چلے تو پھر یہودی بین الاقوامی معاملات کا چارہ لے کر اس قوم کو دشمنوں کے محاصرہ میں جکڑ لیتا ہے اور پھر اس قوم کو زوال کے میدان میں جھونک دیتا ہے۔ جب یہودی کی چالوں کو کامیاب بنانے کے لیے مناسب وقت آجاتا ہے تو جس اس حالت میں قوم کی جنگ لڑ رہی ہوں یہودی ان کی پیٹھ پیچھے حکومت کا جھنڈا بلند کر دیتا ہے۔

اقتصادی طور پر کسی سلطنت کو تباہ کرنے کے لیے یہودی اس کے اداروں کو برباد کرنے کی منظم تحریک شروع کر دیتا ہے حتیٰ کہ ان اداروں کے چلانے کے اخراجات سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ یہ ادارے سرکار کے ہاتھ سے نکل کر سرمایہ کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں سیاسی لحاظ سے یہودی اس ستون ہی کو منہدم کر دیتا ہے جس کے سہارے سلطنت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہودی قحط اور قومی مدافعت کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالتا ہے۔ وہ حکومت پر قوم کے اعتماد میں رخنے ڈال دیتا ہے۔ اس کا کوئی اڈا ہے۔ تاریخ پر چھائیوں ملتا ہے اور قومیت کی ہر جہت لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل بنا دیتا ہے۔

خالص طور پر یہودی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خون اور نسل کے ملک میں اس طرح کا نسل بھائی کی ہوئے کہ قومیت کے جذبہ کی وقعت کم سے کم تر ہوتی بھی جائے۔ وہ ہمیشہ کو بصورتی نسل کی اور بھائی کے تصورات محو کر دیے جائیں اور اس کا رعوام کو خود یہودی پست ذہنی سطح پر اتار دیا جائے۔

یہودی مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ خلوق اور نسل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تو پرانے وقتوں کے تعصبات اور توہمات ہیں فرض باقاعدہ پورش کر کے ہر اس بنیاد کو مٹایا جاتا ہے جو قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو اور جس کے بغیر قوم ہر جگہ میں پل بستی پر قرار نہ رکھ سکتی ہو۔

روس انسانیت کا جیتا جاگتا جہنم ہے

(ل) اس مرحلہ پر آخری اور عظیم جنگ تخت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جونہی یہودی سیاسی اقتدار کی کا شکار ہو جاتا ہے وہ فوری طور پر اپنے چہرہ پر سے اس نقاب کی آخری دھجیاں بھی اتار پھینکتا ہے جس کے پیچھے اس کے اصلی خدوخال آج تک پوشیدہ رہے۔ جمہوریت کا پجاری یہودی عوام کا خدمتگار یہودی پر سے ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ خونخوار یہودی لوگوں پر اپنے تسلط کا کھلم کھلا کوڑا برسانے آ جاتا ہے۔ یہ خونی رسوں میں یہودی اپنے پنجہ میں آئی قوم کے تمام ذہین افراد کو ختم کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح عوام کو ان کے ذہین ہوا خواہوں اور قائدین سے محروم کر کے یہودی ہمیشہ کے لیے اپنے جبر و استبداد کے پنجہ میں عوام رکھنے کی خاطر اپنے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔

اس عالمی کی عبرت ترین مثال روس ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ روس میں یہودیوں نے تین کروڑ انسانوں کو قتل کر دیا بھوکا مار دیا۔ یہ سب کچھ ایک وحشیانہ تعصب کا کھیل رچانے کا مظاہرہ میں کیا گیا۔ اس مرنے والوں میں کئی لوگوں کو اس شدید عذاب دے کر ختم کیا گیا کہ ان کے مقدر سے انسان کے رونگٹے کھڑے

ہو جاتے ہیں۔ اس ساری کارروائی سے یہودی کا مقصد نہ تھا کہ چند یہودی بڑھ جائیں اور چند یہودی اقتصادی نظموں کو ایک مخصوص قوم کے سپرد کر دیا جائے۔

ان حرکتوں کا آخری نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ قومیں آزادی سے محروم ہو کر یہودی کی غلام بن جاتی ہیں بلکہ یہودی کی ان حرکتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ملک خود اور محکوم یہودی ایک دن خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ جب شکار کی موت واقع ہو جاتی ہے تو وہ یا وہ شکار کو اپنی کرم فرمائی پر زندہ رہنے والے ڈھانچا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جنگ میں شکست سے زیادہ مضر شکست خوردہ ذہنیت ہوتی ہے

اگر ہم جرمن قوم کے انحطاط کے اسباب میں کاوش کریں تو ثابت ہوتا ہے کہ اس زوال کی سب سے زیادہ فیصلہ کن اور عمیق ترین باعث نسلی اصول کی اہمیت سے عدم واقفیت اور بالخصوص یہودیوں سے جو خطرہ درپیش تھا اس کا احساس کرنے میں کوتاہی تھی۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جرمنی کو جو فلسطینی میدان جنگ کے اندر ہوئیں انہیں برداشت کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہماری قوم کو جو عسکری فتوحات حاصل ہوئیں ان کے ساتھ جب ان شکستوں کا مقابلہ کیا جائے تو وہ بے حقیقت نظر آتی ہیں۔ در اصل ہمیں عاجز کرنے کا باعث وہ طاقت تھی جس نے قرنوں سے ہمیں ان شکستوں کا شکار بنانے کی باقاعدہ تیاری شروع کر رکھی تھی۔ وہ تیاریاں یہ تھیں کہ قوم کی سیاسی بصیرت اور اخلاقی حیات کو مٹا دیا گیا۔ سیاسی بصیرت اور اخلاقی حیات کے بغیر کوئی قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے جد و جہد کے قابل ہو سکتی ہے اور نہ زندہ رہنے کی حقدار کہلا سکتی ہے۔ جرمنی کی قدیم سلطنت نے جب ہماری قوم کی نسلی بنیادیں برقرار رکھنے میں غفلت کی تو گویا اس نے اس کرۂ ارض پر زندہ رہنے کے حق سے قومی دست برداری کا اعلان کر دیا۔ جو قومیں اپنے باشندوں کو وہ غذا بہم نہیں پہنچاتیں جو ان کے جسم کے لیے ضروری ہے وہ قومیں اپنے

ارتقا کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔ اگر کسی قوم کو ان کا کوئی مضبوط حریف تباہ کر دے تو یہ تباہی کو نے انصافی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو عین انصاف ہے کہ اگر کوئی قوم ان صلاحیتوں کو برقرار رکھنے اور بچانے سے قاصر ہو جائے جو فطرت نے اسے عطا کی ہیں اور اس کے عمل خون میں موجود ہیں تو بالکل ایسی قوم کو زمین پر سے اپنا وجود ختم ہو جانے کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔

ہر شکست میں کوئی فتح پنہاں ہوتی ہے

اس دنیا کی ہر چیز کو کسی بہتر شے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہر شکست مستقبل میں کسی کامیابی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ میدان جنگ کی ہر ہزیمت بعد ازاں کسی نئے عروج کا سبب بن سکتی ہے۔ ہر مصیبت کا دور بہت انسانی کے لیے ایک بہتر دور ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر ظلم و زیادتی سے اب کر کسی قوم کو قوت دی جا سکتی ہے۔ جو کسی قوم کی روح کو از سر نو زندہ کر دیا کرتی ہیں وہاں ان تمام صورتوں میں یہ شرط ہے کہ نسلی خون کو پاک رکھا جائے۔

اگر نسل کی پاکیزگی میں فرق آ گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے سرچشمہ کی اندرونی قوتیں خشک ہو جائیں گی۔ انسان اندر سے کھوکھلا ہو جائے گا۔ نسل میں تغیر آ جانے کے جسمانی اور اخلاقی نتائج سے کبھی نجات حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس بے مثال مسئلہ کا مطالعہ کیا جائے تو پھر زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جائے تو انسانی ہم پر واضح ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ کے مقابلہ میں ان مسائل کی اہمیت بہت کم ہے۔ دیگر مسائل کی اہمیتیں ہمیشہ ایک جیسا رہتی ہیں لیکن نسلی خون کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے پیچھے میں کھوٹ شامل ہو جانے کے نتائج کا تدارک اس وقت تک ہوتی رہتا ہے جب تک خود انسان کا وجود قائم ہے۔

زوال کی وہ تمام علامتیں جو جنگ سے قبل ظاہر ہو رہی تھیں اگر ان کا کھوج لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی بنیاد بھی نسلی اصولوں کی خلاف ورزی کے باعث ہوئی

تھی۔

چاہے ہم عام قانون کی کتابوں کا سراغ لگائیں چاہے اقتصادی پھوڑے مجلسوں کی تشخیص کریں چاہے تاریخی انقلاب اور سیاسی رواں کی تحقیق کریں چاہے کلیسا کے تاریخ کا تجزیہ کریں چاہے عام باشندوں پر صحافت کے مداخلت کا جائزہ لیں۔ یہ تمام چیزیں ہمیشہ اپنی قوم کے نسلی مفاد سے حاصل رہنے کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ یا قسم کے ظلم کے اندر کی خارجی عمل کو مقیم رہنے کی اجازت دینے سے جو اثرات ورثہ میں ملتے ہیں ان سے جبلت کے سبب پرورش پاتی ہیں۔

یہی چاہے کہ اصلاح کے تمام اقدامات معاشرتی اندوہ کے تمام اور سے تمام سیاسی جدوجہد تمام اقتصادی ترقی ارطم ین تمام علمی اضافے کوئی نتیجہ پیدا کرنے سے عاجز رہے یہ صرف قوم اور قوم کا وجود برقرار رکھنے والا نظام یعنی حکومت روز بروز اندرونی طاقت میں اضافہ پاس کے انتظام سے عاجز ہو چکے تھے۔ بلکہ میں طور پر ان میں ضعف کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ دوسری زبان سلطنت کی طبیعی تنگ کاہے ہمیں اس کی داخلی کمزوریوں سے آگاہ رکھنے کا باعث ہونی چاہیے۔ سلطنت میں جان ڈالنے کی ہر کوشش ناکام رہی وجہ یہ تھی کہ اصلی اور سب سے زیادہ اہم مسئلہ پر توجہ نہیں ہو رہی تھی۔

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!

یہ بتانا کہ اغلاط ہوگا کہ وہ مختلف سیاسی پارٹیوں جو ان دنوں کے علاج معالجہ کی فکر میں آگے بڑھیں وہ سب یا ان کے تمام لیڈر ہدایت اور بدنیت تھے۔ ان کی بہترین جدوجہد اس لیے ناکام رہی کہ قوم میں جو روگ عام پھیلا ہوا تھا انہیں اس کی علامتوں کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ اور اس وجہ سے وہ لوگ کی اصلی جڑ کو پاک طرف چھوڑ کر علامتوں ہی کے علاج میں مصروف رہتے تھے۔ اگر قدیم رومن سلطنت کی نشوونما کے مدارج کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی کرتے ہی پتا لگ جاتا ہے

رہے تھے یہ شوق جہاں کے خلاف تحفظ ناموس ملت کے احساس کی آخری جھلک تھی۔ جب قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی زمام اقتدار ڈھل ہو رہی تھی تو ہمیں اس بات میں بھی قوم کے داخلی دشمن کو شناخت نہ کیا جا سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ملکی دشمن کا مقابلہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ قدرت نے کاتب تقدیر کی ذمہ داری سے ہٹا کر کے فطرت کے غیر جانبی قانون انصاف کے ماتحت انتظام کی فیصلہ صادر کیا۔ اور ملی تحریک جس سیاسات اور اصولوں پر قائم کی گئی ہے وہ ملک کو ہر اقدام سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ہمیں بتایا جا چکا ہے کہ اس تحریک کو تسلیم کر کے ہی داخلی دشمن قوی کو روکا جا سکتا ہے اور ایک ہی سلطنت کی صحیح اور مکمل بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔ یہ سلطنت کوئی ایسی غیر ملکی ذہنیت نہ ہوگا جو اقتصادی مقاصد یا سیاسی غرض سے اپنے سر منڈھ لیا گیا ہو۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا نظام ہوگا جو خود قوم کے روحانی تقاضوں کی تخلیق ہوگا۔ یہ سلطنت خود ہی داخلی قوم کی تعمیر کردہ دشمن ایک مرکز ہوگی!

☆☆☆

باب دوازدہم :: جرمن سوشلسٹ مزدور پارٹی کے ارتقا کی پہلی منزل

مرد بے ادب پروں آید ہوا کارے بکند

میری زندگی کے پہلے حصہ کا یہ آخری باب ہے۔ میں اس باب میں اپنی تحریک کے نشوونما کے ابتدائی مدارج بیان کروں گا۔ ان کا تعین اس زمانہ میں ہوا کرتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان اصولوں کا ذکر کروں گا جو ہماری تحریک کے لب لباب کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اصولوں کی اہمیت اور نوعیت مقتاضی ہیں کہ ان کی تشریح بیان کرنے کے بعد ہی زندگی کی ایک دوسری مکمل سلسلہ شروع ہوتے۔ میں اپنی زندگی کے دوسرے حصہ میں ان اصولوں کا تفصیلی بیان کروں گا جن پر ہماری تحریک کا دارومدار ہے اس کے ساتھ ہی میں یہ کوشش کروں گا کہ ہم لفظ "مزدور" سے کیا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ جب میں یہاں محنت کش طبقہ کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میرا مطلب ان لوگوں سے ہوتا ہے جن کے دلوں میں واقعی بے آرزوئیں مچل رہی ہیں گو انفرادی طور پر ان کی رسائی وہاں تک کرنے کی قدرت نہیں رکھتیں جو پوری طرح ان کے حسن کے جلووں کو بیان کر سکیں۔ تمام بڑی بڑی اصلاحی تحریکوں میں ایک عجیب خصوصیت رہی ہے۔ کہ شروع میں ہمیشہ کوئی شخصیت لاکھوں انسانوں کی ترجمانی کی دعوت کے کر اٹھتی ہے۔ دنیا میں جتنے عظیم انقلاب آئے ان کی منزل مقصود تک پہنچنے کی آواز صدیوں پہلے سے کروڑوں انسانوں کے سینوں میں گونجتی رہی تھی لیکن یہ آواز اس وقت تک عملی جامہ نہ پہن سکی جب تک انہیں کروڑوں انسانوں میں سے کوئی ایک آدمی اٹھ کر اس نے عوام کے عزائم کا اعلان کرنے کے لیے تیغ کے نیام سرا نہیں ہو دیے۔ مگر اس اعلان کے بعد وہ تیغ اس قدیم تمنا کے حامیوں کا علم بردار بن گیا۔ اور انجام کار اس نے اس پرانی تمنا کو ایک مکمل پیکر دے کر دنیا کی کروٹ بدلا

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

آج ہماری قوم کے لاکھوں افراد ہماری موجودہ حالت میں جمہوری انقلاب کے متعلق جن ان کی اس خواہش کا وقت وہ شدہ بہ پہنچی ہے جو آج ان میں پائی جاتی ہے۔ ان کا جذبہ ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ کئی لوگ انقلاب کی خواہش کا اظہار جمہوری اور نوسط ذہنی کے کلمات کے ذریعہ کرتے ہیں۔ کئی لوگ شکایت، غصہ اور مایوسی و مطلب کے پیرائے میں اپنے ارمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں کہ۔ پھر ایسے بھی ہیں جن کی آنکھوں نے بے چینی کا بھیس بدل لیا ہے۔ بعض اسی کیفیت کی ترجمانی مختلف اشعار کے وسیلہ سے کرنے کی اکثر ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہی آرزو کی لوگوں کو انتظار میں دوسرے ڈالنے سے باز رکھتی ہے۔ اور یہی دھن ایک کثیر تعداد کو کیمونسٹ انقلاب پسندوں کے مقتضیات اور ہتھوڑا و درانتی میں جا پھنساتی ہے۔

ہماری نوزائیدہ تحریک کا دلچسپ انقلاب ان لوگوں سے تھا جو کیمونزم کے جال میں گرفتار ہو چکے تھے ہم اپنی تحریک کو مخلص اور متقی افراد کی تنظیم بنانا چاہتے تھے ہم تو اس تحریک میں ان لوگوں کو کھینچنا چاہتے تھے جو تشویش سے محفوظ تھے جو طبقوں سے محروم تھے اور جو ذہنی بیگانگی سے اور جو بے چین تھے ہم اپنی تحریک کو قوم کی بالائی سطحوں کی دسترس تک محدود نہ رکھنا چاہتے تھے بلکہ ہم تو اسے عوام کی گہرائیوں تک اتار لے جانا چاہتے تھے۔

قوم دو طبقوں میں بٹ چکی تھی!

اگر محض سیاسی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ۱۹۱۸ء میں صورت حال مندرجہ ذیل تھی قوم دو طبقوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک طبقہ جو کہ پہلے کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے کم تھا قوم کے تعلیم یافتہ عناصر پر مشتمل تھا۔ اس طبقہ میں وہ لوگ شامل تھے جو سیاسی جدوجہد کی رہنمائی کرتے تھے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تعلیم یافتہ طبقہ قوم کا بہترین معلوم ہوتا تھا لیکن

۱۹۱۸ء میں ایک حقیقت کو صاف طور پر تسلیم کرنا تو لازمی تھا وہ یہ کہ جرمن قوم کی عظمت کو اس وقت تک بحال نہ کیا جا سکتا تھا۔ جب تک کہ پہلے بیرونی دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے قومی طاقت کو بحال نہ کر لیا جاتا۔ قومی طاقت کو بحال کرنے کے لیے دو چیزیں ضرورت اساسی کی تھیں۔ اگرچہ ہمارے کچھ پیشہ ور سیاست دان یہ کہتے رہتے تھے کہ اسلحہ کے بغیر قوم کی طاقت بحال نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ پختگی کے قوم کا عزم مصمم اور پختہ ہو جانا ایک وقت یہ بھی تھا جب جرمن قوم کے پاس کافی سے زیادہ فوجی اسلحہ تھے۔ اور وہ جو اس کے وہ اپنی حریت کی حفاظت سے قاصر رہے مہم یہ تھی کہ وہ ان قوتوں سے محروم تھے جو قوم ملت کے قلبی جذبے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جن میں اپنی دھن پر قائم رہنے کا عزم راسخ تھا۔ جب وہ جذبہ مفقود ہو جو انسانوں کو جنگ استعمال کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور یہ طاقت کا عزم مصمم پیدا ہوتا ہے تو بہترین اسلحہ بھی بیکار اور بے جان ثابت ہوتے ہیں۔ جرمنی اس کے پاس قوت مدافعت سے محروم ہو گیا تھا کہ اس کے پاس اسلحہ کی کمی تھی بلکہ قوت مدافعت سے جرمنی کی محرومی کا اصل باعث یہ تھا کہ اپنے آپ کو اسلحہ کر کے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے جرمن قوم کا عزم مصمم نہ تھا۔

آج کل ہمارے کیمونسٹ سیاستدان بالخصوص ہمیشہ اصرار کیا کرتے ہیں کہ ان کی پارٹی اور بے سود باتیں کرتے رہنے والی خارجی پالیسی اس بات کا ثبوت ہے کہ جرمنی کو غیر مسلح کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس خارجی پالیسی کو چلانے والے قومی غدار ہیں۔ اس قدر کے غدار اور بہانوں کا ایک ہی جواب ہے وہ جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں حقیقت حال اس کے عین برعکس ہے۔ آپ غیر مسلح ہونے پر اس لیے آمادہ ہو گئے تھے کہ آپ قوم پرستی کے دشمن ہیں۔ اور آپ کو قومی مفاد کی پروا نہیں۔ آج آپ لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ رنگے ہوئے کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس اسلحہ نہیں۔ آپ کا یہ دعویٰ بھی آپ کے تمام گزشتہ کی

طرح الجھا ہوا ہے۔ اور صحیح معنوں میں اسے سلجھانے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ دولت مند اور قدامت پرست پوری دنیا میں بھی بالکل ویسے ہی سرمایہ کے متعلق ہیں جیسے کہ کیمونسٹ سیاست دان۔ یہ لیبر کی دلیل بزدلی کا نتیجہ ہے کہ جونہی یہ جون ۱۹۱۸ء میں برسر اقتدار آ گئے تھے وہ اسے مسلح کرنے میں کامیاب ہو گئے قدامت پسند سیاسی لیڈر جب کہتے ہیں کہ انہیں جرمنی کے مسلح کر دیئے جانے کے باعث ذرا مصلحت اندیشی وہ وغیرہ وغیرہ بزدلی کی پالیسی اختیار کرنی پڑی تو اس کا بھونڈا جواز پیش کرنے کے پیچھے اس کے پاس کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ دراصل یہ جواز پیش کرنے کے حق دار ہیں۔ یہاں بھی حقیقت حال ان کے بھونڈے بیان کے برعکس ہے۔ جرمنی کا غیر مسلح کیا جانا ان لوگوں کی جرأت کا نتیجہ تھا۔

بزدل کے پاس بندوق وہ کام نہیں کرتی جو بہادر کے ہاتھ میں نہیں دے جاتی ہے

اندریں حالات جرمنی کی طاقت کو بحال کرنے کے مسئلہ کا مطلب یہ نہیں کہ اسے غلامی کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے جو قوم کو اسے استعمال کرنے کے قابل بنا دے۔ جب ایک دفعہ قوم اس جذبہ سے سرشار ہو گئی تو ایک ہزار ایسے راستے تلاش کر لیے جائیں گے جن میں سے ہر ایک کو با آسانی عملی جامہ پہنانے پر منتج ہو گی۔ برعکس اس کے ایک بزدل چاہے اس ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اور اس پر کوئی دوسرا مسلط کر دے تب بھی وہ ایک گولی نہ چلائے گا۔ بزدل کے ہاتھ میں بندوق بھدا کاٹھ ہو جاتی ہے اور جو اسے رکھنے والے کے ہاتھ میں دلیل بھی کام دے جاتی ہے۔

قوم کی سیاسی قوت کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے پہلے یہ ضروری تھا۔ کہ قومی ملت کا جذبہ ایک مرتبہ پھر بیدار کیا جائے۔ اس جذبہ کو بیدار کرنے کی دیگر وجوہات نظر انداز بھی کر دی جائیں تو بھی یہ کافی ہے کہ قوم یہ محسوس کرتا ہے کہ سیاسی غلامی کی پالیسی میں ہر

قدم پیدا کیا جاتا ہے اور کسی سلطنت کی حیثیت سے متعلق رائے قائم کرتے وقت ہر ذی ہوش حکومت یہی سوچتی ہے کہ اس سلطنت کی عسکری قوت مدنظر رکھنی چاہئی ہے۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اس سلطنت کے پاس اسلحے کی کتنی مقدار کس قدر ہے جب یہ فیصلہ کرنا ہو کہ آیا کوئی قوم حلیف بنانے کے قابل ہے یا نہیں تو اس فیصلہ کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے جو ان ہتھیاروں کے ایثار کو دیکھ کر لگایا جاتا ہے جو حفاظت کے مرد میدان ہوتے ہیں آخر پر انحصار ہوتا ہے انسانی شجاعت پر انحصار رکھتا ہے۔ کیونکہ ہتھیاروں کے توڑنے تو ہم حلیف نہیں بن سکتے مردوں کے حلیف تو مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر جارحانہ قوم پر کامیابی حلیف لگی جاتی ہے اور اس وقت تک لگی جاتے گی جب تک کہ جارحانہ عوام کا جذبہ حریت اور جارحانہ حکومت کی عسکری صلاحیت برقرار رہے۔ انہیں خصلتوں کے طفیل ہر جارحانہ جنگ میں ایک دفعہ ہتھیار ڈال دے کر جاپان جنگ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے کتنی ہی شدید قربانیاں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں کسی قسم کے دباؤ کیوں نہ استعمال کرنے کی نوبت آجائے جب تک فتح نصیب نہ ہو تب تک ہر جاپانی اس جنگ سے دستبردار نہیں ہوتا جو عسکری لحاظ اور حربی الحقیقت موجود ہوں اگر ان کی مقدار دوسری قوموں کے مقابلہ میں قطعاً ناکافی ہو تب بھی ہر جاپانی اس جنگ سے دست بردار نہیں ہوتا۔ جو عسکری لحاظ اور حربی الحقیقت موجود ہوں اگر ان کی مقدار دوسری قوموں کے مقابلہ میں قطعاً ناکافی ہو تب بھی ہر جاپانی کی اس روش میں فرق نہیں آتا۔

اگر ایک دفعہ یہ کہہ دیا جائے کہ جرمنی کی جارحانہ کامیابی قوم کے جذبہ حریت کے طفیل ہے تو پھر ہم صاف طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف اس جذبہ کو اپنے ساتھ شامل کرنا کافی نہیں جو پہلے سے قوم پرست ہیں بلکہ وہ عناصر جنہیں جبراً قوم پرستی سے منحرف ہو چکے ہیں ان کے عقیدے بدل کر انہیں از سر نو قومی اصولوں کا قائل کرنا بھی لازمی ہے۔

جدید تحریکوں کو صرف عوام کی پشت پناہی کامیاب بنا سکتی ہے

ہماری تحریک ابھی نورانیہ تحریک تھی۔ ایک اس قسم کی تحریک کو جو ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی ہو، ان سطحات کو ایک مرتبہ پھر مطلق العنان بنانے کے خواب دیکھ رہی ہو اپنی عملی کوششوں کا نقش تیار کرتے وقت عوام الناس کی حمایت حاصل کرنا اپنا خاص الخاص مقصد رکھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک پیچیدہ حالات بالکل کامل ہیں۔ ان کا قوم پرستی کا جوش ایسا ضعیف ہے کہ وہ کسی قوم پرستی کی خاطر کسی حالت میں داخلی یا خارجی پالیسی کا اتنے کر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ترکوں کا کام چاہے جو کچھ نہایت تنگ نظر ہے۔ اگر کامیابی سامنے نظر آ رہی ہو تو پھر شاید یہ لوگ عدم تعاون کی تحریک کا بھی مقابلہ کر لیں۔ ایسا ہونے کے زمانہ میں یہ ہوا تھا۔ لیکن ان کی ضرب المثل بردباری کے باعث ان سے کبھی کسی عملی اقدام کا ظہور ہو ہی نہیں سکتا۔

برعکس اس کے ہمارے عوام کی اس کثیر تعداد ہی کی طبیعت بالکل مختلف واقع ہوئی ہے۔ وہ اپنی جبلی سادہ فطرت کے سبب تعدد کی تنقیص قبول کرنے پر آسانی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے قلیل سیاسی ہیں سیاسی فکر زیادہ وحشی اور مشتعل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں خامیاں مل کر ترکی حکومت کو ہلاک کرنے کی سی کوشش کر لیں گی۔

اس سے پہلے انہوں نے اسی طرح ترکی فوج پر حملہ کر کے اسے برباد کر دیا تھا۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منظم عوام کی یہ طاقت ہمارے موجودہ پالیسی کے حامل حکومت کو استعمال کر کے بیرونی خارجی پالیسی کو قوم پرستی کے خطوط پر چلنے سے روک سکتی ہے بلکہ ترکی کی سیاسی قوت کی بحالی کے راستہ میں بھی رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ جب تک حکومت کی سیاسی قوت بحال نہیں ہوتی تب تک غیر ممالک میں ترکی کی عظمت کا شعلہ دوبارہ کس طرح جلایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ملک مناسب ہتھیاروں سے محروم ہے۔ ترکی قوم کی صفوں میں ڈیڑھ کروڑ کیمونسٹوں کی جمہوریت پسندوں کی

ہستیوں اور اعتدال پسندوں کے وجود سے ہماری حکومت کس طرح مجبور ہو رہی ہے
اس کا احساس صرف انہیں تک محدود نہیں۔ غیر قوموں کو بھی ہماری حکومت کی ان
مجبوریوں کا علم ہے۔ جب یہ قومیں تجارتی کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لیے مسئلہ پر غور
کرتی ہیں تو اس کا صحیح نتیجہ اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک ہماری ان مجبوریوں کو بھی مدنظر نہ رکھا جائے
اور ایسی سلطنت کے ساتھ کون اتحاد قائم کرتا ہے۔ جس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ
سرے سے کسی مستقل اور پائیدار تجارتی پالیسی کے قیام ہی کا مخالف ہے۔ وہ مخالف نہیں تو
کم از کم اس کے ساتھ تعاون پر بھی آمادہ نہیں۔

گھر سے باہر اقتدار حاصل کرنے سے پہلے گھر کے اندر اتحاد قائم کرنا
ضروری ہے

صورت حال اس لیے بھی بدتر ہوتی جا رہی تھی کہ جو دیسی ہاتھوں قوم سے
غداری کی مرتکب ہوئی تھیں ان کے لیڈر اب ہر ایک کوشش کی مخالفت کر رہے تھے جو
تجارتی کی حکومت کو بحال کرنے کی خاطر ہو۔ اس مخالفت سے ان کی غرض سوائے اس
کے کچھ نہیں کہ وہ اس موقع پر ایک واقعہ فاضل ہو چکے ہیں ان میں علیحدہ ہونے پر
آمادہ نہیں۔ انسان کی تاریخ میں قومیں کے تابع ہے ان کی رو سے کبھی ممکن نہیں کہ جو
لوگ سلطنت کی تباہی اور زوال کا باعث تھے اور جو یہ تباہی لائے ان سے انتظام حاصل
کیے بغیر کبھی وہ قوم اس مقام پر پہنچ سکے جہاں وہ پہلے تھی۔ آئے والی نسلیں ہمیں
۱۹۱۸ء کے انقلاب کو صرف ایک حادثہ ہی سمجھیں گی بلکہ ملک کے حق میں غداری بھی
قرار دیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سرکار کی طرف داری اور سیاسی اکثریت کو دوبارہ حاصل کرنے سے
قبل قوم کے اندر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا لازمی تھا۔ یہ متحدہ محاذ صرف اسی طرح قائم ہو
سکتا ہے کہ عوام کو ان ذرائع سے اپنے حقوق کا تحفظ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

آئینی و سائل اور ذرائع کے [illegible] جانب بھی تجارتی کو دیں غلامی

کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن عوام کی اکثریت انسان محض اپنے سیاسی عقائد کے باعث قوم کی ہر قسم کی اصلاح کے مخالف ہیں۔ ان کا مقابلہ ذرا زیادہ مشکل ہے کم از کم اس وقت تک ان کا مقابلہ ممکن نہیں جب تک ان کی مخالفت کی اصل بنیاد یعنی ان کا قومی مفاد کے تصور پر غلبہ حاصل نہیں کر لیا جاتا اور عوام کے دل و دماغ کو اس زہر سے پاک نہیں کر دیا جاتا۔

اکثریت ایک قوم اور سلطنت کے اپنی آزادی واپس کرنے کے امکان پر جب ہم کسی زاویہ نگاہ سے غور کریں۔ تو ہمیں جنگ میں سرفروشی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھیں۔ ہر طرف سے ایک ہی شرائط کی ضرورت یکساں محسوس ہوتی ہے۔ وہ شرط اول یہ ہے کہ پہلے قوم کے عوام کو قومی حریت و استقلال کا حامی بنایا جائے۔

غلام کوئی ترقی بھی کر جائے تو اس سے غیر ہی فائدہ اٹھاتے ہیں

اگر ہم عوام کی آزادی حاصل نہ کر سکے تو خالی اصلاح کے لیے ہر کامیاب قدم سے بھی سوائے اس کے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ جو قوتیں آج قوم کی کوشش کو اپنے مفاد کے لیے خطرہ قرار دے کر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خواہاں ہیں۔ ان کی خدمت کے لیے ہم اپنی مال تیار کرنے کی استعداد میں کچھ اضافہ کر لیں گے۔ ہر کام کرنے کی اصلاح سے ہم جتنا زیادہ مال و اسباب پیدا کریں گے وہ ہمارے نہیں غاصبوں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔ اگر ہم کوئی معاشرتی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو زیادہ سے زیادہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم مزدوروں کی صناعت کی پیداوار میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ اس اضافہ کا فائدہ بھی غیر ہی اٹھائیں گے۔ اس دوران قوم کوئی اخلاقی ترقی بھی نہیں کر سکتی کیونکہ اخلاقی ترقی کا تو سیاسی آزادی اور کسی قوم کے اساسی وقار سے گہرا تعلق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قوم کی مستقبل کا کوئی بھی نقشہ عمل اس وقت تک تلاش کرنا ممکن نہیں جب تک کہ قوم کے عوام کو قوم پرستی کے اصول کا حامل نہ کر لیا جائے۔ جو تحریک صرف وقتی ضروریات پوری کرنے کی متحمل نہیں بلکہ اس کے ہر عمل اور ہر حرکت کا

فیصلہ کن مسئلہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک قوم کے عوام کو قوم پرستی کے اصولوں کی تعلیم دینا اہم ترین اور مقدم ترین فریضہ ہوگا۔

ہمیں ۱۹۷۰ء میں ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہماری تحریک کا اولین اور اہم ترین مقصد عوام میں قوم پرستی کا رنگ چڑھانا ہوگا۔ جب ہم نے ایک دفعہ یہ فیصلہ کر لیا تو پھر اس مقصد کی تکمیل کے تقاضوں کے ماتحت کئی کٹھن منزلوں کی نشاندہی ہمارے کندھوں پر آ پڑی۔

(۱) عوام کو قوم کی اقتصادی بہبود کا خاطر خواہ انتظام کرنے کے لیے جو معاشرتی قربانی کبھی دینی پڑے تھوڑی ہے۔

قومی استحکام کی خاطر اقتصادی قربانیاں مہنگی نہیں!

قومی اقتصادیات کے میدان میں مزدوروں کو آج جتنی مراعات بھی دی جائیں جب ان کا مقابلہ ان فوائد سے کیا جائے جو ان مراعات کے باعث ساری قوم کو حاصل ہوں گے تو ان فوائد کے مقابلہ میں یہ مراعات بالکل ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔ ہاں شرط صرف یہ ہے کہ ان مراعات سے قوم کے عوام ایک مرتبہ پھر آغوش ملت میں واپس آ جائیں۔ بدقسمتی سے ان آقاؤں اور مالکوں میں ملک نظری اور کم نگاہی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہی وہ خصلتیں ہماری قوم کو پنپنے سے باز رکھتی ہیں کہ دور اندیشی کی نظر سے دیکھا جائے تو جب تک مزدوروں کی اکثریت کے اندر قومی احساس قائم نہیں ہو جاتا جب تک نہ کسی قسم کی اقتصادی ترقی ممکن ہے۔ اور نہ نفع ہی کمایا جا سکتا ہے۔ مزدور قوم آخر عوام ہی کی اکثریت کا دوسرا نام ہے۔

مزدوروں کی تربیت جن خطوط پر ہونی چاہیے اس میں طبقہ وار کشمکش دکھانے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی ہوتی ہے جو مزدوروں کا رجحان دائرہ نفع کے اندر لے آتے ہیں۔ مزدوروں کی بہبود ہو لیکن ان کے خلاف ہڑتال کا ہتھیار استعمال کر کے نہیں بلکہ دوستانہ طریق سے تاکہ مزدوروں کے مطالبات منظور کرانے میں کامیاب ہو جائیں

گراں کے ساتھ ہی ساتھ پڑوسی ملکوں کے حملوں کی طرح قومی وقار کی خاطر بھی
ہی تڑپ سے سرشار ہو جائیں جس طرح اپنے مقابلہ ہونے کے لیے تیار ہوتی
ہیں اگر وہ اپنے وطن کے تحفظ کے لیے قاصر نہیں تو پھر ہم جنگ میں ناکام نہ
ہوتے۔ جب فتح کی زبردست خواہش کو پیش نظر رکھا جائے تو بڑی سے بڑی اقتصادی
مراعات بھی کبھی حقیر اور معمولی دکھائی دیتی ہیں جو قریب ترین مزدور کو ترین قوم کے
آغوش میں واپس لانے کے لیے کام کی جائے اسے صاف صاف اور قطعی طور پر سمجھ لینا
چاہیے کہ ایسے معاملات میں اقتصادی قربانیوں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہاں شرط
یہ ہے کہ یہ اقتصادی قربانیاں کسی ایسے طبقہ کے لیے نہ ہوں جس سے قومی اقتصادی کی مرکزی
خودمختاری یا استحکام ہی خطرے میں پڑ جائے۔

(۲) عوام کو قوم پرستی کی تعلیم براہ راست نہیں دی جا سکتی۔ عوام کے اندر قوم پرستی کا
جذبہ پیدا کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ ان کے معاشرتی حالات کی اصلاح کی
جائے۔ معاشرتی اصلاح سے ہی وہ اقتصادی حالات پیدا کیے جا سکتے ہیں جن کے طفیل
قوم کا ہر فرد قوم کی خوشحال زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہو سکتا۔

عوام تذبذب سے اچھا اثر قبول نہیں کرتے طاقت سے مرعوب
ہوتے ہیں

(۳) عوام کو قوم پرستی کے جذبہ سے روشناس کرانا ہو تو ہوا ہوائے اقتصادیات سے
کبھی کام نہیں چلتا۔ ہوائے اقتصادیات سے مراد یہ ہے کہ محض قوم پرستی کی مادی مدد کی
بھاری بھرکم رقم پیش کر دینے پر اکتفا کی جائے یہ کام تو اسی صورت میں ممکن ہے اگر دل
کا کنول اور طبیعت کی شگفتگی کے اس منزل کی جانب بڑھتے چلے جائیں جہاں پہنچنا ہے
غرض قوم پرستی کا جو مفہوم ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کے نزدیک قوم پرستی میں تو کچھ
مطابقت نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے بہت کچھ گڑبڑ کر رکھی ہے قوم پرستی کے
معنی ہیں غیر مشروط بے تابانہ اور جوشیلی قوم پرستی یہ ہے کہ وہ بھی کاٹ سکتا ہے۔ یہ سوال تو

کم ہمت کرتے پیچھے طبقات میں ہی قائم پایا جا سکتا ہے کہ ''آئینی بادشاہت'' پر مائل خوش رہیں یا دوسروں سے بھی تقید کیا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کے عوام بہر حال جدید نہیں ہوتے۔ عوام کو باریک خیالوں سے دلچسپی وابستگی شناسائی ہوتی ہے۔ عوام کے میلانات جذبات پر منحصر کرتے ہیں۔ عوام کی رائیں اور بھلائیں دلوں کی جڑیں جذبات سے پھوٹتی ہیں۔ عوام پر صرف طاقت کے اظہار کا اثر ہوتا ہے۔ طاقت کا اظہار صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب یا تو صاف صاف کسی کی حمایت کی جائے یا مخالفت کی جائے۔ عوام پر کبھی ایسی ادھوری روش کا اثر نہیں ہوتا۔ نہ تو مخالفت اور حمایت کے بین بین نہ دو طرفہ ہو چونکہ عوام کا میلان جذبات پر انحصار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کے کسی حامی و مخالف ہو سکیں تو پھر حیرت انگیز انتقامات سے اپنے فیصلہ پر ڈٹے رہتے ہیں۔

یہاں سے پیدا ہونے والا جذبہ ہمیشہ ظلم سے پیدا ہونے والے جذبوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس سے احترام مٹ جاتا ہے۔ لیکن خوف سے محبت کو فرق نہیں ہوتی۔ اختلاف رائے ختم ہو جاتا ہے لیکن نفرت مشکل ہی دور ہوتی ہے۔ اس کے عوض پہنچنے کی زبردست خواہشات رکھنے ہوتے ہیں ان کو پیدا کرنے والی طاقت کبھی بھی بحث و مباحثہ سے نہیں ہوتی۔ نہ ہی کسی علمی دلائل سے عوام کو کبھی متاثر کیا جا سکا ہے۔ وہاں جوش عقیدت سے لبریز ہو کر عوام ہمیشہ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں۔ ایسا ہی اوقات عوام کو میدان عمل میں دھکیلنے والا یہ جوش عقیدت جنون کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جو کوئی عوام کے دل میں گھر کر لینے کا خواہاں ہو اسے چاہئے وہ ہونی تلاش کر لی چاہئے جس سے عوام کے دلوں کے دروازے کھلتے ہیں وہ دروازہ جو کا پیدا یاد کرنے سے عوام کے دل کا قفل کبھی نہیں کھولا جا سکتا۔ بلکہ عزم صمیم سے عوام کو ضرورت ہو تو طاقت سے کام لے کر یہ قفل ہمیشہ کھولا جا سکتا ہے۔

عوام طبقہ انتہا پسند ہوتے ہیں

(۴) عوام کو صرف اسی صورت میں قابو کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ تحریک کی قیادت کر رہے ہیں وہ پہلے سے طے کر لیں کہ وہ صرف اپنے مقاصد حاصل کر کے رہیں گے چاہے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی بھی دیں گے۔

جب عوام دیکھتے ہیں کہ کسی فریق نے اپنے حریف پر زبردست حملہ کر دیا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبردست حملہ تو ضرور حق پر ہی ہوگا۔ لیکن اگر حملہ آور ناکام ہو اور اپنی کامیابی سے بھرپور فائدہ نہ اٹھائے کہ جس سے مدمقابل کو بالکل ختم کر دے تو پھر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس حملہ آور کو ضرور اپنی سچائی میں شک ہے۔ یعنی کسی تو حملہ آور کے مذہب سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا جاتا ہے کہ ضرور اس کے دامن میں کھوٹ شامل ہوگا۔

عوام بھی تو آخر فطرت ہی کا ایک جزو ہیں۔ قدرت نے عوام کے جذبات کی ساخت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ ادھورے دشمنوں کو اپنی صفوں میں مصافحہ کرتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاقت ور کمزور پر غالب آ جائے یا کمزور غیر مشروط طور پر طاقت کی اطاعت قبول کر لے۔

اگر عوام پر قوم پرستی کا رنگ چڑھانا ہے تو یہ کوشش صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب عوام کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینے کی خاطر قیمتی جدوجہد کی جائے۔ اور جو شیطان عوام میں بین الاقوامی تعلقات کا زہر پھیلا رہے ہیں ان کا کام ہر حالت میں تمام کر دیا جائے۔

(۵) آج کل جن مسائل کو بڑے بڑے مسائل سمجھا جا رہا ہے وہ درحقیقت وہ سب وقتی مسائل ہیں۔ ان مسائل کے پس پشت جو گہرے اور وسیع اسباب کام کر رہے ہیں ان اسباب کی تہہ میں بھی ایک بڑا سبب ایسا ہے جو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہ بڑا سبب اس مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے کہ قوم کی نسل کو کس طرح پاک رکھا جائے۔ انسان کی خوشحالی یا انحطاط کا انحصار اسی پر ہے۔ جو قومیں اپنی نسل کی اہمیت سے واقف نہیں یا اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی پروا نہیں کرتیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی

کسی دلیل یا دلیری کے سے عمل ہو رہے کے دلیری کے کام لیا جا ہے۔ وہ نہیں ہوتے کہ دلیری کے کی چیز رقم کی ہو ہو تو کسوں کی مدعا ہے ہو لے کی استعداد ہو ہو ہیں مصلحتیں ہیں جو کسی قسم کی نزاہت سے نہیں کھائی جا سکتیں۔ جو قوم اپنے کسی لوں کو پاک نہیں رکھ سکتی وہ اس طرح اپنی قوم کے روحانی اتحاد کو پارہ پارہ کر سکتی ہے جب روحانی اتحاد برباد ہو گی تو اس اتحاد کی بنیادوں پر تعمیر ہونے والی تمام عمارت بھی تباہ ہو جاتی ہے جس سے یہ دنیا کو اس اتحاد کے کرشمے نظر آ سکتے ہیں۔ جب کسی قوم کے لوں میں ملاوٹ ہو جائے تو قومی کردار میں فتور پیدا ہو جاتا اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ کسی قوم کی روحانی اور اخلاقی استعداد میں جب کبھی کوئی انحطاط آتا ہے وہ دراصل نسلی انحطاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اگر ہم نے جن قوموں کو کمزوریوں اور عادتوں سے نجات دلانی ہے جو جن کردار کی بنیاد نہیں تو ہمیں سب سے پہلے ان کی نسلی تراکیب سے نجات حاصل کرنی ہو گی جو قوم کے جسم کے اندر باہر سے گھس آئے ہیں اور تمام کمزوریوں اور عادتوں کا سرچشمہ ہیں۔

جس قوم کی عظمت اس وقت تک بحال نہ ہو گی جب تک نسلی مسئلہ کا احساس بیدار نہیں ہو جاتا اور یہ مسئلہ حل نہیں کیا جاتا۔ نسلی مسئلہ صرف بین الاقوامی تحریک کو سمجھنے کی کلید ہے بلکہ اس کی مدد سے ہر نوع انسانی کے تمدن کی کنہ کو بھی پایا جا سکتا ہے۔

قوم پر حق سے قبل محروم طبقات کی دلجوئی لازم ہے

(۲) ہماری قوم کے جو افراد اس کل میں اقتدار کی جان میں پھنس چکے ہیں جب ہم ان کو قوم کی آغوش میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کوشش کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم ملک پیشہ وروں اور وکالت کاروں کے روحانی علالت کرنے کا اصول ترک کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ملک اقتدار کی ہر روحانی کاروبار کی مخالفت میں جو بھی مخالفت پایا جاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قوم کو بھی اسی طبقہ میں بانٹ دیا جائے۔ یہ

باہم سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں یا تین سال کا کام نہیں۔ یہ محنت کی پشتوں تک جاری رکھنی پڑے گی جیسا کہ بیسویں صدی میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

کمیونسٹ اور سرمایہ دار دونوں قوم کے خیر خواہ نہیں

آج کل کے مزدور کو قوم کے آغوش کے اندر واپس لانے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ نہیں کہ وہ دوسرے مزدوروں کے مفادی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ وہ بین الاقوامی اقتدارات ہیں جن کا رنگ اس پر چڑھ چکا ہے۔ دراصل یہ بین الاقوامی اقتدارات قوم پرستی اور وطن پرستی کے دشمن ہیں۔ قوم اور وطن کی پیدائشی مزدوروں کے لیڈروں نے پیدا کی ہے۔ اگر یہ لوگ قومی وفاداری کے جذبہ سے سرشار ہوتے اگر ان کی معاشرتی جدوجہد میں ہمیشہ قومی مفاد مدنظر رہتے تو پھر زیادہ تر نہیں لاکھوں مزدوروں کو قوم کے بہترین فرزند بنا دیتیں۔ ایسا کرنے سے ان زیادہ تر نہیں کی اس جدوجہد میں کچھ فرق نہ آتا جو وہ اپنے اقتصادی مطالبات کو منظور کروانے کے لیے جاری رکھتیں۔

جو تحریک بچے کھچے مزدور کو قوم کے آغوش میں واپس لانا چاہتی ہے اور اسے بین الاقوامی حیثیت کے پنجے سے نجات دلانا چاہتی ہے اس کا فرض ہے کہ محض ایسے مطالبات کے لئے جنگ سرگرمی سے عمل جاری کرے جو کارخانہ داروں میں پھیل چکے ہیں ان مطالبات میں سے ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ قومی مفاد کے پیش نظر مزدوروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام اقتصادی حقوق کو قربان کر دیں۔ اگر مزدور اپنے منصفانہ اور ضروری حقوق حاصل کرنے کے لیے بھی مطالبہ کرے تو وہ قوم سے بغاوت کا مجرم ہوگا۔ اس قسم کے خیالات پھیلانے والے لوگ، کل جھوٹے ہیں قوم کے مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ ایک ہی فریق پر ساری ذمہ داریاں ڈالی جائیں اور دوسرے فریق پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔

اگر کوئی مزدور رہنما اپنی رائے سے مبالغہ آمیز مطالبات پیش کرتا ہے، مشترکہ مفاد کا

حاظ نہیں رکھتا، یہ قوم کے اقتصادی نظام کو قائم رکھنے کی پروا نہیں کرتا تو یقیناً وہ قوم کا مجرم ہے لیکن جو کارخانہ دار اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے غلط طریقے استعمال کرتا ہے قوم کے مزدور پیشہ طبقہ کا حق وا نہیں کرتا، مزدوروں کا خون پسینہ بہا کر کروڑوں کماتا ہے اسے بھی تو قوم کا مجرم خود غرض ہی کہا جا سکتا۔

ایسے کارخانہ دار کو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو قوم پرست کا لقب دے سکے۔ وہی اسے قوم پرستی کا پرچار کرنے کا حق ہے، وہ تو ایک بے اصول خود غرض ہے جو اپنے اطمینان کے لیے کام کر رہا ہے اور ایک ایسے فساد کی بنیاد رکھ رہا ہے جو ہی وہ ملک کے حق میں مضر ثابت ہوگا۔

سب سے پہلے تو ایسی تحریک کو اس خزانہ میں سے ممبر بھرتی کرنے میں وہ مزدوروں پر مشتمل ہے عوام کو یہ واقفیت انہوں کے پیچھے سے جانا اور اس تحریک کا فرض ہے۔ اس تحریک کو سب سے پہلے مزدوروں کی معاشرتی حالت درست کرنی چاہیے ان کا ایک خاص معیار قائم کرنا چاہیے اور انہیں قوم کا ایک اہم رکن ہونے کا احساس دلانا چاہیے تو قوم ہی ہے اور خدمت قوم کے جذبہ سے سرشار ہو۔

کھاتے پیتے لوگ سیاسی لحاظ سے مفلوج ہیں

اگر قوم پرست تعلیم یافتہ طبقات میں سے بعض ایسے افراد ڈھونڈ لے جو کہ جنہیں ہی پی عوام سے محبت ہو، جو شوق سے قربانی کے مشغلہ کی آگ لگائے بیٹھے ہوں اور ساتھ ہی اس جدوجہد کی ہدایت بھی کر سکتے ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کے دلوں کو پاک صاف میں کر لیا جائے تو ایسے افراد کو تحریک کی جانب سے خوش آمدید کہتے ہوئے پہلی صفوں میں جگہ دے دینی چاہیے ایسی تحریک اپنے اراکین ہرگز ان کھاتے پیتے رئیسوں میں سے بھرتی نہیں کر سکتے جنہیں یہ علم ہے کہ اگر اس تحریک نے ایسا کیا تو اس میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد دکھس آئے گی جن کی ذہنیت عوام کی ہمدردیاں حاصل

کرنے کی جدوجہد منظم کر سکے، کھڑا کر دے گی۔ دنیا کی تاریخ میں یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اگر قوم کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کو ایک ہی تحریک میں جمع کر دیا جائے تو عوام کا اثر بہت اچھا ہوگا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اگر پکے کھاتے پیتے لوگوں پر ایک نظریاتی تحریک کے اثر کا سکتا ہے، ان کو جوش میں لایا جا سکتا ہے، عام مطالبوں سے ان کو تحریک کے مقصد کا شعور بہت حد تک دلایا جا سکتا ہے لیکن ان کی روایتی خصلتیں نہیں بدلی جا سکتیں یہ دونوں عادتیں تو صدیوں سے ان کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ دونوں طبقات کے اخلاقی معیار میں تفاوت ہے اور معاشرتی و اقتصادی مسائل کے متعلق ان کی روش ایسی متضاد ہے کہ جس تحریک میں ان دونوں کو اکٹھا کر دیا جائے جب اس کا مطالبوں کے زور سے پیدا کیا ہوا جوش ختم ہو جائے گا تو پھر دونوں طبقات کا تخالف تحریک کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔

آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ اور ہر قوم یہ نہیں کہ دوسرے گروہوں کو راضی کرنے کی خاطر سے قوم کے مفاد کے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے۔ ہمارا پروگرام تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے گرد جمع کریں جو قوم کی بہتری کے خواہاں ہیں۔

ساری تحریک کے کاروبار کا نقشہ اسی زاویہ نگاہ سے تیار کرنا چاہیے۔

کسی عقیدہ کی تبلیغ سے پہلے اس پر پختہ یقین لازمی ہے

ہر تحریک کا پروپیگنڈہ کرتے وقت بھی ایک واضح اور صاف روش اختیار کرنی چاہیے اور کھلم کھلا ایک فریق کی حمایت کا اظہار کرنا چاہیے اس کے بغیر تو کوئی پروپیگنڈہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔

اگر پروپیگنڈہ سے تحریک کو کوئی فائدہ پہنچانا ہے تو اس کا خطاب صرف ایک فریق سے ہونا چاہیے اگر کوئی پروپیگنڈہ اپنی اپیل کا رخ بدلتا ہے تو ممکن ہے کہ ایک فریق اس کو سمجھ نہ سکے یا دوسرا فریق اس سے ناراض ہو جائے یہ بھی ہو جائے کہ یہ پروپیگنڈہ تو بالکل فیل یا اکارت ہو جائے اور پروپیگنڈہ دینے والے پر یہ ظاہر ہو کہ کن دو فریقوں کا یہ

ذکر ہے ان کی دلچسپی کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔

کوئی بھی بات جس اسلوب سے پیش کیا جاتا ہے اس کا بھی لوگوں پر مختلف اثر ہوتا ہے یہ باتیں دیکھنے میں چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت یہ معاشرتی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ان کا فرق بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اگر پروپیگنڈہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بچنے کی کوشش کرے اور عالمانہ انداز میں اپنا مطلب ظاہر کرے تو عوام پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ دوسری طرف اگر پروپیگنڈہ عوام کے عام جذبات کو ملحوظ اور ملاحظہ کا جامہ پہنا دے تو پڑھے لکھے طبقات اس کو پسند نہ کریں گے کیونکہ وہ کہنے کے پروپیگنڈہ تو بالکل بھونڈا اور سوقیانہ ہے جس لوگوں کو تقریر کرنے کی قابلیت کا زعم ہوتا ہے اگر ان میں سے دو آدمیوں کا جائزہ لیا جائے تو بمشکل ہی ایسے ہیں کے جو آج بھٹکیوں، دوہاروں اور گلیوں کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرکے سے قابل کہیں اور کل اسی مضمون کو اسی پراثر طریقہ سے پروفیسروں اور عالم لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔ بہرحال تو کوئی ہزار میں سے ایک ملے گا جو کسی ایسے مجمع کے سامنے تقریر کرسکے جہاں ایک ہی جلسہ میں دہاتی اور پروفیسر ملے جلے بیٹھے ہوں اور تقریر بھی ایسی طرح کرسکے کہ سب لوگ اس کے مطلب کو پورے طور پر سمجھ لیں۔ ایسی تقریر کا اندازہ یہ ہو کہ دونوں گروہوں میں جوش پیدا ہو جائے اور دونوں میں سے کسی کو بھی دل شکستہ یا ناراض نہ کرنا چاہیے کہ دنیا کے اکثر بڑے بڑے اور پیچیدہ عقیدے عوام کو اسی صورت میں سمجھائے جاسکتے ہیں جب ان خیالات اور عقائد کو عوام کے سامنے بیان کرنے کے لیے کسی معمولی واقعہ کے سلسلہ کی مدد بھی شامل حال ہو۔ عوام کو ایک عقیدہ سمجھانے میں اس بات سے بڑھ کر دلچسپی ظاہر نہیں کرتی کہ جس عالی دماغ والے انسان نے یہ نظریہ ایجاد کیا تھا اس کا درجہ کتنا بلند ہے عوام کو سمجھانے میں کامیابی کا انحصار تو اس پر ہے کہ کس نظریہ کے سلسلہ کہاں تک اسے عام فہم پیرایہ میں بیان کرسکتے ہیں۔

جمہوریت پر مقالوں اور کنونشنوں کی تحریکیں قوم کے عوام کو اس لیے کھینچنے میں

کامیاب ہو جاتی تھیں کہ یہ لوگ کن مسائل کو بیان کرتے ہیں عوام کے دل میں پہلے سے ان کے لیے ہمدردی موجود ہے ان کے جذبات جتنے سطحی ہوں اتنی ہی زیادہ آسانی سے عوام ان کا مطلب سمجھ سکتے ہیں اور اتنی ہی جلدی ان پر یقین بھی کر لیتے ہیں وجہ یہ کہ اس قسم کے جذبات عوام کی گھٹیا درجہ کی قابلیت کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہی مصلحتیں تھیں جن کو مدنظر رکھ کر ہماری نئی تحریک نے یہ صاف اور سادہ بیانی تصویری پروپیگنڈے کی پالیسی منتخب کی تھی۔

پروپیگنڈے کا پیغام اور اظہار بیان دونوں اس قسم کے ہونے چاہئیں جو عوام کے ذہن سے ہو لچے ہوں پروپیگنڈے کی قدر و قیمت کا اندازہ محض اس کی عملی کامیابی سے لگانا چاہیے اس جلسہ میں عوام جمع ہوں وہاں کی مقررہ کی کامیابی کا معیار یہ نہیں کہ اس کی تقریر حاضرین میں سے خاص تعلیم یافتہ لوگ ہی سمجھ سکیں بلکہ اچھا مقرر وہ ہے جو عوام کے دل تک میں گھر کر لینے کا گر جانتا ہو۔

پروپیگنڈے کا مقصد علمیت کا پھیلانا نہیں بلکہ قائل کرنا ہوتا ہے

اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی کسی جلسہ میں موجود ہو اور کسی تقریر میں محض اس وجہ سے نقص نکالے کہ تقریر کی علمی سطح اس کی اپنی قابلیت سے کم تھی گو اس نے جلسہ میں یہ بھی دیکھا ہو کہ اس تقریر کا اثر معمولی قابلیت رکھنے والے لوگوں پر بہت اچھا ہوا تھا۔ اس کو قائل کرنا اصل مقصد ہے تو یہ پڑھا لکھا آدمی اپنے اس رویہ سے غلط ثابت کرتا ہے کہ اس میں صورت حال کا اندازہ کرنے کی قابلیت قطعاً موجود نہیں اور اس لیے وہ کسی نئی تحریک کے لیے ہرگز مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ کسی تحریک کے لیے صرف وہی تعلیم یافتہ لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو تحریک کے پیغام اور مقاصد کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں کہ پروپیگنڈا کرتے وقت غلط پروپیگنڈے کی کامیابی کو روک سکیں اور کبھی کوئی پروپیگنڈا کریں کہ خود بڑھے لکھوں پر اس پروپیگنڈے کا اثر کیا ہوتا ہے آخر ہمارے پروپیگنڈے کا مقصد قوم

ہر شخص کا میدان رکھنے والے لوگوں کے لئے تلخی طبع کا سامان مہیا کرتا ہے تو کہیں یہ پروپیگنڈے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو قائل کیا جائے جو ہماری نسل سے ہیں اور ان کی رگوں میں ہمارا ہی خون دوڑ رہا ہے لیکن آج تک وہ قوم پرستی کے خلاف رہے ہیں خاص طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اپنی جدوجہد کامیاب بنانے کے لئے جس قسم کا پروپیگنڈہ کرنا ہے اور اس پروپیگنڈے کو عملی شکل دینے کے لئے جو طریقے اختیار کرنے ہیں ان کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں وہ اصول اور ضوابط پیش نظر رکھنے چاہئیں جن کی تفصیل اس کتاب کے ایک باب میں بیان ہو چکی ہے اس باب کا عنوان ہے "جنگ اور پروپیگنڈہ" ہماری تحریک کو بعد میں جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ فیصلہ صحیح تھا۔

سیاسی اصلاح حصول اقتدار کے بغیر ممکن نہیں

8 سیاسی اصلاح کی کوئی تحریک خواہ اسے کتنی ہی عظیم سے بڑھ کر اقتدار حاصل کر کے اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کامیابی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ سیاسی اقتدار ہی خود قبضہ کیا جائے جو وہ مقصد و جود میں کوئی انقلاب برپا کر دینا چاہتا ہے اس کا یہ صرف یہ حق ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ ان تمام ذرائع پر قابض ہونے کی کوشش کرے جو اس عقیدے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ثابت ہو سکتے ہیں اس دنیا میں جو شخص کامیاب ہوا ہے وہی سچا ہے اور جو شکست کھا جائے وہی جھوٹا ہے جب میں اس مسئلہ میں قدم کا نام لیتا ہوں تو اس سے میری مراد وہی قدم ہوتی ہے جو 1918ء میں اقتدار کے بھوکوں نے حاصل کرنی تھی ملک میں ہر مرد یک ایسی قدم ہوتی ہے جس سے ساری قوم کے مفاد کو تقویت پہنچے بعض کو زجر سے ان قانون دانوں کا یہ خیال ہے کہ جب انقلابی سرکار پر قابض ہو جائیں تو اس انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے کسی انقلاب کو اسی وقت کامیاب کہا جا سکتا ہے جب انقلاب کے بعد قائم ہونے والی حکومت کے ماتحت قوم کی حالت پہلی حکومت کے عہد کے مقابلہ میں بہتر ہو جائے اور

جس اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے انقلاب کا بیڑا اٹھایا گیا تھا وہ پورے ہو چکے ہیں
عام نمائندہ حکومت جس نے 1918ء کے موسم خزاں میں زاروں کی بے لگامی کو مسند
اقتدار سے معزول کر دیا تھا اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔

جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سیاسی اقتدار پر قبضے کے بغیر کسی اصلاحی تحریک کے عملی
مقاصد پورے نہیں ہو سکتے تو پھر ہر اصلاحی تحریک کے لیڈروں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ
روز اوّل سے ہی اپنی تحریک کو ایک عوامی تحریک بنانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے ایک
عوامی مجلس یا جلسے جلوس کا کلب یا ایسے جلوسوں کی انجمن بنا دیں ہوگا یہ تا کہ
کھیلے میں مل بیٹھتے ہیں۔

ہمارا طریقہ کار "عمرانی" ہے جمہوری نہیں

ہماری تحریک کی فطرت اور اس کا داخلی نظام متقاضی ہیں کہ یہ تحریک پارلیمنٹری
طریقہ کار کی خلاف ہوگی پارلیمنٹری طریقہ کار کا خالق ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہماری
تحریک کلیتہً عمل دونوں اداروں سے یہ اصول تسلیم نہیں کرتی کہ فیصلہ ہمیشہ اکثریت کے
حق میں ہونا چاہیے اور لیڈر کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ دوسروں کی رائے اور
ارادے پر عمل کرتا رہے ہماری تحریک کا اصول یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ سے
لے کر بڑے سے بڑے معاملہ تک ہر فیصلہ کا پورا اختیار اور کامل ذمہ داری کسی فرد کے
سپرد ہونی چاہیے۔

ہماری تحریک میں اس اصول کو تسلیم کرنے کے بھی نتائج حسب ذیل ہیں

ہر بڑے حلقہ کا صدر اپنے ماتحت قائدین کی جانب سے مقرر کیا جاتا ہے اس کے
بعد وہ اپنے حلقہ کا قائد بن جاتا ہے اور اس حلقہ کی جانب سے جو جلسہ وہ بھی ہوتا ہے
تمام کمیٹیوں قائد کے ماتحت ہوتی ہیں قائد کمیٹیوں کے ماتحت نہیں ہوتا کوئی کمیٹی رائے
شماری کی بنیاد پر کام نہیں کرتی کمیٹیاں محض اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ ان کے سپرد کوئی
خاص خدمت ہوتی ہے خدمت کے بعد تشکیل کمیٹی کا فیصلہ حلقہ کے صدر تک حاصل

ہوتا ہے ساری ذمہ داری قائد کے سر پر ہوتی ہے لیکن اصول بڑے حلقوں پر بھی عاید ہے مثلاً ضلع کا حلقہ شہر کا حلقہ دیہات کا حلقہ وغیرہ وغیرہ ہر حلقہ میں صدر کا تقرر بالائی قیادت کی جانب سے ہوتا ہے ہر صدر کو کامل تنظیمی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں صرف ساری پارٹی کا قائد اعلیٰ تمام ممبروں کے جلسہ عام کے ذریعہ چنا جاتا ہے وہ تحریک کا واحد قائد ہوتا ہے تمام کمیٹیوں اس کے سامنے جواب دہ ہوتی ہیں لیکن وہ کسی کمیٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا اس کا فرماں ناطق ہوتا ہے اس کے فیصلوں کی پوری ذمہ داری اسی پر ہوتی ہے تحریک کے ممبروں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ محسوس کریں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا قائد بہتر ہے تو اسے اس کے عہدے سے ہٹایا جا سکتا ہے پھر اس کی جگہ کوئی دوسرا قائد منتخب کر لیا جاتا ہے جسے وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور جسے وہی ذمہ داریاں اٹھانے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

تحریک کے ذمہ جو عائلی فرائض ہوتے ہیں ان میں سے ایک اہم فرض یہ ہے کہ قیادت کے اصول کو نہ صرف تحریک کی اپنی صفوں کے اندر نافذ کیا جائے بلکہ ہر کار اور حکومت کو بھی اسی اصول کا پابند بنایا جائے۔

جب کوئی شخص قائد مقرر ہوتا ہے تو پھر اسے جن زبردست اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور ان اختیارات پر کوئی قید و بند نہیں رہتی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے کندھوں پر بڑی سخت اور آخری ذمہ داری کا بوجھ بھی آ پڑتا ہے۔

جس شخص میں یہ جرأت نہیں کہ وہ اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے لیڈر بنایا جائے اس کام کا بیڑا وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو شجاعت کے سانچہ میں ڈھلا ہو۔

انسانیت نے آج تک جو ترقی کی ہے وہ انہی لوگوں کی بدولت کی ہے جن کی بنیاد رکھی ہے اس کا سہرا بھی عوام کے سر پر نہیں رہا یہ کارنامے ہمیشہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی قابلیت رکھنے

والا فرد ہی انجام دیتا رہا ہے اور ایسے کرشمے ہمیشہ کسی شخصیت کے مرہون منت رہے ہیں۔

اس اصول کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تحریک پارلیمنٹری سرگرمیوں کے حق میں نہیں اگر ہماری تحریک کبھی پارلیمنٹری اداروں کو چلانے میں کوئی حصہ لیتی ہے تو صرف اس غرض سے کہ ان اداروں میں شامل ہو کر ان کو اندر سے تباہ کر دیا جائے ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ پارلیمنٹری ادارے زوال انسانیت کی بدترین علامت میں داخل ہیں۔

سیاسی تحریک کو غیر سیاسی مسائل سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے

10 یہ تحریک پوری پابندی سے فیصلہ کر چکی ہے کہ کسی ایسے مسئلہ کے متعلق رائے ظاہر نہ کرے گی جو تحریک کے دائرہ کار سے باہر ہو یا جو ہماری نگاہ میں کوئی بنیادی اہمیت نہ رکھتا ہو ہماری تحریک کسی دینی اصلاح کی داعی نہیں یہ تحریک تو صرف قوم کو سیاسی لحاظ سے منظم کرنے کی خاطر قائم کی گئی ہے قوم کے اندر خود بخود بے شمار دینی فرقے پائے جاتے ہیں تحریک ان کو قوم کے وجود کا یکساں نمائندہ تصور کرتی ہے تحریک ان تمام پارٹیوں سے برسرپیکار رہے گی جو دین کو اس کے مروجہ سے ہٹانے والی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں دین تو قوم کے مذہبی اور اخلاقی نظام کی بنیاد ہے لیکن یہ لوگ دین کو اپنی سیاسی اغراض کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اگر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہیے کہ تحریک سرکاری نظام کی کوئی خاص ہیئت تشکیل قائم کرنے یا منانے کی خواہش مند نہیں بلکہ تحریک تو ان بنیادی اصولوں کو نافذ کرنا چاہتی ہے جن کے بغیر کوئی جمہوریت زیادہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے نہ کوئی ملوکیت تحریک نہ ملوکیت کے قیام کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور نہ جمہوریت کی تائید تحریک تو ان سرکار قائم کرنے کی ذمہ داری لے کر اٹھی ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ بالآخر اس ملک میں سرکار کی ہیئت تشکیل کیا ہو گی تو ہماری نگاہ میں اس مسئلہ کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو وقتی مصلحتوں

کے پیش نظر حل کیا جائے گا۔

جب کوئی قوم اس بڑے بڑے مسائل کا شعور حاصل کر لیتی ہے تو اس پر اس کی زندگی کا اور حقیقت انحصار ہے تو پھر اس قوم میں محض تعلیمی رسوم کی ادائیگی میں ہرگز کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔

قائد اور مقلدین کا رابطہ براہ راست ہونا چاہیے

11 جہاں تک تحریک کی اندرونی تنظیم کا تعلق ہے یہ کوئی سہل کا سوال نہیں جیسا مصلحت کا تقاضہ ہوگا اس کے مطابق تحریک کی تنظیم کر لی جائے گی

بہترین تنظیم وہ نہیں ہوتی جو تحریک کی قیادت اور اختیاری ذمہ داری کے مواقع بہت زیادہ سے حاصل کر دے تنظیم کی خوبی تو یہ ہے کہ کم سے کم مکانی واسطوں کے ذریعہ کام لیا جائے اس قسم کی تنظیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص عقیدہ جو کسی ایک شخص کے ذہن کی اختراع ہے بہت سے لوگوں تک پہنچا دیا جائے اور پھر اس امر کی نگرانی رکھی جائے کہ وہ لوگ کس طرح اس عقیدے پر عمل کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ چاہے کسی پہلو سے دیکھا جائے تنظیم ایک بری مصیبت ہے اس کے بغیر چارہ نہیں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ تنظیم محض مقاصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جب اس ذریعہ کو بجائے خود کوئی مقصد سمجھ لیا جائے تو نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔

چونکہ اس دنیا میں باشعور لوگوں کی نسبت بے شعور لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے تنظیم کی حقیقی روح کو پیدا کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں محض تنظیم کی ظاہری صورت قائم کر لینا آسان رہتا ہے کسی تنظیم کی روح ہمیشہ وہ لوگ قائم کرتے ہیں جن کی قیمت کے لیے تنظیم کھڑی کی جاتی ہے۔

جب کوئی عقیدہ اپنے آپ کو عملی شکل دینے کی منزل کی جانب سفر شروع کرتا ہے تو اسے عام طور پر راستہ میں حسب ذیل مدارج سے گزرنا پڑتا ہے اگر یہ کوئی اصلاحی نوعیت کا عقیدہ ہے تو پھر ان پر ان مدارج کا طے کرنا زیادہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے بہر کیف

عقیدہ پہلے کسی ایک شخص کے قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر وہ شخص محسوس کرتا ہے کہ مجھے یہ عقیدہ ساری دنیا میں پھیلانا چاہیے وہ شخص یہ عقیدہ دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے آہستہ آہستہ کئی لوگ اس کے پیرو بن جاتے ہیں اپنے حلقہ کے معاصرین تک وہ راست رہ کر دعوت پہنچانے کا بہترین طریقہ ہے اور سب سے زیادہ فطرت کی قریب بھی ہے لیکن جوں جوں تحریک کی ترقی ہوتی ہے اور مقلدین کی تعداد بڑھتی ہے تو بعد میں پیدا ممکن ہو جاتا ہے کہ جس عقیدے پر تحریک کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کا اصلی بانی خود شخصی طور پر ہی کسی مقلدین کے سامنے اس کی تبلیغ کرتا پھرے اور اس کے ساتھ ساتھ تحریک کی قیادت کے فرائض بھی سرانجام دے۔

تنظیم کے معنی کیا ہیں؟

جوں جوں مقلدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے توں توں تحریک کے قائد اور مقلدین کے مابین براہ راست بات چیت مشکل ہوتی چلی جاتی ہے قائد اور مقلدین کے مابین رابطہ برقرار رکھنے کے لیے کسی درمیانی واسطے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس طرح سے تحریک کے ابتدائی دور میں درمیانی رابطہ کا نظام بھی شامل ہو جاتا ہے یوں قائد اور مقلدین کے مابین براہ راست رابطہ ختم ہو جاتا ہے جو کہ ایسے رابطہ کی بہترین شکل ہے براہ راست رابطہ کی جگہ بے قائد اور مقلدین کے مابین تنظیم کا رشتہ شامل ہوتا ہے کیونکہ اس مصیبت کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا اس کے بعد کئی چھوٹے چھوٹے درمیانی حلقے بیچ میں شامل ہو جاتے ہیں اگر کسی بھی تحریک کو دیکھا جائے تو اس میں چھوٹے چھوٹے حلقوں کی مثال وہ مقامی تنظیمیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ آہستہ آہستہ تحریک کی تنظیم کی نشوونما ہوتی ہے۔

تحریک کا قبلہ مقرر کرنے کی اہمیت

کسی تحریک میں دلچسپی رکھنے والے اس وقت تک قائم نہ کر سکتے جب تک کہ تحریک کے روحانی بانی کے جو شرائط تقلید کا اصول تمام مقلدین میں مسلم طے نہ ہو جائے

ہوں نہ ہو ہے کہ تحریک کو تنظیمی اختلافات کے باعث نقصان نہ پہنچے اس
سلسلہ میں کسی جغرافیائی مرکز کو تحریک کا قبلہ عقیدت بنا دینے کی ضرورت ہے جتنا زور دیا
جائے کم ہے جب اس قسم کا کوئی مرکزی یا قبلہ قائم ہو جائے تو پھر اس کے گرد ایک
مدافعانہ کشش کا ہالہ کھنچ جاتا ہے مگر مقصد ہو رہنما کھوجنا ایسے ہی مرکز تھے ہے مرکز
سے تحریک کو چلانے کے لیے ایک مستقل قوت پیدا ہو جاتی ہے اس قوت کا سرچشمہ
تحریک کا داخلی تضاد ہوتا ہے اور اس تضاد کی نمائندگی ایک قائد کی اطاعت ہوتی ہے۔

جب کسی تحریک کے ابتدائی حلقوں کی تشکیل ہو رہی ہو تو اس وقت بڑی احتیاط سے
بار بار اس مقام کی اہمیت پر زور دیا جانا چاہیے جہاں تحریک کے نظام کی ابتدا ہوئی تھی اس
جگہ سے تحریک پہلے پہل شروع ہوئی تھی اور جہاں سے اس پر کنٹرول رکھا جاتا ہے اس کی
تخلیقی تجدیدی ہر نئی حرکت کا تعین چاہیے کہ اس مقام کی حرکت تحریک کی حرکت
کی سب سے بڑی علامت قرار دیا جائے۔ جوں جوں تحریک کے ابتدائی حلقوں کی تعداد
میں اضافہ ہوتا چلا جائے کہ ابتدائی حلقوں کے ہی ہر مرکز کے لیے درمیانی حلقے قائم
کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو ان تمام مرکز کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنا چاہیے۔

جب تحریک کے ارکین کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ پھر ان میں سے ہر ایک کے
ساتھ تحریک کے نظام کا مناسب رابطہ قائم نہ ہو سکے تو اس مرحلہ پر پہلی مرتبہ مقامی
مجلسیں قائم کرنی چاہئیں جب درمیانی حلقوں کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھ جائے تب
یہ ضرورت محسوس ہوگی کہ پہلے سے درمیانی حلقے قائم کیے جائیں ان کے ماتحت بیرونی
حلقے تشکیل ہو جائیں ایک سیاسی تحریک میں اس حلقہ وار تقسیم کی مثال صوبائی اور اضلاعی
حلقے ہوتے ہیں۔

اگرچہ تحریک کے اعلیٰ مرکز اقتدار کو ہر نچلے کے ابتدائی حلقوں پر قابو رکھنے میں
کوئی دقت پیش نہیں آتی لیکن تنظیم کے درمیانی حلقوں پر اقتدار قائم رکھنا بعد میں دشوار
مشکل ہو جایا کرتا ہے باوجود اس مشکل کے درمیانی حلقوں پر مرکز کا اقتدار قائم رکھنا

نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تحریک کا داخلی اتحاد برقرار نہیں رہ سکتا۔ یہی تحریک کے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

آخر کار، جب درمیانی واسطوں کی تمام داخلی تنظیمات کو ایک مرتبہ پھر بحال کر کے ان کے اوپر بالائے طبقے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان پر تحریک کے پہلے مرکز کا اختیار قائم رکھنا اور نہیں مرکزی حلقہ کا پابند بنانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحریک کا بانی کار معرف اس وقت نافذ کرنا چاہیے اور اسی حد تک نافذ کرنا چاہیے جتنا کہ تحریک کے مرکزی روحانی نظام اور اوتقارات کا اختیار مسلم ہو چکا ہو۔ سیاسیات میں مرکز کا یہ اختیار کبھی پوری طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ جب قوم پر تحریک کا یہ اختیار مکمل ہو چکا ہو۔ تنظیم کے مندرجہ ذیل اصولوں کا خیال رکھتے ہوئے تحریک کے داخلی نظام کے قیام کے لیے حسب ذیل قواعد وضع کیے گئے ہیں۔

الف۔ یہ کہ تحریک کی تمام انتظامی سرگرمیاں ایک شہر یعنی میونخ میں مرکوز کر دینی چاہئیں جو نظام سے قابل اعتماد مقلدین کا ایک دستہ تیار کرنا چاہیے اس کے بعد ہی ایک ایسے نئے مکتب خیال کی بنیاد رکھ دینی چاہیے جو بعد میں تحریک کے مقاصد کی تبلیغ کرنے میں مفید ثابت ہو سکے۔ بعد میں تحریک کو وسیع پیمانے پر چلانے کی خاطر پہلے میونخ میں اس کی مملکت کا مرکز بنانا چاہیے۔ یہ مملکت کا مقام اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے کہ میونخ میں تحریک کے جس قدر کارندے انجام دینے ممکن ہوں پہلے انہیں مکمل جامہ پہنا کر لوگوں کو دکھایا جائے۔ تحریک اور اس کے قائد کے نام اور کام کا پرچار کرنے کی خاطر صرف یہی ضروری نہیں کہ کیونکہ عقیدہ کا قابل شکست ہونے کا دعویٰ بعد ثابت کیا جائے بلکہ یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ دنیا میں کیونکہ عقیدہ کے علاوہ دوسرے عقیدے بھی ممکن ہیں۔

ب۔ یہ کہ مقامی تنظیمیں اس وقت تک قائم نہ کی جائیں جب تک کہ پہلے میونخ میں مرکزی قیادت کا اوتقار مسلم ہو اور صحیح طور پر نافذ نہ ہو جائے۔

ج یہ کہ اسلامی ملک قائم ہو جائے تو بھی اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک پہلے ان کے قیام کی ضرورت ثابت نہ ہو چکی ہو۔ شاخوں کا قیام اسی وقت عمل میں آنا چاہیے جب مرکزی قیادت کا حلقہ اثر مستحکم ہو چکا ہو۔

علاوہ ازیں تحریک کے عملی کارکن اس وقت قائم کیے جائیں جب ان میں کام کرنے کے لائق آدمی مل جائیں جو ایسے کاموں کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں۔

تحریک کی شاخیں قائم کرنے میں کیا مشکلات پیش آتی ہیں

اس مسئلہ کو دو طرح حل کیا جا سکتا ہے

ا۔ یہ کہ تحریک اتنی رقم جمع کرے جس سے قیادت کی اہلیت رکھنے والے ذہین آدمیوں کو تحریک کی جانب کھینچے اور پھر ان کو تربیت دینے کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ اس طرح سے تحریک ان اشخاص کو تیار کرے جن میں موقعہ کی مناسبت سے مطلوبہ قابلیت پیدا کر رکھتے ہوئے استعمال کیا جائے مسئلہ کا یہ حل آسان بھی ہے اور اس پر عمل بھی جلد ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہے لیڈروں کی یہ قسم تحریک کے لیے اسی صورت میں کام کر سکتی ہے جب پہلے ان کی تنخواہ کا انتظام کر دیا جائے۔

۲۔ یہ کہ تحریک تنخواہ دار عملہ رکھنے کے قابل نہیں اس لیے اعزازی کارکنوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے ظاہری طور پر یہ دوسرا حل مشکل بھی ہے اور اس میں دیر بھی زیادہ لگے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مختلف علاقوں میں ایسے ممبر پیدا نہیں ہو جاتے جو رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو مرکزی قیادت کی خدمت میں پیش کر دیں، اور یہ خدمات سرانجام دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں تب تک تحریک کے لیڈر ملک کے مختلف حصوں میں تحریک کی سرگرمیوں شروع کر دینے پر مجبور ہوں گے۔ رضاکارانہ خدمات کی پیش کش کا مقصد یہ ہوگا کہ متعلقہ علاقے میں تحریک کی تنظیم کرنے اور اس کی باگ ڈور سنبھالنے

ہے آمدگی ظاہر کی جائے ہو سکتا ہے کہ وسیع علاقوں میں ایک کوئی لیڈر نہ مل سکے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ بعض علاقوں میں ہو وہ نہیں تو اس سے بھی زیادہ ایسے آدمی مل جائیں جن کی قابلیت قریب قریب یکساں ہو۔ ایسی صورت میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اور انہیں رفتہ رفتہ مکمل ہونے کے بعد ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

تحریک کی کسی شاخ کے قیام کے لیے ہمیشہ ایک لازمی شرط یہ ہونی چاہیے کہ پہلے کوئی ایسا آدمی اکٹھا ہو جائے جو قیادت کی شرطوں پر پورا اترتا ہو۔

جس طرح سے عسکری تنظیم اور فوج کے تمام شعبے اس وقت تک بیکار ہیں جب تک ان کے لیے مناسب افسر نہ اکٹھا کر لیے جائیں اسی طرح ایک سیاسی تحریک بھی اس وقت تک بیکار ہے جب تک اسے صحیح قسم کے لیڈر نہ مل جائیں۔

اگر کسی مقامی شاخ کے پاس اوصاف قیادت سے متصف اور تحریک کے مقاصد کا ادراک حاصل کرنے کے قابل شخصیت دستیاب نہ ہو تو پھر تحریک کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ بجائے ایک ناکام شاخ کے قیام کا خطرہ مول لینے کے ایسی شاخ کا قیام ہی نہ کیا جائے۔

قیادت کے لیے یہ اوصاف کافی نہیں کہ انسان خود عمدہ کام کرنے کا خواہش مند ہو لیڈر میں دوسرے لازمی اوصاف بھی پائے جانے چاہئیں ان دوسرے اوصاف میں سے ذہانت اور قابلیت کی نسبت عزم کی پختگی اور مدت کی فراوانی زیادہ اہمیت رکھتی ہے بہتر ہے کہ وہ شخص جس میں ذہانت اور عزم کے ساتھ استقلال بھی پایا جائے۔

کسی تحریک کو مخلص تحریکوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے

12 کسی تحریک کے مقاصد کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے پیرو کتنے خلوص سے کام کرتے ہیں۔ یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ کتنے تعصب سے اس کی خاطر جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں کیونکہ تعصب کا مادہ ہونا چاہیے کہ صرف وہی حق پر ہیں اور اپنی تحریک کے سوا تمام دوسری تحریکوں کو غلط سمجھتے ہیں اور ان کا مخالف ہے۔

یہ دلیل کرنا مشکل معلوم ہے کہ کوئی تحریک اپنی جنس دوسری تحریکوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے سے زیادہ طاقتور ہو جاتی ہے یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے اتحاد سے تحریک کو جو وسعت حاصل ہوتی ہے اس سے تحریک کی ظاہری شان و شوکت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس سے عملی اندازے لگانے والے متاثر ہوتے ہیں کہ تحریک کی طاقت میں بھی ضرور اضافہ ہو گیا ہو گا لیکن درحقیقت ایسے اتحاد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک بیرونی عناصر کو اپنے اندر داخل کر لیتی ہے جو بعد ازاں اس کی اصلی حرارت کو ختم کر دینے کا باعث بنتے ہیں۔

بظاہر یہ کرنا آسان ہے کہ دو تحریکیں ایک ہی قسم کی ہیں لیکن دراصل ان میں کبھی یکسانیت نہیں ہوتی جاتی اگر کوئی یکسانیت ہوتی تو دو تحریکوں کو چاہیے ایک ہی تحریک کام ہوتی چاہیے اختلاف کی نوعیت کچھ بھی ہے اختلاف دونوں تحریکوں کے لیڈروں کی قابلیت تک ہی محدود ہو لیکن پھر بھی اختلاف تو ہے۔ دو مختلف المزاج پارٹیوں کا اتحاد قانون ارتقا کے خلاف ہے قانون ارتقا کا تقاضا تو یہ ہے کہ عناصر کمزور دوسروں پر غالب آ جائیں، جو اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش میں غالب کی ہمت و قوت میں کمی کی کیوں نہ واقع ہو جائے۔ مخلوط وزارتیں کبھی کبھی اتحاد سے محض خوری فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں، لیکن دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ خوری فوائد محض ایسی کمزوریاں پیدا کر دیتے ہیں جو بعد میں جا کر زوال ہوتی ہیں۔ کوئی تحریک اسی صورت میں طاقت حاصل کر سکتی ہے جب اس کی اندرونی طاقت کے نشوونما کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کر دی جائیں اور اسے اس وقت تک ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے جب تک کہ وہ اپنے تمام مخالفوں پر غالب نہ آ جائے۔

کسی تحریک کو اس وقت تک زندہ رہنے کا حق ہے اور تبھی اس کی طاقت میں اضافہ ہو سکتا ہے جب تک وہ سچائی سے اس اصول پر کاربند رہتی ہے کہ جدوجہد کے بغیر ترقی ممکن نہیں، اور یہ کہ تحریک کو کامل اتحاد اس وقت حاصل ہو گا جب فتح کی آخری منزل

لے ہو چکی۔

یہی وجہ ہے کہ کسی تحریک کو محض طاری ہو رہا ہے بھی کامیابی کے پیچھے نہ دوڑنا چاہیے بلکہ صبر اور استقلال سے بغیر کوئی کمزوری دکھائے مدت تک جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جدوجہد کی یہ مدت ہی تحریک کی اندرونی نشوونما کے امکانات بہم پہنچاتی ہے۔

جو تحریکیں اپنے مقصد اور دوسری تنظیمات کے ساتھ ٹکراؤ کے بغیر وسعت حاصل کر لیتی ہیں ان کی بیرونی طاقت محض دوسروں کے سہارے کا نتیجہ ہوتی ہے ان کی مثال ان پودوں جیسی ہے جنہیں بند کمرے میں مصنوعی حرارت پہنچا کر اگایا جائے۔ ایسے پودے بظاہر تو سرسبز ہو جاتے ہیں لیکن اس اندرونی قوت سے محروم رہتے ہیں جو قدرتی طور پر نشوونما پانے والے پودوں کو تناور درختوں میں تبدیل کر دیتی ہے جنہیں صدیوں تک بڑے بڑے طوفان بھی گرا نہیں سکتے۔

ہر وہ عالمگیر تنظیم جس کی بنیاد کسی تخریبی عقیدے پر رکھی گئی ہو صرف اسی صورت میں عظمت حاصل کر سکتی ہے جب اپنے مقصد اور دوسری تمام تنظیمات کے خلاف مذہبی جوش اور تعصب سے کام کرے۔ اس جوش اور تعصب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس تنظیم کو خود اپنی سچائی پر ذرا شک نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی عقیدہ سچا ہے اور اسے جدوجہد کے دو تین ہی مواقع میں اس کا صحیح ہونا ثابت کر دیا ہو تو ایسا عقیدہ جب بھی میدان جنگ میں اترے گا ہمیشہ کامل فتح حاصل ہوگی۔ ایسے عقیدے کو اگر نشوونما دینے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی اندرونی طاقت میں اور اضافہ ہوتا جائے گا۔

عیسائیت کو جو عظمت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت نے اس تمام فلسفیانہ عقائد کے ساتھ سمجھوتے کر لیے تھے جو قدیم دنیا میں رائج تھے اور عیسائیت سے کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتے تھے مگر اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت بظاہر ذرا سی لچک دکھائے، پورے تعصب کے ساتھ اپنی تعلیمات کا اعلان کرتی رہی اور ان کی حمایت کے لیے کمر

بستہ ری۔

یہ تحریک دوسری تحریکوں کے ساتھ ملتی ہوئی اور بالا بر جوڑ فی کرتی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہوتی جو ایک عقیدہ دوسرے اس عقیدہ کو ختم کرنے والی تنظیم اور دوسرا اپنے مقاصد کے لیے تگ و دو جدوجہد کر کے حاصل کر سکتی ہے بلکہ تباہ کن انتظامات سے جدوجہد کرنے والی تنظیم تھوڑے ہی عرصہ میں کھوکھلی کر لیتے وہ تنظیم سے ہاری لے جاتی ہے۔

جدوجہد بجائے خود ایک مقصد ہے

(۱) تحریک کے متعلقین کو یہ تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ جدوجہد کو ایک ایسی مصیبت نہ سمجھ کریں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے بلکہ جدوجہد کو تو بجائے خود ایک مقصد سمجھنا چاہیے اس لیے قربانیوں کے بر عکس رہنے سے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ انسان ہمیشہ جدوجہد پر آمادہ رہے جو لوگ ہمارے طرز زندگی اور ہماری قوم کے دشمن ہیں، ان کی نفرت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کی نفرت کا جواب نفرت سے دینا چاہیے اور ان پر غالب آنے کی سعی کرنی چاہیے محبت اور رواداری بھی دشمن کا ایک حربہ ہے جس سے وہ اپنی رنجش کا اظہار کرتا ہے۔

یہودی ہدایات کسی شخص کی مخالفت نہیں کرتے، اس کی توہین نہیں کرتے اور اسے برا بھلا نہیں کہتے وہ کسی شخص پر کسی رائج العقیدہ دشمن نہیں۔ وہ کسی دوسری قوم پر ست سوشلسٹ کہنے کا مستحق ہے۔ کسی رائج العقیدہ دشمن یا قوم پرست سوشلسٹ کے مقاصد کے خلوص، اس کے کردار کی پختگی اور اس کے رویے کی مضبوطی کو جانچنے کے لیے بہترین معیار یہ ہے کہ اس کا نام سنتے ہی ہماری قوم کے جانی دشمن کس قدر مخالفت کا اظہار کرتے ہیں۔

تحریک کے متعلقین کو، بلکہ ساری قوم کو بار بار دہرانا چاہیے کہ یہودی اپنے

اشارات کے ذریعہ ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ اگر یہودی کسی کو کھانا کھلوانا چاہتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت بڑے فریب کا پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ یہ فریب کبھی کبھار ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے ظاہر نظر آنے والی کسی اور حقیقت بہت بڑا جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ یہودی کذب عظیم ہے جھوٹ ہر یہودی یہودی کے دو خاص خصلتیں ہیں یہودی جب کسی سے کوئی جھوٹ یا بہتان منسوب کرتے ہیں تو عزم کے ساتھیوں کو یہ اشارات عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہودی جتنا کسی کی مذمت کرے اتنا ہی وہ ہمیں زیادہ عزیز ہوتا ہے جتنا یہودی کسی کی جان کا دشمن ہوتا ہے ہمیں اس مظلوم کو اپنا بہترین دوست سمجھنا چاہیے۔ اگر ہمارا کوئی رفیق صبح کے وقت کوئی یہودی اشارہ کھوں کر دیکھتا ہے اور وہاں اسے بے خلاف بھوکس ہو نظر نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کل کا دن ضائع کیا ہے اگر اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہوتا تو یہودی اشارات اس کی مخالفت کرتے، اس کی توہین کرتے، اسے برا بھلا کہتے، اسے گالیاں دیتے۔

یہ یہودی ہماری قوم کا پہلی دشمن ہے وہ آریائی اقوام اور آریائی تہذیب کا بدترین دشمن ہے۔ جو لوگ اس کا شر روکنے کی مقابلہ کرتے ہیں انہیں اس نسل کی جانب سے سوائے عداوت کے اور کس سلوک کی توقع ہو سکتی ہے بے شک لوگ تو یہودی کی بہتان تراشیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

جب ہماری تحریک کے راکھن کے گوشت پوست ہمارے خون میں منتقل ہو جائیں گا اساس بن جائے گا تب ہماری تحریک ناقابل تسخیر بن جائے گی۔

تمام انسانی اقدار شخصی اقدار پر مبنی ہیں

14 نازی ہمیشہ کے عزم کو تقویت دینے کے لیے تحریک کی جانب سے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی اقدار کے تمام اندازے شخصی

قدر رہی ہیں۔ دنیا کا ہر عقیدہ و نظریہ کا ہر کارنامہ کسی ایک قوم کی تخلیقی قوت کا ثمر ہے ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی عظیم ہستی کے سامنے ہر عقیدت ختم کر کے ہم یہ صرف کسی تنہا شخصیت کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک پوری ملت شخصیت کو خراج تحسین ادا کرنے والے لوگ خود بھی اہم ایک مشترکہ وراثت سے متحد ہو جاتے ہیں۔

انفرادی شخصیت کا مقام کبھی کسی دوسری شے سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی فرد محض مادی وسائل کا مجموعہ نہیں بلکہ تخلیقی اوصاف کا ترجمان بھی ہے تو پھر اس کی جگہ کوئی دوسرا شخص مقام ہرگز نہیں لے سکتا۔ اگر کوئی شخص دنیا کا سونا اپنے کسی شاہکار کو تمام پھونک دے تو پھر اس کا کوئی شاگرد اس کو پورا نہیں کر سکتا۔ ایک ہی دنیا کے تمام مفکر یا کسی عظیم صدر یا وزیر دست عسکری پیدا کرنے کی نقل ہمکن ہوتی ہے ان کا علم اور مشاہیر کی قوت ان کے عالم تخلیق سے متعلق ہوتی ہے یہ قوت مادی وسائل سے یا کبھی پر بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ یہ کہنا ان کا سرچشمہ الہام روحانی واقعے آبائی ہوا کرتا ہے۔

اس دنیا کے بڑے بڑے تجربات اور بڑے بڑے کارنامے ان کے عظیم خالق شاہکار اور اعلیٰ مدبرین کے ذہانی کارنامے نمایاں رہیں گے کسی ایک ہستی کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ ایسی ہستیاں اپنے اپنے دائرہ میں اپنے کارنامے نمایاں کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ ان منفرد صفات روح کی خدمت میں خراج تحسین ادا کرنے میں کل کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کارناموں کو دوبارہ پیدا کی جا سے ہم جو زبردست طاقت حاصل کر سکتے ہیں اس سے محروم رہ جائیں گے۔

یہودی خود اس حقیقت سے خوب آشنا ہیں اگرچہ ان کارناموں یہودی عظمت اسی میں پنہاں رہی ہے کہ انہوں نے بنی آدم کو تہذیب و تمدن کو سکھا دینے کے لیے شاندار کارنامے انجام دیے لیکن یہودی پورے اہتمام سے انجام دیوں کی طرح بچ جاتا ہے بلکہ اس کے لب دوسری قومیں اپنے کارناموں کو دوبارہ کے اعتراف کی یاد زندہ رکھنا

چاہیں تو بیہودگی ان کی شان میں نقائص نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بزرگوں کے ستر اور کو "خصوصیت" کہہ کر بدنام کرتا ہے۔

جب کوئی قوم ایسی بزدل ہو جائے کہ وہ بیہودگیوں کی جانب سے اپنے بزرگوں کی یہ توہین بھی خاموشی سے برداشت کر لے تو پھر وہ اپنی اندرونی طاقت کے ایک منبع سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ قوموں کی اندرونی طاقت عوام کی من مانی کرنے کی عادت دینے سے پرورش نہیں پایا کرتی بلکہ یہ طاقت تو ہمیشہ بادل استیوں سے اظہار عقیدت کر کے حاصل ہوا کرتی ہے۔ ان لوگوں یا بزرگوں کی تقلید ساری قوم کی زندگی کو بلند اور شائستہ بنا دیتی ہے۔

جب انسانوں کے دن تھوڑے رہ گئے ہوں، جب ان کی آنکھیں ماضی کی گہرائیوں میں ڈوب رہی ہوں، تو پھر ماضی کے دھندلکے میں سے ہمت کے عالی مقام اسلاف اپنی نگاہیں اپنی درد رسیدہ اولاد پر ڈالتے ہیں۔ یہ وہ آبا و اجداد تھے جو رنج و غم، دکھی زندگیوں اور انسانی غلامی کی تاریکیوں کو کاٹ کر جانتے تھے۔ ان بزرگوں کا ادنیٰ دست تصفیہ ایک ستارے سے مایوس دلوں میں امید کو حوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ قسمت ہے وہ قوم جو عالم غیب سے بولنے والے ان ہاتھوں کو دیکھ کر قدم اٹھانے میں ذرا بھی توقف کرے۔

گمنامی امنگوں کے لیے سنگ راہ ہے

ہماری تحریک کی ابتدا میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہم سب گمنام تھے ہمارے بارے میں یہ حیثیت نہ تھی اس وقت کے کروڑی ہمارے محض ساتھیوں کو ہماری کامیابی سے مایوس کر دیتی تھی۔ تب ہمارے سب سے مشکل کام یہ تھا کہ ہم تحریک کے ارکین میں یہ بات جیسے کس طرح سے پیدا کریں کہ تحریک کے سامنے ایک زبردست مقصد ہے یہ بھی سوال تھا کہ اس جیسے کو زندہ رہنے کی صورت کس طرح دی جائے ان دنوں تو صرف چھ یا سات آدمی ہمارے متعلق ہیں کی تقریریں سنتے آیا کرتے تھے وہ ان چھ یا سات دلوں کی بیچارگی کا اندازہ تو لگ چکے تھے جو بالکل گمنام تھے۔ اور یہ تحریک قائم کرنے کی نیت

جہاں پیکیجنگ کے محکمہ سے علاقہ کو پرنٹی کے وجود کا علم تھا۔

ہر ہفتہ کے روز ہماری ہاؤس کونسل کا اجلاس کسی قہوہ خانے میں منعقد ہوتا تھا۔ ہر ہفتے میں ایک روز شام کے وقت "مجلس مذاکرہ" کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تحریک کے تمام رکن پارٹی کونسل کے بھی ممبر تھے اس وجہ سے "مجلس مشاورت" اور "مجلس مذاکرہ" دونوں میں وہی گنے چنے لوگ موجود ہوتے تھے سب سے پہلے جو قدم اٹھانے کی ضرورت تھی وہ تو یہ تھا کہ اس چھوٹے سے حلقہ کو وسیع کیا جائے نئے ممبر شامل کیے جائیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تمام امکانی ذرائع استعمال کرتے ہوئے تحریک کا پرچار کیا جائے تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اس نام کی بھی کوئی تحریک موجود ہے۔

جلسے کس طرح کامیاب بنائے جاتے ہیں

ہم نے سب ممکن طریقوں سے کام کرنا شروع کیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر مہینہ ہم ایک بڑا عوامی جلسہ منعقد کریں گے جہاں علاقے کو شرکت کی دعوت دی جایا کرے گی۔ کچھ دعوت نامے ڈاک کرنے کے باقی ہاتھ سے لکھے گئے شروع شروع کے جلسوں کے لیے یہ دعوت نامے بازار میں کھڑے ہو کر تقسیم کیے گئے اور بعض گھروں میں ہم نے خود جا کر پیغام تحریک کے ہر رکن نے اپنی جان پہچان کے حلقہ میں جلسہ کا پرچار کیا اور کوشش کی کہ اس کے چند ساتھی ہمارے جلسوں میں شامل ہو جایا کریں ان سب کوششوں کے باوجود ہونے کو ہوئے تھے دیکھ کر سر پھوڑ لینے کو جی چاہتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک روز کس طرح میں نے خوف سا خود دعوت نامے لوگوں میں تقسیم کیے اور شام کے وقت ہم سب اس انتظار میں تھے کہ کوئی خوش نصیب ہمارے جلسہ میں شامل ہوگا۔ ایک گھنٹہ تک انتظار کرنے کے بعد "نگار صدر" کو جلسہ شروع کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ پھر جلسہ میں سات ہی آدمی شامل تھے وہی پرانے جانے پہچانے ساتھی۔

پھر ہم نے اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کی ہم اپنے دعوت نامے میونسپلٹی کے ایک نائب کھرے سے ٹائپ کروا کے ذاتی مشین کے ذریعہ ان کی نقلیں تیار کرنے لگے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمارے اگلے جلسہ میں کچھ لوگ تو شامل ہوئے۔ حاضرین کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ گیارہ سے تدریج تیرہ ہوئے پھر سترہ، پھر پچیس، اور آخر کار پینتیس ہم نے اپنے حلقہ میں کچھ رقم بھی جمع کی۔ ہر ماہ تقریباً نے تھوڑا تھوڑا چندہ دیا۔ اس طرح سے ہمارے پاس اتنی رقم ہو گئی کہ ہم نے اپنے جلسہ کا اعلان میونسپلٹی آفس روزنامی اخبار میں اشتہار کے ذریعہ کیا۔ یہ اشتہار اس طرح تھا۔

ہمارا پہلا عوامی جلسہ

اس مرتبہ ہمیں اس کا یقین ہو گیا کہ ہم جیت رہے ہیں۔ ہم نے جلسہ گاہ کے طور پر باغ بیرا دیوی کا انتخاب کیا تھا۔ اس ہال کو بنانے والے نے اس کا ہال رکھنے کی غلطی نہ کرنی چاہیے۔ یہ ایک کھلا سا ہال تھا جس میں بمشکل ایک سو تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مگر اس وقت یہ ہال میری نگاہ میں بہت بڑا تھا۔ ہم اس خوف سے لرز رہے تھے کہ کہیں یہ عظیم الشان عمارت جلسے کی رات کو خالی نہ رہ جائے۔

شام کے سات بجے ہال میں ایک سو گیارہ آدمی موجود تھے چنانچہ جلسہ شروع کر دیا گیا۔ میونسپلٹی کے ایک ہندو ممبر نے افتتاحی تقریر کی۔ اس کے بعد میں بہ اعلان مقرر کے طور پر میری پہلی تقریر تھی ہر چند کہ اس دنوں ہماری پارٹی کے صدر تھے، ان کا خیال تھا کہ ایسا جلسہ منعقد کر کے ہم بہت بڑی جرأت کر رہے ہیں ہر چند کہ وہ بہت نیک آدمی تھے، لیکن کسی طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ مجھ میں چاہے کچھ بھی خوبیاں ہوں لیکن مجھ میں عوام کے سامنے کرنے کا جوہر نہیں۔ بعد میں بھی انہوں نے اپنی پوری زندگی بھر کبھی وہ غلطی نہ کی۔ اس موقعہ پر مجھے تقریر کرنے کے لیے نہیں منتخب کیا گیا تھا۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا پہلا عوامی جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔

خطابت سیاسی تحریکوں کی روح ہوتی ہے

میں نے نصف گھنٹہ تقریر کی۔ اگرچہ مجھے آج تک اس کا تجربہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا لیکن میرے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ میں بھی تقریر کر سکتا ہوں جب مجھے بولتے ہوئے نصف گھنٹہ گزر گیا تو مجھے نظر آنے لگا کہ اس چھوٹے سے ہال میں جتنے بھی لوگ موجود تھے ان سب پر گہرا اثر ہو چکا تھا۔ ان کے اندر جوش پیدا ہو چکا تھا اس کا پتا ثبوت تو اس وقت ملا جب میں نے حاضرین سے چندے کی اپیل کی اور تین سو روپے کی رقم جمع ہو گئی اس سے پہلے بڑی مشکل سے ہمارے پاس روپے کی ایک رقم تھی کہ ہم اپنی پارٹی کے مقاصد بھی چھپوا سکتے تھے۔ اس تحریک کے متعلق کوئی دوسرے رسائل شائع کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس کم از کم ایک ایسی رقم کی بنیاد ہو چکی تھی جس سے ہم اپنے اور ضروری اخراجات ادا کر سکتے تھے۔

اس پہلے جلسے کی کامیابی ایک اور پہلو سے بھی اہمیت رکھتی تھی میں ان دنوں بھی تحریک کی کونسل میں محض تازہ خون بھرتی کرنے کی غرض سے شامل کر لیا گیا تھا۔

طویل عرصہ تک فوجی ملازمت میں رہنے کے بعد میری ایسے کئی فوجی نوجوانوں سے شناسائی پیدا ہو چکی تھی جنہیں میں نے اس پارٹی میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ یہ سب وہ تھے جو تربیت یافتہ نوجوان تھے جو سالہا سال تک فوجی ملازمت کرنے کے باعث اس اصول سے اچھی طرح واقف تھے کہ ایسی کوئی کام یابی مکمل نہیں ہو

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

میں نے لئے راکین کے ساتھ چند ہی منٹ مل جل کر کام کیا تھا کہ مجھ پر جلد ہی راکین شامل کرنے کی ضرورت ثابت ہو گئی ہر دو راکین دونوں تحریک کے صدر تھے پیشہ کے لحاظ سے وہ صحافی تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی عوامی مقبولیت خاصی تھی لیکن پارٹی کا تجربہ ہونے کے لحاظ سے ان میں ایک بڑا نقص تھا وہ کسی اجتماع کے سامنے تقریر نہ کر سکتے تھے اگرچہ وہ اپنے مخلص دوست داری سے کام لیتے تھے لیکن ان میں دوسروں سے کام

پڑنے کی وہ ہمت نہ تھی جس کی جماعت کو ضرورت تھی۔ عام لوگ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ تقریر نہ کر سکتے تھے ہزار بکسان دنوں میونخ میں ہماری مقامی شاخ کے ممبر تھے۔ وہ ایک سادہ طبیعت مزدور تھے وہ بھی بکھر رہا وہ اچھی تقریر نہ کر سکتے تھے علاوہ ازیں وہ سپاہی بھی نہ تھے۔ انہیں فوجی خدمت کا بھوت نہ تھا۔ انہوں نے جنگ کے دنوں میں بھی فوجی خدمت کا تجربہ حاصل نہ کیا تھا اس طرح سے ایک تو وہ ہمارا کام کرتے رہے۔ دوسرے انہیں اس واحد تربیت گاہ میں تربیت حاصل کرنے کا موقعہ بھی نہ تھا جہاں مکرر ہر وہ بھی مزاج افراد کو صحیح معنوں میں مرد بنا دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں صاحب اس خصوصیت سے محروم تھے جو تحریک کے متعلقین میں تحریک کی آخری کامیابی کا باعث ہوتی ہے اور جو قوموں کی قسمت بنانے پیدا کرتی ہے اسی خصوصیت اپنے مقاصد کے راستہ میں سے تمام رکاوٹیں ہمت ہمت ہمت کے ساتھ دور کر سکتی ہے اور ضرورت ہو تو سکندر کی تلوار سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کرتی یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا قلب مومن اور جن کی روح فولادی اوصاف کی تربیت حاصل کر چکے ہوں فولادی تربیت انسان کو وفادار کتے کی طرح چست چالاک لومڑی کی طرح محنت اور چیتے کی طرح مضبوط بنا دیتی ہے۔

ان دنوں میں بھی سپاہی تھا چونکہ میں کی فوجی خدمت سے میرے قسم اور دماغ کو کچھ واسطہ نہ تھا اس تحریک کے حلقہ میں مجھے شروع شروع میں بھی بھوکر کی طرح لاتیں کھانی پڑیں دوسرے سپاہیوں کی طرح میری طبیعت بھی اس قسم کے تکلفات سے ناآشنا تھی کہ "اب تو کام بنے چلے گا" "یا ممکن ہے" "ہمیں ایسا نہ کرنا چاہیے" یہ سخت تشویش کی بات ہے"

کمیونسٹ تشدد استعمال کرتے ہیں

یہ سارا کام ہی صفایا طرز کا تھا۔ ان دنوں تو میں میں ایسے کئی مقامات تھے جہاں قوم پرستوں کے کسی جلسہ عام میں عوام کو شہریت کی دعوت دینا یا عوام کے سامنے یہ

راست حب وطن کی پیل کرنا ممکن تھا۔ جو لوگ ایسے جلسوں میں شرکت کرتے تھے
انہیں باقاعدہ منتشر کر دیا جاتا تھا اور وہ اپنی ہاتھ پاؤں لے کر گھر واپس لوٹتے تھے یہ
کام انجام دینے کے لیے کسی بہت بڑی طاقت کی ضرورت نہ تھی جوں ہی اس دیوہ
کو میونسپل سوفیہ پہنچتے ہوئے کھاتے پیتے لوگوں کا ایک سے بڑا جلسہ منتشر ہو جاتا تھا۔
مزدور حضرات اس طرح بھاگ جاتے تھے جیسے کتوں سے خوف کھا کر گوشت فرار ہو جاتے
ہیں کیونکہ کھاتے پیتے لوگوں کے ان جلسوں پر کمر توڑ ٹیکس تھے جہاں خان
بہادروں نے تقریریں کرنی ہوتی تھیں ایسے جلسوں میں شرکت کرنے والوں کی نسبت
کیونکہ ان جلسوں کے اندرونی کھوکھلے پن سے بہتر واقف تھے یہی وجہ تھی کہ کیونکہ
ایسے جلسوں سے خوف نہ کھاتے تھے بلکہ اس کے ہوں ہی انہیں کوئی تحریک اپنے مفاد
کے لیے مضر نظر آتی تھی وہ اس سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی خاطر وہ اپنی پوری
طاقت خرچ کر دیتے تھے ایسے موقعہ پر ان کے ہاتھ میں سب سے زبردست حربہ مشتعل
تشدد اور خوف و ہراس کا پھیلانا تھا۔

کیونکہ لیڈروں کا پیشہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دھوکہ دیں اور خلاف رو پر گامزن جس وہ
ہی تحریک سے سخت خائف تھے جس کا کلی مقصد یہ تھا کہ ان عوام کی بہبودی حاصل کی
جائے جو آج تک ان دقیانوسی کیونکہ اور سرمایہ داروں کی سودی بھاعتوں کے
پے وقف کیے جاتے تھے بیوروی اور کیونکہ تو "جرمن مزدور پارٹی" کا نام سن کر ہی
بیا محسوس کرتے تھے گویا ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی یہ سمجھنا بھی مشکل نہ تھا کہ
مناسب موقعہ ملنے پر یہ کیونکہ خائنوں کا مقابلہ کرنے سے گا جو اکتوبر 1918ء
کی کامیابیوں کے نشہ سے مست تھے۔

ان دنوں ہماری تحریک کے محدود حلقہ میں جو لوگ شامل تھے وہ اس آنے والی کشمکش
کے تصور سے ہراساں ہو جایا کرتے تھے وہ مکمل طاقت دشمن کے سامنے آنے سے ہچکچاتے
تھے انہیں ڈر تھا کہ اس حملہ میں انہیں شکست کھانی پڑے گی۔ وہ اپنی مختصر سے کام

پلٹن دیکھا کرتے تھے کہ ہمارا پہلا جلسہ منتشر کر دیا جائے گا لیکن ہمارا کارکن کہتا تھا کہ اس طرح پہلا جلسہ منتشر ہو جانے سے تحریک ہمیشہ کے لیے دب جائے گی میری رائے تھی کہ ہمیں تصادم سے بچنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے بلکہ آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس مقابلہ کے لیے ان ہتھیاروں سے فی الفور مسلح ہو جانا چاہیے جن کے ذریعہ وحشیانہ تشدد سے ٹکر لینا ممکن نہیں سمجھے پر اس رائے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے بہت مذاکرات کا سامنا کرنا پڑا۔ تشدد کا مقابلہ وحشی ہتھیاروں سے ممکن نہیں ایک تشدد کا جواب تو صرف تشدد سے ہی دیا جا سکتا ہے ہمارے پہلے جلسہ کی مخالفت نے فضا میری رائے کے حق میں ہموار کر دی تحریک کے اراکین کو یہ احساس ہو گیا کہ انہوں نے پہلے سے کسی بڑے پیمانے پر ایک دوسرے جلسہ کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔

دوسرا دوسری عوامی جلسہ

اکتوبر 1919ء کی کسی تاریخ کو دوسرا جلسہ ہیرا باغ کے ہال میں منعقد ہوا۔ انتظار کا موضوع یہ تھا کہ مجلہ وہ بہت تک دوسرا جلسہ کے حصہ میں کیا حاضر ہی ہے چار مقررین نے بولا تھا میں نے قریباً ایک گھنٹہ تک تقریر کی یہ تقریر پہلے جلسہ میں میری تقریر سے زیادہ کامیاب رہی حاضرین کی تعداد اب ایک سو تیس تک پہنچ چکی تھی۔ جب جلسہ کو خراب کرنے کی کوشش کی گئی تو میرے فوجی ساتھیوں نے فی الفور یہ کوشش ناکام بنا دی جو لوگ جلسہ خراب کرنے کی نیت سے آئے تھے انہیں بازوؤں سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا گیا ان کی واپسی سے قبل ان کی کھوپڑیوں پر اور سر پر روئی کی گدیاں ثبت ہو چکی تھیں۔

تیسرا تیسرا عوامی جلسہ

دو ہفتے بعد ہمارا تیسرا جلسہ اسی ہال میں منعقد ہوا حاضرین کی تعداد اب ایک سو ستر سے زیادہ تھی اس کا سبب یہ ہے کہ ہال [illegible] اس جلسہ میں میں نے پہلی تقریر کی جو اس

مرتبہ گزشتہ جلسے سے بھی زیادہ کامیاب رہی۔

ہمارا چوتھا عوامی جلسہ

اب ہم نے کچھ بڑی جگہ کی تلاش کی۔ اس سے بھی بڑا ہال تلاش کیا جو ہمیں کچھ عرصہ تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد ہم نے ایک بڑا ہال شہر کے دوسرے کونے پر تلاش کر لیا اس ہال کا نام تھا "ایکسل رائل" یہ ہال ڈاکٹر مزاحیہ ہاؤس والا تھا اس ہال کی جگہ ہمارے جلسہ میں لوگ پہلے کی نسبت کم آئے حاضری ایک سو چالیس سے کچھ کم ہی تھی پارٹی کی کونسل کے ارکین کے بھی ڈھیلے پڑنے لگے ہوئے تھے ہمیشہ سے جلسوں کی کامیابی مشکوک سمجھنے لگے تھے انہوں نے کہنا شروع کیا جلسہ میں حاضری کی کمی ہو رہی ہے کہ ہم جلسے بہت جلد جلد منعقد کرنے لگے ہیں اس موضوع پر زور دست ہونے ہوئے میں نے کہا کہ سات لاکھ کی آبادی کے کسی شہر میں دو ہفتوں کے بعد ایک جلسہ کچھ زیادہ نہیں بلکہ دراصل تو ہر ہفتے جلسہ ہونا چاہیے میں نے کہا ہمیں ایک جلسہ میں اتنی تعداد سے زیادہ برداشت نہ ہونا چاہیے ہم جس طریقہ کار پر عمل کر رہے ہیں وہ درست ہے اور ہی بار بار سے ہمیں کامیابی ضرور ہوگی بشرطیکہ ہم حوصلہ اور استقلال سے اپنے راستہ پر گامزن رہیں 20-1919ء کا یہ درمیانی موسم ہمارے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی مہم تھی اس جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہماری قوت کے مقناطیس کو بڑھایا جائے اور اس اقتدار کو یہاں تک ترقی دی جائے کہ وہ ایک فوری بیان کا مرتبہ حاصل کرے جس کی قوت سے پرانی جگہ سے ٹل جایا کرتے ہیں۔

ہمارا پانچواں عوامی جلسہ

کچھ جلسہ ہم نے ایک چھوٹے سے ہال میں منعقد کیا یہاں میرے رہنے کی جگہ ثابت ہوگی حاضرین کی تعداد دو سو تک پہنچ گئی پراپیگنڈا بھی خوب ہوا اور رقم بھی خاصی جمع ہوگئی میں نے فی الفور مطالبہ کیا کہ ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے دو ہفتوں کے اندر اندر یہ جلسہ بھی منعقد ہوا اور یہاں حاضرین کی تعداد پہلے سے دوگنی تھی مزید دو ہفتے کے بعد ہم

نے اپنی تحریک کے متعلقین اور اپنے ہم خیال لوگوں کو ساتویں جلسہ سالانہ کا موقع دیا اب یہ حاضرین کے لیے بہت مشکل کام تھا کہ اس کی تعداد اس مرتبہ چار سو سے زیادہ تھی۔

تحریک اور پارٹی کا فرق

اس دوران میں تحریک کا اندرونی نظام بھی تکمیل پاتا رہا۔ کبھی کبھی تو ہمارے اس محدود حلقہ میں زبردست اختلاف رونما ہوتا ان دنوں بھی یہی حال تھا جو آج کل ہے مختلف گوشوں سے یہ آواز اٹھتی تھی کہ اس نوزائیدہ تحریک کو خواہ مخواہ ایک پارٹی قرار دے دینا مناسب نہ ہوگا میری رائے ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی کا سبب محض اس کی تنگ نظری اور کم علمی کا ثبوت ہوا کرتی ہے ایسے اعتراضات ہمیشہ وہ لوگ اٹھایا کرتے ہیں جو اندرونی قوت اور خارجی اظہار میں فرق نہیں کر سکتے۔ اکثر کسی تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس کے بھاری بھرکم نام سے لگاتے ہیں موٹے موٹے نام ڈھونڈنے کے لیے وہ مارے مارے جان کے وقت کی آنکھیں چھانٹ ڈالتے ہیں۔ پھر بھی ان کی تحقیق کے نتائج کھوکھلے ہی نکلتے ہیں۔

ان دنوں لوگوں کو یہ سمجھانا بڑا مشکل تھا کہ ہر تحریک اس وقت تک ایک پارٹی کہلانی ہے جب تک اس کے مقاصد پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ جاتے اور اسے آخری فتح حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک ایک پارٹی ہی رہتی ہے چاہے اسے کسی نام سے پکارا جائے۔

جو شخص کسی نئے عقیدہ کو اپنے ہم جنسوں کے خانہ دل میں راسخ کرنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے اسے پہلے ایسے متعلقین تلاش کرنے پڑتے ہیں جو اس کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے پر تیار ہوں اگر اس شخص کا مقصد صرف اتنا ہی ہو کہ پارٹی بازی کے کام کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح قومی ہمدردی کی راہ کھل جائے تب بھی اس نصب العین کے حصول کے لیے اسے متعلقین کی ضرورت ہوگی اس وقت تک ایک ہی پارٹی کہلائیں گے جب تک کہ وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو جاتے جب یہ کامیابی وہ حاصل کر لیتے ہیں تو وہ کسی تحریک کو خود اصل پارٹی ہی بے محض

اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ لیں گے تو وہ تنی ہوئی مٹھی اور لشکوں کے لئے بھیر میں وقت ضائع کر رہے ہوتے ہیں ان لوگوں کی محنت کا پانی ان کی عقل سے بھی کم ہوتی ہے۔

خالی ماضی کی پرستش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

قدیم زمانے میں قوموں کے ہاں جو نام رائج تھے اور جن کا آج کل کوئی ٹھیک مصرف بھی نہیں نکلتا ان کو توتے کی طرح دوہراتے رہنا قوم کے موجودہ مزاج کے خلاف ہے فراموش شدہ ماضی کے بغلولوں کو دہرانے کی اس عادت سے لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اس تحریک کے اصحاب یہاں ہمیں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، شاید وہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا یہ وہ الفاظ کو استعمال کرنے کی یہ عادت کچھ بھی نہیں لیکن آج کل عام پائی جاتی ہے۔

میں ان دنوں اکثر تحریک کے متعلقین کو اس آواز کو بلند کرنے سے خبردار کیا کرتا تھا جو قدیم زمانہ قبائل کے "لوک گیت" تو بیرونی کا خوبچہ اٹھائے پھرتے ہیں، اور جو کبھی کوئی مثبت یا منفی کام ہونے اس کے سر انجام نہیں دے سکتے کہ پہلی مرتبہ "میرا خود ستائی کا" چرچا کرتے پھریں اس لئی تحریک کو ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے جو سوائے اس کے کوئی خوبی نہیں رکھتے کہ اپنے منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تو گذشتہ چالیس سال سے "ہیں لیوالات کا نعرہ لگا رہے ہیں" ان کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اب یہ تحریک قائم کی گئی ہے۔

اگر کوئی شخص گذشتہ چالیس سال سے ایک مقصد کی تبلیغ کرتا چلا آیا ہے اور اس کی مساعی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا، حتیٰ کہ وہ خود بھی کوئی کام نہ کرنے سے بھی ناکام رہا ہے تو پھر گذشتہ چالیس سال کی بیکار گزری ہی اس تبلیغ کی ناکامیت کا کافی ثبوت ہے ایسے لوگ اس وجہ سے اور زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں کہ وہ تحریک میں شامل ہو کر شامل نہیں ہونا چاہتے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ان کی گذشتہ خدمات کے صلہ میں تحریک کے بڑے بڑے عہدے ملنے چاہئیں جب تک انہیں بڑے بڑے عہدے نہ دیے

ہوئے ہوئے ہار پہنے پھرتے ہیں، اور دوسری طرف جب بھی زمانے کے سامنے کوئی مقرر کی پیش آ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اسے صرف "اہل الحل والعقد" سے خطاب کرنا چاہیے جو ہی کوئی ایسا کیوں نہ ڈھلا پلے ہوئے ان طرح جانے پہ سری ہاں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں آندھی نہیں اگر ان ہوا میں تلواریں چلانے والے سورماؤں کے کارناموں کے متعلق رنگ لکھے جائیں تو انہیں ان کی شجاعت کے کارنامے داستان میں خاصی دقت پیش آئے گی۔

مجھے اس قسم کے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے کہ مجھے ان سوانگ بھرنے والے مقرروں سے سخت نفرت ہو چکی ہے۔ قوم کے عوام ان لوگوں کی بڑی عزت کرتے ہیں، ہیں بیسویں صدی کے تقاضوں کے ماہرین کا احترام کرنے میں پاکستان دنیا کی کسی بھی قوم کے شانہ بشانہ قرار دیتا ہے جو قومی سطح کے اجتماع کے پیش کر رہے ہیں یہ مقرر بھی اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ رکھتے ہیں اگرچہ ان کے بے حقیقت ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن پھر بھی انہیں ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی نسبت بڑے نظر آتے ہیں ان کی یہ خود پسندی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ تمام جگہ پر محفل میں وطن کے بہی خواہ بنے پھرتے ہیں محفل خواہ وطن کی ہو یا صرف دعوتی کی ٹوٹی ہوئی کرسیوں ہی کا مسئلہ ہو، یہ ضرور بولیں گے، وہ بولیں گے کاموں کی بڑا اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے مثال کا کام دے سکے۔

ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا طرز عمل ان کی بھی صداقت ہونا ثابت کرتا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو ان حرکتوں سے اپنی کوئی غرض پوری کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں عام حالات میں ان دونوں گروہوں کے مابین فرق کرنا مشکل ہوتا ہے ان لوگوں میں سے کلرک کے متعلق میری رائے تو یہ ہے کہ وہ ایسی طاقتوں کے نمائندہ ہوتے ہیں جو قوم کے دیوانی حقوق ہیں جو لوگ مذہب کی اصلاح کا نام لے کر سامنے آتے ہیں، اور قرآن کی قدیم رسموں کی آڑ لیتے ہیں، ان کے متعلق تو

خاص طور پر ہمیں بھی رائے ہے ان کی تمام سرگرمیوں کا اصل یہ ہے کہ قوم کی توجہ اصل مسئلہ پر سے ہٹا دی جائے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ساری قوم متحد ہو کر مشترکہ دشمن یعنی بیرونی کا مقابلہ کرے ایسے واقعات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم بجائے متحد ہو کر قومی مفاد کی خاطر لڑنے کے خود اپنی ہی گھتیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ ضلع راہل کا تقاضا ہے کہ تحریک ایک مقصد کو مرکز کے گرد متحد ہو خود مرکز ہی ایک متحد و قیادت کا تصور دیتی ہے اس قسم کے مہلک عناصر کی سرگرمیوں کا تدارک صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن تاریخ کے یہ عناصر ہر ایسی تحریک کی سخت مخالفت کرتے ہیں جس کے ممبر کی ایک لیڈر ہو اور اس کے دشمن کے ساتھ متحد ہوں یہ لوگ ایسی تحریک کے اس لیے مخالف ہوتے ہیں کہ وہ ان کی شر انگیزیوں کی روک تھام کر سکتی ہے۔

امت کی تعمیر جماعتی سے پہلے ملت کی تعمیر انسانی زیادہ ضروری ہے

جب ہم نے تحریک کے پروگرام کی وضاحت کی تو ہم نے اس میں عمداً "دشمن امت" کا لفظ استعمال نہیں کیا امت کے تصور پر کسی تحریک کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ یہ تصور بہت ہی وسیع اور مبہم ہے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو سنی امت کہتا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کسی خاص پارٹی میں شامل ہے۔

یہ مکمل اور پختہ تصور نہیں ہے اس تصور کی متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں اس لیے کوئی لوگ امت کے تصور کا سہارا لے کر اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے لگتے ہیں جب کبھی کسی سیاسی تحریک کی بنیاد ایسے مبہم تصور پر رکھی جائے جس کی متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تحریک کے مجاہدین کے اتحاد اور انصباط میں فرق آجاتا ہے جب ہر رکن کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کی حد خود متعین کرے اور جو چاہے عمل کرے تو پھر تحریک میں نظم کیونکر قائم رکھا جا سکتا ہے۔

جو لوگ اپنے گوشے کے اندر بیٹھ کر امت کا نشان لگائے پھرتے ہیں جب انسان ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ امت کی حمایت کی تحریک

تعبیریں کی جاری ہیں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے ہر دیا کے ایک مشہور پروفیسر صاحب جو کہ علمی تعبیروں کے استعمال میں شروع سے مخالف ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ برلن کے جلسہ میں شریک تھے (غالباً یہ شرکت علمی تعبیروں تک محدود ہوگی) کہتے ہیں کہ امت مرحومہ کی اصطلاح وہم مترادف ہیں لیکن یہ چیز عالم صاحب نہیں بتا سکتے کہ آج کل امت کا جو مفہوم رائج ہے اس میں اور پرانے زمانہ کے مذہبی بادشاہوں میں کیا مماثلت ہو سکتی ہے لگتا ہے کہ اگر ان عالم صاحب کو ایک واضح جواب دینے پر مجبور کیا جائے تو وہ چپ رہ جائیں گے کیونکہ جن لوگوں نے امت کے تصور سے بالکل بے بہرہ تھے اگر وہ امت کے تصور سے بے بہرہ نہ ہوتے تو متحرم ہو جاتے۔ یا اگر وہ بھی ہماری امت تھے تو ان کا رویہ اس امر کی شہادت ہے کہ امت کی حمایت دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں۔

ہر شخص امت کے تصور کی تعبیر جدا بیان کرتا ہے ایسی مختلف تعبیروں کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی بیانی تحریک کھڑی نہیں کی جا سکتی جو پیغمبر اسلام کے قافلہ میں اس عقیدہ میں اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرا سکتا ہوں کہ "بیسویں صدی میں جمہوریت کے تقاضوں کی انجمن" دنیاوی معاملات میں بالکل ناداں ثابت ہوئی ہے کیونکہ خیال رکھئے وہی لوگوں نے ان لوگوں کا جو مذاق اڑایا ہے اس سے ان کا مقصد پورا ہو چکا ہے کیونکہ پہلے ان لوگوں کو بیک بک کر لیتے ہیں اور پھر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

جو کوئی دوست کے دشمن کا دشمن نہیں وہ کسی کا دوست نہیں!

ہمیں ان لوگوں کو دوست بنانے کی پروا نہیں کرنا جو ان کے دشمن ان سے نفرت نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کا ہم نے ذکر ہوا ہے ہم انہیں اپنی تحریک کے لیے نہ صرف کمانڈ بنا سکتے ہیں بلکہ یہی بڑی وجہ تھی کہ ہم نے اپنی تحریک کو ایک پارٹی کا نام دے دیا تھا ہمیں تو خوشی تھی کہ پارٹی کہلانے کے بعد ہم امت کی حفاظت کے خواب

دیکھنے والوں کی یادداشت سے محو ہو رہی ہے اسی لیے ہم نے اپنی پارٹی کا نام قومی بہبود سوشلسٹ جمہوری مزدور پارٹی رکھا تھا۔

پارٹی کا لفظ گیل کی دنیا میں رہنے والے ان تمام لوگوں کو ہم سے دور رکھتا ہے جو ہمیشہ ماضی کی دنیا میں رہتے ہیں اور جنہیں ہوا سے الفاظ استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے جو خلاف حکومت کے کارکنوں کو بھی ہوا سے رکھتا ہے پارٹی کا مکمل نام ان تمام سورماؤں سے بہت کا نمونہ ہے جو خونی روحانی تلواریں چلاتے ہیں اور اصل بے حوصلہ اور کمزور ہیں اور موقعہ پڑنے پر ہمیشہ اپنے دوستوں کی اصل کے پیچھے سر چھپائے پکڑے ہیں۔

یہ تو ہمیں پہلے سے توقع تھی کہ جوں ہی ہماری تحریک شروع ہوئی ہمیں تمام بزدل فوراً ہم پر حملہ کریں گے لیکن یہ حملہ تھوڑے وقت تک ہی محدود رہے گا کیونکہ حکومت کی حمایت میں سرگرم ہونے والے ان مجاہدین کے ہاتھ اکثر کندے ہی کے بجائے سوا کرتے ہیں ہماری تحریک کا ایک اصول یہ تھا کہ ہم اپنی حفاظت کے لیے تشدد کا جواب تشدد سے دیں گے قدرتی بات ہے کہ ہمارے اس اصول سے ان تمام کے دشمن مجاہدین کے گروہوں میں صف ماتم بچھ گئی وہ ہمیں یہ صرف اس لیے برا بھلا کہتے تھے کہ ہمارے اس اصول کا پرچار کیوں کیا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ان کا خیال تھا کہ ہم ذہنی حالت سے بالکل بیگانہ ہیں یہ ہم حکیم کی تائید میں دلائل دیتے تھے کہ اگر خود ہمیں بھی کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہونا پڑے تو ہم ایسے احمق خاموش کرا سکتے ہیں جو اس پر تالیاں بجانے کی نیت سے وہاں آئے ہوں اور جلسے جلوسوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے پر آمادہ ہوں یہ ہم حکیم سے بزدل ہوتے ہیں کہ وہ بھی ایسے خطروں کی جگہ پر جاتے ہی نہیں ہمیشہ کسی عزت میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں ان کی جگہ سے آواز اٹھاتے ہیں اور یہ عوام کے سامنے آتے ہیں۔

خاموش کارکن ہمیشہ بزدل اور نکمے ہوتے ہیں

میں آج بھی اپنی نوزائیدہ تحریک کے راہنمیں کو یہ زور دے کر یاد دلاتا ہوں کہ ایسے لوگوں سے خبردار رہنا چاہئے جو اپنے آپ کو "خاموش رکن" کا نام دیتے ہیں۔ یہ خاموش رکن صرف بزدل ہی نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ جاہل اور نکمے بھی ہوتے ہیں۔ جس شخص کو بھی علم حاصل ہے اور جو جانتا ہے کہ کوئی نظریہ اور قوم ہے اور وہ اس نظریہ کے علاج سے بھی واقف ہے اس کا فرض ہے کہ وہ خاموش نہ رہے بلکہ سامنے آکر کھلے کھلے بحث مباحثہ کرے اور اپنے نظریہ کے مخالفین کو دلائل سے قائل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر ثابت ہو رہا ہے اس کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کردار بھی پختہ نہیں وہ اس پیچیدہ عمل میں آنے سے گھبراتا ہے کہ یا تو وہ بزدل ہے یا نالائق کیونکہ ایسے "خاموش کارکنوں" کی موجودگی سے بہتر جانتا ہے کہ کس کام کے ہوتے ہیں ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں ہوتا جو سچ مچ کا کوئی کام کر کے دکھائے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے کرتوں سے کوئی نتیجہ نکلنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں وہ ہوتے بالکل ہیچ ہیں لیکن ظاہر یہ کرتے ہیں کہ اپنے "خاموش کام" میں بہت مصروف ہیں مطلب یہ کہ ایسے لوگ ہر سر دھوکہ و ریا ہی مناصب کے بھوکے اور مخلص کارکنوں کے حاسد ہوتے ہیں جب کسی ایسے کارکن کو اپنے سوا بہت سے "خاموش کاموں" کی مدح میں بھنبھناتے سنیں تو یقین جانیں کہ آپ کو ایک ایسے شخص سے واسطہ پڑا ہے جو خود کوئی تخلیقی کام نہیں کرتا، بلکہ دوسروں کی نشانی کا پھل چرا کر گزارہ کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں اس کمتر ذہنی سطح کے حیوانی کا بھی خیال کرنا چاہیے جس سے یہ سست، لکیر کے فقیر، دوسرے لوگوں کی محنت کے نتائج کو خاک میں ملا دیتے ہیں وہ دوسروں کے کام پر کڑی تنقید کرتے وقت بڑی دور کی لیتے ہیں ان کی یہی حرکتوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہماری قوم کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہوتے ہیں۔

تحریک کا ایک سادہ سے سادہ متعلق بھی یہ جانتا ہے کہ وہ کسی شراب خانہ میں میز پر کھڑے ہو کر حاضرین کی موجودگی میں دلیری سے اور کھلے کھلے اپنے خیالات کی

حمایت کر سکے ان دیگ کر بیٹھے رہنے والے مکانوں سے بہتر ہے وہ کم از کم دس بیس آدمیوں کو تحریک کا قائل کر دے گا اس کی خدمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور فون نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی کوششوں کے موثر ہونے کی بہت سے قائم کی جا سکتی ہے لیکن یہ مدعوش دھوکہ دہی اور جوابی کارگزاری کو طوری "نا معقول کام" کا نام دے کر سراہتے ہیں اور گمنامی کے آنچل میں منہ چھپا کر بیٹھ رہتے ہیں، بالکل گھٹیا کھوٹے ہیں اور صحیح معنوں میں اسی لقب کے مستحق ہیں اپنے قوم کے لیے یہ لوگ بالکل بیکار ہیں۔

ہمارا پہلا بڑا جلسہ عام

میں نے 1920ء کے آغاز میں تحریک کا پہلا بڑا جلسہ عام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اس تجویز کے متعلق ہمارے مابین اختلاف رائے پایا جاتا تھا تحریک کے بعض سرکردہ راکین کا خیال تھا کہ ابھی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا وقت نہیں آیا اور اس کا نتیجہ تحریک کے حق میں مضر ثابت ہونے کا خدشہ ہے، کیونکہ اس سے ہمارے مخالف نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ ہم انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہماری تحریک کے راکین نے اب دوسرے جلسوں میں شامل ہونا شروع کر دیا تھا وہاں یہ کارکن سوالات پوچھتے تھے، اور دوسرے مقررین کی تردید بھی کرتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ان کے خلاف شور مچا کر انہیں بٹھا دیا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کی بدولت سے تحریک کو بہت فائدہ پہنچتا ہی جاتا تھا لوگوں کو ہماری تحریک کے وجود کا علم ہونے لگا جوں جوں انہیں ہمارے مقاصد کا علم ہوتا گیا توں توں ہم سے ان کی نفرت اور دشمنی بڑھتی گئی اس وجہ سے ہم پر توجہ رکھنے میں حق بجانب تھے کہ ہمارے سرگرم دوست معقول تعداد میں ہمارے پہلے جلسے کو رونق بخشیں گے۔

مجھے خود امید تھی کہ شاید ہمارا پہلا جلسہ منعقد کر دیا جائے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر آج ہم نے اس طرف سے منہ موڑ لیا تو پھر کچھ عرصہ بعد ہمیں اس میں حصہ لینا

عوام ہی ان کا ساتھ دے سکے ان کا سارا زور چند لمحات پر صرف کر دیا گیا اور یہ لمحات دوبارہ نہ آئے کیونکہ اس وقت ہمارا مقصد یہاں سر بکف ہو کر بیٹھ جانا نہ تھا ہم نے یہ اشتہارات اور رسائل بڑی بڑی پوٹی کا پیٹ بھر کر تقسیم کیے پھر ہم پھر سے تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

تحریک کا خاص رنگ ہم نے سرخ قرار دیا کیونکہ سرخ رنگ جارحانہ ہوتا ہے اور سرخ رنگ کے استعمال سے یہ بھی توقع تھی کہ ہم اپنے مخالفین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر کے انہیں مشتعل کر سکیں گے اس طرح وہ ہمارے وجود کا احساس کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور ہمیں نظر انداز نہ کر سکیں گے۔

سرکاری عہدہ دار سوائے اپنا شاملہ قوم فروش ہوتے ہیں

ہماری اس تحریک میں ایک مشکل یہ ہوئی کہ ریاست کے انتخاب پسندوں اور کمیونسٹوں کا گٹھ جوڑ ظاہر ہو گیا ریاست میں ان دنوں عوامی پارٹی برسر اقتدار تھی جو ترقی کی مرکزی عوامی پارٹی سے ملحق تھی ہمارے اشتہارات سے کمیونسٹ عوام بہت متاثر ہو رہا تھا اس کو مایوس کرنے کے لیے عوامی پارٹی نے پورا زور لگایا ہماری سرگرمیوں پر پابندی لگانے کے لیے واضح حکم صادر کیا گیا پولیس کو جب ہمارے اشتہارات کی مماثلت کے بارے میں کوئی خبر نہ ملا تو کمیونسٹوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ سڑکوں پر لوگ اشتہار بانٹتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے آمد و رفت میں دقت پیدا ہوتی ہے یوں عام انبار عوام قوم پرست عوامی پارٹی اپنے کمیونسٹ حلیفوں کے آگے ننگی ہو گئی اور انہوں نے ہمارے اشتہارات کی ممانعت کر دی حالانکہ ان اشتہارات میں ایک ایسے پیغام کا ذکر تھا جس کی تکمیل لاکھوں مزدور قوم کے معاشرتی میں داخل ہونے کر آ رہے تھے ان لاکھوں مزدوروں کو بین الاقوامی شورش پسندوں نے ورغلا رکھا تھا اور انہیں خود اپنی قوم سے بیزار کر دیا تھا ہماری نو زائیدہ تحریک ان دنوں جس سخت جدوجہد میں مصروف تھی یہ اشتہارات اس کے شاہد ہیں آنے والی نسلیں ان اشتہارات کی صورت میں ہمارے

عزم پر منتج ہوا۔ مقدس رومی سلطنت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر قومی مقاصد نے ایک نئی تحریک کا کام کیا۔ کوشش کی جو انہیں صرف اس لیے ناپسند تھی کہ وہ قوم کے عوام کو قوم پرست بنا رہی تھی، اور انہیں ان کے اصل آقاؤں سے متنفر کر دینے کے لیے کوشاں تھی۔

یہ اشارات اس نظریہ کی تردید کے لیے بھی کافی ہیں کہ ان دنوں ہنگری میں قوم پرست حکومت کا عروج تھا۔ یہ اشارات اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اگر 1919ء سے لے کر 1923ء تک ہنگری میں قوم پرستی کا دور دورہ تھا تو وہ یہ تھی کہ وہاں کوئی قوم پرست حکومت قائم تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم پرستی کے جذبہ نے آہستہ آہستہ عوام پر قابو حاصل کر لیا تھا اور پھر حکومت عوام کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔ سرکاری حکام کا جہاں تک اس چیز سے تعلق ہے انہوں نے قوم پرستی کے اس سیلاب کے راستہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالیں۔ اور اسے ناممکن بنانے کی کوشش کی وہاں دوسرے کاری افسر ایسے تھے جنہیں اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

راست باز افسر ان دنوں پولیس کا افسر اعلیٰ تھا اس کا ایک وفادار مشیر ڈاکٹر فرک تھا جو اس کے ساتھ سب سے پرانا ساتھی تھا۔ اعلیٰ افسروں میں سے صرف یہی دو افسر تھے جو پوری مدارت اور اپنے ذاتی مفاد کو بھی نظر انداز کر دینے کی ہمت رکھتے تھے جو لوگ ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے ان میں سے صرف یہ دو افسر ایسے آدمی تھا جو عوام کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوا تھا، جو یہ فرض سمجھتا تھا کہ جن قوم کے اداروں کی خاطر اس نے سب کچھ قربان کر دیا تھا وہ اقتدار کی خاطر اسے تباہی میں ڈال دے۔ اسے جس قوم سے واسطہ تھا اس کی یہ حالت تھی کہ وہ کسی بات پر سرکاری افسروں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا یہ افسر قومی اداروں کی ضرورت کے جذبہ سے سرشار نہ تھے جو ان کی کارگزاری قوم کی نظر میں تھی وہ صرف حکومت کے آلہ کار تھے تاکہ اپنی روٹی کما سکیں انہیں قومی آزادی کا کچھ خیال نہ تھا سوائے اس کے کہ قوم ہنگری کی بالادستی ان کے سپرد تھی۔

بڑی بات یہ ہے کہ ہم ایک ایسا آدمی تھا جو کہ حکومت اور سرکار کے حامیوں کی وحشیانہ کے خلاف قوم کے غداروں کو اپنا دشمن مانتے سے ڈرتا نہ تھا، بلکہ قومی غداروں کی دشمنی ہو اپنی دولت اور شہرت کے لیے خطرے انفیار کرتا تھا ایسے آدمی کے پاس ہوتا ہیں اور کیونکہ ان کی نظرت دولت کے بارے ہوئے اخلاق اور ایمان مسرت تھے۔ جب چاروں جانب قوم بدحالی میں گرفتار ہو تو اس سے بہتر سامان مسرت اور ہو بھی کیا سکتا ہے وہ تو ہمارے زمانہ کا ایک بڑی خوبی تھا وہ ایک صاف کو جس خاندانی کی زندگی سے آزادی کی موت کو ہم سے ہی نہیں بلکہ دل سے بہتر جانتا تھا

میری رائے میں ہمارے تمام بڑے بڑے آدمیوں سے صرف ہم ہی اور اس کے ساتھی ڈاکٹر کو یہ حق حاصل ہے کہ ہمیں ہمارے قوم پرست بنا دیے کا ذمہ دار سمجھا جائے۔

ہماری تحریک تا قیامت زندہ رہے گی

ہم پہلا جلسہ عام منعقد کرنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ نہ صرف ہمارے پروگرام کا سامان تیار ہو، بلکہ ہمارے پروگرام کی موٹی موٹی شقیں بھی طبع ہو جائیں میں اس کتاب کی دوسری جلد میں ان اصولوں کو بیان کروں گا جو ہم نے پروگرام بناتے وقت مدنظر رکھے۔ یہاں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ پروگرام تیار کرتے وقت مقصد یہ تھا کہ نوجوان پڑھے تحریک کی مکمل صورت سے واقفیت کر دیا جائے، ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پروگرام پڑھ کر ہم تحریک کو سمجھ جائیں اور تعلیم یافتہ طبقات پہلے ہمارے پروگرام کا مذاق اڑاتے رہے، مگر اس پر بحثیں کرتے رہے اور بالآخر اس پر تنقید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے پروگرام کا جو اثر ہوا اس نے ثابت کر دیا کہ ہمارے خیالات صحیح تھے۔

اس دوران میں درجنوں ہی تحریکیں ہماری آنکھوں کے سامنے اٹھیں، اور پھر کوئی نشان چھوڑے بغیر ختم ہو گئیں۔ صرف ایک تحریک ایسی تھی جو اب سے لے کر آج تک

حاضرین سے ہی تھا جن لوگوں کو ہال کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تھی وہ باہر کھڑے تھے حاضرین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی یہ خوشی کی بات تھی کہ حاضرین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہیں ہم پیشہ سے بلانے کے خواہش مند تھے یہ بات دکھائی دیتا تھا کہ نصف سے زیادہ حاضرین کیمیاگر یا آرٹ فیشن ہیں وہ دل میں منصوبے کر آئے تھے کہ دوسرے پہلے ہی جلسہ عام کو آسمانی سے منتشر کر دیں گے۔

برخلاف ان کی توقع کے واقعات نے کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیا۔ جب پہلا مقرر تقریر ختم کر چکا تو میں نے اٹھنا چاہا تو مجھ پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی کہ کوئی بولے نہیں رہے ہیں ہال کے اندر جا بجا لوگوں میں مار پیٹ ہونے لگی میرے پاس جنگ کے لئے کوئی ہتھیار نہ تھا تحریک کے اصل مقلدین جلسہ خراب کرنے والوں کے ساتھ دست و گریباں ہو گئے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جلسہ کا کام دوبارہ بحال کر دیا گیا میں نے پھر اپنی تقریر شروع کی میں تقریباً نصف گھنٹہ بولا ہوں گا کہ "مردہ باد" کے نعرے "زندہ باد" کی گونج سے دب گئے آہستہ آہستہ "مردہ باد" ماند پڑ گئی اور چاروں جانب "زندہ باد" کی آوازیں آنے لگیں آخر کار سب ہی نے تحریک کے پروگرام کے بخیے نکات لوگوں کے سامنے ایک ایک کر کے پیش کیے اور انہیں اظہار رائے کی دعوت دی تو ہر نکتہ کا پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا۔ جب میں آخری نکتہ تک پہنچا تو جلسہ گاہ کے تمام حاضرین ایک نئے اتفاق و ایک تازہ ایمان اور ایک جدید عزم سے مالا مال ہو چکے تھے جلسہ تقریباً چار گھنٹہ کے بعد ختم ہوا جب عوام کالانعام سے کہا جانے لگا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس جائیں تو وہ ہر ہر قدم پر رکتے جاتے تھے تب انہیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی ہے جس کی مخلیق نہ صرف قوم کا نام بھی صفحۂ ہستی سے مٹنے نہ دیا ہے گا۔

غداروں کو پہچاننے کے لیے اقوام کی دیوانی کا خون کب جوش کھا چکا

یہ کسی پرکاری سلطانی جمہوری تھی جس سے لڑ کے وہی آگ اس اگلی تو رم کرے
گی جس کے تیار ہونے والی تھوڑے جس قوم کے سپہ سالار فریضہ ادا کرے گی اور
جنگی کے تو ایک حصار کا کام دے گی۔

جہاں میری آنکھیں نگاہ تصور سے ایک طرف جرمن قوم کے دوبارہ زندہ ہونے کا
نظارہ دیکھ رہی تھیں وہاں مجھے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ انقلاب کی دیوی اب 9 نومبر 1918ء
کے روز قوم سے غداری کا ارتکاب کرنے والوں کو پیوند خاک کے لیے اپنے ہولناک
جبڑے کھول رہی تھی جلسہ گاہ خالی ہو چکی تھی تحریک کا قافلہ منزل کی جانب اپنے سفر پر
روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حصہ دوم

دیباچہ مترجم

طبری کی خود نوشتہ سوانح عمری کی پہلی جلد میں اس کے خاندان کے اور اس کے ذاتی حالات بھی درج ہیں چنانچہ تزک بابری اور تزک جہانگیری وغیرہ کے [illegible] کی [illegible] روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلی جلد کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو اس کا نام "تزک طبری" رکھ دیا گیا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا اس وقت تک اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

شائقین کی قدر دانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب دوسری جلد کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے اس جلد میں مصنف نے "سرکار" کے متعلق اپنا نظریاتی عقیدہ واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کسی سرکار کے قیام کی جدوجہد کے لیے "جماعت" کی تنظیم کس طرح ہونی چاہیے "آئین" "سرکار" "قانون" کے متعلق مصنف کے نظریات کی وضاحت بھی اسی حصہ میں ہے۔ اس رعایت سے اس کا عنوان تجویز کرتے ہوئے "تزک جہانگیری" کی طرز [illegible] [illegible] کا نام زیادہ مناسب حال معلوم ہوا چنانچہ اس جلد کا نام [illegible] طبری رکھ دیا گیا ہے

طبری کا کلام [illegible] [illegible] [illegible] طبری کے [illegible] میں [illegible] تھی [illegible] چنانچہ اس جلد کے شروع میں [illegible] نقل کیا جا رہا ہے [illegible] لکھنے کی حاجت نہیں۔

[illegible]

[illegible]

لیکن [illegible] کے عروج کے وقت [illegible] ایک سیاسی کلام حکومت کے

مغربی تمدن کے اثرات کے ساتھ ساتھ اسلام کی مخالفت کرنی جاری ہے۔ روس، ترکی اور عرب میں تو انقلاب کے عروج سے پہلے بھی ڈکٹیٹر شپ قائم تھی۔ اسپین میں فرانکو اور اٹلی میں مسولینی نے مل کر ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔ امریکہ میں بھی حالات عدم استحکام اور انگلستان میں چرچل نے صیہونی مقاصد حاصل کرنے کو ڈکٹیٹر شپ سے کسی طرح کم نہ سمجھا۔ یہ باتیں معاہدوں کی خود ساختہ تاریخ شائع ہو چکی ہیں ان کا نمایاں ترین پہلو یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی سے یہ کوشش شروع ہو گئی تھی کہ جمہوریت کو ڈکٹیٹر شپ کے مقابلہ پر جنگ جیتنے کا اعزاز دیا جائے۔ آج ہر پارٹی آمریت کی بات کرتی ہے اور ہر پارٹی اپنے آپ کو جمہوریت کا علمبردار کہتی ہے۔ اس کے باوجود جمہوریت کے مستقبل پر جنگ جیتنے کے اختیارات اپنی ذات واحد میں سمیٹے بیٹھے ہیں ہوتی رہا یہ سوال کہ ان لوگوں کا یہ اختیار ان کی غیر معمولی قابلیت اور اپنی پسند قوم کے جذبات کی صحیح ترجمانی کے نتیجہ میں ایسا کون سا کامیاب ڈکٹیٹر گذرا ہے جو قابل تقلید اپنی قوم کا مزاج شناس اور قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار کرنے سے اس کی اہلیت میں کیا فرق پڑتا ہے۔

ہٹلر کے زوال کے بعد ڈکٹیٹر شپ نے دیکھتے ہی دیکھتے جو گوناگوں صورتیں اور بھیس بدلے ہیں اس کی داستان طویل ہے آج تو جمہوریت اور جمہوریت ایسی عام ہو چکی ہے کہ استبداد اور نظام حکومت مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں تجارت میں کنٹرول اور پریس سیاست میں بھی ایک اور حکومت سے اختلاف رائے رکھنے والے کو غدار قوم قرار دے کر تختہ دار پر کھینچ دینا یا گولی سے اڑا دینا ایک معمول کی رسم ہے جو کیمونسٹ اور جمہوری ملک میں یکساں اہتمام سے ادا ہوتی ہے۔

اگر حکومت میں کابینہ اور مجلس قانون ساز ایک مذہب ہے تو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ اس مذہب کا پیرو اصل ہے یا دوسرا یا خالی گروہ بندی لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اس ملک پر مذہب کا تسلط موجودہ عہد میں بیشتر اگر تھا۔

پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت رفتہ رفتہ معاہدین کے ہاتھ کے عہد میں حاصل کی گئی ہے

اس لیے ہمرفی زمانہ شیطنت کے بجائے ہمیں کی تعلیمات سے آگاہ رہنے کی خواہش
مندوں کو یہ بھی مناسب ہے۔

تورہ کلیری کی ایک اور قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ مظفر نے اس طرح کیبورڈ اور
مارکس زمر کے مسئلہ کو حل کیا ہے ایسا کیے ہوئے آج تک کیبورڈ سے کوئی خلاف نہیں
کر سکا۔ جی ہے وہی زمر جس کا نام شیطان کو شیطان ہی لکھ سکتا ہے جس نے اور
شتر اکبت کار ایک آدھ ہی ہو سکتا تھا۔

پیسہ اخبار لاہور
مورخہ یکم جنوری ۱۹۱۹ء
خاکسار
محمد عبدالعزیز چغتائی

☆☆☆☆☆☆

حصہ دوئم

باب اول ضابطہ حیات اور پارٹی کا باہمی رشتہ

(۱) پہلا جلسہ عام

ہماری تحریک کے رہنما اعظم پہلا تشکیل جلسہ عام 24 فروری 1920ء کو منعقد ہوا میونخ کے ہافبراہاس ہوٹل کے بڑے ضیافت ہال میں قریب دو ہزار سامعین کے سامنے ہماری تحریک کے بنیادی نکات کی وضاحت کی گئی حاضرین نے ہمارے منشور کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

پریشان خیالی اور بے یقینی دور کرنے کے لیے تحریک کا منشور ضروری ہے

اس زمانہ میں چاروں طرف ایسے ایسے طور پریشان خیالات و وہم پھیلے ہوئے تھے جن کا نہ صرف کوئی سر پیر نہ تھا بلکہ جو قوم و وطن کے حق میں ضرر رساں بھی تھے ہمیں ان پریشان خیالی، بے یقینی اور گمراہی کے خلاف ایک نئے جہاد کا آغاز کرنا تھا اس مہم کو پھیلاتے وقت ہمیں کیا اصول ملحوظ رہیں گے اور ہمارے کام کو عمل کے لحاظ کیا ہوں گے، اس کی وضاحت ہمارے منشور کے پچیس نکات میں موجود تھی جب ہم نے یہ منشور عوام کے سامنے پیش کیا تو گویا ہم نے قوم کو آگاہ کر دیا کہ ہماری تحریک کے بنیادی اصول کیا ہیں اور طریقہ کار کیا ہیں اور اس وقت کہ جب پہلے دن سے ایک نئی طاقت کا ظہور ہونے والا تھا قضاء قدر کا حکم ہو چکا تھا کہ جب کیلوسٹوں کی تاتھاگت کی پوجا کی جگہ کے قریب پہنچے تو اس وقت بدھی وقت ٹھہرے اور قسمت کے چکر کی گردش پلٹ دے۔ کیلوسٹ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے روک دیئے جائیں گے۔

قوم کو نئے انقلابی ہراول کی نہیں بلکہ ایک انقلابی ضابطہ حیات کی ضرورت ہے

اس زمانی عہد و پیمان میں عوام کی پوری عمومی دلچسپی ضرورت تھی کہ جمہور کے اندر تحریک کا بیج بویا جا سکے۔ لیکن یہ عمومی دلچسپی کے اس عہد و پیمان میں کامیابی حاصل تھی عوام کی عمومی اور جمہور میں تحریک کا بیج صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے جب شروع سے ہی تحریک کے مقلدین کے دل میں یہ پختہ یقین نقش کر دیا جاتا کہ ہماری تحریک ملک کے سیاسی اکھاڑے میں محض کوئی نیا انقلابی ہراول کھڑا کرنے کے لیے نہیں اٹھی ہے بلکہ ہماری تحریک تو ایک جدید ضابطہ حیات کی علمبردار ہے اور یہ ضابطہ حیات ایک مکمل انقلاب کا پیامبر ہے۔

ان دنوں کی سیاسی فضا کا مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کیا ہی رنگ دیباچے کو بیان کر کے سیاسی پارٹیوں کے ہر نئے منشور تصنیف ہوتے رہتے تھے وقتاً فوقتاً منشور پر تازہ دم بھیجا جاتا تھا اور ضرورت ہوتی تو یہ دیباچہ بھی لکھا جاتا تھا یہ منشور کیا ہوتا تھا ہر سال اس کے دیباچہ کا ایک مسودہ ہوتا تھا جو گرگٹ کی طرح پارٹی پارٹی رنگ بدلتا رہتا تھا اس مسودہ کا مسخ نسب کھنا ہوتو ان مقاصد پر غور کرنا ہوگا۔ جن کے ماتحت یہ عموم "منشور کمیٹیوں" کے کرتا دھرتا "رکھن" ہوگرام تیار کرتے بیٹھے تھے۔

انقلابی رنگ کے "منشور"

ان لوگوں کو ہمیشہ ایک ہی دھن سر پر سوار رہتی تھی جو ہے وہ منشور میں سے کوئی شق خارج کریں یا جو ہے کسی مد کا اضافہ کریں ان کا مقصد نگاہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آخر وہ کمیشن ہی اس کا ذکر کیا ہوگا پارلیمنٹری نظام حکومت کے ان کو پیمانوں کو دیکھ کر ذرا بھی شک ہو جاتا کہ ان کے "عزیز از جان جمہور" نے ان دو نظام کو دیکھ کر منہ پھیر لیا ہو جائیں گے تو یہ پہلے کل سالیں خود ساختہ جمہوری نظام کی مثل میں لے کر سامنے آ جاتے

تھے ایسے موقعوں پر پارٹی کے سیاسی نوعیت اور انتخابی رائل حال دیکھنے والوں کی بھی خوب ہی آتی تھی ان بزرگوں کو بھی "انتخابی دنگل علیہ" کا نام دیا جاتا تھا اور بھی "ماہرین الیکشن" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا بالعموم یہ حضرات ایسے پرانے پارلیمنٹری گرگے ہوتے تھے جو ماضی میں الیکشن لڑتے لڑتے اب اس "فن" میں طاق ہو چکے تھے۔

انہیں خوب یاد رہتا تھا کہ گذشتہ الیکشن میں رائے دہندگان کی مواقع پر کشتہ ہو گئے تھے وہ بھی ہوتے تھے کہ آج کن عادتوں سے بھاپ کر عوام کی پرستش کا رخ وقت اختیار کر لینا چاہیے رائے دہندگان کی برائی کو دور کرنے کے لئے ایک ہی "دوا" بتایا جاتا تھا کہ پہلے ایک کمیٹی بنالی جائے پھر عوامی رجحان معلوم کرنے کے بعد اس کمیٹی کی رپورٹ پڑھی جائے کہ آج کل عوام میں کیا چاہتے ہیں یہ لوگ اشارات کو سمجھ کر اندازہ کر لیتے تھے کہ ان کے "عوامی رجحان معلوم" آج کل کیا خواہشات رکھتے ہیں، کن امور سے بیزار ہو چکے ہیں اور کن امیدوں سے سرشار ہیں مختلف طبقات اور گروہوں کی توقعات اور خدشات کا جو اندازہ کیا جاتا تھا کہ ہر پیشہ ور کاروبار اور محنت و مزدوری کے ماہرین کی رائے امنگوں کی بھی تحقیق کی جاتی اور بطور مطالعہ ہوتا۔ حالات پارٹیوں کے ان جلتے ہوئے امور سے اندازہ محسوس کیا جاتا۔ انہیں بنانے کی کوشش کی جاتی بسا اوقات ان امور کے اصلی مصلحین اور مبلغین یہ دیکھ کر شش و پنج میں پڑ جاتے کہ جس کے خلاف غم و غصہ پیدا کیا گیا تھا، انہیں کے لوں پر اس کا سب سے زیادہ اثر ہو رہا ہے پارٹیوں کا "سے غرے" بھی کرنے جاتا کوئی چیز اثر کرتی تھی۔

پروردگار کی بے اندازہ عظمت، یہ رائے دہندگان کی بے پایاں

حماقت

غرض کمیٹیوں کے اجلاس منعقد ہوتے، پرانے مشورے "نظر ثانی" کی جاتی، نئے مشورے گھڑے جاتے ان لوگوں کے لئے یہ وقت بہت تھکا دینے والا ہوتا اس سے زیادہ دشوار

ملط کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کا مقابلہ آج بھی مستقبل میں بھی مطلق العنان جمہوریت کے تصور کے تحت سے کیا جا سکتا ہے یہ پارلیمنٹری شعبدہ باز اکثر کھائے پیتے خرابات کے گھرانوں سے وابستہ ہوتے تھے۔

کمیونسٹ قول کے کچے اور چال کے پکے ہوتے ہیں

کمیونسٹ اسی وقت تک جمہوریت کا دفاع کرتے ہیں، جب تک جمہوریت کسی نہ کسی طرح کمیونسٹوں کے مخصوص مقاصد کے حصول میں ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے کمیونسٹوں کے لیے جمہوریت کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ جس قوم پر مسلط جابر کو کمیونسٹ ختم کر رہے ہوتے ہیں جمہوریت کی آڑ لے کر اپنے قوم پر مسلط جابر کا خاتمہ بھی وقتی طور پر کمیونسٹوں کو حاصل ہو جاتا ہے وہاں جس روز کمیونسٹوں کو یقین ہو گیا کہ جمہوریت ان کے مقصد کے لیے دور رس ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے اسی روز کمیونسٹ جمہوریت کا بات بھی اسی طرح الٹ کر رکھ دیں گے جیسے جادوگر یہاں اپنے ہونے کا جادو پھونک کر لینے کے بعد اس کرامتی کو الٹ دیا کرتے ہیں، جس میں وہ جانے کیا کیا آپ شاپ ڈال کر جادو پورا کرنے کی خاطر دھونی رمائی ہوتی ہے جب بھی کمیونسٹوں کو یہ خطرہ محسوس ہو کہ لوگوں کی اکثریت کمیونزم کے خلاف کوئی ایسا قانون بنانے والی ہے جس سے کمیونزم کے قلع قمع کا امکان ہو سکتا ہے تو کمیونسٹ فی الفور جمہوریت کے بھان متی کے کنبے کے گن گانے سے دستبردار ہو جائیں گے اور جمہوری ضمیر سے بیل کرنے کی بجائے کمیونسٹوں کی یہی اقوامی لوہیں اور تپتے میدان جنگ میں اترنے سے دریغ نہ کریں گے عوام کو سڑکوں پر مشتعل کیا جائے گا اس کے بعد جو معرکہ ہوگا اس کا فیصلہ پارلیمنٹری "ثالثانہ فضا" میں نہ ہو گا بلکہ اس معرکہ کا نتیجہ سڑکوں اور کارخانوں میں ہاتھا پائی اور گولیوں کے بعد برآمد ہو گا اسی روز جمہوریت کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلے گا پارلیمنٹ میں "عوامی نمائندے" مصنوعی اور مصلحتی کا پردہ اوڑھ کر واہی تباہی بکنے کی چوری سے اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہ چکے ہوں گے

بجرا سے نچلے مزدوروں کے ہاتھ میں تھوڑے اور زیادہ پیسے دے کر بلوہ باری سے پورا کیا جائے 1918ء کے موسم خزاں میں ہم اپنی آنکھوں سے یہ ہوتے دیکھ چکے ہیں جب کہ بولشویکوں کی ضرب کاری محنت کا کلام پاش پاش کر چکے ہوں گے تب ان کھاتے پیتے گھروں کو اس سے ہوگا کہ عارضی جمہوریت کا خواب میں کھا کر گیا ہے بلاشبہ کورنسکی جیسے کا زعم کیا ہے مثال وقت تھی۔

بے اصول دشمن کا مقابلہ بے اصول بن کر نہیں کیا جا سکتا ہے

زندگی کے ایک اصول کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں اور اب بھی اسے دہرا دوں جب کسی کھیل کے میدان میں پہلی بار کسی نئے کھلاڑی کو کھیل کے قواعد کا درس ہر گز نہیں کرتے بلکہ وہاں قواعد کو اسی وقت تک تعلیم کرتے ہیں جب تک ان قواعد کو اپنے نفع کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے اپنے حریفوں کو بھنوں میں گرفتار رکھنے میں جوں ہی یہ قواعد ان کے حق میں مضر ثابت ہوں انہیں اپنے قواعد کی خلاف ورزی میں ایک لحظہ توقف نہیں ہوتا تو ایسے کھیل کے میدان میں کسی کے قواعد کی پابندی سے اطاعت کرنا حماقت ہی ہوگی۔

کامیابی پارلیمنٹ میں نشستوں کی اکثریت سے نہیں خلقت کے ایمان سے حاصل ہوتی ہے

کھاتے پیتے لوگوں کی تمام ہم شرب بیوی پارٹیاں، سیاسی جدوجہد کا مقصد فقط یہ تصور کرتی ہیں کہ پارلیمنٹ میں نشستیں حاصل کرنے کی سعی کی جائے جوں ہی ان جماعتوں کے مقاصد اور اصول ایکشن کے معرکہ میں بے ثمر ثابت ہوں انہیں بلی پشت ڈال دیا جاتا ہے، گویا ہوا کا ایک جھونکا آیا تھا جو آیا اور گزر گیا۔ منشور بھی اسی انداز سے تیار کیے جاتے ہیں اور ان کا حشر بھی یہی ہوتا ہے ان جماعتوں کا یہ طرز عمل ایشیا کے ضعف کا باعث ہوتا ہے ایسی جماعتیں اس مقناطیسی قوت سے محروم رہتے ہیں جو عام خلقت کو اپنی جانب کھینچ کر لاتی ہے [illegible] کل حاضر کی جانب کھینچتے ہیں

جو فیض کردہ نصب العین میں داخلی کے ایسی وفق سے پیدا ہوتی ہے جمہوری
جماعت کا ساتھ دیتے ہیں جو اپنے اصول اور اعتقاد کو بچانے اور پھیلانے کی خاطر
مرنے مارنے پر آمادہ ہو۔

پارلیمنٹ کی چوکھٹ کے سامنے عہدوں کی طلب میں صدا لگانے
والے بھک منگے

فی زمانہ ایک طریق نے ہر قسم کی سیاسی قوتوں سے مسلح ہو کر دھاوا بول دیا ہے اس
طریق نے یہ سیاسی قوت زندگی کے متعلق اپنے تصورات کو مسلط کر کے فراہم کی ہے اگر یہ
تصورات مجرمانہ نوعیت کے ہیں تو اس سے ان کی تنظیم پر حالت میں کچھ فرق نہیں آتا
مگر ہیں حالات معاشرت کے موجودہ نظام کو صرف اسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے جبکہ
ہر طریق یک نئے فلسفہ حیات پر اعتقاد کامل رکھتا ہو، اور اپنی قوت اعتقاد سے ایک
تازہ ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے ہماری پارٹی نے یہ تازہ ولولہ سیاسی
اعتقادات کے ذریعہ پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا قوم کو بچانے کے لیے ہمیں جس بڑے دل اور
کمر ہمت مرد نے قیادت کی باگ سنبھال رکھی ہے اس کو ہمارا کہنا ہمارے سیاسی عقیدے
پر ایمان رکھنے والوں کو ہر عقد اور اقدام کی ہمت ضرور ہی ہے اس مقصد میں کامیابی تبھی ہو
سکتی ہے جب ہم دلیری اور بے جگری سے بڑھتے ہوئے ایک قلعہ بند اور ہوشیار
ہماری تحریک پر ہونے والے اس الزام کا جواب دیتا ہے کہ یہ تو ایک متشددانہ انتہا پسند تحریک ہے یہ
الزام لگانے والوں میں ہماری اعتدال پسند پارٹی کے نمائندے قریب قریب ہیں ایسے
بہت سے سیاسی عہدوں کو ہمارا ایک ہی جواب کافی ہے ہم انہیں مخاطب کر کے برملا
کہتے ہیں کہ ہم وہ فرض ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کو ادا کرنے میں تم نے
اپنی مجرمانہ غفلت کے باعث آج تک کوتاہی سے کام لیا ہے ہمارے پارلیمنٹ کی چوکھٹ
کے سامنے عہدوں کی طلب میں صدا لگانے والے بھک منگوں نے ملک کی تباہی میں
کیا کسر اٹھا رکھی ہے ہم اپنی جماعت کی تشکیل سے ایک بالکل جدید حیات تیار کر رہے ہیں

جس کی حفاظت کے لیے ہم اپنی جانیں نثار کریں گے اور کبھی پیچھے نہ ہٹیں گے ہمارا اس رہنے کی تعمیر میں مصروف ہیں جس پر چل کر ہماری قوم ایک مرتبہ پھر آزادی کا اعلیٰ مقام حاصل کر سکے گی۔

مجاہدوں کا گروہ یا الیکشن ورکروں کی منڈلی

غرض ہماری تحریک کے ابتدائی ایام میں ہمیں خاص طور پر احتیاط ملحوظ رکھنی پڑتی تھی کہ ہر طرف سے بھر مجاہدوں کا گروہ ہو جو ایک نئے سیاسی ایمان کی تلقین کی خاطر میدان میں نکلا تھا، کہیں الیکشن ورکر کرنے والوں کی منڈلی نہ بن کر رہ جائے۔

سب سے پہلا انتظامی قدم تو ہم نے یہ کیا کہ ایک ایسا دستور مرتب کرایا جس سے ایک خاص طرح کی اخلاقی پابندی ہماری تحریک کا طرۂ امتیاز بن گئی یہ اخلاقی حکمت تمام پرانی جماعتوں اور پارٹیوں سے ہماری تحریک کو ہر حال میں الگ رکھنے کے لیے کافی تھی جو آج کل سیاسی پارٹیوں میں دیکھ رہے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب کا نتیجہ تھا جس کا ذکر میں ایک سطر اوپر کر چکا ہوں یہ بات ہو جاتا ہے کہ ہمارا یہ طرز عمل ہی برحق خود تحریک کا مقصود واصل اور دوسری تحریکوں سے قطعاً ممتاز ہو جائے۔

نئی سیاسی تحریک کے لیے "سرکار" کا تخیل درکار ہے

اس دور سیاسی پارٹیوں کے گروہ بندی کا خاص سے ہم کوئی آگاہ تھے ہم بتا چکے ہیں کہ اگر ہمیں ایک نئی سلطنت تعمیر کرنا ہے تو ہمیں "سرکار" کا ایک نیا تصور اختراع کرنا ہو گا جو اس سے بالکل علیحدہ ہو گا جس میں تب ہماری قوم کی اکثریت مبتلا تھی حکومت کا یہ جدید تصور زندگی کے متعلق ہمارے نئے خیال کی بنیاد تھی۔

میں اس کتاب کی پچھلی جلد میں "امت" کی اصطلاح کے متعلق اپنے خیالات پیش کر چکا ہوں میں نے وہاں یوں کہا ہے کہ امت کا مفہوم غیر معین اور موہوم ہے آج امت کا لفظ کسی ایسے واضح مفہوم سے عاری ہے جس پر کسی مجاہدانہ تنظیم کی بنیاد رکھی جا

سکے ہر وضع اور ہر مشرب کے لوگ اختیاری راہوں پر چلتے رہے ہیں اور ہمارے ہاں بھی یہی
کاموں پر امت کا سارا بوجھ ڈالے بیٹھے ہیں میں "قوم پرست" اشتراکی مزدور پارٹی"
کا پروگرام پیش کرنے سے پہلے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ امت کے معنی کیا ہیں اور اس لفظ
کا اور ہی تحریک سے کیا تعلق ہے اگر پوچھے تو آج لفظ امت کا کوئی واضح اور ٹھوس
مفہوم ہی نہیں اس کی بنا پر جماعتیں بنائی جا سکتی ہیں اور عمل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے
تو یہ لفظ بیماری کا مرض ہو چکا ہے جیسے کہ مثال کے طور پر لفظ "مذہب" عملی زندگی میں
مذہب کا نہ کوئی متعین مفہوم باقی رہا ہے اور نہ روزمرہ کی زندگی میں مذہب سے
رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

قلب کی دھندلی کیفیتیں اور عمل کا واضح راستہ

مذہب کا کوئی قطعی مفہوم تبھی طے پا سکتا ہے جب پہلے مذہب پر عمل کے لیے کوئی
واضح اور معین لائحہ عمل سامنے ہو اگر کہا جائے کہ فلاں صاحب بڑے "مذہب پرست"
اور "دیندار" ہیں تو ممکن ہے کہ یہ لفظ کانوں کو نہایت بھلا محسوس ہو لیکن عام طور پر جب
اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے مراد کیا ہے ممکن
ہے دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں اس قسم کے گول مول الفاظ اچھے لگتے ہوں
شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں "دینداری" کا کوئی ایسا مکمل اور واضح تصور بھی ہو کہ جب
وہ کسی شخص کو دیندار قرار دیں تو اس کی مخفی کیفیات کا کوئی خاکہ ان کے پیش نظر رہتا ہو
لیکن عام عقلت طلب دماغوں پر مشتمل ہماری گول مول "دینداری" سے عوام کے
پلے تو کچھ نہیں پڑتا کہ اس کے کن میں جو کچھ آئے وہی سوچتا رہے اور
جو کرنا چاہے کرتا رہے "دین" کی اس وقت تک عمل داری ممکن ہے جب تک قلب کی دھندلی
کیفیات روحانیت کے ہاتھوں سے نکل کر کسی دو ٹوک شریعت کا قالب اختیار نہ کر
لیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شریعت ایک ایسا ہادی ہے جس کے بغیر مقصود تک پہنچنے کا اور کوئی
راستہ نہیں ملتا اور یہ بھی اس مقصود کو بھی کوئی "مجموعہ اوہام" قرار نہیں دیا جا سکتا جو مقصود کی

انسان تو ہے کہ اس پر آسانی سے قابو بھی کیا جا سکے۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ بڑے سے بڑے نصب العین ہمیشہ کسی اہم اور عمیق حادثہ ہی کو جواز کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اس کی مثال یہی ہے کہ کمال حسن صورت ہی کی خوبی کا نام ہے لیکن آئینہ پر نظر ڈالو تو خوبصورتی تب ہی جلی معلوم ہوتی ہے جب اس سے بکوئی مطلب برآری بھی ہو سکے۔

مذہب چھوڑنے سے انسانیت کی بنیادیں ہل جائیں گی

یہ مذہب ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ انسان کو حیوانیت کے درجے سے اٹھا کر بلند تر مرتبہ کو عبور کرنے کی امنگ پیدا کرتا ہے مذہب کا استحکام اور تحفظ اسی اعتقاد میں مضمر ہے اگر آج ہم انسانے کی حالت پر ایک نگاہ واپس اگر ہم غور کریں کہ آج انسان کی روز مرہ عملی زندگی میں جو تھوڑی بہت اخلاقی اقدار کام کر رہی ہیں وہ محض مذہبی عقائد کی تعلیم اور مذہب پر ایمان لانے کے باعث قائم ہیں تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ آج بھی مذہبی تعلیمات کو بالکل ان کا کوئی مدل جواز کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس سے نوع انسانی کی بنیادیں ہل جائیں گی ہم بجنس سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی اعلیٰ اعتقادات کی خاطر زندہ نہیں رہتا بلکہ اعلیٰ اعتقادات کے طفیل انسان بن کر زندہ رہتا ممکن ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا وجود اعلیٰ اعتقادات کے طفیل قائم ہے اور اعلیٰ اعتقادات بغیر انسان کے وجود کے قائم نہیں رہ سکتے۔

مذہب کیا ہے

میں یہ بتلاؤں کہ مذہب محض ایسے تصورات اور اعتقادات پر مبنی ہے جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً یہ کہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ اس زندگی کے بعد ایک آخرت کی زندگی بھی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی یا یہ کہ اس کائنات کا کوئی رب بھی ہے لیکن کوئی فرد جو ان اعتقادات پر کبھی بھی جنبش کیوں نہ کھا سکا ہو پھر بھی کبھی یہ ثابت کرنے کی ممکن ہے کہ وہ ان اعتقادات کا منکر ہے یہ لوگ جو اپنے کو ملحد کہتے ہیں اس تعریف کے بعد

ن کو مالے ہوئے ہیں اگر اس کا تعلق صرف جذبات سے ہی نہیں بلکہ جذبات سے قوت عمل سے تقویت حاصل کر کے ایک واضح شریعت یا بیان کامل کی صورت اختیار کرتی ہے تو پھر یہ بیان محکم ہوگا۔ ایسا بیان محکم مذہبی جذبات کے اظہار کے لیے ایک مستقیم فراہم کرتا ہے جس پر چل کر یہ صرف مقصود کی صحیح پیشگی سامنے آتی ہے بلکہ راستے کی مزلیں بھی معین ہو جاتی ہیں۔

اگر جذباتی دور ہم تک محدود رہے اور شرعی معتقدات کی صورت اختیار نہ کرے تو زیادہ سے زیادہ یہ صرف بقائے انسانیت کے لیے کسی بلند اس کے مہم اور متصور رجحانات معاشرہ میں وقتی پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔

فقط آرزوؤں سے لبریز سینے کافی نہیں

اوپر میں نے جو کچھ لفظ "مذہب" کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کا صادق لفظ "مت" پر بھی کیا جا سکتا ہے مت کا مفہوم بھی جذباتی تصورات پر مشتمل ہے ان جذباتی تصورات کی زبردست اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ صرف یہ جذباتی تصورات ایسے گول مول اور مبہم واضح ہوتے ہیں کہ ان کو کسی حد کا پابند کرنا دشوار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص ان کی اپنی اپنی تعبیر کرنے لگتا ہے ان جذبوں کا مثبت سیاسی نظم کے جذباتی کام یہ بھی ہوتا ہے کسی ضابطہ حیات کو ایک عملی قوت بنا دینے کے لیے اور اس کے مختلف تقاضوں کے لوگ جذبات مہیا کرنے کی خاطر فقط آرزوؤں سے لبریز سینے اور ارادوں سے بھرے ہوئے دل کام نہیں دیا کرتے۔ آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جو حریت اور آزادی کا طالب نہیں مگر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ محض حریت کی طلب رکھنے سے سب کو آزادی حاصل ہو گئی نہیں جب تک آزادی کی آرزو میں اور حریت کے تصورات منظم فکروں کی صورت میں صف بند اور سرگرم ہو کر میدان جنگ میں نہیں نکل آتے تب تک کسی قوم کا خواب آزادی ثمر مند تعبیر نہیں ہوا کرتا۔

قوموں کے "ارتقائی پیکر" کا نامہ کار ہوتا ہے

کوئی ضابطہ حیات چاہے وہ کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو چاہے وہ
کتنی مثالی نہ رکھتا ہو لیکن اس ضابطہ حیات سے ہٹ کر کوئی ملت اس وقت تک اپنے عقیدہ
کے پیچھے کوئی ثمر حاصل نہیں کر سکے گی جب تک وہ ضابطہ حیات عملی نظام کی شکل میں
منظم ہو کر سامنے نہ آجائے اس کے ساتھ ہی یاد رکھو کہ قوموں کے اجتماعی پیکر کا نام
سرکار ہوا کرتا ہے جب تک کوئی سیاسی تحریک اپنی قوم کی سرکار پر قابض نہیں ہو جاتی اس
وقت تک اس تحریک کو مجبوراً ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت قبول کرنی ہوگی۔ حکومت کی
مسند پر قابض ہونے سے پہلے کوئی سیاسی پارٹی ساری امت کی نظروں میں کس طرح کھٹک
سکتی ہے۔

کوئی راستہ اختیار کیے بغیر آج تک کوئی مسافر کسی منزل پر نہیں پہنچا

اگر کسی نظری عقیدے سے مستفیض کی تعمیر میں کوئی مدد حاصل کرنا چاہتے ہو تو
پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے عقیدے کی نوعیت، ضرورت اور اس کے حدود کا ٹھیک ٹھیک تعین
کرو جب تک کسی عقیدے کا تعلق روزمرہ کے ٹھوس حقائق سے قائم نہیں کیا جاتا تب
تک کوئی سیاسی تحریک کس طرح اٹھائی جا سکتی ہے جو اس عقیدے کے اصولوں اور
مسلمات کی داخلی قوت سے اس عقیدے کی خاطر مر مٹنے والے سرفروشوں کی کوئی
جماعت پیدا کرے عام اصولوں کو سامنے رکھ کر ایک سیاسی منشور تصنیف کر لینا ہی
کیونکر کوئی ضابطہ حیات واضح سیاسی پروگرام کی شکل اختیار کیے بغیر رہنے کا نہیں ہو سکتا
جب تک ایمان کا رشتہ شب و روز کی دنیا کے معمولی دھندوں سے نہیں جوڑا جاتا تب
تک انسان کے نشیب زمین پر کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے سیاسی پروگرام کے لیے یہ کافی
نہیں کہ ایک مقصد نصب العین سامنے رکھ لیا جائے بلکہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اس
نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا ذرائع استعمال کیے جائیں کوئی راستہ اختیار کیے
بغیر آج تک کوئی مسافر بھی کسی منزل تک نہیں پہنچا۔ اگر مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے
طریقہ کار تلاش کرو۔

کچ پر عمل کے لیے بھی سوچ اور سلیقہ کی حاجت ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی نظری عقیدہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک عملی کی حاجت ہوا کرتی ہے۔ نری دعوی عقیدے آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح انسانیت کے خوشنما رہبر بن سکتے ہیں لیکن انسان ضعیف النسیان ان خوشنما اور درخشندہ روشنی کے میناروں سے تب ہی کوئی فیض حاصل کر سکتا ہے جب کسی اصلاحی تحریک کی ابتدا میں ہی عملی طریقیں انسان کی عملی کمزوریوں کو ایک دیوار کی صورت بنا کر اس نور کے سامنے حائل نہ کر دیں۔

کچ پر عمل کرنے کے لیے بھی کسی سوچ اور سلیقے کی حاجت ہوا کرتی ہے۔ اس کا بھی بندوبست کرنا اسی کو زیب دیتا ہے جو تمام کی کچ انسانی کوتاہیوں کا عملی تجربہ رکھتا ہو۔ عالم بشاری حقیقتوں کے ظہور پذیر ہونے اور اوقات و حالات کے دریائے ذخار سے انسان کچ دہن کی نکتگی بھی ہو سکتی ہے جب پیاسوں کو پانے کے لیے کوئی وہاں سے چلو بھر کر لانے کی تدبیر بھی تو جانتا ہو۔

کسی ضابطہ حیات کی کامیابی کے لیے اس ضابطہ حیات کا عملی پہلو بھی ہوتا ہے کچھ عام نظری اصول اخذ کرنے چاہئیں ان اصولوں کی بنا پر ایک مجاہدانہ جماعت منظم کی جائے جس کے ارکین کے ایمان میں وہم کوئی اختلاف نہ ہو گا اس جماعت کی صفیں واضح ہوں گی اس کی تنظیم سخت ہوں گی اس جماعت کے اوقات و اعزام میں کوئی داخلی مخالفت نہ ہو گی ارتقائی یہ تمام منازل اسی طریق ان منازل کو کامیابی سے طے کیے بغیر کوئی عقیدہ دنیا میں نہیں پھیلایا جا سکتا۔

امامت کے بغیر امت نہیں بن سکتی

کسی عقیدے کو ماننے والے تو ہزاروں لوگ ہو سکتے ہیں لیکن اسے سمجھنے والے بہت تھوڑے ہوا کرتے ہیں ضرورت ہے کہ ان سمجھنے والوں کی صفوں میں سے کوئی ایک

شخص کل کر سامنے آئے اور امامت کے فرائض انجام دے اس شخص کی یہی صفت ہونی چاہیے کہ وہ عام انسانوں کو صاف اور واضح صورت میں پیش کر سکے عوام کے دلوں میں جو جذبات اور مبہم خیالات اٹھتے رہتے ہیں یہ شخص انہیں زبان کی طرح بخشے اور پیغمبر کی طرح واضح اور دلنشین انداز میں ہدایت کرے گا کہ دنیا میں صرف یہی اصول ہیں جن پر عظمت کے منتشر عوامل کی وحدت سے ایک منظم اور متحد انسان کی قوت ایک زبردست پہاڑ کی طرح ابھر کر دوسرے پہاڑوں کے درمیان سربلند ہو جائے گی اس عمل کی جو زمانہ کی ضرورت سے ثابت ہے اپنے فرد کا حق و بطلان اس کی آخری کامیابی یا ناکامی سے ثابت ہوگا۔

نہ سب انسان برابر ہیں اور نہ سب امتیں برابر

جب ہم لفظ "امت" کے تمثیلی معنی دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو حسب ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں

رائج الوقت سیاسی عقائد کی رو سے "سرکار" تہذیب و تمدن پر تو اثر انداز ہو سکتی ہے لیکن خود "سرکار" کی تعمیر سے اصل کا کوئی تعلق نہیں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ سرکار کا وجود اقتصادی ضرورت سے پیدا ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ سرکار کی بنا انسان کے سیاسی حساسات کا تاریخی نتیجہ ہے سرکار کی بنیاد کے متعلق اس تصور سے بالکل منطقی نتائج لازم آتے ہیں یہ تصورات اور یہ منطقی نتائج ان بنیادی اصل عوامل کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے سرکار درحقیقت معرض وجود میں آتی ہے اسی تعامل اور تفاعل سے وہ حکمت عملی پیدا ہوتی ہے جس میں انفرادی شخصیت کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اگر ایک دفعہ اس حقیقت کا اقرار کر لیا جائے کہ مختلف نسلوں میں تخلیقی تحقیق کی استعداد کم و بیش ہے تو یہ بھی اصول خاص کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت ہمارے ذہن پر مسلط ہو کر ہمیں محتاط بنا دیتا ہے جب ایک دفعہ فرض کر لیا کہ ساری قسمیں مساوی ہیں تو پھر قوام ہو طن کے مراتب میں کیا تفریق باقی رہی؟ اور جب

قوم و ملت میں کوئی تمیز ہوتی نہیں تو مارکس کے فکر و عمل میں کس طرح کوئی پیچیدگی ہو سکتی ہے؟

مارکس ازم اشتراکی قوتوں کا نچوڑ ہے

آخر یہ مارکسی اشتراکیت ہے کیا؟ زندگی کا ایک عام مفہوم ہر کوئی عرصے سے دنیا میں رائج پا رہا تھا ایک ہوائی کارل مارکس نے اس عام مفہوم کی بنا پر ایک پوری ضابطہ تصنیف کر ڈالا لیکن زندگی کا یہ عام مفہوم کارل مارکس سے سینکڑوں پہلے نشوونما پا رہا تھا زندگی کے متعلق اگر ایسے جدید نظریات سے پہلے سے ایک دنیا کی طرح پھیل نہ چکے ہوتے تو مارکس کی سیاسی تعلیمات کو کبھی بھی حیرت انگیز کامیابی نہ ہوتی کارل مارکس کی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں اس جیسے لاکھوں انسان نوشتہ دیوار کی حرفوں کا شمار کر رہے تھے مارکس نے اپنے ذہن و فکر کی تیزی اور رسائی سے کام لیتے ہوئے گویا اشتہار چسپاں کرنے والے زور کا ہتھوڑا نکال لیا۔ یہ ہتھوڑا دراصل زور ہے اور اصل زور کے تمام سیاسی خصائص کا نچوڑ ہے۔ مگر مارکس نے مارکسی عبارت سے اس ہتھوڑا میں اور خوشنما شہرت بھی تیار کر دی ہے جس سے دنیا کے چلنے والی تمام آزادخواہوں کا ہاتھ ہو جائے گا۔ یہاں اس بات سے مارکس کی اپنی اصل یعنی یہودیوں کی ترقی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔

''مومن اور کافر'' یا ''منافق اور کافر''

مارکس ازم کے اصول ان نظریات کا نچوڑ ہیں جو ہمارے گردوپیش کی زندگی کی بنیادوں پر ہے ہیں اس بات کی خوش فہمی میں مبتلا رہا ہے کہ کھاتے پیتے طبقات کیونکر اس کا کوئی موثر مقابلہ کر سکیں گے ان کھاتے پیتے طبقات کی معاشرت تو خود اس زہر سے مسموم ہے جس سے مارکس ازم کا ہتھوڑا بنایا گیا ہے مارکس ازم سے کھاتے پیتے طبقات کا تصور دنیا کوئی اصولی اختلاف نہیں رکھتا بلکہ ان کے اتفاقات بنیادی ہیں مارکس ازم اور کھاتے پیتے لوگوں کی زندگی کے تصور میں فرق یہ نہیں جیسا ایک چور اور

قبول کرے بلکہ اس اصول پر بھی کے انسانیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس پر عقیدہ رکھنا کہ اگر کوئی اخلاقی اصول کسی عمل کا وجود خطرے میں ڈال دے اور وہ عمل بھی اخلاقی اصولوں کی حامل ہو تو تب بھی ایسے مہلک اخلاقی اصول کی پیروی جاری رکھنی چاہیے اخلاقی عمل کی خاطر بے عمل اخلاق کے وقت نہیں گزر رہا میں دوغلے ہو چکے ملاموں کا شکار ہو گیا تو انسانی حسن اور شرافت بھی کسی انسانی اصول کے قائم رہنے کا ہمیشہ کے لیے کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

رب کے برگزیدہ بندوں کا انکار رب کا انکار ہے

اس کرہ ارض پر انسانی تمدن اور انسانی تہذیب فقط اس عمل کے دم قدم سے وابستہ ہے اگر یہ تباہ ہو گئے اگر یہ ناکام ہو گئے تو یہ یاوہ گی وحشت اور بربریت کی جیت کی جا سکے گی۔

انسانی تمدن کی تاریخ نسلوں کی تاریخ ہے انہوں نے انسانی تمدن قائم کیا اگر انسانی تمدن کو قائم کرنے والی نسلیں مٹ گئیں تو انسانی تمدن بھی مفقود ہو جائے گا انسانیت کے تمدن کو فنا کرنا ایک بھیانک جرم ہے اس لیے انسانی تمدن قائم کرنے والی نسلوں پر کوئی آنچ آنا انسانیت کے خلاف ایک بھیانک جرم کا ارتکاب ہے ان لوگوں کے نزدیک انسانیت کا وجود امت کے عقیدے پر ہی ہے وہ عمل نسلوں کی دشمنی کو ایسا ہی بھیانک جرم تصور کرتے ہیں جو عدالت پر منحصر ہو تھوڑے کائنات کی برگزیدہ نسل کے خلاف اٹھتا ہے وہ گویا برگزیدگی بخشنے والے پروردگار کے کرم اور بخشش کے خلاف عصیان و طغیان کا مرتکب ہوتا ہے خدائی رحمت کے خلاف یوں بغاوت کرنے والوں کی مثال اس پھنکارتے ہوئے شیطان کی طرح ہے جس نے آدم کی برگزیدگی کے خلاف احتجاج کر کے جنت سے نکلوانے کی کوشش کی تھی۔

خیر الامم

ہر امت پر عقیدہ اور حقیقت خیر الامم کا کا ہے کے تقاضوں کا دوسرا نام ہے اس

عقیدے کی بدولت ان اعلیٰ قوتوں کے روبرو کھڑا ہونے کا موقع ملتا ہے جن سے ایک نئی زندگی کی مزاحمت کرتے ہوئے علم سے اعلیٰ تر مقامات تک بڑھ سکتی ہے اعلیٰ نسلوں کو پچھلوں کے مقابلہ میں برتری حاصل ہوتی ہے اور غیر ذی شعور کائنات میں ہر پہلو سے علم و استدلال کے موقع ہم پہنچ چکے ہیں جن کے اس دنیا میں ترقی کی تمام منزلیں طے کرنے کے بعد یہ گزشتہ دنیا کائنات ترقی کے راستوں پر بھی سرگرم سفر ہو سکتی ہے۔

ہم سے محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل بعید میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب انسان کو ایسے پیچیدہ مسائل درپیش ہوں گے جن کا حل تلاش کرنے کے لیے انسانیت کے بہترین دماغ درکار ہوں گے بہتر سے بہتر انسانوں کی یہ مشکل ہوگی تمام انسانوں کو تسخیر کرنے کی حق دار ہوگی دنیا کے تمام وسائل ہوں گے ہر قسم کے کرنے اس برگزیدہ نسل کے قبضے میں ہوں گے۔

فتح اس کی ہوگی جو سچا ہوگا

ظاہر ہے کہ ہمت کے کسی عقیدے کی ہر اعتبار تسلی تو نہیں پیش کی جا سکتی ہیں بلکہ عرصہ سے ہمارے ملک میں مشکل کوئی ایسی سیاسی تحریک ہوگی جو کسی نہ کسی مرحلے پر ہمت کے عقیدہ کو اپنانے کی کوشش نہ کرتی ہو باوجود اس کے یہ ہے کہ ہمت کے عمل تصور کو ابھی تک ایک جداگانہ عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک طرف تو یہ تصور ہے دوسری جانب انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے والے کئی اور عقیدے بھی موجود ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی تصور اور کائنات اور زندگی کی دیگر متعلقات میں بنیادی اختلاف ہے مثال کے طور پر کائنات کا ایک تصور مارکس ازم پیش کرتا ہے اس عقیدے کے پس پشت ایک عالمگیر مرکزی تنظیم ہے اس تنظیم کو بھی زبردست حاصل ہیں۔ اس تنظیم کے مقابلہ میں رنگا رنگ کے عقیدوں کا ایک انبار تھی کا کہ ہے دشمن کی متحدہ صف کے مقابلہ میں یہ بوقلمونی کیا اثر پیدا کر سکتا ہے؟ پہلے ضرور

تنظیموں سے فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مارکس ازم نے مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مقابلے میں کسی تنوع کا تصور پیش کرنا باقاعدہ تنظیم سے پیش کیا جائے اور اسی کامیابی کے لیے بھی میسر آ جائیں تو پھر دوسرا فریق بھی پہلے فریق کے برابر قوت و اہلیت پیدا کر لے گا اور فتح اس کی ہو گی جو بہتر ہو گا۔

منصوص اعتقادات کی ضرورت

لیکن ایک ضابطہ حیات کو اس وقت تک کسی تنظیم کی شکل نہیں دی جا سکتی جب تک پہلے اس ضابطہ حیات کی تفصیلات ٹھیک ٹھیک اور واضح طور پر معین نہ کر لی جائیں۔ مذہب میں جو حیثیت "منصوص اعتقادات" کو حاصل ہوتی ہے وہی مقام ایک ہمہ گیر منظم ہونے والی سیاسی پارٹیوں کے اصولوں کو حاصل ہوتا ہے لہٰذا اسلامی عقیدے پر مبنی ضابطہ حیات کو پیش کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ پہلا کام عمل مرتب کیا جائے اس کی خاطر لوگ اسی طرح اکٹھے ہوں جس طرح مارکس ازم کی خاطر کمیونسٹوں کی پارٹی بنتی ہے۔ جیسے کمیونسٹ بین الاقوامی اتحاد کے لیے لڑتے ہیں اسی طرح یہ پارٹی اسلامی تنوع کی خاطر جنگ کرے گی۔

یہ خاکہ و مقصد حاصل کرنے کے لیے جس قوم پر ست اشتراکی مزدور تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

"عقیدہ" بغیر تنظیم کے کارگر نہیں ہو سکتا

آج ضرورت ہے کہ امت کے عقیدے کے تمام لوازمات اور اس کی تفصیلات واضح طور سے معین کی جائیں تبھی یہ عقیدہ دعوت کا کام انجام دے سکے گا بغیر اس کے اس عقیدے کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس دعوے کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ ہم ذرا دیکھیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس عقیدے کو پارٹی کی بنیاد بنانے کی مخالفت کرتے ہیں؟ وہ کیوں مخالفت کرتے ہیں؟ یہ مخالفین کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ امت کا عقیدہ کسی ایک پارٹی کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ عقیدہ تو [illegible] دلوں میں سمایا ہوا ہے ان

لوگوں کا یہ اعتراض ہی ثابت کرتا ہے کہ عقیدہ دو آنکھوں میں سمایا ہوا ہے لیکن اس کے دلوں میں مارے رہنے سے متصادم اور مخالف عقائد کی کامیابی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ مخالف عقائد اس سیاسی پارٹی کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں جو دھاتی کلچر کے اقتصادی اصول پر قائم کی گئی ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر وہ صحیح نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہر سال قوم ہتھوڑے کے کنارے پر کھڑی ہونے کی بجائے آج ہتھوڑا کامیابی سے ہمکنار نہیں مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد کے عقیدے کو اس لیے کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ اس کے پس پشت ایک فکری تنظیم کام کر رہی ہے جو عقیدہ پوری موجود ہے جو ان تھک محنت کرتی رہتی ہے مزدوروں کے اس بین الاقوامی اتحاد کے مخالف عقیدے اگر آج تک بڑی بڑی فتوحات حاصل کرتے رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عقائد کے حامیوں کی صفوں میں کوئی اتحاد نہیں۔

عقائد کی من مانی تعبیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی

جب ایک عقیدہ ایک واضح ضابطہ حیات پیش کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کس طرح اجازت دے سکتا ہے کہ اس کے ماننے والے جو کچھ چاہے اس کی تعبیر کر لے۔ اگر ایسی کھلی چھٹی دے دی جائے تو پھر یہ عقیدہ مخالف عقیدوں سے جدوجہد کس طرح کر سکے گا اور کامیابی کیسے حاصل کرے گا کسی عقیدے میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لیے اور اسے صحیح پوزیشن سے ہٹانے کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس عقیدے پر ایمان کی کچھ واضح تعیین ہو گئی ہو شرائط ایمان طے کر لی جائیں پھر ان شرائط کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا جائے اور سوشلسٹ پارٹی کے بنیادی اصول کے طور پر مان لیا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ میں اسے اپنا خاص فرض سمجھتا ہوں کہ عام ضابطہ حیات کے وسیع دعوے اور مبہم نقوش میں سے وہ بنیادی اعتقادات منتخب کر کے پیش کروں جو شرائط ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں یہ شرائط ایمان واضح صاف اور معین ہوں گی ان شرائط ایمان کو قبول کر لینے کے بعد وہ تمام لوگ ایک جماعت و صف میں اکٹھے ہو جائیں گے جو ان کو

اپنی زندگی کا اصول بنائے ہوئے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل ہی قوم کی ہیئت اجتماعی کی حیثیت سے ہماری قومی تصور کائنات کی بنیادی شرائط یعنی کا پورا پورا پیش کرتی ہے مگر ان شرائط ایمان کی بنا پر ہماری ایک سیاسی جماعت عمل پیش کرتی ہے جس کے مرتب کرتے وقت زمانے کے موجودہ حالات پیش نظر رکھے گئے ہیں اس تحریک کو ہم تصدیق بصر کہہ سکتے ہیں ان کی کمزوریاں نظر انداز نہیں کی گئیں ہمارے گرد و پیش جو ٹھوس حقیقتیں موجود ہیں ان کا بھی خیال رکھا گیا ہے اس سیاسی الجمن کی قوت سے تمام صفات گروہ اور گروہ جماعت کی تنظیم میں شامل کی جائے گی پھر جماعت کی تنظیم کو اتنا وسعت بنا دیا جائے گا ممکن ہو۔ جب تک ایسی منظم اور قاعدہ جماعت کی تشکیل ممکن نہیں ہو جاتی تب تک ہیئت اجتماعی تصور کائنات کو دنیا میں مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم :: کس قسم کے معاشرتی نظام کو "سرکار" کہا جا سکتا ہے

سرکار کس چڑیا کا نام ہے

ہماری دنیا پر "سرکار" کی حکمرانی قائم کرنے کا الزام ہم نے ہی لگایا ہے۔ 1920-21ء میں جب زمیندار پنچایت اور کھاتے پیتے طبقات کے بڑے حلقوں نے ہماری تحریک کے خلاف یہ شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ یہ لوگ ملکی "سرکار" کی حکمرانی کو ختم کرنے میں یہ دلیل دینے کے بعد تک یہی پڑھے لکھوں بلکہ عام عوام کے ذہن میں اپنے سیاسی افکار سے ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں کہ انہیں ہماری نوزائیدہ تحریک کو ہوا کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کا اخلاقی حاصل ہو گیا ہے۔ ہم پر الزام یہ ہے کہ ہم بیوقوف لوگوں کے ایک بڑے حلقے میں یہ غلط تصور پیش کر رہے ہیں تو "سرکار" کے وقار کے منافی ہے ہمارے مخالفین جوش میں آ کر بھول جاتے ہیں کہ یہ کھاتے پیتے طبقات خود بھی تو "سرکار" کے کسی ایک تصور پر متفق نہیں اگر ان کھاتے پیتے طبقات سے پوچھا جائے کہ "سرکار" کی کوئی ایک قابل فہم تعریف کر دیجئے تو یہ لوگ کھڑے منہ تکنے لگتے ہیں سرکاری یونیورسٹیوں میں اس پر وقتاً فوقتاً مباحثے ہوتے رہتے ہیں کہ وہ طالب علموں کو سمجھا سکیں کہ "سرکار" کے لفظ کا مطلب کیا ہے۔ یونیورسٹیوں کے وہ پروفیسر جب اپنی طلباء کی جماعت میں لیکچر دینے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ اپنا سب سے پہلا فرض یہی سمجھتے ہیں کہ سرکار کی جس خاص شکل نے انہیں نوکری مہیا کر دی ہے اور ان کے ماہانہ کا بندوبست کیا ہے اس کی وہ جو زبردست تعریف کرتے اور اس کے لئے سرکاری قصیدے پڑھنے میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ سرکاری پیدائش کی وقت شکل اتنی زیادہ اختلافات ہوا کرتی ہے اس کی قریب کسی واضح عقلی تصور کی جائے پھر وہ ہر مشہور انقلابات کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ہم عمومی اور بڑے قابل فہم اختلاف کا ایک نمونہ ہوتا ہے

ہے سرکار کا اس کے وجود کا جواز ثابت کرنے کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی قبیلے یا شہنشاہ کے وقت کسی جنگ کا پروفیسر سرکار کے کیا معنی ہو سکتا ہے جبکہ ملک کی سرکار بیسویں صدی کی سب سے زیادہ طاقتور سرکار ہو۔ اس غریب پروفیسر کو بھی ایک مشکل کام درپیش ہے مشکل یہ ہے کہ آئین کا سبق پڑھانے والے اس پروفیسر صاحب کو نوکری اس لیے نہیں دی گئی کہ وہ علم یا تحقیق حق کے لیے کوئی خدمت انجام دیں۔ انھوں نے دستور کی جو خدمت کی ہے کہ اپنے آقا کے تقرر کا جواز ثابت کرتے رہیں۔ اگر سرکاری شکل بھولی بھالی ہے تو کیا حرج ہے۔ اگر سرکاری پولیس دلچسپی لیتی ہے تو بالکل مناسب کہ پروفیسر صاحب کو تو سرکار کا وجود ثابت کرنا ہے اور اس کی حمایت کرنا ہے مگر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ جب سرکاری ایجنسیز تو جہاں تک کہ چپے چپے حقائق کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ پروفیسر صاحب اپنے کرتب کھیلنے کے لیے پہلے تو اپنے گرد "اصولی اقدار" اور "کلی فرائض" اور "عمومی مقاصد" کے دھوئیں اڑاتے ہیں کہ بالکل نظر ہی نہ آئے اس وجہ سے وہ ہماری "صداقتی قائلوں" اور "وجوبی اصولوں" کے رعب داب سے یاد کیا جاتا ہے۔

عام طور سے کہا جا سکتا ہے کہ سرکار کا یہ تصوراتی تصور پیش کرنے والے تین طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا اقتدار کا دوسرا نام سرکار ہے

ناپختہ ذہنوں والوں کی بات ہو گئی ہیں کہ سرکار کم و بیش عوام کی رضامندی سے قائم کی ہوئی ایک انجمن ہے جس کے ارکین حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی اطاعت کا اقرار کرتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے اس عقیدے کو ماننے والے سب سے زیادہ ہیں ان ہی کی صفوں میں وہ لوگ پائے جاتے ہیں جو "قانون کے اقتدار" کے پرستار ہیں ان حضرات کی نگاہ میں عوام کی خواہش کی کوئی حیثیت نہیں۔ مگر ہیں سارے کہ "قانون کے اقتدار" کے

نہیں ان کے نزدیک پہلی شرط تو یہ ہے کہ سرکار کے وقت سارے ملک میں یکساں نظام حکومت ہونا چاہیے دوسری شرط یہ ہے کہ صرف ایک سرکاری زبان ہونی چاہیے اگر یہ سرکاری زبان صرف نظم ونسق کے اصطلاحی امور تک ہی محدود رہے تو بھی ان دقتوں کی تلافی ہو جائے گی ان کے نزدیک سرکار کے وجود کے لیے محض سرکاری اقتدار کافی ہے جو انہیں اس لیے تیسری شرط یہ ہے کہ سرکار کو رعایا کی بھلائی کا اہتمام کرنا چاہیے چوتھی شرط یہ ہے کہ سرکار کو رعایت کا لحاظ کرنا چاہیے ان لوگوں کے ذہن میں سرکار کا تصور رعایت کا مفہوم بالکل غلط ہوتا ہے رعایت کا یہ تصور وہ سرکار کا کاروبار تصور کرتے ہیں وہ سرکار کی ملازمانی کو محض اس لیے برا نہیں سمجھتے کہ یہ سرکاری ملازمانی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ پانچویں شرط بھی لگاتے ہیں کہ سرکاری کاروبار مستعدی اور کارکردگی سے انجام پانا چاہیے کسی سرکار کا محض عرصے سے قائم رہنے کی وجہ سے عہد حاضر میں اس سرکار کو کبھی بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں اس گروہ کے نزدیک چھٹی شرط یہ بھی ہے کہ سرکار کو برتری کی اقتصادی خوشحالی کا ذمہ لینا چاہیے غرض سرکار کا معیار کارکردگی ہے۔ اس عقیدے کے حامی زیادہ تر اوسط قسم کے ذہن رکھنے والے پیشہ طبقات ہیں وہ سے ترقی پسند اور جمہوریت پرست ہوتی ہیں عام طور پر اسی عقیدے کے حامی ہیں۔

کیا زبان سے قوم اور سرکار بنتی ہے

(تیسری قسم) تیسرے گروہ میں سب سے تھوڑی ہے ان کے نزدیک سرکار کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کو سیاسی اقتدار مہیا کرنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ ثابت ہو یہاں قوم سے مراد ایک ایسی وحدت ہے جو ایک ہی اصل سے تعلق رکھتی ہو اور ایک ہی زبان بولتی ہو۔ اس عقیدے کے حامیوں سے اگر پوچھا جائے کہ قوم کو سیاسی اقتدار مہیا کرنے سے کیا مراد ہے تو وہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے سکتے قومی زبان کی حمایت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس طرح سرکار کے ہاتھ میں ایک ایسا خلوص حربہ ہوگا جس سے سرکار کی رعایا حدود کے باوجود سرکار کا اقتدار قائم رہ سکے گا۔ اس کے علاوہ اسے زبان کا

نسل نے اپنی ہمارجی قوت سے اپنی مفتوح رعایا کو ہاتھوں کی زبان بولنے پر مجبور کر دیا حتیٰ کہ ایک ہزار سال بعد ایک دوسری قوم ہاتھوں کی زبان بولنے لگی اور تب مفتوحوں نے ہاتھوں کو مکمل طور پر مطیع کر کے چھوڑا۔

قومیت کی بنیاد نسل ہے

قوم کو جو چیز ایک قوم بناتی ہے وہ دراصل نہیں نسل ہے۔ قوموں میں گردش کرنے والا خون ہے اس پر جس پر بھی کوئی قوم اپنے جوہر مسلط کرنے کا ارادہ کرتی ہے اور جس قوم پر یہ مسلط کر دیا جاتا ہے اس کا خون بدلنا بھی ممکن ہوتا ظاہر ہے کہ یہ بات ممکن ہے خون میں ملاوٹ تو کی جا سکتی ہے لیکن اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جب خون میں ملاوٹ ہوتی ہے تو اس سے ہمیشہ اعلیٰ نسل مسخ ہو جاتی ہے۔ خون کی آمیزش کا انجام کار یہی ہوتا ہے کہ وہ خصلتیں مٹ جاتی ہیں جن کی بدولت فاتحوں نے کسی دوسری نسل پر غلبہ حاصل کیا ہو۔ جب کوئی بھی نسل کسی دوسری نسل کے ساتھ اختلاط کرتی ہے تو سب سے پہلے اس کی فوقیت تحقیق کی سطح سے ہٹ جاتی ہے۔ جو بے اس اختلاط کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی نئی نسل فاتحوں کی زبان بولنے میں تو دوفاتحوں ہی کی طرح روانی سے بولے۔ ایک عرصے تک وہ اس گفتگو کو سمجھنے میں کسی حد تک رقیق ہے ممکن ہے جو قوم تدریج اختلاط کے گڑھے میں گر رہی ہے وہ اس سے بالکل بے خبر ہو۔ بالکل اس کی فوقیت تحقیق کی سطح کو اٹھتے ہوئے پانی کی طرح ایک مرتبہ پھر تک لے اور ثقافت انتہائی پست اور تمدن کے بیرون کی سطح پیش کر جائے لیکن یہ بیرون کی سطح محض ان عناصر کی سرگرمیوں کی طفیل ہوتے ہیں جنہیں اعلیٰ نسل کی باقیات الصالحات کہا جا سکتا ہے یا یہ دوعلی نسل کے ان عناصر کے کارنامے ہوتے ہیں جن میں شریانوں کا خون غالب ہوتا ہے اور یہ رنگ دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اس دوعلی نسل کے آخری نمونے ہرگز ہرگز مصنوعی کایا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتے وہ ہمیشہ ثقافتی زوال اور ذہنیت تنگ کی مثال ہوتے ہیں۔

نسلی اختلاط سے اعلیٰ دوقائم نہیں ہو سکتا

یہ تو خوش قسمتی ہی سمجھی جا سکتی ہے کہ آسٹریا میں جرمن پرستی کے فروغ اور تسلط کو جو زبردست کی منصوبہ بندی کے مطابق کامیابی نہ ہوئی اگر یہ منصوبہ بندی کامیاب ہو جاتی تو غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آسٹرین سلطنت تو قائم ہو جاتی لیکن وہ صدیوں کے رسوخ کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جرمن عنصر کی برتری ختم ہو جاتی۔ صدیوں گزر جانے کے بعد بھی مطلق آبادی میں شاید منفرد جرمنی کا ایک بڑا حصہ پیدا ہو جاتا لیکن ہنگری کی آبادی کی اکثریت وسطی دور میں بڑا حصہ ہو چکا ہوتا۔ شاید ایک قومی سلطنت تو وجود میں آ جاتی لیکن وہ اصل میں جو ثقافتی تخلیق کی منفرد رکھتی تھی۔

جرمن قوم کے لیے یہ اچھا ہوا کہ اقتدار کے اس منصوبے کو کامیابی نہ ہوئی اگر یہ اقتدار کا یہ منصوبہ باقاعدہ طور پر کسی بڑے نصب العین کی خاطر ترک نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس رگ کا شاہی خاندان نہایت کوتاہ بین اور غلط نظر واقع ہوا تھا اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو آج جرمن قوم اور ایک ثقافتی عنصر کے سوا کچھ نہ ہوتی۔

ایسے عام نسلی قوم پرست رجحانات صرف آسٹریا میں ہی نہیں بلکہ جرمنی میں بھی اس قسم کے علاقائی جذبات میں چھپے ہوئے تھے وہ خوش قسمتی سے کئی ایسے لوگ ہی تھے جو استحاد کے ساتھ پابند تھے بھی جرمن پرستی کو فروغ دینے اور مسلط کرنے کی تجویزوں کی مخالفت کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس قسم کے منصوبوں سے جرمنی کی مشرقی سرحد پر جرمن پرستی کو فروغ حاصل ہو جائے گا یہاں پر وہ اس وہم میں مبتلا تھے کہ چیک قوم کے لوگوں کو جرمن زبان بولنے پر مجبور کر کے جرمن پرست بنایا جا سکتا ہے اگر یہ بات چل جاتی تو اس کے نتائج بہت مہلک ہوتے ایک اجنبی اس زبان کے استعمال سے اس بات کا اظہار کرتی ہو جرمن وحدت سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں اس اجنبی قوم کی ثقافت اور اس کی زندگی کی آزادی، اور اس کی شرافت اس کی ہستی کا آسانی سے جاتی۔

زبان سیکھنے سے خون نہیں بدل جاتا

یہ بیان کرنے سے طبیعت متنفر ہوتی ہے کہ آج بھی ہندوستان کے وفادار کو اس بات سے کیسے دھکا لگتا ہے کہ ہندوستان کا رہنے والا یہودی جب امریکہ میں داخل ہوتے ہیں تو پولیس والوں نے غلاموں کی طرح ہماری روں کا تماشا ہاں کرا دیکھا ہے اس پر کئی امریکی انہیں ہندوستانی کہتے تھے، کیونکہ امریکہ کے باشندے خود ہندوستان کی حالت سے ناآشنا ہیں یہاں تک میں نے اس پر مشرق سے آنے والے ان کہنے والے کو جن کو ہر گز ہندوستانی قوم کے ذاکر میں قبول نہ کرایا ہوگا کہ ہندوستان سے آکر ہندوستان کی روں پر بول سکتے ہیں۔

تاریخ سے ہندوستان پر ست کو مدد دینے اور مستعد کرنے کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے تلوار کے زور سے ہندوستان کو فتح کیا اور ہندوستان کا شکار وں نسل چلا کر اس ملک کو آباد کیا۔ اگر اس ملک کو ایجاد دینے میں کچھ اجنبی خون بھی ہماری قوم میں داخل ہو گیا تو اس حد تک یہ آبادکاری ہماری نسل پاکیزگی کے لیے بربادی کا بات ہوئی۔ آج ہندوستان میں انگریزی خون اور تہذیب کا جو تھوڑا سا امتزاج پایا جاتا ہے وہ اسی خون میں ملاوٹ کا نتیجہ ہے اگرچہ کئی لوگ ہماری قوم میں اس امتزاج دولت کے رجحان کو خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔

کیا سرکار مقصود بالذات ہے

تیسری قسم میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سرکار کو ایک حد تک قائم بالذات نصب العین کے طور پر قبول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک ایک سرکاری عہدہ خود سرکار ہے اس لیے ان کے نزدیک ایک سرکار کا قائم رکھنا نوع انسانی کے وجود کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

سرکار کے مفہوم کے متعلق خود ہمارا تجربہ حسب ذیل ہے

سرکار کے متعلق جو بہت سی آراء دنیا میں کی گئی ہیں ان سب میں یہ مشترک عنصر موجود ہے کہ وہ ایک بیرونی حقیقت کو تصور اختیار کر جاتی ہیں وہ بیرونی حقیقت یہ ہے کہ قانونی اقتدار کی تخلیق کی استعداد فقط چند افراد میں پائی جاتی ہے اس لیے سرکار کا

سب سے بڑا مقصد نسل کی بقا اور نکاح یعنی نسل کے تحفظ اور نکاح کے انسانی تہذیب و تمدن میں نہیں کر سکتے۔

سرکار خود کوئی مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے

یہی وجہ ہے کہ اس یہودی کارل مارکس نے غلط تصورات اور بے بنیاد نظریات کو مقدم قرار دیتے ہوئے سرکار کے مقصد کی جو وضاحت پیش کی ہے وہ درست نہیں ہے اس نے سرکار کے تصور سے نسلی اور قومی امور کا تذکرہ خارج کر دیا ہے نسل کی بقا کے پیچھے دہقانوں نے جس دوسرے تصور کو سرکار کی بنیاد قرار دیا ہے ان میں سے کوئی تصور عالمگیر طور پر معقول نہیں تھا چنانچہ مارکس ازم کا یہ عقیدہ وجود میں حاصل کر رہا ہے کہ سرکار کو ہمیشہ سے قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مارکس ازم مزدوروں کے ہیں انقلابی تصور کا جو عقیدہ وضع کرتا ہے اس کے خلاف کھاتے پیتے دہقانوں کی جدوجہد کی قسمت میں ہمیشہ ناکامی پہلے سے مقدر ہو چکی ہے کھاتے پیتے دہقانوں تو آمار سے ہی اس بنیادی اصولوں کو قربان کر دیتے ہیں جس کے وہ مارکس ازم کا مقابلہ کرنے کی ہرگز کوئی صورت نہیں۔ کھاتے پیتے دہقانوں کے مکار حریف نے ان کے کلاس کے کمزور پہلو تک پہنچ لیے ہیں اب مارکس ازم کھاتے پیتے دہقانوں حریف نے ان کے کلاس کے کمزور پہلوؤں پر انہیں تعصبات سے حملہ کر رہا ہے جو خود کھاتے پیتے دہقانوں نے ماضی میں مارکس ازم کو مہیا کر رکھے ہیں۔

مذہبی حلقات کوئی ایسی تحریک جو کائنات کے نسلی تصور کے عقیدے پر مبنی ہو اسے سب سے پہلے سرکار کی نوعیت اور مقصد کے متعلق یہ صحیح اور معقول عقیدہ دریافت کرنا ہوگا۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ سرکار بجائے خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔

سرکار محض ایک آلہ کار ہے

بطور سرکار کے انسانی تہذیب وتمدن کی کوئی اعلیٰ شکل ترقی نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی تہذیب وتمدن کی ترقی کا سرچشمہ سرکار ہے۔ تہذیب وتمدن کی ترقی کا سرچشمہ تو صرف وہ نسل ہے جسے قدرت نے تخلیقی تحقیق کی استعداد بخشی ہے روئے زمین پر ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ سرکاریں موجود ہوتی ہیں لیکن یہ صرف وہ ہیں جو تہذیب وتمدن کے خالق اور محافظ ہیں اگر آپ سوچیں تو ہر وہ تخلیقات جو آج دنیا کی مہذب اقوام کی رہنمائی حاصل کرتی ہے فنا ہو جائے گی، بلکہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ فقط سرکار کا قیام نسل انسانی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں بچا سکتا۔ سرکار کا قیام سرکار بنانے والوں کے وجود پر منحصر ہے۔ اور سرکار بنانے والوں کا وجود اعلیٰ ذہانت اور موثر نمائی کی اس استعداد پر منحصر ہے۔ جو صرف ایک خاص نسل کا حصہ ہے۔

تہذیب وتمدن کا سرچشمہ نسل ہے

مثال کے طور پر اگر آج کرہ ارض کسی زبردست زلزلے سے تہ و بالا ہو جائے اور سمندروں کی لہروں سے کوئی بلا کوہ ہمالیہ سو جائے تو اس ایک قیامت سے انسانی تہذیب فنا ہو سکتی ہے۔ روئے زمین پر کوئی سرکار باقی نہ رہے گی۔ نظام اور تربیت کی ہر شکل مٹ جائے گی ہزار ہا سال کی کمائی کا حاصل سے ثقافت اور تہذیب کے جو معیار قائم ہوئے ہیں ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ چاروں جانب سوائے موت کی ویرانی اور تباہی کے بیابان اور بنجر کے اور کچھ دکھائی نہ دے گا۔ غرض کہ بچے کھچے چند افراد جو اس تباہ کن انقلاب سے بچ جائیں وہ وہ افراد ہیں جو اس خاص نسل سے تعلق رکھتے ہوں جس کے اندر تہذیب وتمدن کی تعمیر کی ابتدائی استعداد ودیعت کی گئی ہے جب وہ دوبارہ آباد ہو جائے گا تو یہ زمین پھر ایک بار انسانی قوت تخلیق کے کرشموں سے گلزار بن جائے گی۔ چاہے یہ کام ایک ہزار برس کی یہاں تک جائیں۔ مگر اس کے لئے وہ نسل کی مٹ جائے جو تخلیقی تحقیق کی استعداد رکھتی ہے تو پھر چاہے دنیا میں اور

کوئی تبدیلی نہ آئے لیکن محض اس عمل کا تسلسل ہی رہنے زمین کو ایک بار پھر
گہستان بنانے کے لیے کافی ہوگا۔ تاریخ ایسی بہتیری مثالیں پیش کرتی ہے کہ جن
خطوں کا قیام تجلیاتی استعداد سے عاری نسلیں عمل میں لاتی ہیں کبھی بھی بنی نوع انسان
کو حاصل نہیں ہوتا۔ زمانہ قبل تاریخ میں حیوانوں کی کیا کیا قسمیں ختم ہو گئیں اور آج ان کا
کوئی نشان بھی باقی نہیں۔ اسی طرح انسان بھی اگر اس استعداد سے محروم ہو جائے جس
کی بدولت اپنی زندگی کا سارا سامان اور روزگار مہیا کرتا ہے تو وہ بھی ہستی سے نابود ہو
جائے گا۔

سرکار نسلی خصائص کے تحفظ اور نشوونما کے لیے ایک وسیلہ ہے

سرکار کبھی ثقافت کی ترقی کا کوئی مرحلہ طے نہیں کیا کرتی۔ سرکار تو فقط اس عمل کی
حفاظت کرتی ہے جس کے ذریعہ سے تہذیب و تمدن ترقی کرتی ہیں ممکن ہے کہ سرکار
بطور کسی تبدیلی کے صدیوں تک قائم رہے گو اس سرکار کے ماتحت رہنے والوں کی تخلیقی
استعداد اور اس استعداد سے متاثر ہونے والی زندگی میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو
جائے۔ کیونکہ سرکار نے نسلی استعداد کو روکنے میں اپنا فرض ٹھیک سے ادا نہیں کیا سرکار
بطور ایک مشین کے کام کرتی رہے گی لیکن اس میں تو کار بر جو قوم کے اندر داخل ہو چکا
ہے تہذیب و تمدن کو گھن کی طرح کھا جائے گا۔ یہ گھن کھایا ہوا تہذیب و تمدن ایک نہ ایک
دن اپنے زوال کے آثار بھی ظاہر کرنے لگے گا۔

غرض انسانوں کی اعلیٰ خصلتوں کو برقرار رکھنے کی شرط اول نہ سرکار نہیں بلکہ نسل ہے
انسان کی اعلیٰ خصلتیں فقط نسل کی مرہون منت ہیں۔

استعداد کے اظہار کے لیے "سازگار ماحول" درکار ہوتا ہے

نسلی اہلیت کبھی نہیں ممکن کہ یہ بیرونی حالات اس کے اظہار کا موقع مہیا نہ
کریں تو یہی اہلیت مدتوں دبی رہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ نسلوں کی تخلیقی
تحقیق کی استعداد ایسے زمانوں میں بھی موجود رہتی ہے جب بیرونی حالات وقتی طور پر اس

کے اختیار کی جازت نہ دیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے انصافی ہے کہ عیسائیت کے ورود سے قبل کے زمانے کے لوگ وحشی تھے اور تہذیب و تمدن سے عاری تھے ہم بھی تہذیب و تمدن سے عاری نہ تھے بات صرف اتنی تھی کہ ان کی شمالی علاقوں میں تب آباد تھے وہاں کی شدید سردی ان کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی تھی جس کے باعث ان کی تخلیقی استعداد کو اظہار کا موقع نہ ملا۔ جب اس زمانے میں بھی جنوبی علاقوں کی معتدل آب و ہوا میں آ جاتے تو پتا چلتا ہے ان جنوبی علاقوں میں ثقافت کا نام و نشان بھی نہ ہوتا تب بھی ان کے اندر جو تخلیقی استعداد ودیعت تھی وہ ضرور پھوٹتی اور پروان چڑھتی جیسا کہ مثال کے طور پر ہوا ان کے ملاقے میں ہوا۔ ہاں اس کے لیے یہ شرط لازمی تھی کہ یہ جنوبی سطیلیں ان لوگوں کا اور زیادہ دیر قیام کرنے کے لیے میسر ہو جائیں انہیں ہلاک کرنے سے کام لیا جا سکتا۔ ثقافت کی یہ تخلیقی استعداد صرف شمال کی سرد آب و ہوا میں رہنے والے لوگوں کے شمال کے قریب رہنے والے انگلو سیکسن اپنے بہتر آرام دہ گھروں میں بھی آباد کر دیے جائیں تو وہ کوئی تمدن تخلیق نہیں کر سکتے لیکن ان کی یہ تخلیقی استعداد ایک خاص انعام ہے جو صرف "ربانی" ہی نازل ہوا ہے یہ استعداد بھی عادت کی ہمسائگی کے باعث مضمحل ہو جاتی ہے اور بھی ماحول کی یکسانی سے بوڑھے کار آ جاتی ہے۔

اس تخلیق سے متعلق دو ایسی اصطلاحیں ہیں جن کا لفظ کیے جا سکتے ہیں۔

سرکار کی بنیاد روحانی یک رنگی اور جسمانی قرابت ہے

سرکار محض جسموں منصفہ کا ایک ذریعہ ہے سرکار کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ روحانی یک رنگی اور جسمانی قرابت رکھنے والے باشندوں کے تمدن اور معاشرت کے تحفظ و ارتقا کا اہتمام کرے ان علاقوں اور اس استعداد کے نشوونما کا اہتمام کیا جائے جو اس میں ودیعت ہیں ان علاقوں اور استعداد کا بیشتر حصہ اس کامل کامرانی و خود برقرار رکھنے پر صرف ہوگا اور مادی و خود برقرار رکھنے پر توجہ دینے سے نظر صرف ہوتی ہے گی۔ اسی

وثقافتی ترقی پر صرف کیا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بغیر مادی خوشحالی کے روحانی اور ثقافتی ترقی ممکن ہی نہیں۔

سرکار ایک چھلکا ہے جس کا مغز ملت کے مفاد میں

جو سرکار یہ مقصد پورا نہ کرے اسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ایسی سرکار سرکار نہیں آسیب ہے۔ ایسی سرکار کا فی الواقع وجود ہو اس کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں اگر کہا جائے کہ چونکہ سرکار موجود ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اسے برقرار رکھنا چاہیے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ڈاکوؤں کی کوئی ٹولی موجود ہو اور کہا جائے چونکہ یہ ٹولی موجود ہے لہٰذا اس کو قائم رکھنا چاہیے۔

بعض مدبر پرست شخصیتوں کی جو کہ ریاست کے ضابطہ حیات کے علمبردار ہیں اس اصول کے قائل نہیں کہ حقائق کو بہرحال قبول کر لینا چاہیے ہمارا عقیدہ ہے کہ جب حقائق بدلتے ہوں تو انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اگر بدلتے حقائق کو قبول کر لیا جائے تو پھر ہم کسی کے اور زبردست عقیدے کی حمایت کس طرح کر سکیں گے ہم تو ان بدلتے کاریوں کے محافظ بن کر رہ جائیں گے جن کا سچ چاروں طرف بدلتا ہے ہمیں واضح طور پر مطمح نظر اور چھلکے میں تمیز قائم رکھنی چاہیے سرکار ایک چھلکا ہے اور اس کا مغز وہ نسل ہے جو اس کے زیر سایہ پرورش پاتی ہے چھلکے کی خوبی اسی میں ہے کہ مغز کی حفاظت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے ورنہ بغیر مغز کا چھلکا بوجھ ہی ہوتا ہے۔

سرکار ملت کا "انتظامی پیکر" ہے

غرض کسی سرکار کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان نسلی خواص کی حفاظت اور نشوونما کا انتظام کیا جائے جن کی ثقافتی جدوجہد سے وہ حسن اور وقار پیدا ہوگا جو کسی انسانیت کا خاصہ ہے اور آریہ کے ہمارا عقیدہ ہے کہ سرکار محض ملت کے "انتظامی پیکر" کا دوسرا نام ہے یہ انتظامی پیکر صرف ملت کی نگاہ کا محور نہیں بلکہ اس کے ذمہ یہ فرض بھی ہے کہ ملت کی آزادی کامل اور بے تعلق [illegible] کا بندوبست کرے ملت کی ذہنی اور ثقافتی

جلایوں کی نشوونما اور ترقی کا اہتمام کرے۔

سرکار کا بھوت

آج کل لوگ ہمارے سروں پر جس قسم کی سرکار مسلط رکھنا چاہتے ہیں وہ سرکار نہیں بلکہ آسیب ہے یہ آسیب انسانی فطرت میں حلول ہو جانے سے وجود میں آتا ہے۔ جہاں اس آسیب کا سایہ پڑ جائے وہاں روحانی مذہب اور ذات کے سوا کوئی تجلی پیدا نہیں ہوتا۔

بعض مہربان شارحین کی خوب جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا اعتقادات کو قبول کرنے کے بعد فی زمانہ دنیا میں ایک انتظامی اہمیت کی علمبرداری اختیار کر رہے ہیں یعنی وہ یہ کہ ہمیں انتخاب پر مست کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتقادات اور اعمال کی کسوٹی ہمارے معاصرین کی تحسین و آفرین نہیں، بلکہ ہمارا فرض تو صرف یہ ہے کہ جس کو حق سمجھتے ہیں اس کی پیروی کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے آنے والی نسلیں اس کی قدر کریں گی اور وہ صرف ہماری آج کی جدوجہد کی داد دیں گے بلکہ اس کی تصدیق کرتے ہوئے ہمارے شروع کردہ کام کو آگے بڑھائیں گی۔

سرکار کا معیار نسل کی پرورش ہے

بعض مہربان شارحین سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے وقت سے مذکورہ بالا معیار پیش کرتے ہیں سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ جب کسی ایک قوم کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کیا جائے تو یہ اندازہ اضافی ہوتا ہے لیکن جب سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ تمام بنی نوع انسان کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کیا جائے تو اس اندازہ کو مطلق حیثیت رکھتا ہے و بقول دیگرے جس نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔۔ کسی مملکت کی خوبی و برتری کا اندازہ تو اس کے تمدنی معیار سے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس بات سے کہ سرکار کو بیرونی دنیا میں کتنی اہمیت دی جاتی ہے بلکہ سرکار کی خوبی و برتری کا معیار یہ ہے کہ اس سرکار کے ماتحت کام کرنے والے مجموعی طور پر اس حد تک اس نسل معاصر کی

ہو رہی ہے جن کی خاطر یہ سرکار قائم کی گئی ہے۔

"سرکار" ملت کی استعداد کے اعلیٰ ترین ارتقا کا ذریعہ ہے"

اگر کوئی سرکار نہ صرف اس نسل کو زندہ رکھنے کا اہتمام کرتی ہے جس کی خاطر اسے قائم کیا گیا ہے بلکہ اس سرکار کے وجود سے اس نسل کے تحفظ و بقا کا انتظام بھی ہو رہا ہے تو پھر اس سرکار کو ایک مثالی سرکار کہنا چاہیے قطع نظر اس کے کہ دنیا کی دیگر اس سرکار کو کن الفاظ سے یاد کرتی ہے یا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکار کا کام باشندوں میں اہلیت و استعداد پیدا کرنا نہیں، بلکہ سرکار کا فرض تو یہ ہے کہ باشندوں میں جو اہلیت و استعداد پہلے سے موجود ہے اس کے اعلیٰ ارتقا کا موقع بہم پہنچایا جائے۔ دوسری طرف اس سرکار کو مصر کہنا چاہیے جس میں چاہے ثقافت کا معیار بلند ہو لیکن اس ثقافت کے علمبرداروں کی نسلی پاکیزگی کو خلط ملط کر کے ان کی تباہی کا اہتمام کیا جا رہا ہو۔ جب کسی نسل کی پاکیزگی میں خلل آ جاتا ہے تو ثقافت و تمدن کی وہ جڑیں کٹ جاتی ہیں جن سے سبزہ و گل کی صورت کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ثقافت و تمدن سرکار پیدا نہیں کیا کرتی۔ سرکار تو فقط ایک نسل کے ہر فرد کو اکٹھے ایک زندہ تنظیم کی صورت میں دائم رہنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ اس زندہ تنظیم ہی کا نام سرکار ہے جب ایک نسل کے لوگ یوں ایک سرکار کے ماتحت ایک زندہ تنظیم کی صورت میں زندگی بسر کریں تو اس کا ثمر ثقافت و تمدن کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

سرکار اپنی رعایا کی سیاسی تنظیم کا نام ہے

میں ایک دفعہ پھر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ سرکار کی اصل کوئی وجود نہیں رکھتی سرکار تو ایک نسل کے باشندوں کی سیاسی تنظیم کی بیرونی شکل ہے یہی وجہ ہے کہ قبیلہ یا ثقافت کو سرکار کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سرکار کا معیار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے سرکار بنائی ہے ان لوگوں میں ثقافت کی تخلیق کی استعداد ہے ان کی قدر و قیمت بلیغیا وحشی قبیلوں کے ایک قبیلہ سے زیادہ ہے بلیغیا جو کہ ممکن ہے کہ بہادر ثقافت صلیبیوں کی

سرکار کی تنظیمی حالت، اگر محض کارگذاری کے نقطہ سے دیکھی جائے تو ہمارے ان اعلیٰ نمائندے مقصد اور کئے ہوئے کی سرکار سے بہتر ہو۔ سرکاری عمل کا بہترین آئینہ اچھا پولیس اور بہترین انتظامی ادارے کسی قوم میں حکومت کی مقصد اور طاقت پیدا نہیں کر سکتے اگر قدرت نے اس قوم کو اس قوت اور مقصد سے عاری کر دیا ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ سرکار کا آئینہ ڈھانچہ ٹھیک نہ ہو یا انتظامی اداروں میں خلل ہو اس کے باوجود قوم کی طاقت اور مقصد دھیرے دھیرے رفتہ رفتہ صالح ہو جائے گی یہ تب ہوتا ہے جب قوم کے ضمیر و اعلیٰ حواس کو آئین اور انتظام کے اس خلل کے باوجود کچل دیا جائے یا بار بار کر دیا جائے۔

سرکار کا مقصد قوت کو خارجی اثرات سے بچانا اور داخلی اثرات کا بڑھانا ہے

اس لیے کسی سرکار کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بدولت کسی خاص عمل کی سرد و گرمی اور مقصد کہاں تک متحکم ہو رہا ہے خارجی دنیا میں اس سرکار کی حیثیت کیا ہے۔ کچھ ہے یا نہیں اس سے اس کی داخلی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا غرض کسی سرکار کی صحیح قدر و قیمت کا صحیح اندازہ داخلی آسمان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انتظام یہ دیکھتا ہے کہ اس عمل کی سرکار ہے اس کی نگاہ رفتار کا اندازہ کہاں تک کر رہی ہے۔ برعکس اس کے کسی سرکار کی عمل قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ذرا نیچی گہرائی ہے یہ وہ مقام ہے جہاں صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سرکار اپنے داخلی فرائض انجام دینے میں کہاں تک ٹھیک کام کر رہی ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی طے کرنا ہے کہ جس عمل کی سرکار ہے اس عمل کی قوت اور نمائندہ مقصد ادارہ کہاں تک پست یا بلند ہے۔

کسی قوم کی سرکار

اس لیے جب کسی سرکار کے منصب و مقصد کی بلندی کا تذکرہ ہو تو پہلا سوال یہ کرنا چاہیے کہ منصب و مقصد کی بلندی کا تعلق [illegible] سرکار سے ہے یا کام کرنے

ہے کہ اپنی تنظیمی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملت کو وہ سازگار حالات مہیا کرے جن کے ذریعہ ملت اپنی اہلیت و استعداد کا اظہار کر سکے۔ ہم یہ سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ جرمنوں کو کس قسم کی سرکار درکار ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک اور سوال کا جواب درکار ہے اور وہ بنیادی سوال یہ ہے کہ ہم جرمن کس قسم کی ملت ہیں؟ اس قسم کی ہم ملت ہوں گے اسی قسم کی ہمیں سرکار درکار ہوگی جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ کس مقصد کے لیے سرکار قائم کرنا ہے تب تک یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ سرکار کی شکل و صورت کیا ہوگی۔

سیاسی اتحاد کی بنیاد نسب ہے

بدقسمتی سے آج جرمنوں کی قوم کسی ایک نسلی عنصر پر مشتمل نہیں۔ اس نسلی عناصر سے ہماری ملت نے ترکیب پائی ہے انہیں متحد کرنے میں ابھی تک اس حد تک کامیابی نہیں ہوئی کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہماری ملت اپنے خود ایک نسل ہے۔ عمل اس کے ملت کے جسم میں خون بن کر حل ہو چکا ہے اس نے صرف ہمارا خون گرم نہیں کر دیا بلکہ ہماری فکر کو بھی صحیح کر دیا ہے یہ زہر خاص طور پر جنگ کی سال کے بعد سے زیادہ زور دکھا رہا ہے ایک طرف ہمارے ملک کی سرحدیں کھلی تھیں دوسری طرف ان سرحدوں کے اندر کروڑوں اجنبی نہیں آباد تھیں ان سے اختلاط روا رکھا گیا تیسری طرف خود جرمنی کے اندر بھی مختلف نسلوں کو مخلوط اختیار کرنے کی عادت دے دی گئی ان سب عوامل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن نسلی عناصر سے ہماری ملت مرکب ہے ان میں باہم یکدلی و یگانگی قائم نہیں ہو سکی۔ ابھی تک وجود میں خارجی نسلی عناصر کا داخلہ جاری ہے اس کا نتیجہ ہے کہ کوئی بھی نسل یہ نہیں سوچتی مقصد و مفاد پہلو بہ پہلو و ہم تصادم ہیں نتیجہ یہ ہے جب ملت پر کوئی خطرے کا وقت آتا ہے تب کوئی اتحاد کا جذبہ متحرک ہونا چاہیے تو جرمن مختلف سمتوں کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

جن بنیادی نسلی عناصر سے ہماری ملت نے ترکیب پائی ہے نہ صرف مختلف اصناع

میں ان کا تناسب مختلف ہے۔ ایک طبقے میں بھی مختلف عناصر آباد ہیں ایک طرف شہری نسل ہے جو ہر طرف مغربی اصل رہا ہے تک اور مشرقی نسل سے مل جل کر ایک نیا نمونہ پیش کرتی ہے یا پھر یہ طرف میں مختلف عناصر کی باہمی آمیزش سے متعدد نئے عناصر وجود میں آگئے ہیں یہ کہنا کوئی اور رنگا رنگی ہماری ملت کے داخلی اتحاد میں بہت بڑا نقص ہے۔

تسخیر عالم سے پہلے یک رنگی شرط ہے

اس نقص کی وجہ سے ہم زمانوں میں وہ احساس ملی مفقود ہے جو خون کی وحدت سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ خطرات اور مہالک حالات میں قومیں اسی احساس ملی کی بدولت متحد ہو کر اپنے بچاؤ کا سامان کرتی ہیں اس احساس کے ماتحت ایسے موقعوں پر فروعی اختلافات مٹ جاتے ہیں اور وطن کے مقابلے میں پوری ملت ایک صف میں کھڑی ہو جاتی ہے ہمارے زمانوں میں تو یہ ذکر بیکار بیان اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے ہیادی اعلیٰ جو عصر ملک میں پہلو تہی ہو رہا ہے کے باوجود اپنے اختیارات ختم کر کے وحدت الٰہی کی صورت اختیار نہیں کر سکے اور نہ اس میں ممکن ہے اور ہی یہ کہا گیا کہ اور یہ کھوٹی شاید ہمیں بکھرا ہوا دیکھنا چاہتی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے تو اس رنگا رنگی کے طفیل ہم آج تک تسخیر عالم سے محروم نہ رہتے۔

امن کی حفاظت تلوار سے ہوتی ہے

اگر تاریخ کے ارتقاء کے دوران میں ہر قوم ملت کے اندر وہ احساس موجود رہتا جو مثلاً احساس یک جہتی سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے دوسری قوموں نے استفادہ کیا ہے۔ تو آج ہر ان معاملات کی تلخیوں کا تمام کرہ ارض پر حاوی ہوتی۔ دنیا کی تاریخ ایک دوسرا ہی منظر پیش کرتی ہے اگر یہ ہو جاتا تو پھر مدتوں سے جس امن کی وہ آرزو بھی پوری ہو جاتی جو عرض کرنے گزرنے اور رسوخ کے باوجود آج تک پوری نہیں ہو سکی۔ جتنی دنیا میں امن عالم ہو جاتا یہ امن جنگ کی صفت سے بہرہ ور ہے اور یہ قسمت ہر ہی عورتوں کی

گریہ وزاری سے بالکل ان کے حق میں بہتری کا نتیجہ نکلتا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی علامت ایک ذلیل قوم کی تصور ہوتی ہے ایک ایسی قوم جس میں شعور عام کی کمی ہوتی ہے اور ایک ایسی قوم جو ایک بڑے مقصد کے لئے قربانی کرنے کی خدمت کرتی ہے۔

نسل کا نزول ہونا ایک لعنت ہے

چونکہ ہماری قوم ایک ایسی قومیت سے محروم ہے جس کی بنا نسلی وحدت ہو اس لئے ہمیں بے اندازہ مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں اور ہماری اسی قومی تفریق سے غائدہ اٹھا کر ان قوموں کو جو ہم سے پیچھے جو مختلف علاقوں میں مقامی سردار بنے ہوئے ہیں لیکن جن قوم کو اکثریت حاصل ہے کامیاب حاصل ہے کرتی ہے۔

آج بھی ہماری قوم میں نسلی تعاون کی وحدت سے بڑا نقصان اٹھا رہی ہے لیکن جو عرصہ ماضی میں اور آج تک ہماری ناکامیوں کا سبب رہا ہے وہی مستقبل میں ممکن ہے ایک بہت بڑی رحمت ثابت ہو۔ اگرچہ یہ بہت بڑا نقص ہے کہ ہماری قوم کے ہمیاری نسلی عناصر آج تک یکجا نہیں ہو سکے ہیں اور ان میں سے ایک بھی قوم وجود میں نہیں آ سکی جس میں یکسانیت پائی جا سکے۔ لیکن یہ خوش قسمتی ہے کہ اس علامت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہماری قوم کا بہترین خون آج تک بھاری پاکیزگی کے ساتھ محفوظ و سالم ہے اور بہترین نسلی عناصر زوال میں۔

انسانیت کے بلند ترین ارمان

اگر ہماری قوم میں ہماری نسل عناصر کی آمیزش ہو جاتی تو شاید اس سے ایک قومی یکجہتی تو پیدا ہو جاتی، لیکن جیسا کہ ہر نسلی آمیزش سے ثابت ہوا ہے کہ یہ نسلی تعاون بطنوں سے اسی قدر بہرہ ور نہ ہوتی جتنا کہ بہترین ہمیاری عناصر زوال رہنے کی حالت میں تعاون بطنوں کا مالک ہے۔ ہماری قومی یکجہتی کے قائم نہ ہونے سے ایک فائدہ بھی ہوا ہے کہ آج بھی ہمارے مابین ہمیں نسلی عمل کے ایسے گہوارہ موجود ہیں جن کا خون ہر آمیزش سے پاک ہے۔ مستقبل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ لوگ قوم کا بہترین

چاہتی ہے ایک زندہ سرکار ہو گی جس کی تمام سعی صرف ایک نقطے پر مرکوز ہو گی وہ مقصد یہ ہے جو دنیا کی ہر چیز سے بالا تر ہے۔

سرکار کی نصب العین تسخیر عالم ہے

اور ایک سرکار کے لئے اس ریاست میں ہر شخص شریک ہو گا اس سرکار کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ ریاست کے قابل ترین عناصر کو جمع کر کے ان کی پرورش کرے بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ تدریجی لیکن یقینی طور پر دنیا میں ایک نئی ریاست کا تسلط قائم کرے۔

یوں تو دنیا کی ہر جگہ جد و جہد اور کوشش کی راہیں کھلی ہیں یہاں وہ شخص راستہ پاتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں جو بات ہو سکتا ہے اتنی جو سوچ سکتا ہے وہ کچھ نہ ہے اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو بڑے سے بڑا کام ہو اس کا آغاز چھوٹا ہو گا۔ جتنا بلند وہ نصب العین ہو جس کے حصول کی کوشش کی جائے اور جتنا اس کوشش کے وقت عوام اس نصب العین کو سمجھنے سے عاری ہوں اتنی ہی اس کی کامیابی زیادہ شاندار ہوتی ہے یہ وہ حق ہے جو دنیا ہماری سمجھتی ہے یہ کامیابی اور بھی شاندار ہو گی اگر کامیابی کی منزل کا اندازہ پہلے سے کر لیا گیا ہو اور ہر قسم کی مشکلات کے مقابلہ میں بغیر ڈرے اور گھبرائے کے ان تھک کوشش جاری رکھی گئی۔

سرکار مملکت کا ایک ہتھیار ہے

ہمیں کی طرح ہر سرکاری کارکن کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کے لئے کوشش کرتا رہے اور قابل ترین مصلحت کیش تدبیر اس کے مقابلے میں کسی کی سرکار کے قیام کے لئے کوشش کرتا رہے اگر ہو انہیں اس میں زیادہ آرام ہے کہ سرکار کو ایک ایسی مشین سمجھ لیا جائے جس کا کام وقتاً فوقتاً اپنے تحفظ کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے حق میں بڑے جتن کے ساتھ اعلان کر سکتے ہیں کہ ان کی زندگی تو سرکار کے لئے وقف ہے لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی حکومت ہے نئے قوم کی حالت نہیں جانچی جاتی ہے قوم کی حالت سے حکومت کے ہر کسی شے کے لئے جدوجہد نہ کرے گی [illegible] ہم جنسوں کی خاطر بنایا گیا ہوں

ہوتی ہے کہ جیسے میں نے ابھی کہا ہے سرکار کے قدم رکھنے کی کچھ گنجائش زیادہ آسان ہے اور سرکار کو اس دنیا میں عالمی امن کے تحفظ کے لیے ایک زبردست تخریب تصور کرنے سے بہت کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کمزوروں کے لیے سرکار اور سرکار کا اختیار جائے خود ان کی دفاعی جدوجہد میں استعمال کیا جائے گا یہ وہ تخریب ہے جسے استعمال کرنے کا حق امت کے ہر فرد کو حاصل ہے اگر طبقہ وہ ہے ایک غیر مسلح کے تخریب سمجھ کر استعمال نہ کرے بلکہ اس احساس کے ساتھ استعمال کرے کہ یہ تخریب امت کے تمام فرزندوں کے مشترکہ تحفظ کا ہتھیار ہے۔

انسانوں کے جسم ہی نہیں روحیں بھی مسخ ہو چکی ہیں

غرض ہم ایک ایسے اقتصادی عاطر زر ہے ہیں جو ثروت کائنات کی اصل ہے اور بنیاد ہے اس جنگ میں ہمارے ساتھیوں کی تعداد تھوڑی ہوگی اس معاشرے میں ایسے زیادہ ساتھی کس طرح مل سکتے ہیں جو اس معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے جسم ہی نہیں بلکہ ان کی روحیں بھی مسخ ہو چکی ہیں اس ملک کے ہزار ہا باشندوں میں سے صرف خاص خاص لوگ ہماری صفوں میں شامل ہوں گے عمر رسیدہ لوگوں میں سے صرف وہ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوں گے جن کے دل ابھی تک جوان ہیں اور جن کی ہمتوں کی کمر طبیعہ نہیں ہو چکی علم اس کے جو لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ موجودہ صورت حال کو اصل حالت پر قرار رکھا جائے وہ کبھی ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو سکتے ہمارے مقابلے میں ان لوگوں کی تعداد افواج ہے جو آرام پسندی کے رسیا نہیں لیکن سست اور بزدل ہیں ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی خود غرضیاں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ موجودہ صورت حال کو برقرار رکھیں بظاہر ہماری جدوجہد کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ہم جب حقائق پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف یہی دکھائی دیتا ہے کہ ہمیں ابھی کس قدر کام کرنا ہے ورنہ یہ کہ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو پھر کس قسم کی کامیابی ہوگی۔

قوموں کی قسمت اقلیتیں بدلتی ہیں نہ کہ اکثریتیں

جب کبھی کوئی نیا نظریہ یا تحریک وجود میں آتی ہے تو اس کے ساتھ ہی پست ہمت لوگ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں یا کم از کم دل چھوڑ دیتے ہیں کہ ایسے معرکے میں شریک ہونے کے بجائے وہ لوگ آگے بڑھ کر آنے والے ہیں جو فوراً مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو، اور اچھی طرح سمجھ لو کہ جب کسی قوم کے اندر سے چند بلند ہمت مستعد اور کارکن افراد اٹھ کر سامنے آجائے اور کسی مقصد کی خاطر جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو ان کا مرتبہ فی الفور عام عوام سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ یہ تھوڑی سی مگر بہت جلد زیادہ کی قسمت کے مالک بن جاتے ہیں۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا کے تاریخی کارنامے ہمیشہ قلیلوں نے انجام دیے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ قلیل تھوڑے لوگ پختہ عزم، حوصلے اور قربانی کی جذبہ رکھتے ہوں کہ وہ اپنی ملت میں کی سوچ اور دل میں لے لے۔

دہلی نسل کے کمینوں پر عذاب الٰہی نازل ہوگا

کہ لوگوں کو ہمارے راستے میں جن مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ ہمارے نزدیک کامیابی کی منزل کی نشانیاں ہیں۔ یہ وہ کام عظیم ہے جو ہمارے راستے میں بہت سی مشکلات ہیں اس لیے کہ ہمارے سامنے یہی ہے کہ ہمارے سامنے صرف بلند ترین کردار کے لوگ ہی ٹھہر سکیں گے۔ یہ کوئی ہماری کامیابی کی ضمانت ہے قدرت اعلیٰ دہلی نسل کے علاوہ کسی کو رفع کرنے کے لیے ہر وقت تو عذاب الٰہت کرتی ہے قدرت کو دہلی نسل کے کمینے بھی معلوم نہیں ہوتے مگر ملت کی مدد کو قدرت کی جانب سے سخت عذاب آتے ہیں یہ عذاب بالخصوص تیسری دنیا کی پشت پر نازل ہوتے ہیں۔ ان سے وہ تمام اعلیٰ خصلتیں چھین لی جاتی ہیں جو ان کی پہلی جد کے وارثین کو حاصل تھیں ان کے رہنما جاہل رہتے ہیں انہیں بصیرت کی روشنی عطا ہو جاتا ہے وہ یہ کہ لوگوں کے خون میں یکسانیت ہوتی۔ مصیبت کے وقت صحیح الفکر افراد صحیح فیصلے کرتے ہیں یہاں صحیح فیصلوں سے مراد ہے کہ ان کے فیصلوں میں باہمی تضاد نہیں ہوتا۔ وہ جو رائے اختیار کر لیتے ہیں پھر اسی پر چلتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں افراد باہم

حالات میں گھر جاتے ہیں اور ان کے فیصلے کمزور ہم متصادم ہو جاتے ہیں غرض کچھ
قسم خاص صرف صحیح قسم خاص کے مقابلہ میں بچ نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ
بھی کہہ ہے کہ اس کا ہم وطنوں جلدی صلح ہو سکتی ہے نادیدہ جائے گا ہے ہمارے حالات ایسے
ہیں جس میں صحیح قسم نہیں ہے آپ کو بچا سکتی ہیں لیکن گلوط قسمیں بہت بار بچتی ہیں
یہ قدرت کی عدالت کا نتیجہ ہے جو وہ اصلاح کے حوالی کی خاطر کرتی ہے قدرت دیگر
ہوا دی کی اصل جاری نہیں رہنے دیتی وہ ان کی اصل منقطع کر کے انہیں فنا کے گھاٹ اتار
دیتی ہے۔

مجہول النسب قوموں کی تباہی مقدر ہو چکی ہے

مثال کے طور پر اگر کسی نسل کا کوئی فرد اپنے خون کی آمیزش ایک ہی نسل کے کسی فرد
کے ساتھ کرتا ہے تو اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی اولاد نسلی لحاظ سے کمزور ہو گی پھر
اس دیگر اولاد کے آئندہ بچے ان لوگوں کے مقابلہ میں کمزور ہوں گے جن کا خون نسلی
لحاظ سے خالص ہے جب ایک دیگر نسل میں کسی اعلیٰ نسل کا خون داخل ہونا بند ہو جاتا
ہے اور دیگر نسل کے افراد باہم متواتر تناسل پر مجبور ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے
کہ ایسی دیگر نسل جلد ہی ختم ہو جاتی ہے دیگر نسلوں کے ختم ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان
کی قوت مدافعت ناکافی ہوتی ہے ان کی قوت مدافعت اس حد تک ناکافی ہوتی ہے کہ
قدرت انہیں زندہ نہیں رکھنا چاہتی قدرت کا یہ طریق عمل بڑا شاندار ہے اگر دیگر نسل ختم
نہ ہو جائے تو ہزار ہا سال گذر جانے کے بعد وہ بجائے خود ایک نئی نسل کی صورت
اختیار کر لیتی ہے تاہم یہ نئی نسل بھی بہر حال دیگر ہی رہتی ہے اس نئی نسل کے اصلی اور
متند اور مانہ سے یوں باہم مل جاتے ہیں کہ اصلی اور کو شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے
اس طرح ہوئی نسل وجود میں آتی ہے اس میں کسی حد تک گروہ بندی کا احساس بھی پیدا ہو
جاتا ہے لیکن ایسی دیگر نئی نسل کی ذہانت اور لیاقت ہمیشہ اپنے صحیح النسب ہمسایہ
کے مقابلہ میں پست رہتی ہے علاوہ ازیں نئی نسل بن جانے کے باوجود بھی دیگر نسلیں

ہمیشہ ایسی عورتوں کے مقابلے میں شکست کھاتی ہیں جنہوں نے اپنا خون پاکیزہ رکھا ہو ہزار ہا سال گذر جانے کے بعد بھی نسل میں گروہ بندی کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ تنازع للبقاء کے لیے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسلوں کا احساس گروہ بندی یوں کرور رہتا ہے کہ ان میں مصلحت شاہی کی مستقل روح ہوتی ہے اور یہ ہی تخلیق و تعمیر کی بھی طاقت ہوتی ہے اس سے کسی اعلیٰ نسل پر یہ حاصل کرنا شرط صرف یہ ہے کہ یہی اعلیٰ نسلیں ہم جنس ہزاروں سے مرکب ہو اور ان ہزاروں کی باہمی ہر قسم کی مستقل رشتہ داری ہو۔

اپنا شجرہ نسب بھول جانے سے شرافت مٹ جاتی ہے

لہٰذا ہم سب ذیل اصول صحیح قرار دے سکتے ہیں کہ نسلی تفریق جد یا مورث اعلیٰ کی اولاد کی روحانی کا قائم رہتا ہے ہاں اگر اعلیٰ نسل کے اعلیٰ طبقوں میں کسی حد تک صحیح نسب ہم جنس ہونا ضرور محفوظ رہے تو پھر دوسری بات ہے اعلیٰ نسلوں کو اپنی کا یہ اظہار اس وقت تک لائق رہتا ہے جب تک کہ خود اعلیٰ نسلیں اپنی پاکیزگی سے غافل ہو کر اپنا شجرہ نسب فراموش نہ کر جائیں اور یہ اعلیٰ نسلوں سے اختلاط شروع نہ کر دیں۔

یہی وہ اصول ہے جس کے ذریعہ فطرت آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال سے ہمیشہ اس زہر کو خارج کر دیتی ہے جو کسی پاکیزہ خون والی نسل میں وقتاً فوقتاً داخل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ اصول روبہ کار آنے سے پہلے یہ شرط لازمی ہے کہ کسی امت میں ایسے خاندان باقی ہوں جن کا شجرہ نسب نسلی اختلاط سے محفوظ ہو۔

فطرت کی پاکیزگی خون کی پاکیزگی پر منحصر ہے

اگر کسی قوم میں اس کی نسلی روایات محفوظ ہوں تو وہ خود بخود گروہ بندی کے اصول پر عمل شروع کر دیتی ہے مثال کے طور پر اگر ایسی قوم کا کوئی گروہ عارضی طور پر اور مجبوراً اپنے نسلی خون کو پاکیزہ نہیں رکھ سکا تو جوں ہی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے قوم کے ان خاندانوں کا جو پاک ہے وہ جزو یہ نسلی اختلاط سے احتراز کرتے ہوئے صرف باہمی ازدواج کریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نسلی نسلوں کے کھوئے ہوئے خصوصیات ایک طرف ہٹ جائیں گے اور

نگاہوں سے محو ہو جائیں گے کہ ان کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ پانچ کروڑ لوگوں والے
معاشرے کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔

گھوڑے، گدھے اور خچر

جب انسان ذہنی اعتبار سے محروم ہو کر قدرت کے خلاف صف آرا ہوتا ہے تو
پھر کوئی امید باقی نہیں رہتی کہ قدرت اس کے گناہوں کی تلافی کرے گی۔ گذشتہ کوتاہیوں کی
تلافی اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ فطری ذوق کو دوبارہ زندہ اور تازہ کیا جائے۔
تلافی ملاقات کرنی ہوگی۔ فطرت یہ ہے کہ ہر ایک دھکے راستے سے ہٹ کر ہیں پھر وہ
زیادہ سے زیادہ گمراہی میں غرق ہو جاتے ہیں۔ تب عقل بالکل مٹ جاتا ہے اور
انسان اپنی برتری کی تمام علامتوں سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ گھوڑے
باقی رہتے ہیں نہ گدھے، بلکہ چاروں جانب لچر ہی لچر دکھائی دیتی ہیں۔ انسان کی
باہمی مساوات آج کل کے تمام ترقی پسندوں کا مطمح نظر ہے لیکن اس قسم کی
مساوات دنیا سے ہر قسم کی بلند اقدار ختم کر دے گی۔ کچھ شک نہیں کہ ہی نوع آدم ایک
بہت بڑا لچر بن جائے گی۔ لیکن یہ دو بیشوں کا ایک گلہ ہوگا۔ انسان نہ ہوں گے۔ صدیوں
نے تہذیب و تمدن کی تخلیق و تعمیر انجام دی تھی اگر یہ دولت کھو گئی تو انسانیت کا خاتمہ سمجھنا
چاہیے۔

روحانی اولاد کی پیدائش بند ہونی چاہیے

جو لوگ اس کرۂ ارض کی یہ حالت نہیں دیکھنا چاہتے انہیں احساس کرنا چاہیے کہ
ان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ دنیا میں روحانی اولاد کی پیدائش بند کر دی جائے۔
ہمارے معاصرین میں سے بہت سے لوگ بظاہر اس پالیسی کی مخالفت کریں گے اور
شکایتوں سے آسمان سر پر اٹھا لیں گے کہ یہ تو انسان کے مقدس ترین حقوق میں مداخلت
کرنا ہے۔ لیکن یہ دلیل نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں صرف ایک ہی حق مقدس ہے اور
وہ حق ہے مقدس ترین فریضہ کی ادائیگی۔ وہ مقدس حق اور فریضہ یہ ہے کہ نسل انسان کو

پاک رکھا جائے تاکہ انسانیت کے بہترین نمونے محفوظ رہیں اور بنی نوع آدم کی شرافت مند سے مند تر مقام حاصل کر سکے۔

نکاح ایک مقدس عبادت ہے

ایک قومی سرکار کا پہلا کام یہ ہے کہ مناکحت کا معیار بلند کر کے اسے روحانی نسل کا گہوارہ بنا دیا جائے۔ سرکار کا فرض ہے کہ نکاح کو ایک ایسی مقدس عبادت کا درجہ دے دیا جائے جس کا مقصد باری تعالیٰ اعلیٰ ترین مخلوقات کے انتخاب پیدا کرنا ہے تاکہ نشوونما انسان کی اعلیٰ ترین میراث میں بہتروں کی پرورش کرنا انسان کے حقوق کے نام پر احتجاج کرنا ہر گز اس معاشرہ کو راہ نہیں دینا جس نے عبادت کے مقدس ہاتھوں کو پلیدیت بڑھانے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے نتیجہ یہ ہے کہ معزز ترین ورثہ کی زندگی دوبھر ہو چکی ہے ہر دوسرا خاندان، بلکہ ہر خوانچہ فروش مانع حمل ادویات فروخت کر رہا ہے تاکہ تندرست انسان پیدا نہ کر سکیں آج کل ہماری سرکار کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ ملک میں امن قائم رہے اور قانون شکنی کی نوبت نہ آئے ایسی سرکار ہوا سے مدد کے واقعات کھاتے پیتے لوگ اس وہم میں گرفتار ہو چکے ہیں کہ تشنج اور ہیضہ اور اس قسم کی دوسری خانہ ساز امراض کے بیماروں اور اپاہجوں اور مجبوروں کو دوا دیا کرنے سے منع کرنا کوئی جرم ہے حکمران کے ہماری قوم کے ہزارہا تندرست افراد کا ہلاک دیا کرنے سے ہزارہا ناتواں مضرات کے زندہ رہنے کا فرض نہیں۔

شرعاً مانع حمل ایک گناہ ہے

دوسرے شرعاً کا اخلاقی احساس مانع حمل ادویات کو دیکھ کر قطعاً مجروح نہیں ہوتا ان لوگوں کی ذہنی کاہلی اور کوتاہ اندیشی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت درکار ہو سکتا ہے کہ اس طبقہ کے ذہن مفلوج اور احساس کند نہ ہوتا تو یقیناً وہ غور کرتے کہ کس طرح آکدہ نسلوں کی خوراک اور آسائش مہیا کرنے کا انتظام کیا جائے تاکہ مستقبل میں ہماری ملت تندرست افراد پر مشتمل ہو وہ کیوں نہیں سوچتے کہ کس طرح ایسے حالات پیدا کیے

جا چکی ہیں جن میں ہمارے بعد آنے والی نسل زندہ رہ سکے اور اپنی ضروریات زندگی فراہم کر سکے۔

باوجود اکثر ہندوستانی ہندو اکثر عبادت سے کیوں عاری ہو چکا ہے تھوڑا بھی دنیا میں خدا کی پوجا کرنے والی مخلوق کے خلاف اس کی وہ سازش میں عبادت کا ارتکاب کر رہی ہے اگرچہ اب حق کی تلقینات سمجھ پر بیان کی جاتی ہے لیکن ٹرجاؤں کا واقعی طرز عمل اس تلقینات کے قطعی مخالف ہوتا ہے۔

جب جسم ذلیل ہو جاتا ہے تو روح بھی پاپی بن جاتی ہے

بزرگ روح کی باتیں کرتے ہیں لیکن انسان کو جو اس روحانی بات کا حامل ہے اپنی آنکھوں کے سامنے گائوں کی صف میں شامل ہوتا دیکھ کر بے حسی سے خاموش رہتے ہیں پھر جب ان کی سستی کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں تو وہ بیرونی کا شکار کرتے ہیں انہیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ سب کا مقدس خون خود ان کے اپنے خلاف ہی کیسا ہے اگر ہو پاتے ہیں وہ نہیں سمجھ سکتے کہ خلاق کی ساری مخلوق خدا کو کیوں عزیز ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی حالت کیوں اتنی گر گئی ہے وہ نہیں جانتے کہ جب جسم ذلیل ہو جاتا ہے تو روح بھی پاپی بن جاتی ہے جب تک اصلاح حال کا امکان آتا ہے تو پھر یہ چھوٹے کے "مذہبی معلمین" کے منش بھی دونوں طریقہ سیکھتے ہیں کبھی وہ طریقہ اور کبھی مغربی طریقہ تاکہ ہونو قبیلہ کے دشمنوں اور راہو قبیلہ کے عقیدوں اور کاغز قبیلہ کے جنگلوں کو تھوڑا بھی برتھوں سے آشنا کریں خود یورپ کے اندر تو یہ حالت ہے کہ خدا رحم کرے بہر حال اس کا شعور جب ہے یورپ کی قوموں اخلاقی زوال کا شکار ہو رہی ہیں لیکن ہمارے پرہیزگار اور صالح مشنری یہ طریقہ میں عقیدوں کی نجات کے لیے جدوجہد فرماتے ہیں طریقہ کے جنگلوں کے پوشش اور جو مہذب انسان کم از کم تندرست تو ہیں کیا اب انہیں ہماری "اعلیٰ تہذیب" کے نام پر وحشی نسل کی ایک فوج بنا دیا جائے گا جس میں نکاسگ کے بیکار ہو رہے شعور تجربہ سے ملے جلے ہوں گے۔

دینداری کا وعظ کرنے سے یتیم کی پرورش بہتر ہے

شرافت انسان کے زیادہ قریب ہوتا اگر بھوک اور پوشش کچھ سماج کے پرہیزگار بزرگ غریب عزیزوں کو اپنے وعظوں سے نہ ستاتے۔ جو نہ یہ وعظ سننا چاہتے ہیں اور نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں اچھا ہوتا اگر وہ بے نتیجہ وعظ ترک کر دیتے اور دل سوزی اور شفقت سے کام لیتے ہوئے دل ہی دل میں کوشش کرتے ہوئے کہ جب کوئی میاں بیوی بیماریوں میں گرفتار ہوں تو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے کہ وہ کسی یتیم کو گود میں لے لیں اور اسے اپنے ماں باپ کی طرح پرورش بھائے اس کے کہ وہ یتیم ہر دل اور مریض بچے پیدا کریں جو خود بھی ساری عمر دکھوں میں گرفتار رہے اور دوسروں کے لیے بھی پریشانی اور رنج کا سبب ہو۔

قوم کا سب سے قیمتی ورثہ اولاد ہوتی ہے

قومی سرکار کو اس ضمن میں ان تمام کوتاہیوں کی تلافی کرنی ہوگی جو حکومت موجودہ تمام معاملہ فریقین کی غفلت اور ناانصافی کے باعث سرزد ہوتی ہیں قومی سرکار اس کو معاشرتی زندگی کا مرکزی نقطہ بنائے گی قومی سرکار ہر ایسی خوں کو معدود کرنے کی جارحیت نہ دے گی قومی سرکار اس حقیقت کا اقرار کرے گی کہ کسی قوم کا سب سے قیمتی ورثہ اس کی اولاد ہوتی ہے یہ انتظام کرنا قومی سرکار کا فرض ہے کہ صرف تندرست افراد ہی بچے پیدا کر سکیں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جو والدین بیمار ہوں یا ان میں کوئی خاندانی نقص ہو انہیں بچے پیدا کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو والدین اس گناہ سے بچتے ہیں وہ عزت کے مستحق ہیں دوسری طرف قوم کو تندرست بچے دینا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس معاملہ میں سرکار کو نئے بڑھتے ہوئے سوسائٹی کی حمایت حاصل ہے قوم کے مستقبل کے مقابلہ میں افراد کی خود غرضانہ خواہشات کی کوئی حیثیت نہیں انہیں اس معاملہ میں سرکار کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا اس مسئلہ میں اپنے فرائض پورے کرنے کی غرض سے سرکار موجودہ [illegible] سے کام لے کر حاصل کر سکتی ہے

سرکار کو علان کر دینا چاہیے کہ جو شخص کسی ایسی خاندانی مرض میں مبتلا ہیں جس کی منتقلی ہو سکتی ہے انہیں بچہ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دوسری طرف جو عورت تندرست بچے پیدا کرنے کے قابل ہے اس کے لیے سرکار کی جانب سے یہ انتظام ہونا چاہیے کہ اقتصادی نظام کے کسی نقص کی وجہ سے کسی ماں کی گود خالی نہ رہ جائے۔

افسوس آج ماں جیسی رحمت ایک زحمت بن چکی ہے

آج ایک ایسا سماجی نظام رائج ہے جس کے ماتحت والدین کے لیے اقتصادی طور سے اولاد ایک رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے سرکار کو ان بزدلانہ بلکہ مجرمانہ خیالات کو رفع کرنا ہوگا جن کی وجہ سے بڑے بڑے ملکوں کی معاشرتی سوسائٹیں مبتلا ہیں۔ سرکار کی رعایا کی اولاد کی سب سے بڑی پالیسی ہونی چاہیے بڑی دولت ہے جو کسی قوم کو میسر آ سکتی ہے سرکار کی توجہ پہلے بچوں کی جانب ہونی چاہیے پھر ماؤں کی ہونی چاہیے۔

والدین اپنے گناہ معصوم اولاد کے سر نہ تھوپیں

جو لوگ جسمانی یا ذہنی امراض میں گرفتار ہیں انہیں اپنی بیماریوں کو اپنی اولاد کے ذریعہ قوم کے اندر منتقل رکھنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے ایک قومی سرکار کو یہ ایک بہت سنگین سوال ہے اس کا علاج قوم کو تربیت دے کر کیا جا سکتا ہے مستقبل میں یہ کام ہمارے زمانے کی سرمایہ دارانہ جنگوں کے مقابلہ میں زیادہ شاندار اور زیادہ اہم سمجھا جائے گا تعلیم و تربیت کے ذریعہ سرکار اپنی رعایا کو اس تلقین کرے گی کہ یہ بری بات نہیں بلکہ ایک حادثہ ہے جس پر رحم کھانا چاہیے لیکن یہ امر واقعہ ثابت بھی ہے ہر ایک قومی جرم بھی ہے کہ اپنی بیماریوں اور کمزوریوں کو محض اپنی نفسانی تسکین کی خاطر آنے والی معصوم جانوں کے سر تھوپ دیا جائے۔

خاندانی امراض میں مبتلا لوگ اولاد پیدا نہ کریں

سرکار اپنی رعایا کو یہ تربیت بھی دے گی کہ کوئی شخص جو اس کے کسی تصور کے کسی

ذہنی مرض میں گرفتار ہے اور اس وجہ سے خود ہی اپنا علاج نہیں کرتا بلکہ اپنی صحت اور سلامتی کے لیے کسی نہ کسی پر انحصار کرتا ہے جو تندرست ہے اور ایک ایسی قوم کا نمونہ بن سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ہر اعتبار سے انسانیت کا بہترین محسن ہے اور جسے دنیا میں عالی مرتبت کہلانے کا مستحق ہے۔ اسی تربیت کا اہتمام کرتے ہوئے سرکار اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی کام لے گی سرکار کو یہ فرض ادا کرنا ہی ہوگا چاہے سرکار کا یہ طرز عمل لوگوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے وہ اسے پسند کریں یا ناپسند۔

اگر صرف چند سماجی کے لیے ان افراد کو بچے پیدا کرنے سے منع رکھا جائے جو جسمانی یا دماغی امراض میں گرفتار ہیں تو اس نوع انسان نہ صرف بہت سی تکالیف سے نجات حاصل کرے بلکہ صحت و تندرستی کا ایک ایسا معیار قائم ہو جائے جس کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اگر قوم کے تندرست افراد کی اولاد ہونے کا کوئی عملی انتظام سوچ سمجھ کر باقاعدہ طریقہ سے کر لیا جائے تو دنیا میں ایک ایسی نسل کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے جو ہمیں تمام تر اہم سے محفوظ ہونے سے آج ہمارے جسمانی اور دماغی انحطاط کی تمام بیماریوں پر قابو پا لیں اگر کوئی قوم اور سرکار یہ راستہ اختیار کرے کہ ملک کے صرف ان تمام افراد کی نشوونما اور پرورش کی جائے گی جو عملی لحاظ سے برتر ہوں اور ان کی اولاد بڑھانے کا اہتمام کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری قوم آنے والے زمانہ میں ان صلاحیتوں سے مالا مال ہوگی جو عملی طور پر کامیاب رکھنے کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جو حقیقی شرافت کا اصلی سرچشمہ ہیں۔

شرفا کی نوآبادیات قائم ہونی چاہئیں

اس مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے سرکار کا پہلا کام تو یہ ہے کہ جب کوئی علاقہ اس کے تصرف میں آئے تو وہاں نوآبادیات قائم کرنے کا انتظام کسی حد تک باہمی کے ماتحت عمل میں لائے جیسا کہ طے شدہ اصولوں کے ماتحت کیا جائے خاص واقفیت رکھنے والے ماہرین پر مشتمل کمیشن مقرر کی جائیں جو افراد کی نوآبادی

میں جا کر منتظم ہو جاتے ہیں انہیں پہلے ہی کمیشنوں سے خوشامد حاصل کرنے پر مجبور کیا جائے ان سرٹیفکیٹوں میں درخواست دہندہ کی نسل پاکیزگی کی تصدیق ہونی چاہیے ہوں ملک کی سرحدات پر ایسی نوآبادیات قائم کی جا سکتی ہیں جن کے باشندے بہترین نسل پاکیزگی اور شرافت کے نمونہ ہوں گے اس قسم کی نوآبادیات ساری ملت کے لیے باعث برکت ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ نوآبادیات ترقی کریں گی تو ان سے ملت کے ہر رکن کو مسرت، مفاد اور فخر حاصل ہوگا۔ وہ ایک ایسا پاکیزہ قوم ہوں گی، جو پھوٹے کرے ہوں گے تو ساری ملت ترقی کرے گی، بلکہ خود انسانیت پر بہار آئے گی۔

مویشیوں کی نسل کشی کرنے والو! انسان کی بھی اصلاح نسل درکار ہے!!

جس طرح حیات کی دوسرے سرکاری بنیادی اصول پر رکھی جانی چاہیے اس پر بھی عمل پیرا ہونے سے ایک ایسا دور قائم ہو جائے گا جب شرافت کا غلبہ ہوگا۔ تب لوگ صرف گھوڑوں اور مویشیوں کی اصلاح نسل کا خیال نہ رکھیں گے بلکہ خود انسان کی بہترین نسل کشی پر بھی توجہ دیں گے جب یہ دور آ جائے گا تو ایک کروڑ ہوشیار رہنے اور دانشمند ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے گا ایک دوسرا کروڑ ایسا ہوگا جو کوشش کرنے پیشہ ہونے کا ثبوت دے گا اور اپنی بہتریوں سے نسل کی خدمت کو پیشہ بنائے گا۔

اس قسم کے بہتر پیشہ وروں کے روزگار کا کیا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ کیا دنیا میں ہمیشہ ہی ہزاروں تاجران دنیا ایسے نہیں جو اپنی مرضی سے ہوا دیوا کرنے سے باز رہتے ہیں حالانکہ یہ کوئی قانون نہیں اس پر مجبور کرتا ہے۔ ان پر کوئی پابندی عائد ہوتی ہے۔ محض دینی تقاضے کے زیر اثر وہ یہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں اگر لوگوں کو سمجھا دیا جائے کہ نسلی ممیزش کو روکنا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ بہت سی قربانی لوگ بطور دینی تقاضے کے بھی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہ نسلی ممیزش تو وہ فساد ہے جو ایک پشت کے بعد دوسری پشت کو منتقل ہوتا رہتا ہے لوگوں کو یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ انسان کا فرض ہے کہ خدا سے بزرگ و

برتری کی بات کی غرض سے انسانیت کے صرف اچھے نمونے پیش کرے جو کردار سازی کی اصل صنعت کے مطابق ہوں۔

اچھی تجویزوں پر عمل کرنے کو اچھے لوگ درکار ہوتے ہیں

یہ کوئی تعجب نہیں کہ ہمارے زمانہ میں دشمنوں اور انسانیت کی فوج ہمارے معاشرہ میں داخل ہو چکی ہے وہ ان باتوں کو سمجھتی ہے اور نہ قبول کرتی ہے وہ تو صرف اسے کہ جسے جھٹک کر وہ ایک عذر پیش کرے گی جو ہمیشہ ان کے لبوں پر رہتا ہے وہ کہیں گے یہ اچھی تجویز لیکن افسوس ہے کہ اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ہم انہیں اس کا جواب دیتے ہیں کہ ہاں ہاں اس تجویز پر تم سے عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تجویز اس حقیقت پر مبنی ہے تم اس کو سمجھنے کی قوت ہی نہیں رکھتے۔ تمہیں تو ہمیشہ ہی نہ رہتا ہے تم سے نفرت کی غرض کے بندے ہو خود غرضی کے سوا تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں تمہارا معبود صرف پیسہ ہے بہر حال ہم تمہاری عداوت کے لبوں سے نہیں جھڑتے ہیں بارہا مظلوم ہو ملتجی ہو دوسرے انسان کے طالب ہیں جو اپنی غربت اور رعایت کے باعث خود اپنی ذات کو دنیا کا مرکز محور اور مقصد نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنے معبود اپنے آپ کو نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں ان کی خاطر انہیں اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی عار نہیں ہمارے نوجوانوں کی وسیع فوج کے خلاف کے طالب ہیں جو اس زبردست انقلاب کے زمانہ میں ہوش سنبھال رہے ہیں وہ ضرور ان برائیوں کے خلاف جنگ کریں گے جن کا باعث ان کے آباؤ اجداد کی سستی اور غفلت تھی یا تو ہمارے نوجوان ایک دن نئی اصول پر مبنی سرکار قائم کر کے دم لیں گے اور یا پھر وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ان کھاتے پیتے لوگوں کی دنیا کا بھاڑہ ہوتا دیکھ لیں گے۔

دلیری کے اقرار کے بعد اس کا تدارک فرض ہو جاتا ہے

تاریخ کی رو میں ایسی گھڑیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا خود اس زمانہ کے لوگوں کو بھی قطعاً علم نہیں ہوتا باوجود اس کے وہ ان گھڑیوں کا تدارک نہ کریں بلکہ آج کل کے کھاتے

پینے لوگوں کی طرح اپنے آپ کو مطمئن نہیں دیتے رہیں اور اس قسم کے مضمون لکھتے رہیں کہ عادت کی اصلاح کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تو ایسے لوگوں کی قسمت میں ابدی مقدر ہو چکی ہوتی ہے ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کی ایک قابل توجہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ بری عادات کی برائی کا اقرار نہیں کر سکتے انہیں ماننا پڑتا ہے کہ بہت کچھ غلط ہو رہا ہے اور بہت کچھ ناپسندیدہ ہے مگر کبھی نہیں یہ ہمت نہیں پڑتی کہ برائی کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کریں عادات کی برائیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ضرورت صرف یہ ہے کہ چند باہمت اور دانا لوگوں کی قوت کو منظم کر کے اس شر کا مقابلہ کیا جائے لیکن ان کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس ہے وہ خود تو کوئی ایسی کوشش کرتے نہیں اور جب کوئی دوسرا اس قسم کی کوشش کرے تو وہ صرف احتجاج کو پیدا کرتے رہتے ہیں اور ہر کھڑے ہو کر یہ ثابت کرنے میں مشغول رہتے ہیں کہ اس قسم کی کوشش تو ناروا ہے عقل ناممکن ہے اس لیے اس کی ناکامی پہلے سے یقینی ہے مثال کے طور پر ایک ہوا ر اصلاح شراب کی ممانعت کے لیے کوشاں ہے تاکہ ایک قوم کو اس زبردست عادت سے بچایا جا سکے لیکن ہمارے ہوا خواہیں کھاتے پیتے لوگ ہوتے اس کے کچھ نہیں کر سکتے اور کچھ نہیں کرتے کہ بیوقوفوں کی طرح بغلیں جھانک کر شیخ و شنبہ سے سر ہلانے لگتے ہیں اور تحریک کا مضحکہ اڑا کر اپنے آپ کو عقل مند ظاہر کرنا چاہتے ہیں ان لوگوں کی وہی حالت کسی ایسے ملک کی ہو سکتی ہے جو خود مختار کے ماتحت ہو مگر جب ان حضرات کی کبھی نہیں چلتی اور کسی علاقہ کے لوگ اپنی شریانہ کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کامیابی سے انکار شروع کر دیتے ہیں یا پھر اس کی اہمیت گھٹانے لگتے ہیں ایسی اصلاحی کوشش کے دوران میں اخلاقی اصولوں کا نام لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ لوگ جس تحریک کی مخالفت کرتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ علاقہ کے ایک بہت بڑے طبقہ کو بند کر دیا جائے۔

برائی کا مقابلہ نہ کرنے والا بھی برا ہوتا ہے

نہیں دلچسپی ہے اس مسئلہ پر ہم اپنے آپ کو کسی دھوکہ میں مبتلا نہیں رکھ سکتے ہمارے معاشرہ میں کھاتے پیتے لوگ ہر شعبہ زندگی میں کام انجام دینے کے عادی ہو چکے ہیں یہ کھاتے پیتے لوگ ہر بھلی خصلت سے عاری ہیں یہ لوگ ہر ہے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے وہ اس لیے ہر ہے نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اس لیے ہر ہے ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں کہ ہر ہے بلند کرنے جانے میں مستعدی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تو سیاسی مجلسیں اپنے آپ کو کھاتے پیتے لوگوں کی جماعتیں کہلاتی ہیں وہ اس چند گروہوں اور چند طبقات کے مفاد کی حفاظت کرنے والی پیشہ ور تنظیمیں ہیں ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک بس چلے اپنے خود غرضانہ مفاد کی حفاظت کرتی رہیں کہ ہر ہے کھاتے پیتے سیاست دانوں کی یہ جماعتیں ہرگز کسی جدوجہد کی طرف نہیں رکھتیں خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ مقابلہ دکانداروں سے نہ ہو بلکہ کنگال اور مفلوک الحال عوام سے ہو جو اپنی قدرات پر تکیے ہوں، اور نہ دوسرے کسی سے بھیک مانگنے والے نہ ہوں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت سرکار کا فرض ہے

اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سرکار کا سب سے پہلا فرض قوم کی خدمت ہے اور قومی اصلاح و بہبود ہے، اگر ہم مانتے ہیں کہ قوم کی خدمت اور قومی اصلاح و بہبود بغیر اعلیٰ معاصر کے تعاون و ترقی کے ناممکن ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ سرکار کے فرائض اعلیٰ حالات سے بچوں کی پرورش کا انتظام کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ سرکار کو ہر شہری کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا ہوگا تاکہ وہ اصل کی نشوونما میں بہتر طور پر اپنے فرائض انجام دے سکے۔

تین درجن سے ہی دماغ درست ہو سکتے ہیں

جس طرح ایک حاملہ عورت کے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذہانت اور روحانی قابلیت کی سب سے بھلی شرط اصل ہے اسی طرح بچے کی تربیت میں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ترقی کی

ی سے فیصلہ کر سکتا ہے، اراد سے کا پابند نہیں۔ مخلص قوم کا بار بار ضمیر کی سمجھ جائے گا، رکاوٹ ایک ایسے کمزور اور کثیف انسان کے جو بہت ہی صاف ستھرا اور شائستہ ہو۔

مضبوط جسم کے بغیر پاکیزہ روحیں کسی کام کی نہیں

کوئی ایسی قوم جو بڑے حصوں پر مشتمل ہو، لیکن جس کا ہر رکن جسمانی لحاظ سے کمزور ہو، فیصلہ کرنے اور پھر اس فیصلہ پر عمل کرنے میں تذبذب کا شکار ہو، بزدل اور صلح پسند ہو تو ایسی قوم اس دنیا میں اپنا وجود قائم رکھنے کے ناقابل ہے۔ انسان کی قسمت کا فیصلہ جس میدان یا کھیل پر ہوتا ہے اس میں ناکامی کی بڑی وجہ مخلص کو مخلص اس لیے کہتا ہے کہ اس کے پاس علم و عمل کی کمی تھی ناکام وہ لوگ ہوتے ہیں جو نتائج کی پروا نہیں کرتے باقی بچتے نہیں رکھتے کہ پتے راہوں کو کھلی ہوا سے بچانے کیلئے ہیں اور جسم کا ستیاناس ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں جسم مخلص اس لیے نہیں مر سکتا کہ اس کے اندر ایک جاندار روح کا قیام ہے۔ ہم بہترین دماغی تربیت ان لوگوں کو دیتے ہیں جو جسمانی لحاظ سے اپاہج و ناکارہ ہیں، جو فیصلہ کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کے راستے مکروہ ہیں تو ہم اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے اس بات کو نظریہ کی حیثیت دی ہے کہ دماغی و اعصابی کمزوریوں کا علاج کیا گیا ہے کہ انسان نے دماغ اور روح کی بلندی اور شرافت اور عشق کے ساتھ جسمانی حسن اور توانائی کو بھی لازمی قرار دیا تھا۔

قسمت صرف طاقتوروں کی یاری کرتی ہے

ہومر کے کلاسیکی دور میں قسمت صرف ان لوگوں کی یاوری کرتی ہے جو مستعدی سے عمل کرتے ہیں یعنی جسم اور روح کے رشتہ کے متعلق صحیح نظریہ بیان کرتا ہے جو ماہر تندرستی ہے وہ اعلیٰ درجہ کی ذہانت بھی کسی تو انائی جسم کے اندر ہی رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک قومی سرکار کے ماتحت جسمانی ریاضت کوئی انفرادی عمل نہیں ہے جسمانی ریاضت کا اہتمام کوئی ایسا فرض ہے جو پہلے والدین کے ذمہ ہو اور صرف دوسرے یا تیسرے درجہ پر قومی ذمہ داری سمجھا جائے۔ جسمانی ریاضت قوم کی بقا کے

ہے ضروری ہے اس معاملہ میں قوم کی نمائندگی کرنا اور قوم کو بچانا سرکار کے ذمہ ہے جہاں تک رسمی تعلیم کا تعلق ہے سرکار آج بھی ہر فرد کے حق خود اختیاری میں دخل دیتی ہے حکومت جو قوم کی جانب سے بچوں کو جبری تعلیم کے نظام سے وابستہ کرتی ہے اس معاملہ میں والدین کی رضامندی کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا اسی طرح سے ہمارے سماج کی بڑھتی ہوئی ایک اور قومی سرکار قوم کے تحفظ کی خاطر ہر فرد کی آزادی اور جبلت کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے اختیارات سے کام لے گی سرکار کو تعلیم کا انتظام یوں کرنا ہوگا کہ شیر خوارگی کے زمانہ سے ہی ہر بچہ باقاعدہ طور پر ریاضت کے عادی بن جائیں وہ اس طرح محنت کے عادی ہو جائیں کہ محنت کرنے کے قابل بن جائیں کہ آنے والے زمانہ میں نہیں ہونی چاہیے اسے ہم سکیں سب سے بڑھ کر سرکار کا فرض یہ ہے کہ گھر بیٹھے رہنے والوں کی ایک نسل پیدا نہ ہو جائے۔

ماں کی گود سنوارنے سے قوم کا مستقبل سدھر سکتا ہے

جسمانی صحت، صفائی اور تعلیم کی بنیاد کو جوں ماں کی تربیت سے ہوتی ہے سو ہا سال کی محنت سے تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بچے کی پیدائش پر دھوم دھام کے ساتھ کے رسم میں پھینک دی جاتی ہے اور نئی ماں کو زچگی کا بخار چڑھتا ہے اسی طرح سے ماں اور کھلائی کو مناسب تربیت دے کر یہ انتظام بھی کیا جا سکتا ہے کہ بچے کی شیر خوارگی سے ہی اس کے ہوش سنبھالنے تک اسے پوری جسمانی نشوونما کے لیے ورزش کی تربیت کھلائی جائے۔

علم کو کتابوں کی گٹھڑی نہ بنائیں

قومی سرکار کو یہ انتظام کرنا چاہیے کہ اسکول میں بچوں کی جسمانی ورزش کے لیے زیادہ وقت دیا جائے یہ ایک احمقانہ حرکت ہے کہ ننھے ننھے دماغوں پر موٹی موٹی کتابوں کا ناقابل برداشت بوجھ لاد دیا جاتا ہے تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر بچوں کو ان موٹی کتابوں کے سبق بہت کم یاد رہتے ہیں اور جو یاد رہتا ہے وہ فضول حصہ ہوتا ہے

اصل کام کی بات نہیں ہوتی ہے یہ ہوتی ہے کہ بچوں کا ذہن عمر کے اس ذخیرہ میں سے
بھوسہ ہٹانے لگنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے کہ بھوسہ اور دانے دونوں کا ایک
بڑا سا گٹھڑ باندھ کر ان غریبوں کی گردن پر لاد دیا جاتا ہے آج حالت یہ ہے کہ بانی
مکتب سے لے کر ہیڈ مکتب کے اندر صرف وہ گنے چنے انسانی ورثہ صرف کیے جاتے ہیں اس
سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ ورثہ کے اس قلیل وقفہ میں جو وقت طالب علموں کی مرضی پر
چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ چاہیں تو ورزش کریں ورنہ یوں ہی کھڑے دیکھتے رہیں یہی وجہ
ہے کہ ہماری قومی تعلیم اور انسانی تربیت کے درمیان کوئی صحیح تناسب باقی نہیں رہا۔

بچوں کے لیے کھیل اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ تعلیم

کوئی دن خالی نہیں جانا چاہیے جبکہ کسی طالب علم کو ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام
انسانی ورزش میں حصہ نہ لیں ہر قسم کی کھیلوں کا انتظام ہونا چاہیے ہر ممکن کا بھی
انتظام ہونا چاہیے ایک کھیل یہ ہے کہ اس کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کئی
لوگ اپنے آپ کو سخت پر عقیدے کے بتلاتے ہیں اور باوجود اس کے وہ اس کھیل کو
وحشیانہ اور بازاری کہتے ہیں اس کھیل کا نام ہے گھونسہ بازی یا باکسنگ سمجھ میں نہیں آتا کہ
ہم اپنے "شائستہ" اوقات میں اس کھیل کے خلاف کیا کیا لفاظی کھیل چکے ہیں نوجوان
تھوڑا سا پڑھیں اور اس کے بعد ذہنی لڑائی میں یہ وقت صرف کریں تو اسے بالکل
طبعی اور شریفانہ کھیل سمجھا جاتا ہے لیکن گھونسہ بازی ہائے صاحب "یہ تو وحشیانہ کھیل ہے"
ہی کیوں وحشیانہ کھیل ہے؟ کوئی دوسرا کھیل ایسا نہیں جو انسان میں جنگجوئی پیدا کرنے
کے لیے اس کھیل کا مقابلہ کر سکے کوئی دوسرا کھیل اس قدر جلد فیصلے پر پہنچا نہیں کرتا ہے ہی
کوئی دوسرا کھیل جسم میں توازن کی لچک اور مضبوطی پیدا کرنے کے لحاظ سے گھونسہ بازی
کا مقابلہ کر سکتا ہے اگر نوجوان اپنے کسی جھگڑے کا فیصلہ گھونسہ بازی سے لے لیتے
ہیں تو اس میں ہی کوئی بات ہے بلکہ کسی سے لڑنے کے مقابلہ میں وحشیانہ کہہ دینے
سے کسی شخص پر حملہ کیا جائے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی حفاظت کرے تو وہ دلیری میں

بھول کے اس ساری تباہی کی جڑ یہ تھی کہ ہمارے تعلیمی نظام کا مقصد صرف پیدا کرنا نہ تھا، بلکہ وہ تو ظفروں کے بابو، انجینئر، مستری، دوسرا رنگی، ماہرین قانون اور پروفیسر صاحبان پیدا کرنے پر تلا ہوا تھا تاکہ خطہ انگوستہ زمین میں دانشوری کا بازار سرد نہ ہو جائے۔

جہاں تک خالص دانشوری کے میدان کا تعلق ہے ہندوؤں کے ذہین لوگ ہمیشہ بھی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں لیکن جہاں بھی مسائل میں عزم کی پختگی دکھانے کا موقعہ آیا وہاں ہندو ذہین ناکام ثابت ہوئے۔

شجاعت کا دروازہ ریاضت ہے

بظاہر تعلیم کے ذریعہ ایک ہندو انسان کو بہادر نہیں بنایا جا سکتا ایک شخص میں ایک حد تک ذہنی دلیری موجود ہے لیکن مناسب تعلیم نہ ملنے کے باعث وہ جسمانی طاقت اور مضبوطی سے محروم ہے نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کی ذہنی شجاعت بھی دب کر رہ جائے گی فوجی نظر اس بھائی کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں کہ جب کسی شخص کی جسمانی طاقت مناسب تربیت حاصل کرتی ہے تو اس کے اندر دلیری اور جنگجوئی بھی پیدا ہو جاتی ہے فوج میں ہر شخص سورما نہیں ہوتا پھر بھی وہ فوجی خاصہ دلیر ہوتا ہے جنگ سے پہلے ان سپاہیوں کو جو قابل تعریف تربیت دی گئی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ فوج کی تنظیم انسان نظم کا ہر رکن خود اعتمادی کا پتلا تھا۔ انہیں اپنی برتری میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ دشمن بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے 1914ء کے موسم گرما کے آخر اور پھر موسم خزاں میں ہندو فوجوں نے جو فتح پر فتح حاصل کر کے جس لاثانی اور بے مثال شجاعت اور جنگجوئی کی مثالیں پیش کی ہیں وہ صرف اس تربیت کا نتیجہ تھیں جو انہیں باقاعدہ دی گئی تھیں بلکہ جنگ سے قبل ہندوستان کی مدت ہائے دراز میں جو لوگ جسمانی طور پر کمزور تھے انہیں دلیری کے لیے کارنامے سرانجام دینے کے قابل بنا دیا گیا جن کی بدولت انہیں تربیت سے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اسے ہم تک

سے خون کے آنسو بھی نہیں رو سکتی۔

چاپلوسی کی تعلیم گہوارے سے ملنی چاہیے

جن قوموں نے شکست نہیں کھائی ہمیشہ یہ قوم تھی جس نے بار ہا ں لی اور آج دنیا کی ہر قوم ہمارے پاؤں سے ٹھوکریں مار رہی ہے ہماری قوم کو اس قوت کی عادت ہے جو خود اعتمادی سے سرشار ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے یہ خود اعتمادی ہمارے بچوں میں پیدا کرنے کی کوشش ان کے گہوارے سے ہی شروع ہونی چاہیے تعلیم و تربیت کے سارے نظام کی کوشش اس امر پر مرکوز ہونی چاہیے کہ بچوں میں یہ بات اعتقاد راسخ ہو جائے کہ وہ ہر ایک ہر کسی ایک کا مقابلہ کر سکتے ہیں جب تک کسی شخص کی اپنی جسمانی صحت اور حالت ٹھیک نہیں رہتی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی قوم اور ملک کسی سے شکست نہ کھائے گی ماضی میں جن قوموں کو فتوحات حاصل ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر ہر فرد کو اپنی ذات پر اعتماد تھا اور تمام پارٹیوں کو اپنے سرداروں اور سپہ سالاروں پر اعتماد تھا آج اس قوم کی بقا قوت صرف تبھی بحال ہو سکتی ہے جب ان کو یہ اعتماد ہو جائے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور وقار حاصل کرنے کے قابل ہیں جس قوم میں یہ اعتماد کبھی پیدا ہو سکتا ہے جب پہلے کھوکھلا خوف میں یہ اعتماد پیدا ہو جائے۔

اس قسم کے مسائل میں اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

خالی امن قائم رکھنے اور اطاعت بجا لانے سے غلامی کے داغ نہیں دھلتے

ہماری قوم کو جو زبردست شکست اور ذلت اٹھانی پڑی ہے اس ذلت سے نجات پانے کے لیے ہمیں جو کوشش کرنی پڑے گی وہ بھی زبردست ہونی چاہیے یہ خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ہماری قوم کو مضبوط بنانے کے لیے فقط ہمارے کھاتے پیتے لوگوں کو یہ سبق پڑھنا ہوگا کہ امن قائم رکھنے اور اطاعت کرتے رہنے کی یہ غلطی کی تو اس کے نتائج سخت تلخ ہوں گے [illegible] صورت حال سے نجات حاصل

کرنا چاہیے ورزش کے وقت کے علاوہ سے بیشتر اور خاص طور پر "آرام" قائم رکھنے اور اطاعت بجا لانے سے کام نہیں چلا کرتا۔ ورزش کے وقت کے علاوہ یہ صرف ہماری شکست کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس شکست کے سامنے سر تسلیم خم بھی کرتا ہے اگر ہم اپنی غلامی کی زنجیریں توڑ کر اپنے ذہنوں کے مندر بنانا چاہتے ہیں تو یہ کام صرف "آرام" قائم رکھنے اور اطاعت بجا لانے سے کیسے ہو سکتا ہے ہم سے جو کچھ چھن گیا ہے اگر ہم نے اسے واپس لینا ہے تو اس کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم آزادی کی پیاس سے تڑپ اٹھیں اور غلامی کی آگ کو ہوا بھڑکا دیں کہ اس کے شعلے آسمان کے تارے توڑ لائیں۔

طالب علموں کا لباس بھی توجہ کا مستحق ہے

بچوں کو لباس بھی ایسا پہنانا چاہیے جو اس مقصد سے مطابقت رکھتا ہو۔ دیکھ کر دل جل جاتا ہے کہ ہمارے بچے فیشن پرستی کی وبا میں گرفتار ہو چکے ہیں انہوں نے لباس یا لباس کے مقصد کا مطلب بالکل الٹا سمجھا ہے۔

بچوں کا لباس تو خاص طور پر ان کی تعلیم و تربیت کی مناسبت سے تیار ہونا چاہیے جو نوجوان گرمی کے موسم میں ڈبل پتلون کی پتلون اور بند گلوں کی جیکٹ پہنے پھرتا ہے اس بیچارے کا تو لباس ہی اسے ہاتھ پاؤں ہلانے سے معذور کر دیتا ہے پھر کیا بات ہے کہ بچوں میں آزادانہ بڑی جگہ تھا تھر کی حوصلہ افزائی سے بھی دریغ کرنا چاہیے میری مراد اس تھا تھر سے نہیں جو فیشن پوشاک پہننے کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ دوسرے دیسا لباس پہنے نظر آئیں، بلکہ میری مراد اس تھا تھر سے ہے جو ایک شخص اپنے اندر ورزشی قسم کی اچھی مضبوطی کی بناء محسوس کرتا ہے ورزشی قسم بنانا ایسی چیز ہے جس کے پیچھے ہر شخص کو دوڑنا چاہیے۔

مرد کا جسم مردانہ ہونا چاہیے

ورزشی جسم آئندہ زندگی میں بھی کام آتا ہے نوجوان لڑکیاں آگے چل کر جن نوجوانوں کو اپنا دل دیں گی، انہیں بھی اس کی جسمانی خوبصورتی کے مشاہدہ کا موقع ملنا

ہو ہے آج کل لباس پہننے کا یہ انداز رواج پا گیا ہے جس کی وجہ سے جسم کے خدوخال
بن بن پوشیدہ رہتا ہے کہ ہماری قوم کی ہزار ہا لڑکیاں دو ٹکے بیوپاریوں کی نظر میں چلتی
پھرتی نظر آتی ہیں حالانکہ ان کپڑوں کے بے ڈھنگے جسم کا تصور کیا جائے تو کراہت اور
گھن محسوس ہوتی ہے قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جس کا جسم حسین ہے اس کا حسن منظر عام پر آیا
ہوا ہے تاکہ قوم کو عام طور پر خوبصورت اور صحت مند جسم بنانے کا خیال پیدا ہو۔

جبری عسکری تربیت مرد کو مرد بنا دیتی ہے

آج کل ہمارے ہاں جبری قومی تربیت ختم ہو چکی ہے یہ اس نظام کی بدولت تھا کہ
زمانہ امن میں ہمارے بچوں کو جسمانی تربیت میسر آ جاتی تھی یوں ہمارے نظام تعلیم میں
جسمانی تربیت کی جو کمی تھی وہ پوری ہو جاتی تھی۔ بدیں حالات میں نے جو تجاویز پیش
کی ہیں ان پر عمل درآمد کی ضرورت ہو جاتا ہے ہمارے ہاں جبری قومی تربیت کا جو پرانا
نظام رائج تھا وہ نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس کی کامیابی صرف مرد کو تربیت یافتہ
بنانے میں ظاہر نہ ہوئی بلکہ مرد و عورت کے تعلقات پر بھی اس کا نہایت اچھا اثر ہوا تھا
نوجوان لڑکیاں اپنا شوہر انتخاب کرنے میں فوجیوں کو جو فوجیوں پر ترجیح دیتی تھیں قومی
سرکار کو جسمانی تربیت کا انتظام صرف سکول کے زمانہ تک محدود نہ رکھنا چاہیے بلکہ یہ
انتظام کرنا چاہیے کہ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی نہ کہ نوجوانوں کے جسم بھی نشوونما پا
رہے ہوتے ہیں جسمانی تربیت جاری رکھی جائے نوجوانوں کی صحیح جسمانی نشوونما پر ہی
ان کی آئندہ زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔

نوجوانوں کو آوارہ نہ پھرنے دو

یہ تصور بالکل احمقانہ ہے کہ اسکول چھوڑنے کے بعد نوجوان لڑکوں کی تربیت کا
سرکاری جانب سے خاطر رکھنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور ہر کہ یہ اختیار رکھتا ہے وہ ہوتا
ہے اب یہ شہری فوج میں بھرتی ہوں سرکار کا یہ اختیار درحقیقت ایک سرکاری فرض ہے
اور یہ اختیار بطریق کسی وظیفہ کے مستقل استعمال ہونا چاہیے ہو جو ہو سرکار تندرست اشخاص

پیدا کرنے میں ناکامی نہیں لے رہی اس لیے سرکار اپنا یہ فرض ادا کرنے میں مجرمانہ طور پر قاصر رہی ہے یہ سرکار ہمارے نوجوانوں کو سڑکوں پر آوارہ پھرنے اور بڑے بڑے گھروں میں اپنی جوانی خراب کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتی ہے کیوں سرکار ان نوجوانوں کی باگیں نہیں کھینچ کر رکھتی کیوں ان کی جسمانی تربیت اور ریاضت اس وقت تک جاری نہیں رکھی جاتی جب تک کہ وہ نشوونما پا کر باقاعدہ مرد یا عورتیں نہیں بن جاتیں۔

جسمانی ریاضت کا سبق ضروری ہے

فی الحال ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرکار کو جسمانی تربیت اور ریاضت جاری رکھنے کے لیے ضرور جبری تربیت کا انتظام کرنا چاہیے یا کوئی اور جبری قومی انتظام کرنا چاہیے اصل بات یہ ہے کہ جبری جسمانی تربیت اور ریاضت کا کوئی انتظام کرنا چاہیے اور اس انتظام کے لیے جو مناسب ترین ممکن ہو اسے اختیار کرنا چاہیے اسکول چھوڑنے کے بعد نوجوانوں کی جسمانی تربیت اور ریاضت قومی سرکار کا یہ بھی اہم سرکاری فرض ہے جیسا کہ بچوں کو دانشوری کی تعلیم دینا یہ تربیت دینے کا انتظام سرکاری اداروں کے ذمہ ہوتا ہے اس جسمانی تربیت کا نقشہ بعد میں جبری قومی تربیت کے انتظام سے حسب ضرورت علیحدہ بھی رکھا جا سکتا ہے اس صورت میں نوجوان گھروں کو ابتدائی داخل کھانے کی مصیبت سے فوج کو نجات مل جائے گی فوج کو وہ جوان جو ہر قسم کے گھروں سے واسطہ نہ پڑے گا بلکہ فوج کے پاس وہ نوجوان جائیں گے جن کے جسم پہلے سے ابتدائی جسمانی ریاضت کی بدولت تربیت پا چکے ہوں گے فوج کے ذمہ صرف یہ کام ہوتی رہ جائے گا کہ وہ ان گھڑے ہوئے قسم کے نوجوانوں کو فوجی سپاہیوں میں تبدیل کر دے۔

جسے حکم ماننا نہیں آتا اسے حکم دینا بھی نہیں آتا

جب قومی سرکاری فوج کو یہ حاجت نہ ہوگی کہ وہ نوجوانوں کو سیدھا کھڑے ہونے اور ٹھیک طرح سے چلنے کا بھی سبق دیا کرے بلکہ فوج تو سب الوطنی کی تعلیم کی اعلیٰ ترین اور آخری درس گاہ ہوگی فوج میں نوجوان جو گھریلو زندگی سے یہ صرف یہ سیکھا جائے گا کہ اسے

ہتھیاروں کا استعمال کس طرح کرنا چاہیے بلکہ اسے اپنی عملی زندگی میں اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل بھی بنایا جائے گا۔ عسکری تربیت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہونا چاہیے جو کسی بھی ملک کی فوج کی سب سے بڑی خوبی ہوا کرتی تھی جبکہ عسکری تربیت ایک نوجوان کو ایک مرد بناتی تھی اسے نہ صرف حکم ماننے کا سبق دیا جاتا تھا بلکہ اسے وہ اصول بھی سکھائے جاتے تھے جس کے ساتھ وہ ایک روز حکم دینے کے قابل بن جائے اسے یہ سکھایا جاتا تھا کہ اسے اپنے افسروں کے سامنے صرف اسی وقت خاموش نہ رہنا چاہیے جب اسے جارحانہ پالیسی ترجیح دی جارہی ہو بلکہ اگر ضرورت بھی محسوس کرے تو وقت کا فرض ہے کہ وہ بول کر خاموشی توڑے۔

علاوہ ازیں سپاہی کو اپنی قوت پر خود اعتمادی کا شعور اور جماعت بندی کا احساس اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوت کا رکن ہے جسے شکست نہیں دی جا سکتی۔

جب سپاہی اپنی عسکری تربیت ختم کرے تو اسے دو سرٹیفکیٹ ملنے چاہئیں ایک تو اس کے شہری ہونے کی سند ہو گی یہ وہ قانونی دستاویز ہو گی جس کے ساتھ اسے قومی معاملات میں حصہ لینے کا اختیار ہو گا دوسری سند اس کی جسمانی صحت کا تصدیق نامہ ہونا چاہیے جس کے بغیر اسے ملازمت کرنے کے قابل نہ سمجھا جائے۔

لڑکیوں کو ایسی تعلیم دو کہ اچھی مائیں بن سکیں

قومی سرکاروں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے گی اس تعلیم و تربیت کے دوران میں قومی سرکار کو یہ اصول ملحوظ رہے گا کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو بعد میں انہیں ان کے فرائض زندگی بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل بنائے یہاں پھر جسمانی تربیت اور ریاضت کو خاص اہمیت دی جائے گی روحانی اور دینی تربیت کی اہمیت کا وہ اس کے بعد آئے گا لڑکیوں کی تعلیم میں یہ نصب العین ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انہیں ایسے دن بنانا ہے۔

قومی سرکار کو چاہیے کہ جلد درست کرنے کے لیے محض قانونی توجہ دینی چاہیے بلکہ جلد درست کرنے کے لیے ہر کردار کی تعمیر کی خاطر وہ تمام ذرائع تیار کیے جائیں گے جو اس مقصد کے حصول کے لیے مناسب ہوں۔

سعادت اور شقاوت پیدائشی ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ انفرادی کردار کی اصل بنیادیں تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی موجود ہوتی ہیں جو شخص فطری طور پر خود غرض ہے وہ ہمیشہ بنیادی لحاظ سے خود غرض ہی رہے گا جو شخص اصول پرست ہے وہ ہمیشہ بنیادی لحاظ سے اصول پرست ہی رہے گا۔ جن لوگوں کا کردار شروع سے ہی واضح ہوتا ہے ان کے علاوہ لکھا کی تعداد ایسے ہوتے ہیں جن کا کردار مبہم اور غیر معین ہوتا ہے جو شخص پیدائشی طور پر خطا کار ہوتا ہے وہ ہمیشہ خطا کار ہی رہے گا کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں نرم کے ارتقاء کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اگر ان کی سخت اور صحیح تربیت نہ کی جائے تو وہ قوم کے بگڑے رئیس بن سکتے ہیں یہ لوگ اس کے کئی کمزور اور مذبذب کردار اپنے بھی ہوتے ہیں جو بگڑا تعلیم کی خرابی کے باعث بن جاتے ہیں۔

بچوں کو اپنے راز سینہ میں محفوظ رکھنے سکھانا

جنگ کے دوران میں اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ ہماری قوم ایسی مدہ بھت واقع ہوئی ہے کہ ہم اپنے راز کی حفاظت نہیں کر سکتے اس کمزوری کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے اہم ترین راز بھی دشمن سے محفوظ نہ رکھے جا سکتے تھے یہاں میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمیں قوم کے کارِ تعلیم نے جنگ سے پہلے ہمیں کو رازداری کی کیا تربیت دی تھی؟ کیا اسکول کے دنوں میں کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی بچے یا طلبہ کو اس کے ساتھیوں پر ترجیح دی جاتی تھی جو اپنے راز نہ کھولتے تھے کیا یہ نہیں کہ آج کی طرح تب بھی دوسروں کے عیوب و خطا بتانے کرنے والوں کو "صاف گو" سمجھا جاتا تھا اور جب جب وہ کسی راز کو افشا کرنے کی کوشش کرتے اسے "تعلیم" کہتے تھے کیا کبھی یہ سکھانے کی کوشش

کی گئی کہ ذرا سی ایک قابل قدر مردانہ خصلت ہے ہر گز نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ باتیں ہمارے تعلیم دینے والوں کی نگاہ میں بے حقیقت تھیں لیکن یہ انہیں بے حقیقت باتوں کا نتیجہ تھا کہ ہماری سرکار کو روزانہ پیسہ قانونی مصارف پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ عزت اور اس قسم کے دوسرے مقدمات میں سے نوے فیصدی جھگڑے دراصل راستبازی کی فہمائش نہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں کئی باتیں جو راستبازی کے احساس کے بغیر ہونے سے نکل جاتی ہیں انہیں ایک دوسرے کے پاس اپیل ہوتی ہے دہرایا جاتا ہے ہماری قصداً نہ ہونے والی کوشی بار بار اس عادت سے یوں نقصان پہنچتا ہے کہ مال تیار کرنے کے طریقے اسی طرح دوسروں پر کھول دیئے جاتے ہیں ہماری قومی رسائی کے لیے جو خفیہ تدبیریں کی جاتی ہیں وہ اسی طرح ضائع ہو جاتی ہیں کہ ہماری قوم کو خاموش رہنے کی تمیز نہیں۔ ہر شخص جو بول سکتا ہے اسے کسی دوسرے کے سامنے دہرا دیتا ہے جنگ کے زمانہ میں اس بات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑائیوں میں شکست ہو جاتی ہے ایک ایک لڑائی میں شکست کا ایک پوری مہم میں کامیابی یا ناکامی کا اثر پڑتا ہے۔

بچوں کو جھوٹ نہ بولنا سکھاؤ

یہاں یہ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جو کچھ بچپن میں سکھایا نہیں جاتا وہ بڑے ہو کر نہیں کرنا جا سکتا۔ ایک استاد کو ہرگز بچوں کی شرارتیں دور وقت کرنے کے لیے جھوٹ بولنے کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہیئے ننھے بچوں کی بجائے خود ایک سرکار ہوتی ہے بڑی عمر کے لوگوں کا سا برتاؤ کرتے وقت ان کے اندر ایک قسم کا انتظامی اتحاد پایا جاتا ہے یہ ایک قدرتی عادت ہے اس سال کی عمر کے بچوں کا جو بھی اتحاد ہو سکتا ہے وہ بڑی عمر کے آدمیوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ جو بچہ اپنے ساتھیوں کی جھوٹ بولنے کی حمایت کرتا ہے وہ غداری کا مرتکب ہوتا ہے اس کے کردار کا یہ میلان اگر یوں ہی نشوونما پاتا رہا تو یہی بات ہے کہ وہ بڑا ہو کر غداری سے کام لے گا ایسے لڑکوں کو "اچھے میاں" "اچھے" "میاں" "وغیرہ وغیرہ کا نام دے کر اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنی چاہیئے اس کے کردار میں تو محرمانہ خامی

دکھائی دے رہی ہے ممکن ہے استاد صاحب کے لیے یہ امر باعث شہرت ہو کہ وہ اپنا کام خود انجام دینے کی بجائے شاگردوں کو اس قسم کی ناپسندیدہ حرکتوں سے روکنے میں لگے رہیں لیکن اس کا یہ طریق کار بچوں میں کبھی اخلاقی عادتیں پیدا کر دے گا جو ایک دن مہلک نتائج کا باعث ہوں گی ایسا اکثر ہوتا آیا ہے کہ بچپن کا محض ناقص خوردہ ہو کر ایک زبردست بیماری ہوتا ہے۔

بچوں کو چوٹ کھانے اور دکھ سہنے کی تربیت دو

بہت سی مثالوں میں سے یہ تو ابھی میں نے ایک ہی مثال پیش کی ہے ہمارے سکولوں میں آج کل بچپن اور شریر بچہ سختیوں کی جان پر بھر کر تربیت دینے کا انتظام ہونے کے برعکس ہے مشغل میں ہمارے تعلیمی نظام کے اس پہلو پر زیادہ زور دیا ہوا ہے وفاداری، بہادری اور مصلحت اندیشی کی خوبیاں ہیں جو ہر عظیم المرتبت قوم کے افراد میں پائی جانی چاہئیں سکول کے اندر تعلیم کے دوران میں یہ خوبیاں طالب علموں میں پیدا کرنا اور ان کی مسلسل نشوونما کرتا بہت ضروری ہے۔ آج کل ہمارے نصاب تعلیم میں کئی ایسی امور بھی شامل ہیں جو اتنے ضروری نہیں بچوں کو یہ تربیت بھی ملنی چاہیے کہ جب انہیں چوٹ لگے یا دکھ پہنچے تو وہ شکایت کرنے یا رونے دھونے کی بجائے خود اپنی مدد آپ کرنا سیکھیں اگر نظام تعلیم بچے کو بچپن ہی عمر میں چوٹ اور دکھ سہارنے کی تربیت نہیں دیتا تو بڑے ہو کر نتیجہ یہی نکلے گا کہ جب سپاہیوں کو خندق میں رہنا پڑے گا تو ان میں گھر رہنے والے سارے لطف آوارگی اور لکھنوی نفاست سے پر ہوں گے اگر سکول کی تعلیم کے دوران میں ہمارے بچوں کے ذہن میں علم راسخ نہیں جاتا اور اس کی جگہ نہیں ضبط نفس کی زیادہ تربیت دی جاتی تو 1914ء سے لے کر 1918ء تک جب ہماری قوم جنگ کر رہی تھی تو یہ نوجوان زیادہ کارآمد ثابت ہوتے۔

قومی ہر کارے کا نظام تعلیم میں اسمائی تربیت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ کردار کی

قیصر کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ ہمارے قومی معاشرہ میں کئی خامیاں ایسی پائی جاتی ہیں جو ٹھیک کلام تعلیم کے ذریعہ اگر بالکل رفع نہیں کی جا سکتیں تو کم ضرور کی جا سکتی ہیں۔

بچوں کو عزم کی پختگی کا سبق سکھانا چاہیے

قوت ارادی کی تربیت، قوت فیصلہ کو مضبوط بنانے اور ذمہ داری قبول کرنے کی عادت کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔

ہماری برطانی فوج کی تربیت کے دوران میں ایک اصول رائج تھا کہ کوئی حکم دینے کی نسبت یہ بہتر ہے کہ افسر غلط حکم ہی دے دے ہمارے بچوں کو اسی اصول کے ماتحت یہ تربیت دینی چاہیے کہ جب ان سے کوئی سوال پوچھا جائے تو جہالت سے چپ رہنے کی بجائے یہ بہتر ہے کہ غلط جواب ہی دے دیں جو جواب غلط ہو جانے کے ذریعے جواب دینے میں بچگانہ غلط جواب دینے سے زیادہ باعث ذلت ہے اگر ہمارے نوجوانوں کو یہ سادہ سی ذمہ داری اصول سکھا دیے جائیں تو پھر وہ ہماری معاشرت میں بھی قوم عمل سے محروم نہیں رہیں گے۔

بچوں میں قوت فیصلہ پیدا کرو

کہا جاتا ہے کہ دو نومبر 1918ء کے دن میں جرمنی کے تمام سرکاری دماغ اپنی قوت فیصلہ کھو بیٹھے تھے قیصر جرمنی سے لے کر فوجوں کے ادنیٰ کمانڈر تک ہر شخص کی قوت فیصلہ یوں معطوف ہو چکی تھی کہ کوئی شخص اپنی ذمہ داری پر کوئی فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ تھا یہ ایک خوفناک واقعہ تھا اور اس ایک واقعہ سے ہمارے نظام تعلیم کی ناقابل ہولناک طور پر ثابت ہو جاتی ہے اس بربادی کے زمانہ میں ہمارے قومی کردار کی جو کمزوریاں بڑے پیمانے پر ظاہر ہوئیں وہ چھوٹے پیمانے پر روزمرہ کی زندگی میں بھی ہمیں نقصان پہنچاتی رہتی ہیں آج اگر ہماری قوم دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم نہیں دی گئی ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ

ہمارے اندر دشمن کے مقابلہ کرنے کے لیے قوت ارادی کی کمی ہے ہماری قوم میں یہ کمی ہر جگہ پائی جاتی ہے کہ جب کوئی اہم فیصلہ کرنے کی نوبت آتی ہے جس میں خطرہ کا امکان ہو تو فیصلہ سے گریز کیا جاتا ہے حالانکہ خطرہ کا امکان قبول کیے بغیر دنیا کا کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا ایک مفکر نے ایک بار یہ کہتے ہوئے غیر شعوری طور پر خود ہی اپنی قوت فیصلہ کی کمزوری کا اعتراف کر لیا تھا اس نے کہا "مجھے جب تک کامل یقین فیصلہ کی کامیابی کا یقین نہیں ہو جاتا تب تک میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا" یہ کیوں فیصلہ کی کامیابی کا امکان "کبھی" کی حد تک ہمارے کی سب سے بڑی وجہ ہے جو شخص اپنی کامیابی کے بے قدرت سے علامات حاصل کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا وہ شجاعت کے تمام کارناموں کی ہمیشہ کی انکار ہے شجاعت کی تو بنیادی یہی ہے کہ جب کوئی شجاعانہ کارنامہ انجام دیا جائے تو صورت حالات میں جان کا خطرہ بھی لاحق ہو موت سامنے ہو جو جان پر کھیل کر کامیابی کی جانب بڑھتا ہے "ایک مرد ان کام بغیر یہ جانتے ہوئے کہ اس کی موت یقینی ہے آپریشن کرنے چلا جاتا ہے تو اس میں دلیری کی کوئی بات ہے ہاں اگر آپریشن میں کامیابی کا امکان صرف ایک فیصدی ہے، اور پھر بھی کوئی ڈاکٹر حوصلہ کر کے آپریشن کا خطرہ اٹھاتا ہے تو یقیناً یہ ڈاکٹر کا بڑا کام ہے" اگر یہ آپریشن ناکام بھی ہو جائے تو ڈاکٹر سے شکایت کا موقعہ نہیں۔

بچوں کو ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار کرنا

بلاشبہ مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ قوت ارادی سے بڑا دشمن کمزوری اور قوت فیصلہ کا فقدان ہے اصل ہمارے نوجوانوں کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہیں اس کمزوری اور فقدان کے تو وہ کن سنائی آج ہماری قوم میں ہر جگہ ظاہر ہو رہے ہیں اس تباہی کی بدترین مثال ہمارے سیاسی مدبرین کی بزدلی ہے جس کا مظاہرہ وہ ملکی مسائل کے حل میں ناکامی سے کرتے ہیں۔

آج ہماری قوم میں ہر شخص ذمہ داری قبول کرنے سے جس طرح بھاگتا ہے وہ بھی

کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو صحیح تعلیم نہیں دیتے اس غلطی کی بدترین مثال ہمارے سرکاری محکمے پیش کرتے ہیں سرکار کا ہر کلرک کلرکی کا امتحان تو گویا ان ڈگریوں کا مذاق ہے۔

بچوں کو دین کے بنیادی اصول سکھانا بالکل بھی مشکل نہیں

بدقسمتی سے ہمارے سکولوں میں ہمارے بچوں کو کسی مذہب کے اس قسم کے بنیادی اصول سکھانے پر زور دیا جاتا ہے کہ ان ننھے بچوں کو "سفر کرنا" اور "سونا" "اصول" اور "وقت کا مادہ" کے سبق سیکھنے چاہئیں۔ عکس اس کے کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ ان ننھے گنہگاروں کو وہ چار سادہ اور عملی باتیں سکھائی جائیں جن پر کہ ہمارا مذہب مبنی ہے۔ کہ آج کل کے ماہرین تعلیم کے نزدیک بچوں سے عملی باتیں کرنا بالکل اخلاقی ہو یا دینی سکھایا جاتا ہے آپ کو بتائیں تو نہ مانے گا لیکن کسی بچوں کی درسی کتاب دیکھنے پر آپ کو یہ کر دکھایا جاتا ہے کہ "محنت کرو ایک دن پھل ملے گا" کسی کو خیال نہیں آتا کہ ان معصوم کی یہ آزاد روی ساری قوم کے لیے اصول دیانت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

میدان جنگ کی کامیابی مکتب کی تربیت کا محتاج ہے

ایک دن آنے والا ہے جب قومی سرکار بچوں کی قوت ارادی اور قوت فیصلہ کی تربیت کا انتظام کرنے پر مجبور ہوگی اس طرح بچوں کے دل میں بچپن سے ہی وعدہ داری قبول کرنے اور صاف گوئی اور دلیری سے جو کچھ کہ ہے اس کا اعتراف کرنے کی عادت بھی پیدا کی جائے گی اگر قومی سرکار کو اس ضرورت کا احساس ہو جائے تو ایک سو سال تک اس کی بچوں کو تعلیم دینے کے بعد ایک ایسی قوم بن جائے گی جس کی قسمت نہ دی جا سکے گی جس کی قسمت نے آج ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

تعلیم کو آسان بنانا

آج کل ہمارے نظام تعلیم [illegible] کہ یہ قومی سرکار اس کی

تعلیم میں صرف یہ بھی تبدیلیاں کرے گی یہ تبدیلیاں تین قسم کی ہوں گی

پہلی تبدیلی تو یہ ہوگی کہ بچے بچوں کے دماغ پر ایسے مضامین کا بوجھ نہیں ڈالا جائے جن میں سے بیشتر بے بصری فضول ہوتے ہیں اس لیے بچے ان کو بھول بھی جاتے ہیں اندھی مرغا نوی مدارس کا نصاب تعلیم آج کل ایک عجیب معجون مرکب ہے جس میں مضامین کا نصاب اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ہر مضمون میں اس کا بہت کم حصہ یاد رہ جاتا ہے۔

کارآمد علم سکھایا

پچھلی بات تو یہ ہے کہ جتنا علم بچوں کے ذہنوں میں ٹھونسا جاتا ہے اس کا بہت کم حصہ بعد میں کارآمد آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ سکھایا جاتا ہے وہ اتنا کافی ہوتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم پیشہ وری کمانے کے لیے کسی عمر میں اس قابلیت حاصل کرنا چاہے تو یہ تعلیم سے اس قابل بھی نہیں رہتا مثال کے طور پر ایک لڑکا یا لڑکی مدارس کالجوں میں پڑھتے ہوئے سکول سے تعلیم حاصل کرکے گیا ہے اور اس سے پوچھے کہ بیوی اب تمہیں پانچ سال کی عمر میں تمہیں اس علم کا کتنا حصہ یاد ہے جو تمہیں مدت سے تمہارے ذہن نشین کیا گیا تھا اور جس کی خاطر تم نے ایسے ایسے دکھ اٹھائے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ "ہمیں جو کچھ پڑھایا گیا تھا اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ طالب علموں کو ایسا علم مہیا کیا جائے جس سے وہ بعد کی زندگی میں کوئی کام لے سکیں بلکہ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ قوت فہم قوت حافظہ اور خصوصی قوائے فکر کی نشوونما اور تربیت ہو جائے" یہ جواب ایک حد تک ٹھیک ہے وہ جو اس کے بچے کے ذہن پر ایسے علم کا ایک طوفان نازل کر دیا جاتا ہے کہ جس پر نہ تو اس کی طاقت سے باہر ہوتا ہے اس علم کی مختلف اقسام کو وہ اب جدا جدا شناخت کر سکتا ہے نہ ان کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے بالعموم اس علم کا ضروری حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اور غیر ضروری حصہ ان میں اٹک کر رہ جاتا ہے اس طرح وسیع نصاب کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ذہن پر بے شمار مضامین کا ایک بوجھ لاد دیا جائے تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ ایک شخص کو ایسا علم فراہم

کر دیا جائے تو بعد کی زندگی میں اس کے کام آنے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے عام افراد کے لیے یہ مقصد حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس قوم کے بچوں کے ذہن میں کئی زبانیں ٹھونس دی جائیں۔ ان میں سے کچھ زبانیں رکھ لی جائیں گی اور کچھ کا نکال دیا جائے گا۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنی بعد کی زندگی میں استعمال میں لائے گا تو اس کا کیا فائدہ ہوا ہے۔

فضول زبانیں سکھانا بیکار ہے

کیا وجہ ہے کہ لاکھوں لوگ اسکول کی تعلیم کے دوران میں دو یا تین زبانیں سیکھیں لیکن اپنی آئندہ زندگی میں انہیں ان زبانوں کے استعمال کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ اور اس لیے ان میں سے اکثر انہیں بھول جائیں گے مثال کے طور پر ایک لاکھ طالب علم فرانسیسی پڑھتے ہیں ان میں سے بمشکل دو ہزار اپنی بعد کی زندگی میں اپنی اس قابلیت کا استعمال کر سکتے ہیں باقی اٹھانوے ہزار نے جو کچھ لڑکپن میں سیکھا تھا، سے استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی ان سب نے جو وقت رٹ رٹ کے صرف کرکے یاد کیا تھا، وہ سب بیکار گئے ہائیں یہ کہنا کہ اس قسم کی تعلیم سے بچے کے ذہن کی نشوونما ہوتی ہے اگر یہ بچہ بعد میں اپنے اس علم کا کوئی استعمال کر سکے تو پھر اس دلیل میں کوئی وزن بھی ہوتا۔ حالانکہ موجودہ اٹھانوے ہزار بچوں کا قیمتی وقت ضائع کیا جاتا ہے ان کا کچھ بھلا نہیں کیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ ان دو ہزار کو پہنچتا ہے جنہوں نے بعد میں اس زبان کو استعمال کرنا ہے۔

زبان سکھانے کے اصول

میں نے جس زبان کو بطور مثال پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تعلیم سے بچوں کے ذہن میں منطقی استدلال کی استعداد پیدا ہوتی ہے یا ان کی تخیلی ذہن میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ مثال کے طور پر انگریزی زبان کی تعلیم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ بہترین حالات میں بہتر ہوا گر لاکھوں طالب علموں کو ایسی غیر زبانوں کے صرف عام تصور سے آشنا کرا دیا جائے یا بہتر تو یہ ہو کہ مختلف زبان کے خصوص

مزاج سے روشناس کر دیا جائے مخصوص مزاج سے آشنائی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی خصوصیات سے آگاہ کر دیا جائے اس کی گرامر کے بنیادی اصول سکھا دیے جائیں یا اس کے تکلم، اسلوب تحریر اور محاورہ وغیرہ کے متعلق موٹی موٹی ابتدائی باتیں بتا دی جائیں وسط ایشیا کے لیے تو یہ تعلیم کافی ہوگی اس سے اس زبان کے متعلق ان کا تصور بھی زیادہ واضح ہو جائے گا اس لیے اتنا علم نہیں ہوگا جتنا کہ عملی طور پر بھی یہ علم زیادہ مفید ہوگا آج کل بچوں کے ذہن میں کئی زبانوں کا تعلیمی علم ٹھونسنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کی نسبت یہ سرسری علم زیادہ بہتر ہوگا تعلیمی علم تو بچے یاد بھی نہیں رکھ سکتے یا پھر جلدی بھول جاتے ہیں اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو پھر یہ خطرہ بھی نہ رہے گا کہ بہت سا علم سکھانے کے بعد ضروری حصے بھول جائیں صرف غیر ضروری حصے یاد رہ جائیں جب بچہ صرف مفید علم سیکھے گا تو بھول جانے والے حصے کا احتمال اس کے اپنے حافظہ کے لحاظ سے کم ہی ہوگا پھر تو بھولا ہوا حصہ دوبارہ سیکھنا اتنا دشوار بھی نہیں جائے گا۔

کلاس کے سب علموں کے لیے کسی زبان کی مہارت کا سیکھنا اور سکھانا اس کی آئندہ زندگی کے لیے کافی ہوگا اس لوگوں کو بعد میں اس زبان کی واقعی ضرورت ہوگی ان کے لیے یہ مہارت کا علم ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اس زینے پر کھڑے ہو کر وہ آگے بڑھیاں چڑھ سکیں گے اور زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنے کے منصوبے بنا سکیں گے۔

اس قسم کا نصب تعلیم وضع کرنے سے انسانی ریاضت کے بہت سا وقت بچ جائے گا مزید برآں کسی دوسرے تعلیمی ادارے کا بوجھ کم ہو جائے گا اس کا زیادہ وقت سے مطالعہ کرنے کا بھی وقت مل جائے گا۔

علم تاریخ پڑھنے کے اصول

ایک اور اصلاح بہت ضروری ہے اس کا تعلق علم تاریخ پڑھانے سے ہے شاید دنیا کی کوئی دوسری قوم تاریخ میں اتنی دلچسپی نہیں لیتی جتنا کہ یہ علم ہمیں کرایا جاتا ہے اور شاید دنیا کی کسی دوسری قوم پر تاریخ کے مطالعہ کا اتنا برا اثر نہیں ہوتا جتنا کہ اس علم نے ہمارا

تاریخ کا نصاب دوبارہ مرتب ہونا چاہیے

تاریخ کے متعلق اور نصاب تعلیم مکمل کرنے کی ضرورت ہے تاریخ کی تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تاریخی ارتقاء کے اصولوں کا علم ہو جائے ہمارے نظام تعلیم میں تاریخ کا نصاب محض اس مقصد تک محدود ہو جانا چاہیے یہ ہو گیا تو اس سے ہر طالب علم کو فائدہ ہوگا طالب علموں کے ذریعہ پوری قوم کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی تاریخ صرف اس لیے نہیں پڑھی جاتی کہ گزرے ہوئے واقعات کا علم حاصل کیا جائے، بلکہ مطالعہ تاریخ کا فائدہ یہ ہے کہ مستقبل کے لیے راہ عمل حاصل کی جائے ہم یہ کچھ نہیں کر سکتے کہ ہماری قوم کے حافظہ کے لیے کون سی باتیں اختیار کرنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے یہ ہے اصل مقصد تاریخ کی تعلیم محض اس مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن یہاں یہ حال ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کے ماتحت مقصد تو فراموش ہو چکا ہے اور ہم محض حصول مقصد کے ذرائع میں الجھ کر رہ گئے ہیں اصل نصب العین تو کب کا فراموش ہو چکا ہے یہ جواب کوئی جواب نہیں کہ تاریخ کے گہرے مطالعہ کے لیے یہ علم ضروری ہے کہ مختلف واقعات کب وقوع پذیر ہوئے تھے ورنہ ہمیں کچھ پتہ نہ چلے گا کہ تاریخی ارتقاء کی موٹی موٹی منزلیں کیا تھیں تاریخی ارتقاء کی منزلیں معین کرنا پیشہ ور مورخین کا کام ہے ایک اوسط درجہ کا آدمی تاریخ کا پروفیسر نہیں ہوتا ایسے آدمی کے لیے تاریخ پڑھنے کا ایک ہی مقصد ہے وہ مقصد یہ ہے کہ اسے تاریخ کا اتنا علم حاصل ہو جائے جس سے وہ اپنے ملک کے سیاسی مسائل کے متعلق آزادانہ رائے قائم کر سکے جو شخص تاریخ کا پروفیسر بننا چاہتا ہے وہ بعد میں تخصیصات کا مطالعہ کر سکتا ہے وہ چھوٹی سے چھوٹی تخصیصات کی بھی تحقیق کرتا رہے تو کوئی حرج نہیں ہمارے ہاں تاریخ کی موجودہ تعلیم اس لحاظ سے بالکل ناقص ہے اوسط طالب علم کے لیے اس کا کوئی ضرورت سے زیادہ وسیع ہے اور ماہرین تاریخ کی ضرورت کے لحاظ سے اس کا دائرہ بہت تنگ ہے۔

قومی حکومت کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی تاریخ مرتب کرے جس میں

کی مسئلہ کو نہیں رکھا جائے۔

نظام تعلیم کا ایک عملی خاکہ

جو دلائل میں نے اوپر پیش کی ہیں ان کا اختصار یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ قومی سرکار کے لیے ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس طرح سے بدلنا لازمی ہے کہ صرف ضروری مضامین کی تعلیم دی جائے اس کے بعد مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم کا علیحدہ انتظام کیا جا سکتا ہے جو لوگ کسی مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل کرنا چاہیں وہ اپنی مزید تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر طالب علم کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مختلف مضامین کے بنیادی لوازمات سے آگاہ ہو جائے اس بنیادی تعلیم میں ضروری مضامین کا اب بہت قلیل حصہ شامل ہوگا اس مضمون کو وہ اپنی بعد کی زندگی میں کام کرنے کے لیے خاص طور پر اختیار کرنا چاہے۔ صرف اس کا مطالعہ تفصیلی طور پر کیا جا سکتا ہے تمام مضامین سے عام واقفیت کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے لیکن کسی مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل کرنا متعلقہ طالب علم کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس طرح تعلیم کا سب محکمہ ہو جائے گا اسکول میں کوئی کھیل جا سکیں گے ان کھیلوں میں جسمانی تربیت و ریاضت اور کرداری تعمیر کا انتظام کیا جا سکتا ہے کردار کی تعمیر میں قوت ارادی قوت فیصلہ اور قوت عمل کی نشوونما ہوگی۔

علم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سکھایا

آج کل ہمارے ہاں اسکول کی تعلیم میں فنی کا کوئی حصہ اس میں کسی اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ کارخ التحصیل ہونے کے بعد کسی نے کیا پیشہ اختیار کرنا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی پیشہ اختیار کرنے والے لوگ تین مختلف اقسام کے اسکولوں میں تعلیم پا کر آتے ہیں اسکولوں میں عام تعلیم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کسی مضمون میں خصوصی امتیاز کا انتظام نہیں ہائی اسکولوں میں بھی کسی مضمون کے اندر خصوصی امتیاز حاصل کرنے کا انتظام نہیں قومی سرکار اس قسم کے بنیادی نظام تعلیم کو بدل دے گی۔

ثقافتی تعلیم کی بنیاد اور سائنس کی بجائے تاریخ پر ہونی چاہیے

قومی سرکار نصاب تعلیم میں دوسری تبدیلی حسب ذیل کرے گی

اردو سے ماخوذ ہر ست زمانہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم و تعلیم اور تعلیم مسلسل ہی بہت زیادہ زور دیتی ہے مثال کے طور پر تعلیم، نباتات، تعلیم حیوانات، تعلیم کیمیا وغیرہ وغیرہ اس میں شک نہیں کہ یہ مضامین ایک بے زمانہ میں ضروری ہیں جب صنعتی علم صنعتی کیمیاوی کو زبردست اہمیت حاصل ہو چکی ہے اور بلکہ ہماری روزمرہ زندگی ہر قدم پر ان دونوں مضامین کے عملی مظاہروں سے وابستہ نظر آتی ہے لیکن کسی قوم کی ثقافت کی بنیاد ان دو مضامین کے علم پر رکھنا نظر نہ ہے ثقافت کی بنیاد تو ہمیشہ اصول پر ہی رکھی جانی چاہیے اور اس کا اصل مقصد ہونا چاہیے نہ کہ ثقافت کی بنیاد انسان کو ضابطہ و نظم کا پابند کرنے کے لیے رکھی جاتی ہے اس کا مقصد وہ بنیادیں فراہم کرنا ہے جن پر مختلف علوم و فنون کی خصوصی تعلیم کی عمارت کھڑی کی جا سکے اگر یہ بنیادیں فراہم کی جائیں تو ہم ان قوتوں کو ضائع کر دیں گے جو کسی قوم کے تحفظ کے لیے بہت ضروری ہر کاروائی کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہیں تاریخ کے مضمون میں قدیم تاریخ کو بڑا نظر انداز کرنا چاہیے روسو انگریزی کی تاریخ کے ہونے سے خود تاریخ کو صرف اپنے زمانہ کی تاریخ کا بہترین سبق دیتے ہیں بلکہ مستقبل کے لیے بھی موثر ترین راہنمائی کرتے ہیں۔ یونان کی ثقافت کے اصول ہمیں زندگی کے ہر پہلو کے حسن سے آگاہ کرنے کے لیے بہت گہرا اثر رکھتے ہیں یہ درست ہے کہ مختلف علوم میں بڑا فرق ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ہی اصل سے وابستہ ہونے کے باوجود مختلف علوم میں بلند پایہ کے ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ہم سے نظر انداز کر دیں ہمارے زمانہ میں جو کشمکش جاری ہے اس کے متعلق نہایت اہم تعلیم میں ایک تہذیب اپنے تحفظ و بقا کے لیے جنگ لڑ رہی ہے یہ وہ تہذیب ہے جو ہزارہا سال کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہے یونان اور روم دونوں اس ایک تہذیب کی علامتیں ہیں۔

ثقافت کی بنیاد بلند مقاصد پر ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص علم پر

عام تعلیمات اور علم کے خصوصی شعبوں کے درمیان واضح فرق قائم رکھنا چاہیے آج کل حال یہ ہے کہ علم دانوں کے خصوصی شعبے روز بروز تعلیمی دنیا کے تمام بنتے جا رہے ہیں اس رجحان کا تدارک کرنے کے لیے ثقافت کے عمومی اصولوں کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے کم از کم عمومی ثقافت کے وہ اصول تو ضرور برقرار رکھنے چاہئیں جو بلند مقاصد کی تلقین کرتے ہیں اس حقیقت پر بار بار زور دیا جا چکا ہے کہ جمہوری تجارت اور سوداگری کی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب قوم ہوا پرستی اور ہنگامی سے متاثر رہتی ہے ہنگامی اور ہنگامی اعلیٰ اصولوں اور بلند مقاصد کے اتحاد پر مبنی ہے اس لیے اعلیٰ اصولوں کے بلند تصب العین کے جمہوری تجارت اور سوداگری کی ترقی بھی ناممکن ہے یہ ترقی وہ ہوتی ہے جو خود غرضی کی فضا میں ممکن نہیں بلکہ ایسی ترقی تو دوسرے مقصدوں کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دینے اور ایثار سے کام لینے سے ہی ممکن ہے۔

قوم کا مرکز عقیدت سرکار یا قیادت نہیں بن سکتی

آج کل جو نظام تعلیم رائج ہے اس کا سب سے بڑا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ طالب علموں کے ذہن کو علم ٹھونس دیا جائے جس سے وہ دنیا میں اپنا گزارہ چلا سکیں اس اصول کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ "نوجوانوں کو ایک روزمرہ کا کارآمد رکن بنانا چاہیے" لیکن کارآمد رکن کا مقصد صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ بازار میں سے روزی کمانے کی فن کی تربیت نہایت عملی طور پر دی جاتی ہے یہ تربیت بھی عملی ہوتی ہے نہ کہ اصل مقصد مدنظر یہ ہے کہ اس تربیت کی بنیاد پر ہی ناقص ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکار بجائے خود محض ایک صورت کا نام ہے لوگوں کو یہ تربیت دینا مشکل ہے کہ وہ سرکار کی صورت ہی کو اپنا مقصد بنائیں اس صورت کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو اس صورت کے سامنے جواب دہ تصور کریں صورت کے کوئے میں کون سی چیز ہے

کے اختیار تھے ان دنوں یہ راستہ اختیار کیا جاتا تو اسے دنیا میں کمزور قوم ہی تصور کیا جاتا، بہادر قوم ہستی کے دنوں کا بھی اسے ایک لمحہ سمجھا جاتا۔ کسی بڑی بیداری کی لگاتیں ہر تھیں ان دنوں غلامانہ ذہنیت سے آزادی عقیدت کا ظہور زیادہ معقول تھا لوگ اسے برداشت بھی کر لیتے تھے لیکن قومی افتخار کو باقی سب خطرہ ہر ترجیح دیا جاتا تو زیادہ برداشت نہ کیا جاتا۔ غلامانہ ذہنیت سے آزادی عقیدت تو خود ہم پیدا کرتی تھی لیکن قومی افتخار سے محرومی ترقی کر جائے تو خطرہ تھا کہ یہ جذبہ کہیں سرکار کو عوام کی خدمت پر مجبور نہ کر دے غلامانہ ذہنیت سے آزادی کا نتیجہ تو صرف یہ تھا کہ فوج سے ریٹائر ہونے والے بڑے افسروں کی اکثریت کی تشکیل محض میں آ جاتی تھی لیکن اگر قوم پرستی کا جذبہ ترقی کر جاتا تو کیا راستہ اختیار کریں گی حکومت اس کی روک تھام کر پہلے سے کر لیتا مشکل تھا یہ قومی جذبہ ایک ایسی بے مہار طاقت ہے جو ہر سوار کو پٹخنی دیتی ہے کسی کو دبا کر رکھنے کی کیا بات ہے کہ کبھی لوگ ایسے خطرہ سے بچنا چاہتے ہیں یہ تو کسی کو وہم و خیال بھی نہ تھا کہ ایک روز جنگ چھڑ جائے گی پھر اس جنگ میں جب قومی کا نعرہ مستانہ دیا ہو گا تو پھر غلامانہ کی گرد و ہوا کی رہ پیلی گیس کے جھونکوں میں سے گذر رہا ہو گا پھر جب یہ جنون سر پر آ گیا تو ہوا ہے جذبہ جب قومی کی کی ہے ہمیں خوف کے زمانہ دار کہا ہے "مقصود شہنشاہ والی وقار" اور "قیصر و اللہ" کی خاطر کوئی شخص بھی اپنی جان دینے پر آمادہ نہ تھا جہاں تک "قوم" کا تعلق تھا اکثر باشندوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ "قوم" کس چڑیا کا نام ہوتا ہے۔

ہنگامی سرکار سے عقیدت سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی

جب جنگ میں انقلاب پیدا ہو گیا اور "ان شہنشاہ سے وابستہ رہیے" جب قومی کا خاتمہ ہو گیا تو بچارے تاریخ پڑھنے والے استادوں کو بڑی دقت پیش آئی اب تاریخ پڑھنے کا مقصد ہی کیا ہو گیا تھا جنگ کی تاریخ پڑھانے کا مقصد کوئی نہیں صرف واقعات رٹا دینے چاہئیں خود بخود سرکار کو جب اپنے وطن کے لوگوں کی کچھ قدر

نہیں لیکن یہ سرکار جو کچھ چاہتی ہے وہ بھی ناممکن ہے اب خاندان شاہی سے دشمنی
کیا ایسے دور میں لوگوں کی سرفروشی سے سرکاری سوبت ہے نہ اکسا کی اب دنیا میں قوم
پرستی کے جذبے غالب ہو رہے تھے تو یہ بھاری بھرکم سرکار کس کھیت کی مولی تھی کہ
لوگ اس کی خاطر اپنے خون گرائیں کیا اس میں شک ہے کہ اگر ان قوموں میں جنگ میں
سارے چار سال پامردی سے ہرگز کھڑی نہ رہتی اگر جنگ کا خرچہ ہوتا کہ آٹا بھرا
بھاری سرکار کی خاطر اپنی گردنیں کٹوا دیتیں کہ وہ آکر شاندار بھاری سرکار کی مسند حکومت پر جو
لوگ قابض ہیں وہ ان کے ہاتھ سے دنیا و دین تو دیکھئے کیا یہ اس قابل ہیں کہ لوگ ان کی
خاطر مر کٹیں۔"

بھاری سرکار غریب کی جورو ہے جو سب کی بھابھی ہوتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھاری سرکار محض اس لیے قائم ہے کہ یہ بھاری سب کا ہو ہر
ایک کا کہا مان لیتی ہے اور جو کچھ ہاں نہیں کہتی اس کے مانے کا وعدہ کر لیتی ہے یہ
بھاری سرکار دشمنوں کو فراخ اور فرمانے روا کرتی ہے یہ سرکار انہیں کے حق میں
ہمارے وطن کی سرزمین کے گلوں سے دستبردار ہونا قبول کر لیتی ہے دنیا کی بڑی قومیں
اس بھاری سرکار کو اپنا اور دیکھتی ہیں ایک کمزور محض بھوٹنی کی حالت درمحض کے مقابلہ
میں ان کاموں کا ذمہ دار نظر ہوتا ہے جو اسے اپنی مرضی کے موافق جو چاہیں ڈال
سکیں اس بھاری سرکار کی بڑی خوبی ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑا اور کیا ثبوت درکار
ہے کہ ہمارے دشمن اس طرز حکومت کو پسند کرتے ہیں ہمارے دشمن ہماری بھاری سرکار
کو محبوب رکھتے ہیں اور کوئی آثار نہیں مل سکتا فقط یہی وجہ ہے کہ یہ بلند مرتبہ سرکار آج
تک زندہ و برقرار ہے یہی وجہ ہے کہ یہ سرکار کسی ایسے کام تعلیم کو قبول کرتے ہی نہیں
جس سے کسی لوگوں میں حب وطنی کی روح پیدا ہو جائے اگر بھاری بھرکم کے
علمبردار دوسرے چھوٹے چھوٹے کمزوروں سے جنگ کرتے ہیں تو یہ بھاری سرکار بالکل مطمئن
ہے لیکن اس بھاری سرکار کو پسند نہیں کہ یہ چھوٹے کمزوروں سے جنگ کرنے والے سورما کس

ہوں خون کی قربانی دینے کا وقت آیا تو فرشتوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوں گے۔

مورچے لوٹ سکتے ہیں قلعے فتح ہو سکتے ہیں لیکن سورماؤں کے ارادے نہیں لوٹتے

قومی سرکار کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے زندہ ہوگا۔ قومی سرکار کا وجود ہمارے دشمنوں کے خوبصورت وعدوں پر اعتماد کرنے سے محفوظ نہ ہو جائے گا، بلکہ قومی سرکار اپنا وجود برقرار رکھنے اور اپنے تحفظ کی خاطر وہی راہیں اختیار کرے گی، جن کے متعلق سوجودہ نظام حکومت کا خیال ہے کہ ان راہوں کو ترک کر دینا چاہیے قومی سرکار کی مثل جس قدر قومی مفاد کے حق میں مفید ہوگی، اور جتنا قومی سرکار کا وجود قومی روح کے مطابق ہوگا، اتنا ہی اس سرکار کے دشمن اس پر حسد کریں گے اور اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ قومی سرکار کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ وہ اختیار یا اعتماد ہوں گے جو یہ سرکار استعمال کر سکے گی، بلکہ اس کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے شہری ہوں گے مورچے لوٹ جاتے ہیں، قلعے فتح ہو جاتے ہیں، لیکن زندہ مردوں اور عورتوں کی وہ فصیل جو دشمن کے کارے سے تعمیر ہوتی ہے کبھی دشمن کی طاقت سے ڈھائی نہیں جا سکتی۔ وہی حب وطن کا یہ جذبہ روحانی عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

لہٰذا ہمارے تعلیمی نظام کی اصلاح کے لیے تیسرا نکتہ حسب ذیل ہوگا۔

قوم کے بزرگوں کی عزت قوم کی تقویت کا باعث ہوتی ہے

قومی سرکار کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ مختلف علاقہ سے کسی قومی جذبہ غداری کی بو نہ آ رہی ہو سکتا ہے نہ صرف دنیا کی تاریخ بلکہ اپنی تہذیب و تمدن کی تاریخ قومی غدار کے جذبہ کی بو سونگھنے کے لیے ایک سوجھ محض اس لیے تعلیم ہستی نہیں کہ اس نے کوئی ایجاد اختراع کی ہے، بلکہ وہ اس لیے تعلیم ہستی ہے کہ اس نے اپنی قوم کی خدمت کی۔ کسی بڑے کارنامے پر غور کرنے سے اس میں جو جذبہ تحسین پیدا ہوتا ہے اسے فکر و عبادت کے اس جذبہ سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا جو کسی عارف کامل کے

کا کام ہوتا ہے۔ قوم کی تاریخ میں ایسے لوگ بھی گذرے ہیں جنہوں نے مقصد حاصل کرنے کے لیے ہمیں جو کام بتائے ہوں گے یہ ظاہر ہیں کام کے کام ہوں گے مگر ان بزرگوں کو جو ان قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے گا کہ ان بزرگوں کی یاد قومی جذبہ کی تقویت کے لیے مضبوط سہارا ثابت ہو۔

قوم پرستی کی بنیاد قومی جذبہ پر استوار ہوتا ہے

اس اصول کے مطابق مختلف علوم کے موضوعات اور نوٹ تیار کیے جائیں گے طریقہ تعلیم کو بھی بدلنا ہوگا کہ اسکول کھولنے کے بعد لڑکا یا لڑکی نیم مصنوعی پرستش، عائی جمہوریت وغیرہ کی بجائے وہ ماحول پیدا ہو جائے، بلکہ صحیح طلب سے قوم پرست ہو۔ یہ قومی جذبہ شروع سے ہی اخلاص پر مبنی ہونا چاہیے اس کی بنیاد محض دکھاوے پر نہ ہونی چاہیے جب بچوں کے ذہن کچی مٹی کی طرح ہوتے ہیں تو ان پر حسب ذیل بنیادی باتوں کا نقش ترجیحی اصول کے طور پر کر دینا چاہیے جو شخص اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے وہ صرف اپنی جان قوم کی خاطر قربان کرنے ہی میں زندگی سے ہی اپنے جذبہ قومی کا صدق ثابت کر سکتا ہے۔ اس جذبہ قومی سے مقصود اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنا ہو وہ ہرگز جذبہ قومی نہیں ہے ہی قوم پرستی صرف چند لمحات تک محدود بھی ہو سکتی ہے۔ نعرے لگانے اور تالیاں بجانے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ان حرکتوں سے کوئی شخص اپنے آپ کو قوم پرست کہلانے کا مستحق نہیں بنا جاتا۔ ہر نعرے کے پس پشت یہ خلوص و عزم و ہمت ہونا ہے کہ قوم کی بہتری کا تصور ہر حال کرنا ہے۔

قوم پر فخر سے پہلے قوم کو فخر کے قابل بنانا ہوگا

کوئی شخص اپنی قوم پر صرف تب فخر کر سکتا ہے جب قوم میں کوئی عیب ایسا باقی نہ رہ جائے، جس کی حالت کا تصور کرنے سے سر شرم سے جھک جائے۔ جب کسی قوم کی صفت سے زیادہ خامیوں کا شکار ہے۔ مطلعی نے ان کا پردہ اتار دیا ہے حتیٰ کہ ان میں وہ اخلاقی کمی سرایت کر گئی ہے جس کی وجہ سے [illegible] قوم پر کون شخص فخر کر سکتا ہے

جب قوم کے تمام افراد تعلیم اور اخلاقی رویوں کے لحاظ سے نومند ہوں، صرف اسی صورت میں یہ قوم ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اسے قومی افتخار کہا جاتا ہے۔ قومی افتخار کی اصل بلندیاں صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اپنی قوم کی عظمت سے واقف ہیں۔

نوجوانوں کے دلوں میں جب اپنی قوم کی عظیم اور شاندار تاریخ کا احساس ایک ہی شوق اور جذبہ کے ساتھ پیدا کر دیا جائے گا تو ایسا ہو گیا تو پھر ایک دن آئے گا جب ایسے شہریوں پر مشتمل ایک قوم وجود میں آئے گی، جو ایک دوسرے کی اخوت اور مشترکہ قومی افتخار کے بندھن سے متحد ہوں گے۔ یہی قوم دنیا کی قابل عزت قوم ہوگی اور اسے کبھی مٹایا نہ جا سکے گا۔

قوم سے عشق کو جنون کے درجہ پر پہنچانا ہوگا

ہمارے زمانہ میں محکوم قوم پر ہر طرف سے خوف کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی ہماری کمزوری کا نشان ہے۔ ہمارا زمانہ قوت و شوکت پر انحصار کرنے کا زمانہ ہے۔ نہ صرف یہ زمانہ خود استعداد سے عاری ہے، بلکہ اسے جوان مردی کے مظاہروں سے بھی نفرت ہے۔ جب تک یہ نفرت برقرار ہے، نفرت اس زمانہ کو کبھی عالیشان کارنامے انجام دینے کی جرأت نہ دے گی۔ اس زمین پر جتنے زبردست انقلابات ہوئے ہیں، اگر ان کے پیچھے پر جوش اور مجنونانہ جذبات کام نہ کر رہے ہوتے تو ان کا کبھی تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ ان انقلابوں کو نیکی قرار دیتے ہیں۔ ان انقلابوں اور صحیح پسندی کے زور سے یا اس طرح کی پر مشغل سے کبھی انقلابات برپا نہیں ہوتے۔

دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے

ایک بات یقینی ہے کہ دنیا میں عظیم انقلاب برپا ہونے والا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس انقلاب کا انجام کیا عمل کے حق میں ہوگا یا باطل کے حق میں ہوگا۔ یا کوئی دوسری قوم ہے جو اس انقلاب سے کامیاب نکلے گی۔

نوجوانوں کو صحیح خطوط پر تعلیم دے کر قومی سرکاری ملازمت میں ایک اچھی نشست پیدا کر دے گی جو دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی جنگ میں حصہ لینے کی اہل ہوگی۔

ہمارا کام مرہٹی اس قوم کے حصہ میں آئے گی جو پہلے سے راستہ چل نکلنے کی قومی سرکار تعلیم اور انسانی تربیت و ریاضت کے لیے جو انتظام قائم کرے گی، اس کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کے دماغ میں عمل پیدا ہو جائے اور وہ عملی عقیدہ کو سمجھ لیں۔ اسکول سے کوئی لڑکا یا لڑکی بطور کسی ہنر کی کامیاب لے کر اور بغیر کسی خون کی آمیزش سے بچائے کی ضرورت ہے یہاں آئے اور اس تعلیل ہو کر نکلے اس طرح ہماری عمل کے تحفظ کی اولین ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ہماری قوم کی آئندہ خالص ترقی کا بھی اس انتظام پر منحصر ہے۔

ہم کو دیکھنا چاہیے تو انسانی اور دماغی تربیت اس وقت تک ناکارہ ہے جب تک کہ یہ تربیت حاصل کرنے والے خود اپنی وجود برقرار رکھنے اور اپنی خصوصیات کو قائم رکھنے پر تلے ہوئے نہ ہوں۔

اپنوں کے کام آؤ۔ غیروں کے آلہ کار نہ بنو

اگر اس اصول پر عمل نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی صورت پیدا ہو جائے گی، جس میں ہر قوموں کے لیے سونے کا ہم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، مگر اب تک پیچھے تو یہ افسوس ناک صورت ابھی پیدا ہو چکی ہے، گو شاید ہمیں اس کا احساس نہیں وہ صورت یہ ہے کہ ہم اس دنیا کی تہذیب و تمدن کے لیے بطور کھلونا استعمال کیے جاتے ہیں اس زمانہ کے کھاتے پیتے لوگ تو اسے معمولی بات سمجھتے ہیں جب ہماری قوم کا کوئی رکن دوسرے دائرہ سے نکل کر کسی اور قوم میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط ایک شہری کم ہو گیا لیکن یہ احساس نہیں کہ ہمارے نسلی خلوں میں تاریخ کے ایک اور راستہ کھل گیا۔ ہماری نسلوں سے ہمارے مستقبل کا روح کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان نسلوں کو ان کی دلیل حیثیت سے اٹھا کر تہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر لے جائیں گے اس کے ساتھ

ساتھ ہم اس ہدف پر پہنچ چکے ہیں اگر یہ انتظام جاری رہا تو ہم وہاں سے ہمیشہ کے لیے گر نہ جائیں گے۔

نظام تعلیم میں آخری تبدیلی یہ کی جائے گی کہ مذکورہ بالا تعلیم و تربیت کی معراج کے طور پر عسکری تربیت دی جائے گی ہر وہ شہری جو عام تربیت حاصل کرتا ہے اسے پورے تعلیمی عرصے کے دوران عسکری تربیت دی جائے گی۔

قابلیت اور وراثت ورثہ میں نہیں ملتی

قومی سرکار ایک طرف تو عسکری اور دفاعی تربیت کو بڑی اہمیت دے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ خود سرکاری ملازمین کے انتخاب کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں آج کل اس اہم مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے والدین آج کل بڑے عہدوں پر کام کرتے ہیں ان کی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم دینے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کی ذہانت پر محض ثانوی توجہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ ذہانت ایک ایسی قابلیت ہے جس کا حامل دوسروں کے ساتھ مقابلے کے بعد ہی نکلتا ہے ممکن ہے ایک دیہاتی بچہ کسی شہری بچے کے مقابلے میں کم تہذیب یافتہ اور شائستہ ہو لیکن وہ اور اس کے والدین کی آپس کے زیادہ ذہین ہو جس کا خاندان کی پشتوں سے اعلیٰ مناصب پر قابض چلا آتا ہے۔ شہر کے بچوں کی شائستگی اور تہذیب کا اعلیٰ اس کی ذہانت یا کند ذہن ہونے سے کیا تعلق ہے شائستہ اور مہذب تو وہ اس لیے ہے کہ اس نے ایسے حالات میں تربیت پائی ہے جہاں اس کو مختلف کیفیتیں محسوس کرنے اور مشروع سیکھنے کا زیادہ موقعہ ملا ہے۔ اگر دیہاتی والدین کے ذہین بچے بچپن سے ہی اس قسم کے حالات میں پرورش پائیں تو ان کی تہذیبی اور تمدنی حالت بھی ترقی کر جائے۔ آج کل صرف ایک میدان ایسا ہے جہاں کوئی شخص محض اپنی استعداد کے سہارے ترقی کر سکتا ہے اور جہاں اس کے خاندانی مرتبہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے یہ میدان فوج کا ہے یہاں صرف تعلیم سے کام نہیں چلتا بلکہ یہاں تو خاندانی جوہر کی ضرورت ہے یہ درست ہے کہ خاندانی جوہر کی

نشوونما بھی ٹھیک طرح ہوتو وہ ترقی کرتا ہے اور نہ مرجھا جاتا ہے لیکن یہ ترقی صرف ان معنوں میں ہوتی ہے کہ ایک جوہر پہلے سے موجود ہے اور جب اس کی نشوونما ہوتی ہے یہاں وہ پورا ہو جاتا ہے کہ کوئی اور جوہر نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جوہر قابل صرف ہونہار بچوں یا دولت مندوں کے گھر ہی جنم نہیں لیتا بلکہ ان طبقے کے باہر بھی غریب گھرانوں میں توجہ ہوتے ہیں اور یہ ایسا ہو چکا ہے کہ کسی اور قوم کا ان سے ایک بچہ آیا اور بعد میں مشہور ہو کر فن بن گیا۔

یہ انسان ہیں یا چلتی پھرتی ڈکشنریاں

جس حقیقت حال کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے اس کو قوم کی ذہنی اور علمی حالت کی ترقی کے لیے مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں لوگ کیسے کیسے سمجھ لیے ہوئے ہیں اور یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اگرچہ اس اصول کا اطلاق ٹوں طبقے کے میدان میں مناسب ہے، لیکن ان علوم پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا جو روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں یہ درست ہے کہ ہر شخص کو کسی حد تک مشینوں کے مستری کا کام سکھایا جاتا ہے، اس طرح پر لوگوں کو ہوشیار رہنے کی کتاب سکھا لیتے ہیں لیکن اس تربیت کا یہ مطلب نہیں کہ جانور اپنی عقل استعمال کر کے وہ کرتب انجام دیتا ہے عقل تو سکھانے والے کی ہوتی ہے یہی اصول انسان پر بھی عائد ہوتا ہے انسان میں ذہانت ہو یا نہ ہو اسے سائنس کی کئی ترکیبیں سکھائی جا سکتی ہیں جیسا کسی جانور کا کرتب۔ ایک حد تک کسی شخص کو زبردستی ذہین بھی بنایا جا سکتا ہے مطلب یہ کہ اگر اس کو شدید ذہنی تربیت دی جائے تو اسے اوسط درجہ کے کارکنوں سے زیادہ علم حاصل ہو جائے گا لیکن یہ علم مہارتی ذہانت پیدا نہیں کرتی ہے اس قسم کے انسان چلتی پھرتی ڈکشنری بن جاتے ہیں جب زندگی میں کوئی ایسا وقت آ جائے جب فوری فیصلے کرنے کی ضرورت ہو تو علم کی یہ چلتی پھرتی کتابیں اس قابل نہیں رہتیں ایسے لوگوں کو ہر نئے موقعہ پر از سر نو تربیت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انکی جو

کرتب دکھایا گیا ہے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی کی صلاحیت ہو تو وہ خود یہ تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بلکہ انہیں یہ تبدیلی بھی دکھائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بنی نوع آدم کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ جب لوگوں کو محفوظ کیا ہوا ہو اور انہوں نے علم حاصل کیا ہو تو ایسے لوگ صرف موجودہ سرکار کے اعلیٰ عہدوں پر ہی قابض رہنے کی قابلیت پیدا کر سکتے ہیں۔

علم مردہ ہے، اس میں جان جو ہر ذاتی سے پیدا ہوتی ہے

یہ بات تو علیحدہ رہی کہ یہ بھی صحیح ہے کہ کسی قوم کے ذہین سے ذہین افراد اس قوم کی آبادی کے ہر حلقے میں پھیلے ہوتے ہیں یہ بھی امر ہے کہ علم بجائے خود مردہ رہتا ہے اگر علم کی دولت انسان کے ذہن میں داخل ہو تو اس میں بوجھ بڑھ جائے گی، اور کسی انسان کے ذہن میں ٹھونس دیا گیا تو وہ بھی بوجھ رہے گا علم میں تخلیقی قوت تبھی پیدا ہوتی ہے جب علم کے ساتھ ذہانت اور جوہر ذاتی بھی شامل ہو جائے۔

ایک مثال سے ثابت ہو جائے گا کہ ہمارا زمانہ اس معاملہ میں کسی قدیم غلطی کا مرتکب رہا ہے ہمارے اخبار اور رسائل وقتاً فوقتاً ایسی خبریں شائع کرتے رہتے ہیں کہ "دنیا کے کسی حصہ میں پہلی مرتبہ ایک عورت وکیل بن گئی ہے، یا ڈاکٹر بن گئی ہے، یا ڈاکٹری بن گئی ہے، یا بیرسٹر یا جج بن گئی ہے۔" ان خبروں سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ خود ترقی میں جو پیچھے قوم کے لوگ ہوتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کھاتے پیتے طبقات میں کئی ایسے حلقے موجود ہیں جو ایسی خبریں پڑھ کر تحسین و آفرین کے وہ گھڑے برسانے لگتے ہیں انہیں یہ سن کر وجد طاری ہو جاتا ہے کہ ہمارے زمانہ تعلیم کے طریقوں نے کیا حیرت انگیز ترقی کی ہے برعکس اس کے میرا ہمیشہ ہی جی چاہا ہے کہ ایسی خبروں سے وہ مفہوم حاصل کیا جائے جو ان کے اندر مضمر ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی خبروں سے وہ مفہوم حاصل کیا جا سکتا ہے جسے وہ لوگ نہیں پا سکتے جو ان خبروں سے وہ مفہوم حاصل کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہے میرا عقیدہ یہ ہے کہ "سب انسان برابر ہیں" ان بیوقوف کھاتے پیتے لوگوں کو یہ کہنا کہ کسی خبر میں خود عقل و دانش کے خلاف ایک مخفی نظم

کے رجحان کی طرف ہیں یہ بھی ماننا ہوگی کہ ایک پیدائشی ان پڑھ کو کیسے بتا
دینے کا ہنر آتا ہے۔ دوسری طرف مذہب نسلوں کے کھوکھلا طرز ایسے کام
انجام دیتے رہیں جو اس کے تمدنی رتبہ کے شان شایان نہیں یہ کہنے والے بھی کی
بات نہیں سمجھتے کہ جب کھوکھلا علمی استعداد طرز کا کمال ہو کر ہاتھی کی دم میں چھپے
ہوئے ہیں تو ایسے حالات میں ہو تلو خیل کے جنگلوں اور روہ قبیلوں کے
وحشیوں ۔۔۔۔ کو ایسے عہدوں پر فائز ہونے کی تربیت دینا ان کے لیے علم و دانش
داری ہیں اور حقیقت ٹکانے ربانی کے خلاف عملی ہٹ دھرمی اور سرکشی کے مترادف ہے۔
ان وحشیوں کو تربیت دے کر تعلیم یافتہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے کتوں کو کرتب سکھانا۔ اگر
صاحب استعداد نسلوں پر اتنی ہی محنت اور کوشش صرف کی جائے تو ان کا ہر فرد اپنے
معاملات میں ہزار درجہ بہتر اور قابل ثابت ہو سکتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے مستحق صرف اعلیٰ ذہن ہیں

اگر اس قسم کی ترکیبیں عام ہو گئیں تو ایک دن ایسا بھی آ جائے گا جب صورت حال نا
قابل برداشت ہو جائے گی جتنی ہی جلد جیسے تو صورت حال بے بھی نا قابل برداشت ہے،
کیونکہ ذہانت اور علمی جوہر کو اعلیٰ تعلیم کا حقدار بنانے کے لیے کافی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ
حالت نا قابل برداشت ہے کہ ہر سال لکھو کھہا انسان جو کہ علمی استعداد سے بے بہرہ
ہیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں اور دوسری طرف لکھو کھہا انسان جو ہر ذہانت رکھنے
کے باوجود اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں، اس طرح قوم کو جو مجموعی نقصان پہنچتا ہے اس کا
اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ گزشتہ چند برسوں سے امریکہ میں ہم جماعت امتحانات کی
تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں دنیا سے اونچی معاشرتی طبقات
کے ذہین افراد کو اعلیٰ تعلیم دینے کا تناسب دوسرے کے مقابلے میں بہت اونچا ہے۔

"کھوپڑی کے تابوت" میں "علم کی لاش"

یہ ثابت کرنے کے لیے کھوپڑی کے صندوق میں علم کی لاش کافی نہیں اونچی امتحانات

کے لیے بے حد کی ضرورت ہے جتنے زیادہ ذہین اور استعداد والے کی مدد حاصل ہو۔ وہاں آج کل جو ہر ذہانی اور استعداد والے کی بہت قدر کیوں قدر ہے تو اسکول سے آنے والی رپورٹوں کی۔

پھر ایک یہ موضوع ہے جس کے متعلق قومی سرکار کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں سے تعلیم کی تربیت کرنا ہوگی قومی سرکار کا کام یہ نہیں کہ کسی ایک معاشرتی طبقہ کو جو پہلے سے موجود ہے باقی طبقات پر غالب کر دیا جائے۔ قومی سرکار کا تو فرض یہ ہے کہ قوم کی کل آبادی میں سے بہترین دماغ خواہ کس منصب اور امور کے مستحق ہیں انہیں وہاں پہنچا دیا جائے قومی سرکار کا فرض نہیں کہ ہر متوسط بچے کو پرائمری اسکول میں ایک خاص حد تک تعلیم دی جائے۔ بلکہ قومی سرکار کا یہ بھی فرض ہے کہ مناسب قابلیت رکھنے والے بچوں پر ترقی کی دروازیں کھول دی جائیں جس کے لیے وہ ذہنی استعداد رکھتے ہیں علاوہ ازیں ہر معاشرتی طبقہ کے ذہین بچوں پر ہائی اسکولوں کے دروازے کھول دیے جائے چاہیں یہ بہت ہاری ہے ہونے والے کے اور کوئی طریقہ نہیں جس سے قوم کی رہنمائی کے لیے قابل لیڈروں کا ایک گروہ پیدا کیا جائے۔ ایسا نہ ہو تو تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی استعداد رکھنے والے افراد داخل ہو کے جا سکیں گے۔

دانشور طبقہ پر خود غلط ہوتا ہے

ایک اور بات بھی ہے کہ سرکار کو خود کیوں یہ کام کرنے کا انتظام کرنا چاہیے دانشور طبقہ ایسا ہی پر خود غلط خود پسند اور کیریکٹر کا فقیر ہوتا ہے کہ قوم کے باقی طبقات سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ خاص طور پر ترقی کا دانشور طبقہ تو اس مرض میں اور بھی بری طرح گرفتار ہے اس کے بارے بچے لکھتے ہیں جس قوم دانشور طبقہ نے قوم اس لباس کو کچھ سمجھتا ہے اور نہ اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔ یہ طبقہ اتنی مدت سے عوام سے کٹ چکا ہوتا ہے کہ اب اس کا عوام سے کوئی ایسا تعلیمی رابطہ باقی نہیں رہتا جس کے ذریعہ وہ ان کو سمجھ سکے۔ وہ تو قوم سے قطعی اجنبی بن چکا ہوتا ہے۔ دوسرے دانشور طبقہ میں مبتلا ہے

قوت ارادی مفقود ہوتی ہے یہ قوت ہمیشہ شائستہ طبقات میں کم پائی جاتی ہے کیونکہ وہ طبقات لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ لکیر اس کے معنی الناس میں چونکہ ایک گونہ مشابہت بہ نباتات کا غلبہ ہوتا ہے اس لیے ان کی قوت فیصلہ بھی زیادہ تر قوت ارادی ہے لہٰذا ہم قدموں میں علمی شائستگی اور ثقافت کی کمی نہیں رہی۔ لیکن ہماری قوت فیصلہ و قوت ارادی ہمیشہ کمزور رہی ہے۔

ان کو علمی برتری کی شکایت ہے

مثال کے طور پر ہمارے سیاسی مدبرین میں سے جو لوگ زیادہ دانشور تھے ان سے کوئی بھی کارنامہ انجام دینے میں یکسر قاصر ہوئے جب عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو اس جنگ کے لیے ہماری سیاسی تیاریوں اور عسکری تدبروں دونوں کا کچا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کے حاکم کوئی طرح تعلیم یافتہ نہ تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے قومی امور کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے اندر کتابی علم اور کتابی فضیلت بھی تھی کہ بعض لوگوں کو علمی برتری ہو گئی تھی ان کا کوئی عملی احساس اعتدال کی حالت پر نہ تھا۔ ان میں ہمت اور جوش باقی تھا۔ نہ ہی وہ دلیری سے کوئی کام انجام دے سکتے تھے ہماری قوم کی بدقسمتی تھی کہ ہم ایسے صدر اعظم کے وقت جنگ لڑ رہے تھے جو کہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر ہیڈ کوارٹر میں یا فوج کی جگہ اور کوئی بڑا افسر ہوتا اور درشت مزاج شخص ہوتا تو ہمارے عام سپاہیوں کا اتنا بے دریغ خون رائیگاں نہ بہتا۔ ہمارے قائدین کو مبالغہ آمیز دانشوری کی جو بیماری لاحق تھی، اس سے ان لوگوں کو سب سے زیادہ دلی نفرت تھی نے ماہ نومبر 1918ء کا انتخاب کر لیا۔ یہ عقل کے مارے ہوئے لوگوں نے قومی دولت کے سرچشمے کا سانپ بن کر بیٹھے رہے اور ہی دولت کو دوبارہ کبھی انہوں نے دوبارہ نہ دیکھی جس سے دوسری قوموں نے فتح حاصل کر لی۔

دانشوروں کے طبقہ میں تازہ خون داخل ہوتا رہنا چاہیے

یہاں بیتھوفن کچھ مایہ ناز قابل تقلید مثال قائم کرتا ہے کچھ ماہ کے بارہویں کو اردو ج
کی اجازت نہیں۔ اس لیے وہ اپنے بہترین خود اپنی صفوں سے انتخاب نہیں کر سکتے۔ بلکہ
بتدریج بہتر انسان سے۔ انہیں اپنے بہترین منتخب کرنے پڑتے ہیں کی لوگ ٹرک لان
کی اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے ساری کچھ کے اس قدیم نظام کو اس قوت کے ساتھ برقرار
رکھنے میں اس راز کو بڑا دخل ہے یوں کچھ کے اعلیٰ عہدہ دار ہمیشہ عوام کے نچلے طبقوں
سے بھرتی کر کے کچھ ما۔ یہ صرف عوام الناس کے ساتھ ایک ذہنی و نفسیاتی رشتہ قائم رکھنا
ہے بلکہ جو ہر قابل کی تلاش اور خدمت کا ایک ایسا طریقہ بھی فراہم کر لیتا ہے جو صرف
عوام سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ ما کا روحانی نظام اپنی جملی پاک اور
اصلی قوت راوی کے ساتھ آج تک زندہ ہے۔

قومی سرکار کا بھی فرض ہے کہ ایسے نظام تعلیم کی اس طرح تنظیم کرے اور اس کو
اس طرح چلائے کہ ہر جوہر دار نوجوان طبقے میں قوم کے دیگر ذہنی طبقات سے ہمیشہ تازہ
خون داخل ہوتا رہے۔

سرکاری ملازمت آبائی جاگیر نہ بن جانی چاہیے

قوم کی عام آبادی سے سرکار کو ذہنی اختلاط اور پوری ٹریننگ کے بعد وہ طریقہ اختیار
کرنے چاہئیں جس میں ظلی جوہر موجود ہے اور انہیں قومی خدمت پر مامور کر دینا
چاہیے سرکار خود یا سرکار کے منتخب کئے کسی خاص طبقے کے افراد کو آمدنی مہیا کرنے کے
لیے قوم نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ تو اس لیے قائم ہوتے ہیں کہ وہ کام انجام دیں جو ان کے
سپرد کیا گیا ہے یہ کام تبھی ٹھیک طرح انجام دیا جا سکتا ہے اگر سرکار منتخب ملازمت کے
لیے ہمیشہ ایسے افراد کو ترجیح دے۔ جو افراد اس تربیت کے لیے منتخب ہوں۔ ان میں
مطلوبہ ظلی قابلیت اور قوت ارادی موجود ہونی لازمی ہے یہ اصول صرف دیہاتی عہدہ
داروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ جو لوگ قوم کی ذہنی و اخلاقی قیادت سنبھالنا چاہتے ہیں ان
پر بھی عائد ہوتا ہے۔ چاہے وہ کسی دائرہ میں کام کر رہے ہوں ایک قوم کی حکومت کسی حد

تک اس شرط پر منحصر ہوتی ہے کہ اس قوم کے بہترین دماغوں کو قومی خدمت کے ان شعبوں کے لیے پوری تربیت دی جائے جنہیں سنبھالنے کی ان میں خصوصی استعداد ہے مگر اس تربیت یافتہ افراد کو ان عہدوں پر متعین کر دیا جائے جہاں وہ قوم کی بہترین خدمت انجام دے سکتے ہیں اگر دو قوموں میں جنگ چھڑ جائے اور دونوں قوموں کی حالت اور تعلیمی استعداد یکساں ہو تو اس قوم کو فتح ہو گی جس نے پہلی ہی اور بنیادی قیادت اپنے بہترین دماغوں کے سپرد کی ہو گی اور اس قوم کو شکست ہو گی جو محض خاص گروہوں یا محض چند طبقات کا انتخاب کرتی رہی اور جس کے افراد کی فطری قابلیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

ہاتھ سے کام کرنا کوئی عیب نہیں

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا کے موجودہ حالات میں یہ اصول ناممکن نظر آتی ہے فوراً اعتراض کیا جائے گا کہ کسی اعلیٰ عہدے پر متمکن سرکاری عہدے دار کے متعلق فرد واحد سے یہ توقع رکھنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی روزی کمائے اور وہ یہ مشقت محض اس لیے برداشت کرے کہ کوئی دوسرا شخص جس کے ساتھ اس عہدہ سے تعلق رکھتے ہیں سرکاری ملازمت کے کسی عہدے پر کار ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ یہ دلیل بھی تب ٹھیک نظر آتی ہے جب تک ہاتھ سے کام کرنے کی روزی کمانا اس طرح برا سمجھا جاتا ہے جس طرح کہ آج کل برا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قومی سرکار کو ہاتھ سے کام کرنے والوں کی قدر افزائی کرنا ہو گی اس قدر افزائی کا معیار موجودہ معیار سے بالکل مختلف ہو گا۔ اگر ضرورت ہو تو قومی سرکار تعلیم و تربیت کا ایک بہت مستقل نظام کھڑا کرے گی جس سے بیک وقت اتحاد عادت و کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ ہاتھ سے کام کرنا کوئی ایسا پیشہ ہے جس کے لیے پیشہ اختیار کرنے والے کو شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے۔

ہر قوم کی عزت و حرمت کا معیار یہ ہو گا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، بلکہ ہر قوم کی قدر

عزت کا یہ معیار ہوگا کہ وہ جو کام کرتے ہیں کیسے اچھے طریقے سے کرتے ہیں اور یہ کام قوم کے لیے کہاں تک مفید ہے اور یہ قول ایک ایسے زمانہ میں سخت جاہلانہ معلوم ہوگا جبکہ کسی ایک ہنر کا کوئی ماہر کسی ماہر ترین مستری سے زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت داؤد کا ہاتھ سے کھس کھس کرتے ہیں جیسے میں کہہ چکا ہوں عزت و حرمت کا یہ خلط معیار فطرتی قدر کے مطابق نہیں یہ معیار تو مصنوعی طور پر اختیار کیا گیا ہے ایک زمانہ تھا جب اس خلط معیار کا ہندوستان میں نہ تھا موجودہ مغربی تہذیب حالات اس پر پیدا ہوئے کہ ہمارے زمانہ میں مادہ پرستی کا زور ہو گیا ہے۔ اس مادہ پرستی سے جہاں اور بہت سے خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوگئی۔

روپیہ عزت کا پیمانہ نہیں بن سکتا

مادی حالت سے دیکھا جائے تو کسی پیشہ کی قدر و قیمت کا دو طریقوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک پہلو تو مادی ہے دوسرا اصولی کسی پیشہ کی مادی قدر و قیمت تو اس پر منحصر ہے کہ اس کام سے کہاں تک عملی فائدہ پہنچتا ہے آدمی کا جتنا زیادہ حصہ کسی کام سے فائدہ اٹھاتا ہے اتنی ہی اس کام کی مادی قیمت زیادہ ہوگی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اس پیشہ سے مادی فائدہ براہ راست پہنچتا ہے یا بالواسطہ۔ اس قدر و قیمت کا اظہار اس مادی معاوضہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو کام کرنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ اس خالص مادی قدر و قیمت کے علاوہ ایک اصولی قیمت بھی ہوتی ہے اصولی قیمت کا اندازہ کام کی مادی اہمیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پہلو سے کیا جاتا ہے کہ اس کام سے کہاں تک ایک قومی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی ایجاد کی مادی قدر و قیمت کا اندازہ کام کی مادی اہمیت سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس پہلو سے کیا جاتا ہے کہ اس کام سے کہاں تک ایک قومی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی ایجاد کی مادی قدر و قیمت ایک مزدور کے روزانہ کام سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی ٹھیک بات ہے کہ قوم کو

بنیادوں کو کیسے مضبوط بنایا جا سکتا ہے اس کی توفیق دینا قدرت کے ہاتھ ہے۔ فرد کا فرض یہ ہے کہ اسے قوم جو کچھ عطا کرتی ہے وہ پوری دیانت اور سرگرمی سے اس کا عوض قوم کو ادا کر دے۔ جو شخص یہ فرض ادا کرتا ہے وہ عین قرین عزت و اکرام کا مستحق ہے۔ مادی معاوضہ تو اس حساب سے دیا جائے گا کہ کس پیشہ سے قوم کو کیا مادی فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اصولی معاوضہ صرف یہ ہے کہ قوم ہر اس شخص کا احترام کرے جو قدرت کی بخشی ہوئی استعداد کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کرتا ہے۔ اس فکری استعداد کی تربیت قوم پر منحصر ہے۔ اگر یہ حقیقت کھل جائے تو ہر ایک دیانت دار کاری گر ہو یا کوئی بے غرض سیاست کا ہو یا ایک ماہر سرکاری ملازم ہو ان سب کی تشخیص صالح کرے اور دیانت دار عوام کو خون پسینہ کی کمائیاں تو ڑنا ضرور بے غرضی کی بات ہے اگر ایک دفعہ یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننے میں کوئی دقت نہ رہے گی کہ کسی شخص کو کوئی ایسا عہدہ نہ دیا جائے جس کا وہ اہل نہ ہو اور ان ذاتی استعداد اور کفایت کی وہ واحد معیار ہیں جس کا منصفانہ اندازہ کر کے کسی شخص کو قومی مسائل میں دخل دینے کی اجازت ہونی چاہیے۔

مساوات کی بنیاد اجرت پر نہیں بلکہ فرض شناسی پر ہونی چاہیے

موجودہ زمانہ تو خود پرستی کا نظام کر رہا ہے۔ ایک طرف ہر شخص سے وفاداری کا حق دو جاتا ہے۔ مساوی حقوق کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اس مساوات کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں رائج الوقت نظام کے ماتحت کسی انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ اسے دولت کیا حاصل ہوتی ہے۔ یہ معیار قبول کرنے سے انسانی شرافت کی بنیاد پر مساوات کے قیام کی حرکت جاتی ہے مساوات اس کا نام نہیں کہ کوئی شخص کیا کام کرتا ہے مساوات تو اس پر منحصر ہے کہ جو کام کسی کے سپرد کیا جاتا ہے وہ اسے کس حد تک خوب انجام دیتا ہے صرف یہی طریقہ ہے جس سے لوگوں کی عزت غرض کل بیچ طریقہ سے طے کرنے کی بجائے ہر شخص کی مساعی اس کا خود طے کرنے کا حق ہیں

جاتا ہے۔

نازک وقت میں کھلی کھلی بات کر دینی چاہیے

حالات موجودہ جبکہ لوگ ایک دوسرے کا مزاج و کردار کا اندازہ ایک دوسرے کی گفتاروں کی مقدار سے لگاتے ہیں مذکورہ بالا سچائی کی اہمیت کو ہرگز نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان ہدایات کی تعمیل ترک کر دیں، بلکہ اس کا عرض اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب کسی زمانہ میں انسانیت کو اندر سے گھن لگ جاتا ہے، وہ ہوا کے گرجے میں گرنا شروع کر دیتی ہے تو وہ شخص جو اس کا علاج کرنا چاہے اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ خرابی کی اصل جڑیں تلاش کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ قوم پرست شاعر کی تحریک کا فرض ہے کہ حالات موجودہ کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھا لے۔ بہت سے کھاتے پیتے لوگ قوم میں جو گہری چھپا رہے ہیں، ان کے خلاف آواز بلند کرنی ہوگی۔ اور ان تمام عوامی طاقتوں کو متحد کر کے ان میں ہلچل پیدا کرنا ہوگا۔ جو ایک نئے صالح نظام کے علمبردار بننے پر آمادہ ہوں۔

فضیلت کا معیار لالچ یا اجرت نہیں، بلکہ ایثار اور زہد ہے

یہاں یہ اعتراض کیا جائے گا کہ کسی پیشہ کی مادی قدر و قیمت اور اصولی قدر و قیمت میں امتیاز کرنا مشکل ہے اگر انسانی مزدوری کرنے والوں کی قدر، خرابی کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لیے اجرت بھی کم ملتی ہے۔ معترض کہے گا کہ اجرت کم ملنے کی وجہ سے ہی انسانی مزدور کو تمدنی تہذیب میں شرکت کا موقعہ نہیں ملتا۔ انسانی قدروں کی اصولی قدر و قیمت سے اگر مزدور کو حصہ نہیں ملتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور غریب کی روزانہ سرگرمیوں میں اس اقدار کا کوئی عمل دخل ہی نہیں۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ انسانی مزدوروں کا پیشہ اختیار کرنے میں اسی وجہ سے عار کیا جاتا ہے کہ اس پیشہ کی کم آمدنی کے باعث انسانی مزدوروں کا تمدنی معیار گر جاتا ہے تمدنی معیار کا یوں پست ہونا ہی انسانی مزدوروں کی بے عزتی کا موجب ہے۔

ان عقل سے بہت بڑھ کر حقیقت بھی ہے لیکن اس عقل سے بھی بڑی کا
شامل ہونا ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ مستقبل میں مختلف پیشوں کی اہمیت
کے مابین تکرار یا دوئی نہ ہونا چاہیے۔ یہ کہنا کہ جرمنی میں مساوی کردی گئیں تو عملی کام کا
معیار گر جائے گا یہ قومی اخلاق کی بدترین علامت ہوگی کہ لوگوں کو علمی پیشے اختیار کرنے
پر اکسانے کے لیے انہیں زیادہ اہمیت دینا ضروری ثابت ہو۔ اگر دنیا میں آج تک یہی
دستور رائج ہوتا تو دنیا بہترین علمی اور تمدنی کارناموں سے محروم رہتی دنیا کی عظیم ترین
ایجادات، اہم ترین اختراعات، اکثر اہم علمی انکشافات، اور انسانی تمدن کے
شاندار ترین کارنامے دولت کے لالچ یا دولت کے زور سے وجود میں نہیں آئے حقیقت
اس کے بالکل برعکس ہے ان عظیم کارناموں کی بنیاد ہمیشہ دنیاوی عیش و آرام کی وہ
صورتیں ترک کرنے سے ہوئی جو محض دولت سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

انسان صرف دولت اور لذت کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا

یہ ٹھیک ہے کہ آج کل دولت ایک ایسی طاقت بن چکی ہے جو زندگی کے ہر پہلو پر
حاوی ہے اس کے باوجود وہ وقت آنے والا ہے جب انسان اندر سے فطرت کی پرورش
کرے گا آج انسان کو جو کچھ حاصل ہے اس کا بہت سا حصہ وہ ہے جو باہر سے لالچ
سے تیار ہوا ہے لیکن آج انسان کو جو کچھ حاصل ہے وہ اس سے محروم کر دیا جائے تو
انسانیت کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔

ہماری تحریک کا ایک یہ مقصد ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانہ کا خواب دکھایا
جائے جب ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی فراہم کر دی جائیں گی اس زمانہ میں یہ
اصول تسلیم کیا جائے گا کہ انسان صرف مادی لذتوں کی خاطر زندہ نہیں اس اصول کا
خاتمہ ہوگا کہ اجرتوں کے نرخ زیادہ معقول ہوں گے تو وہی مقرر کی جائیں گی
کہ ہر شخص جو ہے وہ دولت سے دلی مزدوری کیوں نہ ہو۔ اگر اپنا فرض دیانت داری سے ادا
کرتا ہے تو عزت اور شائستگی کی زندگی بسر کر سکے گا جیسے ایک انسان اور حیثیت ایک

شوری کے وہ عزائم کر سکتا ہے جو کہ بے محل عالم خواب کی باتیں ہیں یہ نہ کہو کہ دنیا کبھی ان جذبوں پر عمل درآمد کرنے کی پوزیشن میں ہو گی کہ یہ خواب ناقابل عمل ہیں۔

مشکلات اس لیے پیش آتی ہیں کہ انہیں حل کیا جائے

ہم بھی ایسے سادہ لوح نہیں کہ اس خیال میں مگن ہو جائیں کہ دنیا میں کبھی کوئی ایسا زمانہ بھی آ سکتا ہے جب کوئی ٹھوکر نہ لگے گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم ان ٹھوکروں کا احساس کر چکے ہیں انہیں دور کرنے کی جدوجہد نہ کریں۔ یہ کوتاہیوں کو رفع کر کے نصب العین کی جانب تیز تر سفر کریں۔ یہ درست ہے کہ انقلاب کی دنیا ہمیشہ انسان کی خواہشات کے راستہ میں بہت سی مشکلات پیدا کرے گی لیکن ان مشکلات کا تقاضا صرف یہ ہے کہ انسان بڑھ کر اپنے نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کرے کوئی ناکامی سے یہ عزم و ارادہ چھوڑنے پر آمادہ کر سکے کس طرح قانون کے نفاذ میں غلطیاں ہو جانے کے باوجود ہم عدل و انصاف کی تلاش ترک نہیں کر سکتے، کس طرح بیمار کے باقی رہنے کے باوجود ہم علاج سے دست کش ہو سکتے اسی طرح مشکلات پیش آنے کے باوجود ہم بلند نصب العین کے حصول کی کوشش بھی ترک نہیں کر سکتے۔

انقلاب سے ذلت اور قربانی سے عزت حاصل ہوتی ہے

انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ بلند نصب العین قبول کرنے سے جو بر دست طاقت ضمیر میں آتی ہے اس کا کبھی انکار نہ ہونے دے اگر موجودہ حالات میں ہم تک ہو چکے ہیں، اگر ان ہونے والوں میں کچھ سوجھ بوجھ بھی شامل ہیں تو میں انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب دنیا میں تمہاری اطاعت، بلند نصب العین کی خاطر زبردست ترین قربانیاں پیش کرنے کا بہترین نمونہ تھی کیا میدان جنگ میں گردنیں کٹانے والے وہ وقت کی روشنی کی خاطر میں جانیں نچھاور کرنے والے کہاں گئے وہ قربانی ملک کی عزت ملک کی عظمت پر نثار ہونے والے ملک کے وقار کو بچانے کی

باب سوم :: ''سرکار کے اراکین'' اور ''سرکار کی رعایا'' میں کیا فرق ہوتا ہے

کسی سرکار کا شہری ہونے کا مطلب کیا ہے

آج کل سرکار دراصل سرکار کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ سرکار ملک کے باشندوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ پہلی شہری اور غیر شہری شہری وہ لوگ ہیں جنہیں ملک کے اندر پیدا ہونے کے باعث، یا قانون کے ذریعہ ملک کا شہری بن جانے کے سبب شہریت کے تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ غیر شہری وہ لوگ ہیں جنہیں یہی حقوق کسی اور سرکار کے ماتحت حاصل ہوں۔ ان دونوں قسموں کے علاوہ کچھ اور لوگ ہیں جو دنیا کی کسی سرکار کے شہری نہیں اور اس لیے انہیں سرکار کے ماتحت بھی شہریت کے حقوق حاصل نہیں۔

آج کل شہری حقوق حاصل کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ جو شخص کسی سرکار کے علاقہ کے اندر پیدا ہوتا ہے، وہ اس سرکار کا شہری بن جاتا ہے۔ یہ پتا چلنا کہ کون سا بچہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے، یا کس نسل سے، مشکل ہوتا ہے۔ ان باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی حبشی کسی امریکی ماتحت ریاست میں پیدا ہوا ہو تو اس کا قیام خواہ وہ حبشی نژاد میں داخل ہو کر یہاں رہائش اختیار کر لیتا ہے تو اس کا بچہ خود بخود ہی کی نظروں میں ''نژادی'' شہری بن جاتا ہے۔ علی ہذا القیاس کسی ہندوستانی کو بچہ، کسی بھی قوم کے باشندہ کا بچہ، کسی افریقی نژاد، یا کسی ہسپانوی نژاد یا کسی ''نژادی'' بن سکتا ہے۔

جب شہری دو ہوں تو کوئی کس پر چھتہ مونث دانت کتنے ہیں

کسی ملک کے اندر پیدا ہونے کے باعث، اس ملک کی شہریت کے حقوق حاصل کر لینے کے علاوہ، یہ حقوق بعد میں بھی حاصل کر لینے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ اس دوسرے

طریقے کے پیچھے کئی شرطیں کارفرما ہیں مثلاً ایک شرط تو یہ ہے کہ اگر محسن ہو تو درخواست کنندہ کوئی مجرم یا دہشت گرد نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے قومی مفادات نہ ہونے چاہئیں یا اگر ہوں تو دیگر سیاست کے معاملہ میں وہ ایک دوسرے سے متصادم نہ ہونے چاہئیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی مالی حیثیت ایسی ہو کہ جس ریاست کا شہری بننا چاہتا ہے اس کے لیے بوجھ ثابت نہ ہو۔ تارکین وطن کا معاملہ حقیقت پسندی کا تقاضا کرتا ہے اس لیے کسی کے پاس کتنی دولت ہو تو بس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر درخواست کنندہ کے حالات ایسے ہیں کہ اس سے جانے نہیں دیا جائے گا تو توقع رکھی جا سکتی ہے تو یہ بڑی اہم بات ہے اور اسے جلدی سے شہری حقوق حاصل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔ اس کے مستقبل کا اس سوال سے بالکل تعلق ہی نہیں سمجھا جاتا۔

کیا دستاویز کی سند سے قومیت بدلی جا سکتی ہے

شہریت کے حقوق حاصل کرنے کا یہ سارا طریقہ کسی ہوٹل کی لابی کا منظر بن جانے سے بالکل زیادہ مختلف نہیں۔ درخواست کنندہ درخواست دیتا ہے، درخواست کی جانچ ہوتی ہے، درخواست منظور ہو جاتی ہے، ایک روز درخواست کنندہ کو وہ دستاویز مل جاتا ہے جس کے ذریعے اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ شہری بن گئے ہیں۔ ایک درخواست کنندہ جو صبح تک روانڈیلا کا ایک باشندہ تھا، روانڈیلا کا ایک ووٹر تھا، اب سے پہلو نظری سمجھی جاتی ہے کہ اس دستاویز کی برکت سے تم ایک "برٹش شہری" میں تبدیل کر دیے گئے ہو۔

سرکار کا محکمہ داخلہ اختیار خصوصی سے یہ شعبدہ ابھی ہو سکتا ہے جو کام خدا سے نہ ہو سکا وہ اب حقوق شہریت کے دفتر کے ایک کلرک صاحب اپنی الگیوں میں قلم پکڑ کر گوگو جھپنے میں پورا کر دیتے ہیں اس آتش قلم کے کہا کہنے جس کے زور سے ایک تاتاری عادہ نکلی جانے میں بی بی کا "برٹش" بن جاتا ہے۔

قوم کے جسم میں زہریلے جراثیم

یہ صرف ہونے شہری جس کل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا خیال نہیں کیا جاتا، بلکہ
ان کی جسمانی صحت کی بھی کوئی تشویش نہیں کی جاتی۔ اگر وہ شدید کام بیمار ہے تو کوئی فکر
کی بات نہیں موجود ہر کارکن سے شہری قبول کرنے پر آمادہ ہے صرف شرط یہ ہے کہ وہ
مالی طور پر بوجھ ثابت نہ ہو اور سیاسی طور پر خطرناک نہ ہو۔

یوں سالہا سال "سرکار مریکا" ہماری قوم کے جسم میں زہر کے کیڑے داخل کرتی
رہتی ہے۔

شہری اور غیر شہری کے حقوق میں ایک اور فرق یہ ہے کہ "غیر شہری" کو سرکار کے
تمام عہدوں پر تقرر کا اہل ہونے کی اجازت ہے چونکہ اس سرکا امکان ہے کہ اسے غیر شہری
خدمات جبراً بجالانی پڑیں اس لیے اسے عام انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت ہے یہ تو
سکے سوئے ہوئے حقوق ہوئے جہاں تک ذاتی حقوق کا تعلق ہے غیر
شہریوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو کہ شہریوں کو، بلکہ بعض معاملات میں تو غیر
شہریوں کی حمایت بھی ہے یہ ہے ہماری موجودہ جمہوری سرکار کا حال۔

میں خوب جانتا ہوں کہ میں وہ باتیں سنا رہا ہوں جنہیں کسی کان سننے کو نہیں چاہتا
بہرحال ہماری سرکار کی شہریت کے حقوق حاصل کرنے سے زیادہ اہم اور بھولا ہوا
فائدہ شاید دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

قومیت کی بنیاد نسل ہے

آج کل صرف ایک سرکار ایسی ہے جو کم از کم تھوڑی بہت کوشش کرتی ہے کہ اس
مسئلہ میں کسی حد کا خیال رکھنا چاہیے ہماری جمہوری سرکار کو تو یہ توفیق نہیں ہوئی
لیکن امریکہ کی حکومت نے چند معقول شرطیں بھی عائد کر رکھی ہیں مثال کے طور پر کسی
ایسے شخص کو شہریت کے حقوق عطا نہیں کیے جاتے جس کی صحت خراب ہو۔ اس طرح
بعض خاص قسموں کے افراد کو شہریت کے حقوق حاصل کرنے کی ممانعت ہے ان
قدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی سرکار کس رستہ پر چل رہی ہے جس پر ہم قومی

سرکار کو پورا کرنا چاہیے ہیں۔

قومی سرکار اپنی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کرے گی سرکار کے شہری سرکار کی رعایا، اور غیر شہری۔

اصول یہ ہونا چاہیے کہ کسی سرکار کے علاقے میں پیدائش سے محض اس سرکار کی رعایا کے حقوق حاصل ہوں رعایا کو سرکار کے کسی عہدے پر فائز ہونے یا فوجی یا سول زندگی میں حصہ لینے یا کسی الیکشن میں کھڑے یا پیچھے ووٹ دینے کی اجازت نہ ہوگی اور اصول یہ ہے کہ سرکار کی رعایا کے ہر فرد کی قومیت اور نسل کا تعین ہونا چاہیے۔ رعایا کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس سرکار کی رعیت میں شمولیت کو ترک کرتے ہوئے اس سرکار کی قومیت سے دست بردار ہو جائے۔ اس کا شہری بن جانے ایک شہری اور رعیت کے ہر فرد میں صرف اتنا فرق باقی رہ جائے گا کہ غیر شہری کسی اور سرکار کا شہری ہوتا ہے۔

شہریت کے حقوق عطا کرنے سے پہلے اس کے فرائض کی تعلیم بھی ملنی چاہیے

ہر وہ لڑکا یا لڑکی جو ان قومیت سے تعلق رکھتے ہوں اور جن سرکار کی رعیت میں شامل ہوں، اسکول کی تعلیم کی وہ حد پوری کرنے پر مجبور ہوں گے جو ان کے لیے لازمی ہے اس تربیت کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اس نسل کے فرزند ہیں اس سے وہ اپنگی کا احساس ان میں بیدار ہو جائے گا اور اس نسل کے وہ تاثر و جذبات ہیں اس میں شہریت کا شعور ان کو حاصل ہو جائے گا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد انہیں جسمانی ریاضت کے وہ مرحلے بھی طے کرنے ہوں گے جو ان سرکار واضح کرے گی اس کے بعد وہ فوجی تربیت بھی حاصل کریں گے یہ فوجی تربیت معمولی درجہ کی ہوگی۔ جو ہر ان فرد کو ضرور ملی ہو جس تربیت کے بعد وہ جسمانی اور روحانی حالت سے فوجی خدمت بجا لانے کے قابل بن جائیں گے ہر نوجوان جو فوجی تربیت کی مدت پوری کر لے اور اس کی

صحت اور چال چلن کی تصدیق ہو جائے وہ خود بخود شہری ہونے کا مستحق ہو گا۔ خود شہریت کا یہ منصب عطا کرتے وقت بڑی تحقیق کی جائے گی۔ بلکہ ہر ہندوستانی جو بالغ ہو گا شہریت کے حقوق عطا کرنے والی دستاویز کو ہر نوجوان اپنی زندگی کی سب سے بڑی دولت کے طور پر محفوظ رکھے گا۔ اس دستاویز کے ذریعہ سے ایک شہری کے تمام حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی۔ سرکار کو اپنے شہریوں اور رعیت کے درمیان واضح امتیاز قائم کرنا ہو گا۔ شہری قوم کے رکن ہیں وہ سرکار کے وجود کے قیام اور اس کی عظمت کے تحفظ کی ضمانت ہیں برعکس اس کے سرکاری رعیت فقط ملک میں مقیم ہے اور اپنی روزی یہاں کما رہی ہے۔

شہریت رشتہ اخوت کی علامت ہے

شہریت کے حقوق کی سند عطا کرتے وقت ہر شخص کو قوم اور سرکار سے وفاداری کا حلف قرار صحیح حلف اٹھانا ہو گا۔ یہ سند اس رشتہ اخوت کی علامت ہو گی جس سے ایک قوم کے تمام طبقات ہر گروہ باہم برادری کی لڑی میں پروئے جائیں گے۔ جن سرکاری رعیت ہونا ایک جز وقتی کے زمانہ کی خیر سرکار کا وفادار ہونے کے مقابلہ میں بڑی عزت ہو گی۔

شہریوں کو وہ مراعات حاصل ہوں گی جو غیر شہریوں کو حاصل نہ ہوں گی جز سرکار کا ہر شہری اس سرکار کے علاقہ میں حمایت کے رہنے کا حق ہو گا۔ اس حق کے عوض میں بلا خوف و دریغ بھی ہوں گی جو لوگ دانستہ و نادانستہ کے اعمال یا جنگی کردار سے عاری کابت ہوں یا مجرم ہوں یا باغی کے غدار ثابت ہوں وہ ہر وقت سرکاری شہریت کے حقوق سے محروم کیے جائیں گے جب کسی شہری کو حقوق شہریت سے عاری کر دیا جائے تو وہ رعیت میں شامل سمجھا جائے گا۔

ہر جز ہندوستان کی پیدائش کے بعد فطرتاً سرکار کی رعایا میں شامل ہو گی یوں شادی کے بعد وہ جز شہری کا درجہ حاصل کرنے کی کوئی عورت جو آزادانہ طور پر اپنی روزی کما رہی ہو باقی ہے اگر وہ جز رعیت میں شامل ہے تو اسے فوراً شادی کے بعد جز شہریت طلب کرنے کا مختار ہو گا۔

باب چہارم :: فرد کی شخصیت پر "قومی سرکار" کا عقیدہ کیا اثر پیدا کرتا ہے

سب انسان برابر نہیں

آرقوم پرست شتزار کی قومی سرکار کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور ان کی حفاظت کا انتظام کرے جن کے ذمہ پر سرکار کا کام ہے نہ صرف یہ کافی نہیں کہ جس نسل سے سرکار کے شہری تعلق رکھتے ہیں اس نسل کے افراد کی پرورش کی جائے، انہیں تعلیم دی جائے اور عملی زندگی کے لیے تیار کیا جائے بلکہ خود سرکار کو اپنی تنظیم اس طرح بدلنی ہوگی کہ وہ یہ سب کام اچھی طرح انجام دے سکے اور ان کے راستے میں رکاوٹیں نہ آئے۔

کسی شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی نسل سے لگایا جائے اور اسکے ساتھ مارکسی رحم کے اس اصول کی خلاف ورزی کی جائے کہ سب انسان برابر ہیں تو بالکل اتفاقیہ حرکت ہوگی۔ اگر ان کے ساتھ ہم ظالم یا مجرم نہ ہوں گے تو ہم خود اپنے اصولوں کو ان کے منطقی نتائج تک پہنچا کر ہی دم لیں گے اگر ہم قوم اور نسل کی بہت تسلیم کرتے ہیں اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ زندگی کا مقصد ہی ایک اصول ہے تو پھر ہمیں اقرار ہی بھی اس اصول کے نتائج کا اطلاق کرنا ہوگا۔ اگر میں قوموں کے مابین نسل کی بنا پر امتیاز کرتا ہوں تو اس کا مجھے اقرار کرنے میں بھی ان کے حسب نسب کی بنا پر امتیاز کرنا ہوگا۔ جب یہ اصول تسلیم کر لیا کہ قومیں برابر نہیں تو قوم کے اندر افراد کیسے برابر ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر کسی ایک شخص کا دماغ کسی دوسرے شخص کے دماغ کے برابر نہیں ہوتا اگرچہ دونوں کا دماغ ایک ہی نسل خون سے بنا ہو پھر بھی خصوصیات میں فرق ہو سکتا ہے اگرچہ اصول دونوں پر ہیں لیکن عملاً ضرور ان میں فرق ہوگا۔

شریعتوں کو روبعمل لانے کی کوشش کی جائے۔

اس حقیقت کا پہلا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک امت کے اندر اس عنصر کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جس کا سب سے زیادہ داعی ہے خاص طور پر انہیں اپنی نسل بڑھانے کی ترغیب دینی چاہیے۔

سمجھنا یہ کام آسان ہے کیونکہ اس کام کو کرنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہر قسم کی دقیانوسی سے خالی ہے اس کے مقابلہ میں ساری قوم میں سے ان لوگوں کو چننا جن کی دماغی استعداد اور روحانی کردار بہتر ہیں اور پھر انہیں سرکار کے حکمران میں سے حصہ دے کر وہ اختیارات پیدا کرنا جو نہ صرف ان کی اہلیت کے مطابق ہو، بلکہ قوم کے لیے بھی مفید ثابت ہوں، زیادہ مشکل ہے استعداد اور کارکردگی دونوں کو محفوظ رکھتے ہوئے انتخاب کرنا خاصہ دقیق کام ہے یہ ایک ایسا کام ہے جو زندگی کی جدوجہد کو نظر رکھ کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

جو ضابطہ حیات جمہوریت کے اس اصول کا انکار کرتا ہے کہ اکثریت رائے کا حق تسلیم کیا جائے اور دنیا میں بہترین طرز عمل رکھنے والے افراد کو حکومت کے اختیارات پیدا کرنا چاہتا ہے، ایسے ضابطہ حیات کے لیے لازمی ہے کہ وہ خود امت کے اندر بھی افراد پر مشتمل مراتب کے اصولوں کا اطلاق کرے۔ ایسے ضابطہ حیات کا ادارہ بنانا ہوگا کہ فوقیت اور ریاست کے مناصب بہترین افراد کے پیدا کیے جائیں یہ اصول اکثریت رائے پر مبنی نہیں، بلکہ لیاقت کے معیار پر مبنی ہے۔

حکومت صرف اصلاح احوال کی ذمہ دار نہیں اسے اصلاح اشخاص بھی کرنی ہے

جو شخص کہتا ہے کہ قوم پر مسلط اشتراکی سرکار کی دوسری سرکاروں سے کس بنا پر اختیار ہے کہ قومی سرکار کی فوقیت تسلیم کرے وہ ہماری تحریک سے مکمل لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ جب ہم ضابطہ حیات کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد کیا ہوتی

ہے دیت تکمیل میں فرق کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قومی سرکار کی اقتصادی کوشش دوسری سرکاروں سے مختلف ہو بھی یہاں مطلبی اور ہوا ت معدنی میں بہتر توازن ہو یا یہ کہ اقتصادی پالیسی مرتب کرنے میں ہمت الناس کو زیادہ دخل ہو یا یہ کہ ترقوں کا معیار زیادہ منصفانہ ہو یا یہ کہ گنجائشوں میں زیادہ تبدیلی نہ ہو یہ سب صورتیں قومی سرکار کا دوسری سرکاروں سے قطعی طور پر یہاں نہیں کرتیں ہو یہ کہ کہ دیا۔ اصلاحات سے ہماری قوم کی بقا کا یقینی تحفظ نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً ان تجربوں سے قومی حکومت کی طاقت حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جو قوم صرف خارجی اصلاحات سے مطمئن ہو جائے اسے دنیا کی مختلف اقوام کے مابین زندہ رہنے کی کشمکش میں ہرگز کامیابی نہ ہو گی جو تحریک اپنا نصب العین ان معمولی مصلحتوں تک محدود کر دے گی وہ کبھی رائج الوقت حالات میں دور رس اور گہری تبدیلیاں پیدا نہ کر سکے گی یہ درست ہے کہ یہ مصلحت کوشیاں صحیح بھی ہیں اور منصفانہ بھی لیکن ان کا اطلاق صرف خارجی عوامل تک محدود ہے جو قوم کو وہ اندرونی قوت نہیں بخش سکتیں جس کے بغیر قوم کو اس کی موجودہ مکروہیوں سے نجات دلانا ناممکن ہے۔

اس رجحان کی مزید وضاحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک دفعہ پھر ہی نوع انسان کے تمدنی ارتقا کی اصل بنیاد پر نظر کا کوچ لگایا جائے۔

تمام اختراعات کا سہرا کسی ایک شخص کے سر ہوتا ہے

ہی نوع انسان کو پہلی بار جس شخص نے حیوانات کی دنیا سے جدا کر دیا اور جس طرح انسان نے پہلی ایجاد کی ان دونوں کا سبب ایک ہی تھا۔ ایجاد تو یوں ہوئی کہ جب انسان کو دوسری مخلوقات کے ساتھ زندہ رہنے کی کشمکش میں پہل کرنے کے لیے مختلف پیشے اور ترکیبیں اختیار کرنا پڑیں تو اس نے وہی راستہ اختیار کیا جو اس جدوجہد میں کامیابی کا واحد راستہ تھا۔ انسان نے اس طرح پہلے پہل جو اصولی ایجادات کیں وہ کسی ایک فرد کی اختراع نہ تھیں ہم ان ایجادات کے موجدین کی شناخت بھی نہ کر سکیں

کر سکے۔ جب وہ اظہاری صلاحیت نہ کر سکے تو مجبوراً انہوں نے اپنا کام
اپنی کوشش کے سپرد کر دیا۔ یہ مختلف جب جانوروں کی دیواروں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس
کی بنا پر ہیں اور کچھ کامیاب جیسے انہیں تمام جانوروں کے مابین مشترک دکھائی دیتے
ہیں اس مبہم سے انسان ان چاہوں اور رجحانوں کی اصلی مبہم نہ دریافت کر سکتا ہے نہ بیان کر
سکتا ہے اس وہ یہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ انتہائی قبلی رجحان کا کارنامہ ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے "قبلی رجحان کے کارنامے" کوئی معنی نہیں رکھتے ہر وہ
شخص جو جانداروں کے اعلیٰ ارتقا کے نظریہ پر عقیدہ رکھتا ہے یہ تسلیم کرتا ہے کہ زندہ
رہنے کی خواہش کا بڑھنا، اور زندگی کی بڑی شکل کی تخلیق اور اس میں ضرور کسی ایک
تاریخ سے شروع ہوئی ہوگی اس اظہار کی صورت کا نمونہ پہلے ابتدائی کوئی ایک فرد
ہوگا پھر اس نمونہ کی نقل بار بار ہوئی حتیٰ کہ اس نقل کی عادت وسیع رقبے پر پھیل گئی۔ پھر
اس نقل کی عادت ہر انسان کے لاشعوری رجحانات میں داخل ہوگی اس لاشعوری رجحان کو
ہے "قبلی رجحان" کہا جاتا ہے۔

ہر منزل کا پتہ کوئی راہنما بتاتا ہے

انسان کے بارے میں یہ تو ہم سمجھتے اور اس پر یقین کرتے ہیں کہ وہ انسان ہے دوسرے
جانداروں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں انسان نے جو کاریگری اور ہوشیاری دکھائی اس کا
پہلا مظاہرہ یہ تھا کہ اس نے ان جانوروں میں خاص استعداد دیکھی انہیں سدھا کر ان
سے کام لینا شروع کر دیا۔

اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ اس ابتدائی دور میں انسان نے جو طریقے اور جو
کارنامے انجام دیے ان سب کا سہرا اجداد کے سر ہے بعد میں تو تمام نوع انسانی ان
فیصلوں اور کارناموں کی پیروی کرنے لگی اس کارروائی کی ایک اور مثال ہے بیابانی
مکڑی کے جالوں کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے جو ہے جنگلی جانوروں کی بنیادی بچے ہیں
بعد میں کسی ایک انسان نے یہ اصول وضع کیے ہیں پھر کئی سال گزرنے کے بعد بھی کہیں

ہے ہزار ہا سال گزرنے کے بعد یہ اصول ہر جگہ اختیار کر لئے گئے جن کی رو سے انسان ان اصولوں کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔

تمام ایجادات کی بنیاد ایک دوسرے انسان کی فضیلت ہے

انسان نے پہلی پہلی چیزوں کی تکمیل کرتے کرتے ایک دوسری اختراع کر ڈالی جس انسان نے مورکی کرتب دیکھے وہاں اس نے یہ بھی دریافت کر لیا کہ دیگر جانداروں کو کس طرح سدھا کر اپنی زندگی اور موت کی جنگ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یوں ہی نوع انسان کی ایجادات کا وہ عہد شروع ہوتے ہیں ہم خود دیکھ رہے ہیں انسان نے جو مادی ایجادات کیں ان کی بنا دو پتھر کے ٹکڑوں سے ہوئی، پھر اس نے پالتو جانوروں کو سدھایا، اس کے بعد مصنوعی طور پر آگ جلانے کے طریقے اختراع ہوئے، حتیٰ کہ ہمارے زمانہ کی تین بڑی ایجادات اختراع ہوئیں۔ ان سب مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایجادات کا معمار ہمیشہ کسی ایک فرد سے ہوا۔ جوں جوں ہی ہم عہد حاضر کے قریب آتے جائیں توں توں ایجادات کی پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ اور ان کے نشوونما زیادہ انقلاب انگیز ہو جاتے ہیں ہم پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ایجادی اتحاد، فرد کی بجائے جماعت کی وساطت سے ہوئی ہم اپنے گرد و پیش جو مادی اختراعات دیکھتے ہیں یہ سب افراد کی مستعد اور قوت اختراع کا پھل ہیں۔ تمام ایجادات و اختراعات کی مدد سے انسان دوسرے حیوانات کے مقابلے میں بلند تر مقامات طے کرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے آپ کو حیوانات کی دنیا سے بالکل علیحدہ کر لیا۔ اس پر کہا جا سکتا ہے کہ ایجادات کی نوع انسان کی ترقی اور سربلندی کا ذریعہ ہیں ایک وحشیانہ صنعت کے نمونے سے آج سے ہزارہا سال پہلے انسان کو زمانہ برفانی میں جو مدد دی تھی، اور اس طرح اس اصولی ایجاد کے سہارے وہ زمانہ قبل از تاریخ کے دشمنوں میں شمار کرتا رہا تھا غور سے دیکھا جائے تو موجودہ سائنس کی حیرت انگیز اختراعات اصولاً بالکل اسی طرح انسان کو زندہ رہنے اور اپنی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مدد دیتی ہے اگر ایجادات پر نظر ڈالی جائے تو

انسان کے تمام قوائے فکر و ریجوات کا مقصود اس کرہ ارض پر کامیابی سے زندہ رہنا ہے
ممکن ہے کسی بیجو دیا کسی گیرے علمی نظریے کے عملی نتائج شروع شروع میں واضح نہ ہوں
لیکن آخر کار ہر بیجو دیا نظریہ کا مقصد دنیاوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ ان
تمام تر بیجوں کا حاصل یہی ہے کہ انسان کے روگرد جو مخلوق ہے اس کے مابین خود
انسان بلند سے بلند تر مقام حاصل کرتا ہے یہ بلند مقام حاصل کرنے سے انسانی منصب
کو تقویت ہوتی ہے انسان زمین کا حاکم ہے بلند سے بلند تر مقام حاصل کرنا انسان کو ہر
پہلو سے ترقی یافتہ بناتا ہے۔

انسان کی ترقی انسانیت کی مخلصوں کے طفیل ہے

غرض تمام بیجوات فکر کی قوت تخلیق کی مرہون منت ہیں۔ ایسے تمام افراد کی نوع
انسان کے گن ہیں چھوٹے تھے یا بڑے، اور چاہے بیجوات اختراع کے وقت
ان کی نیت کچھ بھی کیوں نہ تھی۔ ان کی کارگزاری کے طفیل لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی
زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل میسر آئے۔

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمارے گرد و پیش آج تہذیب وقتوں کے جو سونے
نظر آتے ہیں ان کا سرچشمہ ہمیشہ فکر کے سر رہا ہے ہر فکر دوسرے فکر کے کام کی توسیع
پوری کرتا ہے اور بعد میں آنے والے افراد اپنے کام کی بنیاد اپنے پیشروؤں کی کار
گزاری پر رکھتے ہیں ان بیجوات و اختراعات سے کام لینے میں بھی یہی اصول کارفرما
نظر آتا ہے آج ماں اور سامان پیدا کرنے کے جو طریقے رائج ہیں دراصل وہ بھی ایک
بیجو کی حیثیت رکھتے ہیں یہ بیجو بھی فکر کی قوت تخلیق کی مرہون منت ہے حتیٰ کہ نظری
علوم میں جو کارنامے انجام دیے جاتے ہیں اگرچہ انہیں مادی پیمانوں سے ناپا نہیں جا
سکتا لیکن درحقیقت عملی علم مندی کے تمام کارنامے انہیں نظری علوم پر مبنی ہوتے ہیں یہ
نظری علوم بھی انفرادی ذہنوں کی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں عوام کا ہجوم کبھی کوئی بیجو نہیں
کرتا کلیت کبھی تجسیم یا فکر کی متعدد نہیں رکھتی ہمیشہ ہر ایک مثال میں کوئی ایک

انسان کوئی ایک شخص اختراع کرتا ہے یا تنظیم کی خدمت انجام دیتا ہے۔

ہر ایجاد اپنے موجد کا عکس ہوتی ہے

غرض انسانی معاشرہ صرف اسی صورت میں ایک طور پر منظم سمجھا جا سکتا ہے جب اس کے افراد کی تخلیقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کے مواقع میسر آئیں اور مختلف خواص کی کارگزاریوں سے معاشرہ کو فائدہ پہنچانے کا انتظام ہو۔ کسی ایجاد کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو موجد کی شخصیت ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایجاد مادی خلق سے تعلق رکھتی ہے یا اصول نظریات سے۔ ہر با فائدہ معاشرہ کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ایجاد کرنے والوں کو ایسے منصب پر کار کر دیا جائے جہاں وہ سب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں درحقیقت معاشرہ کا قیام ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجاد کا فائدہ دوسروں کو پہنچانے کا موقع ملے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر عمل سے معاشرہ کو ایک بے جان تنظیم بننے سے روکا جا سکتا ہے اور ایک زندہ حقیقت بنایا جا سکتا ہے معاشرہ کے اندر صاحب دماغ افراد کو عوام سے بالاتر مقام بخشنے اور عوام کو خواص کی قبیل بنانے کا سبق دینے کی کوشش فطرت کے اصول پر منظم ہونی چاہیے۔

رہبر و عوام کا نسخہ غالب عوام نہیں بلکہ غالب خواص ہے

لہٰذا کسی معاشرتی تنظیم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ صاحب دماغ افراد کو عوام سے بلند تر سطح سے ہٹا رکھے۔ برعکس اس کے کہ ہر معاشرتی تنظیم کا فرض ہے کہ وہ اپنی تنظیمی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے صاحب دماغ افراد کو عوام کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بلند کرے معاشرتی تنظیم کا کام اس اصول پر شروع ہونا چاہیے کہ بنی نوع انسان کو آج تک کوئی سوغات عوام کے ذریعہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر صورت میں فرد کی تخلیقی قوتوں سے حاصل ہوئی رہی ہے لہٰذا افراد ہی بنی نوع انسان کے اصلی محسن ہیں سب کا بھلا اسی میں ہے کہ تخلیقی دماغ رکھنے والے افراد کو جب موقع ملا کریں کا کام انجام

دینے میں مدد دی جائے۔ سیاسی عوام ہر گز نخبہ عوام سے حاصل نہیں ہو سکتی عوام سے ہونے
کی استعداد رکھتے ہیں یہ محض کی عوام میں غیر معمولی قوتوں کا تو تصور بھی نہیں کیا جا
سکتا مگر ان میں صرف وہ اشخاص بنے چاہئیں جن میں قیادت کا بھی جوہر ہو۔ استعداد پائی
جاتی ہے۔

جوہر لے گا مرتبہ اس کا بڑھایا جائے گا

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قیادت کے اہل صاحب دماغ افراد صرف زندگی کے
سخت امتحان میں کامیابی کے ذریعہ ہی منتخب کیے جا سکتے ہیں۔ زندگی کی جدوجہد میں کئی
لوگ ناکام رہ کر تباہ ہو جاتے ہیں جو ناکام رہ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی تباہی کا بات
کرنی ہے کہ اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچنا ان کی قسمت میں نہ تھا۔ صرف چند لوگ
ایسے بچتے ہیں جنہیں قدرت کے چنے ہوئے افراد میں شامل سمجھنا چاہیے اسی طرح فکر
فکر ہوں ایجاد کی تخلیق اور اقتصادی میدان میں بھی انتخاب کی کارروائی جاری رہتی ہے
یہاں فکر فکر ہوں ایجاد کی تخلیق اور خاص طور پر اقتصادی میدان میں قدرت کی جانب
سے انتخاب کی یہ کارروائی وقفہ وقفہ سے جاری نہیں رہتی۔ یہاں انسان بھی مداخلت
کرتے رہتے ہیں۔ قدرت کی جانب سے امتحان اور مصائب کے ذریعہ انتخاب کا یہ
عمل سرکار کے محکمہ ترقی میں بھی جاری رہتا ہے۔ سرکار کے محکمہ فوج کا محکمہ قوم کے
مفاد کی خاطر قائم ہوتا ہے۔ یہ محکمہ سرکاری افسر کا ایک شعبہ ہے اس شعبہ میں بھی
قدرت کی جانب سے انتخاب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے شخصیت کا عقیدہ زندگی کے ہر
شعبہ میں ہمیشہ غالب رہتا ہے یہی عقیدہ ہے جس کی وجہ سے افسر اپنے ماتحتوں پر حاکم
ہوتا ہے یہی عقیدہ ہے جس کی وجہ سے ہر شخص اپنے افسر کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

یہ صرف سیاسی زندگی ہے جہاں فطرت کا یہ اصول برقرار نہیں رکھا جاتا۔ تمام انسانی
تمدن محض فرد کی تخلیقی قوتوں کی بدولت تعمیر ہوا ہے یا ہوا جو اس کی قوم کے تحت و تسلط کے

ہی ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہو گیا ہے کہ معاملات کے فیصلے رائے عامہ کے مطابق ہونے چاہئیں رائے عامہ کا مطلب یہ ہے کہ اکثریت رائے کو ترجیح ملنی چاہیے ملک سرکار کے اعلیٰ حلقوں سے اس پر فتور عقیدہ کا زہر قومی زندگی کی جڑوں تک پھیل جاتا ہے اس طرح جو عمل اوپر سے شروع ہوا تھا وہ نیچے تک آ جاتا ہے قوم کے سارے جسم میں تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں جنگ قومی ذہنوں میں یہودیوں کو جو کردار ادا کرنے کا موقع مل رہا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہودی جن قوموں کے ہاں مہمان ٹھہرے تھے وہاں انہوں نے شخصیتوں کا مرتبہ گھٹا کر اکثریت رائے کی پیروی کا عقیدہ رائج کر دیا ہے۔ یوں سمجھ لیا کہ غیبی عقیدہ کی جگہ نئی سر کیل کے کلچر عقیدہ نے لے لی ہے یہودی دنیا کی قوموں اور انسانوں کے مابین کلچر کے کنوئیں ہیں جہاں وہ پہنچ جاتے ہیں انسانی تمدن تباہ ہو جاتا ہے۔

اکثریت کی حکومت سے فتور پیدا ہوتا ہے

مارکس ازم یہودیوں کی جانب سے شخصیت کے عقیدہ زندگی کو ہر شعبہ سے مٹا کر اس کی جگہ عددی اکثریت کا تصور رائج کر دینے کی کوششوں کا عملی مرحلہ ہے یہ بات میں پارلیمنٹری نظام حکومت اسی کوشش کا نتیجہ ہے ہمارے ملکوں کے جاہل اور ان پڑھ لوگ چاروں جانب دیکھ سکتے ہیں دیہات اور محلوں کی پنچایتوں سے لے کر قومی حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں تک اس اکثریت رائے کے عقیدہ نے فتور ہی رکھا ہے اقتصادیات کے میدان میں دیکھئے تو کمیونزم کی تحریک نے خلل ہی رکھا ہے زیادہ تر کمیونزم کی تحریک مزدوروں کے حقیقی مفاد کا تحفظ نہیں کرتی بلکہ تحریک تو یہودیوں کی عالمی اشتراکی تحریک کے مقاصد پورے کرتی ہے جوں جوں قوم کی اقتصادی زندگی سے شخصیت کا عقیدہ خارج ہوتا ہے توں توں رائے عامہ کا سوچ اور سرگرمیوں پر حاوی ہوتی ہیں اور جوں جوں رائے عامہ کا سوچ اور سرگرمیوں پر حاوی ہوتی ہیں توں توں قوم کا اقتصادی نظام قوم کی اخلاقی عادات و اطوار اور علامت میں ناکامیابت ہوتا ہے اکثریت کی اقتصادی نظام

کی تکنیکی استعداد بھی ختم ہو رہی ہے دکانداروں کی وہ کمیٹیاں جو ملازمین کے معاوضے طے کرنے کی بجائے کارخانوں میں معلومات کی تیاری کے مسائل میں مداخلت کرتی ہیں ان سے بھی ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کمیٹیوں کے سبب معلومات کی تیاری کے نظام کو ضعف پہنچتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ صنعتی کاروبار میں مصروف ہیں انہیں نقصان پہنچتا ہے اگر تجربہ پر نظر ڈالی جائے تو عوامی مطالبات خالی خولی آہنگ نظریاتی نعرے بلند کرنے سے پورے نہیں ہو سکتے عوامی مطالبات پورے کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں عوام کو وہ سامان بہم پہنچایا جائے جس سے ان کی ضروریات پوری ہوں جس وقت عوام کی ضروریات پوری ہو جائیں تو ان میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ امت کے افراد کے باہمی تعاون سے ہر فرد کی ضروریات پوری ہو سکتی ہے افراد کی ضروریات پورا کرنے کا سامان امت کے ہر طبقہ کے باہمی تعاون سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

نظام عالم "قبلی عصبیت" اور "شخصی فضیلت" کے اصولوں پر قائم ہے

مارکس ازم اگر موجودہ اقتصادی نظام پر قابض ہو کر اس نظام کو "رائے عامہ" کے اصول پر چلانے میں کامیاب ہو جائے تو اس سے یہ اصول چلانا ہو جائے گا مارکس ازم کا عقیدہ ہے یا تجربہ اس کا فیصلہ اس طرح نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ آج ہمیں حاصل ہے وہ کل مارکس ازم کے ماتحت بھی موجود رہے گا یا نہیں مارکس ازم کے جھوٹے یا سچے ہونے کا فیصلہ تو اس پر منحصر ہے کہ مارکس ازم کے اصولوں پر عمل کر کے انسانی قوموں میں آئندہ بھی ترقی کی وہی رفتار جاری رکھی جا سکتی ہے جتنی کہ آج تک جاری رہی ہے اگر مارکس ازم موجودہ اقتصادی نظام کو مارکس ازم کی راہ پر لے کے ماتحت قائم رکھنے میں سو فیصدی بھی کامیاب ہو جائے تو تب بھی اس سے کچھ بات نہ بنے گی اصل بات تو یہ ہے کہ مارکس ازم خود اپنے اصولوں کے ماتحت کوئی نئی ترقی کرنے کا اہل نہیں لہٰذا موجودہ تہذیب و تمدن کے مساوی قرار دیا جا سکے۔

عملی ضابطہ حیات، مارکس ازم کے ضابطہ حیات سے یہ بنیادی اختلاف رکھتا ہے کہ عملی ضابطہ حیات نسل کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس لیے وہ شخصیت کی اہمیت بھی تسلیم کرتا ہے لہٰذا انہی دو اصولوں پر عملی ضابطہ حیات کا نظام قائم ہے عملی عقیدہ کے اہم ترین اصول نسل اور شخصیت ہیں۔

زندگی کے ہر شعبہ میں بے مرشدیت ختم کر دی جائے گی

اگر قوم پرست اشتراکی تحریک ان بنیادی اصولوں کی اہمیت کو تسلیم نہ کرے گی اور صرف موجودہ سرکاری ظاہری شکل پر سرخی پاؤڈر مل کر "اسلامی جمہوری" کا اصول تسلیم کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری تحریک مارکس ازم کا بنیادی اصول مان کر اس سے مقابلہ کرنے چلی ہے اس کے بعد قوم پرست اشتراکی تحریک کو ایک جداگانہ ضابطہ حیات کرنے کا ہرگز کوئی حق نہ ہوگا اگر ہماری تحریک کا مقصد یہی ہے کہ شخصیتوں کو مٹا کر ان کی جگہ "بے مرشدیت" مسلط کر دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم پرست اشتراکیت کے نظام میں بھی اسی طرح مارکس ازم کے تمام اصول داخل ہو گئے ہیں جیسے صاف چھپتے قوم پرست ہاریوں کو یہ مرض لاحق ہو چکا ہے۔

قومی سرکار کا فرض ہے کہ وہ ہر حالت میں شخصی اقتدار کی اہمیت تسلیم کرے اپنے شہریوں کی خوشحالی کی ضمانت مہیا کرے۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ اقتصادی زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ سے زیادہ مال اور سامان پیدا کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام پیداوار میں سے ہر فرد کو زیادہ سے زیادہ حصہ مہیا کیا جائے۔

غرض قومی سرکار کا فرض ہے کہ وہ ملکی حکومت کے ہر شعبہ سے پارلیمنٹری اصولوں کو خارج کرنے کی تدابیر پوری سنجیدگی سے کارروائی کرے پارلیمنٹری اصولوں کے بجائے رائے شماری کا معیار تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ کن اختیار عوام الناس کے ہاتھ میں دیا جائے۔ اس بنیادی اصول کی حد تک ہی ذمہ داری کا انتظام لازم ہے۔

بہترین تعین حکومت اور سرکار کی بہترین صورت وہ ہے جس کے ماتحت اعلیٰ ترین

دماغ منتظر ترین مناصب پر فائز ہو کر قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔

مرشد وہی ہے جس میں مرشد والی خصلتیں ہوں

جس طرح اقتصادی میدان میں ہر معمولی قابلیت کے انسان کوئی حاکم وقت چھوٹے منصب پر فائز نہیں کر سکتی بلکہ ہر معمولی قابلیت رکھنے والے افراد خود اپنی ہی کوششوں سے سامنے آیا کرتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹی سے دکان سے لے کر ایک بڑے کارخانہ تک کو چلانے کی صلاحیت تجربہ سے حاصل ہوتی ہے جس طرح زندگی ایک مکتب ہے جہاں ہمیں سبق پڑھائے جاتے ہیں، اسی طرح سیاست کے میدان میں بھی ایک خاص سیاسی مدرسہ ہیں جن کے جانچنے ہر معمولی قابلیت کے سیاسی مدبر اس معیار پر نہیں پرکھے جا سکتے جس پر عام انسانوں کو پرکھا جاتا ہے۔

سرکار کے ہر محکمہ میں بھی حفظ مراتب کا اصول ہر مرحلہ پر ملحوظ رہتا ہے سرکاری چپڑاسی سے چھوٹی سے چھوٹی مقامی تنظیم سے لے کر حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں تک یہی اصول کارفرما ہوتا ہے۔

کثرت رائے سے بھی کوئی فیصلہ کیا نہیں جا سکتا۔ ہمیشہ وہ فیصلہ کارگر ثابت ہوا کرتا ہے جو لوگ کوئی فیصلہ کریں، وہی اس فیصلہ کے لیے ذمہ دار بھی قرار پائے جائیں جو شخص کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز ہو اس کے مشیران کار بھی مقرر کیے جائیں گے لیکن وہ جو فیصلہ کرے گا اس کی ذمہ داری فقط اس کی ذات پر ہوگی۔

مرشد مشورہ بھی کرتا ہے

جس اصول سے ہر فوج کو ہر قوم کے تحفظ کے لیے ایک عامل تعریف کر دیا گیا ہے ہماری سرکار کی تشکیل بھی اسی اصول پر عمل میں آئے گی وہ اصول یہ ہے کہ ہر حاکم کو اپنے ماتحتوں پر مکمل قابو اور اختیارات حاصل ہوں گے لیکن وہ خود اپنے بالائی قائد کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

ان الفاظ کو آج کل بدقسمتی سے [illegible] جاتا ہے جب بھی قائد ہیں

گی لیکن یہ ادارے صرف مشیر کی حیثیت میں مشورہ دیں گے ذمہ داری کوئی ایک فرد ہی ہو سکتا ہے اس لیے ذمہ داری ہمیشہ فرد کے کندھوں پر ہو گی جب ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ہو گی تو فرد میں اور اختیار بھی منتقل ہوتا چلے گا۔

یہ پارلیمنٹیرین خاص اس لیے ہوں گے کہ آئندہ کے لیے قانون کی تدریج تربیت ہو سکے جب وقت آئے گا ان میں سے مناسب لوگوں کو خصوصی ذمہ داری کے عہدے پر لیا جائے گا۔

اس طرح سرکاری نظم کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ حسب ذیل ہے

محلے، شہر اور ملک سب کسی مرشد کے تحت ہونے چاہئیں

میونسپلٹیوں کے نظام سے لے کر ساری مملکت کی مرکزی حکومت تک ہر قومی سرکار کسی مرحلہ پر عوامی نمائندوں کی ایسی مشاورت نہ ہو گی جو خالص اکثریت رائے سے فیصلہ کرتی ہے بلکہ ہر سطح پر امیر کا انتخاب کر کے اس کی مجلس مشاورت کی حیثیت میں کام کرے گی جب تک امیر ہے یہ مجلس مشاورت محض اس کی مشیر ہے۔ مجلس مشاورت کے ممبر اپنی صرف وہی خدمات انجام دیں گے جو امیر ان کے سپرد کرے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض معاملات میں ان مشیروں کو مکمل ذمہ داری بھی سونپ دی جائے مشاورتی مجلس کے صدر کو بہت سے مقامی اختیارات حاصل ہوں گے۔

مشاورت اہل الرائے سے ہونی چاہیے نہ کہ اکثریوں سے

اصولاً قومی سرکار یہ دستور قطعاً بند کر دے گی کہ ہر ہی اور اقتصادی مسائل پر ان لوگوں سے رائے حاصل کی جائے جو ان مسائل سے بالکل نابلد اور ناواقف ہوتے ہیں نہ انہوں نے کوئی خصوصی تربیت حاصل کی ہوتی ہے نہ ان مسائل کا انہیں ذاتی تجربہ ہوتا ہے سرکار اپنی نمائندہ مجلس کو اس طرح مختلف شاخوں میں تقسیم کرے گی کہ ہر پیشہ اور فن کے ماہرین ایک طرف اپنی جداگانہ شاخ کے رکن ہوں گے اور دوسری طرف انتظامی سیاسی مسائل پر بحیثیت مجموعی رائے دینے کے لیے وہ ایک مرکزی اجلاس میں جمع ہو جایا

کریں گے۔

اس ماتحت شاخوں اور مرکزی اجلاس کے مابین مکمل تعاون قائم کرنے کے لیے ہر دو افراد کا ایک باہمی دست اور رابطہ قائم کیا جائے گا۔ یہ باہمی دست اور رابطہ ماہرین خصوصی کی ذمہ داری ہوگا۔

ماتحت یا مرکزی اجلاس میں کسی دوسرے ملک کی نوعیت سے آنے کی پیش کش کا مسئلہ کے لیے بلائی جاتی ہے۔ کہ وہ ووٹ دینے کے لیے۔ ہر رکن کو مشورہ دینے کے طور پر اپنی رائے کا ووٹ ظاہر کرنے کا اختیار ہوگا لیکن اس رائے یا ووٹ کا آخری فیصلہ کے اختیار سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

اس اصول کا مقصد یہ ہے کہ مکمل اختیارات سونپ کر مکمل طور پر ذمہ داری کا تعین کیا جائے اس اصول کے تحت منتخب لیڈروں کا ایک گروہ قوم کے سامنے آجائے گا اور جو وہ زمانہ میں پارلیمنٹ نے جو طریقہ ذمہ داری کی فضا پیدا کی ہے اس کے قابل نظر اس قسم کی ذمہ دار قیادت کا تصور کہیں بھی عیاں ہو گیا ہے۔

اس طرح قوم کی سیاسی تشکیل انہیں اصولوں کے ماتحت عمل میں آئے گی جن کے ماتحت ہماری قوم اقتصادی اور ثقافتی مملکت حاصل کر چکی ہے۔

دنیا ہمیشہ سے جمہوریت کے ماتحت نہیں بلکہ کسی مرشد کے ماتحت رہی ہے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اصولوں پر عمل کرنا ممکن بھی ہے؟ میں خود اس طور پر اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ دنیا ہمیشہ اس جمہوریت کا راج نہیں رہا جس کے ماتحت اکثریت رائے سے فیصلے کیے جاتے ہیں جمہوریت تو بیسویں عالم کے دوران ہمیشہ عارضی وقفوں کے لیے برسر اقتدار آئی جب جمہوریت برسر اقتدار آئی تو یہ زمانہ ہمیشہ قوموں اور سرکاروں کے زوال کا زمانہ رہا ہے۔

ہاں کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ [illegible] نقطہ نظر سے پسند کیا جا

سکتا ہے یا ایسا انقلاب پہلے حکومت کے دائرہ اختیار میں کام کرے پھر اس کا اثر پہلے تک پہنچایا جا سکتا ہے میں نے جس تبدیلی کا تذکرہ کیا ہے وہ محض سرکار کا آئین حکومت بدلنے تک محدود نہیں اس تبدیلی کا مطلب یہ ہے کہ عوام ساری دنیا کی ہر شعبہ زندگی میں بھی انقلاب پیدا کرنا ہوگا یہ انقلاب صرف ایک ہی تحریک کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے، جو خود اسی اصول پر منظم کی جائے پھر اسی اصول کی بنا پر سے اس میں داخلہ پیدا کیا جائے اسی تحریک کے اندر سے سرکار کام کرنے کا حق موجود ہوگا۔

غرض آج قوم پرست اشتراکی تحریک کا فرض ہے کہ وہ ان اصولوں کو پوری طرح سمجھ لے اور پھر خود اپنی تنظیم کے اندر ان اصولوں پر عمل کرے۔ اس طرح پر تحریک نہ صرف مستقبل میں ہونے والی سرکار کی رہنمائی کی خدمت انجام دے سکے گی، بلکہ خود تحریک کی تنظیم میں یہ جدت پیدا ہو جائے گی کہ وہ بعد میں سرکار کا ہاتھ بٹا سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب پنجم :: ''ضابطہ حیات کی نوعیت اور تحریک کی تنظیم کا باہمی رشتہ''

یہودی کرہ ارض کو اپنی وراثت سمجھتے ہیں

میں نے گزشتہ باب میں ''قومی سرکار'' کا ایک عام خاکہ کھینچا ہے لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ چونکہ ہم نے قومی سرکار کے قیام کی زمینی شرائط شمار کی ہیں لہٰذا محض یہ شرطیں کرنے سے قومی سرکار کے قیام کا راستہ ہموار ہو جائے گا یہ بات بہت لمبا کالی نہیں کہ قومی سرکار کی نوعیت کیا ہوگی قومی سرکار کے قیام کا راستہ کرنا اس سے زیادہ ضروری ہے آج جو سیاسی جماعتیں موجود ہیں وہ جو دوسری سرکار سے تعلق حاصل کر رہی ہیں ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اس نظام میں کوئی تبدیلی پیدا کریں گی یا خود اس نظام کے متعلق اپنی روش بدل دیں گی آج کل زمانہ اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ یہودی تھے، یہودی ہیں اور یہودی رہیں گے اس لیے ان سے اس اقتدار کی جانب سے سرکار میں کسی انقلاب کی امید رکھنا عبث ہے موجودہ زمانہ کے ان ریاضات کا تذکرہ ہم نے سابقہ صفحات میں کیا ہے جن سے ہمیں آج کل سابقہ ہے، اگر ان کے تدارک کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو یہ تقریباً یہودی اقتدار کا خواب پورا ہو جائے گا یہ خواب پورا ہو گیا تو یہودیوں کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگی کہ ایک روز یہودی دوسری سب قوموں پر غالب آ جائیں گے اور اس کرہ زمین کے بلا شرکت وہ مالک ہوں گے۔

یہودی فقط اپنی امت کا خیر خواہ ہے

آج کل جن قوم کے ہزار ہا افراد ہوا تو کھانے پینے وغیرہ کے صنعت میں شامل ہیں اور یا پھر کمال شاہی کے مصنوعی بنائے ہوئے ہیں یہودیوں کی اکثریت غول کر چکے ہیں ان

ہوئی قسام کے ذہن اپنی بڑی، مستقل اور یہودی کے باعث قوم کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں برعکس اس کے یہودی اپنے مستقبل کے انتظامات سے سرگرم ہے وہ اپنی قومی کبھی اپنی منزل مقصود سے نہیں دیتے جس سرعت کی قیادت یہودیوں کے ہاتھ میں ہوگی وہ کبھی یہودیوں کے ملی مقاصد سے سرمو انحراف نہ کرے گی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ یہودیوں کے مقابلہ میں آریا قوموں کے مقابلہ میں شرقی ہمیشہ مغرب کی نظامت ہے۔

اگر ہم قومی سرکار کے متعلق اپنے خواب کو حقیقت کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان حالتوں سے بچ کر رہنا ہوگا جو آج عوامی زندگی پر غالب ہیں ان حالتوں کی جگہ ہمیں ایسی حالتیں خلق کرنا ہوں گی جو ہمارے نصب العین کو قبول کرنے اس کی خاطر جنگ کرنے پر آمادہ ہوں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے نصب العین کے حصول کی خاطر جنگ ہی لڑنی پڑے گی ہمارا اولین مقصد قومی سرکار کے نظریہ کی تبلیغ نہیں، بلکہ ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ آج جو یہودی سرکار قائم ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی نظام قائم رہنا گوارا نہیں ہوتا جب تک کہ نئے نظام کے پیرو اس صاف کر دینے کے لئے متحد ہو کر خود غرضی مل کر نئے نظریہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیتے ہیں یہ متحدہ محاذ ہر وسیلہ سے نئے نظریہ کی کامیابی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے متعصب اور خود غرض لوگ اس لئے نئے نظریہ کے مخالف ہوتے ہیں کہ یہ نظریہ یا انہیں ناپسند ہوتا ہے یا خود ان کے وجود کا دشمن۔

تعمیر سے پہلے تخریب کی ضرورت ہوتی ہے

یہی وجہ ہے کہ ہر نئے عقیدہ کے حامیوں کو جو نئے تعمیری کام کرنے کے متعلق اپنی خواہشیں پوری کرنے کے سب سے پہلے ایک تخریبی جنگ لڑنی پڑتی ہے تاکہ موجودہ صورت حال کا خاتمہ کیا جا سکے۔

کوئی ایسا نظریہ جس کے اصول بالکل نہ ہوتے ہوں، اور جو کوئی وقعت بھی رکھتے ہوں، ہمیشہ اپنی تبلیغ کا آغاز حاکمین پر سخت تنقید سے کرتا ہے یہ تنقید ایک ایسا امر ہے

ہے کہ جو ہے وہ نئے عقیدہ کے حامیوں کو برا معلوم ہو لیکن اس کے استعمال کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔

آج کل جو لوگ مسلمانوں کے عقیدہ کے حامی کہلاتے ہیں، انہیں تاریخی ارتقاء کے اصولوں کا بہت تھوڑا علم ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بار بار زور دیتے ہیں کہ نئی تنقید سے کسی حالت میں کام نہ لیں گے برعکس اس کے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیشہ قہقری کام کریں گے ایسی باتیں فضول ہیں اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں موجودہ زمانہ کے تمام بنیاد پرست ایسی ہی کوس کے حامی ہیں اس سے ان کی حقیقت کھل جاتی ہے ان کی ایسی باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے موجودہ زمانہ کی تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ مارکس ازم کو بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کا مسئلہ درپیش تھا۔ مارکس ازم کی قہقری کام سر انجام دینا چاہتا ہے مگر چونکہ مارکس ازم کے "قہقری کام" کا مطلب صرف یہ ہے کہ بین الاقوامی یہودی سرمایہ داروں کا مفید دیرینہ قائم کر دیا جائے۔ باوجود اس کے ستر سال تک مارکس ازم کی کلاسیکل تنقید پر عمل ہوتا رہا۔ مگر اب یہ تنقید کیسی مہلک ہو چکی ہے ثابت شدہ تنقید کی جاتی رہی بار بار وہی تنقید دوہرائی جاتی رہی حتیٰ کہ اس تنقید کا تیزاب پوری سرکار کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ گیا اور ایک روز اس سرکار کا تمام ڈھانچہ کھوکھلا ہو کر گر گیا اور ریزہ ریزہ ہو گیا جب یہ کام ہو چکا تب مارکس ازم نے اپنا اصل قہقری کام شروع کیا۔

ہر اثبات سے پہلے نفی لازمی ہے

مارکس ازم کا یہ طریقہ عمل نہایت دقیق اور مصلحت کے عین مطابق تھا کوئی رائج وقت نظام کبھی خود اپنی موت کا اعلان نہیں کرتا نئے نظام کے قیام کی خواہش سے نہیں ملتا۔ یہ توقع ہی نہ رکھنی چاہیے کہ جو لوگ موجودہ نظام کے حامی ہیں اور ان کے مفاد اس نظام سے وابستہ ہیں وہ خود نئے نظام کی ضرورت ثابت کر دینے سے اس کے حامی بن جائیں گے برعکس اس کے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متصادم نظام پہلے پہل چلنے لگتے ہیں جو

یا عقیدہ والو، ایک ضابطہ حیات کے مسابقت کے میدان میں مقابلہ کی خاطر نکلا تھا وہ
ہے ایک دوسرے کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہے اس حقیقت سے وہ کسی حد میں بھی صرف نظر نہیں
کر سکتا کہ یہ ایک ضابطہ حیات ہمیشہ برداری کا حامل ہوتا ہے کسی کوئی ضابطہ حیات
اپنے پہلو بہ پہلو دوسرے ضابطہ حیات کی بالادستی کو تسلیم نہیں ہوتا ہر ضابطہ حیات صرف
اپنے قیام سے اپنے ہی ایمان کا مطالبہ کرتا ہے ایک ضابطہ حیات چاہتا ہے کہ قومی زندگی
کا ہر پہلو اس کے اصولوں کے مطابق ڈھل جائے ایک ضابطہ حیات کبھی اپنے آس
پاس سابقہ حالات کے آثار قائم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہی حال مذہب اور ادیان کا ہے۔

عیسائیت نے فقط اس پر اکتفا نہ کی تھی کہ بت پرستوں کے معبدوں کے پہلو بہ پہلو
عیسائیوں کے گرجے بھی کھڑے ہو جائے، نہیں بلکہ عیسائیت نے پہلے کافروں کے
معبد گرانے پر توجہ دی۔ یہ اسی متعصبانہ عدم رواداری کی برکت تھی کہ عیسائیت کا دین
اپنے جائے ولادت کی فضا میں ایک "مسلمہ حقیقت" کی صورت اختیار کر گیا۔ عدم رواداری کا
یوں پہلو بھی "مسلمہ دین" کا تصور پروان نہ چڑھا سکتا تھا۔

تعصب کا مقابلہ عصبیت سے ہی ممکن ہے

شاید یہاں پر اعتراض کیا جائے کہ تاریخ عالم میں اس قسم کے واقعات کی ہمیں
مثالیں پیش نہیں ہیں، درحقیقت وہ ہمیشہ یہودیوں کے مخصوص طرز فکر کا نتیجہ تھیں یہ
تعصب اور عدم رواداری دراصل یہودی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں ممکن ہے یہ اعتراض بہ
ظاہر درست ہو اگر یہ اعتراض درست ہے تو ہمیں اس پر سوائے افسوس کے اور
کچھ نہیں کرنا کیونکہ انسانی نوع انسان کی تاریخ میں تعصب اور عدم رواداری کی مثالیں پیش
کرنا اور افسوس ہی کی بات تو ہے ہاں بشرطیکہ یہ واقعات فطرت انسانی کے خلاف ہیں
لیکن یہاں پہلے سے وہ حقائق نہیں ہوتے جو ہمیں پیش نظر ہیں جو لوگ اس
قوم کو اس کی موجودہ زبوں حالی سے نجات دلانا چاہتے ہیں وہ خالی یہ سوچ کر بیٹھ

پہلے ہی کتنی نہیں کر سکتے کہ یوں نہ ہوتا تو کیا اچھا ہوتا ہمیں تو یہ دریافت کرنا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ موجود ہے اس سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہو گی اس کی ترکیب ہے جب ہمیں ایک فلسفہ حیات سے سامنا ہے جس کی پشت پر ہمیشگی قصب کا جذبہ کام کر رہا ہے تو ایسے عقیدہ کا مقابلہ کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم بھی ایسے ہی شدید جذبہ سے تڑپ کر اس کے سامنے ڈٹ جائیں ہم بھی دیوانہ وار اور کر لیں ہمارا یہ عقیدہ ایک یا عقیدہ ہو گا یہ ایک ہو کر عقیدہ ہو گا صرف یہی عقیدہ اچھا ہو گا۔

ایٹم کا جواب پتھر ہی دے سکتا ہے

ممکن ہے آج ہم سب اس پر انکسار فلسفی کے لیے آمادہ ہو جائیں کہ عیسائیت کی ترویج کا "مار پہاڑ" موقعہ غائب ہو چکا اور جبر کی بنا ڈالی گئی۔ ورنہ اس سے پہلے پرانی دنیا میں تو تبلیغ کی خاصی آزادی ہوا کرتی تھی لیکن ہمارے اس انکسار فلسفی سے یہ حقیقت نہیں ہو سکی جاتی کہ دور آج کا ہو یا کل کا جواب جبر کا جواب صرف تشدد ہے جبر کا جواب صرف تشدد ہے ایٹم کا جواب پتھر ہے سو لے اس کے کہ اسلام کے قیام کے لیے تبلیغی کوشش شروع کرنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں سیاسی جماعتیں ہمیشہ مصالحت اور سودے بازی پر آمادہ رہتی ہیں لیکن ایک ضابطہ حیات کبھی مصالحت نہیں کرتا سیاسی جماعتیں اپنے مخالفین کو راضی کرنے کی خاطر اپنی تعلیمات میں ترمیمیں کرتی رہتی ہیں لیکن ایک ضابطہ حیات کہتا ہے میں بھی کھلا ہوں اور میرے سوا سب کھلا ہیں۔

دشمن سے نفرت کرنی چاہیے

شروع شروع میں تو سیاسی جماعتیں بھی ہمیشہ یہی مسلک لے کر میدان میں نکلتی ہیں کہ صرف خود سر حکمران کی ہوا پلٹ دیں گی۔ سیاسی جماعتیں ہمیشہ ایک ضابطہ حیات ہونے کا تصور اہمیت میں رکھتی ہیں لیکن ان سیاسی جماعتوں کے پروگرام ایسے محدود ہوتے ہیں کہ ان کے اندر وہ اجتماعی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کے بغیر کسی ضابطہ حیات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا سیاسی جماعتوں میں مصالحت اور سودا بازی کا

جو جذبہ پایا جاتا ہے اس کے باعث ان جماعتوں میں صرف وہی لوگ رہ سکتے ہیں جو ہر قسم کے
جھگڑے کا سا حوصلہ رکھنے والے لوگ شامل ہوتے ہیں، جو کسی ماریں کی پروا
نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ان میں سے کوئی شخص ایک بار اس بھی دور
نہیں نکالا ہوتا کہ ان کے بیٹے مرنے مارنے پر دل آمادہ ہوتے ہیں وہ کسی مقصد کی خاطر
جنگ کرنے کے قابل ہوتے ہیں وہ بہت جلد ہر قسم کے حالات کے ساتھ میں کوئی معقول
سمجھوتہ حاصل کرنے کے شوق میں ایسا وجود اختیار کر لیتے ہیں جس کا نام ان لوگوں نے
"مفاہمت خواہ" رکھ چھوڑا ہے جب انہیں موجودہ نظام کے ماتحت کوئی ایسی معقول جگہ مل
جاتی ہے تو پھر جب تک ان کا بس چلے یہ وہیں چپکے رہتے ہیں جس دن ان کی ہمتوں اور
کوششوں کا یہ ثمر ختم ہو جاتا ہے پھر اگر ان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ اکھڑ اور روکھی
مزاج حریف انہیں ان کے کھائے سے نکال باہر کرے تو پھر یہ خوشامد اور نیاز دے کر
دوبارہ کسی نہ کسی طرح وہیں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اس وضع کے قماش کے لوگوں کی
ایک اچھی خاصی فوج ہوتی ہے جس میں سے ہر ایک کو دوسرے دھکے دینے کی دھن
ہوتی ہے ان میں سے ہر ایک پہلی قطار میں کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے اس
محبوب زمرے میں داخل ہونے کے اشتیاق میں اپنے مقدس ترین اعتقادات بھی ترک
کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں بس یہ شرط ہے کہ ان کی پوچی ہری رکھنے کو جو روٹی ہے۔
یہ لوگ سیاست کے میدان میں لیڈر نہیں گیدڑ کہلانے کے مستحق ہیں۔

لڑائی میں ہر وہ ہتھیار جو کارگر ہو

برعکس اس کے ایک ضابطہ حیات کبھی اپنی جگہ کسی دوسرے نظام کے ساتھ وابستگی پر
آمادہ نہیں ہوتا ایک ضابطہ حیات کبھی ایسے نظام کے ساتھ تعاون نہیں کرتا جس کی وہ
مذمت کر چکا ہو۔ ایک ضابطہ حیات موجودہ نظام کے خلاف ہر ہتھیار سے جنگ جاری
رکھتا ہے وہ موجودہ نظام کے تصورات کی تمام بنیادوں پر حملہ آور رہتا ہے ایک ضابطہ
حیات اپنے سوا تمام نظریات کو تباہ کر کے دنیا کے لیے امن سے نہیں بیٹھ سکتا۔

غرض ایک ضابطہ حیات کو برسر اقتدار لانے کی جنگ میں کبھی کبھی ہتھیار کرنے پڑتے ہیں ان کی فوجوں سے دشمن کو جو ضرر لاحق ہوتا ہے دشمن بھی اس سے غافل نہیں رہتا اس لیے دشمن ان کے مقابلہ کی خاطر ایک متحدہ محاذ قائم کر کے ان کی فوجوں کی مدافعت کرتا ہے کبھی ایک ضابطہ حیات کو برسر اقتدار لانے کے لیے شدت کے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں تاکہ مخالفین کو کامیاب ہونے کے لیے ان شدت کی راہوں کا بند کرنا ضروری ہے بہرحال کسی شدت اور جنگی فن کو استعمال کرنے کے لیے بھی عوام کے دماغوں کے ایک حلقہ کی حمایت ہو گی ہے۔

الیکشن کی ہنڈکھیا میں ووٹروں کا پکوان

ایک ہی فلسفہ حیات صرف اسی صورت میں اپنے نظریات کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے جب اس دور کے دلیر ترین اور مستعد ترین عناصر اس کی پشت پناہی پر آمادہ ہو جائیں اس کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ جس قوم میں یہ فلسفہ حیات رائج کرنا ہے اس کے بہترین افراد اس نئے فلسفہ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں پھر اس نئی تحریک کے پیرو ایک مضبوط عسکری نظام میں منظم کر دیے جائیں یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے مقابلات کی طویل فہرست میں سے وہ مقابلات چننے ہوں گے جو ملک کو درپیش مسائل اور افراد کے لیے کشش رکھتے ہوں ان نظریات کو واضح اور موثر انداز میں بیان کرنا ہو گا نئی تحریک کے پیروؤں کے لیے یہ بھی بنیادی اصول شرط ہے کہ ان کی حیثیت کے مالک ہوں گے ایک عام سیاسی جماعت کا پروگرام تو اس الیکشن کی ہنڈکھیا میں کامیاب نتائج کا پکوان تیار کرنے کا اہل ہوتا ہے مگر کیا اس کے ایک ضابطہ حیات کا پروگرام موجودہ نظام اور موجودہ حالات کے مکمل طور پر کہ موجودہ ضابطہ حیات کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ ہوتا ہے۔

ہر سپاہی کے دل میں کمانڈر جیسا ولولہ ہونا چاہیے

یہ ضروری نہیں کہ ایک نئے نظریہ کی تنظیم کرنے والے اور سپاہی تحریک کے کارکن

کے تمام بنیادی تصورات اور مقصدیوں سے واقف ہو ضروری ہے کہ ہر سپاہی کو بنیادی معلومات کا علم ہو اور چند بنیادی اصول اس کے ذہن نشین ہو چکے ہوں اسے یہ یقین ہو چکا ہو کہ تحریک کو چلانا اور تحریک کے عقیدہ کو کامیاب بنانا نہایت ضروری ہے ہر سپاہی کو تحریک کے نشر و اشاعت کا علم ہونی نہیں سپاہی کو تو صرف مضبوط ڈسپلن کا پابند کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اسے اپنے مقصد کے اہل اور منصفانہ ہونے کا پابند یقین ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اس کے دل میں جذبہ موجود ہونا چاہیے تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی غیر مشروط ہونی چاہیے تحریک کے ہر مقلد کو تحریک کے آخری نصب العین کا علم ہونا چاہیے اور یہ یقین ہونا چاہیے کہ تحریک کا مقصد شاندار ہے تحریک کو چلانے والوں کے ارادے مصمم ہیں۔

مقلدین کے بغیر امام اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا

فرض کیجئے کسی فوج کا ہر سپاہی سالار ہو فرض کیجئے ہر سپاہی نے یہ سالاری کی تربیت حاصل کی ہو فرض کیجئے ہر سپاہی میں یہ سالاری صلاحیت موجود ہو کیا فوج کا انجام کبھی بہتر ہو گا اسے کبھی جنگ میں کامیابی نہ ہو گی علی ہذا القیاس کوئی سیاسی تحریک کسی ضابطہ حیات کے حصول کے لیے مفید نہیں ہو سکتی اگر اس کا ہر رکن دانشور کہلانے کا مستحق ہے لیکن نہیں "اسادو" سپاہیوں اور مقلدین کی بھی حاجت ہے اس کے بعد تحریک میں ڈسپلن قائم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک تحریک تبھی قائم رہ سکتی ہے جب قائدین اعلیٰ ذہنی قابلیت کے مالک ہوں ان قائدین کے ماتحت مقلدین کی ایک کثیر تعداد ہو جو پورے اخلاص سے جذبہ سے تحریک کے نصب العین کے حامی ہوں ایک تحریک کی ضرورت کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں قسم کی قوتیں ہوں دو سو جوانوں کے کسی ایسے فوجی دستہ میں ڈسپلن قائم رکھنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے جس کا ہر فرد ذہین اور قابل ہو اور برخلاف اس کے دو سو جوانوں کے ایک ایسے فوجی دستہ میں ڈسپلن قائم رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے جس کا ہر فرد کم

رائج ہوں ہر وہ افراد جو تعلیم یافتہ ہوں۔

تحریک کو ان پڑھوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے

جمہوریت پرست اشتراکیوں نے اس حقیقت کو سمجھ کر یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ ان عوام میں سے کہ جب عسکری تربیت کی معیاد پوری کر کے گھر جاتے ہیں تو انہوں نے نظم کی پابندی اور اطاعت کے اصول سیکھ لیے ہوتے ہیں اس مرحلہ پر جمہوریت پرست اشتراکی پہنچ کر آگے بڑھتے اور عوام کے اس گروہ کو جمہوریت پرست اشتراکیت کی اطاعت کے دائرہ کے ماتحت لے آتے ہیں یہ بھی ایک دائرہ اس دائرہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جو ان نوجوانوں نے عسکری تربیت کے دوران میں سیکھا تھا جمہوریت پرست اشتراکیوں کی تنظیم گویا ایک فوج تھی رہنماؤں کے ہاتھ کی طرح ہر سپاہی میں پھیلی ہوئی تھی ایک مزدور جب اپنی عسکری تربیت کی معیاد پوری کر کے گھر جاتا تو وہ اس تحریک کی فوج کا سپاہی بن جاتا اس فوج کے طور طریقوں دستور تھے ان میں ڈیڑھ ہوشیار کے عہدیدار گویا اس فوج کے جنرل ہوتے تھے اس تحریک کی کامیابی کی بنیاد یہ تھی کہ صرف غیر تعلیم یافتہ طبقات اس تحریک میں شامل ہوتے تھے لیکن ہمارے متوسط طبقہ کے لوگ اس امر کو ضرور نقصان دہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک میں صرف غیر تعلیم یافتہ لوگ شامل ہو رہے ہیں مجھے یاد تھا کہ کوئی پیچیدہ سیاسی بحث نہیں زیادہ تر دستوروں کی نوبت ہوتی تھی یہ نوبتیں محض ایسے افراد پر مشتمل ہوتی تھیں جن میں کوئی دانشور نہ پایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے مارکس ازم کی فوج کے سپاہی پڑھے لکھے ہوتے ہیں نہ تھے مارکس ازم کے لیڈروں نے اس فوج کو تربیت دے کر اپنی جماعت کے لیے ایسے سرفروش تیار کر لیے تھے جو اپنے جمہوری آقاؤں کی اسی طرح اندھا دھند فرمانبرداری کرتے تھے جیسے وہ فوج میں اپنے افسر کی اطاعت کرتے آئے تھے ان دونوں کے متوسط طبقہ نے اس قسم کے تنظیمی مسائل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ مارکس ازم کی فوج میں غیر تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت کیا معنی خیز نکتہ ہے انہوں نے یہ

بھی نہ سوچا کہ اس میں کیا خرابیاں ہو سکتی ہیں وہ تو اس خیال میں مگن تھے کہ جب کسی سیاسی تحریک کے تمام متعلقین بڑے بڑے حلقوں سے تعلق رکھتے ہوں تو یہ بات ہو سکتی ہے کہ اس تحریک کے کارکن ہر قسم کے کام کاج کے لوگوں سے کامیابی تک پہنچانے کے لیے کافی ہے ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی تحریک کے برسر اقتدار آنے کے امکانات زیادہ ہیں بہ نسبت اس کے جو سیاسی جماعت ہی ہر طرح سے مشتمل ہو اس کی کامیابی کا یہ امکان ہو سکتا ہے اس حقیقت کو یہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کہ کسی تحریک کی طاقت کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے تمام ارکین کا ذہنی معیار اور روحانی مقام کتنا بلند ہے، بلکہ تحریکوں کی طاقت کا معیار تو یہ ہوتا ہے کہ کسی تحریک کے تمام ارکان اس تحریک کے طرز کی کامیابی کی تکمیل کس سرگرمی سے بجا لانے پر آمادہ ہیں اصل فیصلہ کن امر یہ ہے کہ تحریک کی قیادت کس نوع کی ہے جب دو فوجیں لڑیں تو فتح اس فریق کی ہوگی جس کے تمام سپاہی جیلے بانے جنگ کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، بلکہ فتح تو اس فریق کی ہوگی جس کے کارکن بہتر ہیں اور جس کے ڈسپلن کا معیار بلند تر ہے ڈسپلن کے معیار کا مطلب یہ ہے کہ وہ سپاہی بہترین تربیت یافتہ ہوں اور انہیں جو حکم دیا جائے اس پر فوراً عمل کریں۔

یہ ایک سچی کہانی ہے کہ جب کسی ضابطہ حیات کو عمل جامہ پہنانا ہو تو یہ کوئی معمولی امر نظر نہیں آتا ہے۔

لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرنی چاہیے

اگر ہم کسی ضابطہ حیات کو عمل جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو یہ لازمی ہے کہ اس ضابطہ حیات کی راہ میں آنے والی ایک تحریک قائم کی جائے جب تحریک قائم ہوگی تو یہ منطقی امر ہے کہ اس تحریک میں شامل ہونے والے انسانوں کے مزاج کو بھی مدنظر رکھنا ہوں گے تحریک کا قالب جیسی اور بنیادی اصول بالکل واضح اور معین ہونے چاہئیں تاکہ ان کے متعلق غلط فہمی کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے اسی طرح پروپیگنڈا کا پروگرام بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے یہ پروگرام بناتے وقت ملحوظ رکھنا چاہیے کہ پروپیگنڈا میں ان لوگوں کے

ذہن پر اثر کرنے کی استعداد ہونی چاہیے جس کی قوت کے طفیل بلند ترین خیالات بھی عبارت کی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اگر قومی سرکار کا تصور آج ایک موہوم خواہش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اگر اس موہوم خواہش نے ایک دن کھلی ہوئی واضح کامیابی کی صورت اختیار کرنا ہے تو پہلا قدم ہے کہ قومی سرکار کے مجموعی معنی اور صحیح تصور کو چند ایسے واضح اصولوں کے قالب میں ڈھالا جائے جو اپنی طبعی اور دائمی کشش سے عوام کو اپنا معتقد بنائیں جب تک عوام ان اصولوں کے معتقد نہ بن جائیں گے تب تک ان اصولوں کی خاطر جنگ کون لڑے گا یہ جنگ صرف ان مزدوری کر سکتے ہیں۔

کلمہ ایمان کی ضرورت

یہی وہ بات تھی جسے مدنظر رکھتے ہوئے ہماری تحریک کا پرچم ہمہ ہیادی اصولوں کی شکل میں واضح کر دیا گیا تھا ان بنیادی اصولوں یا نکات کی تعداد چھ ہے ان نکات کا اولین مقصد یہ ہے کہ ایک عام شخص کو پتہ چل جائے کہ ہماری تحریک کا نصب العین کیا ہے گویا یہ نکات ہماری تحریک کے لیے کلمہ ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں اس کلمہ ایمان سے ایک طرف تو تحریک میں شامل ہونے والے معتقدین کو فیض حاصل ہوگا دوسری طرف کلمہ ایمان کی بدولت تحریک میں شامل ہونے والے معتقدین کے مابین ایک گہرا رشتہ قائم ہو جائے گا۔

اس مسئلہ میں ہمیں مندرجہ ذیل حقیقت نہیں بھولنی چاہیے۔

کلمہ ایمان بدلا نہیں جا سکتا

جہاں تک تحریک کے نصب العین کا تعلق ہے وہ اصولاً اٹل ہوتا ہے لیکن جہاں تک اس نصب العین کے پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں بعض نفسیاتی مصلحتیں مدنظر رکھی گئی ہیں لہٰذا وقت گزرنے پر یہ ممکن ہے کہ بعض اصول یا اصولوں کو دیگر پیش کرنے کی ضرورت سامنے آئے بدلتے ہوئے حالات میں یہ تبدیلی [illegible] مفہوم کو شاید بہتر طریقہ پر ادا

بھی کرتے ہوں لیکن الفاظ بدلنے کی کوشش کرنا مہلک ثابت ہوتی ہے۔ کرنی ہی ہو تو یہ کریں کہ آخر پر ہونے والی کوئی بنیادی تبدیلی ہو۔ مکمل بھی ہونی چاہیے جس پر بعد میں بحث کی بنیاد قائم کی جا سکے جو بھی کوئی کتاب ہو اس کا ایک نسخہ بھی تبدیل کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اصولی تبدیلی میں فرق آ جاتا ہے اس تبدیلی سے صرف الفاظ ہی بدلے ممکن ہے نئے الفاظ بہتر ہوں، اور وہ مصنف بھی بہتر اسلوب سے ظاہر کر سکتے ہوں لیکن اس کے بعد بحث مباحثہ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے چاروں جانب گرد بیٹھ جاتی ہے اس لیے ان عادات میں ہمیشہ غور سے سوچنا چاہیے کہ نئے اور بہتر الفاظ اختیار کرنا ضروری ہے یا تحریک کے اندر داخلی اختلافات پیدا کرنے سے پہلے زیادہ ضروری ہے ایسے حالات میں پرانے الفاظ کا ہی رکھنا زیادہ بہتر ہو گا ممکن ہے پرانے الفاظ کی بندش درست نہ ہو لیکن یہ قدیم الفاظ بجائے خود ایک ٹھوس اور بنیادی معنوں کی حیثیت رکھتے ہیں تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو بدلنا ہی ٹھیک ہے جو کہ الفاظ کی تبدیلی کا تعلق صرف کاروباری صورت سے ہوتا ہے اس لیے بھی مناسب اور ممکن نظر آتی ہے لیکن جب یہ نظر ڈالیے اور پرکھیے تو عام مخلوق کے خیالات ہمیشہ ننگی ہوتے ہیں اس لیے اس قسم کی تبدیلیوں کے وقت سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس تبدیلی کا مقصد صرف پروگرام ہی کی تکمیل ہوتا ہے عوام اس سے یہ مطلب لیں گے کہ تحریک کا مقصد بھی بدل گیا ہے اس طرح تحریک کے متعلقات کو رائج کرنے کے عزم و پیغام اور متقدمین کے جذبہ کی سنگینی میں ضعف پیدا ہو جائے گا یوں ہوتے تحریک کو ہونی دنیا میں غالب کرنے میں صرف ہونی چاہیے وہ پروگرام کے متعلق اندرونی اختلافات اور بحث و مباحثہ میں ضائع ہو جائے گی۔

عقیدہ داخل ہونا چاہیے، عمل میں لچک ہو سکتی ہے

جب ایک عقیدہ دنیا میں درست ہے تو اس میں کیا ضرور ہے کہ اس عقیدہ کے اظہار کے لیے وہی پرانے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں سے صدیوں کی کھال پیدا ہو

چلی ہے عقیدہ کے اظہار کے بارے میں اختلاف ہونے کی کوشش کی گئی تو تحریک کا یہ بنیادی اصول بننے تک یہاں لکھا جاتا رہا اور یہ دور ہو کر دوبارہ کا اور اختلاف رائے اور بحث کی اصول اڑنے لگے گی اس کے نتائج المناک بھی ہو سکتے ہیں پھر اگر یہ تحریک بھی اپنی کامیابی کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے تو اس قسم کی بدعتوں سے بچنا چاہیے اور کسی بھی عقیدہ کے متعلق اندھا دھند فتاوٰی میں کس طرح پابند کیا جا سکتا ہے بلکہ ہر وہ اس عقیدہ کو بیان کرنے والے اختلاف لے جا رہے ہوں۔

کسی تعلیم کی حیثیت اس کے اختلاف میں مضمر نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصل قدر و قیمت تو اس کے مطالب و معانی پر منحصر ہوتی ہے تحریکوں کے داخلی مطالب و معانی نہیں ہوا کرتے ہر تحریک کا مقصد اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ اختلاف اور شک و شبہ سے بالکل بے نیاز ہے ہر تحریک کی کامیابی کے لیے تو ہی طاقت درکار ہوتی ہے۔

سائنس کے اصول بدلتے رہتے ہیں لیکن دین اپنی جگہ قائم ہے

یہاں پر ہم بلاشک کھیما سے ایک سبق سیکھ سکتے ہیں اگرچہ اس کھیما کے کئی اصول بدلتے رہے ہیں وجود تحقیقی علوم کی تعلیمات سے کراتے ہیں اور یہ واقعات بالکل غیر ضروری ہوتا ہے اختلاف کے معمولی بیر بھیر سے یہ تصادم روکا جا سکتا ہے لیکن بلاشک کھیما اپنی تعلیمات کا ایک ٹھوس بنیاد لے کر آگے بڑھتا ہے یہ حقیقت خوب سمجھ رکھی ہے کہ اگر واقعات میں ہر روز کائنات پہچان ہونے لگی تو اس طرح کھیما کی قوت عمل میں ضعف آ جائے گا سائنس کی تحقیقات کے نتیجے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ ہر روز بدلتے رہتے ہیں دین کیسے ہر روز سائنس کی ان تعلیمات کی روشنی میں نئی صورت بدل سکتا ہے اسی لیے کھیما نے ایک مستقل فیصلہ کر رکھا ہے کہ دین کے اصول اٹل ہونا قابل تسلیم ہے یہی وجہ ہے کہ کھیما کی بنیادیں آج بھی اتنی ہی قوی ہیں جتنی گزشتہ زمانہ میں مضبوط تھیں ہم بلا تامل یہ یقین کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ہر روز بدلتے ہوئے علمی تعلیمات کے طوفان میں دین کی یہ محکم چٹان ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی

جاب کشش کرتی رہے گی، جو اس کی ہابت قدرتی ہے۔ آپ کو وہاں سے کرکے نت
کے اقتصادی نظام سے نجات حاصل کرنا ہوتے ہیں۔

تحریک کے اصول پتھر کی لکیر ہونے چاہئیں

مذکورہ حالات جو محض پوری سطح پر عمیم تک سے قومی سرکار کے نظریہ کو
کامیاب بنانا ہوتا ہے، اسے ذہن نشین کرلینا ہوتا ہے کہ اس کامیابی تک پہنچنے کا ایک ہی
راستہ ہے وہ راستہ یہ ہے کہ ایک سرفروش تحریک کھڑی کی جائے اس تحریک کی
مضبوط بنیادیں ہمارے کی طرح اصولوں پر تعمیر ہونی چاہئیں ان اصولوں میں وہم
کوئی تضاد یا تصادم نہ ہونا چاہیے جہاں تک تحریک کے اصولوں کے بیان کا تعلق ہے،
جو اصول ایک مرتبہ جس طرح بیان کردیا گیا، پھر اس میں سرمو تبدیلی نہ کرنی چاہیے
اصولوں کے بیان میں وقتی تقاضوں کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیے اصولوں کو بیان کرتے
وقت ایک مرتبہ جو شکل دے دی، پھر اس شکل کو ہر حال میں ثابت رکھنا چاہیے جب تک
تحریک کامیاب نہ ہو جائے کم از کم اس وقت تک اصولوں میں کوئی لچکی تبدیلی کا خیال
تک نہ کرنا چاہیے تحریک کی کامیابی سے پہلے اگر کسی اصول میں ذرا سی لچک تبدیلی
پیدا ہوگئی تو اس سے تحریک کو قوت جاذبہ اور اصل شکل میں فرق آجائے گا آج جس
تبدیلی کو "اصلاح" کا نام دیا جارہا ہے ممکن ہے کل اس کی پہچان بدل کی جائے تو مزید
"اصلاح" کی گنجائش نکل آئے، اور اس سے اگلے روز پہلے سے بھی بہتر "اصلاح"
سوجھ گئے جب اصلاح کا یہ دروازہ کھل جاتا ہے تو پھر راستہ بند کرنا دشوار ہو جاتا
ہے اور جب راستہ کھل گیا تو کیا پدوکوں کا معقول اس راستے کے اندر داخل ہو جائے۔

تحریک کے پیروؤں کا کام عمل کرنا ہے بحث کرنا نہیں

یہ ایک نہایت اہم بات ہے قوم پرست سوشلزم کی تحریک کے راہنماؤں کو یہ کام شروع
سے ہی عملی طور پر سمجھا دینا ضروری تھا "جس قوم پرست مزدور سوشلزم کی پارٹی" کے
پروگرام کے بنیادی نکات کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں تبدیلی کی گنجائش ہرگز

تعبیروں کو بیسویں صدی کے حالات و واقعات کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔

اگر ہماری تحریک پر اعتراض کیا جائے کہ اس نے امت کے عقیدہ پر اجارہ داری قائم کرلی ہے تو اس کا صرف ایک جواب ہے۔

یہ صرف ہم نے امت کے عقیدہ پر اجارہ داری قائم کرلی ہے بلکہ عملی حالات سے دیکھا جائے تو اس عقیدہ کی تخلیق ہم نے انجام دی ہے۔

امت پر عقیدہ کا مطلب صرف ہم نے سمجھا ہے

آج تک امت پر عقیدہ کے نام سے جن خرافات کا بوجھ لادا جاتا تھا وہ بھی ہماری ملت کی تنظیم نو میں حائل نہیں ہو سکتے تھے اس خرافات میں یہ قسمت کا لکھا، ربانی اور کوئی سیاسی مقصد کارفرما ہے وغیرہ وغیرہ مربوط اور عملی زندگی سے کاٹ کر ذہن پر مسلط کر دیا جاتا تھا یہ ہوتا کہ امت پر عقیدہ کی یہ مختلف تعبیریں وہم مسلط ہوتی تھیں ان میں کوئی دخل اندازی نہ پائی جاتی تھی کہ ان خرافات میں داخلی ربط پیدا کر دیا جاتا تو بحیثیت عقیدہ کے وہ اتنے ضعیف تھے کہ ان پر کوئی تحریک قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ صرف قوم پرست شتراکی تحریک کا کارنامہ ہے کہ اس نے امت پر عقیدہ کو ایک مربوط اور عملی سیاسی مفہوم دیا ہے۔

نقل نقل ہے اور اصل اصل

قسما قسمی کی انگیٹھیوں اور گروہ بندیوں میں سے کسی کا قول ایک بالشت ہے تو کسی کا قول دو بالشت ہے اور دونوں مل کر ایک گز بنتے ہیں۔ آج کل بھی آپ کو امت پر عقیدہ سے عاری ہونے کا خطاب حاصل کرنے کا مستحق سمجھتے ہیں یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے جو قوم پرست شتراکی تحریک نے کیا ہے ہماری سرگرمیوں کے نتیجہ میں سے کسی ایک بات پر بھی ہوش نہ تھا کہ یہ امت پر عقیدہ کا نام لیتے ہیں اس لفظ کا مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے بالخصوص ان کے رہنما تو اس عقیدہ کے قریب پھٹکنے کا نام نہ لیتے جب سے ان قوم پرست شتراکی حزب اور پارٹی نے اس عقیدہ میں بھی بھر دیے تو اب یہ سب کے منہ میں پانی بھر آیا ہے

یہ صرف ہماری پارٹی کے پروپیگنڈہ کی کامیابی ہے کہ اس نے امت پر عقیدہ کی حاکمیت عیاں کر دی ہے۔ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مقصد ین حاصل کرنے کی ہوس میں دوسری پارٹیاں بھی ہماری نقل اتار رہی ہیں کم از کم وہ ہماری لفظی نقل کی تو ضرور کوشش کرتی ہیں۔

من حیثیت سے بچ کر رہنا ضروری ہے

جس طرح پہلے یہ پارٹیاں ہر اصول کو اپنے نقطہ انتخابی مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں اسی طرح اب انہوں نے امت پر عقیدہ کا اصول پر حملہ شروع کر دیا ہے ان کا مقصد صرف دکھاوا اور سیاست ہے وہ فقط یہ چاہتے ہیں کہ قوم پرست اشتراکی پارٹی کے ارکین کے عوام میں جو رسوخ پیدا کر لیا ہے اس کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جائے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اور ہماری تحریک کی کامیابی کے ڈر سے وہ اپنے ہی ان کی زبان پر بھی آ گئے ہیں ہماری تحریک ایک ایسے نقطہ حیات پر مبنی ہے جسے عالمگیر اہمیت حاصل ہے ہماری رقیب پارٹیاں خوب جانتی ہیں کہ ہماری تحریک میں بے حد ہونے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس سے ان کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ آج کل وہ الفاظ دوہرا رہے ہیں جو آج سے چھ سال پہلے ان کے نزدیک حماقت کی نشانی تھے پچھلے سال تک انہوں نے ان نعرات کا مقابلہ شروع کیا چار سال قبل یہ اس عقیدہ کے سامنے لاچار ہو گئے اور اب دو سال سے انہوں نے خود ہی عقیدہ کا ورد شروع کر دیا ہے اور اسے اپنے سیاسی ایمان میں شامل کر لیا ہے غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان لوگوں نے کسی سامنے سر جھکا دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمیں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے ہمیں اس حقیقت پر نگاہ رکھنا ہے کہ ان پارٹیوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ نہیں کہ ہم ان قوم کی ضروریات کو ہیں جو ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ مسئلہ پر عقیدہ کا نام کس طرح لیتے ہیں۔

آدھا ایمان پورے کفر سے زیادہ خطرناک ہے

وہ لوگ اس سے کسی طرح کم خطرناک نہیں جو امت کے عقیدہ پر بھی براہ راست قسم کی بھونڈی تباہی پیش کرتے ہیں ان لوگوں کی تباہی کی جڑ کھوکھلی ہوتی ہے ان کے دماغ میں کہیں سے کوئی کیڑا وکیا خیال کہیں سے گھس آتا ہے اور پھر اس کے ذہن پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے ممکن ہے وہ خیال فی نفسہ درست ہو لیکن جس طرح یہ لوگ اس خیال کا شکار ہوئے دنیا کے حقائق سے منقطع کر کے اس کے ہاتھوں میں دیتا ہوا ہوتے ہیں اس سے بھی کوئی مفید اور ہنگو جماعت قائم نہیں ہو سکتی نہ یہاں تنظیموں کے اصول کی تعلیم کی بنیادیں بنتے ہیں بعض لوگ اس قسم کے "پیغمبر" تصنیف کرنے کا شغل فرماتے رہتے ہیں جو خیالات اپنے ذہن کی تخلیق سے یا جو تصورات کہیں سے مالک کر لیا کیے یا کسی سے پڑھ کر لیا ہے اور پھر اس کی تبلیغ کا فریضہ کر دیتے ہیں ایسے لوگ دوست امت ہی عقیدہ کے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں یہ لوگ نیک نیت ہوں تو تنگ دماغ اور بالخطرت کے نیابی گھوڑے دوڑانے والے "شیخ چلی" ثابت ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر یہ دو تہائی تعداد پیدا ہوتے ہیں جو عوام میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رکھنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ اپنی ذاتی فرعونیت اپنی کوششوں کی بے سبی اور اپنی ناکامیت ہی اپنی تحریر و تقریروں سے ہر وقت بڑے زور شور سے دنیا کا سامنے رہا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی تمام حرکتیں بے فائدہ ہیں اور مناسب نہ ہوگا اگر میں یہاں ان بام کی داستان بیان کروں جب قوم پرست اختر کی تحریک نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہمارے جلسے

ہمارا پہلا جلسہ 24 فروری 1920ء کو ہوٹل برادرز کے ہال طعام میں منعقد ہوا۔ ابھی اس جلسہ کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی کہ ہم نے آئے دن جلسے کرنے شروع کر دیئے۔ اس وقت ہم ہر مہینہ بارہ سے زیادہ جلسے کرنے کے بعد ایسے کسی شہر میں ایک چھوٹا سا جلسہ منعقد کرنے کی ٹھوکر پر بڑی احتیاط سے غور کیا کرتے تھے لیکن اب ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر ہفتے ایک جلسہ عام منعقد کریں گے چاہے یہ ہفتہ وار جلسے کتنی تعداد سے شروع کئے جائیں۔ ہم ہر مرتبہ یہی تشویش سے سوچا کرتے تھے کہ کیا حاضرین کافی تعداد میں جمع ہو جائیں گے۔ اور حاضرین فراہم ہو گئے تو کیا وہ ہماری تقریر سنیں گے جہاں تک میری بات کا تعلق ہے مجھے پتہ نہیں تھا کہ اگر حاضرین آ گئے تو پھر وہ جلسہ میں ٹھہریں گے اور تقریر بھی سنیں گے۔

اس زمانہ میں ہر شہر کے ہوٹل برادران کا ہال ہی عوام پر مشتمل اجتماعوں کی واحد جگہ تھی ایک مقدس درس گاہ کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ ہر ہفتے جلسہ عام منعقد ہوتا تھا یہ جلسہ قریباً اسی ہال میں منعقد ہوتا تھا ہر مرتبہ ہال میں حاضرین کی تعداد سابقہ جلسہ سے زیادہ ہوتی تھی حاضرین ہماری باتیں بھی زیادہ سے زیادہ توجہ سے سنتے تھے۔

ہم نے پہلے تو یہ موضوع چھیڑا کہ "عالم گیر جنگ شروع کرنے کی ذمہ داری کس پر ہے" اس زمانہ میں کوئی شخص اس موضوع کی بابت کچھ نہ کہتا تھا پھر ہم نے بتدریج صلح کے معاہدات پر بحث شروع کی ہم قریباً ہر اس مضمون پر کچھ نہ کچھ کہتے جس سے ہمارے سامعین کو دلچسپی ہوتی اور جس سے انہیں ہمارے خیالات کی جانب متوجہ کرنے کا امکان نظر آتا۔ ہم نے صلح کے معاہدات کی جانب خاص طور پر توجہ مبذول کر دی۔

بھیجے پے قوم کی روح کے تڑپ رہے تھے

اس دوران اس نئی تحریک نے عوام کے سامنے جو نئے نئے سوالات کھڑے کیے تھے وہ بے انتہا تھے پوری ہو چکی ہیں۔ آج ان مسائل کا تذکرہ اور ان کی بابت لکھنا آسان ہے لیکن ان دنوں کسی ایسے جلسہ عام میں جہاں حاضرین کھانے پینے کی اشیاء پر مشتمل نہ ہوں، بلکہ مطلس و مقفیٰ و مرصع اہل عوام کا ہجوم ہو، جنہیں شورش پیدا کرنے والوں نے بھڑکا رکھا ہو تا تھا، اور سائنس کے صحیح نظریہ ارتقاء کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسانی کی دیانتی سرکار پر حملہ کیا جا رہا ہے انسانی کی دیانتی سرکار پر حملہ کرنا، رحمت پسندی، جنگ شاہزادی کا مترادف تھا صحیح نظریہ ارتقاء اور سائنس کے متعلق کچھ پیچیدگی کا پیدا کر دینے کی خاطر اعتراض کیا جاتا تھا "اور پہلے تو ہم کا بھی تو ہم تھا" یہ فقرہ سنتے ہی ہجوم بڑبڑانے لگا، بڑبڑاہٹ رفتہ رفتہ غراہٹ کی صورت اختیار کر لیتی تھی، مقرر کو اپنے دلائل کو بیان کرنے کی کوشش ترک کرنی پڑتی۔ یہ لوگ اس طرح باتوں سے کل چکے تھے کہ انہیں قائل کرنے کی کوشش دیوار سے مکریں مارنے کے برابر تھی وہ یہ سننا چاہتے تھے اور نہ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ صحیح نظریہ ارتقاء اور سائنس تو ایک بڑھتی کا پلندہ اور لاک کا بکس ہے یہ تو ہی صحیح ہے ہماری قوم کے حقوق کے خلاف ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ ہے مارکس ازم کے حامیوں کی تحریر کی کارروائی اور بیرونی ہاتھوں کے زیر اثر ہونے کے الزام نے ان لوگوں کی عقل مسخ کر دی تھی بلکہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے خلاف کسی کو شکایت کا حق بھی نہ تھا جبکہ ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ کھانے پینے کے دوران عقل نے اختیار سنبھالنے کی اس خوفناک مہم کے تذکرے کے بجائے ہم نے لوگوں کی کوشش کی تھی کہ انہوں نے مارکس ازم کے حامیوں کے مقابلہ میں صورت حال کی وضاحت کرنے میں کوئی اعتراض کیا تھا ہرگز نہیں اور ہرگز نہیں! اس زمانہ میں یہ "پاسبان قوم" کہیں دکھائی بھی نہ دیتے تھے جو آج کل اپنی عظمت کا اعلان پھیلاتے پھرتے ہیں ممکن ہے وہ اپنے مخصوص حلقوں میں تقریریں کرتے ہوں شاید وہ ستونوں کی محفل میں انہوں نے اس موضوع پر کبھی گفتگو

فرمائی ہو لیکن یہ وہاں کبھی نظر نہ آتے تھے جہاں انہیں آنا چاہیے تھے جہاں بھیڑ ہے قوم کی رہنمائی کے لئے لوگ نہ تھے یہ وہاں آئے کا اخبار کبھی مول نہ لیتے تھے اگر کبھی آتے بھی تھے تو بھیڑ یوں ہی کی سمجھ کر چلے جاتے تھے۔

ہم رائے عامہ کی لونڈی نہیں اس کے رہنما ہیں

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے کبھی واضح احساس ہو گیا تھا کہ ہماری تحریک میں اس وقت جو بھی بھرتی لوگ شامل تھے ان کے سامنے سب سے پہلے یہ مسئلہ واضح رہتا تھا کہ جنگ بھیڑ نے کا آلہ کون فریق کے ہاتھ ہے اس مسئلہ کی وضاحت تاریخی حقائق کی روشنی میں ہوتی رہتا تھا اگر مسئلہ میں ہم اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے تمنی تھے تو اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ صحیح نامہ کا مطلب عوام کو ٹھیک طرح سمجھا دیا جاتا اس وقت عوام کی رائے یہ تھی کہ جنگ کے بعد کا صحیح نامہ گویا جمہوریت کی فتح کے مترادف ہے لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ہم صحیح نامہ کی مخالفت شروع کریں ہم عوام کے ذہن پر نقش کرنا چاہتے تھے کہ ہم صحیح نامہ کے دشمن ہیں اس طرح بعد میں جب حقیقت کھل جائے گی اور فریب کا پردہ چاک ہو کر گھناؤنی اصلیت سامنے آجائے گی تو عوام کو یاد رہے گا کہ ہم نے شروع سے ہی انہیں خبردار کر دیا تھا تب عوام کا غصہ ہمیں حاصل ہو جائے گا اب بھی میرا عقیدہ یہی تھا کہ اس جمہوری مسائل کے متعلق عوام گمراہ ہو چکے تھے ان کی ہدایت میں اپنا مسلک کھلم کھلا بیان کرتا میں ہر طرح کی مخالفت کی پروا کئے بغیر گمراہی کی پرزور تردید کرتا اس طرح مخالفت کا جو طوفان اٹھتا میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ تھا۔ جس قوم پر ست اشتراکی مزدور پارٹی رائے عامہ کی لونڈی نہیں بلکہ رائے عامہ کی راہنما ہے یہ تحریک عوام کی محکوم نہیں بلکہ ان کی قیادت کی مدعی ہے۔

دشمن کو شکست دینی ہے اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیے

ہر تحریک میں یہ بھی ضروری ہوتی ہے کہ مخالفین کے طور طریقوں کی پیروی کی جائے بالخصوص جنگ میں یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ دشمن کی کوششوں سے عوام

خلاف نظریات قبول کر چکے ہوں یا مسائل کے متعلق غلط رویہ اختیار کر چکے ہوں تو کسی تحریک کی نئی نسل حالات کے بدلے ہوئے طریقے قبول کر لیتی ہے یہ کمزوری اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب حالات کی تقلید کوئی تحریک کے مقاصد کے حق میں مفید ثابت کرنے کے لیے بہانے بھی تراش کر لیے جاتے ہیں جو درحقیقت بالکل بے بنیاد ہوتے ہیں انسان میں نقال کا ایک فطری جذبہ پایا جاتا ہے یہ جذبہ ہر تحریک کو اپنے حالات کی تقلید پر بار بار آسانی سے آمادہ کر دیتا ہے مگر اس نقال کے جوش میں بعض اس قسم کے عناصر بھی گھس جاتے ہیں کہ ہر تحریک اپنے مخصوص راہ پیغام سے "بے راہ" اختیار کر رہی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ تحریک بھی اپنے حالات کی بھرمار یا بیسی میں شریک ہوتی ہے۔

یہ اخبارات قوم کے سر پر چڑیل کی طرح سوار ہیں

مجھے بارہا ایسی مثالوں کا تجربہ ہو چکا ہے کہ موقع پر بڑی سمت سے کام لے کر اپنی تحریک کی کشتی کو عام بہاؤ سے بچا کر ایسا عام بہاؤ مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے کہ ہم سمت سے کام بن جاتے تو خطرہ تھا کہ ہماری تحریک کی کشتی بھی عام سیلاب میں بہہ جاتی ایسا موقع آخری مرتبہ تب آیا جب جرمن اخبارات نے نیرول کے حادثہ کو آگ سے واپس لے کر جرمنی سے الحاق کرنے کے مطالبہ کو غیر معمولی اہمیت دے کر اچھالنا شروع کیا اس مسئلہ کو جو اہمیت دی گئی وہ جرمن قوم کے مفاد کے منافی تھی دراصل یہ جرمن اخبارات بھی ہماری قوم کے سر پر چڑیل کے آسیب کی طرح سوار تھے اور ہمیشہ اسے ورغلا کر کسی نہ کسی غلط راستہ پر لگا دیتے تھے تمام ہماری قوم پرستی ہار گئی اور قوم پرست انجمنوں نے بغیر یہ سوچے کہ کس کی غمخواری سے درحقیقت کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے نیرول کے مسئلہ پر ایک عام غوغا برپا کر دیا اس طرح پر قوم پرست عناصر پبلک رائے سے ایک ایسے کام کی حمایت کو تقویت پہنچا رہے تھے جس سے ان دنوں ہمیں جرمنوں کے لیے خاص طور پر اس اندھیری دنیا میں امید کی کرن سمجھنا چاہیے تھا ہمیں

کسی تحریک کو ہمیشہ اپنے داخلی نعروں پر نگاہ رکھنی چاہیے اور وقتی "زندہ باد" کے نعروں پر کان نہ دھرنا چاہیے ممکن ہے کہ اس طرح کے بعض نعرے کو بعض وقت تحریک میں گزر ہو۔ لیکن اس تحریک کو چلانے والوں کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اصل کام وقت قریب ہے جو تحریک دنیا کا نقشہ بدلنا چاہتی ہے اسے مستقل پر نگاہ رکھنا چاہیے عارضی مفادوں کے سامنے جھک جانا اس کا شیوہ ہونا چاہیے۔

صبر اور استقلال سے مخالف بھی موافق بن جاتے ہیں

یہاں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تاریخ میں سب سے بڑی کامیابی کن لوگوں کو حاصل ہوئی ہے انہیں شروع شروع میں بہت کم حامی ملتے تھے شروع میں حامی نہ ملنے کی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ رائے عامہ کے خلاف چلتے تھے اور وقتی مقبولیت کی پروا نہ کرتے تھے۔

ہمیں اس سچائی کا تجربہ پہلی ہی مرتبہ عوام کو خطاب کرنے پر ہوگیا حقیقت یہ ہے کہ ہم عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیتاب رہتے تھے حتیٰ ہم تو عوام کی جماعتوں کو ختم کرنا چاہتے تھے ان دنوں بار بار ایک ہی واقعہ پیش آیا کرتا تھا جب میں جلسہ میں تقریر کرنے جاتا تو سامعین کے اعتقادات، جو کچھ میں کہنا چاہتا اس کے بالکل خلاف ہوتے۔ جو کچھ میں چاہتا تھا کہ کہوں وہ چاہتے تھے کہ نہ کہوں میں قریباً دو گھنٹہ دو تین ہزار لوگوں کو یہ منانے کے لیے صرف کرتا کہ وہ اپنی پہلی رائے بدل دیں میری ہر چوٹ سے ان کے پہلے خیالات یک بہ یک حد تک مسمار ہو جاتے آخر کار میں نہیں اور کر اپنے اعتقادات اور اپنے ضابطہ حیات کا سوا نہ پاتا۔

دشمن کی چال کا اندازہ کر کے اس کا توڑ تلاش کرنا چاہیے

اس تجربہ سے مجھے ایک یہ ملکہ حاصل ہو گیا جو اس وقت کے لحاظ سے خاصا اہم تھا یعنی میں نے دشمن کے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لینے کے ذریعے دریافت کرنا شروع کر دیا جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کون سے طریقے اور بالخصوص وہ لوگ جو ہمارے

خلاف مباحثہ کی رائے دہی کر رہے تھے۔ ہی ہائی دیوں نے گویا ایک سا چھ فیصلہ کن میں داخل کر لیا ہے دیوی کی تردید کے لیے کوئی بار دلیل ہوتا تھا ہم اپنے دعوی کی تلقین مسلسل کر رہے تھے اور ہی تردید میں بھی ایک ہی قسم کے حقائق اور استدلال کے استعمال سے ثابت تھا کہ ہمارے مخالفین کی ایک مرکز سے باقاعدہ تربیت پا کر ہمارے سامنے آئے تھے یوں پتہ چل گیا کہ ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے ہمیشہ ایک ہی ڈھنگ سے حملہ کرتے ہیں انہوں نے جو طریقہ سیکھا ہے اس ہی طریقہ سے بحث کر سکتے ہیں میں آج فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے صرف اس پروپیگنڈے کو نئے زمانے کا مدلل اختراع کر لیا ہے بلکہ اس ڈھنگ سے میں پردہ فاش کر رہے خلاف منصوبے چلانے والوں کو خود ان کے ہی تھیوریوں سے شکست دے دی۔ دو سال گذرنے کے بعد میں اس فن کا ماہر بن چکا تھا۔

بحث میں جیتنے کا نسخہ یہ ہے کہ حریفوں کی دلیلوں کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے

میں ہر تقریر سے پہلے واضح طور پر اندازہ کر لیتا تھا کہ ہمارے خلاف کیا دلیلیں کس انداز میں پیش کی جائیں گی مباحثہ کی اس نوعیت اور اس کے مدلل کے متعلق یوں کاپیہ کر کے میں اپنی تقریر میں خود حریف کی متوقع دلیلوں اور حقائق کی تردید شروع ہی میں کر دیتا ہوں اس طریقہ کو کامیاب بنانے کے لیے میرا دستور یہ تھا کہ میں اپنے دعوے کے خلاف تمام ممکن حقائق خود ہی بیان کر کے انکی باہم متضاد ثابت کر دیتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر اخلاص سے تقریر سننے والا میرا ہوا ہاں کر میرا قائل ہو جاتا۔ چونکہ ہم حقائق کا جواب پہلے ہی پیش کر دیتے تھے لہٰذا جب حریفوں کی جانب سے وہاں حقائق دہرائے جاتے تھے تو سامعین کے حافظہ پر ان کا نقش ہی نہ جمتا جو کچھ انہیں سکھانے کی کوشش کی جاتی تھی وہ طلبہ ان کے لبوں پر آنے سے پہلے ہی غلط ثابت ہو چکا ہوتا تھا۔ پھر بے چارے میری تقاریر کو دلچسپی سے سنتے تھے۔

جب میں اپنی قومی زندگی میں پہلی بار سیاسی کے عہدہ پر مامور تھا تو میں نے معاہدہ ورسائی اور قیام امن کے موضوع پر اپنا لیکچر تیار کیا تھا فوجیوں کو ایک بار یہ لیکچر سنانے کے بعد میں نے اس کا عنوان اور موضوع بدل کر اب لیکچر کا عنوان یہ رکھ دیا کہ "معاہدات ورسائی اور رست توسک میں تقابل" اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ میرے پہلے لیکچر کے بعد جو بحث شروع ہوئی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دراصل عوام کو معاہدہ رست توسک کے متعلق بہت علم نہ تھا اور جن حالتوں نے اس قابلیت سے پروپیگنڈہ کیا تھا کہ رست توسک کے معاہدہ کو بدنام کر کے رکھ دیا تھا لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی تاریخ میں یہ معاہدہ سیاہ کاری ہر قسم کی بدترین مثال تھا۔

مخالف کے ایک ایک عذر کی تردید کرنی چاہیے

یہ مضمون اس کثرت سے عوام کے سامنے دہرایا گیا تھا کہ لاکھوں آدمیوں کو یقین ہو چکا تھا کہ معاہدہ ورسائی اس ترمیم کی منصفانہ سزا ہے جس کا ارتکاب ہماری قوم نے معاہدہ رست توسک کے تقاضے کی تھا یہی وجہ تھی کہ عوام معاہدہ ورسائی کی مخالفت انصاف کے خلاف سمجھتے تھے کئی لوگوں کی توجہ کی اس مخالفت سے اخلاقی حس محسوس ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ جرمنی میں "جاوداں جنگ" کی شرمناک اور بہیمانہ اصطلاح عام طور پر استعمال ہونے لگی یہ وہ کارنامہ اصطلاح تھی جو روح کو ٹوٹی پھوٹی تھی باوجود اس کے ہمارے لاکھوں ہم وطن یہی سمجھتے تھے کہ یہ جاوداں جنگ کی معصوم فطرت کے برتر انصاف کا تقاضا ہے یہ بتانا کہ اس سے روح زیادہ الجھتی ہے کہ کیا بھی ہو سکتا ہے لیکن درحقیقت یہ ہی تھا اس مقالہ کا بہترین ثبوت وہ پروپیگنڈہ تھا جو میں نے معاہدہ رست توسک کی وضاحت کر کے معاہدہ ورسائی کے خلاف شروع کیا میں دونوں معاہدوں کا اس طرح مقابلہ کرتا تھا کہ ہر موضوع پر دونوں معاہدات کی ایک ایک دفعہ لے کر ان کا باہمی موازنہ کرتا پھر میں یہ حقیقت واضح کرتا کہ کس طرح رست توسک کا معاہدہ انسانی قدر کے تقاضوں کے عین مطابق ہے برعکس اس کے ورسائی کا معاہدہ کیونکر انسانی

انسانیت دوستی اور بے غرضی کی بدترین مثال ہے اس نظارہ کا سامنے ہی حیرت انگیز اثر ہوتا تھا کہ دفعتاً ایسا ہوا کہ میں نے دو ہزار کے قریب سامعین کے جلسہ کو خطاب کیا جس میں ایک ہزار تو عورتیں تھیں جو مجھے حجاب نہ ہونے کی وجہ سے دیکھ رہی تھیں میری تقریر کے بعد جب میرے گرد کا مجمع عقیدت و محبت سے مشتعل ہو چکا تھا ان کے دل و دماغ سے ایک بہت بڑے بھوت کا اثر مٹ چکا ہوا تھا ہزار ہا افراد کا مجمع بھوت سے نجات پا کر بی کے احساس سے سرشار ہو جاتا تھا۔

قوم کے فرزندوں کو قوم کے دائرہ میں واپس آنا چاہیے

ان دنوں میں دو موضوعات پر تقریر کرنا سب سے اہم سمجھتا تھا پہلا موضوع تو تھا "ہالکیٹ جنگ کے اسباب کیا تھے" دوسرا عنوان تھا "مطبوعات و رسائل و اخبارات تک میں نظائل" میں نے یہ تقریریں درجنوں مرتبہ دہرائی ہوں گی" میں انہیں ہمیشہ ایک لب و لہجہ میں فیش کرتا رہا جس کے جس تک ان دو لفظات کا تعلق تھا عوام کے کثیر حلقہ کا ذہن بالکل صاف ہو گیا ہو وہ ان نکات پر متحد ہو گئے اس حلقہ میں سے ہماری تحریک کے ہولیس راکھیں کی بھرتی ہوئی۔"

ان مجمعوں کا مجھے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں آہستہ آہستہ مجمع عام کے سامنے جلسہ گاہوں میں تقریر کرنے کا عادی بن گیا مجھے لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور وسیع جلسہ گاہوں میں ہزار ہا اشخاص کے سامنے تقریر کی ہمت سے حسد ہائی حرکات میں کمال حاصل ہو گیا۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں، ان دنوں ہماری تحریک کا حلقہ محکم تھا ان دنوں میں اس حلقہ سے باہر کوئی ایسی پارٹی نہ تھی جو عوام کے سامنے ہوں مسلم لیگ کا تجربہ کرتی آج کل جو سیاسی جماعتیں ہیں وہ تک بناتی ہیں گویا ہمارے حلقہ کو توڑنے کا سامان کر رہی ہے اس وقت ان میں سے کوئی سیاسی جماعت بھی کام نہ کر رہی تھی ہاں سیاسی لیڈر ہوا چلے "آپ لوگ قوم پرست کہتے تھے اگر کبھی کبھار یہ موضوع

بھیجا تو ہی تو زیادہ تر اپنے ہم خیال حلقوں کے سامنے، جو پہلے سے ان کے ساتھ متفق ہوتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بے لیڈروں کی تقریروں کا واحد فرق یہ ہو سکتا تھا کہ پہلے سے جو لوگ ان کے ہم عقیدہ تھے وہ اپنے عقیدہ میں زیادہ راسخ ہو جاتے۔ لیکن قوم کو جس کام کی ضرورت تھی وہ تو کچھ اور ہی نوعیت کا تھا۔ ضرورت تو یہ تھی کہ قوم کے جو افراد دشمن کے ہم عقیدہ و ہم مسلک بن چکے تھے ان کی رائے اور ذہن کو سیاسی کی وضاحت اور پروپیگنڈے کے ذریعہ تبدیل کر کے انہیں پھر قومی دھارے میں واپس لایا جاتا۔

تقریری پراپیگنڈے کے ساتھ تحریر بھی تقسیم ہونا چاہیے

ہم نے اپنے پراپیگنڈے کو تقویت پہنچانے کے لیے بہت ورق کی کشتی چھپوں بھی چھاپ کر بانٹی شروع کیں۔ میں بھی فوج میں تھا جب میں نے ایک بحری کشتی چھلی کا مضمون تیار کیا تھا۔ میں نے اس چھلی میں معاہدہ ورسیلز اور معاہدہ سیورے کا ہر ایک نکتہ داخل کیا تھا۔ کشتی چھلی تب کثیر تعداد میں چھپ کر کے تقسیم کی گئی تھی۔ اب میں نے یہی چھلی پھر چھپوا کر اپنی پارٹی کے لیے استعمال کی اس سے خاصی کامیابی ہوئی شروع شروع میں ہمارے جو جلسے منعقد ہوتے وہاں دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں ہمیں یہ خاص امتیاز حاصل تھا کہ سامعین کے سامنے ہمارے ہی قسم قسم کے رسالے، اشتہار اور پمفلٹ بکھرے ہوتے تھے۔ وجہ اس کے ہماری تحریک کا لٹریچر ہونے کی حد تک تقریروں پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی عظیم انقلاب ایسے تقریر کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تقریر کی کامیابی کی وجوہات نفسیاتی ہیں۔

انقلاب صرف تقریر سے پیدا کیا جاتا ہے

میں اس کتاب کی پہلی جلد میں واضح کر چکا ہوں کہ وہ تمام بڑے واقعات جن کے ذریعہ دنیا کے نقشے بدلے جاتے رہے ہمیشہ تقریر کے ذریعہ وقوع پذیر ہوئے نہ کہ تحریر کے ذریعہ اس موضوع پر بعض اضافے میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تعلق ان دنوں کے دوران میں ذہن کو پڑھنے والے لوگوں نے تقریر کے حق میں میری رائے کے

خلاف بہت کچھ کہا لیکن بات کی تہہ تک پہنچنے والے اکثر اس فرق کو نہیں جانتے تھے کہ اس مخالفت کی اصل وجہ کیا ہے کہا جاتا ہے کہ بیشتر مقرر کے حق میں بہرے ہونے کی مخالفت اس لیے کرتا تھا کہ وہ خود تقریر کے ذریعہ عوام کو عبور کرنے کی قابلیت نہ رکھتے تھے اور نہ ہی وقت وہ تو بیہودہ جملوں کی مدد ہی تکیہ کرتے تھے لوگوں کو تقریر کے ذریعہ ابھارنے کی خاطر یا اسے کبھی گھونٹ کر اکھاڑے میں اترنے کا کام نہیں پڑتے تھے واقعات کی رو نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس سے آج کل کے کھاتے پیتے فرقات چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں وہ بھی حس ہی مفقود ہو چکی ہے جس کے ذریعے عوام کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔

تحریر پر تقریر کی ترجیح

ایک مقرر کرنے والا تقریر کے دوران عوام کا رخ دیکھ کر مسلسل اپنی تقریر کا ڈھب بدلتا رہتا ہے اس لیے اسے اپنی تقریر وقتی نکاسے کے مواقع ڈھالنے کا موقع ملتا ہے وہ سننے والوں کے چہرے کو دیکھ کر خوب اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اس کی بات سمجھتے ہیں یا نہیں اس کے ساتھ متفق ہیں یا نہیں اور کیا اس کے الفاظ وہی اثر پیدا کر رہے ہیں جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے برعکس اس کے ایک مصنف کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کی تحریر کون پڑھے گا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مصنف شروع سے ہی زبانوں کے کسی خاص گروہ سے مخاطب نہیں ہوتا جو اس کی نگاہ کے سامنے ہو بلکہ وہ تو مجبور ہے کہ ایک عام انداز اور ایک عام اسلوب سے جو بلکہ مصنف ہے کھوا لے غرض مصنف کا نفسیاتی پارہ یہاں تقریر انداز کرنا اور اپنے بیان کی لپیٹ سے محروم رہنا ایک لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قابل مقرر کے طور پر کیا جا سکتا ہے کہ ایک اچھا مصنف ہو ہی نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ایک اچھا مقرر تصنیف کر سکتا ہے۔ ہاں اگر مصنف کو عوام کے سامنے تقریر کرنے کی بھی مشق ہے تو پھر دوسری بات ہے یاد رکھنا چاہیے کہ عام جلسے جلوس ہوتے ہیں وہ اس حالت میں ہوں اس کی عادتوں میں گرفتار رہتے ہیں ان کے اندر کسی ایسی تقریر کو پڑھنے کی کوئی بھی خواہش

نہیں ہوتی جو ان کے عقیدہ کے مطابق نہ ہو۔ عوام تو کسی تحریر کو تبھی پڑھتے ہیں جب اس میں وہی کچھ لکھا ہوتا ہے وہ خود پڑھنا چاہتے ہیں غرض کسی تحریر میں کوئی خاص رجحان پایا جائے تو اس تحریر کو وہی لوگ پڑھیں گے جو پہلے سے اس رجحان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں مگر کوئی رسالہ یا اشتہار اپنے مختصر کے باعث ان لوگوں سے وقتی نگاہ التفات کی توقع رکھ سکتا ہے جو اس کے سامنے مندرجات سے متعلق ارادے نہیں۔

تصویر بھی تحریر سے زیادہ موثر ہوتی ہے

تصویر چاہے کسی شکل میں ہو ہر جگہ اس میں بیسیوں قسم کی دلچسپی رکھتے ہوں عوام کی توجہ کو زیادہ کشش کرتی ہے تصویر کو زیادہ کشش بنانے کے لیے کسی خاص ہدایت سے تیار کردہ مضمون کی بھی ضرورت نہیں اس احتیاط پر رکھی جاتی ہے کہ تصویروں کے لیے جو عبارت لکھی جائے وہ بالکل مختصر ہو تصویر کے ذریعہ جو مضمون پیش کیا جائے گا اسے ہر شخص دیکھتے ہی سمجھ لے گا لیکن تصویر کے نیچے جو بھی عبارتیں لکھی جاتی ہیں انہیں کوئی نہیں پڑھتا کوئی بات عوام کو سمجھانی ہو تو تصویروں کے ذریعہ بہت تھوڑے عرصے میں اور نہایت آسانی سے سمجھائی جا سکتی ہے برعکس اس کے یہی بات تحریر پڑھ کر سمجھی ہو تو اس کے لیے طویل اور شدید محنت سے مطالعہ کی حاجت ہوتی ہے۔

ہر جگہ تصویروں میں بھی دقت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ایک تصویر کسی کے پڑھنے پر اس قسم کا نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ تصویر کشی کے ذریعہ جو مضمون پیش کرنا ہے وہ ایک ہی انداز سے پیش کیا جائے گا اور دیکھنے والے مختلف طبیعتیں رکھتے ہوں گے تصویروں کا اثر بھی کبھی زیادہ ہوتا ہے جب تصویروں کی پیش کش کا انداز دیکھنے والے کی ذہنی سطح اور اس کی طبیعت کے مطابق ہو یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کتاب عوام کے لیے چھاپی جاری ہو تو شروع سے ہی اس کا اسلوب بیان اور اس کی ذہنی سطح کسی ایسی کتاب سے بالکل مختلف ہو گی جو اعلیٰ ذہین طبقات کے لیے تیار کی جائے۔

تقریر مناسب حال ہونی چاہیے

جس طرح مختلف جذبات کے پیش نظر ہیں مختلف اسلوب اور مختلف لہجے میں تصنیف کی جاتی ہیں اسی طرح تقریریں بھی سامعین کی نوعیت اور موقع کی مناسبت سے مختلف انداز کی ہوتی ہیں ممکن ہے ایک مقرر اپنی تقریر میں اور ایک مصنف اپنی تحریر میں ایک ہی موضوع پر طبع آزمائی کریں لیکن اگر کوئی مقرر وہ فنی اعلیٰ پیمانے کا ہو جو ہر مقرر ہے اور اس میں تقریر کی جو معمولی استعداد بھی موجود ہے تو وہ کبھی کسی ایک دلیل یا ایک مضمون کا ہی شکل میں دو مختلف موقعوں پر ایک ہی صورت میں نہ دہرائے گا۔ وہ ہمیشہ عوام کا رنگ دیکھ کر اپنی تقریر کو اس کے مطابق ڈھالے گا عوام کو مجمع جس خاص وقتی جذبے سے سرشار ہوگا اس کی مناسبت سے مقرر کی زبان سے پہلا لفظ نکلے گا اس طرح کہ جونہی اسے سامعین کے دوں تک رسائی مل جائے گی تو اسے عوام کے غالب جذبے کا اندازہ کرنے میں کچھ مغالطہ نہ ہوا ہو تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھا مجمع اس کی غلطی کی اصلاح کرنے کو موجود ہے جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں ایک اچھا مقرر سامعین کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ کر سکتا ہے کہ آیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سامعین اسے سمجھ رہے ہیں یا نہیں دوسرے کیا اس کی دلیلیں ان کی عقل کے مطابق ہیں تیسرے سامعین کو کہاں تک اس پر اعتبار اور اعتماد ہے کہ وہ اس کے قول کو کچھ کچھ قبول کر رہے ہیں اگر مقرر کو نظر آئے کہ سامعین اس کی بات نہیں سمجھ سکتے تو وہ اپنے آپ کو ان سے واضح الفاظ میں وضاحت کرنے کا کہہ سکتا ہے یا مجلس میں ہر شخص اس کی بات سمجھ جائے گا دوسرے اگر وہ دیکھے کہ اس کے دلائل سامعین کی عقل کے مطابق نہیں تو وہ اپنے خیالات کے سلسلہ کی ہر کڑی کو بڑی گہری توجہ کے ساتھ اس احتیاط اور آہستگی سے قائم کرے گا کہ بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی اس کے استدلال کو سمجھ جانے کا تیسرے جونہی سے محسوس ہوگا کہ سامعین اس کی تقریر سے قائل نہیں ہو رہے وہ اس طرح اپنا مضمون پیش کر رہا ہے اسے وہ سمجھ نہیں سمجھتے تو وہ اپنے دلائل مختلف پیرائے میں بار بار دہرائے گا ہر دلیل کے ساتھ کارآمد مثالیں پیش کرے گا اور سامعین کے دل میں جو اعتراض کھٹک رہا ہے اسے خود پیش

کرے گا ان جذبات کو ابھارنے کے بعد وہ ان کا تجزیہ کر کے ان کی تردید کر دے گا
تاکہ سامعین کا ذہن بھی آپ کے بھٹکے ہوئے چہرے کے تاثرات سے
اسے بتا دے گا کہ سب نے اس کی دلائل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

سامعین کو قائل کرنا کافی نہیں انہیں ایکٹ بھی کرنا ہوتا ہے

کسی موقعے پہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے ذہنی تصورات پر قابو پانے
کی ضرورت ہوتی ہے اس قسم کے تصورات زیادہ تر لاشعوری ہوتے ہیں ان لاشعوری
تصورات کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے نہ کہ عقل پر اس قسم کے ذہنی تصورات پر قابو پانا کسی
سوچی سمجھی رائے کو بدلنے سے ہزار گنا زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان کی بنیاد جذباتی
نفرت پر ہوتی ہے نہ کہ کسی غلط فہمی یا ناقص علم پر غلط فہمیاں اور جہالت کو سمجھ کر دور
کیا جا سکتا ہے لیکن جذباتی تعصب کو دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا ہے جینے کے لیے دلچسپی ہونی ان
حالتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے فقط جذبات ہی کو مشتعل کر کے کام لیا جا سکتا ہے
جذبات کو مشتعل کرنا تقریر سے ممکن نہیں یہ کام تقریر ہی کر سکتی ہے۔

میرے اس دعوی کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ کو کتنے پیتے مشروبات کے کئی
اشتہارات دیکھنے میں آئے ان میں سے کسی اشتہار میں تقریر اور فصاحت کا اچھا انتظام بھی تھا
ان اشتہارات کی فصاحت لاکھوں تک پہنچتی تھی وہ جو ان کے یہ اشتہارات عوام کو کوکا کولا
پیپسی مشروبات کا دشمن بننے سے نہ روک سکے مشہور مشروبات سال بہ سال اشتہارات اور
کتابوں کی بوچھاڑ کرتے تھے وہ پچھلے طبقے کے لاکھوں افراد کو اپنا ہمنوا بنا لیتی تھیں بتاتا
کہ پچھلے گھڑے پر پانی کی بوند اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ میں سے ایک بات ضرور سچی
تھی یا تو کوکا کولا پیپسی مشروبات کے اشتہارات میں جو دعوے شائع ہوتا تھا وہ سچ تھا یا کاروبار
تھا اور یہ عوام کے دلوں تک فقط تقریروں سے رسائی ناممکن ہے آج تک جو تقریریں اس
موضوع پر لکھی گئی ہیں وہ نفسیاتی عقل سے بالکل عاری تھیں ایسی تقریریں بے اثر
ثابت ہوتی ہیں۔

اخبارات کتابوں سے زیادہ موثر ہوتے ہیں

یہاں یہ اعتراض بالکل فضول ہے کہ مارکس ازم کے حامیوں کا زبردست رجحان محض ان کی تحریروں کے حقیقی ہے خاص طور پر مارکس ازم کی سب سے بڑی کتاب تو کاپل مارکس نے لکھی تھی اس کے لیے بڑی مفید ثابت ہوئی یہ اعتراض برلن کے بعض قوم پرست نورات نے پیش کیا ہے اس سے زیادہ سطحی دلیل آج تک پیش نہیں کی گئی یہ دلیل ایک خاص مطمئن پر مبنی ہے مارکس ازم کو عوام میں جو مقبولیت اگیز رجحان حاصل ہوا ہے اس کی وجہ پوری مطبوعہ کتاب نہیں جو یہودی کا عام فکری رجحان ہے بلکہ اس رجحان کی حقیقی وجہ وہ تحریری پروپیگنڈا ہے جو سالہا سال سے عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ہر ایک لاکھ ترین مزدوروں میں سے شاید ایک مزدور نے بھی مارکس ازم کی کتاب کا مطالعہ نہ کیا ہوگا اس کتاب کا مطالعہ زیادہ تر ذہین طبقہ اور خصوص یہودیوں نے کیا تحریک کے سرمایہ دار لوگ اس کتاب کا علم بھی نہیں یہ محض چند مزدور یا زیادہ تر کچھ طبقات سے تعلق رکھتے تھے یہ کتاب عوام کے لیے کبھی بھی نہیں لکھی گئی یہ کتاب تو یہودیوں کے تنظیم عالم کے منصوبے کے دانشور اور ذہین لیڈروں کی راہنمائی کے لیے لکھی گئی ہے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت وہ بالکل مختلف ذرائع سے جن میں اخبارات کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے۔

صحافت تب موثر ہوتی ہے جب واقعات سے اس کا ربط ہو

کھانے پینے کی اشیاء کے اخبارات اور مارکس ازم کے حامیوں کے اخبارات میں فرق یہ ہے کہ مارکس ازم کے حامی اخبارات انقلاب پیدا کرنے والے سرغنوں کے ہاتھ میں ہے برعکس اس کے کھانے پینے کی اشیاء کے اخبارات کی ساری تحریک پیشہ ور منصوبہ کاروں کے ہاتھ میں ہے اگر کسی جمہوریت کا حامی جو ہیبت ناک جلسہ گاہ سے اٹھ کر اپنی بیوی کی گود پر واپس آتا ہے اس کے لیے عوام کو مشتعل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے برعکس اس کے کھانے پینے کی اشیاء کے مضمون نگار اگر کبھی بھی میز پر جھک کر عوام

تک پہنچے گی تو عوام کے میلے کپڑوں اور پھٹے کی وجہ سے بدبو آتی ہے تجھے یہ کہہ دو تو بکواس ہے بے اثر ہوتا ہے۔

کمیونزم پھیلنے کا راز کیا ہے

مارکس ازم کی حمایت میں لاکھوں مزدوروں کی شہوت مارکس ازم کے حامی مفکروں لکھاریوں کے مذہبی ٹوٹن سے لکھے ہوئے مقالات کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اس زبردست پراپیگنڈہ کا نتیجہ ہے جو ہزار ہا ان تھک کارکن ہر وقت جاری رکھتے ہیں ان کارکنوں میں مختلف مزاج شوق پھیلانے والوں سے لے کر مزدوروں کی انجمنوں کے بھولے سے بھولے ملازم کامل اخبار مدیر ہیں اور رائے پر اثر کرنے والے بھی شامل ہیں علاوہ ازیں لاکھوں چلتے ہوتے ہیں جہاں منبر ہیں جلسوں پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریر کرتے ہیں ان جلسوں میں اپنے خیالات عوام کے ذہن نشین کرتے ہیں یوں انہیں ان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان کی نفسیات پر انہیں کافی مقررین عبور حاصل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں اب عمر ہتا ہے کہ اپنے مقاصد کا کامیاب پرچار کرنے کے لیے کس خاص وقت کون سے انتخاب مفید ثابت ہو سکتے ہیں اس پر اکتفا نہیں اس کے علاوہ وہ تقسیم الاوقات عوامی مظاہرے اور جلوس منعقد ہوتے ہیں جن میں بیک وقت ایک ایک لاکھ انسان حصہ لیتے ہیں ان سب باتوں کا اثر پڑتا ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد انسان کے دل میں بھی یہ فکر پیدا ہو جاتا ہے کہ گو میں زمین پر رینگنے والا ایک حقیر کیڑا ہوں لیکن میرا رشتہ ایک ایسے دیوتا سے ہے جس کی پرستار کے سامنے کھاتے پیتے طبقات ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے کروڑوں نے زمین پر کی تو آگ اور اس کے ٹکڑے نہیں جسم کر دیں گے چنانچہ آج کل ہماری کے قیام میں خونی فی الفور رونما ہو سکتی ہے فتح کی گھڑی قریب ہے۔

علم کلام ایک فن ہے

اس قسم کے پروپیگنڈہ کا لوگوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اشتراکی جمہوریت کے حامی مضامین کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں یہ کیل و دماغ ان اشارات کا اثر قبول

کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے مگر یہ تقریریں فیشن نہیں کرتے ملک میں نئی تقریریں چھاپی جاتی ہیں جہاں کھاتے پیتے طبقات کے ہاں پروفیسر صاحبان اور حاصل مضمون نویس اور تقریر نویس ہیں اور ہر قسم کے مضمون تخلیق فرمانے کی کوشش کرتے ہیں وہاں مارکس ازم کے حامیوں کے ہاں مقررین تصنیف کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں اس فن میں لمبا ترین تجربہ رکھنے والوں کو حاصل ہے عام طور پر یہ لوگ علم کلام میں مہارت اور بحث کو زور دار طریقے سے مطلب کے مطابق بنا لینے کی استعداد نہیں ایک موثر مصنف بنا دیتی ہے لیکن دراصل ان کا اسلوب یہاں ایک خطابی مقرر کا ہوتا ہے نہ کہ کسی مصنف کا۔

یہی وجہ ہے کہ کھاتے پیتے طبقات کے نمائندے عوام الناس میں کچھ ہونی نہ کر سکے انہوں نے عوام کو قائل کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی غرض یہاں بھی وہ روٹی اور رات کے بھوجن کا قصہ تھا۔

سورج چڑھتے وقت تقریر کا اثر کم ہوتا ہے

جذباتی تعصبات اور نسلی روایات و وجدانی کیفیات کو ہوا کر ان کی جگہ لے لینا بھرا ہوا صاف کام ہے اس کوشش میں کامیابی کا انحصار کسی ایسے حالات اور اثرات پر ہے جنہیں ڈیزائن کرنا اور بیان کرنا ممکن نہیں فقط ایک بات کی کسی مقرر نے حاصل کر لیا مالک ہونے کا انجام دے سکتا ہے ایسی کوششوں کو کامیاب بنانے میں یہ خیال بھی رکھنا ہوتا ہے کہ دن کے کون سے حصہ میں تقریر کی جائے ایک ہی تقریر کرنے والا ہو وہی تقریر کی جائے اور موضوع بھی ایک ہو تب بھی صبح کے اس بے اس کا اثر کچھ اور ہوگا۔ دوپہر کے اس سے کچھ اور اثر ہوگا اور شام کو کچھ اور ہی اثر ہوگا جب میں نے پہلے پہل مجمع عام کے سامنے تقریریں شروع کیں تو میں صبح دوپہر سے پہلے کا وقت عام طور پر مقرر کرتا تھا مجھے ایک مظاہرہ خاص طور پر یاد ہے جس کا انتظام ہم نے میونخ کے شہر میں کنڈن کمر کے ہال کے اندر منعقد کیا تھا اس مظاہرہ کا مقصد جرمن اشتراکیہ پر لعنہ و ملامت کے خلاف

یہ حقیقت ہے کہ بعض گھروں میں ایک شخص دوسرے پر بالکل اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں بعض گھریلو ہوئی باتیں یا کسی سابقی روایتیں بھی انسان کے ذہن میں تصویر کی طرح موجود رہتی ہیں اور اس کے دل و دماغ کے متاثر کرنے میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ایک ہی تجربہ کار مبلغ اگر اس شہر میں پیش کیا جائے جس کے قدیم حالات کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے تو وہاں اس کا اثر دوسرے کسی اور شہر سے بالکل مختلف ہوگا۔ جب کہیں میں وہاں کے معروف مقامات یا روایات کی جانب اشارہ ہوگا تو اس کا لطف کی اجنبی ماحول میں وہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

تقریر کرتے ہوئے اوقات کا خیال کیسے رکھا جائے

ان تمام مشکلوں میں مسئلہ یہ ہے کہ کسی دوسرے انسان کے ارادوں پر کہاں تک اور کن طریقوں سے قابو پایا جا سکتا ہے اس اصول کا اطلاق خاص طور پر عوامی جلسوں پر ہوتا ہے یہاں حاضرین کی قوت ارادی تقریر کرنے والے کے ارادے سے ٹکرا رہی ہوتی ہے مقرر کی خواہش ہوتی ہے کہ حاضرین کو قائل کر کے ایک نئے نظریہ کا معتقد بنا دے۔ صبح کے پہر اور دن کے وقت انسانی طبیعت کسی کی بات ماننے کے خلاف زور سے مزاحمت کرتی ہے۔ برعکس اس کے رات کے پہر میں جس کا ارادہ قوی تر ہو اس کی بات دوسروں کو ماننی پڑتی ہے سچ یہ ہے کہ ہر جلسہ میں دراصل دو مختلف قوتیں ارادی رکھنے والے فریقین کا دخل ہوتا ہے ایک شخص جو فن تقریر کا ماہر ہے اور جس کے اندر ارادہ کی قوت میں پختگی اور تیزی موجود ہے ان لوگوں کو زیادہ آسانی سے قائل کر سکتا ہے جن کی قوت مدافعت کمزور پڑ چکی ہو۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے قوی ارادی وہ بھی کو یہاں رکھیں نہیں قائل کرنا اور معتقد بنانا ذرا مشکل کام ہے۔

جلسہ گاہ میں روشنی کا انتظام بھی تقریر کے اثر میں فرق پیدا کرتا ہے

بعض مذہب کے گرجوں میں مصنوعی طور پر جو ہر سرد روشنی کا سماں پیدا کیا جاتا ہے اس کا بھی اصل مقصد یہی ہے [illegible] روشنی میں خوشبو ملکائی جاتی

ہے خوشبو ہلکا لے کے عجیب و غریب برتن استعمال میں لاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

فرض تقریر کرنے والے اور سننے والوں کے مابین جو رابطہ ہوتا ہے اس میں تقریر کرنے والا اپنی حیرت انگیز ذہانت سے پروپیگنڈہ کے نفسیاتی اثرات کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔ مگر اس کے ایک مصنف کو یہ فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملتا۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی شخص کے ذہنی رجحانات پہلے سے قائم ہو چکے ہوں تو مصنف ایسے رجحانات کو ابھارنے اور بڑھانے والے تقریر لکھ سکتا ہے اور اس میں کہ ان پر عمل کرنے کی خدمات انجام دے سکتا ہے تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی عظیم انقلاب کبھی خالی تقریروں سے پیدا نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ انقلاب کے ساتھ ساتھ تقریرات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

انقلاب ہمیشہ تقریر کے زور سے پیدا ہوتا ہے

یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انقلاب فرانس کا بنیادی تصور کی وجہ سے کیا جا سکتا تھا۔ یہ انقلاب دراصل شورش پھیلانے والوں کی ایک پوری فوج کام کر رہی تھی۔ اس فوج کی رہنمائی چند عظیم شان عوامی مقررین کر رہے تھے۔ یہ مقررین عوام کے جذبات کو ابھارتے تھے عوام کے جذبات خود بھی مشتعل ہو چکے تھے حتیٰ کہ یہ ہوا اٹھتے ہوئے لاوے کی طرح بھٹ پڑا۔ اس نے تمام یورپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حال ہی میں جو عظیم شان روسی انقلاب وہاں میں پایا اس کا بھی یہی حال تھا یہ انقلاب جن کے حامی مظلوم لوگوں نے برپا نہیں کیا بلکہ یہ انقلاب ان مقررین کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے ہر جگہ پہنچ کر مارکس کے اس عقیدہ کی تبلیغ کی جس کے ماننے والے مقررین کام کر رہے تھے جو ہر جگہ شورش پھیلا رہے تھے۔

روس کا بالشویک دور جس میں عوام کیرنسکی انقلاب کے حامی تھے کہ لینن نے کارل مارکس کے نظریات پڑھ لیے تھے مگر وہ اس لیے انقلاب کے حامی تھے کہ ان کے سامنے ایک جنت کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ یہ نقشہ اس عقیدہ کے حامی ہزارہا شورش

پڑھنے والوں نے عوام کے سامنے پیش کیا۔

عوام سے خطاب کے لیے عالمانہ اسلوب ہی موثر ہوتا ہے

اردو کے کلاسیکی مضمون نگاروں کی عادت تھی کہ محفل دیا سے بالکل جدا رہتے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک مضمون نگار کو ضروری ایک مقرر سے زیادہ وقار ہوتا ہے اس لیے وہ لکھنے کی صلاحیت کرتے ہوئے ایک فاضل نگار نے جن کا مضمون کسی قومی پرست اخبار میں چھپا تھا، یہ دلیل دی کہ بڑے سے بڑے مقرر کی تقریر بھی جب چھپ کر سامنے آتی ہے تو اس کا پول کھل جاتا ہے اس سے مجھے ایک اور مضمون یاد آگیا جو میں نے دو برس تک مطالعہ کیا تھا۔ یہ مضمون ایڈیٹ جارج کی نگارش کے متعلق تھا۔ ایڈیٹ جارج تب برطانوی کابینہ میں کلیدی وزارت کی تیاری کا وزیر تھا اس مضمون میں ایڈیٹ جارج کی نگارش کا تجزیہ کرکے ثابت کیا گیا تھا کہ مضمون نویس نے یہ فیصلہ دینے کی جرأت کی تھی کہ ان نگارشوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مقرر کی ذہانت اور علم نہایت ناقص ہے۔ ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نگارشیں بالکل فی البدیہہ اور عالمانہ ہیں۔ میں نے خود ان نگارشوں میں سے چند جو ایک رسالے کی صورت میں مطبوعہ تھیں فراہم کیں ان کے مطالعہ کے بعد مجھے ان لوگوں سے ہمدردی آئی کہ یہ بیچارے جن مشکل حالات میں اپنے کام میں سرگرم رہے کلم بھی سکتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ نگارشیں عوام کو سیاسی پہلو سے متاثر کرنے کے فن میں کیسے تجربہ کار اور ہوشیاروں کی حیثیت رکھتی ہیں اس شخص نے ان تقریروں پر محض اس لیے نکتہ چینی کی تھی کہ خود اس کے دماغ و زبان پر ان کا اچھا اثر نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس عالی مرتبہ برطانوی مقرر کی تقریروں نے اس کے سامعین پر بڑا اثر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان نگارشوں کا اثر تمام تر دیہاتی آبادی پر ہوا تھا۔ اس نگاہ سے دیکھا جائے تو اس مقرر کی یہ تقریریں زریں کارنامہ کہلانے کی مستحق ہیں کیونکہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کو عوام کی روح سے کتنا گہرا رابطہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان نگارشوں کا اثر آخری دم تک برقرار رہا۔ جب ان نگارشوں کے مقابلہ میں ڈارڈینل کے دوران جنگ کے وزیر میں ہوگ کے

ہے اثر تقاریر ہوتی رہیں سے ہوا ہونے والے ارشادات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے ذہن
بے ساختہ ہر مسلم وزیر اعظم کی تقریریں بہتر ہدایات کی آئینہ دار ہیں لیکن یہ بے موقع
ہدایت یہ ثابت کرتی ہے کہ ان صاحب کو عامۃ الناس سے بات کرنے کی تمیز نہیں یہ
مقصد ہے کہ وہ عوام کے سامنے تقریر نہیں کر سکتا تھا باوجود اس کے ایک ہوشیار وزیر
ہر مسلمان مصلحت کا پورا وقت ضائع کیا جس میں بے شمار سائنس کا علم تھا۔ یہ جاننے
وزیر کی تقریروں کا اثر عوام پر کیا ہوگا اس کا اندازہ بڑے لحاظ سے ہوں گا لیکن
ہے کہ خود اس پر ان تقریروں کا کیا اثر ہوا ہے کہ اس کا ذہن تقریری علم کی بلندی سے
ملک ہو چکا ہے ایسے ذہن مصلحت کے لیے یہ بھی عرفا کہ وہ اپنے ذہن پر اثر ہے کے
ساتھ اس تقریر کا مقابلہ ذہن وزیر اعظم کے علمی لحاظ سے پست پچی تقریر کے ساتھ کرتا۔
جو ہے وہ تقریر عوام پر کیا اثر ہوا ہے اثری کیوں نہ ثابت ہو چکی ہو سے تو یہ بیان تھا کہ خود
اسے کون سی تقریر زیادہ موثر معلوم ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ذہن
صرف دو میں بات کے کسی طرح نہ تھا بلکہ اس سے ہزار درجہ زیادہ قابل تھا اس کا
ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی تقریر ایسے لہجہ سے کرتا تھا جس کے باعث عوام
کھول کر اس کی بات سنتے تھے وہ بلکہ کھلے طور پر اس کی اطاعت کرتے تھے یہ ٹھیک ہے
کہ تقریروں کا اندازہ کل عامیانہ تھا لیکن ان کے اس عامیانہ پن اصطلاحات کی تازگی
مثالوں کی سادگی سے اور بے جھجکی سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ اس انگریز کی سیاسی
قابلیت کس حد تک درجہ کی تھی۔ جب کوئی سیاسی مدبر اپنی قوم کے سامنے تقریر کرتا ہے تو اس
تقریر کو جانچنے کا معیار یہ نہیں کہ اس کا اثر یونیورسٹی کے پروفیسروں پر کیا ہوگا۔ بلکہ معیار
تو یہ ہے کہ اس کا اثر عوام پر کیا ہوگا۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس سے کسی تقریر کرنے والے کی
صحیح قدر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تحریک کے قائدین کی تربیت کا کام لیڈر کا ہے

پچھلی سال گذرے ہماری تحریک بالکل نہیں تھی اس تھوڑے سے عرصہ میں اس

تحریک نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے آج اندرونی اور بیرونی دشمن اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اس ترقی کی وجہ فقط یہ تھی کہ ہم نے بیان کردہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھا۔ اور ان پر عمل کیا۔

ابتدائی تحریک میں تقریروں سے کام لیا گیا۔ لیکن جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں تب تقریروں سے فقط یہ کام لیا جاتا تھا کہ تحریک کے چلانے والے تاجرین کو جس قسم کی ہدایت دی جائے۔ ان تاجرین میں صف اول اور دوسری صف دونوں اقسام کے ممبر شامل تھے ہم اپنے عام خریداروں کو قائل کرنے کے لیے تقریر سے کام لیتے تھے یا تو وہ ہماری دکان پر آ کر کوئی پمفلٹ یا اخبار کی مجبوریت کا حامی یا کیٹلاگ فقط ہمارا کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ کر ہمارے ضابطہ حیات کی تعلیم پانے پر آمادہ ہو گیا ہو یا اس نے خود اپنے ضابطہ حیات پر کاربند ہونے کا از خود قبول کر لیا ہو۔ ایک اخبار کا کئی سو خریدار مقابلہ کیا جاتا ہے جب وہ چھپنے والے کی سیاسی پارٹی سے متعلق ہو لیکن ان اخبار پڑھنے سے کوئی حاصل نہیں ہو جاتا وجہ یہ ہے کہ کسی اخبار کا خریدار ایک پڑھا لکھا آدمی ہی تحریک کا جو عام نقشہ ذہن میں آتا ہے وہ اس سے حاصل ہو رہا ہوتا ہے کہ اس سے کسی مخصوص اخبار پڑھنے والے کی رائے نہیں مل سکتی۔ پھر جس شخص کو اپنے ایک ایک گاہک کے خرچ کا حساب رکھنا ہو اس سے تو یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے کہ وہ صرف دلچسپی کے پہلو سے واقفیت کی خاطر اپنے مقصود کے خلاف اخبار کا وہ خاصہ خرچ برداشت جائے گا تحریک کا اخبار وہی شخص باقاعدہ پڑھتا ہے جو تحریک کا رکن بن چکا ہو۔ وہ اخبار کا مطالعہ اس لیے کرتا ہے کہ اسے پتہ چلتا رہے کہ تحریک میں کیا ہو رہا ہے۔

تحریک کے اشتہارات ایسے لکھے جانے چاہئیں کہ منہ بولتے نظر آئیں

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا اطلاق منہ بولتے اشتہارات پر نہیں ہوتا خصوص کر یہ اشتہارات مختلف قسم ہو جائیں تو تحریک ایک طرف ہی چلے گی اور اس شخص پڑھنے کے

پہلے لیتا ہے شرط یہ ہے کہ اشتہار کا مضمون کسی ایسے مسئلہ کے متعلق ہو جو ان دنوں زبان زد خاص و عام ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی اشتہار دینے والا اس پر تھوڑی بہت توجہ دے کر پبلک رائے یا ذہنی میلان میں تھوڑی بہت ترمیم کر لے اور نئی تحریک پر توجہ دینے لگے۔ لیکن یہاں پوری کامیابی کی صورت میں بھی تحریک سے تھوڑی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ مقابلہ میں کوئی واضح فرق نہیں آئے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اشتہار فقط کسی موضوع کی جانب توجہ دلا سکتا ہے اشتہار کا فائدہ خیال یہ ہے کہ اس کا بار بار دیکھنے والا بعد میں کسی ایسی صورت عمل میں شامل ہونے پر آمادہ ہو جائے جس سے زیادہ واقفیت بہم پہنچا کر اس کی مقداری راہنمائی کی جا سکے۔ یہ راہنمائی صرف کسی جلسہ عام میں ہی مہیا کی جا سکتی ہے۔

تحریک کے لیے جلسے اور عوامی مظاہرے بھی ضروری ہیں

جلسہ ہائے عام اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ان میں شمولیت کے بعد ہر شخص پہلے صرف تحریک کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے وہ اپنے سابقہ رفقاء سے کٹ کر تنہا رہ جانے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ جلسہ میں شامل ہوتا ہے تو پہلی مرتبہ اسے ایک نئی معاشرتی تنظیم کے وجود کا احساس ہوتا ہے اس احساس سے اسکو لوگوں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے اور اس میں تقویت آ جاتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی جلسہ یا ریلے میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جوش و خروش دکھاتا ہے تو پھر اس کے لیے دشمن کے مقابلہ پر قبضہ کرنا پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو جاتا ہے اسی طرح جلسہ کے ہجوم میں بیٹھا ہوا ایک شخص ایک قسم کی یکجہتی محسوس کرتا ہے اس احساس کے خلاف کی تدبیریں دی جا سکتی ہیں۔

وسیع پیمانے پر منائے جانے والے عوامی مظاہرے نہ صرف ہر کسی کا دل بڑھاتے ہیں بلکہ سے تحریک کے قریب لاتے ہیں بلکہ ایک جنبی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں جو شخص پہلی مرتبہ کسی ایسے مظاہرے کا حامی بن کر اس میں شامل ہوتا ہے جہاں اس کی دکان یا

کا رتبہ ہے وہ پہلے دل میں ٹھہرتا ہے۔ اسے اس وقت اپنے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک انسان بہت سے انسانوں کے گروہ میں شامل ہو کر محسوس کرتا ہے عوامی مظاہرے اس گروہ کی حکمت اس کے دل پر نقش کر دیتے ہیں وہ جو کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے پر ایک عام شخص ہے اپنے کو نہایت حقیر تصور کرتا ہے پھر جب وہ پہلی مرتبہ کسی جلسہ عام میں داخل ہوتا ہے اور چاروں جانب اپنے ہم عقیدہ افراد کو دیکھتا ہے تو اسے بڑی تسلی ہوتی ہے اسی وجہ سے اس میں اثر پذیری کا مادہ اس میں سرایت کر جاتا ہے تو اسے اور بھی حوصلہ ہو جاتا ہے۔ جوں جوں وہ چار ہزار لوگ کسی شخص کے چاروں جانب جمع ہوں وہ ہوں ان کے جوش و خروش سے یہ جماعتی تاثر با آسانی پیدا ہو جاتا ہے اگر ہزارہا لوگوں کا یہ اتحاد کامیاب بھی ہو جائے تو اسے بخشیں ہو جاتا ہے کہ کسی تعلیم یافتہ ہی انسان نے ایسے موقع پر اس کے دل میں ان معتقدات کے خلاف پہلی مرتبہ شک پیدا ہوتا ہے جنہیں وہ آج تک مانتا آیا تھا۔ اس کے بعد وہ جماعتی سوچ کے اسیر کا شکار ہو جاتا ہے تب ہزار ہا لوگوں کی قوت ارادی اس کی قوت ارادی اور اس کی عقل پر ایک فرد میں داخل ہو جاتی ہے تو لوگ ہی جلسہ گاہ میں ٹھک وٹھ سے داخل ہوتے ہیں وہ یہاں سے تخیل حاصل کر کے واپس جاتے ہیں اور وہ اس کی سحر اثرت کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں۔

کھوکھلی لیاقت وبال جان بن جاتی ہے

قوم پرست اشتراکی تحریک نے کبھی اس اصول کو نظر انداز نہیں کیا اس تحریک نے کبھی ان کھاتے پیتے گھروں کی رائے نہیں مانی ان کا قول ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں لیکن ہمارے نے اپنی ذہانت سے ایک عظیم سلطنت ضائع کر دی، خود ایاہو جو ادھر و ادھر ڈال دیا ہو اپنے طبقہ کی برتری سے بوکھلا جاتے ہیں۔ ان کی لیاقت سے ان کی جان پر بن گئی ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں اس وہ ایک ہی محور میں دائر ہو گئے ہیں وہ ان قوم کو مارکس ازم کا پابند ہونے سے نہیں بچا سکتے یہ وہ عقیدہ ہے

جس میں داخل ہوتے ہی ان کے درمیان خلا ہو جاتے ہیں اور ان کی حالت قابل رحم
بن جاتی ہے۔ انہوں نے خود اپنے متعلق جو رائے قائم کر رکھی ہے وہ ان کے کلمہ کلام سے
ہے ان کے غرور اور رعونت دونوں کی جڑیں یکساں گہری ہیں۔

اگر یہ لوگ آج بھی تقریر کی ہدایت کو سمجھ لیتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں
نہیں محسوس ہو چکا ہے کہ خود ان کی تقریروں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ہفتم :: سرخ طاقتوں سے تصادم

تحریک کے لیے ہنگامہ آرائی بھی ضروری ہے

1919ء سے لے کر 1921ء تک ہر سال میں نے کمانے پینے طبقات کے بعض جلسوں میں شرکت کی میں جب بھی ان جلسوں میں شریک ہوا مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو بچپن میں رمضان کے مہینے میں پینے وقت مجھ پر وارد ہوا کرتی تھی یہ زور کی بھوک لگا کرتی تھی کیونکہ اس سے مجھے کامل روزہ رکھنے کی توقع ہوتی تھی لیکن یہ زور کی بھوک تھا یقیناً نہایت مضر۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ جن قوم کے کارندے سے باندھ کر ہر ایک زیردست کھلی کر کمانے پینے طبقات کے جلسوں میں لایا جاتا، اور پھر وہاں مشتعل تقریروں کے پیچھے بند کر دیا جاتا جلسے کے اختتام تک کی وہ اس کی عبادت نہ ہوتی تو پھر شاید چند سال بعد ان جلسوں کا قوم پر کچھ اثر ہونے لگتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں صاف گوئی سے اعتراف کرتا ہوں کہ اگر ایسے حالات رونما ہو جاتے تو میں زندگی بھر کے لیے توبہ کر لیتا۔ مجھ میں جن قوم سے وابستہ رہنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہتی۔ خدا کا شکر ہے کہ صورت حال ایسی نہیں ہے۔ کچھ اور ہوش و حواس قائم رکھنے والے عوام کمانے پینے طبقات کے ان جلسوں سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیطان سے رحیم سے بھاگتا ہے۔

میں کمانے پینے طبقات کے ضابطہ حیات کے علمبرداروں سے تعارف ہوا مجھے ان کے جو حالات معلوم ہوئے ان سے مجھے ذرا حیرت نہ ہوئی مجھے پہلے سے علم تھا کہ یہ حضرات قوم کو کچھ بہت نہیں دیتے۔ ان دنوں میں نے جمہوریت پرستوں، قوم پرستوں، قومی پارٹی اور لیبر پارٹی کی قومی جماعت (لیبر پارٹی کی معتدل جماعت) کے جلسوں میں شرکت کی سب سے پہلے مجھے جس حقیقت کا احساس ہوا وہ یہ تھی کہ سب جگہ

حاضرین کی ایک ہی کیفیت تھی نظر یا بہ جگہ حاضرین صرف پانی کے اراکین ہی مشغول ہوتے تھے مقرر کو اس قسم کا تھا کہ جیسے بارگاہ کی محفل میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ جلسے کسی اور قوم کے جلسے نظر آتے تھے ہوا ہی میں ایک عظیم تقاب سے دوچار ہو چکی ہے مقررین کا جہاں تک بس چلتا وہ بھی یہی کوشش کرتے کی محفل کے سکوت میں فرق نہ آئے۔ یہ حضرات اس طرح تقریر کرتے گویا کسی عبادت کا مضمون پڑھ رہے ہیں۔ یا کوئی فلسفیانہ مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ ہر قسم کے ہوشیلے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے تقریر میں چلتے چلتے کسی جگہ موقع یا ضرورت بھی جاتا۔ تب ایک مزاحیہ جملہ سے آتی تو مقرر کی میز کے سامنے بیٹھنے والے لوگ بڑی فرض شناسی سے دانت نکال دیتے۔ مسکرانے میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی جاتی کہ کہیں قہقہے کی آواز نہ نکل جائے کسی دانا یوں ہی مقرر کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ہولے سے تالیاں کے لوگوں کی طرح بڑی تمکنت سے دو ہونٹوں پر شگفتگی کے آثار کھیل جاتے۔

ایک ناکام جلسے کا نقشہ

یہ مقرر کی میز کے گرد بیٹھنے والے لوگ جہاں ضرور موجود ہوتے تھے ایک دفعہ میں ایک ایسے جلسہ میں شریک ہوا جو میونسپلٹی کے شہر کے دیگر ہال میں منعقد ہو رہا تھا یہ ایک عوامی مظاہرہ تھا جو جنگ بند رکنے کی خوشی منانے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی، کہہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریر کی تھی۔ یہ مقرر کسی یونیورسٹی کے بزرگوار قسم کے پروفیسر تھے پلیٹ فارم پر محفل منعقد تشریف فرما تھی۔ جناب صدر کی دائیں جانب جو صاحب بیٹھے تھے انہوں نے ایک آنکھ کی جھپک لگا رکھی تھی جناب صدر کی بائیں جانب جو بزرگ بیٹھے انہوں نے بھی ایک آنکھ کی جھپک لگا رکھی تھی جناب صدر کی آنکھوں پر کوئی پوشیدہ تقاضا تھا جس حضرت نے یہ دلچسپ قسم کا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا کسی جج کی عدالت میں حاضر ہوں جہاں سزائے موت کا اعلان کیا جانے والا ہے دروازے چاروں جانب سکوت چھایا ہے دفعتاً جا

جلسہ منعقد کرنا بھی جنگ سے کم نہیں

شروع ہی سے ہم نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہمارے جلسوں میں عوامی تنظیم و نظم کا انتظام رہنا چاہیے۔ صدر کے دائیں بائیں کی نشستیں باقاعدہ ترتیب سے ہونی چاہیے۔ ہم کھاتے پیتے لوگوں کے جلسوں کی طرح اپنے جلسہ میں صدر کی جھاگ سے گلگین پلیٹیں بانٹا کرنا نہیں چاہتے تھے ہم تو یہی کہتے تھے کہ ہمارے جلسہ میں کوئی مخالف بیٹھا ہوا تو کہہ اٹھے ہمارا کیا ہوا کہ ہمارے جلسہ میں مخالفین کی تعداد بڑھ گئی ہے" ہمیں چند سر لے ان کی راہنمائی کے لئے ان کے سر ہونے ان کے چہروں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آج ہی سارا قصہ یہیں ختم کر کے جانے کا ارادہ نہیں کئے۔

ہاں ہوں کی مرتبہ ایسا ہوا کہ سرخ جھنڈے کے علمبردار کیڈر خود ہمارے جلسوں کو ہیشہ کے لئے ختم کر دینے کی نیت سے آئے کہیں سے یہ منصوبے پہلے سے بنا رکھے ہوتے تھے کہ جہاں جلسہ منعقد ہونے میں تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی لیکن ہمارے صدر کے سنگدل ارادے اور ہمارے جلسہ کے منتظم رضا کاروں کے جذبہ شوق نے جلد ہی فریقوں کے مزاج ٹھکانے لگا دیے۔ بے شک ہمارے حریف اگر ہم سے ناراض ہوں تو وہ اس معاملہ میں حق بجانب ہیں۔

مخالفین کو بھی متوجہ کرنا چاہیے

کیونسٹوں کو ہمارے جلسہ میں گھس آنے کی پہلی مہم یہ تھی کہ ہم نے اپنے اشتہار سرخ رنگ میں چھاپے تھے عام کھاتے پیتے لوگ یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے بھی باشندوں کا سا رنگ استعمال کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں کوئی راز پنہاں ہے جس کو عوام کی پست طبقوں میں کانا پھوسیاں شروع ہو گئیں کہ یہ بھی مارکس ازم کے حامیوں کا ایک فرقہ ہے۔ یہ تو مارکس ازم کے حامی ہیں جو جلسوں میں دخل کر دیا کرتے ہیں ممکن ہے سوشلسٹ ہوں۔ یہ لوگ تو آج تک مارکس ازم اور سوشلزم کا فرق نہیں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ہمارے جلسوں میں جو تقریریں کو خطاب کرتے ہوئے ہوں یا ہمارا

جاتا ہے کہ "ہے ہم وطن مرد اور عورتو" کھاتے پیتے لوگوں کی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ "خواتین و حضرات" ہماری پارٹی کے اراکین بھی ایک دوسرے کو "ساتھی رفیق" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو انہیں پتہ نہیں ہوتا کہ یہ تو کیا کہتے ہیں۔ ہم ان دنوں کھاتے پیتے لوگوں کی باتیں سن کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے یہ غریب ہماری تحریک کی بنیاد اور اس کی نیت اور ہمارے مقاصد کو سمجھ کر کے اطمینان میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

ہم نے سرخ اشتہار چھاپنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے خیر خواہوں اور ہمدردوں کا حلقہ بڑھانے کے بعد کیا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ ان کمیونسٹوں کو جانیں، انہیں ہماری جانب توجہ ہو۔ ہی ہمارے جلسوں میں "نہیں" کچھ دلچسپی نہیں کر یہ ہمارا جلسہ خراب کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں لوگوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کا موقعہ ملے۔ ان دنوں ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ ہمارے مخالف کس طرح ہر بار اپنی جان ہارتے تھے وہ بے چارے ہمیشہ اچانک ہو کر جیت رہ جاتے تھے پہلے تو انہوں نے ہمیں دنوں سے پہلے کی کہ ہمارے جلسہ میں کوئی نہ جائے اور ہمیں نظر انداز کر دیا جائے عام طور پر ان کی اس چال پر عمل کیا گیا۔ جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے حامی ہماری صفوں میں شامل ہونے لگے اور انہوں نے ہماری تعلیمات کو قبول کر لیا تو ان کی اس چال پر عمل کیا گیا۔ جب وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے حامی ہماری صفوں میں شامل ہونے لگے اور انہوں نے ہماری تعلیمات کو قبول کر لیا تو ان کے لیڈروں کو بے چینی اور اضطراب محسوس ہوا۔ ان کا بیان تھا کہ یہ صورت حال برداشت نہیں کی جا سکتی اور یہ ضروری تھا کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔

ایک کامیاب تحریک کس طرح ترقی کرتی ہے

تب "وجدانی شعور رکھنے والے کارکنوں" سے اپیل کی گئی کہ وہ ہمارے جلسوں میں کثرت سے شامل ہو کر ہمارے مقررین کے "کئے سے زیادہ ناپسندیدہ نعروں" کی اس

تحریک کو کچل کے رکھ دیں۔

چونکہ ہماری جلسہ گاہ جلسہ شروع ہونے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی مزدوروں سے پر ہو گئی۔ ان انتظامات کی کیفیت یہ ہوئی تھی کہ گویا وہ روٹی بھری ہوئی بوری رکھی ہے اور پاس ہی ملکتا ہوا جیتا بھی موجود ہوتا تھا لیکن نتیجہ ہمیشہ ان کی توقعات کے خلاف نکلتا جو لوگ ہمارے اجلاس کی حیثیت میں آتے تھے وہ جاتے وقت اگر ہماری تحریک میں شمولیت پر آمادہ ہو چکے ہوتے تو کم از کم اپنے اعتقادات پر تنقیدی نگاہ ڈالنا ضرور شروع کر دیتے۔ آہستہ آہستہ مہینوں میں وقت گذرتا گیا میری تقریر اور نیز کمیٹی کی تجویز پر ہم نے دو سو سے زائد ہوٹلوں کو بند کرا کے ہمارے ہزاروں کی ایک جلوسی جماعت کی صورت میں مظاہرہ کرایا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے مخالف قائدین ڈر گئے انہوں نے وہ حیلے ترک کر دیئے تھے پھر ہمدردی رجوع کی انہوں نے چوتھی مرتبہ پارسوئی کا جلسہ کیا پھر ایک مرتبہ اعلان جاری کیا کہ مزدوروں کو ہمارے جلسوں میں شرکت کرنی نہ چاہیے۔

جب ہمارے جلسوں میں مزدوروں کی آمد ایک مرتبہ پھر رک گئی۔ یا اگر وہ آتے تھے تو بہت تھوڑی تعداد میں لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد کھیل از سر نو دہرانا شروع ہو گیا مزدوروں نے ہمارے جلسوں سے دور رہنے کی ہدایت نظر انداز کرتے ہوئے پھر ان میں شمولیت شروع کر دی کیونکہ روز بروز ان کی تعداد میں ہمارے کارکن بننے لگے حتیٰ کہ پھر "کھیل قدیم" کا پیدا کیا گیا ہوا جماعت کو تتر بتر کر دینے کا حکم جاری ہو گیا۔

کسی کامیاب تحریک کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے

باوجود اس کے وہ تین دن پھر "نو جملے" منعقد ہو چکے تو ان میں اندازہ ہو گیا کہ جلسے توڑنے کا حکم دینا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرانا دشوار مشکل ہے ہر جلسہ کے بعد سرخ افسر کی طاقت زیادہ کمزور ہوتی جاری تھی دفعتاً پھر یہ ہدایت جاری کی گئی کہ اگلے جلسے سے کیونکہ مرد اور عورتیں ان قوم پرست شدھی کی شورش پیدا کرنے والوں کے جلسوں

میں ہر گز مت جایا کرو۔

سرخ انبارات نے بھی اس قسم کے مرتبے دری دری استعمال کرنے شروع کیے۔ جب بھی وہ ہمیں خاموش کرانے کی کوشش کرتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ یہ ہمیں ہے بلکہ انہوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے اور ہماری مزاحمت کا مقصد صرف یہ تھا کہ مزدوروں کی نگاہ میں ہمیں مستقل حیثیت حاصل ہو جائے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہمارا تو کچھ گزرتا نہیں ان کا بھی کام ہو رہا ہے لوگ پوچھتے تھے کہ جب موضوع مستقل نہیں ہے تو اس پر تقریر کی اتنی کیا ضرورت ہے تب لوگوں میں ہمارے متعلق تجسس شروع ہوا اس پر انبارات نے اپنے عملے کی صورت میں کچھ عرصہ ہم سے یہ سلوک کیا گیا کہ ہمیں ہی نوع دم کا دشمن اور مجرم قرار دے دیا گیا مقالہ پر مقالہ شائع ہو رہا تھا ہر مقالہ میں ہمارے مجرمانہ اعمال کی نئی تفصیل درج ہوتی تھی ان الزامات کی تائید میں لمبے چوڑے ثبوت مہیا کیے جاتے تھے۔ وہ باتیں کھولی گئیں جو سربستہ راز کی پردہ پڑی ہوئی تھیں ہمارے خلاف تحریک کی جاتی تھیں اس انبارات کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں لوگوں میں بدنام کر دیا جائے۔

دلیری اور جرات کے بغیر کامیابی نہیں ہوتی

ان دنوں میں نے یہ موقف تیار کر رکھا تھا کہ جو بے وہم ہر چیز میں ہو ہے جانبدار کیسے ہو سکتا ہے ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ہمیں کھڑا نہیں کر سکتے تھے اور ہم پر توجہ دینے کے لئے مجبور تھے۔ رفتہ رفتہ مزدوروں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ صرف ہم ہی ایک ایسی جماعت ہیں جو ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اس پر کہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہودی انبارات کے پیروؤں کو پتہ چل جائے گا کہ ہم کون ہیں اور اصل کیا چاہتے ہیں۔

کمیونسٹوں کو اگر ہمارا کوئی جلسہ منتشر کرنے میں کامیابی نہ ہوتی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے لیڈر اپنے جذبہ کے بزدل تھے جب بھی وقت آیا تو وہ لڑنے مرنے کا

کام اپنے چھوٹے موٹے ہاتھوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر خود میدان سے بھاگ جاتے تھے پھر وہ ہال سے باہر ایک طرف کھڑے ہو کر یہ انتظار کرتے تھے کہ جلسہ منتشر ہو جائے تو تماشہ دیکھیں گے۔

مخالفین کی صفوں میں جاسوس بھیجنے چاہئیں

ہمیں اپنے حریفوں کے ارادوں کا پہلے خوب علم رہنا چاہئے اس کی دو وجوہات تھیں اول تو ہم نے اپنی پارٹی کے کئی ارکین کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اسی مصلحت کی خاطر سرخ جماعتوں کے رکن بنے رہیں دوسرے سرخ جماعتوں کے لیڈر ہماری خوش قسمتی سے ایسے واقع ہوئے تھے کہ جو کچھ کرنا ہوتا تھا پہلے ہی اس کا پروگرام بنا لیتے تھے وقتی پن کی یہ عادت بدقسمتی سے سرخ لیڈروں میں عام ہے ان لوگوں سے کوئی چیز چھپا کر نہ رکھی جاتی تھی وہ اپنی مرغی کی طرح یہ حضرات چوزے نکلنے سے پہلے ہی کڑکڑانا شروع کر دیتے تھے لہٰذا ہر موقع پر ہم اس بیانیہ پر اعتبار کیا کرتے تھے کہ سرخ لیڈروں کو یہ علم ہی نہ ہوتا تھا کہ گڑبڑ مچانے کی پہلی کوشش ہی انہیں کس طرح جلسہ سے باہر نکال پھینکا جائے گا۔

پولیس کے بھروسے پر جلسہ منعقد نہیں کیا جا سکتا

اس حالات نے مجبور کر دیا کہ ہم اپنے جلسوں کی حفاظت خود کریں سرکاری حفاظت پر تکیہ نہ کیا جا سکتا تھا تجربہ سے ثابت ہوا کہ پولیس ہمیشہ جلسہ خراب کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے سرکاری حفاظت کا ہمیشہ ایک ہی پہلو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ پولیس والے کھڑے ہو کر اعلان کر دیتے ہیں کہ اب جلسہ ختم کیا جا رہا ہے حالانکہ جلسہ ختم کرانا ہی ہمارے مخالفین کا اصل مقصد ہوتا تھا۔

عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں پولیس نے جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا وہ سرکاری مداخلت کی صحیح مثال ہے۔ جونہی انہیں اطلاع پہنچتی کہ کوئی جلسہ منعقد کرنے کی کوشش کی جائے گی وہ [illegible] جلسہ ختم کرنے والوں کو گرفتار کرنے

کی بجائے جلسہ منعقد کرنے والے بے گناہوں کو پیشور دے جیل جاتے کہ "جلسہ ہم کیوں کرتا ہے" پولیس اپنے اس اقدام کی وضاحت یوں کرتی تھی کہ "امن و امان کے خطرے کے پیش نظر یہ اقدامات کی جا رہی ہیں۔"

پولیس کی حفاظت میں جلسہ منعقد کرنے سے عوام کی ہمدردی ضائع ہو جاتی ہے

نتیجہ یہ تھا کہ شرفا کی سیاسی سرگرمیاں ہمیشہ پچھلے دروازے چھوٹے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی تھیں جو مار دھاڑ کرتے رہتے تھے۔ سرکار تو اس کے ہاتھ پر ان غنڈوں کے سامنے جھک جاتی اور رعایا کو حکم دے دیتی کہ خواہ مخواہ غنڈوں کو مشتعل کرنے کا کیا فائدہ ہے جب قوم پرست شہری کسی جگہ جلسہ منعقد کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے، اور مزدوروں کی یونین اعلان کر دیتی کہ وہ یہ جلسہ منعقد نہ ہونے دیں گے تو حکومت ان غنڈوں کو گرفتار کرنے کی نہیں سوچتی۔ اسلئے پولیس ہمارے جلسے کی ممانعت کا اعلان کر دیتی ہے قانون کی خلاف ورزی ہمیں ایک بے شرم تھی کہ اسے ایسے موقعوں پر ہمیں کھلم کھلا حکم دینے سے کبھی عار نہ تھا۔ ان حالات میں یہی علاج تھا کہ جلسہ خراب کرنے کی ہر کوشش کو جڑ سے پہلے ہی اکھاڑ دیا جائے یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ جو جلسے پولیس کی حفاظت میں منعقد کئے جاتے ہیں وہ عوام کی نگاہ سے جلسہ منعقد کرنے والوں کی قدر و منزلت گرا دیتے ہیں۔ جو جلسہ پولیس کی حفاظت کے بغیر منعقد نہیں کیا جا سکتا اس کے ذریعہ کسی مخلص کو تحریک کا مقصد بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر عوام کے کچھ طبقہ کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں تو ایک بڑی جماعت میں اتنی عداوت بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی ہمدردی کا مستحق بھی ثابت کرے۔ جس طرح ایک عورت ایک بزدل کے مقابلہ میں ایک دلیر مرد کو پسند کرتی ہے اسی طرح عوام کے قلوب پر بھی ایسی ہی جماعت کا سکہ بیٹھتا ہے جو شجاعت کے راہ سے آراستہ ہو۔ وہ کسی ایسی عمدہ تحریک کا آغاز نہیں کر سکتے جو [illegible] کے لئے بھی پولیس کی امداد کی

حق ہے۔

جلسہ خراب کرنے والوں کا مقابلہ کیسے کرنا چاہیے

یہی وجہ تھی کہ ہماری نوزائیدہ تحریک کو خاص طور پر اپنا وجود قائم رکھنے کے قابل بنانا نہایت ضروری تھا ہم مداخلت تو کرنا چاہتے تھے، اپنے مخالف سرخ عناصر کا مقابلہ کامیاب بنانے کی کوشش بھی خود ہمارے ہی ذمہ تھی۔

ہمارے جلسوں کے لئے حفاظتی قوت کی تنظیم سب سے پہلی ضرورت تھی

اپنے جلسہ کو پرامن رکھنا اور ہر قسم نفسیاتی تاثر کا ایک خاص معیار قائم رکھنا کہ اس میں کوئی مداخلت کارگر نہ ہو۔

یہ تنظیم رضا کاروں کے لیے وردیاں فراہم کرنا جو ضرورت پڑے تو نظم و ضبط قائم رکھ سکیں۔

ان دنوں ہمارے جلسوں میں صورت حالات پر صرف ہمارا ہی قابو ہوتا تھا۔ کبھی ایسا موقعہ نہیں آیا کہ ہم نے کسی دوسرے کو اپنے جلسے پر قابو پانے دیا ہو۔ ہمارے مخالفین خوب جانتے تھے کہ جہاں ہمارے مخالف کبھی کی طاقت کیوں نہ فراہم کر لے، جونہی انہوں نے ہمیں دار الشتعال دلانے کی غرض سے جلسہ گاہ سے باہر پھینک دیا جائے گا اس وقت ہم جلسے میں تاثر کے علاوہ دوسرے مقامات پر منتظر کرتے تھے وہاں کھڑی ہوئی سو یا آٹھ سو مخالفین کا سامنا ہوتا تھا۔ ہماری قوم پرست اشتراکی پارٹی کے صرف پندرہ سولہ ارکین ان کے سامنے ڈٹ جاتے تھے باوجود اس کے کہ ہم کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے ہم جانے اپنے مخالف کے پیچھے جان دینے پر آمادہ ہوتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ ہماری پارٹی کے مٹھی بھر ساتھیوں نے سرخوں کے ایک پورے جتھے اور مشتعل ہجوم کا تنہا مقابلہ کیا یہ ٹھیک ہے کہ وہ پندرہ بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ ٹھہر کے جا سکتے تھے لیکن ہمارے مخالفین کو علم تھا کہ ان لوگوں کو ختم کرنے سے پہلے ان کی تعداد سے تین یا چار گنا زیادہ حملہ آوروں کی کھوپڑیوں پر چوٹ پڑ رہی ہوگی ہوں گی

پر قربانی دینے کو تیار ہو گئے تھے ہم نے جلسے منعقد کرنے کے لئے مارکس ازم کے حامیوں اور کھاتے پیتے لوگوں، دونوں کے طریقوں کا مطالعہ کیا تھا، اور ہم نے دونوں سے مفید سبق حاصل کئے تھے۔

کمیونسٹوں کی مکارانہ چالیں

مارکس ازم کے حامی ہمیشہ اپنے جلسوں میں یہ کوشش کیا کرتے تھے کہ ان کے جلسہ کو منتشر کرنے کا کبھی کھاتے پیتے لوگوں کو خیال بھی نہیں آیا۔ یہی وجہ تھی کہ سرمایہ داروں کے جلسے خراب کرنے پر ہی لگے ہوئے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا نہ صرف سرمایہ کو اس کارروائی میں خوب مہارت حاصل ہو گئی بلکہ جرمنوں کے کئی صناع ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ سرمایہ نے کھلم کھلا اعلان کر رکھا تھا کہ مارکس ازم کے حامیوں کے سوا کسی اور پارٹی یا جماعت نے جلسہ منعقد کرنے کی جرأت کی تو اسے مارکس ازم کے حامی اپنے خلاف "ناقابل برداشت اشتعال انگیزی" تصور کریں گے۔ جب کمیونسٹ تحریک کو چلانے والے لیڈروں کو یقین ہو جاتا کہ کوئی جلسہ منعقد ہونے والا ہے جہاں ان کی زبردستیوں اور غنڈہ گردیوں کا پول کھولا جائے گا تو وہ ایسے جلسہ کو ناکام بنانے میں ذرہ بھر توقف نہ کرتے۔ جوں ہی کوئی ایسا جلسہ منعقد کرنے کا اعلان ہوتا، سرخ اخبارات یک آواز ہو کر اس کے خلاف غراہٹ شروع کر دیتے یہ غراہٹ تمام جلسہ سے پہلے عوام کی جانب رجوع کرتے اور بڑے احترام اور عجز کی ممیز لہجہ میں یہ درخواست کرتے کہ "کمال طبقہ کے خلاف اس اشتعال انگیزی" کو فوراً روک دیا جائے، کیونکہ قانون اور امن کا یہی تقاضا ہے۔ اس واردات کو پیش کرنے کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی تھی، اس کا لب و لہجہ ہر اخبار کے مخاطب طبقہ کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق ہوتا رہتا تھا۔ اس قسم کا احتجاج ظاہر ہو وہ یہی اسلوب بیان اختیار کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ یہ مطالبہ سو فیصدی کامیاب رہتا تھا۔ اگر کوئی طرح کے معنوں میں زبردست ہو اور محض نشان کا بھی نہ ہو، ایسے گستاخانہ مطالبہ کو

روز کرنے تو تب ایک کی بجائے چلی جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک طرف تو اعلان کیا جائے کہ "کل کارخانہ مزدوروں کو اشتعال دلانے" اس کے ساتھی پارٹی کے اراکین کو ہدایت کی جاتی کہ فلاں جگہ جلسہ میں بڑی جرأت کے ساتھ شرکت کرو۔ اس شرکت کا مقصد یہ ہوگا کہ "کھاتے پیتے طبقات کی شرمناک مارشل لاء مزدوروں کے زبردست غصے کی طاقت سے بچا لیا جائے۔"

جلسہ میں حریف سے دبنا ٹھیک نہیں

کھاتے پیتے طبقات کے جلسے جس دہشت کے ماحول میں منعقد ہوتے تھے اس کو دیکھ کر ان غریبوں پر ترس آتا تھا۔ ان لوگوں پر کمیونسٹوں کا ایسا رعب چھایا تھا کہ جب تک اس کا عمل آنکھوں سے نہ دیکھ لیا جائے محض کہنے سننے سے تو اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ کلام تو اس قسم کی دھمکیوں سے ہی جلسہ کو شروع کر دیا جاتا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ جلسہ کا اعلان اٹھ جانے ہوتا تو کارروائی کا آغاز ہونے تو بلانے سے بھی مشکل ہی ہو سکتا۔ صدر جلسہ کارروائی یوں شروع کرتے کہ پہلے "غریب اختلاف کے معزز اراکین" کی شان میں ایک قصیدہ ارشاد کرتے اس میں کہا جاتا کہ صدر اور منتظمین جلسہ ان حریفوں کی آمد پر نہیں خوش آمدید کہتے ہیں یہ خوش آمدید صرف اخلاقاً کہا جاتا ہے۔ ان حاضرین کی آمد کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی کہ اگرچہ وہ ہمارے ساتھ متفق نہیں لیکن وہ ہو سکتے ہیں کہ باہمی تبادلہ خیالات اور افہام و تفہیم سے ہی مسائل طے ہو سکتے ہیں۔ غریب اختلاف کے معزز مہمان فوراً ان شرائط کو بڑی خوشی سے قبول کر لیتے تھے اس کے ساتھ ساتھ غریب صدر یہ بھی یقین دلاتا کہ اس جلسہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کسی کو اس کے عقیدہ سے منحرف کیا جائے (جناب اس کی ضرورت ہی کیا ہے) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے خود قائم کرے اور پھر اپنی رائے برقرار رکھے۔ لیکن دوسروں کو بھی تو آزادی رائے کا حق دینا چاہیے۔ لہٰذا میں حاضرین سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ جو صاحب تقریر فرمائیں گے ان کو دوران تقریر میں ٹوکا نہ جائے۔ یہ تقریر نہایت مختصر ہو

گی۔ آپ خاموشی سے تقریر سن کر دنیا پر ثابت کر دیں گے کہ یہ جلسہ نہ مسلموں کے اتحاد کا ہے اور نہ اختلافات کی شدت کا مقابلہ کر سکے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیمونسٹ جلسے کیسے خراب کرتے ہیں

کیمونسٹ پارٹی کے کارکن جلسوں میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی گفتگو سے باز نہ آتے۔ جوں ہی تقریر شروع ہوتی مقرر کے جملے کے جملے ہوا میں اڑا دیتے اور اسے خاموش ہونا پڑتا۔ حضرات مقررین ہوں بھگی بلی بن کر بیٹھ جاتے کہ بعض دفعہ تو یہ خیال ہوتا کہ شاید وہ خود ہی چاہتے تھے کہ انہیں خاموش کر کے وجہ شہادت عطا کر دی جائے۔ کھاتے پیتے دکانات کے مہاجن اس شان کے ساتھ جلسہ گاہ سے رخصت ہونا شروع کر دیتے کہ ان کے پیچھے پیچھے ایک خونی جلوس ان کا تعاقب کر رہا ہوتا۔ ایسا تب ہوتا جب ان لوگوں کی قسمت اچھی ہوتی ورنہ عام طور پر اسلام کا مقرر اس سے زیادہ مسرت ناک ہوتا تھا۔ جس کی کہ ہوا ہی مدت نہ بجھتی ہو۔ جو تالی کی تو پھر ہوش ہی کے رہی تھی۔

اس حالات میں ہماری قوم پرست اقلیت کی پارٹی نے جلسوں کا جو انتظام شروع کیا تھا اسے دیکھ کر ہمارے ہم کے ساتھی بھونچکے رہ گئے وہ ہمارے جلسوں میں اس طرح سے شرکت کرنے آتے تھے کہ جس کھیل کھیلنے کے عادی ہو چکے ہیں وہی کھیل یہاں بھی کھیلا جائے گا۔ اور ہمارا بھی وہی حشر ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ "آج انہیں ختم کر دیں گے" بارہا ایسا ہوا کہ وہ جلسہ گاہ میں ہمیں مرنے مارنے کو داخل ہوئے لیکن انہیں ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ جلسہ گاہ سے اٹھا کر دور پھینکے جا چکے ہیں۔ انہیں دوبارہ یلغار کرنے کی مہلت بھی نہ دی گئی۔

جلسہ کے منتظمین کو خود اعتمادی سے کام لینا چاہیے

اول تو ہمارے جلسہ میں کارروائی کا اسٹیج ہی بالکل مختلف تھا۔ ہم اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے نہ کسی سے تقریر کی اجازت مانگتے تھے۔ نہ خاموش رہنے کی اپیل کرتے تھے۔ نہ کسی کو اپنے جلسہ میں بولنے کی اجازت دیتے تھے۔ ہم یہ تسلیم ہی نہ کرتے

تھے کہ ہمارے جلسہ میں ہر ایرے غیرے کو بحث شروع کرنے کی اجازت ہے۔ ہم نے روکے اندار میں ہر شخص کو سمجھا دیتے کہ جلسہ ہمارا ہے جو ہماری مرضی ہوگی ہم یہاں کریں گے۔ اگر کسی نے ہماری کارروائی میں خلل ڈالا تو اسے بغیر چوں چرا کے اٹھا کر جلسہ سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ جو صاحب جلسہ کی کارروائی میں مداخلت کریں۔ ان سے اس مداخلت کے باعث جو بھی خرچ ہو اس کے ذمہ دار ہم نہ ہوں گے۔ گرداں وقت بچا تو جلسہ کے آخر میں بحث کی اجازت دی جائے گی۔ اب ہماری پارٹی کے کارکن کارروائی شروع کرتے ہیں یہ مدار المہام صاحب کیا تھا کہ مارکس ازم کے حامی بھائے اسے سن کر ششدر رہ جاتے۔

رضا کاروں کی تنظیم کی ضرورت

دوسرے ہمارے ہر جلسہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ و منظم رضا کاروں کا ایک گروہ جلسہ میں امن قائم رکھنے کی خاطر ہمارے ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ ہر شخص اس کے کہ کھاتے پیتے لوگوں کے جلسوں کی حفاظت کیلئے کرائے کے غنڈے ہوتے تھے انہیں دیکھ کر دہشت کھاتا تھا کہ بوڑھے مریض کو استقبال کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے اس کو رحم ہوتا تھا کہ ان کی عمر کے باعث ان کا احترام کیا جائے گا اور ان کا حکم مانا جائے گا لیکن مارکس ازم کے حامی بگڑ جاتے تھے کہ احترام کیا اور حکم ماننا کس بلا کا نام ہے۔ ان حالات میں کیا ہو سکتا ہے کہ کھاتے پیتے لوگوں کے جلسوں میں جلسہ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا۔

جب پہلے پہل ہمارے جلسے شروع ہوئے تو میں نے اسی وقت حفاظتی رضا کاروں کا ایک دستہ مرتب کرلیا۔ اس دستہ میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے۔ ان میں سے بعض تو وہ فوجی تھے جو میرے ساتھ جنگ میں شامل رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ پارٹی کے وہ نوجوان ارکین تھے جنہیں شروع ہی سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ دہشت اور تشدد کا مقابلہ صرف دہشت اور تشدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں صرف جان پر کھیل جانے والے دلیر مردوں کو کامیابی حاصل ہوا کرتی ہے ہم ایک ایسے نصب العین کی

خاطر آ رہے تھے جس کے لئے لوگوں کا آخری فیصلہ سنا بھی جا رہا ہے۔ ان نوجوانوں کو یہ سبق سکھایا گیا تھا کہ جب مسائل کا فیصلہ عقل کے بجائے تلوار سے ہونے لگے تو خیر اسی میں ہے کہ مسئلہ کا شکار کرنے کی بجائے خود ہی مسلح ہو کر آ جاؤ۔ ہمارے حکمرانوں کے محافظین کی ہاسوری سی میں ہے کہ ان کے آنے کے پہلے ہی شہرت ہو۔ ان کو بلانے سے پہلے ہاتھ کے جوہر دکھانے چاہئیں۔

ہوا میں جنگ پر جانے والے ان نوجوانوں نے غیر معمولی جوش و خروش سے ہمارے اس پیغام پر لبیک کہا وہ پہلے ہی کھاتے پیتے طبقات کی مست بلاور زندگی دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

سب پر واضح ہو گیا کہ گذشتہ میں انقلاب بپا ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت کی حکومت نے نوجوانوں کو کچلنے میں بزدلی دکھائی تھی اگر اس حکومت انقلاب کو کچل دیا جاتا تو نوجوانوں کی کمی یہ تھی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس وقت کوئی ایسا صاحب دماغ نہ تھا جو اس طرح انقلاب کو دبا دینے کا حکم دیتا جب میں ان نوجوانوں کے سامنے تقریر کرتا اور انہیں سمجھاتا کہ ان کے فرائض وقت کے مستقبل کے لحاظ سے کیا ہیں تو ان کی آنکھوں میں جوش کی ایک عجیب چمک آ جاتی میں انہیں بار بار یہ سبق دیتا کہ اگرچہ تمہاری کھوپڑی میں دنیا بھر کی عقل جمع ہو چکی ہے لیکن ہڑوں میں ابھی سکت نہیں کہ اپنے سر کو اٹھی سے بچا سکو تو یہ ساری عقل کارت جائے گی صبح کی دیوی جنگ کے دیوتا کی سواری کے لئے اس دنیا میں یہ جگہ نہیں وہ کئی بڑی مثالوں سے جنگ میں خدمت کا مفہوم ان نوجوانوں کے ذہن پر خوب واضح طور سے نقش ہو جاتا تھا افسروں کی مردہ فضا میں کرسیوں پر بیٹھ کے ہوئی کی کیفیت میں جیتے ہوئے وہ چلتی ہوئی مریض سرکاری دفتر جنگ کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتے تھے اور یہ ایک قومی فریضہ کے جنگ کے معنی وہی زندہ دل جوان سمجھ سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ ملک کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی ہے تو

موت سے کبھی نہ ڈرا ہو۔

ہمارے رضا کاروں کی تنظیم

ان نوجوانوں نے کیا خوب کارنامے انجام دیے!

جب کبھی ہمارے جلسہ میں کوئی شخص خلل پیدا کرتا یا نوجوان تتلی ہوئی مکھیوں کے چھتے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ خلل پیدا کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو، یہ نوجوان خود کمی ہی کیوں نہ ہو چکے ہوں، انہیں دیکھ کر ہر دیکھنے والی آنکھ یہی کہتی تھی کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو نہیں روک سکتی۔ ان کے چہرے میں تو یہ شوق موجزن تھا کہ ہماری تحریک اپنی مقدس منزل کی جانب کامیابی سے بڑھتی جائے۔

1920ء کے موسم سرما میں ہمارے جلسوں کی حفاظت کے لئے اور وہاں صفائی قائم رکھنے کی خاطر ہمارے رضا کاروں کی تنظیم ایک شکل اختیار کر چکی تھی 1921ء کے موسم بہار میں ہمارے رضا کاروں کی یہ جماعت دو رضا کاروں کی ٹکڑیوں میں تقسیم کی جا چکی تھی یہ ٹکڑیاں بڑھ کر آگے ٹولیوں میں تقسیم تھیں۔

اس تنظیم کی ضرورت یوں واضح تھی کہ اب ہمارے جلسوں کی تعداد دو سو تک تھی میونسپل شہر کے باہر بڑا دالان میں اب بھی ہمارے جلسے منعقد ہوتے تھے لیکن اب اس کے علاوہ ہم سارے شہر کی بڑی بڑی جلسہ گاہوں میں بھی جلسے منعقد کرتے تھے 1920-21ء کے درمیانی موسم سرما اور موسم سرما میں ہم نے جو جلسے پیوگر، اور میونسپل شہر کے کنول بڑا میں منعقد کئے وہاں حاضرین کی تعداد دس ہزار تک ہو چکی تھی ہمارے جلسوں میں ہمیشہ یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جلسے میں ہجوم زیادہ ہوتا تھا تو پولیس جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے گھنٹوں پہلے داخلہ بند کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

تحریک کے جھنڈے اور نشان کی ضرورت

ہمارے جلسوں میں صفائی قائم رکھنے کی خاطر رضا کاروں کے جو دستے مرتب ہوئے انہوں نے ایک بڑی مشکل کو حل کر دیا۔ اس وقت تک ہماری تحریک کا کوئی مخصوص

نشان کا طغرا نہ تھا۔ ہمارا جھنڈا ابھی نہ تھا اس وقت کے حالات میں یہ کمزوریاں کچھ بھی ناقابل برداشت نہ تھیں لیکن ہوں یہ تھا کہ مستقبل میں ثمایہ ایسی کمزوریاں برداشت نہ کی جا سکیں ان علامات کا تعین نہ ہو سکنے کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ پارٹی کے ارکین کے پاس کوئی ایسا ظاہری نشان نہ تھا جس سے ان کی شناخت ہو سکے یا اسی شناخت کے طفیل میں تمام ان ورکروں کے مکانات کا پتہ لگایا جا سکتا تھا۔ یہ بات سب تھا کہ جھنڈا بھی پارٹی کے ارکین کی ظاہری نشان کے بغیر رہے جا سکیں یہ نشان ایسا ہونا چاہیے جو تحریک کے مقاصد کا ترجمان ہو اور ہم ہمیں دیگر سیاسی کیمونسٹوں کے نشانات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

ہمارے ایام جوانی کے دوران میں مجھے یاد ہے تجربہ ہو چکا تھا کہ اس قسم کا ظاہری نشان کسی بھی جماعت کے لئے نفسیاتی اہمیت رکھتا ہے اس قسم کے نشانات سے ارکین کو جو ذہنی تسکین ہی حاصل ہوتی ہے جنگ کے بعد جب کیمونسٹ شاہی محل اور قیصری دربار کے سامنے عوامی مظاہرے کر رہے تھے تو میں ان دنوں برلن میں ہی تھا چاروں جانب سرخ جھنڈوں کا ایک سمندر نظر آتا تھا کہیں بارہ دری پر سرخ نشانات تھے کہیں کوٹ کے بُرجوں میں سرخ پھول لگے تھے قریب ایک لاکھ بیس ہزار حاضرین کا مجمع ہوگا اس وسیع اجتماع میں ہر جانب پھیلے ہوئے سرخ نشانات سے ایک عجیب ہیبت، رعب اور قوت کا احساس ہوتا تھا میں یہ مظاہرہ دیکھ کر خوب کھوتیا، بعد میں نے خود محسوس کیا کہ ایک بازار میں چلتے پھرتے ہوئے عام شہری اس قسم کے ذہنی مظاہروں کو دیکھ کر کیوں ان سے جادو کا سا اثر قبول کرتا ہے۔

جھنڈے کی اہمیت اعتقادی ہوتی ہے

کھاتے پیتے طبقات بحیثیت ایک سیاسی پارٹی کے کسی ضابطہ حیات کے علمبردار ہیں ہوتے کسی ضابطہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی ایک جھنڈا نہیں ان کی سیاسی جماعتیں تو ایسے "ایمان و عمل" پر مشتمل ہوتی ہیں جو کسی حکومت کا سرکاری

جھنڈا اٹھائے پھرتے ہیں اگر اس سرکاری جھنڈے کا رنگ کسی ضابطہ حیات کا آئینہ دار ہوتا تو کم از کم یہی کہا جاتا کہ یہ سرکاری جھنڈا سرکاری ضابطہ حیات کا آئینہ دار ہے اس صورت میں اس جھنڈے کا احترام کرنے والے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ جھنڈا ان کے ضابطہ حیات کو نافذ کرنے کی کوششوں کا آئینہ دار ہے۔

فی الحقیقت صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔

ہماری سرکار تو لال رنگ کے کپڑوں کا ایک گٹھڑ ہے جس کو باندھ کر اکٹھا کرنے کا کام مزدور کماتے پیتے طبقات کی مدد کے طفیل ہی انجام پا رہا تھا سرکاری جھنڈا جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ تھا اس نے یہ اس سرکار کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا جو کچھ تھا اس جھنڈے کی نہ کوئی نظریاتی توجیہ تھی نہ بنیاد۔

جرمنی کا پرانا جھنڈا

جرمن زبان بولنے والے علاقے میں صرف جرمن آسٹریا ایک ایسا خطہ تھا جہاں کماتے پیتے طبقات کی سیاسی جماعت کا جھنڈا اس قابل تھا کہ اسے کسی سیاسی پارٹی کا جھنڈا تسلیم کیا جاتا یہاں قوم پرست کماتے پیتے طبقات کے ایک گروہ نے 1848ء کے قومی جھنڈے کے رنگوں کو اپنا لیا تھا۔ اس جھنڈے میں یہ رنگ تھے کالا، لال اور سنہری۔ یہ جھنڈا کسی ضابطہ حیات کا تو ترجمان نہ تھا مگر بھی قومی رجحان کا ترجمان ہونے کی حیثیت میں جہاں تک اس جماعت کا تعلق تھا۔ یہ ایک انقلابی جھنڈا ضرور کہا جا سکتا تھا۔ جب اس جھنڈے کے حامل ممالک اشتراکی جمہوریت پرست تھے یا جرمانی مذہب پرست اشتراکی دیوانوں کی پارٹی کے ارکین جس طرح اس جھنڈے کو 1918ء میں کالے، سفید اور لال رنگوں کے قیصری جھنڈے کو جھکایا تھا۔ اسی طرح وہ آج بھی اپنے اس جھنڈے کو لہرا رہے تھے یہ ٹھیک ہے کہ جرمن دیوانی سرکار کا لال، کالا اور سنہرا جھنڈا (1848ء کی یاد تھا یہ بھی ٹھیک ہے کہ 1848ء کا سال ایک انقلابی عہد متصور ہوتا ہے لیکن اس دور میں اس جھنڈے کی نمائندگی رجعت پسند طبقوں کے

ہاتھ میں تھی ہندوستانی سوشلزم کے علمبردار سوچ رہے تھے جب اس ترنگے جھنڈے کو ترنگا کے طریقہ پر عوام میں لایا گیا اور کانگریس کی قیادت نے انگلستان سے واپس مارکسزم کے حامی اور اعتدال پسند سوشلزم کے حامی اس جھنڈے کے پیچھے آج یہ لوگ اس جھنڈے کے پیچھے ہیں آج یہ لوگ اس جھنڈے کو اپنا مقدس اور پیارا جھنڈا کہتے ہیں وہ اس جھنڈے کو اپنا جھنڈا ہوتے ہیں لیکن یہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے سرکاری جھنڈے سے 1918ء میں غداری کی تھی۔

یہ اپنا جھنڈا کام نہیں دے سکتا

غرض یہ بالکل سچ ہے کہ 1920ء تک مارکسزم کے حامیوں کے مقابلہ میں کوئی ایسا جھنڈا نہ تھا جو مارکسزم کی مخالف طاقتوں کو یکجا کرنے کا نشان بن سکتا۔ کانگریس کے پہلے تین دنوں میں سے کسی کانگریس کی مجلس عاملہ یا کسی کالے، لال، ہرے، سفید رنگوں کو یہ نشان بنانے پر آمادہ نہ تھے کیونکہ انہیں 1918ء کی تلخ تجربہ نہ بھولا تھا وہ اس جھنڈے کو قبول نہ کرتے تھے لیکن اس کے مقابلہ میں خود بھی کوئی ایسا پروگرام پیش نہ کر سکتے تھے جو کسی صورت حال سے مطابقت رکھتا۔ انہیں زیادہ سے زیادہ یہی خواہش تھی کہ اپنی ترنگی سرکار کو اسرار و عیان کر دیا جائے۔

غرض یہ ہے کہ وہ طبقہ جس کی علمبرداری کالے، سفید، ہرے، لال رنگ کے جھنڈے کے ہاتھ میں ہوتی ہے یہ اپنی قیصری ترنگی سرکار کا جھنڈا ہے اس جھنڈے کو اب ہماری تمام تباہی و بربادی کی ذمہ داری ہے یہ اپنی تمام تباہیوں کا ذمہ دار ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ایک ایسی سرکار جسے مارکسزم کے حامیوں نے ترنگی حالت میں ختم کر دیا اس کا نشان اب مارکسزم کے حامیوں کو کچلنے کے لئے اچھا ثابت نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ایک شریف آدمی ترنگی جھنڈے کا احترام کرے وہ اسے حالات کو مدنظر رکھے کہ جب یہ جھنڈا زندہ تھا تو اپنی جوانی کے ایام میں اس نے اس جھنڈے کے سائے میں جنگ آزادی کی اور کئی سورماؤں نے اس جھنڈے کی آن پر اپنی جانیں قربان کر

دیں۔ لیکن سفید فام کی نگاہ میں حصہ لینے کے لیے یہ جھنڈا کسی کام کا نہیں۔

پرانے جھنڈے کی بے حرمتی نہ کرو

جہاں تک ہماری تحریک کا تعلق ہے ہم نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ جرمن قوم کا پرانا جھنڈا اگر ختم ہو گیا ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ ہمیں اس زوال پذیر دور کا اچھے پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے سیاسی مدبرین کے زوال پذیر دور میں رہنے والوں کا طریق ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اچھا ہے نئی جرمن سرکار نے ایک نیا جھنڈا اٹھایا ہے۔ اب وہ اس نئے جھنڈے کے ساتھ جو دلیل کر رہے ہیں ہمیں ان کی بحث پر وہ نہیں۔ آؤ ہم سب تھوڑا سا شکر ادا کریں کہ ہمارے دور میں کم از کم سرخ جھنڈے کو یہ ذلت برداشت کر کے بیرونی تسلط سے بچا لیا گیا ہے۔

موجودہ جرمن سرکار تو پہلے آپ کو ہر اپنی قوم کو فروخت کر رہی ہے خدا وہ دن نہ لائے کہ یہی سرکار اس قابل ہتک جھنڈے کو اپنائے جس میں کالا سفید اور لال رنگ شامل تھے۔

جب تک نومبر 1918ء کے شرمناک واقعات کا داغ ہماری پیشانی سے دھویں نہیں دیا جاتا۔ تب تک مناسب یہی ہے کہ اس شرمناک صورت حال کے خاتمے کے لیے اس کا ایک علیحدہ جھنڈا ہی ہے۔ اس سرکار کا حق ہے کہ یہ اپنے معزز جھنڈے کو تہ کر دیا لے ہمارے کھاتے پیتے بورژوا مدبرین کو ہوش رکھنا چاہیے کہ جو شخص اس موجودہ سرکار کے لیے کالا سفید اور لال جھنڈا تجویز کرتا ہے وہ جرمنوں کے شاندار ماضی کو ذبح کرانے کا خواہش مند ہے۔ یہ کالا جھنڈا ہماری پرانی قیصری سرکاری کے ناموں ننگ و عار ہے۔ قدرت کا شکر ہے کہ اس ہنگامی سرکار نے اپنے قدوقامت کے مطابق ایک نیا جھنڈا تراش لیا ہے۔

یہ ایک اور وجہ تھی کہ ہم قوم پرست اشتراکی پارٹی کے راہنما پرانے جھنڈے کو پھر بلند کرنا اپنے خاص مقصد کے لیے ضروری نہ سمجھتے تھے۔ ہمیں ہرگز یہ ڈر نہ تھا کہ ہم اس

قیصری جس سرکار کو دوبارہ زندہ کریں جو خود اپنی غلطیوں کے باعث ختم ہو چکی ہے۔ ہم تو ایک نئی سرکار قبیلہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔

نئی سرکار کا نیا جھنڈا

جو تحریک ہمارے اس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک نئی سرکار کے نشان کے طور پر ایک نیا جھنڈا بھی تجویز کرے۔

ایک نیا جھنڈا اختیار کرنے کا سوال تب عرصہ تک ہمارے سامنے رہا۔ سوال یہ تھا کہ جھنڈے کی شکل و صورت کیا ہو۔ ہر طرف سے متعدد تجاویز موصول ہوئی تھیں پر تجاویز ایک حد تک سے آگے نہیں جا سکی تھیں لیکن کم و بیش سب ہی قابل عمل تھیں نئے جھنڈے کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ہماری جدوجہد کا نشان بن جائے لیکن اس کے لئے یہ بھی شرط تھی کہ وہ ایک موثر نعرہ کے لیے بڑے شعار کا کام بھی دے سکے جو لوگ عوام کی پسند سے تعلق رکھنے والے معاملات میں حصہ لیتے ہیں وہ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ ظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں دراصل بڑی اہمیت رکھتی ہیں انکی اس تحریک کی جانب متوجہ کرنے کا ولیں مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئیں جھنڈا دیکھ کر تحریک سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔

جھنڈے کا رنگ

یہی وجہ تھی کہ ہمیں جو مختلف تجاویز موصول ہوئیں وہ ہم نے ناظور کر دیں ایک تجویز تو یہ تھی کہ ہماری تحریک کا جھنڈا سفید ہو جس کا مقصد یہ ہو کہ ہماری پہلی سرکار زندہ کرنا چاہتے ہیں ہم اس طرح اس فرسودہ سیاسی جماعتوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے تھے۔ جو وقت گذرنے ہوئے زمانہ کو واپس لانا چاہتی ہیں علاوہ ازیں سفید کوئی ایسا رنگ نہیں جس سے عوام کی توجہ کو کھینچا جا سکے یا قائم رکھا جا سکے۔ سفید رنگ تو صرف جون زدگیوں کی انجمنوں کے لئے ہی موزوں رہتا ہے سے ایک ایسی تحریک کا نشان کس طرح بنایا جا سکتا ہے جو انقلابی دور میں [illegible] کی طلبگار ہے۔

ایک وجہ یہ بھی کہ کالے رنگ کا جھنڈا اختیار کیا جائے موجودہ حالات کی مناسبت سے تو یہ تجویز بہت موزوں تھی لیکن اس سے یہ سمجھ لیا جاتا کہ ہماری تحریک کے علمبردار روسی ہیں۔ علاوہ ازیں کالا رنگ بھی جاذب توجہ نہیں۔

ایک تجویز یہ بھی کہ سفید اور نیلے رنگ کا جھنڈا اختیار کیا جائے یہ جھنڈا خوبصورت تو ضرور ہوتا لیکن یہ جھنڈا پہلے سے ترکی کی وفاقی سرکار کے ماتحت ایک ریاست کا جھنڈا ہے۔ علاوہ ریاست بھی یہی ہے کہ وہ قسمتی سے ننگ ملت کے لئے مشہور ہے اور اس کی کوئی اچھی شہرت نہیں علاوہ ازیں ان رنگوں میں بھی نقص یہی ہے کہ جاذب توجہ نہیں کالے اور سفید جھنڈے پر بھی یہی اعتراض تھا۔

کالے، لال اور سبز رنگوں کو اختیار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ موجودہ ترکی وفاقی سرکار کے جھنڈے میں شامل ہیں۔

علی ہذا القیاس کالے، سفید اور لال رنگ کے جھنڈے کو اختیار نہ کرنے کی وجوہات میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کم از کم یہ رنگ اس شکل میں تو استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ جس طرح آج تک استعمال ہوتے آئے ہیں پھر بھی یہ تینوں رنگ دیگر تمام رنگوں سے بہتر ہیں۔ یہ بھی مانا پڑتا ہے کہ ان رنگوں کا آپس میں خوب میل ہے اور جاذب نظر بھی ہیں۔

ہمارا اپنا جھنڈا

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری خواہش ہمیشہ سے یہی تھی کہ ہمارے رنگوں کو کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھا جائے اس کی وجہ تو یہ تھی کہ میں ایک سابق فوجی کی حیثیت سے پرانی ترکی سرکار کے جھنڈے کو ان رنگوں کو اپنے سے واجب التعظیم سمجھتا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے شخصی ذوق کے اعتبار سے بھی ان رنگوں کا باہمی میل بہت خوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے وہ تمام تر تجاویز جو ہلال اور ستارے کو منظور کر رہے تھے جو نئی تحریک کے جھنڈے کی خاطر پیش کئے گئے تھے ان کو رد کر دیا میں کسی ایسے تھے جو

برطانی سرکار کے جھنڈے کے رنگوں میں سوراجیہ کا نشان بھی شامل کرتے تھے بحیثیت قائد کے میں خود یہ نقشہ عوام کے سامنے پیش نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ کوئی اور شخص مجھ سے بہتر نمونہ پیش کر دیتا۔ ہوا بھی یہی کہ سارن ریگ کے قصبہ سے ایک دانوں کے ڈیزائن نے ایک بہت اچھا نقشہ پیش کیا جو میرے نقشہ سے بالکل ملتا جلتا تھا اس کے نقشہ میں صرف ایک فرق تھا وہ یہ تھا کہ سوراجیہ کی تین لکیریں چرخے کے پہیوں کی طرح گول مڑی ہوئی تھیں جو میرے نقشہ میں نہیں تھیں۔

دو تین دن کے بعد میں نے ایک تیسرا نقشہ تیار کیا جس کا نقشہ یہ تھا کہ سرخ جھنڈے میں ایک سفید دائرہ ہو جس کے مرکز میں سوراجیہ کا نشان بنایا جائے۔ کئی تجربوں کے بعد میں نے جھنڈے اور سفید دائرے کے رنگ اور سوراجیہ کی جسامت میں مناسبت و توازن پیدا کر لیا۔ اس کے بعد ہمارے جھنڈے کی شکل آج تک یہی چلی آ رہی ہے۔

ہمارے رضا کاروں کا حفری

اس کے ساتھ ہم نے اپنے جلسوں میں انتظام کرنے والے رضا کاروں کے وردیوں کی خاطر اس لمونہ کے بارہ بند نشان بھی تیار کروا دیے یہ بارہ بند سرخ ہوتے تھے بیچ میں ایک سفید دائرہ ہوتا تھا اور اس کے اندر سوراجیہ کا نشان بنایا جاتا تھا میونسپل شہر کے ایک سارجنٹ نے اس بارہ بند کا پہلا مکمل لمونہ تیار کر پیش کیا اس کے بعد یہ لمونہ مستقل صورت اختیار کر گیا۔

1920ء کے موسم گرما کے عین وسط میں ہمارا جھنڈا پہلی مرتبہ عوام کے سامنے پیش کیا گیا یہ جھنڈا ہماری تحریک کے لئے خوب موزوں تھا تحریک بھی نئی تھی اور جھنڈا بھی یا گویا دونوں کے جوانی کے دن تھے یہ جھنڈا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اس زمانے میں اس جھنڈے کا عوام پر یہ اثر ہوا گویا اچانک ہوئی "فصل بہاری" ہو تحریک کی حامی خواتین میں سے ایک خاتون کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ ہمیں پہلا جھنڈا تیار کر

دے۔ جس دن یہ جھنڈا بنا کر آیا ہم سب بچوں کی طرح خوشی سے اچھل پڑے۔ پھر ہی
یادگار میٹنگ میں ہم لوگوں کے ہاتھ میں یہ جھنڈے تھے جلسہ گاہوں کی حفاظت کے
لئے ہمارے رضا کاروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اپنی رضا کاروں کی وردی اور
جھنڈا بہت جلد مقبول عام ہو گیا۔

اور پھر یہ جھنڈا ہماری تحریک کے لئے کیا خوب نشان ثابت ہوا۔

ہمارے جھنڈے کی وضاحت

اس جھنڈے میں جو رنگ شامل تھے ایک طرف تو ہم ان کے احترام کرتے
تھے کہ وہ ہمارے شاندار ماضی کے ترجمان تھے اس جھنڈے کے وقت قرآن مجید نے
ہمیں قومی وقار برقرار رکھنے کے لئے تلقین کی تھی دوسری طرف یہ جھنڈا ہماری تحریک
کی پشت پر جو فلسفہ ہے اسے بھی وضاحت سے پیش کر رہا ہے ہم قوم پرست نہیں اس
لئے جھنڈے کو اپنی پارٹی کے پروگرام کا آئینہ دار نہیں سمجھتے ہیں سرخ رنگ ہماری تحریک میں
معاشرتی انقلاب کے تخیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سفید رنگ ہماری قوم پرستی کی
علامت ہے سوشلزم ہمارے قومی نصب العین کا نشان ہے وہ نصب العین یہ ہے کہ ہم
انسانیت کے آپسی فرزندوں کو دنیا کا عالم دیکھنا چاہتے ہیں ہم تحریکی کارگذاری پر ایمان
رکھتے ہیں یہی محنت اور مشقت کرنے سے کوئی نتیجہ نکلے صرف آرام دان کا مقصد ہو یہ
ہے ہی ہم کو یہ توفیق حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے سوشلزم کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم
دوسروں کو کمانا دینا چاہتے ہیں۔

دو سال کے عرصہ میں ہماری جلسہ گاہوں کی حفاظت کرنے والے رضا کار باقاعدہ
وردیوں میں ملبوس ہو چکے تھے اس رضا کار تنظیم کا مقصد ایک جدید ضابطہ بندی کی
حفاظت کرنا تھا ضرورت تھی کہ اس تنظیم کو بھی کامرانی کا ایک نشان دیا جائے چنانچہ اس کا
بھی ایک جھنڈا بنا میں نے اس جھنڈے کا نقشہ بھی تیار کیا اور اس کی تیاری اصلاحت
کے خدا بخش کاریگر کے سپرد کر دی۔ جو نشان کام کرتے تھے اس زمانے سے لے کر

آج تک یہ نشان بھی قوم پرست اشتراکی جدوجہد کا علامتی خصوصی رہا ہے۔

ہمارے ابتدائی جلسے

اب ہمارے جلسوں میں عوام کی دلچسپی بڑھ چکی تھی خاص طور پر 1920ء میں تو یہ دلچسپی بہت بڑھ گئی ہمیں مجبور کیا جاتا تھا کہ ایک ہفتے میں دو دو جلسے کریں جہاں ہمارا شمار کا ہوتا وہاں ہجوم ہو جاتا۔ شہر کی بڑی بڑی جلسہ گاہیں سامعین سے پر ہو جاتیں۔ ہمارے کئی جلسے کسی ہال میں ہوتے تھے ہزارہا مخلوق خدا نے مارکس ازم کی تعلیمات نے گرمو کر دیا تھا ہمارے جلسے سننے آتی وہ ہماری باتیں سننے کو بہت سے متفق ہو جاتے پھر وہ حق کو آزاد کرنے کی جدوجہد میں کام کرنے کے لئے ہمارا ہاتھ بٹانے لگتے عوام اب ہم سے خوب واقف ہو چکے تھے ہمارے بارے لوگوں کی زبان پر تھے "قوم پرست اشتراکی" کی ترکیب نکلی اب کلاسیکی میں آتی تھی اس مجموعہ خلاف معلوم ہو کل واضح تھا اس کے تذکرے سے ایک بیان پارٹی کا تفصیلی پروگرام تصور میں آجاتا تھا ہمارے حامیوں اور اراکین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ 1920-21ء کے درمیانی موسم سرما میں ہم میونخ کے اندر ایک مضبوط پارٹی بن چکے تھے۔

ان دنوں سوائے مارکس ازم کی حامی پارٹیوں کے میونخ میں اور کوئی قابل ذکر پارٹی نہ تھی کم از کم کوئی ایسی قوم پرست پارٹی نہ تھی جو ہماری طرح عوامی مظاہروں کا انتظام کر سکتی میونخ کے کنول ہال میں پانچ ہزار حاضرین بیٹھ سکتے تھے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہال میں ہمارا جلسہ ہوا تو حاضرین کے جلسے کے لئے جگہ نہ رہی۔ شہر میں صرف ایک دوسرا ہال ہوتا تھا جہاں ہم نے ابھی تک جلسہ منعقد نہ کیا تھا اس کا نام کروبی سرکس ہال تھا۔

جنوری 1921ء میں ایک مرتبہ پھر فنڈ کے لئے نئی آزمائش کے اسباب پیدا ہو گئے۔ معاہدہ ورسیلز کے تحت جرمنی کو اکیس کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کی مہلت دی گئی شرط یہ عائد کر دی گئی کہ پہلی قسط کی ادائیگی مارچ میں کرنی ہوگی جب

ترکی نے یہ شرط ماننے سے انکار کیا تو ترکی کے دشمنوں نے لندن میں جمع ہو کر ترکی کو ہائی جیکم دے دیا۔

ہمارا پہلا عوامی مظاہرہ

اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے میونخ کے مائے ہرست ہوا ہال میں ایک مشترکہ مجلس مذاکرہ نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا میں یہ خبر سن کر سخت مضطرب ہوا اور محسوس کیا کہ وقت گزرتا جا رہا ہے اور عملاً کچھ نہیں کیا جا رہا ہے کونس ہال میں جلسہ منعقد کرنے کی تجویز ہوئی تھی مگر کچھ سوچ کر یہ تجویز منسوخ کر دی گئی یہ بھی طے ہوا تھا کہ سرے جلسہ شروع نہ کریں مگر یہ تجویز ہوئی کہ فیوڈن ہال کے سامنے مظاہرہ کیا جائے لیکن یہ تجویز بھی ملتوی ہو گئی آخر کار طے پایا کہ میونخ کے کنزل ہال میں ایک مشترکہ جلسہ منعقد کیا جائے دن پر دن گذرتے جا رہے تھے بڑی بڑی پارٹیوں نے اس سارے پروگرام کو قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ مجلس مذاکرہ بھی تک یہ ٹھیک طرح سے طے نہ کر پائی تھی کہ مظاہرہ کس روز کیا جائے۔

۲۴ فروری کو منگل کے روز میں نے پھر مطالبہ کیا کہ کوئی آخری فیصلہ کیا جائے مجھے ہفتے کے روز تک انتظار کرنے کو کہا گیا ہفتے کے روز میں نے پھر پوچھا کہ صاف صاف بتائیے جلسہ کب ہو گا جواب ملا کہ کل اتوار کو ہال ہمیں نہیں مل سکتا اس لئے پیر کے روز ہو گا۔ مجھے بتایا گیا کہ توقع ہے اسی روز شام کو مظاہرہ منعقد کیا جائے گا۔

مجھ میں اب مزید صبر نہ تھا میں نے فیصلہ کیا کہ ہم خود انفرادی مظاہرہ کریں گے اتوار کی دوپہر کو میں نے اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھ دیا اسی وقت لگے ہاتھ ایک اور ضروری کام کے لئے کرنے کا بھی ہم نے کر لیا۔

ایک کامیاب جلسہ کا انعقاد

اس زمانے کے حالات میں یہ فیصلہ ایک بہت بڑی مہم کا سامنا کرنے کے مترادف تھا صرف یہی خطرہ نہ تھا کہ جلسہ کامیاب نہیں ہو سکے گا کوئی نہیں بلکہ یہ خطرہ بھی تھا کہ

جلسہ ملتوی نہ کر دیا جائے۔

تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے جلسہ گاہ کے مطابق رضا کار کا شمار اس وقت ہال کے لیے کافی نہ تھا۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ اگر جلسہ ملتوی کیا گیا تو اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ ایک بڑے ہال میں جلسہ ملتوی کرنے والوں سے نجات حاصل کرنا تمام عام جلسہ گاہوں سے زیادہ مشکل تھا لیکن تجربے سے ثابت ہوا کہ میرے خدشات بے بنیاد تھے حقیقت حال بالکل برعکس نکلی بڑے ہال میں جلسہ ملتوی کرنے والوں کا ہاتھ بٹانے کو رضا کار بہت جلد حاصل کر لیے چھوٹی چھوٹی جلسہ گاہوں کی نسبت زیادہ آسان ثابت ہوا۔

ایک بات تجربے سے ثابت ہوئی تھی اگر جلسہ ناکام ہوتا تو ہمیں مکمل ہونے میں مدت لگ جاتی اور ایک جلسہ ملتوی ہو گیا تو ہماری ذمہ داری ختم ہو گئی ہے اس میں فرق آجائے گا ہمارے حاضرین جب ایک دفعہ کامیاب ہو گئے تو پھر وہی جلسے بار بار دیکھیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم مزید جلسے نہ کر سکیں گے اس کی وقت کا مقابلہ کرنے میں کئی مہینے ضائع ہو جائیں گے۔

ہمارے ہاں صرف ایک دن باقی تھا جمعرات کا دن جس میں ہم اپنے اشتہارات لگا سکتے تھے خوش قسمتی سے اس روز صبح بارش ہو گئی ہے یہ خوف پیدا ہوا کہ بارش اور برف میں باہر نکلنے کی بجائے اکثر لوگ گھر ہی رہنا پسند کریں گے خاص طور پر ایسے حلقے میں کون جائے جہاں دھوپ کا مشکل سے دن نکلنے کا امکان ہو۔

جمعرات کی صبح کو یہ خوف مجھ پر بیدار طاری ہو گیا کہ ممکن ہے یہ تاریخ سامعین سے پر نہ ہو سکے پھر تو محض منظر بہت خوب نہ لگے گی اس خیال سے میں نے مختلف اخبار کے دفتر اشتہارات کا مضمون فی سطر لکھوایا اور اسی روز سہ پہر میں یہ دفتر اشتہارات تقسیم کروا دیے یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی کہ ان دفتر اشتہارات میں جلسے پر آنے کی دعوت درج تھی۔

میں نے ذمہ داریاں کرایہ پر لیں پھر جہاں تک کس چلا ان کارکنوں کو چاروں جانب سے سرخ نشانات سے جا دیا۔ ہر ذمہ داری پر ہمارا جھنڈا نصب کر دیا گیا پھر ایک ایک ذمہ داری پر ہماری پوزیشن کے بعد وہیں کارکن کھڑے ہو گئے ان کارکنوں کو ہدایت دی گئی کہ سڑکوں پر جلسے کا اعلان خوب زور و شور سے کریں اشتہارات تقسیم کریں ہر اس راستہ کو جو جلسہ منعقد ہو رہا ہے اچھی طرح دیکھ لیں کوئی کمی رہ نہ جائے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ سڑکوں پر جھنڈے لہراتے ہوئے ذمہ داریاں گھومتی رہیں گی ان میں ہر کس ان کے حامی نہ ہوں گے دوکانوں کے مالک ہماری ان سرخ گاڑیوں کو دیکھ کر کھلے کے کھلے رہ گئے۔ شہر کے بیرونی علاقے میں سرخ جھنڈیاں لگی لگی کر کہتے تھے کہ یہ دیکھو جلسہ گاہ کو مکمل کرنے کی ایک نئی صورت نکالی گئی ہے ہر کس و ناکس کے ذہن میں کوئی یہ وہم تھا کہ جلسے منعقد کرنا اور سڑکوں پر ہنگامہ آرائی صرف انہی کے لئے جائز ہے۔

ایک کامیاب جلسہ کا نقشہ

شام کے سات بج گئے اور جلسہ گاہ میں ابھی صرف چند لوگوں ہی پہنچے تھے مجھے بجلی فون پر ہر دس منٹ کے بعد اطلاع دی جا رہی تھی میں مضطرب ہو گیا عام طور پر سات بجے تک ہماری جلسہ گاہ قریب قریب آدھی بھر جایا کرتی تھی رہا اوقات تو جلسہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہتی لیکن جلدی میں بھول گیا کہ میرے مضطرب کی اصل وجہ کیا تھی میں یہ بھول گیا تھا کہ کوئی جلسہ گاہ کتنی وسیع ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ اس میں ایک ہزار حاضرین موجود ہوں تو جلسہ گاہ خاصی بھری بھری نظر آتی ہے لیکن اس سرکس گراؤنڈ میں تو کئی ہزار آدمی تھے کے بعد بھی نظر نہیں آتی تھوڑا عرصہ بعد مجھے موصلہ افزا اطلاعات موصول ہونے لگیں پہلے آنے والے بتائے گئے کہ جلسہ گاہ تین چوتھائی بھر چکی ہے اور گرد و نواح سے آنے والوں کا ایک کثیر ہجوم ابھی جلسہ گاہ سے باہر ہے میں بے جلسہ گاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں سرکس گراؤنڈ پہنچا تو آنکھ کر دنگ رہ گیا جلسہ گاہ سے باہر عوام کا ہجوم

کھڑا تھا اس وقت کھڑے ہونے والوں میں بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جو مجھ سے اور میرے خیالات سے
جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے اختلاف کا اظہار کر چکے تھے۔

جب میں ہال میں داخل ہوا تو مجھے وہی مسرت محسوس ہوئی جو ایک سال پہلے میونخ
ہائف برو ہال کے بیرونی حصے میں اپنے پہلے جلسے کی تقریر پر محسوس ہوئی تھی جلسہ
گاہ میں بھیڑ کی یہ کیفیت تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا میں بمشکل ہجوم میں سے گزر کر
پوڈیم تک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ یہاں کی شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے میرے
سامنے ہال اپنے بھرا ہوا تھا جیسے کوئی میچ کا ہفتہ ہو۔ ہزارہا حاضرین سے جلسہ
گاہ پر تھی۔ کرسیوں کے علاوہ فرش پر بھی بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ پولیس کے چند افسر
بھی تھے اس کے علاوہ درجنوں غریب طالب علموں اور خود ہمارے نظم و ضبط
قائم رکھنے والے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی اندازہ تھا کہ ساڑھے چھ ہزار
افراد موجود ہوں گے۔

میری تقریر کا عنوان تھا "مستقبل کی ہوا" مجھے یقین ہو گیا کہ عوام کا یہ ہجوم جس سے
میں مخاطب ہوں مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ اس یقین سے مجھے وہ مسرت حاصل ہوئی کہ
میں خوشی سے مغلوب ہو گیا۔

میں نے تقریر شروع کی، میں ڈھائی گھنٹے تک بولتا رہا۔ ڈھائی گھنٹے تقریر کرنے کے
بعد مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ جلسہ کامیاب ہو گیا۔ ان ہزارہا افراد سے اب ہمارا رابطہ قائم ہو گیا
تھا جب میں یہ کہہ کر تقریر کر چکا تو ہر طرف سے "ہائل ہٹلر" کے نعرے بلند ہوئے
ہائے حسین کی آواز آنے لگی جب میں دو گھنٹے تقریر کر چکا تو تالیوں اور نعروں کی گونج
حاضرین پر سنجیدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی اس کے بعد مجھے متعدد بار اس ہال میں اس
سنجیدہ خاموشی کا تجربہ ہوا تھا۔ جو لوگ اس سنجیدہ خاموشی کا تجربہ حاصل کر چکے تھے وہ
کبھی فراموش نہیں کر سکتے اس خاموش سنجیدگی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مقرر دل میں گھر جانے والا ہوتا
ہے کہیں سنگ گرنے کی بھی آواز نہیں آتی تھی لوگ مبہوت ہو کر بے حس و حرکت بیٹھے

ہوئے تھے جب میں نے تقریر ختم کی تو حاضرین نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ کا اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

میں تقریر ختم کرنے کے بعد یہ شاندار منظر دیکھنے میں مست تک کھڑا دیکھتا رہا۔ وسیع ہال آہستہ آہستہ خالی ہو گیا پھر میں پیٹ بھر کر رخصت ہوا۔ میرا دل خوش اور مطمئن تھا میں گھر واپس لوٹ آیا۔

میونخ کے کروڑ پتی سرکس ہال میں ہونے والے اس پہلے جلسہ کی تصویریں تاریخی ہیں ہمارے اس جلسہ میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اس کا نقشہ اتحادیوں کی نسبت ان تصویروں میں بہتر نظر آتا ہے کیونکہ پتے اتحادیوں نے یہ تصویریں شائع کیں اس کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ جلسہ صرف "قوم پرست" نوعیت کا تھا۔ ان تصویروں پر جو عکاسی ہوئی وہ حیرت پھیلانے والی تھی اس سے اس کا بہتر ثبوت درکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہیں ذکر نہ تھا کہ جلسے کا اہتمام کرنے والے کون تھے۔

ہم نے شروع میں تحریک کیسے پھیلائی

ہم پہلی مرتبہ اب ہماری حیثیت ایک معمولی پارٹی کی نہ رہی تھی اب ہمیں نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا میں چاہتا تھا کہ اگر کسی کو یہ شک باقی ہو کہ ہم اس قسم کے جلسے دوبارہ نہیں کر سکتے تو یہ شک دور کر دیا جائے میں نے لگے ہی ہفتے اسی سرکس ہال میں ایک اور جلسہ رکھ دیا اب کے بار بھی وہی کامیابی نصیب ہوئی ایک مرتبہ پھر ہال حاضرین سے بھر گیا یہاں تک کہ اس کے آٹھ ہفتہ بعد میں نے یہاں ایک اور جلسہ رکھا۔ یہ جلسہ بھی ویسا ہی کامیاب ثابت ہوا۔

1921ء کے اوائل میں یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد میں نے میونخ میں پے در پے سرگرمیاں اور بھی تیز کر دیں۔ میں نے صرف ہر ہفتہ جلسہ منعقد کرنا تھا بعض اوقات ایسے ہفتے میں دو تقاریر دو جلسے کرتا تھا۔ موسم گرما اور موسم سرما میں ہم نے ہر ہفتے تین تین جلسے منعقد کرنے شروع کر دیے اب ہمارا ہر جلسہ سرکس ہال میں منعقد ہوتا تھا یہ

دیکھ کر ہم واپس لوٹ جاتے کہ ہمارا وہ جلسہ پہلے کی طرح کامیاب رہا تھا۔

جلسوں کے انعقاد کا نتیجہ یہ [illegible] شروع ہوا کہ ہماری جماعت کے اراکین [illegible] کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔

قدرتی بات ہے کہ ہماری ان کامیابیوں سے ہمارے مخالفین [illegible] گی۔ شروع شروع میں ہمارے مخالفین کا خیال یہ رہا کہ اگر وہ ہمارے خلاف تشدد کا استعمال کریں گے [illegible] احساس ہو گیا کہ ہماری تحریک [illegible] ہمیں خوفزدہ کرنے سے [illegible] ہمارے خلاف [illegible]

مخالف ہم سے [illegible]

ہمارے خلاف [illegible]

ن کا مقصد یہ تھا کہ ہماری تحریک پھیلنے نہ پائے، بلکہ شروع میں ہی مزدوروں کے نوجوان کارکنوں کی ایک مضبوط ٹولی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیں۔

چند روز بعد اصل حملہ شروع ہونے سے قبل طے کیا گیا کہ ہمارا ایک جلسہ جو میونخ کے مضافات میں منعقد ہونے والا تھا، خراب کر دیا جائے۔ اس جلسہ میں مجھے تقریر کرنا تھی۔

جلسہ خراب کرنے والوں کا مقابلہ

4 نومبر 1921ء کی شام کو چھ سات بجے کے درمیان مجھے پہلی مرتبہ خفیہ طور پر اطلاع ملی کہ آج رات کا جلسہ منتشر کر دیا جائے گا۔ یہ کام ہمارے مخالفین نے تجویز کیا ہے کہ بعض فیکٹریوں کے کمیونسٹ مزدور کثیر تعداد میں ہمارے جلسہ پر حملہ آور ہوں گے۔

ہمیں اس سازش کا پہلے سے علم ہو جاتا لیکن ایک افسوسناک اتفاق کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ اس روز ہم نے میونخ کے سرکردہ مزدوروں کا ایک اجلاس اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔ ہم نے یہ دفتر ترک کر دیا تھا اور نئے دفتر میں ابھی پوری طرح کام شروع نہیں ہوا تھا۔ نئے دفتر میں ہم نے کرایہ دار سے ٹیلی فون کٹوا دیا ہوا تھا۔ ہمیں ابھی نیا ٹیلی فون لگوانا تھا۔ چنانچہ ٹیلی فون کے ذریعے ہمیں جلسہ توڑنے کی کوشش کے متعلق کی لوگوں نے خبردار کرنا چاہا لیکن یہ اطلاع ہم تک نہ پہنچ سکی۔

یہی وجہ تھی کہ اس روز شام کو ہمارے محافظ دستے معقول تعداد میں موجود نہ تھے۔ ہال میں صرف ایک دستہ موجود تھا۔ عام طور پر چار دستے میں موجود رہتے تھے لیکن اس روز میں صرف چھ یا پانچ رضاکار تھے۔ ٹیلی فون کے ذریعے تا حال ہمارے رابطہ ایسے نہ تھے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر کی اطلاع دی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے رضاکاروں کی مطلوبہ تعداد مہیا نہ ہو سکی تھی۔ علاوہ ازیں اس سے پہلے کئی مرتبہ ایسی ہو چکا تھا کہ ہمیں حملے کی خبر ملی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ وہ جو پرانی ضرب المثل

ہے کہ ہم کتنے ہیں اور ہمارے دشمن کی تعداد کتنی ہے۔

شاید یہ بھی تھی کہ اس روز ہمارے جتھے کو تباہ کرنے کے لیے ہمارے مخالفین کے وحشیانہ عزم کے مقابلے کا پورا اندازہ نہ کیا گیا تھا۔

بڑی بات یہ تھی کہ ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ میونخ کا بیئر ہال ہمارے مخالفین کی جانب سے ہمارے جتھے کو تباہ کرنے کی کوشش کے لیے کوئی موزوں مقام تھا۔ ہمیں تو یہ ڈر تھا کہ اس قسم کا حملہ کسی بڑے ہال میں کیا جائے گا۔ خاص طور پر کروڑے سرکس ہال میں۔ لیکن اس رات ہم نے ایک بڑا کارآمد سبق سیکھا۔ بعد میں ہم نے اس اصول کا بڑے محتاط انداز سے جائزہ لیا۔ ہم جس نتیجے پر پہنچے وہ دلچسپ بھی تھا اور ناقابل یقین بھی۔ چنانچہ اس کے بعد اسی سبق کو ذہن رکھتے ہوئے ہماری تحریک کی تنظیم ہوئی اور اسی اصول پر ہمارے حفاظتی دستوں نے اپنا طریقہ کار وضع کیا۔

یا ہٹلر یا مرزا؟

میں ہال کے اندر اس ہال میں جس روز شام کے پانچ بجے پہنچا جب کھانے میں پہنچنے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ مرغوں کی نیت کیا ہے۔ ہال حاضرین سے پر تھا۔ پولیس نے اندر آنے کے راستے بند کر دیے تھے۔ ہمارے مخالفین وقت سے بہت پہلے ہال میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ سے بعد دروازے پر ہال سے باہر رہنے والی گارڈ کا کچھ حصہ اور دوست مجھے دروازے کے قریب ملے۔ میں نے ہال کا اندازہ کر لیا۔ ڈی گارڈ کے ہر پینتالیس یا پچاس ارکان موجود تھے۔ میں نے ہال کے اندر رہنے کا حکم دیا۔ میں نے ان لوگوں پر واضح کر دیا کہ آج شام پہلی مرتبہ تحریک کے پیروں کا کامل اتحاد اور مخلصانہ وفاداری کا ثبوت دینا ہوگا۔ ہم میں سے کوئی شخص زندہ ہال سے باہر نہ جائے گا۔ میں نے اعلان کر دیا کہ میں ہر قیمت میں ہال کے اندر رہوں گا اور میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ تم میں سے کوئی مجھے یہاں چھوڑ کر چلے جائے گا۔ اگر میں نے تم میں سے کسی کو بزدلی یا غداری کرتے پایا تو اپنے ہاتھ سے تمہارے سینے پر سے تحریک کا ہٹلر یا مرزا

تمہارے ورود بلند کی تحریک کے نشان ہیں لوگ ہوں گا" میں نے ان لوگوں کو سمجھا دیا کہ جلسہ خراب کرنے کے ذرا بھی آثار پیدا ہوں تو انہیں یہ کام شروع کر دینا چاہیے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے آپ کو بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود حملہ آور پہلے ہوں ۔

رضا کاران نے تین مرتبہ "یا عمر امرنا" کا نعرہ بلند کیا ان کی آواز آج معمول سے زیادہ گونج دار اور زیادہ خوفناک تھی ۔

جلسہ میں فساد کا ایک منظر

جب میں ہال کے اندر داخل ہوا میں نے اپنی آنکھوں سے صورت حال کا جائزہ لیا ہوئے حاضرین بکھرا بکھرا کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی خشمگیں نظروں سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے چہروں پر غیظ و غضب اور نفرت کے آثار ہویدا تھے ۔ سب میری جانب دیکھ رہے تھے بعض دوسرے لوگوں نے میرے پہنچتے ہی میرے خلاف نعرے لگائے ۔ ان کی پیشانیوں پر لکھا تھا کہ آج وہ مجھے ختم کر کے دم لیں گے انہیں ہمارے سر پھوڑنے میں کسی عار نہ ہوگا ۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں ختم کر دینا چاہتے تھے ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی آثار تھے جن سے ان کے ارادے ظاہر ہو رہے تھے لیکن آسان تھا کہ ان کی تعداد زیادہ ہے وہ اپنی قوت اور غلبہ کے زعم میں اپنے جذبات چھپانے کی پروا نہیں کر رہے تھے ۔

باوجود اس کے ہم نے جلسہ کا آغاز کر دیا ۔ میں نے تقریر شروع کی بانگ درا دہلی ہال میں ہمیشہ ورود سے دور شروع کی میز پر کھڑے ہو کر تقریر کیا کرتا تھا اس پر میں ہمیشہ حاضرین کے وسط میں ہوتا تھا تاکہ یہی وجہ تھی کہ یہاں ہاتھا پائی اور مار پیٹ کا امکان پیدا ہوتا تھا جو دوسری جلسہ گاہوں میں میسر نہ آتا تھا ۔

میرے سامنے اور خاص طور پر میرے دائیں جانب فقط ہمارے مخالفین ہی بیٹھے یا کھڑے تھے ان میں سے اکثر نوجوان تھے ان میں مقامی تبلیغی کارکنان کثیر تعداد میں

یہ نظارہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر کھاتے پیتے لوگ بھی ہمت کریں تو ان کے جلسے کس طرح کامیاب بنائے جا سکتے ہیں۔

جانبازوں کے خون سے تحریک سیراب ہوتی ہے

شرارت شروع ہوتے ہی فی الفور میرے لوکائی دستوں نے حملہ شروع کر دیا۔ ان لوکائی دستوں کا کام ہی یہ تھا۔ وہ لوگ بھیڑیوں کے خون کی طرح دار باڈی پر حملہ آور ہوتے تھے۔ وہ آٹھ آٹھ، دس دس کی ٹولی میں کھلے حملہ کرتے تھے وہ جب یورش کرتے تو حریفوں کی کثیر تعداد کو پرے ہٹا کے ساتھ ہال سے باہر دھکیل آتے۔ پانچ منٹ کے بعد کوئی رضا کار ایسا نہ تھا جو خون سے شرابور نہ ہو۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لوگ کس قیمت سے جیتے ہوئے ہیں سب سے پہلی قیمت میرے دیرینہ دوست کی ہے جو آج میرے ہاتھ سے ہلاک ہوا ہے اس کے علاوہ کئی اور بھی تھے گو وہ ان سے پہلے تھے لیکن وہ بار بار حملہ کرتے تھے جب تک ان میں سے ہر ایک وہاں پر کھڑا ہونے کی ہمت تھی، وہ اپنا کام ہی کیے جاتے تھے میں مسلسل مصروف رہا۔ مجھے بھی کئی زخم آئے تھے لیکن ہیں منٹ کے بعد اندازے پچاس سے کم رضا کاروں نے مخالف کو ہال سے باہر نکال دیا تھا۔ صرف ہال کے باہر کی کوٹے میں ایک بہت بڑا ہجوم تھا جو اگلی تک اندر رضا کاروں کا سخت مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک ہال کے دروازے کے قریب ہی مسلسل کئی دو گولیوں چلنے کی آواز آئی۔ یہ گولیاں پوائنٹ بلینک رینج سے چلائی گئی تھیں اس کے بعد فی الفور چاروں جانب سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ آہا! یہ بھی کیا منظر تھا اس منظر کو دیکھ کر جنگ کے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی میرا دل یہیں بیٹھنے لگا۔

اس وقت یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کس شخص نے گولی چلائی لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے جوانوں نے پہلے سے بڑھ کر جوش سے حملے جاری رکھے یہ حملے اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ جلسہ درہم برہم کرنے والوں کا آخری فرد بھی ہال سے باہر نکال دیا گیا۔

باب ہشتم :: صاحب قوت کی یکتائی اس کے حق کے باعث توانائی ہوا کرتی ہے

متحدہ محاذ کی تجاویز

میں نے گذشتہ باب میں محب وطن دس پارٹیوں کے ایک متحدہ محاذ کا تذکرہ کیا تھا یہاں میں اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

جب ہم کسی متحدہ محاذ کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور پر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مختلف پارٹیاں اپنے مشترکہ مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لیے مل جل کر کام کرتی ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض طے شدہ امور میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا جائے۔ ایک مشترکہ مجلس منتظمہ مقرر کی جاتی ہے اس مجلس کو کچھ اختیارات سونپے جاتے ہیں مجلس کے سپرد یہ کام ہوتا ہے کہ آئندہ متحدہ کوششوں سے کسی منظم پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ ایک عام شہری جب یہ خبر سنتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ مختلف پارٹیاں اب ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے بعد مل جل کر کام کریں گی مگر کار ایک مشترکہ پروگرام تلاش کرنا گویا وہی تکرار مباحثہ کا خاتمہ ہو گیا ہے اس کے بعد یہ امکانی امر پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اتحاد سے بڑی تقویت حاصل ہو گی چھوٹے چھوٹے گروہ علیحدہ کام کرتے تو کمزور رہتے، اب مل جل کر جانور بن جائیں گے لیکن میری رائے میں اس قسم کے تصور خود ساختہ غلطی ہے۔

ایک مقصد کے لیے جدا جدا عناصر کیسے جمع ہیں؟

میری رائے میں اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے پہلا اہم سوال ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ مختلف انجمنیں پارٹیاں اور عناصر جب سب ایک ہی قسم کے مقاصد لے کر اٹھی ہیں تو پھر ان کے نظریات کیوں جدا جدا ہیں اس سوال کا جواب

سبق آموز بھی ہے اور راہ نما بھی۔ منتشر کا کام صرف یہ ہے کہ ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک انجمن کافی ہے۔ تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ مقصد ایک ہی ہو اور اس ایک مقصد کو پورا کرنے کے لیے متعدد پارٹیاں وجود میں آ جائیں۔

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مقصد کے لیے شروع شروع میں ایک پارٹی قائم ہوتی ہوگی کسی ایک شخص نے کوئی ایک گروہ جنم دیا کسی خاص مسئلہ کا کوئی حل تجویز کیا یوں ایک مقصد سامنے آیا اور اس شخص کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ایک تحریک وجود میں آ گئی۔

ہر انجمن یا پارٹی یوں ہی وجود میں آتی ہے پروگرام تو کسی موجود پارٹی کو دور کرنے پر مشتمل ہوتا ہے یا مقصد میں کوئی نیا رخ شامل کرنے کی فکر ہوتی ہے۔

جو تحریک پہلے شروع ہوئی اسے سبقت حاصل ہوتی ہے

جب ایک دفعہ یوں کوئی تحریک وجود میں آتی ہے تو اسے عملاً سبقت کے بعض حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اب ہر طریقہ کار تو یہ ہوگا کہ جو بھی فرد اس تحریک کے نصب العین کی خاطر جدوجہد کرنا چاہیں انہیں اسی تحریک میں شامل ہونا چاہیے نظریات بدلنا چاہے تاکہ منتشر کر مقاصد کے حصول کے لیے بہتر اور زیادہ موثر کوشش ہو سکے بالخصوص صاحب رسوخ کا تو فرض ہے کہ وہ تحریک میں شامل ہو کر منتشر کر مقاصد کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں ہاتھ بٹائیں غرض معقولیت اور رواداری کا تقاضا ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک ہی تحریک چلائی جانے میں مختلف اور متضاد کر دوں کا کر کسی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے وحدت اور خلوص شرط اول ہے۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس کی وجوہات میں پہلی وجہ تو رقابت اور حسد ہے دوسری وجہ قابل رحم ہے کیونکہ اس کی جڑیں انسانی کی ایک ازلی کمزوری پر مبنی ہے اگر مسئلہ کی تہہ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان دونوں وجوہات کی پشت پر ایک تیسری وجہ کام کر رہی ہے اس تیسری وجہ کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اپنا نظریہ زیادہ بہتر بنانا چاہیے

ہمیں پہلے سے زیادہ جوش اور قوت کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم یہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم انسانی کمزوریوں پر غالب آجائیں گے۔ انسانی کمزوریوں پر غلبہ پا لیا گیا تو ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ہر تحریک کے پس پشت تحریک کا بانی ہوتا ہے

کسی مقصد پر کام کرنے کا اہتمام ایک پارٹی کے دماغ کیوں نہیں چھوڑ جاتا۔ اس کی جس پہلو کو میں نے اوپر کریدنے کی کوشش کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کسی دنیا میں جتنے عظیم کارنامے انجام دیے جاتے ہیں ان کی پشت پر کوئی ایسی خواہش ہوتی ہے جس کی تڑپ مدت سے انسان کے سینوں میں موجود تھی پہلے یہ تڑپ خاموش تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صدیوں تک انسان کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کا متمنی رہتا ہے وہ ہمیشہ حالات کے صدمے جھیلتے رہتے ہیں لیکن سب کے دلوں میں جو خواہش ہوتی ہے اس کو ہوا کرنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی جو قومیں ایسی مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے کی شبانہ روز جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوتیں انہیں بدنصیب سمجھنا چاہیے اگر وہ ایسی کوشش ہی نہ کریں تو انہیں زوال پذیر سمجھنا چاہیے کسی قوم کی ہمت اور قوت عملی کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جو اسے مطلوبیت سے نجات دلائے جس قوم میں یہ کس بل ہو وہ زندہ رہنے کا حق رکھتی ہے ایسے راہنما خوش قسمت سے ہی قوم کو میسر آیا کرتے ہیں وہ قوم کو کسی بدترین عذاب سے نجات دلاتے ہیں یا قوم کو جو خطرات درپیش ہوتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتے ہیں ساری قوم کے دل میں ہو سکتا ہے کہ برسوں عرصہ سے تڑپ رہی تھیں انہیں پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

جس مسئلہ کو وقت کے عظیم مسئلہ کہا جاتا ہے اس کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ انہیں حل کرنے کی امنگ ہزارہا سینوں میں موجود ہوتی ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس امنگ کا پورا کرنا فرض ہے خواہ قسمت ہزارہا افراد کو ایک ہی مہم پر روانہ کرنے کے لئے آگے

لڑائی ہے اقتدار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک کھلے مقابلے کے بعد جو سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ دلیر ہو یا اکثریت کی کامیابی کا انتظام کیا جائے۔ مسئلہ حل کرنے کا سہرا ایسے منتخب روزگار فرد کے سر ہی رہتا ہے۔

پیغمبری کے جھوٹے دعوے دار

ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیوں تک انسان کی کثیر تعداد اپنی مذہبی زندگی سے مطمئن نہیں ہوتی وہ چاہتے ہیں کہ اپنے دین کی اصلاح کریں روح کی اس پکار کے جواب میں درجنوں ایسے مدعی پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں یہ الہام ہوتا ہے کہ اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق وہ زندگی کی مذہبی دقتیں حل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں اسی زعم میں وہ نئی تعلیمات کے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کر دیتے ہیں یا کم از کم موجودہ دینی عقائد سے بیزاری کا اعلان کرنے لگتے ہیں۔

یہاں پھر یہ امر قطعی ہے کہ اقتدار کے مقابلے ہوں یا دین کے جو بہترین ہوگا جو سب سے زیادہ قوی ہوگا اسی کو اس منصب کے لیے منتخب کیا جائے گا لیکن عام دستور یہی ہے کہ طریقہ آزمائی سے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صرف ایک ہی شخص اس کام کے لیے موزوں ہے بلکہ ہر شخص اس کے دعویدار بن جاتے ہیں کہ انہیں بھی دعوت سے عمل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اس منتخب روزگار شخص کو انہیں زعم ہوتا ہے کہ وہ بھی یہ خدمت انجام دینے کی استطاعت رکھتے ہیں معاصرین یا ہم عصر یہ طے نہیں کر سکتے کہ متعدد دعویداروں میں سے کون بہترین صلاحیت رکھتا ہے اور کون سب کی متفقہ تائید کا مستحق ہے۔

اختلاف کا مقصد حق و باطل کا امتحان ہے

یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے یا کم از کم قرنوں سے ایک ہی مقصد کے پورا کرنے کے لیے مختلف اور متضاد تحریکیں قائم کرتے ہیں ہر تحریک کا بانی ایک ہی مقصد پیش کرتا ہے یا کم از کم عوام یہ سمجھتے ہیں کہ مختلف تحریکوں کا مقصد ایک ہے عوام تو صرف موہوم خواہشات محسوس کرتے ہیں عوام کو دوسرے لوگوں [illegible] اپنی عوام کے سامنے اپنے نصب

ہیں کا تصور صاف نہیں ہوتا۔ عوام یہ ٹھیک طرح نہیں جانتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں عوام میں یہ فیصلہ کرنے کی استعداد نہیں ہوتی کہ ان کا اصل ٹھکانہ کہاں ہے اور طور اشارات کس حد تک اور کس طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔

سچ کی بات یہ ہے کہ مختلف انسان ایک ہی منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کرتے ہیں ہر ایک کو خلوص سے یہی زعم ہوتا ہے کہ اس کام کو میں دوسروں سے بہتر انجام دے سکتا ہوں ہر ایک اسی وہم میں گرفتار رہتا ہے کہ میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے میرا فرض ہے کہ دوسروں کی پروا کیے بغیر اسی راستے پر گامزن رہوں۔

یہ تو کہیں دیوانوں پر ہنسی کرتے وغیرہ وغیرہ سب وقت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایک دوسرے سے جدا جدا وجود میں آتے ہیں سب کا مقصد ایک ہی سب انھیں کا حصول ہوتا ہے یہ کہ وہ تاحصار بعید وہ بالا ہر بعید وہ نظر آتا ہے عام لوگوں کا خیال تو یہی ہے کہ جو طاقت مختلف راہوں میں منتشر ہے اگر وہ ایک مشترک جادہ پر متحد ہو جاتی ہے تو مقصد بہت جلد پورا ہوتا ہے اور کامیابی کی منزل تک پہنچنے میں کوئی شک باقی نہ رہتا لیکن یہ خیال درست نہیں فطرت اپنے اٹل اصولوں کے مطابق خود اس تصادم کا آخری فیصلہ کرتی ہے فطرت مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں صریحاً مقابلہ کرنے کی دعوت دیتی ہے سب کامیابی کی منزل کی جانب دوڑتے ہیں اس دوڑ میں ہر ایک سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے مگر جس کا راستہ سب سے مختصر ہو، جس کی رو سب سے زیادہ واضح ہو جو سب سے زیادہ عوام کا دل موہ لے اسی کی تحریک کامیاب ہوتی ہے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن

اگر مختلف فریق ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہ کریں تو وہ فیصلہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کون دوسرے سے بہتر ہے اگر آخری فیصلہ ان مشوروں کی صوابدیدگی پر چھوڑ دیا جائے جو اپنے حق کی برتری کے زعم میں کامیابی کی کچھ نشانیوں کی

بھی پروا نہیں کرتے تو پھر کوئی تعلیم کس طرح ہو سکتا ہے کسی اقدام کے حق و جواز کا آخری معیار یہی ہے کہ وہ طرز کامیابی کے نصیب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف گروہ مختلف راستوں سے ایک ہی منزل کی جانب بڑھیں تو کوئی ہرج نہیں جو بھی ہر طریق کے علم میں یہ بات آئے کہ اس مجلس مشاورتی کو کوشش کسی اس راہ میں جاری ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ بڑی احتیاط سے بار بار جائزہ لے کہ کیا واقعی اس نے بہترین راستہ اختیار کیا ہے کیا اس سے مختصر راستہ تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ کیا منزل تک جلد پہنچنے کی کوشش کا اور کوئی امکان بھی ہے؟

سفر کرنے سے ہی منزل تک پہنچتے ہیں!

باہمی مقابلے سے اس ہوڑ میں حصہ لینے والے ہر فریق کی استعداد بڑھ جاتی ہے بنی نوع انسان نے کارکردگی کا جتنا کام ہوئے وہ اس کی ہمسر راہوں سے ہی حاصل کیے ہے۔ غرض یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ منزل تک پہنچنے کا بہترین راستہ مختلف راہوں پر سفر کرنے سے ہی دریافت ہو سکتا ہے جس کیلئے کو ہم نے شروع میں پیچیدہ دیکھا تھا وہ درحقیقت قدرت کا ایک بہت بڑا انعام ہے جس پر کبھی کبھی افسوس ہوا تھا کہ ہر فریق کی قوتیں جدا جدا راستوں پر ضائع ہو رہی ہیں اس اتلاف کی ذمہ داری دراصل غیر شعوری طور پر ہر گروہ کے سر ہے۔

جرمن قوم کے اتحاد کے دو راستے تھے

آپ اب اس اصول کا اطلاق تاریخ کے واقعات پر کریں۔ جرمن قوم کو جو مسئلہ درپیش تھا جب اس کا حل تلاش کرنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو کسی زاویہ میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے صرف دو راستے تھے دراصل شروع سے ہی ان دونوں راستوں پر چلنے کا فیصلہ کر لیا جانا چاہیے تھا ایک وہ راستہ جس پر آسٹریا کی حکومت چل رہی تھی دوسرا وہ راستہ جو پرشیا کی حکومت نے اختیار کیا تھا۔ آسٹریا کے تاجدار صدیوں سے جرمنی پر حکمران چلے آتے تھے اور پرشیا کے فرمانروا ان

مسائل جنگ سے ہی حل ہوتے ہیں

آخر کار ایک مضبوط اور متحد جرمن سرکار کا قیام مکمل حالات کا مرہون منت تھا یہ وہی حالات تھے جنہیں بالکس جرمن ذہانت کہتے تھے اس حالات کو برقرار رکھنے کی صلاحیت اور جیسا کہ مظاہرہ کیا جا چکا ہے کہ جرمنی کے تمام ہی طبقوں کی شان ہی نرالی ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ جنگ سے وابستہ ہو گیا۔ یہ جنگ کوئی گزرے زمانے کی جنگ نہیں تھی بعد کے مورخین نے رائے ظاہر کی ہے کہ جرمنی کے تمام طبقوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ان کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی خواہش تھی کہ جنگ ہو۔ یہ غلط ہے ہاں دیکھا جائے تو جرمن سرکار کی بنیاد متحدہ جدوجہد اور اشتراک کار پر استوار نہ ہوئی تھی بلکہ جبر کر ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھی ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس جنگ متحدہ میں حصہ لینے والوں کو یہ شعور نہ تھا کہ ان کی جدوجہد کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے اس تناظر میں دیکھا جائے تو فتح حاصل کی اگر کوئی شخص سیاسی ذہانت سے عاری ہو جائے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ محض عقل انسانی کے بل بوتے پر جدوجہد کی جاتی تو یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا یہ مسئلہ دراصل قدرت کی دانش مندی سے جڑا ہوا ہے قدرت نے اپنی دانش مندی کا اظہار مختلف حالتوں کو اکٹھا کر کے اس لڑائی سے ہی آخر اس اتحاد کی صورت ظاہر ہوئی جہاں تک عقل انسانی کام کر سکتی تھی وہ صدیوں پہلے کون شخص جرمن حالتوں پر نظر ڈال کر سمجھ سکتا تھا کہ کوئی جرمن سرکار کی بنیاد خاندان ہوہنزلرن نہ رکھ سکے گا بلکہ پرشیا کے خاندان ہوہنزلرن سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے گا ہو آج کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ

تقدیر کا فیصلہ انسان کے فیصلے سے بہتر ثابت ہوتا ہے آج کون یہ کہے گا کہ ہمیں سرکاری
ہیا کسی رسول پر ہر ورد بالواسطہ شاہی خاندان پر رکھی جانی چاہیے۔

ہیں اختلافی ارتقا کر چہ ایک صدی میں مکمل ہوا لیکن دکھائی دیتا ہے کہ حق اختلاف
رہے۔

اختلاف بھی باعث رحمت ہو سکتا ہے

ور آئندہ بھی ایسا ہوگا اس لیے یہ کوئی افسوس کی بات نہیں کہ مختلف لوگ ایک ہی
مقصد حاصل کرنے کے لیے الگ الگ کوششیں کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے
ذریعے سب سے مضبوط اور سب سے بہتر راستہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اسے
کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔

قوموں کی زندگی میں ایک ہی نوعیت کی مختلف تحریکیں جدا جدا راستوں سے ایک
ہی منزل تک پہنچتی نظر آنے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے یہ دوسری وجہ افسوس ناک
نہیں بلکہ رحم کی مستحق ہے اس کی بنیاد حسد، رقابت اور بد دلی ہے۔ اس
کی بنیاد اس جذبے پر ہے کہ دوسروں کا کامل اپنی جیب میں ڈال لیا جائے۔ خصوصی سے یہ
انسانی کمزوریاں بعض اوقات ایک ہی فرد میں جمع ہو جاتی ہیں۔

حسد بری بلا ہے

جب کبھی کوئی ایسا شخص منظر عام پر آتا ہے جو اپنی قوم کی بہبود کا اصل ہدف تشخیص کر
لیتا ہے جب بھی حقیقی مرض تشخیص کر لیا جاتا ہے اور اس مرض کا علاج شروع ہوتا ہے
ہو یہی منزل معین کر کے قافلہ سفر پر روانہ ہوتا ہے تو تھوڑے اور کم ہمت طرز پر ہی طرح
متوجہ ہو جاتے ہیں وہ اس راہنما پر نگاہ رکھتے ہیں جو اب عوام کی توجہ کا مرکز بن چکا
ہوتا ہے جس طرح چھوٹی چھوٹی چڑیاں بظاہر ایک دوسرے کی طرف جھپٹ کر کے جھپٹتی
ہیں لیکن دراصل سب کی نگاہ اپنے اس خوش قسمت ساتھی پر ہوتی ہے جسے روٹی کا کوئی
بڑا ٹکڑا کہیں سے مل جائے تو وہ فوراً اپنے سے چھیننے کی کوشش کریں گی اور اگر وہ ناکام ہو تو

ہی کی جبجن رہی ہے جائیں گی یہی حال ان تحریکوں کا ہے جو بھی کوئی مخلص لیڈر رہنمائی کر کے شروع کرتا ہے وہ ہیں خلاؤں کی ایک فوج کان پھاڑ پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیتی ہے کہ یہ اس منزل پر پہنچ گیا تو اسے کیا ہو گیا کچھ ہونے کا نہیں اس کا ارادہ ہو جاتا ہے کہ منزل پر پہنچ کر ..... کیا تمام شے کا وہیں وہ اپنی سمجھ کے مطابق کوئی اور راستہ اختیار کر کے پہلے مسافر سے قبل وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خدا انقلابوں سے بچائے

جو بھی کوئی نئی تحریک قائم ہوتی ہے اور یہ صحیح پروگرام پیش کرتی ہے اس قسم کے لوگ آگے بڑھ کر اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں کہ ہم بھی اس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نیک اخلاص سے اس تحریک میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا اس کی مسابقت کا حق تسلیم کرتے ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ پروگرام پیش کر کے اس پروگرام کو ایک نئی پارٹی تعمیر کرنا چاہتے ہیں یہ صحیح حرکت پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر یہ لوگ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیتے ہیں وہ ہمیشہ کچھ عوام کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ جو راستہ اس تحریک نے اختیار کیا ہے ہم بھی عرصہ سے اسی راستے پر گامزن ہونے کے لیے ہی قول دے رہے تھے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ پیچھے پڑے ہوئے فریب میں کامیاب ہو جاتے ہیں درحقیقت وہ نفرت کے مستحق ہوتے ہیں یہ کیا شرمناک بات ہے کہ جو انسان کسی شعبہ میں پہلے سے پایا جاتا ہے اسے وہاں سے اتار کر اپنا جھنڈا مشہور کر دیا جائے۔ کسی دوسری تحریک کے پروگرام پر ڈاکہ ڈال کر ایک نئی صناعت کھڑی کر دی جائے گویا اس نئی صناعت کے بانی نے وہ پروگرام تصنیف کیا ہے اس بے ایمانی کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب نئی صناعت قائم کر کے افتراق اور اختلاف کی آگ بھڑکانے والے افراد خود ہی انتشار اور تضاد کا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں یہ نفاق اور اتحاد کے نعرے تب بلند کیے جاتے ہیں جب انہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ مسابقت کی دوڑ میں اپنے حریف سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

یہی روش ہے جس کے باعث وطن پرستوں کے حوصلے بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

اختلاف کی بنیاد طلوص پر ہو تو اتحاد میں دیر نہیں لگتی

1918ء اور 1919ء کے زمانہ میں نام نہاد محب وطن گروہوں اور پارٹیوں کا قیام ایک عام سی بات تھا۔ ان جماعتوں کی کثرت کی وجہ داری ان بانیوں کے سر پر تھی۔ 1920ء تک قوم پرست سوشلسٹ نیشنل مزدور پارٹی آہستہ آہستہ کئی چھوٹی پارٹیوں پر غلبہ پا کر نمایاں مقام حاصل کر چکی تھی ان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں سے کئی ایک کے بانی بے تکلف اور دیانت دار تھے کہ انہوں نے قابل تعریف تگ و دو سے اپنی ناکام جماعتوں کو ختم کرتے ہوئے نئی جماعت میں غیر مشروط طور پر شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہی روش دائیں بازو کے ایک تو جولیس سٹرائچر نے فرنکن کی جوان دنوں فرانکن بورگ میں نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا بڑی تھا قوم پرست سوشلسٹ نیشنل مزدور پارٹی کے خواص و مقاصد نیشنل سوشلسٹ پارٹی سے ملتے جلتے تھے لیکن دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کے بغیر قائم ہوئی تھیں سٹرائچر ان دنوں فرانکن بورگ میں ایک مطلق العنان حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے پہلے کہہ چکا ہوں وہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا سب سے بڑا حامی تھا۔ اپنے نصب العین پر پختہ ایمان تھا۔ اپنی تحریک کی مستقبل میں کامیابی میں کوئی شک نہ تھا لیکن جونہی قوم پرست سوشلسٹ پارٹی کی برتر قوت اور وسعت کا سٹرائچر کو احساس ہوا اس نے نیشنل سوشلسٹ پارٹی ترک کر کے اپنے پیروؤں سمیت قوم پرست سوشلسٹ نیشنل مزدور پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی کیونکہ یہ پارٹی نیشنل سوشلسٹ پارٹی پر غالب آ چکی تھی سٹرائچر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی "آزاد و جداگانہ" پارٹی میں شامل ہو کر جاری رکھے گا یہ فیصلہ بھی آسان نہ تھا لیکن اس نے یہ فیصلہ کیا اس کا اخلاق اور دیانت داری ظاہر ہے۔

اختلاف برائے اختلاف خود غرضوں کا شیوہ ہے

جب تحریک کا پہیہ دوبارہ گھومنا شروع ہو گیا تو پھر ہماری ہم مسلک ساتھیوں میں سے کوئی خرابی باقی نہ رہی۔ وہ بڑی بڑی ذاتیں اور معزز صاف کو اور مسلک مزاج شخص اپنے اخلاق سے خود بخود ہماری طرف کھنچا آتا تھا۔

میں نے اوپر محب وطن مہاجر کی صفوں میں جس انتشار کا ذکر کیا ہے اس کا سبب مذکورہ بالا دوسری وجہ بھی تھی۔ ہر مسلک مزاج آدمی کا یہ کوئی ضمیر نہ تھا۔ اس کا کوئی نصب العین نہ تھا وہ قوم پرست مسلک مزاج پارٹی کی کامیابی کو دیکھ کر اس کی تقلید کرنے لگے۔

بلکہ ہمارے پروگرام سے ملتے جلتے دوسرے پروگرام پیش کیے جانے لگے۔ ہمارے مطالبات ہم سے پہلے ان کا جلسہ کا اعلان کیا جاتا۔ اس مقاصد کی خاطر ہم سال سال بھر کام کرتے آئے تھے انہی کا نیا پارسل نو شروع کیا جا رہا تھا۔ ان راہوں پر محب وطن قوم پرست مسلک مزاج چلتے آئے تھے۔ بس بطور ایک رواج کے پیش کیا جانے لگا لوگوں کو یہ بتلانے کے لیے کہ اگر یہ قوم پرست مسلک مزاج پارٹی کیسے مدت سے موجود ہے پھر بھی اس جیسی دوسری پارٹیاں قائم کرنے کی ضرورت ہے طرح طرح کے کرتب اختیار کیے جاتے تھے ان لوگوں کے لحاظ ایسے ہی دلچسپ تھے جیسا کہ ان کی حیثیت خود تھی۔

قائدین کی کمزوری جاہ طلبی ہے

حقیقت میں ان سب چالوں سے غرض صرف ایک تھی وہ غرض تھی ان بڑے بڑے ایوان تحریک کی جاہ طلبی یہ نئی نئی انجمن بنانے والے لوگ جو چاہتے تھے کہ بغیر کوئی نئی خدمت انجام دیے محض برتری حاصل ہو جائے ان کی سب سے بڑی خواہش ان کی بے تری تھی وہ دوسروں کے کمالات پر اترانے سے باک نہ رکھتے تھے عام زندگی میں ایسے ہی لوگوں کو چور کہا جاتا ہے۔

ان دنوں کوئی ایسا پنڈال یا تصویر نہ تھی جو عام ہو آئے دن جب کہ اس پر اپنے ہاتھ کی صفائی کی مشق نہ شروع کریں جن لوگوں سے سرزد ہوتی تھیں، وہ

جماعتوں کے اتحاد سے کبھی قوت پیدا نہیں ہوتی البتہ یہ اکثر ہوتا ہے کہ مضبوط جماعت جب کسی کمزور پارٹی سے اتحاد کرتی ہے تو خود اپنی طاقت بھی کھو بیٹھتی ہے یہ خیال غلط ہے کہ کمزور گروہوں کے مل جانے سے کوئی قوی گروہ وجود میں آسکتا ہے تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکمل بکھرے ہوئے حالات بکھری ہوئی دنیا میں کامیابی ہمیشہ انتشار اور نکاموں کی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بہت سی جماعتیں مل جاتی ہیں تو ان سب جماعتوں کی منظوری سے ان کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترک مجلس منتظمہ معرض وجود میں آجاتی ہے اس مجلس میں کمزور جماعتوں اور پارٹیوں کی ہوتی ہے اس قسم کے اتحاد کے بعد کھوکھلے مفاہمت کا امکان کوئی نہیں رہتا یہ سوال نہیں رہتا کہ بہترین رہنما کو کیسے لایا جائے یہاں سب سے زیادہ کمزور سست اور سب سے زیادہ قومی مجلس کی کامیابی یقینی نہیں ایسے اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں آجاتی ہیں اس مسلک کی خاطر اتحاد قائم ہوتا ہے اسے اس اتحاد سے زیادہ کی جگہ نقصان پہنچتا ہے۔

جداسی کی بجائے جماعتوں کا اتحاد وقتی ہو سکتا ہے

یہ ہو سکتا ہے کہ محض ایک پل کے طور پر کسی مستقل پالیسی کو نظر رکھتے ہوئے تحریک کی قیادت ہم مسلک جماعتوں سے اس بنا پر کوئی مشترکہ محاذ قائم کرے کہ کسی مسئلے کا حل حل کر حل تلاش کیا جائے یا کسی ایک پالیسی کو رد کر دیا جائے لیکن یہ صرف عارضی اور ہنگامی حل ہو سکتا ہے دو جماعتوں کا اتحاد کبھی مستقل نہ ہونا چاہیے ایسے اتحاد کا صرف مقصد یہ ہوگا کہ ہر تحریک اپنی برتری سے دست بردار ہو جائے جب مشترکہ محاذ قائم کیا جاتا ہے تو متحدہ جماعتیں اس طرح پھنس جاتی ہیں کہ اپنی اپنی طاقت کو صحیح اپنی مرضی سے بھی جدوجہد میں استعمال کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ نہ ہی فریق غالب کو مکمل کامیابی حاصل کرنے کا کوئی امکان باقی رہتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا کا کوئی کارنامہ مشترکہ کوششوں سے انجام نہیں پاتا۔ کارنامے ہمیشہ فرد کی کامیابی سے انجام پذیر ہوتے ہیں مشترکہ محاذ سے جو کامیابیاں

حاصل کی جائیں وہ کھوکھلی ہوتی ہیں۔ کیونکہ باہمی شرکت ختم ہو جانے پر اس شرکت میں سے آئندہ اختیار کے ثمرات حاصل آنے ہیں اشتراک میں بہبود اختیار کے ثمرات موجود ہوتے ہیں جو کوشش ہاتھ سے حاصل کیا جاتا ہے وہی ہاتھ سے چھن جاتا ہے انسانی عقل کی ترقی میں جو عظیم الشان اثر ہے رونما ہوئے ہیں سے روئے زمین کا حلیہ بدل گیا وہ ثمرات بدست جد و جہد کے بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچے جا سکتے تھے یہ جد و جہد بہبود افراد کے ماتحت ہوتی ہے متحدہ محاذ اس میں حصہ نہیں لے سکتے۔

بڑی بات یہ ہے کہ عوامی سرکار کی محب وطن اتحاد سے قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ اتحاد کے لیے ثمرہ باہمی مصالحت ہے۔ عوامی سرکار کا قیام مصالحت سے نہیں بلکہ کسی تحریک کے عملی عزم سے عمل میں آئے گا جبکہ عزم صرف ایک ہی جماعت میں پایا جا سکتا ہے جو دوسری جماعتوں کے ساتھ جد و جہد کے بعد ان پر غالب آ چکی ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب نہم :: طوفانی دستوں کی تنظیم کے متعلق بنیادی تصورات

سرکار کے تین بنیادی ستون

ہر ملک میں سرکار کی قوت تین بنیادی ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی سرکار میں اول قیصری ملوکیت دوسرے مستقل سرکاری ملازمین اور تیسرے فوج۔ 1918ء کے انقلاب کے بعد ملوکیت ختم ہوگئی فوج کی طرف کر دی گئی اور سرکاری ملازمین کا سیاسی پارٹیوں کی مدد باقی اور رشوت خوری نے سنیاناس کر دیا۔ یوں اقتدار سرکار کی بنیاد دو ستونوں پر قائم رہ گیا۔ سرکار کا اقتدار تین بنیادوں پر منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا جس سرکار کے تین ستون ختم ہو جاتی ہے۔

عوامی تائید وہ بنیاد ہے جس کے بغیر سرکاری اقتدار کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔ لیکن فقط عوامی تائید سرکاری اقتدار کے قیام کے لیے کافی نہیں ہو۔ اقتدار محض عوامی تائید پر قائم ہو گا وہ کمزور، بے لچکی اور متزلزل ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو عوامی تائید سے اقتدار حاصل ہو جائے وہ اپنے اس اقتدار کو مستقل یا مضبوط بنانے کی خاطر انسانی قوت بھی فراہم کرتا ہے۔ غرض انسانی قوت یا انسانی قوت ستونوں کر سکے کا اقتدار اقتدار کی دوسری طرف ہے یہ دوسری بنیاد پہلی بنیاد کے مقابلے میں زیادہ پائیدار اور مضبوط ہے لیکن انسانی قوت ہمیشہ عوامی تائید سے زیادہ موثر نہیں ہوتی اگر عوامی تائید اور انسانی قوت دونوں یکجا ہو جائیں اور کچھ عرصہ تک کامل کرتی رہیں تو پھر اقتدار کی ایک تیسری بنیاد بھی حاصل ہو جاتی ہے جو ان پہلی دو بنیادوں سے زیادہ مضبوط اور موثر ہے یہ تیسری بنیاد ہے رواج، دستور اور روایات کی تائید۔ جب کسی اقتدار کی پشت پر عوامی تائید، انسانی قوت اور روایتی تصدیق اکٹھی ہو جائیں تو پھر وہ اقتدار مستحکم ہو جاتا ہے قائم نہیں رہ جاتا ہے۔

روس میں انقلاب کے بعد اقتدار کی یہ تیسری اور آخری بنیاد بھی کھوکھلی ہو چکی تھی

کوئی ایسی قوت باقی نہ رہی تھی جس کی مدد سے روسی عوام مدتوں سے ہوئی آئی ہو۔ پرانی سرکار ختم ہو گئی قیصری ملوکیت ختم کر دی گئی شہنشاہیت اور عظمت کے پرانے تمام نشان مٹ گئے رواج اور روایات کا بھی خاتمہ ہو گیا نتیجہ یہ تھا کہ عنان اقتدار سرکار کے ہاتھ سے زمین پر گر گئی۔

فوج کی بنیاد نظم اور اطاعت پر ہے

عنان اقتدار کا دوسرا ستون یعنی انسانی قوت بھی اب باقی نہ رہی تھی انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر جو لاکھوں کی تعداد میں فوج بھرتی کر دی گئی تھی عنان اقتدار سرکار کی تنظیم اور حفاظت کا سب سے بڑا سہارا سمجھا جاتا تھا یہ فوج بھی روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ خود فوج کے اعلیٰ عہدہ دار انقلاب کی حمایت میں شورش پھیلانے کے لیے استعمال کیے گئے جو فوج محاذ جنگ پر تعینات تھی اس میں سرکار کی فوجیں زیادہ دلیل نہ ہو سکیں لیکن جوں جوں فوجیں میدان جنگ سے واپس آتیں توں توں فوجوں میں بھی اس انقلابی خیالوں کے زہر اثر کرنے لگے جس نے دارالحکومت کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا تھا میدان جنگ قومی عظمت کی یادگار اور شہیدوں کا گہوارہ تھا لیکن وہ میدان جنگ اب پیچھے رہ گیا تھا جب فوجیں نظم و ضبط توڑنے کے بعد مراکز پر واپس پہنچیں تو فوجی بھی اس ہڑبونگی کا شکار ہو گئے اس کے بڑے بڑے دشمن طرف پھیلے ہوئے تھے انقلابی فوجیوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ فوجیں بنا رکھی تھیں ان فوجوں نے ایک نئی اصطلاح گھڑ لی تھی وہ اصطلاح تھی "رضاکارانہ اطاعت" اطاعت کا مفہوم تو ہر سپاہی جانتا ہے لیکن جب اطاعت رضاکارانہ ہو تو پھر وہ اطاعت تو نہ رہی بلکہ موت ہو گی۔

خالی عوامی تائید سے حکومت نہیں چلتی

بلشویکوں باقی فوجیوں کے سہارے کوئی اقتدار کا مرکز قائم کرنا ممکن تھا یہ باغی فوجی تو اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ کارخانے کے جانباز مزدوروں کی طرح فوجی بھی اس دن کے منتظر تھے فوج کے اعلیٰ کا پابند ہوتے ہیں وہ دوسرے ستون پر رکھا تھا اس کے سہارے

سرکار کا اختیار قائم ہوتا ہے اب عام میں انتخاب کے بعد اختیار کا صرف ایک ظاہری رہ گیا تھا جمہوری تو بیدلس اسی رسم انتخابی سرکار کے وجود کا ذمہ دار تھا لیکن اختیار کی بنیاد حکمت عملی تھی یہ ٹھیک ہے کہ انتخاب نے چند متمدن ملکوں سے بادشاہی سرکار کا خاتمہ کر دیا تھا اور اس کی جگہ جمہوری سرکار قائم کی تھی لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم کی معاشرت کا نظام پہلے ہی جنگ کے صدموں کی تاب نہ لاتے ہوئے درہم برہم ہو چکا تھا۔

ہر قوم میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں

ہر قوم کی ہیئت تشکیلی طبقات پر مشتمل ہوتی ہے ایک طرف تو وہ گروہ ہوتا ہے جسے قوم کا بہترین عنصر کہا جا سکتا ہے یہاں بہترین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بہترین شہری ہوتے ہیں وہ ذہری مدبر ہوتے ہیں وہ اپنے ذاتی مفاد کو کام کرنے پر آمادہ رہتے ہیں دوسری طرف وہ گروہ ہوتا ہے جنہیں تنگ قوم بدترین عنصر کہا جا سکتا ہے وہ مکار، خطا کار، ریا کار اور خود غرض بیکار ہوتے ہیں ان دونوں گروہوں کے بیچ میں تیسرا گروہ متوسط درجہ کے لوگوں کا ہوتا ہے جن کی شرافت اور نیچ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

کسی قوم کو عروج تب حاصل ہوتا ہے جب اس کی قیادت کی باگ ڈور اس کے اشراف کے ہاتھ میں ہو جب کسی قوم کی قیادت متوسط طبقے کے ہاتھ میں آ جائے تو پھر وہ ترقی اور روادار کی جانب گامزن ہو چلتی ہے حالات میں اعتدال رہتا ہے متوسط طبقہ کے خصلتیں اور عادتیں قومی زندگی میں بھی رواج ہونے لگتی ہیں یہ وہ دور ہوتا ہے جب کہ اشراف کا گروہ اور نیچوں کا گروہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر غالب نہیں ہوتا سب اپنی اپنی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔

کسی قوم کا زوال کا وقت تب ہوتا ہے جب اس کی قیادت اس کے رذیل اور بیکار طبقہ کے ہاتھ میں آ جاتی ہے یاد رکھنا چاہیے کہ عوام الناس یا متوسط طبقہ تب ہی برسر اقتدار آتا ہے جب کہ نیچوں اور شریفوں میں تصادم اندرونی صورت اختیار کر جائے اور

ہمیشہ ایسے ہی جوان تو رضا کاروں کی بھرتی ہوتے ہی لبیک کہتے تھے، بڑھ رہا ہو رکھو کھا
ایسے جوان آگے بڑھے جوں جوں وہ آگے بڑھے توں توں قوم میں ایسے لوگوں کی کمی
ہوتی گئی جن کی آنکھیں نہ کھلیں وہ بالغ ہو گئے یا اگر کھلی بھی رہ گئیں تو وہ ہو گئے ہو
گئے پھر بھی انہوں نے اپنا کام جاری رکھا کیونکہ اس قسم کے مزید بچے فراہم نہ ہو رہے
تھے 1914ء میں جن لوگوں نے فوج کے لیے رضا کاروں پر مشتمل تھے ان کے
زمانے میں ان رضا کاروں کو پوری فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی ان کو فوجی تربیت دینے
کی وجہ یہ تھی کہ عام زمانہ امن کے پیشہ ور فوجی عہدوں پر بیشتر زمانہ امن میں جبری
بھرتی کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ یہ جوان بری طرح گولیوں کا نشانہ
بنے وہ لاکھوں جوان جو لڑائی کے میدان جنگ میں مارے گئے یا بالغ ہو گئے ان کی
کمی پوری نہ ہو سکی۔ ان کے مارے جانے کا نقصان ہوا اس کا اندازہ صرف تعداد
کے شمار سے نہیں لگایا جا سکتا ان کی موت سے قوم کے معاشرتی ڈھانچے کے پلڑوں کا
توازن درہم برہم ہو گیا ہمارے معاشرتی نظام میں پہلے ہی بہترین عناصر کا فقدان
تھا ان نوجوانوں کے کٹ مرنے سے اب چوروں جاہلوں اور کمزور عناصر کو فروغ
حاصل ہونے لگا۔ یہ لوگ اور ان کی بیویوں کی بے تحاشا افزائش ہماری آبادی کے بہترین عناصر کو
مغلوب حاصل ہونے لگا۔

رزمیہ جذبات سے ملت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے

پھر ایک اور وجہ بھی تھی جس سے ہمارے ہاں تک قوم کے بہترین افراد میدان
جنگ میں گولیوں کا نشانہ ہو رہے تھے یوں ہمارے بہترین افراد عبرت ناک طریقہ پر
موت کی جانیں بچا کر چھپ رہنے میں کامیاب ہوتے آئے تھے ہر اس جانباز کے ساتھ
ساتھ جس نے قوم کی خاطر جان کی بازی لگا دی اور جیتے جیتے جنت کا راستہ پا لیا کوئی نہ
کوئی ایسا بھگوڑا بھی موجود تھا جو اپنی بے موت کو عمل دے گیا اور یہ سلسلہ گھڑیال کی
ٹک ٹک کی طرح ہماری تاریخ میں مصروف عمل رہا ہے کسی قوم کی جدوجہد کے لیے نہایت ضروری ہے

ہوں جنگ کے اختتام کے بعد قوم کا جو نقشہ ان کے ذہن میں تھا وہ حسب ذیل تھا

متوسط طبقہ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے جان و مال کی عظیم قربانی دی تھی قوم کا محب وطن طبقہ جانبازی کی عدیم النظیر مثال پیش کرتے ہوئے قریب قریب سارے کا سارا ہوس ملک کی خاطر کٹ مرا تھا اس کے مقابلے میں قوم کا لعیب اور ہرجائی طبقہ قریب قریب سارے کا سارا محفوظ تھا اس طبقہ کے بچ نکلنے کی بڑی وجہ یوں تو اس حقیقت کو قرار نہیں تھے اور دوسرے یہ کہ سرکاری دفاتر نے جنگی کے کاموں پر تقریباً مکمل قبضہ کر لیا تھا۔

یہ مفروضہ کہ زندہ رہنے کا حق صرف افراد کو ہے

ہماری قوم کے ان کمزور معاصر نے جو مرنے سے اپنی جان بچا لے گئے تھے انقلاب برپا کیا وہ انقلاب برپا کرنے میں اس لیے کامیاب ہو گئے کہ قوم کا اشرف اور محب وطن طبقہ اپنی جانیں قربان کر چکا تھا یہ طبقہ ان باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اب زندہ نہ تھا۔

فرض کریں انقلاب شروع سے ہی قوم کے ایک حصے کی تائید سے برپا ہوا تھا اور اکثر انقلابیوں نے جو محاذ جنگ پر اس کی ذمہ داری قوم پر نہیں اس کی ذمہ داری تو ان گنتی کے چند لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس انقلاب کا بیڑا اٹھایا تھا۔

جو سپاہی محاذ جنگ پر تھے انہوں نے جنگ ختم ہونے کا خیر مقدم کیا خیر مقدم کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ بہت ہو چکا تھا سپاہی خوش تھے کہ گھر جائیں گے بیوی بچوں سے پھر ایک بار ملاقات ہو گی لیکن سپاہیوں نے انقلاب برپا کرنے کی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہ تھی وہ انقلاب کے حامی نہ تھے وہ انقلابیوں کے ساتھی نہ تھے جن لوگوں نے انقلاب برپا کیا اور انقلاب کی تحریک کے منظم سپاہی انہیں پسند نہ کرتے تھے سپاہی ساڑھے چار سال تک ایک جانکاہ جدوجہد میں مصروف رہنے کے باعث اپنے وطن

کے سیاسی مرد اور طور طریقوں کو اپنا لیا تھا۔ سیاسی کو یہ بھی نہ رہا تھا کہ وہ سیاست دانی مفاد کی خاطر کیسے کیسے مرتے ہیں۔

انتخابی فسادی ہوتے ہیں

انتخاب صرف جمہوری قوم کے لیے مخصوص طریقے میں مقبول تھا۔ یہ وہ طریقہ تھا جس نے کئی سرکار کے مالیت اپنا پن اور اخلاقی کمزوری کو معزز شہری بنانے کا مسلمہ طریقہ تسلیم کر لیا تھا۔ یہ طبقہ بھی انتخاب کو انتخاب کی خاطر پسند نہ کرتا تھا بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ شاید ہی صاحبان انتخاب درحقیقت انتخاب سے کوئی عقیدت رکھتے تھے حقیقت یہ تھی کہ صاحبان انتخاب صرف اس لیے انتخاب کے حوالے کرتے تھے کہ انہیں انتخاب سے ذاتی فائدہ پہنچتا تھا۔

مارکس روم کے حاکم دوسروں کا گھر دوست کر جیتے اس طریقے سے کوئی مستقل اقتدار حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا سرکار کو سرنگوں کرنا اقتدار قائم کرنا تھا۔ کسی سرکار اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہتی تو بادشاہ اس کی جان لیتی تھی یا کوئی عرصہ تک جیل میں مقفل رہنا ہوتا اس کے بعد قوم کے بہترین مشاہر باہم مجتمع ہو کر انتخاب کا خاتمہ کر دیتے۔

انتخاب برپا کرنے والوں کو ان دنوں سب سے بڑا خطرہ یہ لاحق تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں جو طوائف السلطانی پیدا کی ہے وہی ان کے خاتمے کا سبب نہ بن جائے کوئی موثر اور قوی اقتدار اعتدال کر انہیں گوشہ گمنامی میں دفن نہ کر دے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے مرحلوں پر اس قسم کے واقعات پیش آنے کی مثالیں موجود تھیں لہٰذا صاحبان انتخاب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح انتخابی سرکار کا اقتدار پائیدار اور مستحکم بنا دیا جائے۔

ظلم کو بھی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے

یہی وجہ تھی کہ انتخابی سرکار کے قیام کے تھوڑی عرصہ بعد سے ضرورت لاحق ہوئی کہ اپنی تقویت کے لیے کسی موثر چیز کا سہارا لے۔ اس وقت انتخابی سرکار کی واحد بنیاد

ہر دلعزیزی تھی لیکن تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ عوام میں ہر دلعزیزی کافی نہیں اقتدار کو پایدار بنانے کے لیے منظم قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے جب دسمبر 1918ء، جنوری اور فروری 1919ء میں انتخابات ہو کر نئے ارکان نے اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس کی تو انہوں نے چاروں جانب آسرے ڈھونڈنے شروع کیے کہیں ایسے لوگوں کی تلاش ہوئی جو فوجی قوت سے حکومت کی تائید کریں اس وقت تک ان جماعتوں کو صرف عوامی مقبولیت کی تائید حاصل تھی انقلابی سرکار کا قیام اکثریت کو کچلنے کی خاطر عمل میں آیا تھا۔ لیکن اب خود اس سرکار کو فوجیوں کی تائید کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت تک انقلابی سرکار کا انحصار جماعت بلشوک کے مخلص عناصر کی حمایت سے قائم تھا ان عناصر میں فدائی تھے پورے، ڈاکو تھے، خونی جھگڑے تھے اور فوجی خدمت سے جان چرانے والے تھے۔ ایسی عناصر کو ہم نے کسی قوم کے طبیعت عناصر قرار دیا ہے ان لوگوں سے کسی مقصد یا اصول کی خاطر ایثار یا قربانی کی توقع رکھنا محال تھا اس طبقہ نے انقلابی مجلس کی حمایت کی اور انتخاب دیا کیونکہ اس طبقہ کے اندر سے جانباز سپاہی مہیا نہ ہو سکتے تھے یہ طبقہ مضبوط سرکار کے قیام کا خواہش مند نہ تھا بلکہ وہ تو ہر سرکار سے تنگ تھا اس میں استقلال اور تحمل پیدا کرنے کی طاقت نہ تھی ان لوگوں کی زبان پر یہ نعرہ تھا کہ ہر شخص میں مضبوط سرکار کی تنظیم اور تعمیر کے بعد کر دہ ہو گیا ان کا اصرار تھا کہ ہر سرکار کو فنا کی گھاٹ اتار کر خوب توڑ رہا ہے۔

انقلابی نظم و نسق نہیں چلا سکتے

یہی وجہ تھی کہ جب عوامی لیڈروں نے گوناگوں خدشات سے متاثر ہو کر اپنی ہمدردی کی تو اس طبقہ میں سے کسی نے اس اپیل پر لبیک نہ کہا نے اس طبقہ نے تحمل اور بردباری کا اظہار کیا اس کا خیال تھا کہ فوجی قوت کی فراہمی اس کے مقاصد کے خلاف ہے جس کی بنا پر انقلاب برپا کیا گیا تھا ایسی حرکت مدد باقی کے مترادف ہو گی یہ عناصر ملک میں کوئی ایسی حالت دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے جس کی بنا عوام کی تائید کے علاوہ کسی

سے فوج میں شامل ہی نہ ہوتے تھے کہ ان کی تاخیر سے سزا میں موت کے سے نہایت ضروری ہیں بلوائیوں کی اس فوج میں دو دس ہزار بھگوڑے بھی شامل تھے جو موقع جنگ چھوڑ کر اپنی جانیں بچا لائے تھے۔

بھگوڑوں کو سزائے موت ملنی چاہیے

ایک بزدل شخص جس قدر موت سے ڈرتا ہے کسی اور شے سے نہیں ڈرتا۔ وہ موت سے بچنے کی خاطر ہر ایسا سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جہاں جنگ میں بزدلوں کو ہر طرف سے موت ہی موت نظر آتی تھی بزدلوں کو اپنے فرض پر آمادہ کرنے کا ہمیشہ صرف ایک ہی طریقہ رہا ہے اور جہاں تک بزدلوں کا تعلق ہے ان کے لیے آج بھی وہی ایک کارگر حربہ ہے۔ وہ حربہ یہ ہے کہ بزدل کو اس یقین کرا دیا جائے کہ اگر میدان جنگ سے بھاگے تو ضرور گولی مار دی جائے گی۔ جہاد جنگ میں جو سپاہی لڑتا ہے اس کے مارے جانے کا تو قطعاً امکان ہوتا ہے۔ لیکن بھگوڑوں کی موت کو یقینی بنا دینا ہے صرف ایسے جلادی قانون سے ہی نہ صرف بلکہ بزدلوں کو بھی پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے سے روکا جا سکتا ہے۔ فوج کی فتوحات میں بھاگنے کی سزا موت اسی مصلحت سے درج ہے۔

یہ عقیدہ خوب سمجھا تھا کہ جب قوم اپنی زندگی کو موت کی جدوجہد میں مصروف ہے تو صرف رضاکارانہ وفاداری پر اعتماد کرنے سے ہی کام چل جانے کا خطرہ رہتا ہے جس جان کی لیے سرفروشی پر آمادہ رہیں گے کہ وطن کو سرفروشی کی حاجت ہے۔ اپنے فرائض کی رضاکارانہ انجام دہی صرف بہترین انسانوں کا خاصہ ہے۔ اوسط انسان اپنے فرائض محض اپنی خوشی سے ادا نہیں کرتا۔ اس کے لیے خاص قوانین کی حاجت ہوتی ہے۔ چوری کی سزا اس لیے رکھی گئی ہے کہ جو لوگ فطرتاً اخلاق کے نہیں سے چوری کو برا سمجھیں کم از کم خوف کے مارے اس جرم سے بچے رہیں۔ ایسے قوانین مجرموں کو خوفزدہ کرنے کے لئے جرم سے باز رکھتے ہیں ایسے قوانین نہ ہوں تو صورت حال یہ ہو جاتی

ہے کہ بعض کوئی شخص زیادہ دیانتدار ہو تو اکثر وہ بے وقوف سمجھا جاتا ہے اس طرح عمل کے پیچھے جو ذہنیت کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خالی ہاتھ گھر لوٹنے سے بہتر ہے کہ چوری کے مال میں سے بھی حصہ وصول کیا جائے۔

جب ہر انسانی قدر سے خطرہ آ رہا تھا۔ کہ جرمنی کو کئی سال تک زیر رکھنے کی تو یہ خیال عام تھا کہ جنگوں نے لاکھ ہزاروں سال کے تجربے سے انسان کو مشکل حالات اور خطرات کی کیفیت میں اپنے غرض کی راہ لگی پر مجبور کرنے کے جو ہتھکنڈے دریافت کئے ہیں وہ اب تک کے ہو سکتے ہیں۔

میدان جنگ میں سخت سزاؤں کی ضرورت

یہ درست ہے کہ جو شجاع اور جرأت مند لوگ رضا کارانہ طور پر جنگ میں شامل ہوتے ہیں ان کے لیے جنگی قوانین میں موت کی سزا عائد کرنا ضروری نہیں۔ لیکن یہ سزا ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو قومی بحران کے وقت آجانے کی صورت میں اپنی جان کو قوم سے زیادہ قیمتی تصور کرتے ہیں۔ ایسے کمزور اور بزدل لوگوں کو اپنی بزدلی دکھانے سے باز رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے یہ طریقہ ہے سخت ترین سزاؤں کا خوف۔ جب انسان کو ہر روز موت کا سامنا ہو جب لاکھوں تک انسانوں کے بچوں میں زندگی بسر کرنی پڑے۔ اس دوران میں خوراک بھی پوری نہ ملے تو جس انسان کا ایمان متزلزل ہو جائے اور کوئی جواب دے جائے اسے صرف قید کی سخت کی دھمکیوں سے بھی مورچوں پر ڈٹے رہنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے موقعوں پر تو صرف گولی سے مرنے موت کا تماشا ہی کام دے سکتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے موقعہ پر ایک لاکھ قید خانے کو ہزار ہا میدان جنگ پر ترجیح دیتا ہے قید خانے میں کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ لڑائی سے باہر ہو گی وہاں جنگ میں سزائے موت کو موقوف ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جنگی قیدی رہا ہو جائیں۔ لاکھوں کی ایک فوج میدان جنگ کے عقب کے شہروں میں اپنے گھروں کو واپس آ جائے گی۔ 1918ء میں خاص طور پر ایسا ہوا۔ بلغاریوں

مجرموں کی وہ وسیع تنظیم وجود میں آنے لگی جس کا ہمیں 7 نومبر 1918ء کے بعد ایک
قوت سامنا کرنا پڑا۔ انقلاب انہی لوگوں نے برپا کیا۔

جرمنی میں کیوں بالشویک انقلاب برپا نہ ہو سکا

ان سب کارروائیوں سے محاذ جنگ پر لڑنے والوں کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ درست
ہے کہ محاذ جنگ پر لڑنے والے سپاہی بھی صلح اور امن کے خواہاں تھے۔ لیکن سپاہیوں کی
یہ خواہش ہی انقلاب کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ جب متواتر کی جنگ کے بعد جرمن
سپاہی گھروں کو آنے لگے تو انقلابی خوف زدہ ہو کر بار بار یہ سوال کرتے تھے کہ محاذ جنگ
سے واپس آنے والے سپاہیوں کا طرز عمل کیا ہوگا۔ ان لوگوں نے اپنے دل لڑائی
لڑتے لڑتے سفید کر لیے تھے وہ انقلاب برداشت کر لیں گے؟

انقلاب برپا ہونے کے پہلے چند مہینوں تک انقلابیوں کا یہی طرز عمل تھا اس کے
باعث انہوں نے کم از کم ابتدائی کارروائی اختیار کر لیا۔ وہ پوری طرح دخل نہ دینا چاہتے
تھے کہ جرمن فوج کے بڑے حصے انقلاب کو کچل کر رکھ دیں۔ اس وقت اگر کسی ایک
ڈویژن کا سپہ سالار بھی اپنے ڈویژن کے سپاہیوں کو حکم دیتا تو وہ بلا تامل اس کے فرمان کی
تعمیل کرتے اور سرخ جھنڈے کو پھاڑ پھینکنے کے بعد ہم پر مکمل عمل کے
راکین کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیتا تو ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی
فوج ایک ڈویژن سے بڑھ کر سات ڈویژن ہو جاتی۔ اگر کوئی مقابلہ کرتا تو توپوں اور
دستی بموں سے اس کے دھجیاں اڑا دیے جاتے انقلاب کے تماشہ کے کام دینے والے
در اصل یہودی تھے انہیں جرمنی فوج کا خطرہ تھا اور کسی کا نہ تھا۔ اسی خطرے سے بچنے کی
خاطر انہوں نے انقلاب کو قدرے اعتدال کے راستے پر ڈال دیا۔ ان میں یہ جرأت نہ
تھی کہ انقلاب کو بالشویزم کی حد تک پہنچاتے۔ اس لیے انہوں نے موجودہ صورت حال
کو گوارا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور منافقانہ طور پر صلح اور امن کی صدائیں بلند کرنے لگے۔
یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کئی اہم مسائل میں زمیدہ کوئی مثال کے طور پر بڑے سرکاری

ملازمین اور فوج کے قدیم قائدین سے اپیل کی گئی کہ وہ کم عمر مزاج اپنے عہدوں پر کام کرتے رہیں اس طرح کالجوں کا بائیکاٹ کر کے شہنشاہیت کی شکست کی جاتی ہے اسی طرح وقت گذرتا جائے گا اور اس سرکاری ملازمین اور فوجی قائدین کو جواب دے دیا جاتا تھا۔ جمہوری حکومت نے انہیں بے عمل کر کے انقلابیوں کا قبضہ مستحکم کر دیا جاتا تھا۔

انقلابیوں کا یہی تھا کہ بڑے بڑے سرداروں اور سرکاری ملازمین کو دھوکا دینے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چال ممکن نہیں صرف اسی طریقے سے فوج کے وفادار حلقوں کو دھوکا جا سکتا ہے کہ وہ خود ہی سر اقتدار آ کر وہ اپنے آپ کو بے ضرر اور اعتدال پسند ثابت کر دے۔

مگر تجربے سے ثابت ہے کہ ان کی یہ چال کبھی کامیاب نہ ہوئی۔

جرمن انقلاب دیرپا کیوں ثابت نہ ہوا

انقلاب برپا کرنے والے قوم کے ہر ان اور پسند گانوں عناصر نے تھے انقلاب تو فسادیوں، بیوروں اور ڈاکوؤں نے برپا کیا تھا۔ انقلاب سب اس رستے پر چل گیا تھا اس سے انقلاب برپا کرنے والے ان اصلی عناصر کی تسکین نہ ہوئی تھی قائدین انقلاب کی بڑی دقت یہ تھی کہ وہ اپنے حامیوں کے سامنے اپنی چال کی پوری طرح وضاحت بھی نہ کر سکتے تھے اگر یوں وضاحت کر دی جاتی تو چال بے اثر ہو جاتی غرض حامیان انقلاب کو قائدین انقلاب مطمئن نہ رکھ سکے۔

جب اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی اندرونی برسر اقتدار آ گئی تو اس پر سے ایک انقلابی پارٹی کی دہشت اور بربریت کا رنگ آہستہ آہستہ اترنے لگا یہ درست ہے کہ اشتراکیت پسند جمہوریت کے حامی انقلاب چاہتے تھے لیکن ان کے لیڈروں کی یہ نیت بھی یقیناً ان کی یہ نیت بھی آخر کار تھی یہ بھی کہ ایک انقلابی پروگرام تو تھا لیکن اس انقلابی پروگرام کو پورا کرنے کے لیے آدمی نہ تھے۔ کسی حماقت کے بس کا کار نہیں خود انقلاب برپا نہیں کر سکتے اگر یوں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی جائے تو لیڈروں کو

حلقہ تحریر ہو جائے گا کہ ان کے دس لاکھ ممبروں کی اکثریت توسط درجے کے اعتدال پسند سست اور ذہنی جمود کے مارے ہوئے شہریوں پر مشتمل ہے جو کسی انقلابی کوشش کی طاقت نہیں رکھتے۔

اشتراکیت کس طرح انقلاب برپا کرتی ہے

یہودی یہ سب کچھ دور جنگ میں ہی کر چکے تھے اور اسی لیے انہوں نے اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی میں وہ پھوٹ ڈال دی تھی جو آج تک موجود ہے ایک طرف تو اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی اور اس کے کٹر انتھ ذہنی جمود کے مارے ہوئے ارکین کو اس طرح حکومت کے گلے ڈال دیا گیا کہ قومی رجحان کی گاڑی رک گئی۔ دوسری طرف سرگرم انقلاب پسند عناصر کو اس جماعت سے نکال کر علیحدہ گروہوں کی صورت میں منظم کیا گیا۔ آزاد و خود مختار پارٹی اور جابار لیگ درحقیقت مارکس ازم کے انقلابی حامیوں کے متعدد گروہوں کے رہنما تھے ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ پہلے قدم کی مسند کو خالی کر دیں پھر اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی سرکار کی اس خالی مسند پر قابض ہو جائے گی اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی کافی دیر سے اس کارروائی کے لیے تیار ہو رہی تھی مارکس ازم کے حامیوں نے دل کھانے پینے وغیرات کی حیثیت کا صحیح اندازہ کیا تھا۔ اس سے کوئی خوف ہی نہ تھا۔ وہ تو کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے ہر نئے حکام کی ٹھوکریں کھانے پر تیار ہو جائیں گے یہ قدیم ہو کر دہ روایات کے حامل لوگ کوئی دیرپا مقابلہ نہیں کر سکتے اور جس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت ہو۔

جب انقلاب کامیاب ہو گیا اور انتخابوں کا ڈھونگ تھا کہ پارٹی سرکار کے تمام ستون گرائے جا چکے تو اس عالم میں جاوا جنگ سے واپس آنے والے سپاہی انتخابوں کے بے لطف عمل سے کم برہم تھے ان سپاہیوں کے خوف سے انقلاب اس راستے پر چل رہا تھا جسے وہاں سے لوٹتے ہی اشتراکیت پسند جمہوری پارٹی نے جو کہ فوج کے قلب کی حیثیت رکھتی تھی مستقل طور پر قبضہ کر لیا آزاد و خود مختار پارٹی اور جابار لیگ کے

مقدمۃ الجیش کو ادھر ادھر بھگا دیا گیا۔

لیکن یہ سب کچھ خاصی کشمکش کے بعد ہوا۔

انقلابیوں کے دو گروہ

اس سرگرم عناصر نے مکمل جدوجہد سے انقلاب برپا کیا تھا وہ اس صورت حال سے مطمئن نہ تھے جو کابینہ تھا کہ ان سے غداری کی گئی ہے اب انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ یہ اپنی جنگ خود لڑیں۔ جب انہوں نے سازشوں کی بھرمار کر دی تو خود انقلاب کی تباہی کا سبب بننے والے کسی سے تک آ گئے اسی انقلاب پر پوری طرح متحکم کی نہ ہو تھا کہ انقلابیوں میں دو پارٹیاں قائم ہو گئیں ایک پارٹی خانوں اور ان کی اتحادی تھی دوسری پارٹی خون خرابے اور لوٹ مار پر تلی ہوئی تھی پہلی سر تھا کہ ہمارے کھاتے پیتے طبقات اس اور قانون کے حامیوں کی پشت پناہی کرنے لگے کھاتے پیتے طبقات کے مشتعل قابل رحم سیاسی پارٹیوں نے بھی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی کارنامہ انجام دینے کا موقع پایا۔ قافلہ پہلے سے انقلاب کی منزل کے راستے پر روانہ ہو چکا تھا یہ بھی خوشی سے قافلہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے یوں کھاتے پیتے طبقات اور انقلابیوں کے مابین ایک اتحاد قائم ہو گیا۔ اگرچہ کھاتے پیتے لوگ انقلابیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن کھاتے پیتے طبقات کی سیاسی جماعت نے بالشویزم کا مقابلہ کرنے کے لیے مارکس ازم کے حامی قائدین کے ساتھ اشتراک کا باعزاز حاصل کر لیا۔

یوں دسمبر 1918ء اور جنوری 1919ء میں حسب ذیل صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔

انتہا پسند، اعتدال پسند اور رجعت پسند

قوم کے مدبرین عناصر پر مشتمل ایک اکثریت نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ مارکس ازم کی حامی پارٹیاں اس اکثریت کی نگہبانی کر رہی تھیں انقلاب نے بظاہر اعتدال کا راستہ اختیار کر لیا تھا اس پر انتہا پسند عناصر [illegible] ہو کر برسرپیکار تھے انتہا پسند عناصر کی

جانب سے دی گئی ہم جھگڑے مشین گنیں چلانے اور سرکاری عمارات پر قبضہ کرنے کے واقعات رونما ہونے لگے۔ انقلاب کی معتدل پسند رہنما ختم ہوتی نظر آتی تھی اس دہشت کے دور کو مزید بڑھنے سے بچانے کی خاطر سے دونوں لشکروں کے مابین ایک عارضی صلح اور شرط قرار پائی کہ دشمن بھی انتہا پسندوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ جمہوری سرکار کے مخالف تھے وہ جمہوری سرکار کے دشمنوں کو ہونے کے کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اور جمہوریت کی دشمنی سے اور زور ہو گئے۔ قدامت پسند کہلانے والے لوگ اس وجہ سے کہ انتہا پسندوں کے مخالف تھے وہ اس وجہ سے بالکل مختلف تھے کہ ان کی ہمدردی جمہوری سرکار کے حکمرانوں اور انتہا پسندوں میں تھی چلی رہا تھا۔ قدامت پسند کہلانے والے لوگ جمہوری سرکار کے حکمرانوں سے بھی خوش نہ تھے۔ لیکن انتہا پسندوں کے خلاف جمہوری سرکار کے حکمرانوں اور قدامت پسند کہلانے والے لوگوں نے جو مشترکہ محاذ قائم کیا اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جمہوری سرکار کے حکمران قدامت پسند کہلانے والے لوگوں کی مخالفت سے محفوظ ہو گئے۔

اعتدال پسندوں نے کس طرح انتہا پسندوں پر فتح پائی

یہ بات بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے اس کو دور رکھنے سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ جب قوم کے دس افراد میں سے نو نے انقلاب میں حصہ لیا اور جب ان میں سے آٹھ افراد نے انقلاب سے بیعت کر لی اور ان میں سے چھ افراد نے انقلاب کی مخالفت کی تو پھر قوم کے دس افراد میں سے محض ایک شخص کی وجہ سے انقلاب کامیاب کیسے ہو گیا۔

رفتہ رفتہ سرکوں پر ہونے والے کام کرنے والے جانباز لوگ کے حامی ختم ہو گئے قوم پرست عوامی اور اصلی پرست عوام بھی تدریج دب گئے ان دونوں گروہوں کے زوال کے بعد جیسا کہ دستور ہے اعتدال پسند درمیانہ طبقہ آگے بڑھا کھاتے پیتے طبقات اور مارکس ازم کے حامی دونوں نے موجودہ صورت حال کا فائدہ

لگانے کے لیے مشترک کار کا راستہ اختیار کیا۔ غرض جمہوری سرکار کی گاڑی چل نکلی۔
شروع شروع میں اس مشترک کار کے باوجود کھانے پینے وغیرہ کی اشیا میں ملاوٹ پر تبھی کا اظہار کرتی رہیں۔ خاص طور پر انتخاب کے موقع پر ملاوٹ کی کالی چادر کو پھاڑ کر کھانی چیزیں صاف کرنے کی کوشش تھی کہ کہ کہ مردوں کو تکلیف سے نکالا جائے۔

کھانی چیزیں صاف کرنے کی یہ روش دیوت داری پر مبنی تھی دل سے تو وہ ملاوٹ پر تبھی کو برا سمجھتی ہی تھیں۔ سے سکھرانوں کے ہاتھی پیر نے دوں کو سیاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ خود کھانی چیزیں سیاسی اصلاحوں میں بھی کھیر جذبات پھیل رہے تھے اب عام کھانے پینے کی اشیا میں ملاوٹ خوری کو نہ دیتے تھے پہلی سرکار کے عہد کی یادگار شراب بھی رخصت ہو چکی تھی۔ بس اس کی یاد باقی رہ گئی تھی۔

انتخاب کن حالات میں رونما ہوتا ہے

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ پہلی فوج میں اختیار پھیل جانے کے بعد سے تھانوی حکمراں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی خاطر مجبور ہو گئے کہ کوئی نئی تنظیم قائم کریں۔ اس وقت یہ حالات پیدا ہو چکے تھے کہ پہلی تنظیم صرف کچھ لوگوں پر مشتمل ہو سکتی تھی جس کا ضابطہ دیوت تھانوی حکمرانوں سے بالکل متضاد تھا۔ اسی عناصر سے آہستہ آہستہ ایک نئی فوج منظم ہوئی جس کی شرطوں کے وقت اس نئی فوج کی تعداد بہت کم رکھی گئی۔ نئے حکمرانوں کے لیے باعث تقویت بننے کی کوشش میں اس نئی فوج کی روح بھی بدل گئی۔

پتہ چلتا ہے کہ پہلی سرکار میں بعض ایسے عناصر تھے جن کے باعث انقلاب کامیاب ہوا اس کے علاوہ انقلاب کو حیثیت ایک سیاسی واقعہ کے ہونا کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجوہات حسب ذیل تھیں

۱۔ یکلی عہد تھی کہ ہماری قوم میں قومی اور اصلاحات کے تصورات مسخ ہو چکے تھے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرکار کی حامی سیاسی جماعتیں اس وقت بالکل

معاشی اور تعلیمی نظام میں خلل ہو تو نتیجہ انتشار ہوتا ہے

ان دونوں واجبات کی ادائیگی کے لیے ایک اور حقیقت ذہن نشین کرنا لازمی ہے ہماری قوم میں فرض شناسی اور اطاعت کے تصور کے مسخ ہو جانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارا نظام تعلیم ناقص تھا۔ اس نظام تعلیم کے تحت سرکار کی حمایت کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن قوم کی حمایت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس غلط تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ اہل قوم مقصد اور حصول مقصد کے ذرائع میں تمیز کرنے کی قوت سے بے بہرہ ہو گئے تھے۔ فرض شناسی اور فرض اور اطاعت بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ سرکار کی کوئی مقصد نہیں پڑتا سب حصول مقصد کے ذرائع ہیں اصل مقصد یہ ہے کہ انسانی اور سماجی طرز کے اعتبار سے ہم جنس انسانوں پر مشتمل ملت کی بقا اور ترقی کا انتظام کیا جائے جب قوم کا یہ شعور مفقود ہوتا صاف دکھائی دے، جب نظر آ رہا ہو کہ ملت سنگدل حکمرانوں کا شکار بننے والی ہے اور اس قوم کو بیرونی حملہ کے خطرہ کا سامنا ہو تو محض فرض شناسی کے نام پر فقط اس لیے کہ ان حکمرانوں کی اطاعت کی جائے جو مسند حکومت پر قابض ہیں سراسر ظلم اور حماقت ہے ایسے حالات میں فرض شناسی اور فرض کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے حکمرانوں کی اطاعت کبھی سے منہ موڑ لیا جائے اور قوم کو تباہی سے بچایا جائے آج کل ہمارے کھاتے پیتے طبقات میں سرکار کی وفاداری کا جو تصور رائج ہے اس کی رو سے اگر فوج کے کسی افسر کو اپنے حاکم سے یہ علم حاصل ہو جائے کہ ازلی بندر ہو تو اطاعت کیشی کا تقاضا ہے کہ ازلی بندر کر دی جائے اس کھاتی پیتی ذہنیت کے نزدیک اندھی اطاعت قوم کی زندگی سے زیادہ ضروری ہے لیکن قوم کی ہستی شعور کی خلش کے تحت نازک حالات میں اہل اور نااہل حاکموں کی اطاعت لازمی نہیں ایسے نازک مرحلہ پر ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ راست قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور بغیر کسی کی اطاعت کی پروا کیے اس ذمہ داری کا حق ادا کرے۔

جب حالات مارکس ہوں تو تشدد سے بھی کام لینا پڑتا ہے

لیکن اب اس بات کا امکان ہو گیا کہ ہماری قوم میں اکثریت کی قوم پرستی کے جذبات رکھنے کا تصور ہی ہو پایا تھا ہماری حکومت بھی اس تصور سے عاری ہو چکی تھی اس کی جگہ لے رہی تھی ہر انگلینڈی حاکمیت دستور میں پائی تھی۔

جہاں تک سرکار کی عام حاضری کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری قوم کے مستقل اور دیرینہ دشمن فرانس کی بہت بڑی تعداد ہمیں جنگ میں گرفتار کیا جا چکی تھی یہی وجہ تھی کہ ہماری عدالتی کرسی سیاہی ہو گئیں سب سے بڑا مسئلہ جس پر ہمیں سرکار کی عام صف کی کرسی سیاہی ہو گئیں تھیں ان حاضروں میں یہ ضبط سریت کر پایا تھا کہ اپنے خیالات اور جذبوں کی ہدایت صرف وہی لوگوں سے کرنی چاہیے اسمانی حاکمیت کا استعمال نظر سرکار کا مذہب ہے یہ خیال بھی اس ضروری اور احتیاط کا آئینہ دار تھا جو ہر دو جانب دیکھی جا رہی تھی ایسے حالات میں جب کہ مقابل اس اصول کو تسلیم کرتا ہو اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے کھلم کھلا تشدد کی دعوت دیتا ہو وہی لوگوں کے ساتھ یہ مساوات میرے عقیدت پر مبنی معقول معلوم نہیں ہوتی کھاتے پیتے طبقات کی جمہوریت میں مارکس ازم کا تصور خود جمہوریت کا مذاق ہوں ہوتا تھا۔ اس عالم میں کھاتے پیتے جمہوریت پرستوں کا یہ ماننا کہ مارکس ازم کا مقابلہ وہی طریقوں سے کیا جائے ایک ایسی حماقت تھی جس کی قیمت بعد میں بڑے خوفناک طریقے سے ادا کرنی پڑی مارکس ازم کا ہمیشہ سے یہی اصول رہا ہے کہ تلواروں کا استعمال صرف مصلحت وقت پر مبنی ہے جو چلی جائے اور کارگر ثابت ہو۔

کھاتے پیتے سفید پوش طبقات بزدل ہوتے ہیں

مارکس ازم کا یہ اصول بات نومبر سے لے کر نومبر 1918ء تک درست ثابت ہوا مارکس ازم کے حامیوں نے پارلیمنٹ یا جمہوریت کی بار بار پروا نہ کی انہوں نے مجرموں کی ایک فوج ساتھ لے کر گلیوں میں نکلے ہوئے شورش برپا کر دی اور پارلیمنٹ

ہوں جمہوریت دشمنوں کا خاتمہ کر دیا۔

جب انقلاب کامیاب ہو گیا تو کمانی بیچی سیاسی جماعتوں نے اپنے سابق ہمراہیوں سے اپنے ان کے زیر خاکہ کیں جن خانوں میں چھپے ہوئے تھے یا دیوں کی دکانوں میں جہاں یہ کام کرتے تھے وہ سے نکل آئے کارخانہ داروں اور بیوپاریوں میں کام کرنے والوں کی ہمیشہ یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس میں کسی اصلاح کی امید نہیں رکھتے ہیں ان کا سیاسی پروگرام ہمیشہ ماضی پر مبنی ہوتا ہے باوجود اس کے وہ خود کو کام حکومت سے وابستہ ہو چکے تھے ان کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ نئی حکومت میں اپنے حصے سے محروم نہ رہ جائیں اس مقصد کے لیے ان کا واحد ہتھیار رشوت اور تحکم سے لوگوں کا استحصال تھا۔

یہی وجہ تھی کہ انقلاب کے بعد کمانی بیچی سیاسی جماعتوں نے بھی بڑی بڑی طرح بازاری عناصر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

جب جمہوری سرکار کے تحفظ کے لیے پولیس ایکٹ منظور کیا جا رہا تھا تو یوں کی اکثریت اس کی حامی نہ تھی لیکن باہر مزدوں پر مارکس ازم کے دو گروہ حامی مظاہرے کر رہے تھے۔ کھاتے پیتے یہ متدانوں کی خوف کے مارے جان نکل رہی تھی اس لیے انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف اس ایکٹ کے حق میں ووٹ دے دیے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں ڈر تھا کہ مزدور پارلیمنٹ یعنی رجحانات سے باہر نکلے ہیں ان کے سر توڑ دیے جائیں گے۔

یوں نئی سرکار اپنے راستے پر چلنے لگی کوئی اس کی کوئی مخالفت ہی نہ ہوئی تھی۔

سیاسی منصوبے کے بغیر طاقت بھی بیکار ہوتی ہے

مارکس ازم اور اس کے مستقل حامیوں کا مقابلہ کرنے کی تدابیر اور طاقت صرف کیب نوبیت کی تنظیمات میں تھی۔ یہ تنظیمات رضاکاروں کے ان دستوں پر مشتمل تھیں جو فوجی افسروں نے فوج منتشر ہو جانے کے بعد اپنے طور پر منظم کر رکھے تھے بعد

ان فوجی چوکیوں نے خود حفاظتی کے لیے جو تنظیمات قائم کی تھیں یا سوک گارڈ کی تنظیمات یا خونیوں کی انجمنوں میں بھی کسی حد تک یہ حوصلہ اور استعداد ہو سکتی تھی۔

لیکن اس قسم کے سوا دوسرے جتنے جماعتی کام ہو سکتے تھے ان کی وجہ سب ذیل تھی۔

قومی سیاسی جماعتیں تو اس لیے ناممکن تھیں کہ ان کے پاس کوئی ایسی جماعت نہ تھی جس سے وہ مزدوروں پر مظاہرے کرکے فوجیوں کی وفاداری کمزور کر سکتیں اس لیے بھی ناممکن تھیں کہ ان کے پاس نہ کوئی سیاسی تنظیم تھی اور نہ کوئی واضح سیاسی مقصد۔

مارکس ازم کو ایک مرتبہ جو کامیابی نصیب ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ مارکس ازم کے حامیوں کے پاس ایک سیاسی مقصد بھی تھا اور طاقت بھی موجود تھی مگر اس مقصد اور اس قابلِ وقت کے مابین خلا بھی تھا۔ اس قوم پر مشتمل کو ترقی کے راستے سے ہٹا کر دبے پاؤں کی وجہ یہ تھی کہ قوم پر مشتمل کی جسمانی طاقت اور معقول سیاسی مقاصد میں باہم کوئی ربط نہ تھا۔

قوم پر مشتمل سیاسی جماعتوں کے مقاصد کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ ہزاروں میں ان مقاصد کی خاطر جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔

دفاعی انجمنوں کے پاس جسمانی قوت تھی وہ ہزاروں میں غالب اور سرگرم تھیں لیکن ان کے پاس سیاسی تکمیل کا کوئی ایسا پروگرام نہ تھا جس کی خاطر ان کی طاقت استعمال ہو سکتی تھی یا ان قوم کے کسی طرح کام آ سکتی۔ عیار یہودیوں نے اپنی قوت کار سے ایک جانب سیاسی تنظیمات کو سیاسی تجربات سے محروم کر دیا تھا۔ چونکہ ان سیاسی جماعتوں اور دفاعی فوجی تنظیمات میں پہلے سے موجود تھا یہودیوں نے اس میدان کو بھی خالی پایا اور منظم ہو گئے۔

عدم تشدد یہودیوں کی ایک چال ہے

یہودی اس کام میں اپنے اوتار سے خوب کام لیتے تھے ایک طرف تو انہوں نے یہ

مشہور کر رکھا تھا کہ فوجیوں کی وردی انھیں تو خیر سپاہی کہلوانے میں دوسری طرف سیاسیات میں وہ ہمیشہ اس امر پر زور دیتے تھے کہ سپاہی جنگ تو فقط وردی پہنچ پر نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی سپاہی مشہور کر دیتے، مگر لاکھوں سادہ لوح ترکوں پر ان کی صداقت سے اس کی گرفت کرنے لگے انہیں یہ بھی نہ تھی کہ تو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تلواروں سے مسلح کر کے اور اپنے ہاتھ کو باندھ کر سپاہیوں کے پہرہ کر رہے ہیں۔

ترکوں کی اس سادہ لوحی کی بھی ایک حد تھی جب تک کوئی عظیم انسان نصب العین سامنے نہ ہو جس کی خاطر دل میں ولولہ دینے کی امنگ پیدا ہو جب تک انہی قوت عمل پیدا نہیں ہوتی جب یہ ایمان پیدا ہو جائے کہ صورت حال میں ایک بنیادی انقلاب پیدا کرنا لازمی ہے تب ہی یہ اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ حصول مقصد کے لیے مدتوں سے استعمال کرتے ہی بیکار ہیں۔

جو تحریک علی وجہ مقصد کی خاطر میدان میں نہیں آتی وہ سخت ترین حربے استعمال کرنے کی استعداد سے سرور ہوتی ہے۔

معاشرہ دیرپا ایک عظیم نصب العین کے تخیل کے بغیر چل سکتا

انقلاب فرانس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ ایک بنیادی انقلاب سامنے آ گیا تھا انقلاب روس کی تحریک بھی ایک تخیل کی مرہون منت تھی جس نے ایک پوری قوم کو مسحور کر کے اس کی جو کایا پلٹ کر دی ہے اس کی وجہ بھی ایک تخیل ہے۔

کمالی ترکی سیاسی جماعتیں ایسے کارنامے انجام نہیں دے سکتیں بلکہ کمالی ترکی سیاسی جماعتیں بھی ہمیشہ ماضی کو اپنے لیے نمونہ بناتی رہیں مگر نئی فوجیوں کی وردی انھوں نے بھی ماضی پرستی کو یہ نصب العین بنایا تھا اور نئی فوجیوں کی وردی انھوں کا تو کوئی سیاسی پروگرام ہی نہ تھا ان کے دلوں سے پرانی عسکری روایات فراموش نہ ہوئی تھیں یوں ترکی قوم کا ذہن پہلے سے زیادہ کارآمد ہو سکتا تھا وہی کند ہو گیا۔ یہ صرف یہ

ہر یہ کند ہو گیا بلکہ اس سے جمہوری سرکار کے کاموں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا یہ درست ہے کہ ان عسکری و نیم عسکری تنظیموں کی نیت بہت اچھی تھی ان کے حسن نیت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود اس بات کو ان کا طریقہ عمل نہایت احمقانہ تھا۔

سیاسی تشکیل کے بغیر عسکری مہمات کامیاب نہیں ہو سکتیں

جرمنی فوج منظم ہونی اس کے مل ہوتے ہی مارکس ازم کی ہدایت میں وہ طاقت فراہم ہو گئی جو مارکس ازم کا اقتدار منظم کرنے کے لیے ضروری تھی اس کا عسکری نتیجہ یہ نکلا کہ سپاہیوں کی جو دو ٹولیاں آپس میں لڑنے بھڑنے کے لیے بنائی گئی تھیں وہ کارآمد نہ بھی گئیں نہیں اب منتشر کیا جانے لگا اس نازک صورت حال میں لیڈروں نے حکومت کے اس اقدام کے مقابلے کا فیصلہ کیا لیکن عدالت میں جانے کے بجائے انہوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ بہر حال وہ تھے بھی اسی سلوک کے مستحق۔

قوم پرست سوشلسٹ ورکر پارٹی کے قیام سے ایک ایسی تحریک وجود میں آ گئی جس کا مقصد واضح تھا یہ جماعت صرف ماضی کی بحالی کی خواہش مند نہ تھی جیسا کہ کمانی چیتی سیاسی جماعتوں کا دستور تھا بلکہ یہ تحریک تو حکومت کے موجودہ معقول طور کو ختم کر کے اس کی جگہ ایک ضابطہ خوانی سرکار قائم کرنا چاہتی ہے۔

جس روز سے یہ تحریک قائم ہوئی اسی روز سے یہ طے کر لیا گیا کہ مقاصد کی تبلیغ صرف قانونی وسائل سے نہیں کی جائے گی بلکہ جہاں تبلیغ کے راستے میں قانونی رکاوٹیں حائل ہوں گی وہاں زور و شمشیر بھی کام لیا جائے گا اس لیے تحریک کے قائدین کا ایمان تھا کہ ان کے پیش کردہ مقاصد نہایت اہم ہیں ایسے اہم کہ تحریک کا مقصد پورا کرنے کے لیے ہر قربانی جائز ہے جہاں زبان کو ہاتھ سے روک دیا جائے وہاں زبان کی مدد کے لیے ہاتھ سے کام لینا لازم ہو جاتا ہے۔

فساد اور جہاد کا فرق

میں وضاحت کر چکا ہوں کہ ہٹلر کی پارٹی میں جو تحریک عوام کا دل موہ لینے

کے لیے چلائی جائے اسے اپنے مخالفوں کے تشدد کے جواب میں اپنے بچاؤ کی خاطر
وہ وقت جوابی تشدد سے کام لینا پڑتا ہے تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا میں کبھی سرکار کی
کی طاقت اس تشدد پر غالب نہیں آسکی جس کی پشت پناہی کوئی ضابطہ حیات بھی تشدد
ہی دے سکتا ہے شرط یہ ہے کہ دوسرے ضابطہ حیات کے حامی بھی پہلے ضابطہ حیات کے
مقلدین سے کم دلیر اور بہادر نہ ہوں مختلف ملکوں میں بلکاروں کے یہ اصول تعلیم کرتا
ہمیشہ سے گروہ گھونٹ رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بلکا تو کبھی سرکار کے رکی حقدار
کے پرستار ہوتے ہیں لیکن مختلف بلکا تعلیم کرنے والے اس حقیقت پر ان کے مانے
یا نہ مانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کسی سرکار کے مقرر صرف اسی وقت تک قانون و امن
بحال رکھ سکتے ہیں جب تک کہ سرکار کی پشت پناہی کرنے والا ضابطہ عوام میں بھی تسلیم کیا
جاتا ہو جب حکومت کا ضابطہ حیات عوام میں مقبول ہو تو توڑ پھوڑ کرنے والوں کو عام
طور پر مجرم اور فسادی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر وہ بے بنیاد فسادی ہو تو اس کے جب
سرکار کا ضابطہ حیات عوام میں مقبول نہ ہو تو سرکار کے خلاف توڑ پھوڑ کرنے والوں کو
سرکاری عقیدہ کے خلاف ایک نئے عقیدہ کے علمبردار تصور کیا جاتا ہے جب سرکار کے
عقیدے سے کوئی نیا عقیدہ ٹکرا رہا ہو تو کتنی ہی سخت تشدد کیوں نہ اختیار کیا جائے اس تشدد
سے ہر گز کامیابی نہ ہوگی ہو نئے عقیدے پر مبنی تشدد ناکام و ناکام ثابت ہوتا ہے یہی وجہ
ہے کہ کمزور عقیدے پر مبنی سرکار تشدد سے کام لینے کے باوجود تو ہو جاتی ہے۔

محض تشدد سے کوئی اصولی تحریک ختم نہیں کی جا سکتی

جرمن سرکار کی مملکت میں چاروں جانب مارکس ازم کا بول بالا ہو رہا ہے۔ ستر سال تک
جرمن سرکار ہر قسم کی کوششوں کے باوجود مارکس ازم کا عقیدہ ہٹا نہیں سکی۔ مارکس
ازم کے حامیوں کو نیچ محض اور نیچ نسل کی جو گالیاں دی گئیں اگر ان سب کی میزان
نکالی جائے تو شاید ہزاروں سال بن جائیں چیر دینی اور چیر و تشدد سے مارکس ازم کے
ضابطہ حیات کے حامیوں کو ان گنت بار کچلنے کی کوشش کی گئی لیکن انجام یہ ہوا کہ ہر بار

سرکار کو بری طرح مار ماننی پڑی۔ عام کسی بھی بڑی سیاسی جماعتوں کے کارکنان ان سب حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن حقیقت کو جھٹلانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔

اب یہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ 9 اکتوبر 1918ء کو سرکار نے لیبر مشروط طور پر مارکس ازم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کل بھی سرکار مارکس ازم پر غلبہ حاصل کرے گی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے یہ کہنے والے سادہ لوح بھروسوں میں سانس لیتے ہوئے کہ مختلف وزارتوں کے محکمانی دفاتر میں اپنے ہوئے گزر بسر کرتے رہتے ہیں کہ مزدوروں کے مفاد کے خلاف کیسے حکومت چل سکتی ہے جب یہ لوگ مزدوروں کا نام لیتے ہیں تو ان کی مراد مارکس ازم کے حامی ہوتے ہیں یہ لوگ ان مزدوروں کو جو انقلابی مارکس ازم کا حامی قرار دے کر نہ صرف ایک صریح جھوٹ بولتے ہیں بلکہ مارکس ازم کے عقیدہ و تجدید کے سامنے خود اپنی شرمناک شکست کا بھی برملا اظہار کر جاتے ہیں۔

رضا کاروں کی تنظیم عسکری نوعیت کی نہ ہونی چاہیے

موجودہ کارزار سے پہلے سے مارکس ازم کے ساتھ آویزش ہے یہی وجہ ہے کہ قوم پرست اشتراکی تحریک اپنے عقیدے کو عام کرنے کے لیے نہ صرف عوام کو متحرک رکھنے کے ذریعہ قائل کرنا چاہتی ہے بلکہ خود اپنے دفاع کی خاطر اپنے آپ کو منظم رکھنے کی ذمہ داری بھی محسوس کرتی ہے یہ دفاع ہمیں انقلابی اشتراکیت کے حملوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے ہمیں انقلابی اشتراکیت کی جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں ان کے باعث ان کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔

میں پہلے یہ بیان کر چکا ہوں کہ ہماری نوجوان تحریک کو جیسے جیسے تجربہ حاصل ہوتا گیا ہم نے کس طرح اپنے حملوں کے بچاؤ کی خاطر ایک تنظیم تیار کی یہ تنظیم ابتدا میں ایک عسکری تنظیم کی صورت اختیار کر گئی یہ ایک ایسی عسکری تنظیم تھی جو آن واحد میں کام کرنے کی خاص تربیت حاصل کر چکی تھی رفتہ رفتہ اس تنظیم کے اندر باقاعدہ درجے اور عہدہ

داران کے منصب قائم کیے گئے۔

یہ درست ہے کہ ہماری فوجی تنظیم بظاہر سوسائٹی کی دفاعی ضرورتوں سے پیدا ہوئی تھی لیکن درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ سوسائٹی کی دفاعی تنظیمیں کسی وسیع سیاسی عقیدے کی پیداوار تھیں وہ دراصل دفاع کی خاطر قائم کی گئی تھیں ان کی نوعیت اور تنظیم بھی اسی محدود مقصد پر مبنی تھی یوں سمجھنا چاہیے کہ سرکار کی باقاعدہ فوج کی مدد کے لیے یہ تنظیمیں ایک قسم کی غیر باقاعدہ فوج تھیں ان دفاعی تنظیمات کی رضاکارانہ حیثیت قائم رہنے کی صرف دو وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ یہ تنظیمات خاص حالات میں قائم ہوئی تھیں دوسرے یہ کہ ان دنوں سرکار کو بھی ایک خاص صورت حال سے سابقہ تھا لیکن یہ دفاعی تنظیمیں ان معنوں میں نہ تو وجود میں آئی تھیں اور نہ رضاکارانہ کہ انہیں بطور خود اپنی مرضی سے کسی پسندیدہ سیاسی عقیدے کے دفاع کی خاطر منظم کیا گیا تھا اگرچہ بعض دفاعی تنظیمات اور ان کے قائدین موجودہ جمہوری سرکار کے مخالف تھے وہ خود اس کے ان تنظیموں کو بالکل آزاد و رضاکارانہ قرار نہیں دیا جا سکتا صحیح معنوں میں سیاسی عقیدہ کا مطالبہ تب ہی ہوتا کہ جب وقت کی عالمی قوتوں کی عالمی قوتوں کی جائے وہ سیاسی عقیدہ کا تقاضا ہے کہ مثبت طور پر اس میں کسی متبادل نظام کا نقشہ موجود ہو اس طرح متبادل نظام کے قیام کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوتی اس متبادل نظام ہی کی وجہ سے اس کے قیام کو مقدس ترین فریضہ سمجھا جائے۔

ان دنوں قوم پرستی کی تحریک کے ساتھ رضاکاروں کے جو نئے جلوس میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے وہ اس قسم کی دوسری تمام دفاعی تنظیمات سے بالکل مختلف تھے ان کو متاثر کرنے والی حقیقت یہ تھی کہ ہماری تنظیم برٹش انخلاء سے پیدا ہونے والی صورت حال کو برقرار رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی ہماری تنظیم کا مقصد فقط یہ تھا کہ ایک نئے قوم کی تعمیر کی جائے۔

رضا کاروں کو جسمانی تربیت کے علاوہ اعتقادی تربیت بھی ملنی چاہیے

شروع شروع میں ہمارے رضا کاروں کی اس تنظیم کا مقصد فقط جلسوں میں امن قائم رکھنا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ہمارے جلسے میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ اگر رضا کاروں کی یہ تنظیم نہ ہوتی تو ہمارے مخالفین جلسہ منعقد نہ ہونے دیتے۔ ہمارے ان رضا کاروں کو حملہ کرنے کی تربیت تو دی جاتی تھی لیکن ہماری تربیت فقط اڈا چلانے کی تربیت نہ تھی ان دنوں جب وطن عزیز میں سیاسی بیداری کے باعث یہ سمجھتے تھے کہ فقط اڈا چلانے کی تربیت بھی مفید ہو سکتی ہے ہمارے رضا کار اڈا تو اس پر استعمال کرتے تھے کہ جب کسی انسان کو اڈے کے راستے سے ہٹا جائے تو بعد اڈے کے اصل مقاصد کی تبلیغ ہو سکتی ہے تاریخ میں بہت سی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ علی ترین وطنوں کو کسی ایسے نامراد اڈا کے محافظ نشدہ کو ہٹانے خود مقصد تصور کرتے تھے جبکہ وہ اپنے اصل مقاصد اور بلند عزائم کی تعلیم دینے والے راستوں کو نشدد کی راہ سے ہٹانے میں قوت بازو کا استعمال جائز سمجھتے تھے علاوہ ازیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی بھی سرکار کی حمایت ہر گز فرض نہیں بلکہ ہر وطن کی حفاظت کے لیے مفید ہو ہمارے محافظ رضا کار قوم اور سرکار کو ان باتوں سے بچانے کے لیے تلے تھے جو قوموں کا ستیاناس کر دینے کے در پے تھے۔

رضا کار ہمارے جلسوں کو خراب ہونے سے بچاتے تھے

میں کچھ عرصہ پہلے اڈا باس میں جو دنگا ہوا جہاں ہمارے کچھ رضا کاروں نے اپنے فرائض کا شاندار مقابلہ کر کے اول شہرت حاصل کی اس کے بعد ہمارے رضا کار دستوں کا ملوکانی دستے مشہور ہو گیا جہاں کہ اس نام سے ظاہر ہے کہ یہ دستے ہماری تحریک کا ایک شعبہ تھے اس طرح ہر جماعت کے ماتحت صوبہ جات ہوتے ہیں ایک شعبہ ہے تعلیمی ہمارے ایک اور شعبہ [illegible] ہمارے شعبہ جات ہیں اسی طرح

رضا کار بھی ایک شعبہ ہیں۔

ہمیں تجربہ ہو گیا کہ رضا کاروں اور حامیوں کی یہ تنظیم کتنی ضروری ہے یہ تجربہ محض اس بنا پر ہی نہیں ہوا تھا کہ تحریک کے میونخ سے باہر لے جا کر مختلف کے دوسرے حصوں میں پھیلانے کی کوشش سے بھی اس تجربے کی تصدیق ہوئی جب یہ سمجھا جانے لگا کہ ہماری تحریک مارکس ازم کے لیے خطرہ ہے تو مارکس ازم کے حامیوں نے کوئی ایسا موقعہ خالی نہ جانے دیا۔ جہاں قوم پرست اشتراکی تحریک کے جلسوں کے انعقاد کو روکنے کی کوشش نہ کی جاتی جب کہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے جلسہ خراب کرنے کی کوشش کی تو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ مارکس ازم کی حامی تمام جماعتیں باقاعدہ تنظیم و انتظام ہمیشہ اور ہر موقع پر اپنے نمائندوں کی ان کوششوں اور سرگرمیوں کی پشت پناہی کرتی رہیں۔

دشمن کے علاوہ جو غلطیوں سے بھی مقابلہ ہوتا ہے

تعجب یہ ہے کہ جو کمانی جیتی سیاسی جماعتیں انہیں مارکس ازم کے حامیوں کے ہاتھوں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی تھی وہ بھی ان کے خلاف لڑنے سے باز نہ آتے تھے وہ بھی مارکس ازم کے ہاتھوں دوسری پریشانی پر خوشی کا اظہار کرنے لگے جب کبھی ہمیں مارکس ازم کے مقابلے میں کوئی زک اٹھانی پڑتی تھی یہ جماعتیں جیتی سیاسی پارٹیاں پوری سرگرمی اور کوتاہ نظری سے مسرت کا اظہار کرتیں انہیں خوشی یہ تھی کہ ان حریفوں کے مقابلے کی خواہش میں تاب نہیں، انہیں کوئی دوسرا بھی شکست نہیں دے سکا۔ سرکاری طبقہ پولیس کے حاکم اور کابینہ کے وزراء بھی اگرچہ ایک طرف اپنے آپ کو عوام کے سامنے قوم پرست ظاہر کرتے تھے لیکن دوسری جانب پوری بے دلی سے اصول ظلمی کرتے ہوئے ہم قوم پرست اشتراکیوں اور مارکس ازم کے حامیوں میں جب کبھی تصادم ہوتا تو مارکس ازم کے حامیوں کا ساتھ دیتے کئی لوگ بیہودی اشارات میں ذرا سی تعریف چھپ جانے کے شوق سے اپنی ذلیل حرکات کرنے میں جانبازی سے

مارکس ازم کا مقابلہ نہ کرتے اور جن پر یہ کھیل جاتے تو کیا آج ہندوستان پندرہ سال پہلے انہیں وہ ذلیل اشخاص کو پرزور روکرتے ہوئے سوئیوں پر لٹکا دیتے۔

یہ خاص ترین حرکات دیکھ کر ایک دن شریر پوہر کو تاؤ آگیا۔ ہمیں اس معزز شخص کی یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی وہ ایک ہولو اعزہ سوریات دار شخص تھا کہ اسے مکاروں اور فریبوں سے دلی نفرت تھی اس کی نفرت ایسی شدید تھی کہ اس قسم کی شدید نفرت کسی سچے انسان کے سینے میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ہوں تو میں بتا رہا تھا کہ ایک دن پوہر کو تاؤ آگیا انہوں نے کہا "ساری عمر میں نے تعلیم دی ہے کہ میں پہلے پہلی قوم کا وفادار رعایت ہوں اور اس کے بعد اپنی سرکار سے وفاداری کا ثبوت دوں" میں نے کبھی ان ذلیل انسانوں کی شکل نہیں دیکھی جو سر اقتدار طبقہ کا خانہ زاد بن جانا اپنے لیے باعث اعزاز تصور کرتے ہیں ایسے لوگ تو بس یہ دیکھتے ہیں کہ برسر اقتدار طبقہ کا مفاد کیا ہے اور پھر وہ لوگوں کے مفاد کے مخالف کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

سرکاری ملازم بھی فرض شناس ہونے چاہئیں

یہ بیچارے دل ٹوٹ جاتا تھا کہ ہزار ہا دیانت دار وفادار ملازمین سرکار رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کا اثر قبول کر رہے تھے بے حسی کی مثالیں دیکھتے دیکھتے ہر سرکاری ملازم کے اخلاق کو گھن لگ رہا تھا یا ذلیل انسان نہ صرف اپنے آپ کو ذلیل کرتے تھے، بلکہ دیانت دار سرکاری ملازم کے لیے جینا دوبھر کر دیتے تھے۔ دیانت دار سرکاری ملازم سے نفرت کی جاتی تھی۔ ان کا تبادلہ عمل میں لایا جاتا تھا۔ انہیں ان کے عہدوں سے تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ مگر یہ سب بھگتنے والے انتہائی اطمینان سے وفاداری کی چادر اوڑھ کر اپنے آپ کو قوم پرست مشہور کر دیتے تھے۔

اس قسم کے سرکاری ملازمین سے کیسی کیسی توقع ہو سکتی تھی وہ شاندار وفاداری ہماری مدد کرتے تھے ہماری تحریک کو اپنا خود کام ہوتا تھا۔ ایک تحریک جب تک خود اپنی حفاظت نہ کرے تب تک اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی اس کی جانب عوام کی

لاہور کی تعلیم ہی ہے اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مقام تو تب ہی نصیب ہوتا ہے جب کوئی تحریک اپنا بچاؤ خود کرنے کے قابل بن جاتی ہے اور جو کوئی اس پر حملہ کرے اسے مؤثر جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عسکری تربیت کا غیر سرکاری انتظام مشکل ہے

خود ہماری صفوں کی عسکری تربیت کے لیے ہم نے ایک اور اصول بھی وضع کیا ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہمارے رضا کاروں کو یہ صرف جسمانی مستعدی کی تعلیم دی جائے گی، بلکہ انہیں ہر طرح سے منظم کی جائے گی کہ وہ قوم پرست اشتراکی دوستوں کے لیے دل و جان سے مستعد بن جائیں اس کے علاوہ انہیں نظم و ضبط کی پوری تختی سے تربیت دی جائے گی۔ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم سے سیاسی خوبیوں کی دعویٰ محرموں کی کوئی نسبت نہ تھی۔ بالخصوص ان محرموں کو جو کمیونسٹ پارٹیوں سے تعلق رکھتی تھی ہماری رضا کاروں کی تنظیم کی کوئی بات خفیہ یا داخلی نہیں تھی۔

یہ درست ہے کہ ان دنوں کے خاص حالات کے پیش نظر ہم نے قوم پرست اور اشتراکی مزدور پارٹی کے رضا کاروں کی تنظیم کو بالکل ایک دفاعی انجمن کی شکل میں کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی میرے اس طرز عمل کی وجوہات حسب ذیل تھیں

کسی غیر سرکاری انجمن کے لیے قومی دفاع کی خاطر کوئی تنظیم قائم کرنا عملاً ناممکن ہے غیر سرکاری انجمن یہ کام کبھی انجام دے نہیں سکتی ہے صرف سرکار اپنی فوج کے لیے سپاہی بھرتی کر سکتی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ غیر سرکاری ادارے کے غیر سرکاری کوششوں سے قوم کی دفاع کی خاطر کوئی تنظیم کھڑی کی جا سکتی ہے وہ خود اپنی استعداد اور صلاحیت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے فوج کی جیسا ضبط و نظم ہوتی ہے کسی غیر سرکاری عسکری تنظیم میں ضبط و نظم محض رضا کارانہ اطاعت پر مبنی ہوتے ہیں وہاں رضا کارانہ اطاعت سے عسکری ضبط و نظم کا حاصل کبھی نہیں ہوتا۔ رضا کارانہ اطاعت سے جو ضبط و نظم قائم ہو گا وہ محض نمائشی ہو گا صحیح معنوں میں عسکری تنظیم کے لیے فوجی ضبط و نظم کی ضرورت ہوتی ہے

تربیت کا ضابطہ و نظم سے کام نہیں چلتا۔ غیر سرکاری تنظیمات میں نظام کی تنفیذ کے لیے سب سے بڑی قوت بھی باطنی کی صورت میں سزا دینے کا اختیار متصور ہوتا ہے۔ 1919ء کے موسم سرما میں جگہ جگہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ موسم بہار تک رضا کارانہ تنظیمات قائم کرنا دو وجوہات سے ممکن تھا ایک تو جو لوگ ان تنظیمات میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے تھے وہ پہلی فوج کے تربیت یافتہ تھے ضابطہ و نظم ان کی طبیعت میں رچا بسا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت ان تنظیمات پر جو فرائض عائد کیے گئے تھے ان کی نوعیت ایسی تھی کہ ہر رکن کو کم از کم ایک معین مدت تک طوعاً و کرہاً خدمت کرنی پڑتی تھی ان حالات میں سوائے اطاعت کے چارہ نہ تھا۔

غیر سرکاری عسکری تربیت موثر نہیں ہوتی

آج کل جو دفاعی تنظیمات قائم کی جا رہی ہیں ان میں یہ دونوں خصوصیتیں مفقود ہیں جوں جوں ایک دفاعی تنظیم میں توسیع ہوتی ہے توں توں اس کے ضابطہ و نظم میں کمزوری آجاتی ہے اس قدر ضابطہ و نظم میں کمزوری آتی ہے تادیبی اختیارات کا حیطہ بھی کم ہو جاتا ہے یوں ایسی تنظیم رفتہ رفتہ غیر سیاسی فوجی انجمنوں اور سابقہ فوجیوں کی مجلس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایک کثیر التعداد گروہ کو رضا کارانہ نظام کے ماتحت عسکری تربیت دینا محال ہے کسی کثیر گروہ کو رضا کارانہ نظام کے ماتحت عسکری تربیت دینا بھی ممکن ہوتا ہے جب فرمانروائی کے متعلق اختیارات حاصل ہوں ایسے بھی لوگ تو بہت تلاش کیے جا سکتے ہیں جو اپنی خوشی سے رضا کارانہ طور پر فوجی اطاعت کیشی اختیار کرنے پر آمادہ ہوں جو ایک عسکری نظام میں عادت اور رواج کے ماتحت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہوتی ہے۔

غیر سرکاری عسکری تربیت فوجی مقاصد کے لیے مفید نہیں

دفاعی انجمنوں کے ممبر اول تو [illegible] تک محدود تھے۔ ایسے مشکل نیز صبر

تک محدود رکھا جائے اور اس سے عسکری تنظیم کا کوئی معقول انتظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔
عسکری تربیت کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ تربیت پانے والوں کو بہترین اور قابل اعتماد تربیت دی جائے۔ جنگ ختم ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ مضمون ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا) اس دوران وہ جرمن نوجوان جو سابقہ حالات میں فوجی مہم پر جانے سے قبل عسکری تربیت حاصل کر چکے ہوتے ابھی تک باقاعدہ عسکری تربیت سے محروم ہیں۔ کسی رضاکار تنظیم کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ پہلے سے عسکری تربیت حاصل کر چکے ہیں ان کو فوری طور پر یک جا جمع کر دیا جائے۔ اگر یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا تو وہ دو چار ہی طرح سے کامیاب ہو سکتا ہے کہ ایسی تنظیم کا عسکری تربیت یافتہ رکن کس سال تک کارآمد رہ پائے گا۔ ۱۹۱۸ء کا سپاہی سے نوعمر سپاہی بھی بیس سال گزرنے کے بعد عسکری تربیت جاری رکھنے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ موجودہ رفتار سے وہ وقت دور نہیں جب عسکری تربیت یافتہ افراد کو پختہ عمر تنظیموں کی صورت اختیار کرنا پڑے گا۔ یوں رضاکار تنظیموں کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی انجمن بن کر رہ جائیں گی۔ یہ صورت حال کسی بھی ایسی تنظیم کے لیے خوش آئند نہیں ہو سکتی۔ جب آپ کو سابقہ فوجیوں کی انجمن نہیں کہنا چاہتا۔ بلکہ قومی دفاع کی انجمن کہنا چاہتا ہے۔ قومی دفاع کی انجمن کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ پرانے فوجیوں کی روایات برقرار رکھی جائیں۔ بلکہ اس کے مدنظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک ایسی انجمن کا پیش خیمہ ہو گا کہ قومی تحفظ کا جذبہ عام کیا جائے۔ اس جذبے کو عملی شکل دینے کے ذرائع استعمال کیے جائیں۔ مگر اس انجمن میں ایسے لوگوں کی تنظیم کی جائے جو عسکری دفاع کی خدمات دینے کی تربیت پانے کی استعداد رکھتے ہوں۔

عسکری تربیت فوجی نظام کے ماتحت ہی ممکن ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے جب اس تنظیم میں شامل ہونے والوں کو عسکری تربیت دینے کا انتظام ہو۔ بصورت موجودہ ایسی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ کیا انتظام روا ہے

لوگوں کے کس کی بات ہے۔ حقیقی معنوں میں تربیت یافتہ سپاہی ایک لفٹ میں دو یا تین گھنٹے کی تربیت سے پیدا نہیں کیے جا سکتے۔ جو یہ ضروریات جنگ ہر سپاہی پر جو عظیم ذمہ داریاں عائد کرتی ہیں ان کا علم بھی ہو سکتا ہے جب ایک رنگروٹ کو تربیت یافتہ سپاہی بنانے میں دو سال صرف کیے جائیں۔ یہ کم از کم عرصہ ہے۔ جنگ کے ایام میں ہم نے محاذ جنگ پر دیکھا کہ ہمارے نوجوان رنگروٹوں کو بنا کافی فوجی تربیت ملنے کے کیا خوفناک نتائج بھگتنا پڑے۔ رضاکاروں کے دستے تشکیل پا رہے تھے لفٹ بھی فوجی تربیت مل چکی تھی جو انہوں نے اس دوران میں اپنے آپ کو ملکی قربانی دینے کے لیے پیش کیا تھا۔ جب محاذ جنگ پر پہنچے تو سوائے نوجوان کا کندھا بٹانے کے اور کسی خدمت کے قابل ثابت نہ ہوئے۔ نوجوان رنگروٹ جنہیں چھ مہینے تربیت دی جا چکی تھی صرف اسی صورت میں رجمنٹ کے لیے کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ جب انہیں تجربہ کار افسر اپنے پلاٹونوں کی صفوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ "آزمودہ کار" سپاہیوں کی رہنمائی میں یہ رنگروٹ بھی رفتہ رفتہ اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل بن جاتے تھے۔

تو رنگروٹوں پر کیا جا رہا ہے اس کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ لفٹ میں ایک یا دو لفٹ فوجی تربیت دے کر کوئی فوج تیار نہیں کی جا سکتی۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ احکام صادر کرنے کے اختیارات بھی محدود ہوں اور وسائل بھی ناکافی ہوں۔ اس طریقہ کار سے ٹریننگ پائے فوجیوں کو دوبارہ تربیت دے کر ان کا حوصلہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن نئے رنگروٹوں کو باقاعدہ سپاہی نہیں بنایا جا سکتا۔

ملک کی حفاظت سرکاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے

یہ طریقہ کار بالکل مختلف ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ کسی پہلو سے بھی کم نہیں۔ اس طریقہ کار کا ناقص ہونا اس حقیقت سے واضح ہے کہ جہاں یہ نام نہاد رضاکار نہ تو فوجی تنظیمات پر شور مچا کر اور روزگار کو بڑا مشکل سے مطلوبہ وسائل کے بغیر بڑھا بڑھا کر ایک بہت بڑی فوج کو قومی دفاع کی تربیت دیتی ہیں وہاں خود ہماری سرکار

ہمارے نوجوانوں کو جمہوری اور صحیح پسندانہ عقائد کی تلقین کر کے لاکھوں افراد کو قومی خدمات کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ ان کا جذبہ حب وطن کے منطقی خاتمے تک پہنچ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ انہیں بھلائیوں کے ایک ایسے ریوڑ میں تبدیل کیا جا رہا ہے جو ہانکے جانے پر جدھر چاہے ہانک کر لے جائے۔ یہاں پہنچ کر وہ انہیں بھلا کر رضاکارانہ تربیت حاصل کرنے والوں میں بھی سب ایک نیت نہیں ہوتے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کی یہ روش جس کے نوجوانوں کے دل و دماغ پر مزید اثر ڈالنے کی جو کوشش دکھائی دیتی ہیں کر رہی ہیں، اسے مایوس کر دیتی ہے۔ اس روشنی میں وہ قومی انجمنوں کی سرگرمیوں مشکوک نظر آتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ حب کے باعث میں نے ہمیشہ رضاکارانہ تنظیمات کے ذریعہ عسکری تربیت دینے کی مخالفت کی ہے۔ وہ یہ ہے حسب ذیل ہے

فرض کر لیجیے کہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود کوئی وطنی انجمن برسال ہزاروں نوجوانوں کو مستعد فوجی بنانے میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ یہ بھی فرض کر لیجیے کہ یہ سپاہی صرف ذہنی لحاظ سے مستعد نہیں بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی مستعد ہے۔ اور ہتھیاروں کا استعمال بھی سیکھ چکے ہیں پھر بھی تیار نہیں رہے گا۔ تیار نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی سرکار کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں جو قوم کی رضاکارانہ تنظیم کو صرف غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتی ہے۔ ایک رضاکارانہ غیر سیاسی تنظیم کیا کر سکتی ہے۔ جب کہ قوم کے سیاسی قائدین سرکار کو قومی تحفظ کے لحاظ سے ناکارہ بنا چکے ہوں۔

سرکار سے قوم کے دشمنوں کا خارج از بحث ہے

یہ تمام سرگرمیاں اس وقت تک ناکارہ ہیں جب تک خود سرکار اپنے اعمال و اعمال سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے کہ قوم کی عسکری قوت کسی کام نہیں آسکتی۔ اس سرکار کے کارندے قوم کو عسکری قوت دیتے ہوئے اپنی مدبرانہ ذات کی حفاظت کے لیے ہر کسی

کار کی خاطر استعمال کرنے پر آمادہ نہیں۔

یہ ہے آج کی صورت حال۔ کیا یہ بات مستحکم نہیں ہوگی کہ دس ہزار افراد کو تخریب استعمال کرنے کی تربیت دی جائے۔ ان کی تربیت کے انتظامات خفیہ رکھے جائیں اور اس عرصہ میں کئی چند سال بھی نہیں گزرے ہماری سرکار نے پچاس لاکھ افراد تربیت یافتہ فوجیوں کو برخاست کر دیا تھا۔ یہ صرف اگلی خدمات بجا لانے کی نہیں بلکہ ان کی قربانیوں کا سرعام تمسخر اڑایا گیا۔ ہماری سرکار نے فوجیوں کی اس شناسی کا یہ صلہ دیا کہ کیا ہم اپنے فوجی ایک ایسی حکومت کے لیے تیار کریں جس نے ہماری کامیاب ترین مہموں کے سر پر تھوکا ان کے چہرے پر سے تمغے اور عطرے اکھاڑ کر پھینک دیے۔ کیا موجودہ حکومت نے قدیم فوج کا وقار بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا ہے۔ کیا حکومت نے ان لوگوں سے کوئی پرسش کی جنہوں نے ہماری قدیم فوج کو تباہ کر دیا۔ ہم اس کی ہلاک کے مرتکب ہوئے۔ ہرگز نہیں۔ ہر کس اس کے اس قسم کے لوگوں کو موجودہ حکومت کے ماتحت اعلیٰ ترین مناصب اور عہدے حاصل ہیں۔ کیا ہم نے تباہ حال دستے پسپا رنگ کے میدان میں یہ سبق حاصل نہ کیا تھا کہ جس کی اگلی اس کی پچھلی۔ موجودہ جمہوری سرکار کے ماتحت اگلی انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے انقلاب برپا کیا تھا۔ یہ انقلاب ہماری قوم کے خلاف بدترین غداری کے ارتکاب کی یادگار ہے۔ تاریخ کی تاریخ میں اس سے زیادہ ذلیل غداری کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ اس قسم کی اگلی کو قومی دھارے میں لانے کی خاطر اگر ایک جدید فوج تیار کر بھی لی گئی تو اس سے قوم کو کیا فائدہ ہوگا عقل سلیم اس طریق کار کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔

جب تک سرکار اپنی نہیں بنتی فوج اپنی نہیں بن سکتی

یہ سرکار ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال سے مستفید ہونے کی خاطر مضطرب تھی۔ یہ حقیقت وہ بھی انہوں کو سمجھ لینے کے متعلق ہو جو وہ سرکار کی

بالکل سے واضح اور یقینی طور پر ظاہر ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد جو دو فوجی انجمنیں وجود میں آئیں ان کا اس وقت تک خیر مقدم کیا گیا۔ جب تک ان سے انقلاب کے بعد برسرِ اقتدار آنے والی قابل ہستیوں کی ذاتی حفاظت کا کام لیا جا سکتا تھا۔ جب قوم کا جذبہ بتدریج ٹھنڈا ہوتا گیا اور برسرِ اقتدار پارٹیوں کی ذات کو خطرہ بھی کم ہو گیا تو پھر ان دو فوجی انجمنوں کی ضرورت نہ رہی۔ انہیں غیر ضروری تصور کیا گیا ان کے اختیار چھین لیے گئے۔ اور جس حد تک ممکن تھا انہیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاریخ کے صفحات بادشاہوں کی بے وفائی سے بھرے پڑے ہیں۔ آج جو یہ کھائے پیتے طبقات میں کوئی بیحد محب وطن پیدا نہیں ہو گئی ہیں جو تلواروں سے آسمان منصفی کی توقع رکھ سکے۔ یہ انقلابی ہیں کون گھروں کو آگ لگانے والے بے گناہوں کو قتل کرنے والے لوگوں کو لوٹ کر اپنی جیبیں بھرنے والے اور قوم سے غداری کرنے والے جب کبھی یہ فوجی انجمنیں قائم کرنے کا مشورہ میرے سامنے پیش ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو فوج کی نظم و نسق کی تربیت دیں۔ وہ کون سا مقصد باقی رہ گیا ہے جس کے حصول کے لیے انہیں تربیت دینے کے بعد طلب کیا جا سکتا ہے۔ ان سوالات کے جوابات سے واضح ہو جائے گا کہ ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

غائن سرکار کی فوج دشمنوں کی معاون اور رعایا کی دشمن ہوتی ہے

اگر موجودہ سرکار نے بھی اس قسم کے رضاکارانہ تربیت یافتہ لشکریوں کو فوجی خدمات کے لیے طلب کیا تو اس کا مقصد ہرگز قوم کو جنہوں سے محفوظ رکھنا نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہوگا کہ قوم کے اندر جو ظالم ہو رہا ہے اس میں انہیں عوامی علامات کے غصے سے بچایا جائے۔ جب قوم محسوس کرتی ہے کہ اسے دھوکہ دیا گیا اس سے جو وعدے کیے گئے تھے ان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور ملک کے مفاد کو نقصان پہنچانے والی ہے تو پھر اس قسم کے لشکروں کو ہمیشہ قوم کی جانب سے بغاوت کا سامنا

رابطہ رہتا ہے۔

اس وجوہات کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ جرمن قوم پرست شترا کی مزدور پارٹی کے طوفانی دستے فوجی تنظیم کی مکمل اختیار نہ کریں گے۔ ان کے رضاکار صرف قوم پرست شترا کی تحریک کے تحفظ اور تبلیغ کی خاطر منظم کیے گئے۔ ان کے فرائض عسکری نوعیت کی تخریبات سے قطعاً مختلف تھے۔

خفیہ انجمنیں سیاسی مقاصد حاصل نہیں کر سکتیں

طوفانی دستے کوئی خفیہ تنظیم نہ تھے۔ خفیہ تنظیمات بھی قائم کی جا سکتی ہیں۔ جب ان سے قانون کے خلاف کوئی کام لیا جائے۔ غرض خفیہ تنظیم کا مقصد اس کی نوعیت سے ہی ایک حد تک مخصوص ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ جرمن قوم کیسی واقع ہوئی ہے یہاں کوئی وسیع تنظیم خفیہ نہیں رکھی جا سکتی۔ جرمنی میں کوئی وسیع تنظیم قائم کی جائے تو اس کا مقصد اور وجود دونوں ہی پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ یہاں کوئی خفیہ تنظیم قائم کرنے کی کوشش بالکل فضول ہے۔ علاوہ ازیں آج کل ہمارے ہی جیسے دشمن کے دماغ کے پاس جاسوسوں اور مخبروں کی ایک ایسی فوج ہے جو ہمیشہ چوکنی رہتی ہے کہ ہر راز افشا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ جہاں کوئی راز نہ ہو وہاں وہ بہتان تراشنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس قسم کے امکانات کا راستہ بند کرنے کے لیے مقصد کے متعلق خاموشی کی مہر لگانا ممکن نہیں۔ خفیہ مقصد میں خاموشی کے کوئی تحریک خفیہ نہیں رہ سکتی۔ خفیہ انجمنیں صرف چند افراد تک محدود رکھی جائیں تو بھی خفیہ رہتی ہیں ایسے چند افراد کی تلاش کرنے میں سالہا سال صرف ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے معمولی افراد لوگوں کی قلت تعداد ہی انہیں قوم پرست شترا کی تحریک کا مقصد پورا کرنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ ہمیں شب و روز اس کمی کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے جان پر کھیل جانے والے سازشیوں کی عادت نہیں ہوتی ہے۔ ہمیں تو ایسے ضابطہ حیات پر مطمئن ایمان رکھنے والے اکثریت لوگوں کی عادت ہے۔ یہ کام خفیہ مشوروں سے نہیں ہو سکتا۔ یہ کام تو عظیم الشان عوامی مظاہروں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ مگر

مخصوص افراد کی دشمنی سے تحریک کو دعوت دے کر مقابلے کا ماحول نہیں پایا جا سکتا۔ تحریک کا یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ افراد میں پیچھے ہٹ کر ... عام مخلوق کو ان سے دور ہو جائے۔ ہم نے اس کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مستقبل میں قوم میں سخت اثر ... ہے کہ ایک دن وہ کی آئے گا جب قوم کا ... تحریک کا حصہ ہو گا۔

بالعموم افراد کے قتل سے قوموں کی قسمت تبدیل نہیں ہوتی

تخریب پسندوں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے۔ وہ عام طور پر یہ کہ تخریب پسندوں کے ذہنوں میں یہ بات ... مقصد کی علامت کا ... [illegible] ... ہیں وہم ہو جاتا ہے کہ کسی ایک شخص کو قتل کرنے سے قوم کی نجات کا سامان ہو جائے گا۔ قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر بن جائے گی۔ اس وہم کو یہاں کی تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ تاریخ میں ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ جب کوئی قوم کسی ایک فرد کے ظلم عذاب میں مبتلا رہی۔ ایسا ممکن ہوتا ہے جب وہ ظالم غیر معمولی قابلیت کا مالک ہو۔ اس غیر معمولی قابلیت کے باعث اسے خاص اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس ظالم ... [illegible] ... خاص اختیارات کا نتیجہ ہوتا ہے ایسی صورت حال میں اگر ... کوئی ... [illegible] ... قوم کو ان ... سے نجات مل جاتی ہے۔ ... [illegible] ... نہیں۔ ... [illegible] ... قتل کر دیے گئے ہیں ... [illegible] ... ہے۔ ... [illegible] ... تھا۔ ... [illegible] ... ہے۔ ... [illegible] ... کر دیا ... [illegible] ... ہے۔

قتل سے قوم کو صرف تب فائدہ پہنچتا ہے جب کسی غیر معمولی انسان

سے مقابلہ ہو

1919ء سے لے کر 1920ء تک یہ نظریہ حق تھا کہ کسی خفیہ انجمن کے ارکین قومی زبوں حالی کی شدت سے مضطرب ہو کر تاریخ میں ایسے کارناموں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہیں ان لوگوں سے انتقام لینے کی کوشش نہ کریں جو وطن کی بربادی کا باعث بنے ہوئے۔ یوں مضطرب ہو کر ایسی حرکت کا ارتکاب کرنے والے کی نیت تو یہی ہوتی ہے کہ قوم کو زبوں حالی سے نجات دلائی جائے۔ لیکن ایسی کوششیں سراسر حماقت ہوتی ہیں۔ مارکس ازم کی کامیابی کسی ایک فرد کی غیر معمولی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی۔ مارکس ازم کی کامیابی تو کھاتے پیتے طبقات کی بڑھتی ہوئی خوف شناسی اور ابتلا کا نتیجہ تھی۔ ہمارے کھاتے پیتے طبقات کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے انقلاب کے سامنے مزاحمت ختم کر دیا۔ حالانکہ اس انقلاب نے غیر معمولی قابلیت کا ایک آدمی بھی پیدا نہیں کیا۔ یہ تو سمجھ جا سکتا ہے کہ بالشویکی ذہنیت اور عزائم کی غیر معمولی قابلیت کے سامنے لوگ کیوں سر جھکا دیتے تھے۔ لیکن یہ دونوں باتیں تو شرمناک تھیں کہ بیوقوف شیطین فریب خلاص ہوا اور ڈرپوک بیوقوف اور اس قسم کے دوسرے ذلیل لوگ ان مجرموں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے تھے۔ ان انقلاب کے حامیوں کی ذہنیت کے لوگ تھے۔ اس انقلاب میں کوئی ایک شخص بھی تو ایسا نہ تھا جسے عظیم کہا جا سکتا۔ یہ قوم کی بدترین بدقسمتی تھی کہ انقلابیوں کی صفوں میں ہر شخص یا کوئی مکمل قسم کا بیوقوف ہو۔ ان میں سے کسی کو قتل کرنا کوئی نتیجہ پیدا کر سکتا تھا۔ ایسے قتل کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ پرانی جونکیں نکال کر تازہ دم پیاسی اور موٹی جونکیں ان کی جگہ لینے کو موجود ہوتی ہیں۔

اس زمانہ میں بہت سال پیشتر گزرے ہیں کہ ہمارے سیاسی حریفوں کو قتل کرنے کی مہموں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلنی چاہیے۔ یہ مہم اس لیے سامنے آنی تھی کہ تاریخ میں اس قسم کی تخریبی مہموں کی قابل اعتراض مثالیں موجود ہیں۔ ان قابل اعتراض مثالوں کی تکذیب موجودہ زمانے میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ زمانہ ہر لحاظ سے انتشار اور زوال کا

ہے۔ آج کل دشمن بھی ایسے بہت حیثیت کے مالک ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو
ختم کر دینے سے مسئلہ کو تقویت نہیں پہنچتی۔

دشمنوں کو قتل کرنے میں وقتوں کو ضائع نہ کرنا چاہیے

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے جب یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ ہر
موقعہ پر غداری کرنے والے کو وہیں ختم کر دیا جائے۔ جب حکومت کے بڑے عہدوں
اور اعلیٰ ترین مناصب پر وفاداری اور ہوائی قائم ہیں ہوں تو ایک عظیم الشان
سلطنت دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی ہے جس کا نظارہ ہم دشمن کی قرارداد پر
پاس ہوتے دیکھ چکے ہیں۔ جنہوں نے جنگ کے دوران میں پکڑے جانے والے انگریز قیدیوں کی
بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ویک مارکیٹ میں لاکھوں کے حساب سے دشمن کے تعمیر کئے ہوئے
سرکاری کارخانہ جات میں کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جنہوں نے کبھی یہ بات مستعمل نہیں ہونے دی
کہ ان کے ملک کے خلاف دشمن نے جنگ ختم ہو جانے کے بعد تباہ شدہ ریلوے لائنوں کی
تعمیر کی نشان دہی کر دی ہے کوئی سے کوئی سے زاد ہو جائے۔ جس سرکاری حکومت نے بڑے
بڑے غداروں کو کسی قسم کی سزا سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس کے وقت چھوٹے چھوٹے اور
معمولی غداروں کو سزا دلانا کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک
مخلص اور اصول پرست محب وطن کسی بڑی تعزیر کو قتل کر دینے کی پاداش میں خود بھی سزائے
موت پا سکتا ہے مگر ہے تو صرف دشمن کے چھپے ہوئے اعلیٰ عہدیداروں کی اطلاع دشمن تک
پہنچانی تھی۔ لیکن جب محب وطن عدالتی قوتے غداروں کے سامنے کھلی عدالت میں پیش ہو
گا۔ وہ وہیں اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم سوال بھی
قابل غور ہے۔ کیا تعزیر غداروں کو اسی قسم کے تعزیر غداروں کی مدد سے ختم کرنا بہتر ہے یا
کسی غدار کے مقابلے میں ایک عام محب وطن اصول پرست انسان کا مروانا بہتر ہے۔
کسی تعزیر غدار کو دوسرے تعزیر غدار سے مروانے کی کوشش میں غالب یہ ہوگا کہ پہلے
سے ہی یقین نہ ہو سکے گا کہ واقعی غدار کو مروانے میں کامیابی ہوگی یا نہیں۔ یا کامیابی ہو

بھی گئی تو یہ منصوبہ عمل میں نہ لایا جا سکے گا۔ دوسری صورت میں ایک ناقابل
بیان کی موت یقینی ہو گی لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ایک اصول پرست ساتھی کی ذات
سے محروم ہو جائیں گے۔ اصول پرست اور مخلص ساتھی ہر وقت آسانی سے فراہم نہیں
ہوتے۔ کسی نازک وقت میں ایسا ایک ساتھی میسر ہونے یا نہ ہونے پر ساری محنت کا
دارومدار ہو سکتا ہے۔

چھوٹے غداروں کو مارنے سے پہلے بڑے غداروں کو سزا دینے کی ضرورت ہے

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک بڑے بڑے چوروں کو آزاد
پھرتے ہیں تب تک چھوٹے چوروں کو بھی سولی پر نہ چڑھانا چاہیے۔ ایک
دن ایک قومی عدالت قائم ہو گی۔ اس عدالت کے سامنے وہ ہزار مجرم پیش ہوں گے
جنہوں نے ہٹلر کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے غداری کا ارتکاب کیا تھا۔ اس
انتخاب کے جرنیل گدڑ جس قوم کو نگلتے ہیں اس سب کی ذمہ داری ان مجرموں کے سر
ہے۔ ان مجرموں کو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی۔ ان سزاؤں سے ان چھوٹے
موٹے غداروں کو سبق مل جائے گا جنہوں نے ہماری شکست سے اپنے کے دانے دار کی
حوصلہ افزائی کی تھی۔

ان تمام کوششوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں نے مستقل مزاجی سے ہر قسم کی خفیہ انجمنوں
میں شرکت ممنوع کر دی۔ میں نے حتیاط کو ہاتھ سے نہ چھوڑا کیونکہ جرمنی کی ہر خفیہ انجمن میں
جا گھسی۔ میں نے اس زمانہ میں قوم پرست اشتراکی تحریک کے ان سرگرمیوں میں حصہ لینے
سے باز رکھا جن میں محض نوجوان مصروف تھے۔ ان جوانوں کی نیتیں بہ نیک اور عزائم
بڑے بلند تھے لیکن وہ اپنی سرگرمیوں کے باعث خود نقصان اٹھاتے تھے اور ان کی
قربانیوں سے دوسروں کی ذات میں کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا۔

غرض اگر خود میں نے سیکرٹ سوسائٹی کی رکنیت کی ہوتی تو انجمن کی کوئی بنا ہو خفیہ انجمن

کی صورت بھی اختیار کرسکتی ہیں اس سے متعلقہ دلیل حصول اختیار ہوتے ہیں

رضا کاروں کو کس قسم کی تربیت ملنی چاہیے

۱۔ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم عسکری رہنما خطوط سے ہم آہنگ کی جائے گی۔ اس تنظیم میں صرف یہ ملحوظ رکھا جائے گا کہ تحریک کی فوری عملی ضروریات کس طرح پوری کی جاسکتی ہیں۔ اس تنظیم کے ارکین کو عملی جسمانی تربیت دینا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا ان دونوں نقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ توجہ ذیل پر دی جائے۔ ہمارے رضا کاروں کو چست و چالاک بنانے کے لیے کھیلوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ میرے نزدیک مکہ بازی کی عملی تربیت اور کھڑے ہو کر لگ پڑ کے چلتے ہوئے ہاتھوں کی مشق، رسّہ چلانے کی ماہر ہونا کارِ تربیت سے زیادہ مفید ہے اگر ہماری قوم کو ایسے نوجوان مہیا کر دیے جائیں جو جہاد نہ کھیلوں کی ریاضت کر چکے ہوں۔ جن کے دل میں حب وطن کا جذبہ ہو جو قربانی کی صورت میں عمل کرنے سے نہ جھجکتے ہوں تو ایک قومی سرکار کے قیام کے بعد ایسے نوجوانوں سے دو سال کے اندر زبردست افواج تیار کی جا سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ تربیت دینے کے لیے مستقل فوجی نظام میں ہر درجہ کے افسر موجود ہوں۔ ایسے تربیت دینے والے فوجی افسر صرف ہماری قومی فوج ہی مہیا کر سکتی ہے۔ یہ کام کسی دوسری انجمن کا نہیں دوسری انجمنوں کے پاس تربیت یافتہ افسر ہیں ہوتے کوئی مستقل نظام۔ جسمانی ریاضت سے مستعد اور چاق و چوبند ہو کر فرد میں اپنی برتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ انفرادی برتری کا یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے جب مشق اور ریاضت سے فرد میں تعمیری اور قوت کا شعور پیدا ہو چکا ہو۔ ہمارے رضا کاروں میں جسمانی برتری پیدا کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان رضا کاروں سے تحریک کی خدمت لے کر انہیں اس برتری اور مستعدی کی تربیت دی جا سکتی ہے۔

تحریک کو سازش کا رنگ اختیار کرنے سے بچانا چاہیے

۲۔ خفیہ راستوں کو خفیہ کارروائیوں کی جانب کوئی رجحان اختیار کرنے سے

بچانے کی خاطر ایک طرف تو ان کی وردی بدل رکھی گئی ہے جس سے شناخت کرنا مشکل ہے۔ دوسرے ان رضا کاروں کی ایسی کثیر تعداد شامل کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کا رخ کس طرف ہے۔ گویا تحریک کو جیت کے متعلق عوام میں کوئی خاص دلچسپی ہونے کا امکان نہیں۔ طوفانی دستوں میں شامل ہونے والے رضا کار کسی خفیہ جلسے منعقد نہیں کرتے۔ وہ کھلے بندوں عوام کے سامنے پریڈ کرتے ہیں۔ یوں خفیہ تنظیم کے متعلق تمام افواہوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ ان رضا کاروں کو چھوٹی چھوٹی سازشوں میں شرکت کرنے سے بچانے کے لیے شروع ہی سے ان کے دل میں تحریک کے مقاصد عام کیے جاتے ہیں۔ انہیں ان مقاصد کی تبلیغ کے لیے ایسی مکمل تعلیم دی جاتی ہے جس سے ان میں وسعت نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تعلیم کے بعد ہر کوئی رضا کار یہ فرض نہیں سمجھتا کہ کسی چھوٹے درجے یا بڑے درجے کے دہشت کو قتل کر دیا جائے بلکہ وہ یہ فرض سمجھتا ہے کہ ایک جدید قوم پرست حکومت کی عوامی سرکار کے قیام کی جدوجہد میں بہتر تصرف ہو جائے۔ یوں موجودہ سرکار کے خلاف جدوجہد انتظام ہو۔ چھوٹی چھوٹی سازشوں پر بس نہیں بلکہ ایک بڑے ترقی کی تیاری ہے۔ وہ بڑا ترقی یہ ہے کہ ایک نئے ضابطہ حیات کی کامیابی کے لیے ایک روحانی اور اخلاقی جہاد کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مارکس ازم کو ہر صورت اور ہر قوت میں ختم کر دیا جائے۔

اپنی تنظیم کو دوسری متوازی تنظیمات سے ممتاز رکھنا چاہیے

۳۔ طوفانی دستوں کی تنظیم کی بابت تلقین ہوتی رہی کہ وردی اور سازوسامان کا تعین کرتے وقت یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی کہ ہمارے رضا کاروں کی تنظیم فوج سے بالکل ممتاز رکھی جائے۔ ان رضا کاروں کو ان خاص ضروریات کے متعلق بتایا گیا تھا جنہیں پورا کرنے کے لیے طوفانی دستوں کی تنظیم عمل میں آئی تھی۔

یہ وہ اصول تھے جن پر میں ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک عمل کرتا رہا۔ میں نے کوشش کی کہ ہماری نوجوان تحریک کے راہنما بھی یہ اصول سمجھ جائیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ

۱۹۲۱ء کے وسط تک ہمارے پاس ایسے ساتھیوں کی خاصی تعداد مہیا ہو گئی تھی۔ جو وقت میں سو رضا کار ہوتے تھے۔ اسی سال موسم خزاں کے اختتام تک ہمارے رضا کاروں کی تنظیم کے مختلف درجوں کی خصوصی وردیاں معین کر دی گئیں۔ اس کے بعد ہمیں ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے بعد میں طوفانی دستوں کی تنظیم پر زور دست تر ڈالا۔

ہمارے رضا کاروں کا پہلا عوامی مظاہرہ

(الف) جمہوری سرکار کے تحفظ کے لیے جو پہلی بار طلب منظور کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف ہمارے زبردست عوامی مظاہرہ پیدا ہوا تھا۔ یہ مظاہرہ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما کے اختتام میں میونخ شہر کے کونش پالاس میں سب محب وطن جماعتوں کی جانب سے منعقد کیا گیا۔ قوم پرست اشتراکی تحریک نے بھی اس مظاہرے میں حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے راہبین منظم فوجی شکل میں پریڈ کرتے ہوئے سڑکوں سے گزرے۔ ان کی ایک ایک ٹولی جداجدا مارچ کر رہی تھی۔ میونخ کے رضا کاروں کے چھوٹے ٹن میں سے ہر ایک کے اندر سو رضا کار تھے سب سے آگے تھے۔ اس کے بعد بورژوی کے سیاسی نعروں میں کام کرنے والے رکھے تھے۔ ہمارے ہاتھ دو جھنڈے تھے ہوئے جا رہے تھے۔ پہلا جھنڈا ہمارے صدر ہوتے تھے۔ جب قوم پرست اشتراکی بڑے چوک میں آکر پہنچے تو جلسہ کا دوسرا حصہ تھا۔ لیکن وہاں کوئی جھنڈا نہیں دکھائی دیا تھا۔ ہماری آمد سے بے انداز جوش و خروش پیدا ہوا۔ یہاں قریب سولہ ہزار حاضرین کا اجتماع تھا۔ اس جلسہ میں ان مقررین نے حصہ لیا جن میں میں بھی شامل تھا۔

اس مظاہرے کو بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی۔ بڑی دقت یہ تھی کہ پہلی مرتبہ ثابت ہو گیا کہ میونخ کے قوم پرست بھی سڑکوں پر مارچ کر سکتے ہیں۔ ہر طرف کی دھمکیوں کا اس بار انہیں رکھا نہیں۔ ہماری سرخ سرکار کے تحفظ کے لیے جو رضا کار تنظیمات کام کر رہی تھیں انہوں نے حسب معمول اپنے گھروں سے ہمارے جلوس کی مختلف ٹکڑیوں کو منتشر کر دیا اور وہ اپنی لہولہان کھوپڑیوں سہلاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ قوم پرست

شتراکی تحریک نے پہلی دفعہ ثابت کر دیا تھا کہ ہم نے آخر دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کے لیے اپنے حقوق استعمال کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ دہشت گردوں کو ہلاک کرنے کا حق صرف ان افراد کو حاصل ہے جو اکثریت کے عوامی نمائندوں اور وطن کے دشمنوں کے لیے وقف کرنے پر تیار نہیں۔

شہر سے باہر رضا کاروں کی پہلی مہم

اس دن کے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ حکومتی وسائل کی زیادت کے متعلق ہمارے خیالات صحیح تھے۔ یہ خیالات صرف نظریاتی لحاظ سے درست نہ تھے بلکہ ان پر عمل کرتے ہوئے ہم نے جو حکم نامہ جاری کیا تھا وہ بھی کارآمد ثابت ہوئی۔

اس کامیابی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے رضا کاروں کی صفوں میں زیادہ لوگ شامل ہونے لگے۔ اس بھرتی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہر ہفتہ کی دشمنوں میں میونخ کے اندر سو رضا کاروں کی فوجیوں کی تعداد پہلے سے بڑھ جاتی تھی۔

(ب) دوسرا اہم واقعہ ہماری دوسری مہم تھی جو اکتوبر ۱۹۲۲ء میں کوبرگ کے قصبہ تک بھیجی گئی۔

بعض عوامی انجمنوں نے کوبرگ کے قصبہ میں ہم جرمنی منانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامہ میں ذکر تھا کہ مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ میں اپنے مقلدین کو بھی ہمراہ لاؤں گا۔ مجھے یہ دعوت نامہ ۱۱ بجے قبل از دوپہر ملا۔ وقت تھوڑا ہی باقی تھا۔ ایک گھنٹے میں ہماری شمولیت کے تمام انتظامات طے ہو گئے۔ ہم جرمن کانگریس میں شمولیت کے لیے تیار تھے۔ میں نے طوفانی دستوں کے ساتھ آٹھ سو رضا کار اپنے ہمراہ لے جانے کی خاطر منتخب کیے۔ یہ رضا کار قریباً پورہ ٹولیوں میں منظم تھے۔ انہیں میونخ سے کوبرگ لے جانے کے لیے ایک پیشکل ٹرین استعمال کی گئی۔

کوبرگ میں تھوڑی عرصہ پہلے استصواب رائے ہو چکا تھا۔ اس استصواب رائے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کوبرگ کے باشندوں نے شمولیت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قوم پرست شتراکی

طوفانی دستوں کی بوچھاڑ کبھی اس دیوار میں اور کبھی دوسرے مقام پر قائم ہو چکی تھیں لیکن ابھی شہر پناہ کے دفاع پیچھے جا چکے تھے۔

رات کے وقت میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ تمام ایسے مقامات پر جہاں سے طوفانی دستوں کے رضاکار ہماری زمین میں داخل ہوئے ایک سنسنی پھیل گئی۔ کئی لوگوں نے بجلی کی روشنی میں جھنڈا لہراتے دیکھا تھا۔ ہر دیکھنے والا ہم سے بہت متاثر ہوا۔

قاعدہ میں قوت فیصلہ، استقلال اور خودداری کی ضرورت ہوتی ہے

جب ہم کورنگ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو ہمارے لئے مقامی دوستوں کا ایک وفد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ مقامی لیڈروں کی ہدایت کے ماتحت یہ طے کیا گیا ہے کہ ہم اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہوں گے۔ نہ ہی ہمارے ساتھ بینڈ بجایا جائے گا۔ ہمارے ساتھ پولیس موٹر سائیکل پر مشتمل ایک دستہ بھی تھا۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ ہم باقاعدہ پریڈ کرتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہوں گے یہ مقامی لیڈر جنہیں دراصل آرگنائزیشن پر ناراضگی تھی۔ انہوں نے اپنا ہر لیڈر ہمیں رکھ چھوڑا تھا۔

میں نے فی الفور یہ شرائط جو ہماری عسکری شان کے خلاف تھیں نامنظور کر دیں۔ جن بزرگوں نے اس جلوس کا فیصلہ کیا تھا میں نے ان کو اس امر سے آگاہ کرنے میں کوئی توقف نہ کیا کہ میں جانتا ہوں آپ اپنے حریفوں سے اس قسم کی گفت و شنید کیوں کرتے ہیں اور کیوں ان کے ساتھ ایسے معاہدات میں شریک ہوتے ہیں لیکن میں نے اعلان کیا کہ ہمارے طوفانی دستے اسی وقت فوجی ترتیب شہر میں داخل ہوں گے۔ ہمارے جھنڈے لہراتے ہوئے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اور ہمارا بینڈ بھی بجتا ہوا سنا جائے گا۔

ہماری یہ تجویز ہی بالآخر منظور کی گئی۔

جب ہم سٹیشن سے نکلے تو وہاں کئی ہزار افراد کا ہجوم کھڑا شور مچا رہا تھا۔ اور قریب

شروع ہے۔ اس کی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس وقت تک ہم بائیس ہزار تھے
ہر ایک کو معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہوا بدل رہی ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد سڑک پر کوئی
ایک سر بھی نظر نہ آ رہا تھا۔

رات پڑنے پر جوتشدد شروع ہوا اس نے زیادہ سنگین صورت حال اختیار کر لی۔
طوفانی دستوں کی جو ٹولیاں پہرے پر مقرر تھیں انہیں معلوم ہوا کہ اصل کارکن مرکزی
شہر کی گلیوں پر حملہ کر کے ان کی ایسی درگت بنائی گئی تھی کہ تیز ہی عملی اس پر ہم نے کسی
اپنے سرداروں کی خبر لینے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز صبح تک کوارگ میں سارا سال سے
سرخوں نے جو رعب اور تسلط قائم کر رکھا تھا اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مارکس ازم کے حامیوں اور یہودیوں کا خاص تعلق ہے کہ جھوٹ پھیلانے
میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے اخباروں میں اپنے بیانات
تقسیم کیے گئے جن کا عنوان تھا "ان (قومی) نگاہوں کی تعظیم سے تعلق رکھنے والے مزدور
مزدور مزدور عورتو۔" ان کتابچوں میں ہم کو ہمارے خلاف لڑنے کا کہا گیا تھا۔ واقعات کو توڑ
مروڑ کر پیش کیا گیا تھا کہ ہماری ٹاکوں کی ٹولیوں نے کوارگ شہر کے پر امن مزدوروں
کے خلاف قتل و غارت کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس پر ڈیڑھ گھنٹے بعد "دوپہر" ایک
عظیم الشان عوامی مظاہرے" کا اعلان بھی کیا گیا۔ توقع یہ تھی کہ اس مظاہرے میں
سارے ضلع کے مزدور شامل ہوں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس سرخ دور کے ہر نقطے
کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ میں نے طوفانی دستوں کو حکم دیا کہ دوپہر کے وقت ان
کا اجتماع ہوگا۔ ان کی تعداد اب پندرہ سو کارکنوں تک پہنچ چکی تھی۔ میں نے فیصلہ
کیا کہ میں جوانوں کو ساتھ لے کر کوارگ کے معاملے میں شہریت کروں گا اور قصبے کے اس
بڑے چوک سے بھی گزروں گا جہاں سرخوں نے مظاہرہ کیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا
تھا کہ کیا ان میں ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کی ہمت ہے۔ جب ہم چوک میں پہنچے تو دیکھا
کہ ان دس ہزار مظاہرین کا اجتماع منتشر ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ صرف چند سو افراد

وہاں پر موجود تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو یہ لوگ زیادہ تر خاموش رہے اور یکدم وہاں سے بھاگ نکلے۔ صرف راستے میں بعض مقامات پر جو سرخے شر کے باہر نظر آئے تھے اور بھی ہمارے واقف نہ ہوئے تھے انہوں نے بھی کہیں کہیں لوٹنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک آدھ دھول کی کہ وہ بھی نو دو گیارہ ہو گئے۔ وہ لکارہ دیکھنے کے قابل تھا کہ قصبے کے عوام جو ستے عرصہ سے ہمارے پیچھے کس طرح آہستہ آہستہ خوش میں آنے لگے۔ عورتیں کے دہاں پر قرار رہو گئے۔ ہمیں خوش آمدید کہہ گیا شام کے وقت جب ہم وہی کے لیے مارچ کر رہے تھے تو راستے میں جا بجا خواتین اور خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔

کبھی جان پر بھی کھیل جانا چاہیے

انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق میں نے بالکل مطلع کیا کہ کارکنوں نے ہڑتال کر دی ہے اس لیے ہماری ٹرین نہیں چلائی جا سکتی۔ اس پر میں نے جرنیلوں کے پوچھنے پر ہدایت کر دی کہ اگر ہماری ٹرین روانہ ہوئی تو میں ہی حکم دے کر سرخ پارٹی کے تمام جانبازوں کو گرفتار کر لوں گا۔ جو ہمارے راستے میں آ جائے اسے تو ہم کچلتے جائیں۔ ہم اپنی ٹرین خود چلائیں گے۔ اور ان سرخ پوشوں کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے۔ ان سرخ پوشوں میں سے بعض کو انجن کے کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ بعض کو گاڑی کے اگلے کمرے میں قید کر دیا جائے گا۔ اور بعض کو درمیانی گاڑیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہمیں باقومی تعاون کی ضرورت میں بعض درجن افراد ہمارے ہمراہ سفر کریں گے۔ میں نے ان کو یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ گاڑی ہمیں خود چلانی ہے کوئی میں سب کی جان کو خطرہ ہو گا۔ ہمیں اپنی گاڑی چلانی تو آتی نہیں۔ ہمارے ساتھ ان سرخ پوشوں کی جان بھی خطرے میں ہو گی۔ اگر ہماری گردن ٹوٹے گی تو ہمیں کم از کم یہ تسلی رہے گی کہ ہم عدم آباد تنہا نہ جائیں گے۔ بلکہ ہمارے ساتھ سرخ انقلاب کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ سرخ پوشوں

کے۔

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہو گا ابھی وقت ہے روانہ ہو گی ورنہ ہم صبح ہم صبح ہی میدان میں ہوں گے۔

یوں ۱۹۱۷ء کے بعد پہلی مرتبہ کورگ کے قصبے میں کاشت کرنے کا خانوں کے سامنے تمام مشریوں کی حیثیت یکساں ہے۔ آج کوئی بھی خود مختار حاکم گروہ بھی کرے کہ سرکار اپنے تمام شہریوں کی جان کی محافظ ہے تو کم از کم ان دنوں اس بات پر عمل نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں تو شہریوں کو اپنی جان ان لوگوں سے خود بچانی پڑتی تھی۔ جو آج موجود سرکار کا حصہ ہیں۔

کامیابی سے کامیابی کا راستہ کھلتا ہے

شروع شروع میں کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ اس ہڑتال کے واقعات کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ان واقعات سے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد عوامی دستوں کی خود اعتمادی بڑھ گئی۔ انہیں اپنی قوت کی معاملہ فہمی پر بھروسہ ہو گیا۔ ہمارے معاصرین ہماری جانب خاص توجہ دینے لگے۔ پہلی مرتبہ لوگوں نے فخر کرنا شروع کیا کہ قوم پرست اشتراکیت تحریک ایک ایسی تنظیم ہے جو ثابت قدمی سے مارکس ازم کی حمایت بھی کرتی ہے قوم کو نجات دلاتی ہے۔

صرف مسوریت پرست یہ دعویٰ بجا نہ تھا کہ ہم نے اپنی کمزوریوں کو توڑنے کی جرأت کیوں نہ کی۔ ایک مسوری سرکار کے ماتحت ایسی جرأت کس طرح ہوتی کہ جب ہم پر حملہ کیا گیا تو ہم نے کھل کر اس کا جواب دیا۔ ایسی تو چاہے تھا کہ ہم کے رگ کاٹتے رہتے۔

کھاتے پیتے اخبارات کی اکثریت نے بڑا فسوس ظاہر کیا۔ بازاری اخبارات میں ہماری مذمت کی۔ صرف چند شریف اخبارات نے اطمینان ظاہر کیا کہ کم از کم ایک عرصے تک تو بازاروں میں دہشت پھیلانے والے مارکس ازم کے حامیوں کو سبق کا

خوب پتھر سے ملا ہے۔

رضا کاروں کے پہلے عملی مظاہرہ کے مفید نتائج

خود کورگ میں مارکس ازم کے پیرو مزدوروں کے کارکن بھی کچھ حصوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اسی چیز کے لیے لڑتا ہے جس پر ایمان رکھتا ہے اور جس کے لیے محبت کرتا ہے۔ اس قسم کے مزدوروں کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ انہیں مرغلا رمارکس ازم کا حامی بنایا گیا ہے۔

کورگ کے واقعات سے خود طوفانی دستوں نے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔ ہمارے رضا کاروں کی تعداد اس سرعت سے بڑھ گئی کہ جب جنوری ۱۹۲۳ء میں ہماری پارٹی کانگریس منعقد ہوئی تو وہاں ہمارے انڈا بھیجنے کی رسم میں چھ ہزار رضا کاروں نے شرکت کی۔ ان رضا کاروں کی راہنمائی کرنے والے لوہوں نئی وردی میں ملبوس تھے۔

کورگ کے تجربے سے ہم پر واضح ہو گیا کہ ہمارے طوفانی دستوں کو خاکی وردی میں ملبوس کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف جماعتی سپاہی کو تحریک ملتی ہے بلکہ جھگڑا ہونے پر دوست دشمن کی پہچان رہتی ہے اور کوئی مغالطہ نہیں ہوتا۔ اس وقت تک ہمارے رضا کار صرف ہار بند کے طور پر تحریک کا نشان لگاتے تھے۔ لیکن اب ہماری مشہور خاکی وردی بھی رائج کر دی گئی۔

کورگ کے تجربے سے ایک اور اہم نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب ان تمام قصبات میں سرخوں کی چلائی ہوئی دہشت زدگی دور کر کے دم لیں گے۔ جہاں انہوں نے سارا سال سے اپنے ہم عقیدہ لوگوں کے علاوہ کسی مخالف عقیدہ سے تعلق رکھنے والے کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ آزادی رائے کا حق برقرار رکھا جائے گا۔ اس روز کے بعد ہم نے دیکھا کہ ایسے مقامات پر لے جاتے تھے آہستہ آہستہ وہاں سرخوں کے تمام حلقے ٹوٹ گئے۔ قوم پرست اشتراکی پراپیگنڈہ نے ان پر حملے کر لیے۔ طوفانی دستے بے کار ہو کر دوسرے دوسرے علاقوں میں روانہ ہونے لگے۔

کبھی وقتی تقاضے بھی پورے کرنے پڑتے ہیں

اب فوجانی دستے ایک دہشت گرد تحریک کے ارکین کی طرح بغیر مقصد اور ہدف کی تنظیم کے تھے لگ بھگ وہ کھلے بندوں ایک عسکری تنظیم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ وہ ایک نئی قومی سرکار کے قیام کے خواہش مند تھے۔

ہمارے منتقلی ارتقا کا یہ مرحلہ مارچ ۱۹۲۳ء تک طے ہوتا رہا۔ پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ تحریک جس راستے پر چل رہی ہے وہاں سے اس کا رخ موڑ دوں۔ ہماری تنظیمی تشکیل میں یکسر تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۹۲۳ء کے ابتدائی مہینوں میں فرانسیسیوں نے جرمنی کے صنعتی علاقے روہر پر قبضہ کر لیا۔ اس سے جو نتائج برآمد ہوئے انہوں نے فوجانی دستوں کے ارتقا پر اثر ڈالا۔

یہ بحث نہیں کہ اس موضوع پر آزادانہ بحث کی جائے یا لکھا جائے۔ یہ کرنا قوم کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ میں صرف اس حد تک بیان کروں گا جس حد تک عوام کے سامنے اس پر بحث ہو چکی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ پہلے سے ہر شخص کے علم میں ہے۔

روہر کے صنعتی علاقے پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہمارے لیے جرمنی کی کامیابت تھا۔ اس فیصلے کے بعد امید پیدا ہوئی کہ شاید جرمنی بیرونی دنیا سے ہر معاملے پر مزاحمت اختیار کرنے کی پالیسی ترک کر دے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر دفاعی اقدامات کے لیے موقع ہوگا کہ ہم خفیہ کارگزاری کر کے دکھائیں۔ فوجانی دستوں کی تعداد اب ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں تندرست اور قوی نوجوان شامل تھے۔ قوم کی خدمت کا کوئی ایسا موقع آیا تو یہ رضاکار بھی اپنا فرض ادا کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں اور موسم گرما میں ہمارے رضاکاروں کی یہ تنظیم ایک بڑی عسکری تنظیم میں ڈھل گئی جو میدان جنگ میں جانے کے قابل ہو۔ ۱۹۲۳ء میں ہماری تحریک کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ہمارے رضاکاروں کی تنظیم کی ہیئت تشکیل از سر نو کی گئی۔

میں کی دوسرے مقام پر ان واقعات کا تذکرہ کروں گا جو ۱۹۲۳ء میں پیش آئے۔ یہاں میں صرف یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ طوفانی دستوں کی تنظیم میں جو تبدیلیوں کی گئیں وہ عام حالات میں تحریک کے لیے مضر ثابت ہوئیں۔ ہم نے یہ تبدیلیاں صرف اس لیے قبول کیں کہ فرانس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارا ملک اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس موقع پر یہ غرض ادا کرنے کے لیے ہماری تنظیم میں یہ تبدیلیاں لازم تھیں۔

اگر ایک کوشش ناکام ہو تو دوسری کوشش شروع کرنی چاہیے

۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں جو واقعات پیش آئے اگرچہ وہ ظاہر بین لوگوں کو ناپسندیدہ نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اگر مقصد اعلیٰ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان واقعات کا پیش کرنا لازمی تھا۔ جرمن سرکار نے جو روشن اختیار کی اس کے بعد طوفانی دستوں کو عسکری تنظیم کی شکل میں رہنا حاصل ہو گیا۔ حکومت کے رویہ میں اس تبدیلی کے بعد بھی ہمارے رضاکاروں کی تنظیم عسکری صورت اختیار کیے رہتی تو اس سے تحریک کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے ہمارے رضاکاروں کی عسکری تنظیم یک لخت ختم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا کام بھی اسی جگہ سے پھر شروع کیا۔ جہاں سے ہم اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر ایک غلط راستہ پر منتقل ہو گئے تھے۔

۱۹۲۵ء میں ازسرنو قوم پرست اشتراکی جرمن پارٹی دوبارہ قائم کی گئی۔ تحریک کو اپنے طوفانی دستے ازسرنو منظم کرنے پڑے اور ان دوبارہ انہی اصولوں پر تربیت دی گئی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ اس تنظیم کے لیے لازم ہے کہ کن اصولوں کی جانب توجہ دے جس پر اس کی ابتدا کی گئی تھی۔ اس تنظیم کا سب سے بڑا غرض یہی ہے کہ وہ تحریک کی حفاظت کے لیے خدمات انجام دے اور تحریک کے مقاصد کی روحانی تبلیغ میں معاون ثابت ہو۔

طوفانی دستوں کو ہرگز اس بات کی پروا نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک دفاعی انجمن یا خیر انجمن بن کر رہ جائیں۔ یہ انتظام کرنا لازمی ہے کہ ہمارے رضاکاروں کی تنظیم اس پر

یک لاکھ خواتین کا مقصد مذکورہ بالا ہے تو قوم پر ست شخصیت کی خاطر جدوجہد ہو
عمل ہوئے ہیں اور انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ایک عوامی سرکار قائم کر کے رہیں گے۔

☆☆☆

باب دہم

چھوٹ دا وہ ور حکومت کرو

جنگ کے ایام میں ہی ایک مسئلہ خاصی نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے موسم سرما میں اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۲۰ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں ہماری توجہ ہارنی مجبور ہو گئی کہ اس مسئلہ کے متعلق کچھ واضح موقف اختیار کرے۔ میں نے اس کتاب کی پہلی جلد میں اختصار سے وہ واقعات بیان کر دیے ہیں جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ ان واقعات سے صاف نظر آ رہا تھا کہ ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ان واقعات میں جیسا کہ میں نے بیان کر چکا ہوں سب سے پہلے تو وہ پراپیگنڈہ شامل تھا جو ترکوں اور فرانسیسیوں نے شمالی ترکی اور ساحلی ترکی کا یہ اتا متفرق تاروں کرنے کے لیے منظم کیا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے موسم بہار میں بھی مرتبہ وہ رسالے بانٹے جانے لگے جن کا جلد میں ایک باقاعدہ تانتا بندھ گیا۔ ان رسالوں کا مقصد یہ تھا کہ ہر مسلمان کے خلاف جذبات بھڑکائے جائیں تاکہ جنگ شروع کرنے کے لیے واحد ذمہ دار قرار دیا جائے۔ ۱۹۱۶ء تک یہ پراپیگنڈہ ایک باقاعدہ نظام کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کی کل ذمہ داری جرمنی اور آسٹریا ہنگری سے ہٹا کر انگلستان پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے بعد تازہ جذبات کو ابھار کر اس پراپیگنڈے نے ترکوں کو شمالی ترکی سے نکال دیا۔ تھوڑا عرصہ بعد ہی آشوریوں کی اس چال کے نتائج ظاہر ہونے لگے۔ ان دنوں جو لوگ حکومت اور فوج کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے وہ اس کام کے کامیاب کرنے میں غلطی کے مرتکب ہوئے۔ خاص طور پر جو دلائل پاپا یوں کی فوج کے خلاف تھے۔ زیادہ تر غلطی کے مرتکب ہوئے۔ ان لوگوں نے اندھا دھند اپنے ترکش سے غلطی کی اور کوئی ایسا ٹھوس قدم نہ اٹھایا کہ جس سے اس پراپیگنڈہ کا تدارک ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے جو کچھ کہا گیا اور جس کی بعد ازاں میں نے تردید کر دی تھی اس پراپیگنڈہ کو خوش آمدید کہا گیا۔

بعض لوگ ایسے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ اس پروپیگنڈے سے جرمنی کے اتحاد میں مدد ملے گی۔ وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ شاید یہ پروپیگنڈا ملک کا ایک وفاقی نظام قائم کرنے کی تحریک کے لیے باعث تقویت ثابت ہو۔ اپنے فرض سے یہ غفلت محرمانہ تھی شاید تاریخ میں کسی غفلت کے لیے اس سے زیادہ سخت سزا ملنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اس پروپیگنڈے سے پرشیا کمزور ہو گا تو ملک کی تمام ریاستوں میں مساوات کی بنا پر وفاقی نظام قائم ہو جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ پرشیا کے زوال کے بعد تمام جرمنی روبہ انحطاط ہو گیا۔ اس طرح جو تباہی آئی اس سے تمام جرمنی غارت ہوا۔ سب سے زیادہ نقصان ان ریاستوں کو پہنچا جو وفاقی نظام کی حامی تھیں۔

جس شدت میں پرشیا کے خلاف مصنوعی طور پر یہ کی اونی گئی شدید ترین تھی وہ جرمنی کے تاجداروں کے خاندان کے خلاف عداوت کا آئینہ دار ہوا۔ یہی عداوت انقلاب کی بنیاد ثابت ہوئی۔

تاب شدہ چیز کے مرادم گویند چیز با

یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ دشمن کے پروپیگنڈے سے پرشیا کے خلاف جذبات کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ دراصل ایسے جذبات موجود تھے جن کی بنا پر عوام نے اس پروپیگنڈے کو قبول کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کے اقتصادی مفاد کو جس جنگ کا قائل جیسے طریقے سے پامال کیا گیا۔ مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو جس حد تک پہنچا دیا گیا۔ ساری مملکت کو مرکزی حکومت کا غلام سمجھا جاتا تھا۔ مملکت سے بیزار محسوس کیا جاتا تھا یہی وہ جذبات تھے جن کی بنا پر پرشیا کے خلاف جذبات پیدا ہوئے۔ یک عام شکایت یہ جاتی تھا کہ جنگ کے متعلق تمام ٹھیکے ان کمپنیوں کے سپرد کیے جاتے ہیں جن کے مرکزی دفاتر برلن میں واقع ہیں۔ عام شکایت اس کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ تمام ٹھیکے برلن کو دیے جا رہے ہیں۔ برلن اور پرشیا میں کوئی تمیز نہ کی جاتی تھی۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمام ٹھیکے پرشیا کو دیے جا رہے ہیں۔ عام شکایت ان کمپنیوں کی

اندرونی سازش سے باوقف تھا۔ یہ کمپنیاں لوگوں کو بری طرح لوٹ رہی تھیں۔ عام طور پر ان جنگی کمپنیوں کہا جاتا ہے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ ان کمپنیوں کی حقیقی ملکیت ہے اور ان کے ہاتھ میں ہے یہ پرشیا کے قبضہ میں ہے۔ بلکہ خود ان ممالک کو بھی اس میں داخل نہیں لوگ تو صرف یہ دیکھتے تھے کہ کمپنیاں مجموعی کیا ہے کام کر رہی ہیں۔ ان کو صرف یہ دکھائی دیتا تھا کہ یہ قابل نفرت ادارے مملکت کے دارالحکومت میں کن رشوتوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اس کے بعد لوگوں کو غصہ پہلے برلن اور پھر پرشیا کی جانب منتقل ہو جاتا تھا۔ عوام کے اس غصے کو رفع کرنے سے بعض حلقوں نے بڑی غلطی کا ثبوت دیا۔ مثال کے طور پر ریورپوری حکومت نے اس پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔ عوام کی بددلی کو دور کرنے پر نہ تو پھر توجہ نہ دی گئی۔ اس نے اس بددلی کو پھیلتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا کہ اس طرح پرشیا کا اقتدار کم ہوگا۔

یہودی خود چوری کرتے ہیں اور دوسروں کو پکڑوا دیتے ہیں

یہودیوں جیسی عیار قوم یہ خوب جانتی ہے کہ انہوں نے جنگی کمپنیوں کے بارے میں لوگوں کو بھڑکانے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے ایک نہ ایک دن اس کی مخالفت ضرور ہوگی۔ یہودی دونوں ہاتھوں سے اس قوم کو لوٹ رہے تھے۔ اس لیے اگر اس لوٹ مار کی مخالفت کا رخ یہودیوں سے ہٹا کر کسی اور طرف پھیر دی جاتا تو یہودیوں کو اس میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہودیوں نے اپنے آپ کو عوام کے غیض و غضب سے بچانے کی موثر ترین تجویز یہ سوچی کہ عوامی غصہ کا رخ کسی اور نشانہ کی جانب پھیر دیا جائے۔ یہودی پرشیا سے لڑنے پرشیا ہی سے لڑنے جنگی لڑائی زیادہ تھے انہی ان دونوں ریاستوں کی باہمی کشمکش یہودیوں کے پیدا کی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عوام کی توجہ ان کی طرف سے ہٹا دی گئی جو قوم کو مدتوں سے گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ یہودیوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ کمپنی کے وجود کا اساس تک نہ تھا۔ اس کے بعد جب کبھی یہ خطرہ پیدا ہوا کہ عوام اس کے خلاف ہو جائیں گے تو فوری طور پر یہ بھی مفقود

کا کوئی اور حصہ قلم زد ہونے سے بچ جاتا ہے۔

کوٹ آرزو نے جب یورپ میں انقلابی جدوجہد کو پرشیا کے خلاف جدوجہد کا رنگ دینا شروع کیا تو اس کا مقصد بورژوا یورپ کی حفاظت نہ تھا۔ وہ تو یہودیوں کی عالمگیر تحریک کے ایک گماشتے کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر وہ فرانس اور یورپ کے موجودہ معاملات اور رجحانات کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ان نئے بحرانوں سے آزادی کو ٹکرانے کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی جب آزادی پر زوال ہو جائے گا تو پھر سے یا شورہ کاشت کرنے میں سہولت رہے گی۔

کوٹ آرزو نے جو چال چلنی شروع کی تھی۔ اس کی موت کے بعد بھی بہت عرصہ اس پر عمل ہوتا رہا۔ مارکس ازم کے حامی جنہوں نے آج تک آزادی کی روشنیوں اور ان کے نوابوں کی انتھک دی خدمت کا دعویٰ کیا تھا۔ یک لخت آزادی پامالی کا روپ دھار کر ان جدوجہد اور مساوات کا سہارا لینے لگے جن کی بنیاد ابھارنے والوں کے نوابوں کے خاندانوں سے وفاداری تھی۔

یہودی بھائی کو بھائی سے لڑا کر خود بچ نکلتا ہے

جب یورپ یا کوئی اس کی کوئی ملک جمہوری حکومت سے ٹکرانے کے لیے لشکر بھیجتا اور اس حکومت کے مقابلے میں اپنے ہمنوا لے تو مارکس ازم کے حامی مفکرین نے اس انقلاب کو یورپ کے مزدوروں کی پرشیائی فوجی جارحیت کے خلاف جدوجہد کا نام دیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب یہودی کی حکومت جمہوری حکومت کو زیر کر لیتی تو اس سے وہ یہودی برآمد نہ ہوتے تھے جو دوسرے قومی اصطلاح میں برآمد ہو رہے تھے۔ کیونکہ حکومت کے ہاتھ آنے کے بعد عوام کو مطمئن رکھنا آسان ہوتا ہے۔ اسے پرشیا کے خلاف غصہ اور نفرت کے جذبات بڑھ گئے۔

یا شورہ کے گماشتوں نے یہ چال اختیار کر رکھی تھی کہ جب یورپ کی کوئی جمہوری حکومت زیر ہو جاتی تو انہوں نے مشہور کر دیا کہ پرشیا کی فوجی جارحیت کو یورپ میں

عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے جذبات کو بھڑکانے میں کامیابی ہوگی ہے۔ ان کی یہ چال چل گئی جب ہوریا پارٹی کا انتخاب ہوا تو کوٹ آفیسر کے میونسپل میں مشکل سے ہزار ووٹ ہوں گے اس وقت کیونسٹ پارٹی کے تین ہزار سے بھی کم ووٹ تھے۔ ہوریا کی سرکار ختم کر دینے کے بعد جب دوبارہ انتخابات ہوئے تو ان دونوں پارٹیوں نے مل کر قریباً ایک لاکھ ووٹ حاصل کیے یہی وہ واقعہ تھا جس سے ذاتی طور پر متاثر ہو کر میں نے ان قوم پرست مخالف شاعروں کو لڑنے کی مخالفت شروع کی۔

عوام گمراہ ہو جائیں تو ان کی غلط فہمی دور کرنی خاصی دشوار ہوتی ہے

میرا خیال ہے میں نے اپنی ساری زندگی میں کوئی اتنا بڑا کام کرنے کی غلطی نہیں کی جتنا کہ ہر شیا کی مخالفت کی تحریک کرتے وقت میرے سر پر آن پڑا تھا۔ ان دنوں ہونے میں کیمونسٹوں کی حکومت تھی بڑے بڑے عوامی جلسوں میں ان کے خلاف نفرت پھیلائی جاتی تھی۔ بالخصوص ہر شیا کے خلاف تو نفرت کا یہ عالم تھا کہ ان جلسوں میں شاذ ہی کوئی باشندہ شریک ہوتا تھا۔ شاید عوام کے ہاتھوں اس کی جان کو خطرہ ہو جاتی۔ ان جلسوں کے اختتام پر وحشیانہ جوش سے بھرے ہوئے نعرے لگائے جاتے تھے "ہم ہر شیا سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں" "ہر شیا مردہ باد" "ہم ہر شیا سے جنگ کرنا چاہتے ہیں" "لیبر وفد واپس جاؤ" پارلیمنٹ میں بھی کھلے بندوں یہی کہا جاتا تھا۔ ہوریا کی متعلق اتحادی کے ایک وکیل نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا "ہم ہر شیا کے ساتھ ہیں ہاں آزاد آزاد کر جان دینے سے بھی نہیں گھبراتے ہیں کہ ہوریا کی متعلق اتحادی کی خاطر جہاد کرتے ہوئے مر جائیں"۔

میونسپل شہر کے لوگوں پر ڈکٹیٹر میں ایک ایسا جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ جب میں نے اس حماقت کے خلاف آواز بلند کی میرے اردگرد مٹھی بھر ہمدرد ہی تھے۔ اس امتحان کے بارے میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک کہ کسی شخص نے اس رویے میں کسی ایسے جلسے میں خود شرکت نہ کی ہو اور یہ نہ دیکھا ہو کہ وہاں کیا فضا ہوتی

تھی ۔ ذرا تصور کیجیے ۔ اس وقت ہم پر کیا گزری ہوگی جب ہم نے خود کو بچانے والے اس ہجوم سے جو قابو سے باہر ہو چکا تھا فرار ہوتے ہوئے ہمیں دریا کے کنارے کی طرف دھکیل دیا ۔ جنگ کے دوران جب ہم لوگ قوم کو بچانے کی خاطر میدان جنگ پر لڑ رہے تھے تو یہی ہجوم جو اسی قوم میں شامل تھا ہمارے ساتھ کیا کر رہا تھا ۔ اگرچہ لوگ بھرتی بھی ہوئے تو بکریوں بھیڑوں اور بیلوں کی طرح جان بچا کر محاذ جنگ سے بھاگ آئے جب ہجوم نے ہم پر حملہ کیا تو ہم میں سے چند ہمارے ہتھیار ہمارے ساتھ تھے اور ایک دل وہاں تھے ۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ زندگی رہنے تک ہم ساتھ رہیں ۔

ہم نے بڑے دکھ جھیل کر عوام کی گمراہی دور کی ہے

1919ء میں بھی ایسے تصادم کے واقعات رونما ہوتے رہے ۔ لیکن 1920ء کے آغاز میں تھوڑی عرصہ بعد اس تصادم کی شدت بڑھ گئی ۔ مختلف جلسوں میں تو میرے خلاف کو جو بے خانماں ہو چکا تھا ہے دھڑکا دھڑکا لفظوں کو سامنا کرنا پڑا ۔ اس وقت مجھے ایک ایسا ہی جلسہ خاص طور پر یاد آ رہا ہے ۔ یہ جلسہ میونخ شہر کے مختلف حصوں میں ہوا تھا ۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میری اور میرے دوستوں کی بری گت بنی ۔ ہمیں فرش پر گرا کر پاؤں سے کچلا گیا ۔ مختلف گروہوں نے ہمیں اٹھا اٹھا کر ہال سے باہر پھینک دیا ۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہوتی تھی کہ ہم لہولہان ہو چکے ہوتے تھے ۔ ہوش بھی نہ ہوتی تھی کہ سر دھڑ میں ہے یا نہیں ۔

یہ جلسے جلوس تو پہلے سے ہی ہوتے رہتے تھے ۔ پھر میرے ساتھ میرے نام جنگ کے رفقاء بھی شامل ہو گئے تھے ۔ اس وقت ہماری تحریک نے یہ ذمہ داری سنبھال لی ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کامیاب ہوئے یا نہیں ۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ۔

میں آج یہ اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہم ہی تھے جنہوں نے منظم ہو کر اپنے ہمدردوں کی مدد سے بتدریج لیکن یقینی طور پر اس حماقت و غداری کی وبا کی سازش کا خاتمہ کر دیا ۔ میں حماقت و غداری کی مشترکہ سازش کا ذکر اس لیے کرتا ہوں

کہ کوئی بھی ایسی سازش میں شریک ہونے والے عوام بے وقوف تھے لیکن میں یہ نہیں مان سکتا کہ اس سازش کو منظم کرنے والے اور اس کی ترغیب دینے والے بھی سادہ دلی کے عذر سے بے گناہ قرار دیے جا سکتے ہیں ان سازشیوں کو میں تب بھی غدار سمجھتا تھا۔ اور آج بھی غدار سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ فرانس سے گداری کرتے تھے ان میں سے ایک مجرم کا نام مارشل نیں تھا۔ اس کے جرم کا ثبوت اب تاریخ کے اوراق پر ثبت ہو چکا ہے۔

وفاق کا فرد دراصل نفاق پر مبنی ہے

بہر صورت حال کو بروئے کار لا کر ناپولین کا ارادہ تھا کہ یہ سازش کرنے والے اپنی عیاری سے اپنے اصل مقاصد کو وفاق کی حمایت کے پردے میں چھپانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا پیدا کردہ شورش کا سب بھی محض وفاقی نظام حکومت کا قیام ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ ہر شیا کی حکومت میں جو شورش کھڑی کی گئی اس کا وفاق کی حمایت سے کوئی تعلق نہ تھا "تحریک وفاق" کا یہ مطلب کس طرح ہو سکتا ہے۔ کہ جو وفاقی حکومت پہلے سے قائم ہے اس کے بخیے ادھیڑ دیے جائیں جو شخص ریاست داری سے وفاق کا حامی ہو جو وفاق کے اس تصور کا مخالف نہ ہو جو امریکہ نے مملکت کے اتحاد کی غرض سے پیش کیا تھا اور وہ امریکہ کی یونین ہوئی یا کم از کم جرمنی کی ہوئی پر مبنی سرکاری حکومت کیسے قائم کر سکتا تھا۔ کم از کم یہ محض ملک کے مختلف حصوں کے مابین قطع تعلق کی حمایت تو کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر شیا کی قدامت پسند پارٹی کا کوئی رکن پیرس سے فرانکو یا کی علیحدگی کا مطالبہ کرتا یا اس قسم کی علیحدگی کی تحریک کی حمایت میں کوئی کھلا سیاسی قدم اٹھاتا تو میونخ میں اجتماع کا کیا نتیجہ ہوتا۔ باوجود اس کے جو سچے اور مخلص حامیان وفاق اس ہوا و ہوس کی چال کو نہ سمجھ سکے اور اس کا شکار ہو گئے وہ ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ دراصل حامیان وفاق نے وفاق کے تخیل کو یوں توڑ مروڑ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اگر ان سرکار کو وفاقی نظام قائم کرنا ہے تو

اس کا طریقہ یہ نہیں کہ ایسے کو مرکے ایک اداری عنصر یعنی پرشیا کی تعمیر کی جائے اور اسے برا بھلا کہا جائے۔ اس طریقے سے تو وفاق کا قیام اگر ممکن بھی ہو تو ناممکن بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس لیے بھی قابل عمل تھا کہ اس نام نہاد حامیان وفاق نے اپنی شورش کا نشانہ پرشیا کے باشندوں کے اس عنصر کو بنا رکھا تھا۔ جو ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء میں قائم ہونے والی جمہوری سرکار کے گناہوں سے داغدار تھا۔ یہ نام نہاد حامیان وفاق آئین وائمر کے مخالفین پر کوئی حملہ کرتے تھے کیونکہ آئین وائمر کے مخالفین بیشتر یہودی نسل کے باشندے تھے اور یا پھر یہودی تھے۔ ان لوگوں کا تمام زور بیان پرشیا کے قدامت پسندوں کے خلاف صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ قدامت پسند آئین وائمر کے مخالف تھے اس تحریک کو چلانے والے یہودیوں پر وار کرنے سے بھی احتراز نہ رکھتے تھے۔ ان کی یہ روش باعث استعجاب نہیں۔ اس سے تو سارے معمہ کا حل نکلتا ہے۔

یہودی اپنی بدمعاشی چھپانے کے لئے قوم میں پھوٹ ڈال دیتا ہے

انقلاب سے پہلے یہودیوں نے عوام کی توجہ اپنے آپ سے ہٹانے کے لیے یہ ترکیب اختیار کر رکھی تھی کہ جمہور کو اور خاص طور پر بویریا کے باشندوں کو پرشیا کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ یہی حربہ یہودیوں کی پالی ہوئی انقلابی کمپنیوں کو جمہوری توجہ سے بچانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ انقلاب کے بعد یہودیوں نے پہلے سے بھی زیادہ قوت حاصل کر لی تھی۔ اس قوت کو چھپانے کے لیے کسی ایسے ہی حیلے بہانے کی ضرورت تھی۔ یہودی اس دفعہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ وہ یوں کہ یہودیوں نے تمام نہاد قوم پرست عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ بویریا کے قدامت پسندوں کو پرشیا کے قدامت پسندوں سے الگ کر دیا۔ حالانکہ یہ دونوں قدامت پسند تھے۔ یہ عمل انجام دیتے ہوئے یہودیوں نے انتہائی مہارت سے کام لیا۔ درحقیقت پرشیا کی دشمنی اور بھی یہودیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن پرشیا کے خلاف اس قسم کے دشمنانہ اور مخاصمانہ جذبات بھڑکائے گئے کہ ان لوگوں کو احمق بنایا جا رہا تھا جنہیں احساس تک نہ ہو کہ یہودی سے کوئی

غرض نہ کرتا تھا کہ ان کی بھلائی بھلائی کا گا گھونٹ رہے تھے۔ بلوریا کے باشندوں کو یہ دکھائی دیتا تھا کہ برلن میں جاسوس اور سفارتکار کام کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ ان میں تو صرف برلن شہر کے مقامی لہجے میں بولنے والے سست اور کاہل قسم کے آدمی کے قصے سنائے جاتے تھے۔ مگر یہاں وطنیت کا نشہ شہر کا مقامی حصہ نہ تھا بلکہ پورا شہر تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پوری دنیا کا شہر تھا۔

یہ لوگ تو حالات ایسے بدلک ہو جاتے تھے۔ کہ انسان مایوس ہونے لگتا تھا۔ یہودیوں میں یہ بڑی معمولی خاصیت ہے کہ وہ عوام کی توجہ اپنے سے ہٹا کر اس کا رخ دوسروں کی جانب موڑ دیتے تھے۔ ان کی اس خاصیت کا مظاہرہ آج کل بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس خاصیت کی مثالیں موجود رہنے کے واقعات سے بھی مل سکتی ہیں۔

یہودی کی سازشوں کا قوم کو علم بھی نہ تھا

۱۹۱۸ء میں یہودیوں کی مخالفت کی تحریک کسی مظلم شکل میں موجود نہ تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب بھی ہم یہودیوں کا تذکرہ سنتے تھے تو ہمیں کیا دشواریاں پیش آتیں لوگوں کے چہرے ہی بیزاری کے آثار ظاہر کرتے گویا وہ کچھ ہی نہیں۔ یا ایسا ہوتا تو گویا ہر شخص ناپسندیدگی کے آثار ہویدا ہوتے۔ اس زمانے میں ہم عوام کی توجہ قوم کے اصل دشمن کی طرف موڑنے کی جتنی بھی کوشش کرتے وہ سب بیکار نظر آتی۔ اس کے بعد صورت حال میں کچھ بہتری رونما ہونے لگی۔ صدر اعوان کے اس رجحان کی رفتار نہایت سست تھی۔ "دشمن سے بچنے اور دشمن پر حملہ کرنے کی فلیگ" کی تنظیم آگرچہ ناقص تھی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہودیت کا مسئلہ ایک دفعہ پھر سامنے آ گیا۔ ۱۹۱۸ء کے درمیانی موسم سرما میں بلی عوام کی مخالفت آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگی۔ اس سے بعد قوم پرست اشتراکی تحریک نے یہودیت کا مسئلہ ایک بالکل نئے زاویے میں پیش کیا۔ ہم نے یہ مسئلہ دیہاتی علاقوں اور مضافاتی بستیوں کے علاقے سے لاں

کر ایک عوامی تحریک کے طور پر عمل میں تبدیل کر لیا۔ جو بھی ہو اس مسئلہ کو جرمن قوم کے سامنے یوں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے کہ اس سے قوم کے اتحاد کو تقویت حاصل ہو۔ یہودیوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔ انہوں نے وہی پرانے حربے اختیار کر لیے۔ جرمن کی مستعدی سے یہودیوں نے محب وطن تحریک میں پھوٹ ڈال دی۔ یہ پھوٹ یوں پھیل کر ایک طبقاتی جنگ ہو گئی ایک طرف تو انہوں نے پارلیمنٹ کی اکثریت حاصل ہونے پر زور دینے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس کے بعد بالشویک اور پارلیمنٹ فرقوں میں دو بدو لڑائی ہوئی۔ اس وقت یہ ایسی فرقہ وارانہ تحریک تھی ایک ایسا مسئلہ تھا کہ جو عوام کی توجہ دوسرے مسائل سے ہٹا سکتا تھا۔ غرض یہودیوں کے خلاف جو مہم شروع کی گئی تھی اس سے عوام کی توجہ ہٹا دی گئی۔ جن لوگوں نے قوم کو اس فرقہ وارانہ تنازعہ میں الجھایا انہوں نے قوم کے خلاف ایک ایسا جرم کیا جس کا کفارہ وہ کبھی ادا نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال یہودی جو چاہتا تھا وہی کرتا تھا۔ بالشویک اور پارلیمنٹ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے لتے لے رہے تھے۔ دوسری طرف قربانیوں کا دشمن بلکہ خود اشتراکیت کا دشمن ہونے میں منہ چھپائے ان کی حماقت پر قہقہے لگا رہا تھا۔

یہودی ہماری قوم کی عصمت اور ناموس پر روحانی گھاؤ لگا رہا ہے

پچھلے سال بہت سے وفاقی نظام حکومت اور وحدانی نظام حکومت کی نزاع میں عوام کو الجھایا گیا عوام کی قوتیں یوں ضائع ہوتی رہیں۔ یہودی مزے سے قوم کی جیبیں کاٹتا رہا۔ اس نے ہمارے اقتصادی سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کیا۔ اب ایک مرتبہ پھر یہودی اپنی پرانی چال میں کامیابی سے کام لے رہا تھا۔ آج جرمنوں کے دو مذہبی فرقوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ دونوں لڑنے میں مصروف ہیں۔ اور دونوں کی جیبیں یہود کھوکھلی کرنے والے مزے لوٹ رہا ہے۔ یہ لڑائیاں اس زہر سے کھوکھلی ہو رہی ہیں کہ جو جرمن اقوامیت اور عقیدے کا حامی یہودی ہماری قوم کے معتقدات میں داخل کر کے پھیلا رہا ہے۔

ذرا سوچیے تو ہماری قوم کے خون میں یہودی خون کی آمیزش سے کتنی تباہی کا سامان ہو رہا ہے۔ یاد رکھیے کہ اس مسیح کرنے والے زہریلے قوم کے تسلط سے نجات صدیوں بعد ہی ہو سکے گی۔ ممکن ہے کبھی ہو نہ ہو سکے۔ یہ بھی غور کیجیے کہ نسل میں خلل پیدا ہونے سے ہماری جرمن قوم کی آریائی خصلتیں یکسر مٹتی جا رہی ہیں۔ ایک ملت کے ہماری تمام اخلاقی و تخلیقی استعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے شہروں میں یہ خطرہ رونما ہو چکا ہے کہ ہم ماضی کے اس گڑھے میں نہ گر جائیں جس میں آج یہودی گر چکا ہے۔ خون کی آمیزش ایک دہانی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہماری قوم کے لاکھوں افراد اس دہانے حائل ہیں یہودی اس وبا کو پھیلانے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔ یہ گلٹو جرثومیں جو ہماری قوم کے جسم سے چمٹی ہوئی ہیں۔ ہماری معصوم سی بھیڑ بکریوں والی دوشیزاؤں کی عصمت پر یہودی کاروباری ہیں ایسے دولت کے دھبے ہمارے ماتھوں کی پیشانی پر سے کبھی نہ دھل سکیں گے۔

آریہ خدا کی برگزیدہ اور بہترین مخلوق ہیں

آریہ خدا کی وہ برگزیدہ اور بہترین مخلوق ہیں جو اس نے اپنی خاص عنایت کے نمونے کے طور پر اس دنیا کو عطا کی ہے۔ یہودی خدا کی اس برگزیدہ مخلوق کو ہلاک کر رہے ہیں۔ وہ آریوں کی نسل کو مٹا رہا ہے۔ یہ گناہ عظیم عیسائیت کے دونوں بڑے فرقوں پر بھی بدستور ملوث ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی آنکھوں کے سامنے سرزد ہو رہا ہے۔ باوجود اس کے یہ دونوں عیسائی فرقے اس گناہ کے ارتکاب کو روکنے میں اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل ہیں۔ جہاں تک دنیا کے مستقبل کا تعلق ہے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے کہ ان دونوں عیسائی فرقوں میں سے کس کو کس پر فتح نصیب ہوتی ہے۔ لیکن دنیا کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے کہ آریہ نسل زندہ رہتی ہے یا نہیں باوجود اس کے یہ دونوں عیسائی فرقے آریہ نسل کے وجود سے نہیں لڑتے بلکہ آپس میں لڑتے ہیں۔ یہ کبھی مستقل نہیں رہتے ہے۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں سچے دین کا صحیح جذبہ موجود ہے جو

وہ کسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا ہو اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ کی مخلوق کو ہر اس شخص
اللہ کی رضا پوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں خوبیاں ہونی چاہئے کافی نہیں۔
شخص سے خدا کی مخلوق بھی کرنی لازم ہے۔ خدا کی مخلوق پوری ہو سکتی ہے۔ جس نے
ہر شخص کے انسان کو حد انسانوں سے بڑھ کر انسانی شکل دی۔ جو ذہنیت خدا کی
جدا مخلوق کی۔ اب جو شخص اللہ کی عبادت میں بھی دے کر خلق پیدا کرتا ہے۔ وہ
ہے کائنات کی تخلیق ہو خود خالق حقیقی کے مخلوق کے خلاف عبادت کا ارتکاب کرتا ہے۔
جو شخص ایسی عبادت کا ارتکاب کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ اپنا جو فرض ہے چاہے وہ
کسی مذہبی فرقے سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو یہ ہے کہ یہ مطالبہ اپنے مذہبی
فرقے کے اندر رہتے ہوئے کرنا چاہیے۔ جو شخص اپنے مذہبی فرقے کی حمایت کی حد سے
تجاوز کر کے دوسرے مذہبی فرقے کے لوگوں سے ٹکراؤ میں پڑتا ہے اور اس طرح خدا
کے خلاف عبادت کرنے والوں کے مقابلے میں تو خود بنتا ہے۔ اس کو یہ کام کبھی
نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ٹکراؤ میں پڑنا فرض سے بھی ہو سکتا ہے۔ نا فرض سے بھی۔

پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کا مسئلہ

عیسائی میں جو مذہبی فرقہ وارانہ اختلافات موجود ہیں ان کے فیصلہ کن نظریہ ایک فرقے
کے پیرو کا دوسرے فرقے کے پیروی معتقدات پر حملہ کرنے سے اس کے کچھ نتیجہ
نہیں پیدا کر سکتا کہ دونوں فرقوں میں ہمیشہ کی تصادم ہو جائے۔ ایسا تصادم عیسائیت کے
دونوں فرقوں کے لیے مضر ہوگا۔ اس معاملے میں عیسائی کی صورت حال فرانس جیسی ہے
سے بالکل مختلف ہے۔ ان جیسی ملکوں میں اگر کوئی شخص پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کے
خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے تو اس کا یہ نتیجہ ضروری نہیں کہ فرانسیسی ہسپانوی یا اطالوی قوم
کے اندر تفرقہ ہو اور خانہ جنگی پیدا ہو جائے۔ عیسائی کی صورت حال فرانس جیسی یا اٹلی سے
بالکل مختلف ہے۔ یہاں پاپائیت کی اطاعت مطلقہ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا گیا۔
تو اس میں پراٹسٹنٹ ضرور حصہ لیں گے فرض دوسرے ملکوں میں پاپائیت کی اطاعت

مطالبے کے خلاف تحریک شروع ہو تو اس میں حصہ لینے والے بیشتر لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی تحریک میں حصہ لینے والے بیشتر لوگوں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ پاکستانی سیاسی مسائل میں دخل نہ دیا کریں۔ برعکس اس کے برما میں کوئی ایسی تحریک شروع ہو تو اس کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ بیشتر لوگ فرقہ پرستانہ فرقہ مطلوب ہو رہا ہے۔

مذہبی فرقوں کی جنگ قوم کے لیے مضر ہے

کسی مذہبی فرقہ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو اختلاف رکھنے والوں کو علیحدہ ہونے کی کم از کم اس کا متحمل نہ برداشت کر لیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے بالکل اسی مسئلے پر اختلاف رائے دو مذہبی فرقوں کے مابین پیدا ہو جائے۔ تو اس کے اختلاف کے اظہار میں حصہ لینے والے متحارب فریقوں کو ان لیے رکھی ہوں تو ایسے اختلاف سے برگزیدہ داری کا سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ اصول اس حد تک تو درست ہے۔ کہ تحریک فرقے کے اندر کسی مسئلے پر اختلاف رائے پیدا ہو جائے۔ تو جو شخص اس اختلاف کے وقت کی نزاکت کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہے وہ کسی شخص سب سے پہلے یہ دیکھے کہ کوئی دوسرا فرقہ اس نزاکت یا اعتراض کو دور کرنے کے درپے ہے تو وہ صرف وہ اپنی حمایت سے دست بردار ہو جائے گا بلکہ غیر فرقے کی اندرونی اختلافات میں دخل دینا بھی نامناسب سمجھا جائے گا۔ ایک مذہبی فرقہ دوسرے مذہبی فرقے کے اندرونی اختلافات میں اگر قومی مفاد کی خاطر دخل دے تب بھی یہ مداخلت برداشت نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بھی ہمارے دینی عقائد ہمارے سیاسی عقائد اور ہماری قومی وفاداری سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس صورت حال کو اس طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مذہبی فرقہ کو دوسرے مذہبی فرقے سے لڑا دیا جائے۔ اس کا علاج تو یہی ہے کہ مختلف شہروں کے مابین مذہبی رواداری پیدا کی جائے۔ اگر یہ اتحاد ہو گیا تو پھر قوم باہم عظمت کے اس عروج پر پہنچ جائے گی جہاں پہنچ کر مذہبی اختلافات کو بھی عشق سے دور رکھنا ممکن ہوتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ آج ہندو مسلم جیسی فرقہ وارانہ تحریکات کو مذہبی اختلافات سے الجھایا جاتا ہے وہ بین اقوامیت کے عالمی کیمونسٹوں سے بھی بڑھ کر قوم کے بدتر دشمن ہیں قوم پرست شتراکی تحریک نے اپنا نصب العین یہ مقرر کیا ہے کہ ان کیمونسٹوں کو ان کے موجودہ عقیدے سے ہٹا کے ہی مجبور کیا جائے۔ جو شخص خود اپنی تحریک کے راستے میں ہر قدم پر مثال کر تحریک کو اس کے نصب العین سے منحرف کرنے کا خواہش مند ہے۔ وہ بدترین ندامت کا مستحق ہے۔ ایسا شخص بیہودگی کے سوا کے ہاتھ سے کھیل رہا ہے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے یا کیا جانے میں اس حرکت کا مرتکب ہوتا ہے۔ بیہودی تو خدا سے چاہتے ہیں کہ محب وطن تحریکات کا جوش و ولولہ فرقہ وارانہ مذہبی اختلافات سے متصادم ہی صرف ہو جائے۔ ورنہ بیہودیوں کو خطرہ ہے کہ محب وطن تحریکات بیہودیوں کے لیے خطرہ بن جاری ہیں۔ میں نے عمداً یہ لفظ استعمال کیا ہے کہ تحریکات کی قوت اور جوش بیہودی غیر متعلقہ مسائل میں ضائع کر دینا چاہتا ہے۔ جب تک کوئی شخص تاریخ سے بالکل جدا نہ ہو وہ یہ جان نہیں سکتا کہ جس مذہبی مسئلہ کو لے کے سیاست دان صدیوں تک حل کرنے کی کوشش کرتے رہے آج تک کامیاب نہ ہوئے اب سے اور بھی تحریک حل کرے گی۔

فرقہ وارانہ مذہبی اختلافات قوم کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا دیتے ہیں

بہر حال حقیقت حقیقت ہے۔ اس وقت ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں ہر مخلص محب وطن تحریک کا سب سے بڑا فرض برطانیہ کی اطاعت سلطنت کے خلاف جدوجہد کرنا ہے آج وہ دیکھ سکتے ہیں کہ برطانیہ کی اطاعت سلطنت کو ختم نہیں کر سکے ہیں انہوں نے وطن تحریک میں صرف رکاوٹ ڈال دی ہے۔ میں تحریک کو ہر ایسے ذہنی خلفشار سے پاک دیکھنا چاہتا ہوں جو اس وہم میں گرفتار ہو کر کہ وہ کام بھی کر سکتا ہے اصل وطنی تحریک کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ قوم پرست شتراکی تحریک کے

چلنے والوں کا ہمیشہ یہ اولین فرض ہوگا کہ قوم پرست اشتراکی تحریک کو اس قسم کے مذہبی تصورات کی بنا پر استعمال ہونے سے بچائیں جو اس قسم کا گمراہ کن پروپیگنڈا شروع کرنے سے قبل تحریک سے خارج کر دینا چاہیے۔

۱۹۳۲ء کے دوسرے حصہ تک ہم اپنی تحریک کو اس قسم کے تاثرات سے بچانے میں کامیاب رہے۔ ہماری تحریک میں ایک وسیع العقیدہ رواداری اور ایک وسیع العقیدہ بھائی چارہ کا جذبہ کام کرتا رہا۔ جہاں تک اس کے مذہبی معتقدات کا تعلق تھا ان میں اس قدر تضاد تھا کہ کوئی فرق نہ آیا۔ دونوں نے متحد ہو کر پولس کو برباد کرنے والوں کے خلاف جو جانکاہ جدوجہد کی اس کے دوران دونوں کے دل میں ایک دوسرے کا احترام پیدا ہو گیا۔ انہیں ایام میں ہماری تحریک کا اعتدال پسند پارٹی سے تعلق تازہ ہو گیا۔ اس تازہ کا مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس تازے کی بنیاد قومی قبلی سیاسی اور اقتصادی مفاد پر تھی تب ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ درست تھا۔ آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ میں زیادہ عقل رکھتے ہیں انہیں اس مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مذہبی فرقوں کا سر نہ ابھارنا

گزشتہ چند سال سے اس ضمن میں حالات بدل گئے ہیں۔ نام نہاد محب وطن حلقوں کی طرف سے کچھ ایسی سنسنی ہے کہ وہ مذہبی تنازعات میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں اپنی سلامتی کا احساس اس وقت سے بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے مذہبی فرقے کی اس سرایت کار نے مارکس ازم کے مقابلہ کے مواقع بڑھا دیتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ تحلیل اور خرابی پیدا کی جائے۔ ایسے فرقے بنا دیے جاتے ہیں اور ایسی ایسی تنظیمات پیدا کی جاتی ہیں کہ جن کا کوئی سر پیر نہیں۔ آج ایک فریق کی خبر لی جاتی ہے۔ کل دوسرے فریق کی درگت بنتی ہے۔ یوں باری باری اشتعال سے مذہبی مناظرے کی آگ روشن رکھی جاتی ہے۔

جرمن ایک ایسی قوم ہیں جن کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ قومیات اور اجتماعی
تنظیمات کی خاطر بھی مدتوں باہم لڑتے جھگڑتے رہ جاتے ہیں۔ ایسی قوم میں معمولی
باتوں پر بھی مہلک خانہ جنگی ہو سکتی ہے۔ مگر اس قسم کے تفرقے پیدا کر کے ہماری قوم کو اس
کی زندگی کے اصل مسائل سے دور رکھا گیا ہے۔ جب جرمن مذہبی جنگوں میں ایک
دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے تو دوسری قومیں دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔
آج محب وطن جرمن اس بحث میں منہمک ہیں کہ یہودیت کی اطاعت واجب تسلیم
کرنے سے زیادہ خطرہ ہے یا یہودیوں سے زیادہ خطرہ ہے۔ ہم اس بحث میں گرفتار
ہیں اور یہودی ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمارا خون چوسنے کے درپے ہیں۔ یکساں
نصب العین وطن کی جنگ آزادی کو دیکھ کر میں قوم پرست اشتراکی تحریک اور جرمن قوم کی
جانب سے دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمیں ایسے دشمنوں سے بچائے جو ہم اپنے
دلوں سے خود پیدا کریں گے۔

بین الاقوامی نظام حکومت

جرمنی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں عالمی نظام حکومت قائم کرنے کے متعلق ۱۹۱۹ء سے
لے کر یہودیوں نے جو مہم جاری کی ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس نے قوم پرست
اشتراکیت کو مجبور کر دیا کہ وہ اس تازہ کی مذمت کرتے ہوئے اصل مسئلہ کے متعلق
صحیح رویہ اختیار کرے۔ "کیا جرمنی بین الاقوامی حکومت قائم ہونا چاہیے۔ یا
ایک مرکزی نظام حکومت؟" ان اصطلاحات کا صحیح مطلب کیا ہے۔ میری رائے میں
پہلے سوال کی نسبت دوسرا سوال زیادہ اہم ہے۔ میں دوسرے سوال کو اس لیے اہم قرار
دیتا ہوں کہ اس پر سارے مسئلہ کا انحصار ہے۔ اس دوسرے سوال کا جواب طے ہو جانے
کے بعد تمام علاقہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اور ایک منطقی ریاضت کی طرح حل ہو جائے گا۔

بین الاقوامی حکومت سے کیا مراد ہے؟

بین الاقوامی حکومت کا مطلب ہے کہ کسی متعلقہ جہان حکومتیں، رضا و رغبت خود اپنے

مطلق العنان اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ایک اشتراک قائم کرتی ہیں۔ اور اس طرح ایک نئی حکومت وجود میں آجاتی ہے۔ اس نئی حکومت کو اشتراک میں شمولیت کرنے والی تمام حکومتوں کے اس قدر اختیارات منتقل کر دیے جاتے ہیں جو اتحاد کے قیام کے لیے لازمی سمجھے جائیں اور جن سے نئی حکومت کے مقاصد کا اہتمام ہو سکے۔

امریکی وفاقی نظام کی بنیاد کیا ہے؟

یہ ہے وفاقی نظام کا مفہوم لیکن اس نظام کے تحت آج تک کسی وفاقی حکومت میں فی الحقیقت عمل نہیں ہوا۔ خاص طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو اس نظام کا عمل نہیں ہو رہا ہوں یہ کہنا دشوار ہے کہ اشتراک میں شامل ہونے والی اکثر وحدتیں پہلے مطلق العنان تھیں۔ بعض وحدتیں تو وفاق کے قیام کے بعد اس میں آکر شامل ہوئیں ان وحدتوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شمولیت اختیار کر رکھی ہے ان میں سے اکثر کسی وحدتیں ہیں جن کے حدود اربعہ کا تعین محض صوابدید تھا۔ بعض ریاستوں کی حدود تو نقشہ نویس کے مکھ نے مقرر کیں۔ شروع شروع میں تو ان ریاستوں کا کوئی جداگانہ تشخص تھا نہ ریاستیں منقسم ہونے کی حالت میں کسی قسم کے حقوق کا سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ امریکی وفاقی نظام حکومت نے خود ان ریاستوں میں سے اکثر کی تشکیل انجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ مطلق العنانیت کے اختیارات کچھ بڑے وسیع ہیں لیکن یہ اختیارات وفاق کے قیام سے پہلے وفاق میں شامل ہونے والی تمام وحدتوں کو حاصل نہ تھے۔ بلکہ خود وفاقی حکومت نے ان وحدتوں کو عطا کیے تھے۔ لہٰذا یہ اختیارات وفاقی حکومت کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ اختیارات تو اس وسیع تر علاقائی منطقہ کی خصوصیات میں شامل ہیں جس کا رقبہ قریب قریب ایک براعظم کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسی متعدد وحدتوں کا تصور نہیں آتا جو مطلق العنان تھیں۔ بلکہ ایسی وحدتوں کا تصور ذہن میں آتا ہے جنہیں خود مختاری کے اختیارات وفاقی آئین کے

ماتحت حاصل ہوئے۔

جرمن وفاقی نظام کی خصوصیات

مذکورہ بالا تعریف ان حقائق پر پوری طرح صادق نہیں آتی جو جرمنی کے وفاقی نظام کی نوعیت سے متعلق ہیں۔ یہ درست ہے کہ جرمنی میں وفاقی مملکت کے قیام سے پہلے وحدتوں کا وجود تھا۔ مملکت کا قیام ان وحدتوں کی رضامندی سے عمل میں آیا۔ تاہم مملکت ان وحدتوں کے رضاکارانہ اتحاد سے قائم نہ ہوئی تھی۔ نئی وفاق میں شامل ہونے والی تمام وحدتوں کا باہمی تعاون رضاکارانہ تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ پرشیا کی ریاست نے رفتہ رفتہ باقی تمام ریاستوں پر غلبہ پا لیا۔ جرمن ریاستوں کے نظموں کی باہمی تفاوت اس قدر زیادہ ہے کہ جرمن وفاقی نظام کو کسی طرح امریکی وفاقی نظام کے مماثل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بڑے رقبے والی جرمن ریاستوں اور چھوٹے رقبے والی جرمن ریاستوں کے رقبے میں باہمی تفاوت اس قدر زیادہ ہے اور پھر سب سے بڑے رقبے والی جرمن ریاست تو دوسری ریاستوں سے اتنی بڑی ہے کہ ان سب کے مابین مساوات قائم کرنا ناممکن العمل ہے۔ یہ چھوٹی بڑی ریاستیں وفاقی سطحات کے قیام میں مساوی حصہ دار نہیں بن سکتیں۔ اکثر ریاستیں تو ایسی ہیں کہ وہ جنگ وصلح میں بھی مطلق اعلان نہ تھیں۔ جرمن ریاستوں کی مطلق العنانیت داخلی نظم ونسق تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی منصب نہ تھا۔ پھر یہ تو ہے کہ وقت کے واقعات نے اور پھر موجودہ زمانے کے واقعات نے ان میں سے اکثر کا نام نہاد "مطلق العنان" ریاستوں کا وجود ختم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان "مطلق العنان" ریاستوں کا وجود زیادہ تر نام ہی تھا۔

بسمارک کا قائم کردہ وفاقی نظام

ان ریاستوں کا قیام ان تاریخی حالات میں ہوتا تھا جن پر یہاں ان کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ البتہ میں اس حقیقت کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر ریاستوں کا وجود ان کے [illegible] سے قبل سے متعلق تھا۔ یہ وجود

رہنا محض سیاسی حالات کا نتیجہ تھا۔ یہ سیاسی حالات اس قسم کے تھے جس میں رہتے ہوئے ہمیشہ مرکزی سلطنت روبہ زوال تھی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ یہ بھولی ہوئی باتیں اس انحطاط اور زوال کا نتیجہ بھی نہیں اور اس کا سبب بھی نہیں کا وجود ہمارے ذہن میں استقلال رونما ہونے کا نتیجہ تھا۔

قدیم مرکزی سلطنت کا آئین ان تمام مذکورہ بالا حقائق پر مبنی تھا۔ کم از کم اس آئین میں ان حقائق کا ایک حد تک لحاظ رکھا گیا تھا۔ وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کو پارلیمنٹ میں مساوی نمائندگی نہ دی گئی تھی۔ ان کی نمائندگی ان کے رقبے کے اعتبار سے تھی یا پھر یہ نمائندگی ان کی تجارتی اہمیت کے تناسب سے دی گئی تھی یا سلطنت کی فوج میں ہر وحدت نے جو حصہ لیا تھا اسے ملحوظ رکھتے ہوئے نمائندگی دی گئی تھی۔

وفاق میں شامل ہونے والی مختلف وحدتوں نے اپنی مخلوط اجتماعیت کے اختیارات تمام و کمال رضاکارانہ طور پر وفاق کو منتقل کر دیے۔ کل وحدتوں کی مخلوط اجتماعیت مقصود تھی۔ ان وحدتوں کے اختیارات تو انہوں نے اپنے طور پر وفاق کے سپرد کر دیے۔ اسمارک نے اس وفاق کا آئین تیار کرتے ہوئے جو اصول مدنظر رکھا وہ یہ تھا کہ مختلف وحدتیں اپنے اختیارات وفاق کو منتقل کریں بلکہ جو اصول مدنظر رکھا گیا وہ یہ تھا کہ مرکزی سلطنت کے قیام کے لیے جو اختیارات ضروری ہیں وہ وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں سے طلب کر لیے جائیں۔ یہ حکمت عملی اعتدال پسندانہ بھی تھی اور دانش مندانہ بھی۔ ایک طرف تو اسمارک نے رسوم و رواج اور روایات کا پورا لحاظ رکھا۔ دوسری طرف اس کی حکمت عملی نے نئی مرکزی سلطنت کو اس کے روز قیام سے ہی معقول اور بہترین حکومت بنا دیا۔ ہر وحدت کا رضاکارانہ اور مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی کہ سمجھا جائے اسمارک جب یہ آئین تیار کر رہا تھا تو اس کے ذہن میں اس آئین کے ذریعے مرکزی وفاقی نظام حکومت کو وہ تمام مراعات اختیارات حاصل ہو گئے جو آئندہ زمانہ کے لیے درکار ہو سکتے ہیں۔ اسمارک کا مقابلہ تو یہ تھا کہ کسی صورت سے

جو شاہی وفاق میں شامل ہونے والی وحدتیں اس وقت تسلیم نہ کرتیں۔ بسمارک کو یہ توقع تھی کہ رفتہ رفتہ ریاستوں کے نتائج خود بخود وحدتوں کے اختیارات میں کمی پیدا کر دیں گے۔ کسی کام میں تدریج کے یہ معنی تو زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ فی الفور ہر وحدت کو مجبور کر کے اس کے اختیارات چھینے جا سکتے ہیں تو شاید نتیجہ اچھا نہ ہوتا۔ بسمارک کی اس حکمت عملی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کبھی غافل سیاسی مدبر تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ان سلطنتوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اور وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔ بسمارک کا جو توقع تھی زمانے نے وہی کام کر دکھایا۔

جرمنی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا حشر

جب جرمنی کی جنگ میں شکست ہوئی اور قیصریت کا نظام حکومت ختم کر دیا گیا تو اس کے نتیجہ یہ نکلا کہ وفاق میں شامل ہونے والی مختلف ریاستوں کے اختیارات بہت کم ہو گئے اور مرکزی حکومت کے اختیارات بڑھ گئے۔ جن وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں کسی نہ کسی بنیاد پر قائم نہ تھیں۔ ان ریاستوں کی بنیاد یہاں کی شاہی قیصر نظام حکومت ختم ہوا اور مختلف تاجدار خاندانوں کے اختیارات سلب کر لیے گئے تو ان ریاستوں کا وجود ہی معدوم ہو گیا۔ یہ ریاستیں تو خود ان تاجدار خاندانوں کے دم قدم سے تھیں۔ مگر ان خاندانوں نے ہی ان ریاستوں کو قائم کیا تھا اس کے اثر سے ان ریاستوں نے ترقی کی تھی۔ جب ان ریاستوں کے قیام کی اصل مد ختم ہو گئی تو ان ریاستوں کا جداگانہ وجود کس طرح قائم رہ سکتا تھا۔ عملی نتائج سے مجبور ہو کر ان ریاستوں نے اپنے ہمسایوں سے الحاق کر لیا۔ بہ صورت دیگر رضاکارانہ طور پر زیادہ طاقت ور ریاستوں میں مدغم ہو گئیں۔ اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے وہم اختیارات مطلق العنانیت در حقیقت نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ان ریاستوں کے باشندے ان ریاستوں کے جداگانہ وجود کی

کچھ زیادہ ہی وعدہ کرتے تھے۔

ملوکانہ کے کام مکمل ہوتے ہی جرمن سلطنت کے وفاقی کام کو سخت دھچکا لگا تھا۔ جب صلح کا اہم معاہدہ طے کر لیا گیا تو اس معاہدے سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں نے وفاقی نظام کو بڑی کمزور بنا دیا۔

جرمن مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع کی وجوہات

جب جرمن سلطنت نے جنگ ہار کر اقتصادی تاوان ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی تو ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری کے متعلق وفاق میں شامل ہونے والی ہر وحدت سے کوئی اقتصادی معاہدہ نہ کیا گیا۔ اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ تھا کہ وفاق میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں کے مالی اختیارات متعلق الاعلان نہ رہے۔ جوں جوں صلح کی شرائط پر عمل ہوتے گیا تو جرمن قوم کی مالی زنجیریں زیادہ مضبوط ہوتی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مرکزی جرمن حکومت نے مجبوراً اک خاص حد تک ریلوے کے محکموں پر بھی تسلط جما لیا۔ جرمنی کو ہونے کے لیے جنگ میں حصہ لینے والی قوم میں جس قدر اپنے مطالبہ میں اضافہ کرتیں اتنا ہی مرکزی جرمن حکومت کو بھی مجبوراً اپنے اختیارات کا دائرہ وسیع کرنا پڑتا۔

یوں رفتہ رفتہ مرکزی جرمن حکومت کے اختیارات وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ اختیارات کی اس توسیع کے لیے جو دلیل پیش کی گئی وہ معقول تھی لیکن اختیارات کی یہ توسیع حالات کا طبعی اور منطقی نتیجہ تھی۔ اس توسیع کا الزام دراصل ان لوگوں اور سیاسی پارٹیوں پر ہے جنہوں نے ضرورت کے وقت جنگ جیتنے پر پوری توجہ نہ دی۔ اگر انہوں نے جنگ لڑنے میں پوری توجہ صرف کی ہوتی تو جرمنوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس جرم کا ارتکاب زیادہ تر ان سیاسی پارٹیوں نے کیا جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو جنگ کے دوران میں قومی مفاد پر ترجیح دی۔ یہی جماعتیں زیادہ تر ہیرو بنی تھیں۔ انہوں نے قومی کاز کو جس وقت کہ قوم کی توجہ کی ضرورت تھی۔ ہم جنگ ہار گئے

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ترکی جو کچھ ان سے حاصل کرتا تھا اس سے بھی زیادہ وہ ان تک انہیں دوگنا کر دیتا تھا۔ اسے کہتے ہیں ہاتھ کا انعام۔ شاید کسی رسم کے ارتکاب پر آسمانی عذاب اتنا جلد نازل نہیں ہوتا جتنا کہ اس رسم کے ارتکاب کے بعد نازل ہوا۔ وہی سیاسی جماعتیں جنہوں نے چند سال پہلے باغی ریاستوں کے مفاد کو ترکی سلطنت کے مفاد پر ترجیح دی تھی اب لاچار اور مجبور کھڑی دیکھ رہی تھیں کہ واقعات نے مرکزی حکومت کو مجبور کر کے ان کے ہاتھوں تک ریاستوں کا وجود ہی ختم کر دیا تھا۔ ایسی جماعتیں زیادہ دیر باقی نہیں رہ سکتیں۔ انہیں اپنی موت کا پھل فوری چکھنا پڑا۔

بیرونی غلامی اندرونی خلل کا باعث ہوتی ہے

مطلق العنانیت کے تصورات پختہ ہو جانے سے ترکی وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے درجے میں جو فرق آیا اس کا وہ ریاکاری کی مدتوں مثال تھا۔ ان کے اس ملنے کا خطاب زیادہ تر رائے دہندگان سے تھا۔ کیونکہ ترکی رائے دہندگان کی بدولت ہر معاملے میں رائے دہندگان ہی سے خطاب کرتی تھیں اگرچہ یہ سیاسی جماعتیں وہ ہوتی تھیں۔ کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے اختیارات کو کم کیے جا رہی ہیں۔ اور دوسری طرف یہی جماعتیں ترکی کے دشمنوں کی جانب سے عائد کردہ شرائط صلح کے قبول کرنے کی بھی حامی تھیں جب ترکی کے دشمنوں کی جانب سے عائد کردہ شرائط صلح تسلیم کر لی جائیں تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پر ترکی کے اندر ایسے حالات پیدا ہو جاتے تھے جن سے مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع ایک لازمی امر تھا۔ دشمنوں کی عائد کردہ شرائط تسلیم کر لینے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ ترکی کی اندرونی حالت برقرار رکھی جاتی۔ اسمارک نے جو ترکی سلطنت قائم کی تھی وہ مطلق العنان حکومت تھی۔ وہ ترکی سلطنت کے بیرونی اثر کے تابع نہ تھی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ بیرونی حاکمیت بھی قبول کر لی جائے اور اسمارک کا قائم کردہ ترکی کا داخلی نظام سلطنت بھی قائم رہے۔

تاوان جنگ جرمنی کے لیے ایک لعنت ہے

اسمارک کی تاج کردہ جرمن سلطنت کے کندھوں پر کسی اس قسم کی بھاری مقننہ اقتصادی ذمہ داریوں کا بوجھ نہ تھا جیسی اب اس پر مسلط ہونے کے بعد جرمنی کے لئے ڈال دی گئی تھیں۔ داخلی معاملات میں اسمارک کی تاج کردہ سلطنت کو زیادہ اختیارات کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ سلطنت صرف بیرونی امور میں دلچسپی لیتی تھی جو اس کا وجود قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس سلطنت کے ماتحت وفاقی نظام میں شامل ہونے والی ریاستوں پر مرکزی حکومت کو کوئی بالادستی کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ مرکزی حکومت کے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ رقم کافی ہو جاتی تھی جو وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں رضاکارانہ طور پر ادا کرتی تھیں۔ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کو مرکزی حکومت کے اخراجات پورا کرنے کے لیے تھوڑی رقم ادا کرنی پڑتی تھی کہ وہ اس مرکزی حکومت سے بہت خوش تھے۔ اب یہ کہنا غلط پروپیگنڈا ہے۔ کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستیں صرف اس وجہ سے مرکزی حکومت سے ناراض ہیں کہ مرکزی حکومت نے ان پر اقتصادی ہر مالی بالادستی حاصل کر لی تھی۔ حقیقت حال یہ نہیں۔ مرکزی جرمن حکومت سے ناراضگی کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مطلق العنانیت میں فرق آ گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ مرکزی جرمن حکومت جرمن قوم کے مفادات کو بری طرح نقصان پہنچا رہی ہے۔ آج جرمن قوم کا ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ گورنمنٹ کو ہم قومی جھنڈے کا احترام کیا جاتا ہے اور جرمن حکومت کو فتح کے گانے گائے جاتے ہیں لیکن موجودہ مرکزی جرمن حکومت اپنے شہریوں کی آزادیوں کی نگہبان ہے۔ جمہوری سرکار نے اپنے تحفظ کے لیے جو پولیس اور فوج کا نظام بنا رکھا ہے اس سے جمہوری سرکار کے خلاف لوگوں کی زبانیں تو بند کی جا سکتی ہیں لیکن ایک ایسی جرمن شہری کی ہمدردی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جو کسی جمہوری سرکار سے ہمیشہ اس قسم کے قانون

ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اپنے شہریوں پر مکمل قابو نہ کر سکیں۔ اسی مقصد کے پیش
سرکارنامہ لوگوں کو فیڈریشن کی سزائیں دینے پر بھی مجبور ہے۔ اس ہنگامی سرکار کی ان
حرکتوں سے ہی دنیا میں ہنگامی سرکار کے ادارے کا نام بدنام ہو گیا ہے۔

آئینی نظام میں سیاسی کمزوریاں ٹھیک نہیں کر سکتا

آج کل بعض سیاسی پارٹیوں کہتی ہیں کہ مرکزی حکومت اس لیے کمزور اور
عزیز ہو گئی ہے کہ مرکزی حکومت نے وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی متعلق
اعانت کے بعض ایسے اختیارات چھین لیے ہیں جو پہلے انہیں حاصل تھے۔ ان
سیاسی جماعتوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں فرض کیجیے کہ مرکزی حکومت وفاق میں شامل ہونے
والی ریاستوں پر اپنے اختیارات میں توسیع نہ کرتی۔ وہ چاہتی اس کے مرکزی حکومت کی
بیرونی عزیزی میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ مثلاً یہ ہے کہ ریاستوں کو جو معمولی مقدار میں بوجھ
برداشت کرنا پڑ رہا ہے وہ تو پھر بھی برداشت کرنا پڑتا جب مرکزی حکومت صلح کے
ساتھ ساتھ کسی شرائط قبول کرتی جن کی رو سے مرکز میں کثیر تعداد میں ادا کرنا ہے تو اس
سے کیا فرق پڑتا کہ وہ تاوان خود مرکزی حکومت ادا کرے یا وفاق میں شامل ہونے والی
ریاستیں ادا کریں۔ اگر ہر ریاست کو اپنے طور پر تاوان جنگ ادا کرنا پڑتا جو آج مرکزی
حکومت ادا کر رہی ہے تو معاہدہ وارسائی کی ہر شق پر عمل کرنا پڑتا تو اس
صورت میں مرکزی حکومت کی حالت زیادہ شدید ہوتی مرے اس دعوے کی دلیل یہ
ہے کہ موجودہ حالت میں مرکزی حکومت کے پاس وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں
سے علیحدہ علیحدہ تاوان جنگ وصول کرنا اور بوجھ ہلکا ہوتا۔ نتیجہ یہی ہوتا کہ ان تاوان کو
وصول کرنے کے لیے جبر و سختی سے کام لینا پڑتا آج مرکزی ہنگامی سرکار جنگ کے
بعد صلح نامہ کی ان شرائط سے نجات حاصل کی جائے جن کی رو سے ہے وہ یہ حق
کہ صلح نامہ سے نجات حاصل کی جائے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر ہنگامی سرکار
مجبور ہے کہ ان صلح ناموں کو جس نے قبول کر رکھا ہے ان کی شرائط پر عمل بھی کرے۔ اس

صورت حال کی ذمہ داری تمام تر ان بیرونی طاقتوں کے سر پر ہے جو ایک طرف تو ترقی پذیر ملکوں کو دولتی ریاستوں کو خود مختاری کا حامل رکھنے کی کوشش کرتی ہیں دوسری طرف یہی سیاسی اور معاشی مرکزی تر ان حکومت اور اس کی پالیسی کی حمایت کرتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ترقی سے ملک اور قوم کے تمام اختیارات مطلق العنانیت ہی ختم ہو جائیں۔

حکومت کی بیرونی مجبوریوں سے اندرونی کمزوریوں میں اضافہ ہوتا ہے

میں نے اوپر کہا ہے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک اور قوم کے حقوق آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ میرے اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے پاس ایسے وسائل آمدنی نہیں ہوتے جس کی موجودہ احتیاجات اور مجبوریوں داخلی اور خارجی سیاسی سلامتی کی ضروریات پوری کر سکیں۔ ان حالات داخلی اور خارجی پالیسی کا یہ چکر چل گیا ہے کہ اندرونی مجبوریاں بڑھتی جاتی ہیں۔

مرکزی تر ان حکومت جو بیرونی قرضہ قبول کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے کہ تر ان کے مفادات بیرونی حکومتوں سے تعلق قائم کرتے وقت مجبوریوں کو نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ جو قرضہ لینے کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اندرونی حالات پہلے سے بدتر ہوتے جاتے ہیں جب اندرونی اقتصادی حالات خراب ہوتے ہیں تو مزید قرضے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس چکر سے وقار میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مطلق حاکمیت کے اختیارات کم کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس پالیسی کی مخالفت نہ کر سکے یہ مخالفت کرنے والوں کا جو ری مٹ جائے۔

باہر گیدڑ گھر میں شیر

موجودہ تر ان حکومت کی پالیسی اور بیرونی تر ان حکومت کے حالات میں بڑا فرق یہ ہے کہ بیرونی تر ان سرکار داخلی [illegible] ذمہ داری دیتی تھی۔ اور بیرونی دنیا

سے معاہدات طے کرتے وقت پیش ہونا اعزاز کا باعث ہوتی تھی۔ برعکس اس کے موجودہ ہندوستانی سرکار کا عمل یہ ہے کہ گھر کے مکروہ باشندوں پر تو شیر ہے اور باہر کے عافیت دار انسانوں کے سامنے گیدڑ کی طرح دم دبائے پھرتی ہے۔ ہر فتی حکومت کی داخلی اور خارجی حکمت عملی بھی ایک دوسرے کا نتیجہ نہیں۔ ایک مولو العزم قومی سرکار کو داخلی حکومت چلانے کے لیے بہت سے دقائق نہ ماننے کی عادت نہیں ہوتی۔ یہی سرکار سے اس کی رعایا کی وفاداری اور عقیدت ہی نہیں حکومت کی طاقت بھی حاصل رکھتی ہے۔ برعکس اس کے جو سرکار بین الاقوامی تعلقات میں مدام ہے اس کے زندہ رہنے کے لیے سوائے اس کے چارہ ہی نہیں کہ اپنی رعایا پر ظلم اور زبردستی سے اپنے قوانین کی خدمت پر مجبور کرے۔

قومی جھنڈے اور فوجری کے نشہ میں فرق

موجودہ سرکار جب "آزادشری" کی تراکیب استعمال کرتی ہے تو سفید جھوٹ بولتی ہے۔ آج اس سرکار کے وقت "آزادشری" کہاں پائے جاتے ہیں؟ آزادشریوں کا وجود تو برٹش ڈرس سرکار کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ موجودہ سرکار کے وقت تو ہر فتی علاقوں کی ایک نوآبادی ہے جس کا کام محض غیروں کی خدمت گزاری ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت کے وقت ہم رعایا کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ہم آزادشری کہلانے کے حقدار تو ہرگز نہیں۔ سرکار کے جھنڈے کو قومی جھنڈا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو نوکروں کی ایک انجمن کا ٹریڈ مارک ہے۔ یہ ٹریڈ مارک ہمارے رواجوں اور آزادیوں کا نشان نہیں۔ اس ٹریڈ مارک کا پہنانی قانون کے روح رواں افسروں کے حکم سے چل رہا ہے۔ اس ہندوستانی سرکار کی علامتیں اور نشانات وہی وقعت رکھتے ہیں جو غلاموں پر ہیروں کی مہریں کی ہوتی ہیں۔ جمہوریت کا یہ نشان کبھی ہمارے قوم کے مزاج کے مطابق نہیں بن سکتا۔ موجودہ ہندوستانی سرکار کو قدیم روایات کے احترام کا کوئی احساس نہیں۔ یہ سرکار ماضی کی عظمت کی قدر دان نہیں۔ اس سرکار نے گزری ہوئی

حکومت کے نشان خاک میں ملا دیے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب اس سرکار کو پتہ چل جائے گا کہ اس کی رعایا خود سرکار کے انتظامات کا احترام کرتی ہے۔ یہ وفاقی سرکار صوبائی اور ضلعی سرکاروں کے ساتھ مل کر ایک پیچیدہ مجلس میں محض طبع کے لیے تھوڑا وقت لے جائے۔ یہ بھی ہے کہ یہ وفاقی سرکار وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کے اختیارات محدود کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے اس طرز عمل کی وجوہات صرف اقتصادی نہیں بلکہ اصولی بھی ہیں۔ یہ سرکار اقتصادی دھوکہ بازی کی مرتکب ہوتی ہیں وہ اپنی رعایا کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ یہ سرکار اپنی رعایا کے حقوق پر دست درازی کر رہی ہے۔ وہ اپنی رعایا کو اس لیے دبا کر رکھنا چاہتی ہے کہ کہیں اس کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔

گھر میں حکومت محبت کے بل پر ہوتی ہے نہ کہ جبر سے

ہمقوم پرست اشتراکی اس سرکار کے اصولوں کے تحت چلیں گے۔ ہمارا اصول یہ ہوگا کہ ایک مضبوط قومی سرکار کا مقصد داخلی اور خارجی پالیسی میں اپنے شہریوں کے حقوق کی حفاظت ہو۔ ہمیشہ اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دے سکتی ہو۔ اس آزادی سے سرکار کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ سچ ہے کہ ایک مضبوط قومی سرکار اپنے شہریوں اور وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں کی انفرادی آزادی اور اجتماعی مفاد کی خاطر بڑی حد تک پابندی کر سکتی ہے۔ اس کی یہ پابندیاں خوشی خوشی قبول کی جاتی ہیں کیونکہ ان کا طرز عمل قومی سلامتی کی نگہداشت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس کے قوانین اور فیصلے اس کے شہریوں کو اس لیے قبول ہوتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا مقصد ساری قوم کی فلاح و بہبود ہے۔

مرکز کو صوبوں پر بالادستی ہونی چاہیے

دنیا کی ہر سرکار کو اپنی داخلی تنظیم میں تضاد کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس معاملے میں ہماری بھی مستثنیٰ نہیں۔ آج کل ہر وہ سلطنت جس میں شامل ہونے والی ریاستوں کی مختلف

انسانیت کا تصور قطعاً نہیں ہے۔ ان میں سے بعض رسومات کا تو پتا نہیں ہے کہ ان کی متعلق انسانیت محض ایک واہمہ ہے۔ تجارت اور علم و تحقیق دونوں کے لحاظ سے رسومات کی اہمیت اب بہت گھٹ چکی ہے۔ اور مزید گھٹ رہی ہے۔ جدید وسائل رسل و رسائل اور تعلیمی ترقی نے فاصلے کم کر دیے ہیں اور دور کے علاقے قریب آ گئے ہیں۔ جو علاقہ کبھی ایک ریاست ہوتا تھا اب ایک صوبہ ہے۔ جو مملکت کبھی ایک علم کہلاتا تھا اب وہ ایک سرکار کے ماتحت ہے۔ اگر محض اصول اور اصطلاح کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ترقی کے لحاظ سے پہلے تہذیبی تقسیم کا مسئلہ کبھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا جو آج سے سو سال پہلے برطانوی راج کے تعلق کے لحاظ کا مسئلہ تھا۔ آج میرٹھ سے لندن جانا اس سے زیادہ آسان ہے جتنا آج سے سو سال پہلے میرٹھ سے لندن پہنچنا مشکل تھا۔ جدید وسائل رسل و رسائل کے تعلیمی مواقع کے تمام رہنے کی وجہ سے اب یہ ممکن ہے جو پولین کے ساتھ جنگ کے زمانے میں فرانسیسی ریاستوں کے رشتے کی وجہ سے تھی۔ اگر کوئی شخص ان حقائق سے نکھیں بند کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک گزرے ہوئے زمانے میں ہی زندگی بسر کر رہا ہے دنیا میں ہمیشہ ایسے لوگ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جن کی زندگیاں زمانہ حال کی نسبت زمانہ ماضی سے زیادہ متعلق ہوتی ہیں۔ ایسے بزرگوار تاریخ کے ارتقاء کی رفتار کو سست تو کر سکتے ہیں لیکن وہ اسے روک نہیں سکتے۔

ریاکاری کا پول ایک دن کھل کر رہے گا

ہمارے جس قوم پرست اصول کے قائل ہیں اس کی بھی یہی حد ہوتا ہے اور حق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان مسائل پر جو قوم پرست کی نئی تعریف سیاسی پارٹیوں کے تعلقی غروں سے گمراہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تعلقی غروں کی اصطلاح اس لیے استعمال کی ہے کہ ان پارٹیوں کو ملک کی بھلائی سے یا واقفیت نہیں ہے کہ ان کی تباہی پر تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ خود ہی تو اس سازش میں شریک ہونے والے مجرم ہیں جنہوں نے موجودہ صورت حال

پیدا کی ہے۔ خاص طور پر ہم یہاں مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو روکنا
کیسے حاصل کرو ہے جس کے پس پشت کوئی سنجیدہ مقصد نہیں۔ اگر ان حلقوں کو کسی
بات پر اعتراض ہو تو کھلی جلسہ پر بلا کر ان کی حمایت حاصل کر لی جائے گی۔ ہوا یہ کہ
حمایت کے اختیارات پر مرکزی حکومت کی جانب سے ذکر کیا جاتا ہے
جاتا ہے لیکن آج تک اس ذکر کو روکنے کے لیے کوئی قدم اختیار نہ کی گئی۔ ہاں ہر موقعہ
پر کچھ غیر موثر قسم کے ضرور بلند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سنجیدگی سے اس بات کی
مخالفت کرتا ہے کہ مرکزی حکومت کے اختیارات کی توسیع کو روکنا ٹھیک نہیں تو
اسے یہ کہہ کر چپ کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تم موجودہ زمانے کی سرکار کی
ضروریات اور ان کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ مرکزی حکومت کے اختیارات میں توسیع
کی مخالفت کو جو شخص اچھا نہ سمجھے اس کی توہین کی جاتی ہے۔ اسے ایک طرح کا مجرم قرار دیا
جاتا ہے۔ اسے لگ کیا جاتا ہے کہ پھر یا تو اسے جیل میں بند کر دیا جاتا ہے یا تاوان کی
صورت وصولی کرتے ہوئے اسے تقریر کرنے سے منع کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات
میں ہماری تحریک کے مقلدین کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وفاق کا نظام کس رہا کاری کا
متحمل ہے۔ یہ رہا کار لوگ وقتی نظریہ کی محبت سے یہ ہی ہا ہا کار مچا دیتے
چاہتے ہیں جیسا کہ سب سے ان کا اصلی مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی کوئی کا
ہو کر کامیابی حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ملکی اتحاد صرف جہاں قوم قائم کر سکتے ہیں

ملک میں ایک خاص حد تک اتحاد پیدا کرنا ضروری ہے۔ بالخصوص رسل و رسائل اور
آمد و رفت کے ذرائع میں ایک متحدہ نظام ہونا ضروری ہے۔ ہم قوم پرست شتر کی اپنا فرض
سمجھتے ہیں کہ موجودہ سرکار کے ماتحت "ملکی تحریکوں" کے جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا دیے جاتے
ہیں ان کی پوری طاقت سے مخالفت کریں۔ ان تحریکوں کا مقصد فقط یہ ہے کہ
موجودہ حکومت کی ہیئت تجارتی یا تعلیمی پر دو ڈال جائے تاکہ ان پر دے کے پیچھے کسی

نہیں چلی تھی۔ موجودہ مرکزی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ریلوے ڈاک خانہ اور مالیات کے محکمے مرکزی تسلط کے ماتحت کر دیے جائیں گے۔ اس تجویز کا مقصد یہ نہیں کہ خوبی ریلوے کے وہ پالیسی اختیار کی جائے۔ بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ اخبار سے جو معاہدے کیے جا چکے ہیں ان کو پورا کرنے میں کوئی کمزوری نہ رہ جائے۔ اس وجہ سے ہمقوم پرست شتر کی ہر وہ ممکن اقدام کریں گے جس سے اس پالیسی میں رکاوٹ ڈالی جا سکے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم بھی کوشش کریں گے کہ اس پالیسی کو ختم کر دیا جائے۔ ہم ہر اس کوشش کا مقابلہ کریں گے جس کا مقصد تمام محکموں کو ایک مرکز کے ماتحت لانا ہو۔ بالخصوص ایسے محکمے جو ہماری قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے بڑے ضروری ہیں۔ ہماری اس مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ حالات موجودہ تمام محکموں کو ایک مرکز کے تحت لانے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کروڑوں روپیہ جو ان جنگ کیا جائے۔ ان محکموں کو بجائے اس کے کہ ان کی ذاتی کی ضمانت کے طور پر غیروں کے حوالے کر دی گئی۔ اس تمام کارروائی کے مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جنگ کے بعد جو معاہدے ہمارے نام نہاد دوستوں نے کیے ہیں ان پر عمل ممکن بنایا جائے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر قوم پرست شتر کی تحریک کو ریلوے، مواصلات کا مذاق کرنا ہی پڑے گا۔

چھوٹی چھوٹی جنگیں بڑے بڑے مقاصد کا نام لے کر جیتی جا سکتی ہیں

ہم اس مرکزی کی پالیسی کے اس پہلو کی بھی مخالف ہیں کہ داخلی طور پر اس کے ماتحت ملک میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جس کی ہر حرکت ہمارے قوم کے مفاد کے لیے مضر ہو۔ موجودہ صوبائی سرکار دراصل ایک بیرونی سرکار ہے۔ یہ سرکار ہماری ملت کے لیے ایک لعنت ہے ہمارے حقوق میں حائل ہونے والی علت ہے۔ ہماری آج اس سرکار پر کڑی چوٹیں کر رہی ہیں۔ یہ وہ [illegible] ہے۔ موجودہ

سرکار چاہتی ہے کہ اس کالا دھن کی معیشت کو ختم کر دیا جائے۔ موجودہ سرکار کی بھی یہ کوشش ہے کہ اس ریاستوں کو جو دی ختم کر دیا جائے۔ اندرین حالات ہمارا فرض ہے کہ ان ریاستوں کی اقتصادی کالا دھن معیشت کو یہ سمجھ دیں کہ اس سے اس کالا دھن معیشت کے زیادہ موثر ہونے کا امکان پیدا ہو جائے۔ اپنا یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ حکومت کی مرکزیت کی پالیسی کے خلاف جدوجہد کو ہی ایسی جدوجہد کی صورت دی جائے جو تمام مزدور قوم کے اہل مقاصد کے حصول کی جدوجہد کہہ سکے۔ ہماری پارٹی ہے کہ جدوجہد کا رنگ اور پس منظر ریاست کی خصوصی حقوق کی جنگ لڑنی ہے۔ ہم بھی ہماری کے ان خصوصی حقوق کی خاطر جدوجہد کرنا چاہتے ہیں لیکن اس جدوجہد کا رنگ اور پس منظر ایسا نہیں۔ ہمارا پس منظر بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ جدوجہد بھی قومی مفاد کی خاطر ہے۔ ہم اس جدوجہد میں اس لیے شریک ہیں کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں برسر اقتدار آنے والی جمہوری سرکار کا قلع قمع کر سکیں۔

مرکزیت اس حکومت کو زیب نہیں جو غیروں کی آلہ کار ہو

ہم مرکزیت کی اس پالیسی کے اس لیے بھی خلاف ہیں کہ قومی ملکیت کی جو صورت فی الحال اختیار کی جا رہی ہے اس سے نہ اتحاد پیدا ہوتا ہے نہ نظم و نسق میں کوئی سہولت کی راہ نکلتی ہے۔ اس نام نہاد قومی ملکیت کے منصوبے کا بادی النظر میں موجودہ مطلب صرف یہ ہے کہ اصل اداروں کو وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کے خود مختارانہ قابو سے نکال کر انتظامی پارٹیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ تاریخ کی تاریخ میں دوست نوازی کی اس سے بڑھ کر کوئی مکروہ مثال نہیں ملتی جو جمہوری سرکار نے پیش کی ہے۔ آج جو مرکزیت اختیار کی جا رہی ہے یہ ان سیاسی پارٹیوں کا کارنامہ ہے جنہوں نے وعدے کیے تھے کہ صاحب اقتدار ہونے کی صورت میں انفرادی اور قدر دانی کی جائے گی۔ کی اصل مقصد انفرادی اور قدر دانی کا یہی مقصد ہے کہ عہدوں اور ملازمتوں پر صرف ان پارٹیوں کے جنبہ دار افراد کو مسلط کر دیا جائے؟ جب سے یہ انتخابی سرکار بنی ہے

بیرونیوں کو ہر اس اقتصادی ادارے میں بڑے بڑے عہدے ملتے رہے ہیں جس پر مرکزی حکومت نے قبضہ کیا ہے۔ بیرونیوں کو قومی نظم و نسق میں بھی عہدے ملتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اقتصادی ادارے اور نظم و نسق دونوں بیرونیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے دشمن کو ہمارے خلاف جنگ میں قدم اٹھانے کی سہولتیں حاصل ہوں۔ تو ہم چاہتے ہیں کہ ہر کریمیت کی باہمی کے حق میں ہر نئے قدم پر نگاہ رکھیں۔ ہر ہر مرحلے پر اس کی مخالفت کریں۔ ہماری ہی تو مسلسل کوشش رہے گی اور رہنی چاہیئے کہ بالفعل قومی مقاصد ہمارے پیش نظر رہیں گے۔ ہم ملک نظری اور تعصب سے ہمیشہ بچیں گے۔

قوم کے ماتحت اجزا کی خودمختاری تسلیم نہیں کی جا سکتی

تعصب اور ملک نظری سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ہماری تحریک کے مخلصین میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ ہم قومی سلطنت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے ماتحت تمام باشندوں کی مطلق العنانیت کے اختیارات پر بالادستی کے حقوق رکھتی ہیں۔ جہاں تک قومی سلطنت کا اس حق کا تعلق ہے۔ ہمارے میں ذرہ بھی شک نہیں کرتے۔ اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک سرکار محض ایک پیکر کا نام ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس پیکر کی روح کیا ہے۔ سرکار کے پیکر میں حقیقی روح اور اصل مطلب قوم ہوتی ہے۔ یہ واضح ہے کہ قوم کے بالاتر مفاد کے سامنے ہر مفاد قربان کیا جا سکتا ہے۔ ہر مفاد قومی مفاد کے ماتحت ہے۔ قومی سلطنت اور قوم کے اندر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ مطلق العنانیت کی طاقت یا اختیار کسی ہر وعدے کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ قومی حقوق میں شامل ہونے والی بعض ریاستیں اپنے لوگوں سے غیر ملکوں میں بھیجتی رہتی ہیں۔ جن بین الاقوامی عہدنامے کے ذریعہ سے ان ریاستوں کے ہاں مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیئے۔ یہ ختم ہو کر رہے گی۔ جب تک ایسا نہیں ہو جاتا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ بعض غیر ممالک قومی

سلطنت کو مرکز سے ایک سلطنت ہی نہیں سمجھتے۔ ان کی سیاسی روش بھی ان کے اسی شک کی ترجمان ہے۔ ان علاقائی نمائندگان کا انتظار اس لیے بھی ناقابل برداشت ہے کہ اس سے ذرا بھر بھی تاخیر ہونے پر بہت نقصان ہوتا ہے۔ اگر کسی غیر ملک میں کسی جرمن شہری کے مفاد میں جرمن سلطنت کے بحری کوششوں سے حفاظت نہیں ہو سکتی تو ہی یہاں ممکن ہے کہ جرمن وفاق کی کسی بھی ریاست کا نمائندہ اس کام میں کامیابی حاصل کرے گا۔ دنیا میں موجود بین الاقوامی نظام میں جرمن وفاق کی ان بھی ریاستوں کو موجودہ حیثیت نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی وفاقی ریاستیں غیر ملکی سرکاروں کی نگاہ میں محض جرمن پر حملہ کرنے کے لیے دروازے اور سوراخ کا کام دیتی ہیں یا پھر وہ ایسا علاقہ سمجھی جاتی ہیں جسے جرمن سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ہم جرمن قوت پرست یا جارحیت نہیں دے سکتے کہ غیروں کے کسی کرنے دھرنے کا کوئی خریدار ہی توقع سے بیرونی سفارتیں قبول کرے جو دولت اب مرجھا چکا ہے۔ اس کی جڑوں کو سر سبز زمین میں گاڑ دی جائیں۔ تو شاید پھر یہ پودا ہرا بھرا ہو جائے۔ ہر ملی جرمن سرکار کے غیر ممالک میں سفارتی نمائندے ایسے ناکام ثابت ہوئے کہ اب آزمائے ہوئے تجربہ کو دوبارہ آزمانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صوبوں کی اہمیت ثقافتی ہونی چاہیے اور مرکز کی اہمیت سیاسی ہونی چاہیے

مستقبل میں ہماری پالیسی یقیناً یہی ہوگی کہ جرمن وفاق میں شامل ہونے والی مختلف ریاستوں کی انفرادی اہمیت ثقافتی دائرے تک محدود کر دی جائے جس کا تعلق بیرونی دنیا کو ایک مرکز بنانا وہ کوئی خصوصی اور مخصوص پسند یا جرمن کا دشمن نہ تھا۔ بلکہ وہ تو جرمن کی سلطنت کا بھی وہی خواہاں تھا کہ جس کے نیچے طبقہ کا قدر دان تھا۔ اس کا ہر لفظ اول تھا۔ اس کا سب سے بڑا شوق یہی تھا کہ سرکاری تعلیمات کے استعمال سے بیرون کی ثقافتی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ وہ بیرون کی سیاسی قوت

فوج کو صوبائی امتیازات سے بالاتر رکھنا چاہیے

فوج کو مختلف ریاستوں کے طرز سے پاک رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ماضی میں یہ غلطی کی جاتی تھی کہ مختلف ریاستوں کی تمیز فوج کے اندر بھی قائم رکھی گئی۔ یہ کام فوج کا نہ تھا۔ یہ فوج کے دائرے سے متعلق ہوتا چاہیے تھے۔ آنے والے دور میں جب قوم پرست انتظامی سرکار قائم ہوگی تو ماضی کی اس غلطی کو دہرایا نہ جائے گا۔ جن فوج میں یہ کمیں پائی گئی کہ قبائلی امتیازات کو قائم رکھنے کے لیے ایک مذہب کا کام دے یوں امتیازات کو ترقی دے۔ جن فوج تو اس پر قائم کی گئی ہے کہ تمام قوموں کو ایک دوسرے کی شراکت سکھائے اور ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے کی درس گاہ کا کام دے۔ قوم کی زندگی میں ہر وہ شخص جو تعصب اور تفرقہ پھیلاتا ہے جس سے بدامنی کا احساس پیدا ہوتا ہے اسے فوج کے اندر تعلیم کی غرض سے مسترد کرنا چاہیے۔ فوج کا یہ فرض ہے کہ جن بچے کو اس کے پیدائشی صوبے اور طبقے کو جن کی متعلقہ خصوصیات سے سکھانے کی حاجت نہیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ بچوں کو مادر وطن کی خصوصیات سے آگاہ کیا جائے۔ جب سپاہی کو ایک دن جہاں انتظامی پر کر قوم کا دفاع کرنا ہوگا تو اس کے دائرے سارے ملک کی حفاظت ہوگی نہ کہ کسی خاص علاقے کا بچاؤ۔

عسکری رنگروٹوں کو مادر وطن کی سیر کرانی چاہیے

یہ ایک تربیت یافتہ دستور ہے کہ جن نوجوانوں کو عسکری تربیت اس علاقے میں دی جاتی ہے جہاں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ عسکری تربیت کا زمانہ وہ دور ہے جب کہ ہر رنگروٹ کو تمام جرمنی سے آشنا کرنا چاہیے۔ آج سپاہیوں کو تمام جرمنی سے روشناس کرانے کی عادت ہو بھی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان جن طرح پہلے کبھی سارے ملک میں سفر کر کے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کیا کرتے تھے اب وہ فوج کے شوق سے اس طرح اپنے سارے ملک کا سفر کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ کبھی عجب دانش مندانہ حرکت ہے کہ ہر ریاست کے نوجوان رنگروٹ منٹ کاٹنے میں رکھے جاتے

ہیں۔ یہاں کے رنگروٹ یہاں نہیں رکھے جاتے ہیں۔ دوسرے رنگروٹ سات کوارٹ میں رکھے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہر ہر کے رنگروٹوں کو وہیں رہنے سہنے اور کرشمالی کی سیر کرائی جاتی۔ ہمبرگ کے باشندوں کو کوہ ہیلس کے نظارے دکھائے جاتے۔ مشرقی پرشیا کے جوانوں کو بالٹی بحر کے ساحل دیکھنے کا موقع ملتا؟ یہ درست ہے کہ ہر علاقے کی خصوصیات کے مطابق اس علاقے کے نوجوانوں کی تنظیم ہونی چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تربیت کے وقت بھی ان امتیازات کو روا رکھا جائے۔ یہ تو ممکن ہے کہ فوج کو بحال کرنے پر کسی کو اعتراض نہ ہو لیکن فوج کے متحد کرنے پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص ہر کارے کے دیگر نکتوں کو بحال کرنا پسند کرتا ہو لیکن فوج کو بحال کرنے پر ہر شخص مسرت کا اظہار کرے گا۔ آج کل جرمنوں ہر کاری فوج کی تعداد اتنی کم ہو چکی ہے کہ اب اس فوج کی ریاست و تنظیم ہر ہر ہونی ہوگی۔ آج جرمن فوج کو بحال و متحد کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا قدم ہے جس کے ہم مخالف نہیں بلکہ ہر مستقل کی قومی فوج بھی اس نمونہ پر بنائی جائے گی۔

اتحاد و ایمان سے سب زنجیریں کٹ جاتی ہیں

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ قوم کے اندر ایک نئے اتحاد اور ایمان کا جوش و خروش پیدا کر جائے۔ یہ اتحاد اور یہ ایمان جس کی آخری کامیابی پر کسی کو شک نہ ہو۔ جب ایسا اتحاد اور ایسا ایمان پیدا ہو گیا تو سب زنجیریں کٹ جائیں گی۔ ہماری ترقی کے راستے سے ہر دشواری اور ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ قوم پرست اشتراکیت اس حق کی دعوے دار ہے کہ ہمارے اصول پوری جرمن قوم پر مسلط ہونے چاہئیں۔ ہم اس معاملہ میں رواداری سے کام لیں گے اور کوئی رکاوٹ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہم پوری جرمن قوم کو اپنے اعتقادات اور اپنے اصولوں کی تعلیم دے کر رہیں گے۔ جس طرح دیگر کے لوگوں نے مذاہب ہی صدیوں کو اپنی تبلیغ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں سمجھتے اسی طرح قوم پرست اشتراکی اتحاد بھی جرمنی کی مختلف ریاستوں یا صوبوں کو کوئی دیوار نہیں سمجھتا

جو ضرور کی جا سکتی ہوں۔ ہر ریاست مادر وطن کا ٹکڑا ہے اور اسے خطاب کرنا اور قائل کرنا ہمارا حق اور فرض ہے۔

آخر ہمیں آزادی قومی استقلال کی جدوجہد کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے

قوم پرست اشتراکیت کے اصول کسی ایک ریاست کے سیاسی مسلک کے آلہ کار نہیں ہوں گے۔ وہ دن آنے والا ہے جب یہ اصول ساری جرمن قوم کے مرشد اور راہنما ہونے کی خدمت انجام دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان ملکی حدود کو تسلیم کرنے سے انکار کریں جو محض ذہنی سیاسی تبدیلیوں کے وقت قائم کر دی گئی ہیں جس کے ہم اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتے۔

جب ہمارے مقتدرات کا ملک میں پورا تسلط ہو جائے گا تب ہم تبلیغی وسائل میں اپنے شہریوں کو بیرونی ریاست کی شہریت اور آزادی کے حقوق دے سکیں گے۔

☆☆☆

باب یازدہم :: تحریک کی تبلیغ اور تنظیم کا باہمی رشتہ

۱۹۲۱ء کا سال ہمارے ملک کی پبلک زندگی کے خاص طور پر اہم ثابت ہوا۔

پہلے ایمان درست کرو پھر جماعت خود بخود بن جائے گی

جب میں تحریک مزدور پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے فوراً تبلیغ اور پروپیگنڈا کا شعبہ سنبھال لیا۔ میرا خیال تھا کہ وقتی طور پر یہ شعبہ سب سے اہم ہے۔ ابھی وہ وقت نہ آیا تھا کہ تنظیم کے مسائل پر اپنا دماغ پریشان کیا جائے۔ ابھی ضرورت تو یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اپنے اعتقادات اور خیالات پھیلائے جائیں۔ تبلیغ ہمیشہ تنظیم سے پہلے کی جاتی ہے۔ تبلیغ سے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ پھر تنظیم انہیں اکٹھا کر کے ان سے کام لیتی ہے۔ میں کبھی اس بات کا قائل نہیں ہوا کہ جلد بازی سے کسی مردہ جماعت کو تنظیم کا نام دے دیا جائے۔ ایسی تنظیم محض ایک بے جان خیال ہوتا ہے۔ ایسی تنظیم شاذ و نادر ہی ایک جاندار اور ترقی پذیر تنظیم کا کام دے سکتی ہے۔ تنظیم کی بنیاد ہمیشہ زندگی کے کسی نقطے پر رکھی جاتی ہے۔ ایسا زندہ نقطہ جس میں آگے بڑھنے اور ترقی دینے کے امکانات ہوں۔ جب بہت سے لوگوں میں خود بخود ایک ترتیب پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس فطری ترتیب اور طبعی تنظیم سے ان لوگوں میں خود بخود ایک ترتیب پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس فطری ترتیب اور طبعی تنظیم سے خود بخود تنظیم کا پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح یہاں بھی انسانی کمزوریوں کا سوال رکاوٹ بنتا ہے۔ ایک انسانی کمزوری یہ ہے کہ انسان اپنے سے کسی برتر انسان کی اطاعت قبول کرنے سے بھی شروع میں کچھ جھجکتا ہے اگر دماغی حلقوں سے ذہنی حلقوں کی تنظیم ایک بے کی دوسرے جان کار میں شروع کی جائے تو یہ امر واقع رہتا ہے کہ ایسی تنظیم کے اندر کوئی شخص جس کی بابت ابھی یہ ٹھیک پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے محض جذبات اور رکابت کے زیر اثر اپنے سے بہتر اور قابل تر افسر کو پیچھے

دلچسپی کر لوگ تحریک میں آگے آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تعلیم کے ذریعہ ایک نئی تحریک کے لیے خاص طور پر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

تنظیم کے لیے ذہانت سے زیادہ مردم شناسی درکار ہوتی ہے

یہی وجہ ہے کہ پہلے تحریک کے معتقدات کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ ان اصولوں پر تحریک کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ان کی عوام کے سامنے وضاحت کرنی چاہیے۔ تبلیغ اور پروپیگنڈہ کا یہ کام بہت عرصہ تک جاری رہنا چاہیے۔ اس تبلیغ اور پروپیگنڈہ کی مکمل ایک مرکز سے ہونی چاہیے۔ جب مختلف ان نظریات کے حامی ان جماعتوں تو پھر بڑی احتیاط سے ان کی چھان بین کر کے ایسے افراد تلاش کرنے چاہئیں جن میں قیادت کی صلاحیت ہو۔ ان قیادت کی صلاحیت رکھنے والے اشخاص کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ معاملہ دیکھنے میں آسان کام ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بعض اوقات ایسے افراد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ جو لوگ تحریک کے اصولوں کو سمجھنے میں ماہر ثابت ہوں۔ وہی تحریک چلانے کے لیے ذمہ دار منصب سنبھالنے کے بھی اہل ہیں۔ اکثر حقیقت میں اس کے الٹ ثابت ہوتی ہے۔ کئی ماہر لوگ تحریک چلانے کے لیے نااہل ثابت ہوتے ہیں۔ اور کئی کند ذہن افراد اس تحریک چلانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

غیر معمولی ذہانت کے مالک شاذ و نادر ہی تنظیم کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصول بنانے اور نظریات قائم کرنے کے لیے انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ تصورات کو نظر انداز کرتے ہوئے کلی قاعدے القا اور وضع کر سکے۔ برعکس اس کے تنظیم کا اہل وہ شخص ہوتا ہے جس میں عام انسانوں کی نفسیاتی کمزوریوں کا صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہ کام تصورات پر نظر رکھنے سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس شخص کے بس کا تنظیم کا کام ہو جو ہے کہ جیسے انسانوں سے واسطہ پڑے انہیں سے کام چلانے۔ اس کوشش میں ناکامی بھی ممکن ہے جب وہ پہلے صحیح طور پر ایسے انسانوں کو سمجھ سکے۔ مردم شناسی تنظیم کے لیے بھی شرط ہے۔ ایک ماہر تنظیم انسانوں کی حقیقت سے بے

بلند رکھتا ہے۔ وہ نہ پست۔ وہ انہیں ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسے وہ ہوتے ہیں۔ وہ ان کی کمزوریوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ وہ ان کے گھریلو اور بستی کے بھی خبر اور رکھتا ہے۔ ان کی دیگر خصوصیات پر بھی اس کی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک زبردست تنظیم کھڑی کر دیتا ہے کہ اگر اسے منتشر کرنے کی کوشش کی جائے تو بھی وہ سخت مقابلہ کرتی ہے۔ وہ اس جماعت کو ایک عقیدے کی زبان اور منطق سکھاتا ہے۔ وہ اس جماعت میں یہ عقیدہ پیدا کرتا ہے کہ اپنے عقیدے کو کامیاب بنانے کے لیے ہم نہ لے۔

"ہادی" اور "امام" کے منصب جدا ہیں

ممکن ہے ایسا کوئی شخص بھی مل جائے جو مل نظر ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر تنظیم بھی ہو۔ لیکن کسی مل نظر کے ساتھ ایک امام اور قائد کی خوبیوں سے متصف ہونا بہت ہی نادر ہے۔ ایک امام اور قائد کے لیے یہ لازم ہے کہ لوگوں میں زبردست پیروی پیدا کر سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے وہ لوگ کبھی تسلیم نہیں کرتے جو ہمیشہ سے مسائل کو علمی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ کہیں مانتے تو وہ کہیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ایک بھی حقیقت ہے۔ کثیر التعداد عوام میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی اہلیت اسی شخص میں ہوتی ہے جو عمل کی صلاحیت کا حامل ہو۔ ایک عوامی مقرر ہونے کے لیے بھی ماہر نفسیات ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مقررین اپنی تقریروں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اور بہتر لیڈر ثابت ہوتے ہیں۔ میں تخلیقی تو تخلیق سے اور لیڈر عوام سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے خیالات میں منہمک رہتے ہیں لیڈر عوام یا قوم کی یہی صفت ہے کہ وہ عوام سے جو چاہے کرا سکے۔ قیادت کی اہلیت ہر گز صلاحیت کی تراش خراش پر منحصر نہیں۔ یہ ایک بے کار بحث ہے کہ ان دونوں قابلیتوں میں سے کون سی قابلیت زیادہ ضروری ہے یا زیادہ اہم ہے۔ کیا بنی نوع انسان کے لیے اصول نظریات اور افکار دریافت کرنے میں زیادہ اہم ہیں یا ان نظریات کو عملی جامہ پہنانا زیادہ اہم ہے۔ جیسا کہ زندگی کے ہر کی شعبوں میں پایا جاتا ہے یہاں بھی اس قسم کی ایک یا بہترین اصول بیکار ہیں

گے۔ اگر کوئی تحریک یا نظام عوام کو ان اصولوں پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔
دوسری جانب کسی تحریک کی بقا کے لیے ان اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی
عمل نظر انسانی جدوجہد کے لیے اصول و ضوابط متعین نہ کرے یا ان پر عمل نظر
انداز کر دے تو نظم و ضبط کی کوئی ایک شکل ہو یا کئی، تو بکھر جاتی ہے۔ اس کی دوسری خاصیت ہے جس
سے عمل جلیل و نظام عظیم وجود میں آتے ہیں۔

"ارکین" اور "معاونین" کا فرق

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب میں پہلے پہل پارٹی میں شامل ہوا تو میں نے
ساری توجہ تبلیغ کے لیے وقف کر دی میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ایک
ایسا دائرہ وضع کیا جائے جو نئے نظریات کو قبول کریں۔ اور جوش و ولولہ سے انہیں
کامیاب بنانے کے درپے ہو جائیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے ہم لوگوں کو اپنی
طرف بلا سکتے ہیں جب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو لیتے تو تبھی تنظیم کی عمارت اٹھانے
کی باری آتی تھی۔ غرض مبلغ کی بجائے تنظیم کرنے والے کی منزل سے آگے آتی ہے۔

اگر کوئی تحریک کسی نظام کو بدلنا چاہتی ہے اور اس کی جگہ کوئی اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے تو
پھر اس تحریک کے قائدین کو حسب ذیل اصول خوب سمجھ کر مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ اصول
یہ ہے کہ ہر تحریک کو جب وہ کچھ وسیع ہو جائے تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔
اول ارکین دوم معاونین۔

مبلغ کا فرض یہ ہے کہ معاونین فراہم کرے۔ تنظیم کرنے والوں کا فرض یہ ہے کہ
ان معاونین میں سے ارکین منتخب کریں۔

کسی تحریک کا معاون وہ شخص ہوتا ہے جو اس کے مقاصد کو سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور
وہ ہوتا ہے جو مقاصد کی خاطر جدوجہد کرتا ہے۔

معاون کو تبلیغ کے ذریعے تحریک کے عقائد کا معتقد بنایا جاتا ہے۔ تنظیم کی جانب سے

راہنما کے ذمہ یہ کام ہوتا ہے کہ نئے معاونین کو قائل کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں تاکہ کارکن معاونین میں سے تازہ دم کارکن چنے جا سکیں۔

"مرید" باآسانی مل جاتے ہیں "رفیق" مشکل سے ملتا ہے

معاون بننے کے لیے کسی مقصد سے کوئی بھی قبول کرلینا بھی کافی ہے۔ رکن بننے کی شرط یہ ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے قربانی کی ہو۔ اس کے لیے جدوجہد کا دعویٰ کیا جائے۔ ان معاونین میں سے بہترین کارکن حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ معاون بننے کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے تحریک کی تعلیمات اور مقاصد قبول کر لیے ہیں۔ رکن بننے کا مطلب یہ ہے کہ اب اس شخص میں یہ حوصلہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اس مقصد کے لیے کوئی بھاری قربانی دینے کی جدوجہد میں عملی حصہ لے گا۔

چونکہ محض کوئی مقصد قبول کرنے میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلانے پڑتے اس لیے اکثر لوگ کسی نہ کسی صورت کا معاون بن جانا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کثرت سے دیکھا ہے۔ رکن بننے کے لیے عملی طور پر بہادر اور متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ وصف اقلیت میں ہی پایا جاتا ہے۔

جب معاون زیادہ ہوتے ہیں اور کارکن تھوڑے تو منتظم کا فرض ہے کہ ان تھک کام سے تحریک کے پیچھے زیادہ سے زیادہ معاون حاصل کرے جس کے بعد وہ تنظیم ہے سے ان معاونین میں سے پوری کاوش اور محنت کے ساتھ بہترین عناصر منتخب کرنے چاہئیں تاکہ انہیں رکن بنایا جا سکے۔ منتظم کو پروپیگنڈہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ جس شخص کو اس نے تحریک کا قائل کیا ہے اس کی انفرادی حیثیت کیا ہے۔ منتظم کا یہ کام نہیں کہ لوگوں کو قائل کرتے وقت ان کی قابلیت، ذہانت یا کردار کو مدنظر رکھے۔ ہاں جو لوگ ہیں قائل ہو جائیں ان میں سے تنظیم کرنے والوں کو بہترین عناصر منتخب کرنے ہوں گے جس میں تحریک کو بالآخر تکمیل اور کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے عملی جدوجہد کرنے کی بہترین استعداد ہو۔

تبلیغ اور تنظیم کے فرائض میں تمیز

تبلیغ کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ساری قوم کو اپنے عقیدہ کا معتقد بنا دے۔ تنظیم کا فرض یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں صرف ان لوگوں کو داخل کرے جو اپنی نفسیاتی حالت سے تحریک کے اعتقادات کو عزیز بنا لینے میں رکاوٹ کا باعث نہ ہوں۔

تبلیغ اپنے اعتقادات عوام میں پھیلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ عوام کو اس وقت کے لیے بھی تیار کرتا ہے جبکہ اس کے اعتقادات غالب آ چکے ہوں گے اعتقادات کو پھیلانے میں جدوجہد کرنے والے رکھین کے قبیل حاصل ہوگا۔ تحریک کے معاونین میں سے چنے جائیں گے۔ یہ انتخاب اس بنا پر ہوتا ہے کہ کن معاونین کو تحریک کو پوری تکمیل تک پہنچانے کی قابلیت اور عزم مستحکم ہوتا ہے۔ اگر تبلیغ نے وسیع پیمانہ پر عوام کو تحریک کے اعتقادات کا قائل کر دیا ہے تو اس اعتقاد کا بار بہت زیادہ آسان ہو جائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ تحریک کی تنظیم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو ٹھوس طور پر سرگرم ہیں اور خود سر ہو کر دوسروں کو اپنے راز میں شریک کرنے کے لیے کام کر سکتے ہیں۔

خواص کا دائرہ محدود رکھنا چاہیے

جب تبلیغ اس حد تک کامیاب ہو کہ ساری قوم کسی عقیدے کی پیرو بن جائے تو پھر تنظیم کے لیے اس تبلیغ کا فائدہ اٹھانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کام مخلص لوگوں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ غرض تبلیغ اور تنظیم کا رشتہ یا معاونین اور رکن کا باہمی رشتہ ایک دوسرے سے ازحد ملزوم ہے۔ جتنا تبلیغ کا کام اچھا ہوگا اتنا ہی تنظیم کا کام آسان ہوگا۔ جتنی معاونین کی کثرت ہوگی اتنی ہی رکین کی تعداد زیادہ ہوگی۔ برعکس اس کے جس قدر تنظیم وسیع ہوگی اتنا ہی تبلیغ کا کام ہوگی۔ جس قدر رکین زیادہ ہوں گے اتنے ہی معاونین کم ہوں گے۔ اگر تبلیغ محدود ہے تو تنظیم کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اگر معاونین مخلص ہیں تو رکنیت کا دائرہ وسیع ہوگا۔ یہی اس کے تحریک کی کامیابی مشکل ہوگی۔

"تبلیغ" کا مفہوم

مبلغ کا یہ پہلا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے جو جماعت کی تنظیم میں داخل ہو کر اس کی تقویت کا سبب بن سکیں۔ تنظیم کا دوسرا فرض یہ ہے کہ ایسے راہنما منتخب کرے جن مناسب تربیت دی جائے جو تبلیغ کے دائرہ کو وسیع دے سکیں۔ تبلیغ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ رائج الوقت نظام کو اندر سے کھوکھلا کر کے اسے ہیچ کر دے۔ جب تنظیم رائج الوقت نظام کو بیرونی راستے سے ہٹا دے گی تو اس کی تعلیمات کی ترقی کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔ اس کی یہ تنظیم عمل پر مبنی ہے۔ تنظیم کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ تاکہ پھر اس اقتدار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے اعتقادات کو بالآخر مسلط کر دیا جائے۔

کیا انقلابی تصور کا کامیاب ہونا انقلابی تصورات صرف تبھی قبضہ کی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ جدید ضابطہ حیات کیا پوری قوم کو سکھا دیا جائے۔ یا اگر پوری قوم کو یہ ضابطہ حیات نہ سکھایا جائے اور قبضہ سے پہلے اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر ضرورت پڑنے پر ساری قوم کو جبراً اس ضابطہ حیات کا پابند بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کی بنیادی تنظیم ہمیشہ ان افراد کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ جو آگے بڑھنے والی سرکار کے کلیدی مناصب اور عہدے سنبھالیں گے۔ بصورت دیگر ان لوگوں کے اس نئی سرکار کا ساتھ کون کرے گا؟

بالفاظ دیگر ہر تنظیم عالم گیر انقلابی تحریک کے تصورات اور اعتقادات اس کے اپنے حلقے سے باہر پھیلانے کا کام اس کے مبلغین کے سپرد ہوتا ہے۔ مبلغین کو بھی اس کام سے نہ تھکنا چاہیے کہ نئے تصورات اور اعتقادات لوگوں کو سکھا دیے جائیں نہ صرف یہ تصورات اور اعتقادات لوگوں کو سکھا دیے جائیں بلکہ عوام میں اچھی طرح پھیل جائیں۔ کم از کم مبلغ کا یہ فرض ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کی حیثیت میں تصور کر کے یہ کوشش کرے کہ عوام میں جو اعتقادات آج کل رائج ہیں انہیں متزلزل کر دیا جائے۔

تنظیم کے معنی

اس فکر کی تبلیغ میں جان پیدا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے پس پشت ایک منظم کام کر رہی ہو۔ تنظیم ہے ہر رکن ان مقاصد میں سے منتخب کرتی ہے۔ جو تبلیغ سے متاثر ہو کر تحریک میں شامل ہو چکے ہوں۔ اگر تبلیغ کی مہم شدت سے جاری رکھی جائے تو تنظیم زیادہ سے زیادہ طاقت ور ہوتی جائے گی۔ اگر تبلیغ کے پس پشت تنظیم طاقت ور ہو اور جماعت اور بھی تبلیغ زور شور سے کرتی جائے گی۔

غرض تنظیم کام کرنے والوں کا کام یہ ہے کہ تحریک کے ارکین میں اگر کوئی اختلاف یا افتراق رونما ہو جائے تو اسے اس حد تک نہ بڑھنے دیا جائے کہ اس سے تحریک میں پھوٹ پڑ جائے اور تحریک کا کام رک جائے۔ تنظیم کا یہ بھی فرض ہے کہ تحریک کی تائید مقاومت میں ضعف یا کمزوری پیدا ہونے دے۔ وہی تحریک کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ تحریک میں ہمیشہ نئے عزم اور نئی ہمت کو زندہ رکھا جائے۔ ہر قدم پر تحریک قوی سے قوی تر ہو جائے۔ تحریک کے ارکین کی تعداد کو بے اندازہ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تحریک کے ارکین تھوڑے ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔ بہت کم انسان صاحب ہمت اور صاحب جرات ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو تحریک اپنی تنظیم کا زور بے اندازہ بڑھا لیتی ہے۔ آخر وہ ایک روز بھی ست اور بھدی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تنظیم کسی تحریک کے ارکین بڑھانے والے گروہ کا دوسرا نام ہے جو تنظیم ایک دائرہ ایک خاص حد سے آگے بڑھاتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ تاب مقاومت سے عاری ہو جاتی ہے۔ ایسی تحریک میں وہ قوت نہیں باقی رہتی کہ وہ اپنے معتقدات کی تبلیغ اس شد و مد، عزم اور جوش کے ساتھ جاری رکھے جو کسی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے لازمی ہے۔

تبلیغ میں شدت سے کام لینا چاہیے

جس قدر کوئی عقیدہ عظیم اور زیادہ انقلابی ہوتا ہے اتنا ہی اس عقیدہ کے پیروؤں میں عزم، جوش اور جذبہ تبلیغ زیادہ ہونا چاہیے۔ ایسے عقیدہ سے کی تبلیغ قوت ان لوگوں کو

ہوتا ہے۔ تنگ دل ہوتے ہیں۔ کم ہمت اور کم ظرف کہلاتے ہیں۔ لوگ ایسے بلند عقائد کے حامل نہیں ہوتے۔ اگر ان کے دل ایسے عقیدے کے قائل بھی ہو جائیں تو وہ اپنے اعتقاد کا کھلے بندوں اقرار کرنے سے ڈرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تنظیم کے پس پشت کوئی واضح اور ٹھوس عقیدہ نہ ہو۔ اس کی رکنیت میں صرف ایسے صاحب ثروت اور صاحب عمل لوگ شامل ہوتے ہیں جو اپنے معاصرین میں ذرات عمل سے ممتاز ہوں۔ ایسے لوگ اس تحریک کی شدید تبلیغ سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک کسی تحریک کے ارکین اس قسم کی تبلیغ کا اہتمام نہ کریں جب تک اس تبلیغ کے پس پشت یہ جذبہ کام نہ کر رہا ہو کہ ہم کو اس پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے مقاصد کی موثر تبلیغ کرنے کا ہی کوشش کرنا چاہیے گا۔ جب تک تحریک موثر اور شدید تبلیغ کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک ایسی تبلیغ کا اہتمام نہ ہو جب تک تحریک کے معتقدات کو فتح یاب اور کامیاب بنانے کی جدوجہد کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ تبلیغ ان معتقدات کی ہونی چاہیے جن پر تحریک قائم کی گئی ہے۔

تنظیم میں احتیاط سے کام لینا چاہیے

کسی تحریک کو سب سے زیادہ جو چیز نقصان پہنچا سکتی ہے کہ غیر معمولی اور غیر رفتار کامیابی سے متاثر ہو کر ارکین کی بہت بھاری تعداد یک لخت اس میں شامل ہو جائے۔ جب تک کوئی تحریک اپنے مقاصد کے لیے مجاہدانہ جدوجہد میں مصروف رہتی ہے جب تک کمزور دل اور خود غرض انسان ایسی تحریک کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ لیکن جونہی اسی جماعت کو کوئی واضح کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ تو بکثرت اس قسم کے لوگ فوراً اس میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں تحریکوں کے ارتقاء کے دوران ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کئی تحریکیں جو شروع میں بڑی کامیابی سے نظر آتی ہیں ناگہاں وہ اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ناکام ہو گئیں۔ ان تحریکوں کی سست روی کی وجہ داخلی کمزوری

تھی۔ اس داخلی کمزوری کے باعث اس تحریک نے جدوجہد کا راستہ چھوڑ دیا اور یوں رفتہ رفتہ اس کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ شروع شروع میں کامیابی حاصل ہو جانے تو باہمند یہ داخل ہو جاتی ہے اور بڑی بڑی تعداد میں تحریک کے رکن بن جاتے ہیں کہ وہ اس اکثریت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے مقصد سے رابطہ کا جذبہ کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ بہت سے مفاد پرست عناصر تحریک کا رخ اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کے لیے کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔ ان تحریکوں کی اپنی کم ہمتی کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس طرح تحریک بچی رہتی ہے۔ اس کے بعد اس عقیدہ کی خاطر کوئی جدوجہد نہیں کرتا اس طرح تحریک کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ دوسرے کے جوش و خروش کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ تحریک کا جذبہ بجھ جاتا ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ایسے موقع پر کیا خوب کہتے ہیں کہ تحریک کے شربت میں پانی عناصر کے غدر سے بڑھ گیا۔

اساسیقون ۱۱ اولون

اس وجوہات کی بنا پر تحریک اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جونہی کامیابی حاصل ہو تو وہ اپنی صفوں میں مزید نئے ارکین بھرتی کی بند کر دے۔ ایسے موقعوں پر تنظیم کی مزید توسیع بڑی دور اندیشی دیکھ بھال اور رکنیت کے لیے درخواست کنندگان کی مکمل جانچ کے بعد ہونی چاہیے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تحریک کی جڑیں گہری و سالم رہتی ہیں اور سرسبز رکھی جا سکتی ہیں۔ یہ احتیاط کرنا لازم ہے کہ تحریک کی باگ ڈور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے جو اس کے مقصد سے وابستہ ہیں۔ جنہوں نے شروع میں کٹھنائیاں جھیل کر تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب ہے کہ وہاں تحریک کو تبلیغ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ خاص کر وہ تبلیغ جس کا مقصد تحریک کو عوام سے روشناس کرانا ہے جب تحریک برسر اقتدار آ جائے تو اسے ان تمام اقدامات پر عمل کرنے اور وعدہ خلافی سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ جو تحریک کے اقتدار سے کرانے کے لیے دکھائے۔

تحریک خود مختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ان لوگوں کو جو اس کی مخالفت کر رہے تھے اس نے آمادہ کار میں تحریک کی ضرورت تھی۔ حکومت کے اختیارات بھی انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہنے چاہئیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہنا چاہیے۔ جب تک مداخلت کے اصول پر مداخلت کے اختیارات کی سرکاری بنیادی حکمت عملی نہ بن جائیں۔ جب یہ کام ہو جائے تو پھر جائز ہوگا کہ مقتدر حلقہ یہ سرکار کے امین کے حوالے منتقل کر دیا جائے۔ یہ نئی سرکار اور اس کا امین خود تحریک کی روح کے ترجمان ہوں گے۔ یا عموماً یہ نسلی ذہن کا نہیں بلکہ یہ مسئلہ اس عوام کا ہے جو رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان عوامل کا اندراج پہلے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ان پر قابو رکھنا ناممکن ہی ممکن ہے کہ جب یہ قدم اٹھانے سے پہلے ان پر نگاہ رکھی جائے۔

تمام بڑی تحریکیں چاہے ان کی نوعیت کیسی ہو یا مذہبی تحریکیں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ جب مذکورہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھا جائے جب ان کو اس سے تجاوز کیا جاتا ہے تو پھر کامیابی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

''پرہیزگار قلندری'' اور ''مجاہد فدائی''

میں اپنی مداخلت کا ماخذ تبلیغ تھا۔ ایک طرف تو میں نے یہ کوشش شروع کی کہ بعد میں تحریک کو جو حکومت حاصل ہونے والی ہے اس کے حوالے بھی میدان تیار کرنے شروع کر دیا جائے۔ دوسری جانب میں نے ایسے تنظیمی اقدامات کا اہتمام کیا ہے کہ تحریک کی تنظیم میں سوائے بہترین عناصر کے کوئی گھسنے نہ پائے۔ جتنا بھی انتشار کا مادہ انقلابی دور میں پیدا ہوتا ہے اتنا ہی کمزور اور مذبذب مزاج کے لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے جو ہماری تنظیم کا اندرونی حلقہ ان کی پہنچ سے محفوظ رہتا تھا۔ شاید ان میں سے اعلیٰ لوگ معاونین میں شامل رہتے تھے۔ لیکن انہیں یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ ہماری نیابت میں رہنمائی کو لیں۔ بر عکس اس کے وہ خاموش ہی رہتے تھے۔ بڑے بڑے افراد نے ان دنوں مجھے یہ جتلایا کہ وہ میرے ساتھ کامل طور پر متفق ہیں لیکن کی قیمت پر ہماری تحریک

کے رکن بنے ہیں تو وہ کہتے تھے کہ یہ تحریک ایسی انقلابی ہے کہ اگر ہم نے اس کے رکن بن کر اس میں حصہ لیا تو ہمیں برا بھلا کہا جائے گا۔ ہمیں سخت اذیت ناک حالات پیش آئیں گے ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں دیانت دار اور مخلص پاکستانی ہونے کی شہرت حاصل رہے۔ کم از کم قانونی طور پر ہم آپ کی تحریک سے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں۔ یوں تو ہم آپ کے ساتھ متفق ہیں

ہماری اس میں بہتری تھی۔ یہ سب لوگ جو اندر سے انقلابی تصورات کے حامی تھے اگر اس وقت ہماری تحریک کے رکن بن جاتے تو آج ہم پر بیروزگاروں کی ایک منڈلی ہوتے۔ ہم ایک جوں اسے تحریک کی حیثیت اختیار نہ کر سکتے جو وہ جہاد سے سرگرم ہے۔

میں تحریک کا امیر بن گیا

میں نے اپنی تبلیغ کو یہ جاری رکھا اور یہ احساس دلایا کہ ہماری تحریک کا انقلابی میدان عمل کے لیے مستقل اور منظم ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو سے زائد مقامات کے صرف انقلابی دل رکھنے والے افراد ہماری بیعت میں داخل ہوئے۔

یہ ہماری تبلیغ کا ہی اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں لاکھوں باشندگان ملک کو دل سے یقین ہو گیا کہ ہم سچے ہیں اور راستی پر ہیں۔ وہ ہماری کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ اگرچہ وہ خود کو ایسے بزدل تھے کہ ہمارے مقاصد کی خاطر کوئی قربانی کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ تاہم وہ ہماری صفوں میں شامل ہوتے جاتے تھے۔

۱۹۲۰ء کے وسط تک تحریک کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے یہ آسان طریقہ کار کافی تھا اور خوب کارآمد ثابت ہوا۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ تحریک کی تنظیم کو بھی اسی انداز سے منظم کیا جائے۔ جس انداز سے ہماری تبلیغ کامیابی حاصل کر چکی تھی۔

ہماری جماعت کے صدر کی ہلاکت سے بعض حقیقت ناشناس لوگوں نے یہ کوشش

کی کہ ہماری جماعت پر قبضہ کر لیں۔ ان کی اس کھلی کھلی سازش کا فوراً ہی انکشاف ہو گیا۔ یہ سازش ختم کر دی گئی۔ جلسہ عام میں اتفاق رائے سے تحریک کی رہبری کے تمام اختیارات مجھے سپرد کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نیا عہدہ بنایا گیا جس کی رو سے تحریک کے صدر کو تحریک کی تمام ذمہ داری سپرد کر دی گئی۔ کمیٹیوں میں قرارداد پیش کرنے کا دستور ترک کر دیا گیا۔ اس کی بجائے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا گیا۔ آج تک اس اصول پر کامیابی عمل ہو رہا ہے۔

"تقسیم کار" یا "مشترکہ ذمہ داری"

جب اگست ۱۹۲۱ء کے بعد میں نے ان اصولوں پر تحریک کی داخلی تنظیم نو کا کام شروع کی۔ اس کام میں کئی بھلے لوگ میرے ساتھ شریک تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی کارگزاری اور خدمت کا ذکر کیا گیا ایک ایک کا نام لے کر بعد میں کروں گا۔

میری کوشش یہ تھی کہ تبلیغ سے جو نئے ممبر بھرتی ہو چکے ہیں ان کو بھی تنظیم کے انتظام کے لیے کام میں لایا جائے۔ اس طرح ان نئے ممبروں کا تربیت کا بندوبست ہو جائے۔ میں نے کئی پرانے دستور بدل دیے یا بھلا دیے۔ نئے قواعد رائج کیے جو دوسری جماعتوں کے ہاں رائج نہ تھے۔

۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک ہماری تحریک کا کاروبار ایک مجلس منتظمہ چلاتی تھی۔ اس مجلس منتظمہ کے اراکین جلسہ عام میں منتخب ہوتے تھے۔ مجلس منتظمہ میں حسب ذیل عہدہ دار شامل تھے۔ ۱۔ خزانچی ۲۔ نائب خزانچی ۳۔ دو یا اس سے زیادہ نائب صدر۔ ان عہدہ داروں کے علاوہ مجلس منتظمہ کا ایک رکن مجلس عامہ کے نمائندے کے طور پر شامل ہوتا تھا۔ ایک یا دو مشیر و اشاعت بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مجلس منتظمہ میں بعض معمولی اراکین بھی ہوتے تھے۔

یہ بات خاص مستقل نہیں ہے کہ ہماری مجلس منتظمہ کی ہر نئی تشکیل اسی اصول کی بنا پر ہوتی ہے۔ جس کے خلاف کام کرنے کے لیے تحریک قائم ہوئی تھی۔ یعنی پارلیمنٹری طریقہ

کار سے کام کرنے کے اصول۔ تحریک اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس کا لب لباب یہی اصول تھا۔ ہماری تحریک کی مقامی شاخوں سے لے کر علاقائی تنظیم تک علاقائی تنظیم سے لے کر مضلع اور تنظیم تک ضلع سے لے کر صوبائی تنظیم تک اور صوبائی تنظیم سے لے کر قومی مجلس عاملہ تک ہر ادارہ اسی اصول کی حمایت کے لیے سرگرم عمل تھا۔ یہ وہ اصول تھا جس نے تب بھی ہمیں بہت تقویت پہنچائی۔ اور آج تک ہمارے لیے بہت ضروری ثابت ہو رہا ہے۔

"کثرت رائے" یا "شخصی ذمہ داری"

اس صورت حال کو قبول کرنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ تحریک کی داخلی تنظیم میں وہ بنیادی نقصان ہماری تحریک میں ظہور پذیر ہوتا۔ تحریک کا اصل مقصد برباد کرنا ممکن ہو جاتا۔

مجلس منتظمہ کی کارروائی کیسے چلائی جاتی تھی۔ اس کے بارے میں کی رو سے تمام فیصلے کثرت آراء کے پابند تھے۔ غرض ہماری مجلس منتظمہ بھی ایک کمیٹی ہی ہوا کرتی تھی۔ شخصی ذمہ داری یہاں قطعاً مفقود تھی۔ ہماری سرکار کے بڑے بڑے ذمہ دار محکموں سے جو مختلف اور خلاف متعلق رپورٹیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہی ہماری مجلس منتظمہ میں بھی پیش ہوتی ہیں لیکن ان رپورٹوں پر مجلس منتظمہ کے تمام ارکین ہر مسئلہ کی نسبتیات میں دخل دیتے تھے۔ ہر رائے شماری کی نوبت آتی تھی۔ تب کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا تھا۔ چنانچہ باہم مشورہ و مشاورت اس مسئلہ پر بھی ہوتا رہتا تھا کہ ہدایات کے معاملہ میں کس شخص کا نظر رکھنا مناسب ہے۔ باہم ہدایات میں معاملات میں کسی دخل تھا۔ جس کا تعلق فلاں تنظیم سے ہوتا تھا۔ باہم تنظیمات ان امور میں رائے ظاہر کرتا تھا جو دیہ کے متعلق ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہمارے مشیروں اور تحریک کے لیڈروں نے بھی تبلیغ کے مسائل طے کرنے میں

دیا ہے تو پھر ایک باضابطہ تبلیغ مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس شخص میں مرتی ہوئی محفل ہوا سے پہ تماشا بالکل فضول نظر آتا تھا۔ یہ بھی فضول جیسا کہ کسی بڑے کارخانے میں ہدایت کے مگر ان مشینوں کے کل پرزوں کے متعلق رائے دینا شروع کر دیں یا بہتر نظم و نسق میں دخل دینے لگیں۔

میں نے یہ مداخلت برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت بعد میں نے مجلس منتظمہ کے اجلاس میں شمولیت ہی ترک کر دی۔ میں سوائے تبلیغ کے محکمہ کا انتظام کرنے کے اور کسی بات میں دخل نہ دیتا تھا۔ اسی دوسروں کو یہ اجازت دیتا کہ وہ میری سرگرمیوں میں خود کو مشورے دینے میں خواہ مخواہ دوسروں کی سرگرمی کے متعلق انہیں کوئی مشورہ نہ دیتا۔

جس دن یہ انتظام ہو گیا اور میں صدر مقرر ہوا تو مجھے مکمل بااختیارات مل گئے۔ تب میں نے اس قسم کی تمام مداخلتوں کا خاتمہ کر دیا۔ مجلس منتظمہ میں اکثریت رائے سے فیصلہ کرنے کے بجائے اب متعلقہ شعبہ داری کے صوابدید پر عمل ہونے لگا۔

"قیادت" اور "اطاعت" کے اصول کا طریقہ کار

صدر یا میئر تمام تحریک کو چلانے کے لیے ذمہ دار ہے۔ میئر کے ماتحت ایک مجلس شوریٰ ہے اور میئر کو خاص فرائض اس مجلس شوریٰ کے ہر رکن کے سپرد کرنا ہے۔ خصوصی فرائض کے لیے میئر دیگر افراد کو نامزد کرتا ہے۔ مجلس شوریٰ کے ارکین ہوں یا خصوصی فرائض انجام دینے والے افراد ہر ایک صرف ان فرائض کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر ایک کارکن براہ راست میئر کے سامنے جواب دہ ہے۔ ان کارکنوں میں باہمی تعاون کے رشتے قائم رکھنے کا ذمہ دار میئر ہے۔ میئر ہی کارکن مقرر کرتا ہے۔ اور میئر ہی انہیں منتشر کرتا ہے اور جہاں ضرورت ہو باہمی تعاون کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

متعلقہ شعبہ داری کا یہ اصول ہے جو شروع سے ساری تحریک میں رائج رہا ہے

چھوٹی چھوٹی مقامی اور علاقہ وار یا سماجی تنظیمات میں اس اصول پر عمل ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ کسی شخص کے لیے مطلق شخصی ذمہ داری قبول کرنا ایسے لوگوں کو اس لیے ناپسند ہوتا ہے کہ وہ اکثریت رائے کی نئی کی آڑ میں چھپ کر وار کھیلنا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اپنے اعمال پر کمیٹی کے فیصلوں کے پردہ ڈالے رکھیں۔ میری رائے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ کسی زبردست کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد کی جائے۔ جو لوگ ذمہ داری قبول کرنے سے ڈرتے ہیں ان کی بات ہرگز نہیں ماننی چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل ہونے میں کچھ وقت صرف ہو تو کچھ ہرج نہیں یہ اصول تعلیم کرنے سے ہی وہ قائدین ابھریں گے جن میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کی صلاحیت اور لیاقت ہوگی۔

"وحدت" اور "کثرت" کا سیاسی اطلاق

بہرحال جو تحریک پارلیمنٹری اداروں کی حمایتوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے قائم ہوئی ہے۔ خود اس تحریک کو کسی حمایتوں سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ صرف یہ طریقہ کار اختیار کرنے سے ہی تحریک میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ کہ اپنا مقصد پورا کر سکے۔

آج کل اکثریت رائے ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ جو تحریک کے ایک لیڈر کے اصول پر چلائی جائے گی۔ اور تحریک کے تمام مسئلہ قدامات کے لیے ہی ایک سیاسی لیڈر کو ذاتی طور پر ذمہ دار گردانے گی وہ بہت جلد موجودہ نظام کا مات ثابت کر رکھ دے گی۔ اور موجودہ لیڈروں کے خلاف کامیابی حاصل کرے گی۔ یہ ایک دماغی بیماری ہے جیسے کہ دردِ سر ہوتے ہیں۔

اس اصول کو تعلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہماری تحریک داخلی طور پر دوبارہ منظم کی جائے۔ جب یہ دوبارہ تنظیم شروع کی گئی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ تحریک کے مایات اور سیاسیات کے شعبے جداجدا کام کرنے لگے۔ شخصی ذمہ داری کا اصول تحریک کے نظم و

نسق کے بر عکس بن کر رہ گیا۔ یہ اصول قائم کرنے سے تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی تحریک کا نظم و نسق پہلی نسبت سے آزاد ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک کا نظم و نسق اقتصادی اصولوں پر چلنے لگا۔

تحریک کی ابتدا اور رہنمائی

ہماری جماعت ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت جماعت کے صرف چار ممبر تھے۔ جماعت کا کوئی دفتر نہ تھا۔ جماعت کا کوئی خزانہ تھا۔ جماعت کے کوئی عہدہ دار نہ تھے۔ جماعت میں کوئی باقاعدگی نہ تھی۔ جماعت کا کوئی لٹریچر نہ تھا۔ ہماری مجلس مشاورت کا پہلا اجلاس پہلے ہر کاسے کے بازار میں ایک ہوٹل کے ایک کمرہ میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد کاسیک کے ایک قہوہ خانے میں اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ یہ صورت کئی سال زیادہ تر بلکہ قائم رہی تھی اس لئے میں نے یہ معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے میونخ کے مختلف ہوٹلوں اور ریستورانوں کا ایک چکر کاٹا۔ غرض یہ تھی کہ جماعت کے استعمال کے لیے ایک کمرہ کرایہ پر لیا جائے۔ آخر کار ہوا ستال کے پرانے محلہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ ملا۔ اس کی عمارت کسی زمانے میں ایک شراب خانے کے طور پر استعمال ہوتی رہی تھی۔ وہ بھی مقدس سعادت کے ماتحت نہیں بلکہ آنے والے ممبر انہیں اسی شراب خانے میں بیٹھ کر غم غلط کیا کرتے تھے۔ یہ کمرہ نہایت تاریک اور زبوں حال تھا۔ اس پر اس کام کے لیے موزوں تھا۔ جو ہمیشہ یہاں سے ہوتا آیا تھا۔ یہ اس کے کام کے لیے موزوں نہ تھا۔ جو اب یہاں شروع ہونے والا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جو گلی بھی تاریک تھی کہ گرمیوں کے دنوں میں جب تیز دھوپ پڑ رہی ہوتب بھی کمرے میں دھندلی روشنی چھائی رہتی تھی۔ غسلخانہ ایک قسم کی کوٹھی ہوتی تھی۔ یہاں ہم نے اپنی تحریک کا پاسپرٹ قائم کیا۔ کرایہ تین روپیہ ماہوار تھا۔ یہ رقم بھی اس زمانے میں ہمارے لیے بہت گراں تھی۔ ہم مجبور تھے کہ اپنے اثاثہ جات گروی رکھیں۔ مالک مکان جب ہمارے قبضہ کے پانچ روز بعد دیواروں پر

سے لکڑی کا کام لے لیا تو بھی ہمیں یہ حوصلہ ہوا کہ احتجاج کرتے۔ دیواروں پر لکڑی کا کام اس وقت چڑھا دیا گیا تھا جب سلطنت کے مسلمان یہاں شراب پینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ دیواروں پر سے لکڑی اتر جانے کے بعد کمرے کی شکل کسی پرانے کھنڈر جیسی بن گئی۔

محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے

باوجود اس کے ہماری تحریک کو ایک مقبول جماعتی کی جانب ایک اہم قدم تھا۔ آہستہ آہستہ ہم نے یہاں بجلی لگوا لی۔ ٹیلی فون بھی آ گیا۔ ایک میز اور کچھ کرسیاں منگوائی گئیں۔ کاغذات رکھنے کے لیے ایک الماری تھی۔ جس کے پٹ غائب تھے۔ ایک صندوق بھی آ گیا۔ مالک مکان کی مہربانی سے ہم جس حصے میں رہتے تھے اس کا کرایہ بھی معاف تھا۔

جب وقت گزرتا گیا تو تحریک کا کام چلانے کے لیے لفظ میں ایک مرتبہ پھر تبدیلی کا اضافہ ناگزیر ثابت ہوا۔ تحریک کا روزانہ کاروبار چلانے کے لیے ہمیں ایک باقاعدہ محکمہ اور ملازم کی ضرورت محسوس ہوئی۔

لیکن اس وقت کے حالات میں ہمارے لیے محکمہ اور ملازم رکھنا خاصی مشکل تھا۔ ہماری تحریک کے اراکین تعداد میں اتنے کم تھے کہ ان میں سے کوئی دو روں مخلص تلاش کرنا جو معاوضہ بہت کم لے اور اس کے باوجود وہ مستعدی سے خدمات سرانجام دے سکے۔ ان کی تحریک کو ضرورت تھی آسان نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان خدمات کے بجالانے میں وقت بھی صرف ہوتا اور محنت بھی درکار تھی۔

دیر تک غور کرنے کے بعد ہم نے ایک سماجی خدمت کو اپنا لیا۔ اس نے ہمارا ہاتھ بٹانا قبول کر لیا۔ اس کا نام ہر نکلا تھا۔ وہ جنگ کے ایام سے میرا رفیق چلا آ رہا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے ہر روز صرف چھ گھنٹے صبح آٹھ بجے سے دوپہر کے دو بجے تک کام شروع کیا۔ پھر وہ ۵ بجے شام سے ۹ بجے رات تک ٹھہرنے لگا۔ اس کے بعد وہ سارا دن

ی سے دفتر آ جاتا تھا۔ آخر کار وہ ہمہ وقت ملازم ہو گیا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک دفتری کام کرتا رہتا۔ وہ ایک بہت صاف گو اور دیانت دار ملازم ثابت ہوا۔ جو تحریک کا وفادار تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایڈریس مارکنگ کی چھوٹی مشین بھی دفتر میں لے آیا اور اسی ساعت کے کاروبار میں یہی واحد مشین استعمال ہوئی وہ یہی ٹائپ رائٹر تھا۔ بعد میں ساعت نے فلپس واگر کے پرانا ٹائپ رائٹر دیا۔ ہمیں ایک مخصوص صفحہ بندی کی بھی ضرورت محسوس ہوئی اس میں کاغذات وغیرہ رکھیں۔ کبھی جا سکیں اور چوری کا خطرہ بھی نہ ہو۔ اگلی تحریک کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اس کا صفحہ بندی کار ہوتا۔ برعکس اس کے ہماری مالی حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے کفایت پیسے بچانے کی خاطر دوستوں سے ادھار لینی پڑتی تھی۔

اٹھارہ مہینے گزر جانے کے بعد ہمارا دفتر ہماری ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ چنانچہ ہم نے کارلیس وسٹر سے بازار میں ایک بڑا دفتر لے لیا۔ ہمارا یہ دفتر اگلی ایک ربع صدی تک ہمارا مرکز رہا۔ لیکن یہاں ایک کمرہ کی بجائے اب تین کمرے ہمارے پاس تھے۔ ایک کمرہ بہت بڑا تھا۔ جس کی کھڑکیاں بھی بڑی تھیں۔ اس وقت کے حالات میں یہ دفتر بہت ہی عالی شان معلوم ہوتا تھا۔ اس دفتر میں ہم اوہیو ۱۹۲۳ء کے اختتام تک مقیم رہے۔

ہم نے اخبار نکالا

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہم نے کونسٹر ریویو دفتر ہی اخبار جاری کیا۔ جیسا کہ اس اخبار کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ کونسٹر کا نمائندہ تھا۔ اب ہم نے اس اخبار کو ان قوم پرست شتر کی مزدور پارٹی کا نمائندہ بنا لیا۔ پہلے یہ اخبار ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا ۱۹۲۸ء کے آغاز میں اسے روزنامہ بنا دیا گیا۔ اور اگست ۱۹۲۸ء میں یہ اخبار روزانہ شائع ہونے لگا۔ تب اس سارے کے لوگ خوب متعارف ہو چکے تھے۔

میں صحافت میں بالکل نو آموز تھا۔ چنانچہ میں نے کئی نئے سبق سیکھے۔ یہ سبق میں

نے کی بھی تکلیف نہ کرنا اصل ہے۔

بیوروکریٹس کے متعدد اختیارات تھے۔ اس کے مقابلے میں تاجر عوام کی نمائندگی کرنے والا یہ ایک ہی اہم اختیار تھا۔ یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ ایک سبق میں نے کئی تجربوں کے بعد حاصل کیا۔ وہ سبق یہ تھا کہ قوم پرست اختیارات کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کا مالی انتظام سخت بدنظمی میں تھا۔ ان اختیارات کے انتظام میں یہ اصول مروج تھا کہ جو تنخواہ ملتی ہے وہ کافی ہے۔ جو بے کوئی تحفہ نہ قبول کیا جائے وہ بھی جائے۔ یہ اصول بالکل غلط تھا کہ جیسے رشوت دینا ہر جگہ عقیدہ و ضمیر میں ہوتا ہے لیکن کوئی رشوت عقیدہ و ضمیر کے خلاف ہو تو وہ دل تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ جو شخص اپنی قوم کی قابل قدر خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا عقیدہ بھی سچا ہے۔ اور اس کی رائے بھی صائب ہے۔ برعکس اس کے وہ شخص جو اپنے عقیدے کے متعلق باتیں بناتا ہے اور عمل کچھ نہیں کرتا۔ وہ نہ تو قوم کے لیے مفید ہے اور نہ ہی اسے صائب الرائے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اعتقاد کے متعلق خالی باتیں بنانا ایک ایسی عادت ہے جو قوت کے لیے مضر عادت ہوتی ہے۔

سچی بات بھی ایک تجارت ہے

اخبار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ ایک جرنل عوامی اخبار ہونے کا مدعی تھا۔ اس کی سب باتیں سچی نہیں۔ لیکن اس میں وہ غلطیاں اور کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں جو ہر جرنل عوامی اداروں کا خاصہ ہیں۔ اس اخبار کے مضامین اور اخبار بالکل تسلی بخش تھے۔ لیکن اس کا مالی انتظام سخت بدنظمی کی حالت میں تھا۔ مالی انتظام اس اصول پر چلایا جاتا تھا کہ جو اخبار ہر جرنل عوامی ہونے کا مدعی ہو۔ اسے کس سہارے پر گزارہ کرنا چاہیے۔ یہ اصول اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ ہمارے اخبار کو محض دوسرے اخبارات کا ہی مقابلہ کرنا ہے۔ یہ تو وہ باتی کی بات ہے کہ ہم عوام دشمن کے چندوں سے اخبارات کے اخراجات کی کمی کو پورا کریں۔ اور اس کے مالی انتظام کا ٹھیک نہ ہونا

اصولوں پر انتظام نہ کریں۔

میں نے تصور کیا کہ اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا جائے۔ مجھے اس کام کے لیے ایسا شخص چاہیے تھا جو اس صورت حال میں مضمر تھا۔ قسمت نے میری یاوری کی تھی مجھے ایک ایسا شخص مل گیا تھا جس نے اس وقت سے لے کر آج تک تحریک کے لیے بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے صرف ہمارے لیے ہی مالی مشکر کے طور پر کام نہیں کیا تھا بلکہ وہ ہماری تحریک کے مالی مشکر کی خدمت بھی انجام دیتا رہا۔

تحریک کا مشیر مال بھی ہونا چاہیے

۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑنے سے پہلے میرا تعارف ہر دلعزیز کس آدمی سے ہوا۔ وہ تب میرا مشیر تھا۔ آج کل وہ ہماری سیاسی سماعت کی مالیات کا معاملہ ہے۔ مجھے جنگ کے چار سال کے عرصہ میں متواتر اس شخص کی بیحد معمولی قابلیت سمجھ اور دیانت داری کا تجربہ ہوا۔ یہی شخص مستقبل میں میرا رفیق بننے والا تھا۔

۱۹۲۱ء کی موسم گرما میں مجھے اتفاقاً ایک روز ہر دلعزیز کس آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ جنگ کے دوران میں میری رہنمائی کے اندر میرا مشیر رہ چکا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ ہماری تحریک کا نظم مالیات سنبھال جائے۔ ان دنوں تحریک پر بڑا نازک وقت گزر رہا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے کئی مدارس سے مطمئن نہ تھا۔ ایک مدارس کے متعلق تو مجھے خاص طور پر تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ہر آدمی تب ایک بھی مدارس پر مامور تھا۔ جس کے پاس ترقی کے بھی خاصے امکانات موجود تھے۔

پہلے تو وہ کچھ دیر تردد میں مبتلا رہا۔ مگر اس نے میری درخواست مان لی۔ لیکن اس نے میری درخواست قبول کرنے سے پہلے یہ شرط عائد کی تھی کہ میرے کسی ماتحت کام نہ کرنا ہوگا۔ وہ صرف ایک حاکم کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس سے پیش کرنے والا ایک شخص ہونا چاہیے۔

ہماری سیاسی سماعت کی مالیات کے اس پہلے ناظم نے تحریک کے لیے بہت بڑی

خدمات انجام دیں۔ تجارت کے متعلق اس کا علم وسیع اور گہرا ہے۔ اس نے تحریک کے محکمۂ تجارت میں باقاعدگی اور دیانت کے اصول داخل کر دیے ہیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہمارے دفاتر میں ایک ایسا نمونہ پیش کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے۔ ہماری تحریک کا کوئی دوسرا شعبہ ان دفاتر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ زندگی میں اکثر ہوتا ہے کہ ہر شخص غیر معمولی قابلیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے حریف لوگوں میں حسد اور بغض پایا جاتا ہے۔ ہر آدمی کو کسی نہ کسی آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔ لیکن اس نے صبر و تحمل سے یہ آزمائش برداشت کی۔

تحریک کا دفتر کن اصولوں پر چلنا چاہیے

۱۹۳۳ء کے بعد ہماری تحریک میں بعض قواعد پر سختی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ قواعد صرف تحریک کی ہدایت سے متعلق نہیں بلکہ تحریک کی تنظیم سے بھی متعلق ہیں۔ تحریک کے مرکز میں باقاعدہ دفاتر قائم کیے گئے ہیں اور ان کے متعلق تفصیلات کی فہرستیں تیار رکھی جاتی ہیں۔ تحریک کی آمدنی کا مستقل اور تسلی بخش انتظام کر دیا گیا۔ چلتے اخراجات صرف چندہ آمدنی سے پورے کیے جاتے ہیں۔ غیر معمولی صرف مخصوص اخراجات کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطالبات کا سامنا ہونے کے باوجود تحریک کسی کی قرض دار نہیں۔ ہاں تھوڑا بہت تو چلتا ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے سرمائے میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری مالیات کا انتظام اس طرح کیا جاتا ہے کہ جیسا تجارت کے کسی بڑے ادارے میں۔ تحریک میں لوگوں کو ملازم رکھتی ہے۔ وہ صرف دفتری کارگزاری کے عمل پر تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ کسی کو یہ اجازت نہیں دی جاتی کہ دفتری فرائض کی ادائیگی میں ذاتی کام کرے اور تحریک کے ساتھ وہ داری کو آڑے لا کر تنخواہ وصول کرتا رہے۔ ایک قوم پرست اشتراکی پارٹی کی اہلیت یوں ثابت کرتا ہے کہ جو فرائض اس کے سپرد کیے جائیں۔ انہیں ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ عزت اور سلیقے سے کام انجام دے سکے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ معاشرے میں وہ کس

مرتبہ ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے عہدے کے فرائض کو ٹھیک طرح انجام نہیں دے سکتا وہ یہ کہنے کا حق دار بھی نہیں کہ وہ تحریک کا وفادار ہے۔ جس خدمت کا اس نے وعدہ کیا رکھا ہے اس خدمت کے لیے اس کا اہل ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس کی وفاداری دکھاوے کی ہے۔

سیاسی خدمت وظیفہ خواری کے ذریعے نہ ہونی چاہیے

ہماری جماعت کی ہدایات کا پہلا حکم اس اصول کا قائل تھا کہ اس کے کاروبار میں کسی بیرونی اثر کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ جب کسی شخص کے ترشے سے اس کے کام میں مداخلت کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کا اصول یہ تھا کہ تحریک کے نظم و نسق میں وظیفہ خوروں کے لیے کوئی ملازمت خالی نہیں کسی شخص کو ہوکار کرنے کا باعث ہونا اس لیے تحریک میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ کہ وہ تحریک کا رکن ہے یا اس کا معاون جب ہماری تحریک سرکاری ملازمین کے معاملہ میں سیاسی جماعتوں کی دوست داری اور اقربا نوازی کی اس قدر سخت مخالف ہے تو خود تحریک کے اپنے نظم و نسق اور اپنے دفتر میں تو یہ برائی ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ اتفاق یہ ہوا کہ ہمارے ابتدا کے دفتر میں بعض ایسے شخص ملازم ہو گئے جو پہلے ہوم رول پارٹی کے رکن تھے۔ ان کے کام سے ثابت ہوا کہ جو خدمت ان کے سپرد ہے اس سے خوب اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔ اس تجربہ کا نتیجہ خوب کامیاب رہا۔ ان کی کارگزاری کی خوب تعریف کی گئی۔ یہ ایک ایسی دیانت داری اور اخلاصانہ مثال تھی کہ جس سے ہماری تحریک نے اپنے ملازمین کے دل موہ لیے۔ اب ہمارے ملازمین اس قدر جلد اور ایسے خلوص سے تحریک کے وفادار ہو گئے کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ لوگ قوم پرست انجمن کے رکن بن گئے۔ ان کی یہ وفاداری ضمنی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی دیانت داری اور اخلاصانہ اور مستقل کارگزاری سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تحریک کے دل سے وفادار ہیں۔ ہاں یہ طبعی امر ہے کہ ہر ایک ملازمت کے دو امیدواروں میں دونوں جس طرح ہوں تو بھی

ن میں سے تحریک کے رکن کو کسی اعلیٰ عہدے پر ترقی دی جائے گی۔ زمانے بعد جماعت
مالیات نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی سے ان اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا۔ اس کا
تحریک کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس سے اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ان کی بھی
پروا نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تحریک کے کی قیمت گر گئی اور ہر اخبار کے کالم
مخالفانہ پروپیگنڈے سے بھر گئے تو ہزاروں کے بجائے لاکھوں خریداروں نے اشاعت
بند کر دی تو ہماری تحریک کا محکمہ تجارت نہ صرف بدستور جاری رہا اور تمام حسابات پہلے کا
رہا بلکہ ہمارے اخبار نے مسلسل ترقی کی۔ اس زمانے میں یہ اخبار تحریک کے سب سے
بڑے اخباروں میں شمار ہونے لگا۔

اہل پر ناہل کو عہدہ چننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی

۱۹۳۱ء کا سال میرے لیے اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ میں نے جماعت کے میر کی
حیثیت سے آخری فیصلہ کن طور پر ان کارکنوں کو جماعت سے علیحدہ کرنے والوں
کام بند کر دیا۔ جو ہماری مجلس عاملہ کے رکن تھے اور جماعت کے نظم و نسق اور بیرونی
معاملات میں دخل دیتے رہتے تھے۔ میرا یہ اقدام اس لیے ضروری تھا کہ یہ لوگ اگر اندر
کام کرتے رہتے تو مسلسل طور پر کام میں دخل دیتے رہتے تو ہمیں کسی کام کے انجام دینے کے
لیے کوئی قابل شخص کس طرح مل سکتا ہے۔ یہ لوگ اس لیے دخل اندازی کرتے ہیں کہ وہ
دنیا کا ہر کام دوسروں سے بہتر کر سکتے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ لوگ اس کام میں
ہاتھ ڈالیں وہاں سوائے پریشانی اور بدمزگی کے کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ جب میں نے ان
عقل کے پتلوں کی بات نہ سنی تو چپ چاپ اور الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی
کارگزاری کے لیے کوئی دوسرا میدان تلاش کر لیا۔ جہاں انہیں محکمہ کے فرائض ادا
کرنے کا موقع دیا جاتا۔ اور وہ محکمہ کی حیثیت سے دوسروں کو ہدایت کرتے کہ
کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ لوگوں کو یہ جنون ہوتا ہے کہ وہ ہر کام میں دخل دیتے رہیں
ان کے ذہن ہمیشہ بلند تصوروں اور اعلیٰ خیالات سے مجتمع تباہی ہو کام کرنے کے گر کی کلاسے

سے ارتباط پیدا کرنے والی کیفیت عارض رہتی ہے۔ ضعفا ان معززین کی نسبت ہر لمحہ عین ہیبت صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو جمع کر کے ان کی ایک "انجمن کار" کیلئے بنا دی جائے۔ جس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ قاعدہ کا م کرنے والے ماہرین فن کی "دیکھ بھال" کرتی رہے اور ان پر حکم چلاتی رہے۔ یہ بات قوم پرست شرکت کی روح اور اصول کے خلاف ہے کہ بلکہ ہر ماہل لوگ قابل کارکنوں کی کارگزاری میں ہمیشہ اپنی ٹانگ اڑاتے رہیں۔ یہ "ویاں کمیٹیوں" کبھی بھی خوشی کام نہیں کر سکتے۔ میں نے اس زمانے میں اپنا یہ فرض سمجھا کہ ایسے وقت در معقولات کرنے والوں سے ان کی حفاظت کروں۔ انہیں کوئی باقاعدہ اور ذمہ دار کام دیا جائے۔ کسی کو یہ جرأت نہ ہونی چاہیے کہ ایک کاریگر کے کام میں دخل دے یا اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔ ایک صاحب ہنر کو فرصت اور فراغت بھی چاہیے کہ جو کام ایک دفعہ اس کے سپرد کیا جائے وہ اسے اطمینان سے انجام تک پہنچائے۔

ان کمیٹیوں کے دخل در معقولات سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کے ارکین میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر کوئی خاص کام سونپ دیا جائے ورنہ یہ لوگ باقاعدہ مجلس تیار کر کے میں بڑے دلیر ہوتے ہیں۔ نئی نئی تجویزیں پیش کریں تو بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ جب کوئی خاص کام ان کے سپرد کر دیا جائے تو معزز ارکین رفتہ رفتہ کھسکنے لگتے ہیں۔ اور اصولاً لے سے بھی ان کا پتہ نہیں ملتا۔ مجھے بصورت حال دیکھ کر اپنے اختیار تمیز پر ہمیشہ داد آگئی۔ اگر ان معزز ارکین کمیٹی کو بھی خاص باتیں بنانے کی کوئی خاص کام سپرد کر دیا جائے تو یہ لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ بالخصوص اگر ایک ایک رکن کے سپرد علیحدہ علیحدہ کام ہو اور ہر ایک کو شخصی طور پر اس کام کے لیے جواب دہ بنا دیا جائے تو پھر ان حضرات کا کہیں پتہ نشان بھی نظر نہ آئے گا۔

ہر کارے دہ ہر مردے

میرا مطالبہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ذاتی کاروبار میں ہم اس وقت تک نہیں تھکتے۔ جب تک کسی کام کے لیے کافی آدمی نہیں اکٹھے کر لیتے اسی طرح تحریک کے معاملات میں بھی تب تک دم نہ لینا چاہیے۔ جب تک کہ تحریک کے ہر شعبے کے ناظم یا حاکم کے عہدے کے لیے سب سے زیادہ قابل اور بہترین شخص تلاش نہ کر لیا جائے۔ جب ایسے شخص کو ایک مرتبہ کسی عہدے پر مقرر کر دیا جائے تو پھر اسے مکمل اختیارات سونپ دیے جانے چاہئیں۔ اسے اپنے ماتحتوں سے کام لینے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ وہ جو ذاتی طور پر اپنے حاکموں کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ اس کے اختیارات بھی مکمل ہوں گے۔ اور اس کی ذمہ داری بھی مکمل ہو گی۔ کسی شخص کو اس وقت تک اس کے ماتحتوں پر حاکم نہ بنانا چاہیے جب تک وہ خود اس کام کا ماہر نہ ہو جو اس کو سونپا جائے۔ میں نے ۲۰ سال کے عرصہ میں اپنے اس نظریات پر زور دے کر زیادہ عمل کروانا شروع کر دیا۔ آج یہ حالت ہے کہ کم از کم جہاں تک ہماری تحریک کے ذیلی حلقوں کی کارگزاری اور گرفت کا تعلق ہے۔ ہم صحیح مسلک مانے جاتے ہیں۔

میری یہ رائے قبول کرنے کا دن ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ثابت ہو گیا۔ جو سال قبل جب میں تحریک میں شامل ہوا تھا تو تحریک کے پاس ریزرو میں صرف ۲۷ ہزار ڈالر تھے۔ ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہماری تحریک خلاف قانون قرار دے کر جبراً منتشر کر دی گئی اور اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ تب ہماری تحریک کی تمام جائیداد اور کاغذات کو نیلام کر کے اس کی جو قیمت وصول کی گئی وہ قریباً ایک لاکھ ستر ہزار ڈالر سے کچھ اوپر تھی۔

☆☆☆

باب دوازدہم :: ٹریڈ یونین کا مسئلہ

۱۹۲۹ء میں ہماری تحریک نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اس ترقی نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم ایک ایسے مسئلے پر توجہ دیں جسے ابھی تک حل نہ کیا گیا تھا۔

مزدوروں کو بھی ایک انجمن چاہیے

ہم ہر وقت یہ کوشش کرتے تھے کہ تحریک کو عوام کے دلوں تک پہنچانے کے لیے آسان تر بنائیں اور جلسے جلوس کے علاوہ اور طریقے تلاش کیے جائیں۔ ہماری ان کوششوں میں ہمیں ہر قدم پر اس اعتراض کا سامنا ہوتا تھا کہ جب تک مزدوروں کے پیشہ ورانہ اور اقتصادی مفاد کی نگہداشت کی سیاسی تنظیمات کے ماتحت ہیں جن کے سربراہوں کے اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ تب تک یہ کیسے ممکن ہے کہ مزدور مکمل طور پر ہماری تحریک سے وابستہ ہو جائیں۔

یہ ایک بڑا وزنی اعتراض تھا۔ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا تھا کہ کسی پیشے کو اختیار کرنے والا مزدور جب تک کسی ٹریڈ یونین میں شامل نہ ہو۔ اس کا کام نہیں چل سکتا۔ ٹریڈ یونین میں شامل ہونے کے بعد یہ صرف مزدوروں کے پیشہ ورانہ مفادات محفوظ ہو جاتے تھے۔ بلکہ غیر ٹریڈ یونین میں شامل ہونے کا کام ہی محال تھا۔ اکثر مزدور ٹریڈ یونین میں شامل تھے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ ٹریڈ یونین تحریک کا ایک واضح نظام طے کروانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ ٹریڈ یونین تحریک کا ایک واضح نظام طے کروانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ ٹریڈ یونینوں کے ایسے عہدہ دار طے کر چکے تھے جن کی رو سے مزدوروں کی مستقل آمدنی کا انتظام ہو گیا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف وجوہات سے تعلق رکھنے والے مزدوروں نے ٹریڈ یونینوں کی اس جدوجہد سے فائدہ اٹھایا تھا۔ بہت سے ہڑتالیوں نے ہڑتالوں کے وقت ٹریڈ یونینوں کی مدد سے طے کرنے کا فائدہ اٹھانے کے بعد ٹریڈ

یونین کی مزاحمت سے دست بردار ہو جاتے تو اس کا ضمیر کبھی اس اجازت نہ دیتا۔

"مالک" کوتاہ اندیش ہوتے ہیں

اس مسئلہ کے متعلق ایک اور بات کہہ دینا بھی ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو اس مسئلہ کے مالی پہلو سے واقفیت تھی نہ وہ اس کا اخلاقی پہلو جانتے تھے۔ نہ وہ اس موضوع پر اپنے علم میں اضافہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اکثر کارخانوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو مزدور ان کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ان کی کسی قسم کی تنظیم مالکوں کے مفاد کے خلاف ہو گی۔ اس فیصلے کے بعد ان کارخانے والوں کا اس مسئلہ کا کوئی جائز حل نکالنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی دیگر مسائل کی طرح اس مسئلہ پر بھی ان لوگوں کی توجہ مبذول کرنا بہت ضروری تھا۔ جو مالک تھے اور مزدوروں کے اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ حیثیت میں غور کر سکتے تھے۔ صرف غیر جانبدار اشخاص کے لیے ہی ممکن تھا کہ تعصبات سے بالاتر ہو کر مسئلہ کی عمومی حیثیت کو نظر انداز نہ کریں۔ غیر جانبدار حلقے تھوڑی سی ہمدردی سے اس کام میں قوم کے لیے اس مسئلہ کو حل کرنا مشکل نہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہماری قوم کے حال اور مستقبل دونوں کے لیے یکساں اہم ہے۔ اس مسئلہ کے صحیح حل پر ملک کی ہستی کا دارومدار ہے۔

معاشرتی بے انصافی کا تدارک لازمی ہے

میں اس کتاب کی پچھلی جلد میں زرداریوں کی نوعیت اور اس کے مقاصد کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں۔ وہاں میں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جب تک یا تو سرکار اس مسئلہ کا کوئی حل نافذ نہیں کرتی یا تعلیم کے ذریعے لوگوں کے خیالات بدل کر مالکوں کا مزدوروں کے متعلق رویہ نہیں بدلا جا سکتا۔ جب تک مزدوروں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ اپنے حقوق کی خود حفاظت کرے۔ مزدور اپنے حقوق کی حفاظت اس طرح کر سکتا ہے کہ مزدور اور مالک مساوی حیثیت کے فریقین کی شکل میں قوم کے اقتصادی نظام کے لیے رہتے ہوئے معاہدہ ملازمت کی شرائط و ضع

طے کریں۔ ایسے معاملات میں سرکاری جانب سے غیر جانبدار ثالث کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ٹریڈ یونین کے ذریعے معاشرتی بے انصافی ہو سکے تو یہ بات قومی مفاد کے لیے اچھی ہوگی۔ ورنہ یہ معاشرتی بے انصافی جاری رہی تو اس سے معاشرت کے پورے نظام کو سخت دھکا لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک ملکان میں ایسے مزدور ہوں جنھیں اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کا قطعاً احساس نہیں یا جو بنیادی انسانی حقوق بھی محفوظ نہیں رکھتے تب تک مزدور مجبور ہیں کہ وہ خود اپنے حقوق کے تحفظ کا اہتمام کریں۔ سابق وزیر محنت کامن لباب بیان کرتے ہوئے میں نے یہ کہا ہے کہ جب مزدوروں کو خود حفاظتی کے لیے قدم اٹھانا ہی پڑے تو یہ بہتر ہوگا کہ ٹریڈ یونین کی بنیاد پر خود مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی جائے۔

ٹریڈ یونین کے مسئلے کے مختلف پہلو

یہ تھے میرے ذاتی خیالات جو ۱۹۴۹ء میں انہی خیالات پر قائم رہا۔ لیکن اب ضرورت تھی کہ وہ طریق کار بھی تجویز کیا جائے۔ خالی مسئلے کا سمجھ لینا تو کافی نہ تھا۔ اب بعض ایسے مسائل اختیار کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی جن پر عمل کیا جا سکے۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات درکار تھے

۱۔ کیا ٹریڈ یونین کی ضرورت ہے؟

۲۔ کیا ہر قسم کی صنعت اشتراکی مزدور یونین کو ایک ٹریڈ یونین کے طور پر کام کرنا چاہیے؟ یا اس مزدور یونین کے ارکین کسی نہ کسی شکل میں ٹریڈ یونینوں کے اندر حصہ لیں؟

۳۔ اگر ایک قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین بنائی جائے تو اس کی شکل کیا ہو؟ ایسی ٹریڈ یونین کا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیے؟ اور اس کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

۴۔ اس ڈھانچے اور مقاصد کے ساتھ ٹریڈ یونین قائم کرنے کا طریق کیا ہونا چاہیے؟

ٹریڈ یونین ضروری ہے

میرا خیال ہے کہ پہلے سوال کا جواب نفی میں دے چکا۔ حالات موجودہ مجھے بتلا رہا ہے کہ ہم ٹریڈ یونین کے بغیر کام چلا سکتے۔ برعکس اس کے قوم کے موجودہ حالات میں ٹریڈ یونین ایک نہایت اہم اقتصادی ادارہ ہے۔ ٹریڈ یونین فقط معاشرتی مسائل میں ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ سیاسی مسائل میں بھی اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ٹریڈ یونینوں کی سیاسی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ جب قوم کے نمائندے دیکھیں گے کہ ان کی دولت و ثروت اسی پر ان کی زندگی و موت کا انحصار ہے ایک انصاف پسند ٹریڈ یونین تحریک کے ذریعے ہی ہو سکتی ہیں تو اس سے ساری قوم میں ایسا ہو کام کرنے کے لیے جذبہ و ولولہ کا جذبہ تقویت حاصل کرے گا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ٹریڈ یونینیں وہ بنیاد ہیں جس پر آئندہ قوم کی اقتصادی پارلیمنٹ کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس قومی اقتصادی پارلیمنٹ کی ترکیب تشکیل یہ ہوگی کہ پارلیمنٹ کے ممبر مختلف پیشوں اور حرفتوں کی جماعتوں کے نمائندے ہوں گے۔

سرکار پر قبضہ سے پہلے تجربہ کو اپنا کام پورا کرنا ہوگا

دوسرے سوال کا جواب دینا بھی آسان ہے۔ اگر ٹریڈ یونین تحریک ہم سے تو ظاہر ہے کہ قوم پرست شنرا ایک کل مسئلہ پر کوئی واضح موقف اختیار کرنا چاہیے۔ یہ موقف صرف نظری نہ ہونا چاہیے کہ عملی بھی ہونا چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس موقف پر عمل کیسے ہو؟ یہ سوال واقعی بڑا گہرا ہے۔

قوم پرست شنرا کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ قوم پرست شنرا کی قومی سرکار قائم کی جائے۔ اس لیے اس تحریک کو ہمیشہ یہ اصول اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ کہ ہر سرکار کے ہمہ گیر قائم ہونے کے ساتھ ہم جو مقصد قائم کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی بنیاد ہمیں آج تحریک کے مختلف شعبوں کی صورت میں تیار کر لینی چاہیے۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہوگی کہ صرف تعمیر ہی نہیں بلکہ یہ قوت حاصل کرنے سے پہلے ہم کی بنیاد کے

بالفعل ایک تنظیم بکھری کر رہیں گے۔ جو یہ نظام کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ جب تک
ہمارے پاس ایسے کارکنوں کا ایک ذخیرہ نہ ہو۔ خاص طور پر اگر یہ کام تحریک کی روح
کے مطابق انجام دیا جائے تو ایسی تربیت کی ضرورت اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ یہاں ہم
یہ اصول قائم کر سکتے ہیں کہ ہر کام میں وہ روح یا وہ جذبہ ہونا چاہیے یا تصور کیا جانا چاہیے
جس کے ماتحت کوئی کام انجام دیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے پیچھے صحیح
کی نیت محض ہونی چاہیے رکھنی ہے۔ کام کرنے کے ڈھنگ تو ایک ہم ورد دستور بنانے
کرنے کے بعد بڑی حد تک طے کیے جا سکتے ہیں لیکن حقیقی روح اور اصلی جذبہ پیدا
کرنے میں دیر لگتی ہے۔ یہ روح اور جذبہ محض ہم ورد دستور کی پابندی سے نہیں پیدا کیا جا
سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ایک قوم سیاسی لحاظ سے منظم ہے تو اس پر قیادت کا اصول
جبری اکثریت سے بالفعل نافذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس اصول کو ایک زندہ حقیقت بننا
تبھی ممکن ہو گا جب وہ تمام دل سے تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس کے بغیر اس اصول کی بھی
نشوونما نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں کہ سب سے پہلے ہر شہری کو اس اصول کے ماتحت
تربیت دینی ہو گی۔ سب سے اوپر سرکار کے پورے کل کو اس اصول کے مطابق ڈھالنا
ہو گا۔ قیادت کے اصول کی تبلیغ اور اشاعت کرنے کے لیے ایسے لوگوں کا ایک گروہ ہونا
چاہیے۔ جو سالہا سال آزمانے کے بعد منتخب کیا گیا ہو۔ ان لوگوں کو زندگی کی تلخ
حقیقتوں کے تجربے سے بالکل کارآمد ہونا چاہیے۔ ان لوگوں میں یہ طبیعت پیدا ہو گی کہ وہ
قیادت کے اصول پر عمل کر سکیں۔

حکومت "کمیں" سے نہیں ہوتی "تنظیم" سے ہوتی ہے

یہ سوال کہ اصول ہے کہ کسی سرکار یا "کمیں" کا کھا گھایا ایک مدت کے لیے ہی تخلیق میں
سے تحلیل کر لیا جا سکتا ہے۔ اور پھر سے "احکام جاری کرنے والی" کمیں ملک میں
نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے سوانگ رچائے تو جا سکتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ
ایسے تحلیل میں زیادہ دیر تک جاری رہنے کی طاقت نہ ہو گی۔ ایسا ہے روح "کمیں" اس

ہے کی مانند ہوگا جو بے جان مردہ ہو۔ ایسے آئین کے تصور سے آئین دانگر کی مثال دی جاتی ہے۔ اس آئین کی روح سے بھی تو یہی کوشش کی گئی تھی کہ ہر قوم کا ایک یا دستور حکومت ہو اور ایک ہی سرکاری جھنڈا مقرر کر دیا جائے۔ اس دستور حکومت اور سرکاری جھنڈے کا گزشتہ نصف صدی میں ہماری قوم کی تاریخ کے عروج و زوال سے کوئی رابطہ نہ تھا۔

قوم پرست سوشلزم کی سرکار اس قسم کے ناکام تجربے سے بچ نہیں سکتی ہے۔ یہ سرکار اس تنظیم کے بل پر قائم ہوگی جو خود عرصہ دراز سے کام کر رہی ہوگی۔ خود اس تنظیم کے اندر قوم پرست سوشلزم کی زندگی کی عملی مثالیں موجود ہوں گی۔ جب ایسی تنظیم کسی قوم پرست سوشلزم کی سرکار قائم کرے گی تو یہ سرکار ایک زندہ حقیقت ہوگی۔

پیشہ ورانہ پنچایتیں

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سرکار کا جو تانا بانا تیار ہوا ہے اس کے تحت ہی پیشہ ورانہ پنچایتوں میں موجود ہوں گے۔ ہر پیشہ ور برادری کے لیے جدا جدا قائم کی جائیں گی۔ یہ پنچایتیں ہی ذریعہ ہوں گی۔ جن کے ذریعہ ہی میں آنے والی سرکار کے ممکنات مضمر ہیں۔ پیشہ ورانہ بنیاد کے اصول پر ایک مرکزی اقتصادی پارلیمنٹ کا وجود آ جائے قوم پرست سوشلزم کی اور ہونا ہے تو لازم ہے کہ آج ہی اس ڈھانچے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی شاخ قوت پرست سوشلزم کی نظریہ حیات کی علمبردار ہو۔ ہماری تحریک کی آج کی شاخیں کل آنے والی سرکار کے خلیوں کی شکل اختیار کر لیں گی۔ سرکار ایک چھوٹے سے تو قائم نہیں ہو جاتی۔ وہ تمام ڈھانچے جو اوپر سے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ جن سے سرکار بنتی ہے۔ اگر یہ بنیادیں جاندار ہوں تو کسی طرح ہو سرکار بنتی ہے اس کے کھلے بے جان رہتے ہیں۔

اگر اس مسئلے کو وسیع تر زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم پرست سوشلزم کی تحریک کو خود پنچایتوں کے متعلق ایک واضح پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔

پیشہ ورانہ رفاقت نہ پیشہ ورانہ رقابت

قوم پرست اشتراکی تحریک کو بھی ایک مرحلے پر لبرل ڈیموکریٹس کے متعلق واضح پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔ وہ مرحلہ یہ ہے کہ جس مزدور، کسان دوستوں کو صحیح معنوں میں قوم پرست اشتراکی اصولوں کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم نے دونوں کو لکھا ہے کہ قومی نظام کے اندر رہتے ہوئے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہوگا۔ یہ تعلیم قومی اصول دان پالیسی اور دوسری تنظیموں سے نہیں دی جا سکتی۔ یہ تعلیم صرف ہمارے مزدور کی زندگی کی جدوجہد میں ہی دی جا سکتی ہے۔ تحریک کا فرض ہے کہ محنت کے ان دونوں اقتصادی طبقات میں یہ جذبہ پیدا کرے اس جذبہ کی تعلیم دے کہ ان مختلف طبقات کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ جب وہ قریب آجائیں تب پھر ان میں وحدت فکر پیدا کی جائے۔ جب تک یہ ابتدائی کام مکمل نہ ہو جائے تو یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ ہم صحیح معنوں میں قومی معاشرہ کا کوئی نظام قائم کر سکتے ہیں۔ ہماری تحریک کا فلسفہ حیات ایک عظیم نصب العین پیش کرتا ہے ہماری تحریک اس نصب العین کی خاطر جدوجہد میں مصروف ہے۔ اس نصب العین کو انتہائی فکری بنیادوں پر پانے کا کام آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جب ان بنیادوں پر انتہائی فکر پانے کا کام آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ جب ان بنیادوں پر انتہائی فکر مستحکم ہو جائے تو پھر بعض سے کہا جا سکے گا کہ یہ نظام مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ لہٰذا اس کے یہ نظام محض کھوکھلے کا کام ہوگا۔ اس بنا سے تحریک کے پیش نظر ہے کہ وہ لبرل ڈیموکریٹس کے تعلیمی کی جانب ایک مثبت روش اختیار کرے اور اس کی مخالفت نہ کرے۔ صرف مخالفت ہی نہ کرنا ہی کافی نہیں۔ تحریک کو اس سے آگے بڑھنا ہوگا۔ آج لبرل ڈیموکریٹس کے راکین اور معاونین کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ہماری تحریک کے لیے لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کو ایسی عملی تعلیم دے جس سے آنے والی قوم پرست اشتراکی سرکار کی تعمیر و ترقی میں پوری ہو سکیں۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب وہی ہے جو کہا جا چکا ہے اس سے

نہ ہو تو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

طبقاتی مصالحت نہ کہ طبقاتی جنگ

قوم پرست اشتراکی ٹریڈ یونین طبقاتی جنگ کی انکاری ہوتی۔ مارکسی ٹریڈ یونین کے مخالف ہڑتالوں اور تحریکوں کی مدد بھی ہوتی تھی۔ قوم پرست اشتراکی مزدور طبقاتی اختلاف کو تسلیم نہیں کرتی۔ جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، وہ ان مزدوروں کا صرف یہ تسلیم کرتی ہے کہ قوم کا ہر مزدور سرمایہ کار کے ساتھ ایک مساوی رتبہ رکھتا ہے۔ شہری ہے۔ ہر شہری کے حقوق یکساں ہیں۔ حقوق کی مساوات کی نسبت سے سب کے فرائض بھی یکساں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مارکسی مزدور یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ سرمایہ کار دوسرے شہریوں کے علاوہ کچھ ایسے حقوق بھی رکھتے ہیں جو کہ سرمایہ کار کے اوقات ملازمت میں، وہ نہیں رکھتے جنہیں کسی دوسری قسم کے یہاں حقوق حاصل نہیں ہوتے۔

قوم پرست اشتراکی تصورات کی رو سے ٹریڈ یونین کا یہ مقصد نہیں کہ قوم کی دولت پیدا کرنے کے ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ایک طبقے کی صورت میں دوسرے [illegible] طبقے کو دوسرے طبقے سے آزاد کیا جائے۔ وہ ان حالات میں سب طبقات قوم کی بہتری اور ترقی کے لئے مل جل کر کام کریں گے تو ان ٹریڈ یونین کے ذریعے تعاون کی [illegible] ہو جائے۔ ٹریڈ یونین کے ذریعے اسی کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ جب ٹریڈ یونین اور کسی قسم کے لوگوں سے ایک سرمایہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی ٹھان لی گئی۔ یہ تصورات ٹریڈ یونین کے مفاد، جو صرف یہی نہیں کہ مزدور سے طبقاتی جنگ کے ہتھیار کی حیثیت سے ہی استعمال کیا جائے۔ یہ قوم کی ترقی کے ذرائع سے ہو کر ایک طبقاتی جنگ میں ٹریڈ یونین کو بھی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہودیوں نے ٹریڈ یونین کو ایک اقتصادی تصورات کی شکل دے دی۔ یہودیوں نے ہی ملک و قوم کی جیت تھیوری کو آزادانہ اور خود مختار قومی سرمایہ کاری کی اقتصادی بنیادوں کو ختم کرنے کی خاطر استعمال کرتی ہے۔ یہودیوں نے ہی ملک و قوم کی جیت اور آزاد قومی سرمایہ کاری کی حیثیت کو ہم قومی

تجارت کی اجازت کے ذریعہ سے پورا کرتی ہے۔ اس کے بعد ان آزاد قوموں کو بیرونیوں کی عالمگیر مالیتی قوت کا غلام بنا دیا جاتا ہے۔ بیرونیوں کی یہ مالیتی قوت دنیا بھر میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ قومی سرکاروں کی مداخلت سے وہ اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

"مالک" اور "مزدور" دونوں قوم کے اعضا ہیں

برعکس اس کے قوم پرست شتراکی زیادہ تر اس کا قائل ہے کہ قوم کی اقتصادی زندگی میں حصہ لینے والے افراد کے جداگانہ گروہ منظم کر دیے جائیں۔ اس تنظیم کا منشا یہ ہو کہ قومی اقتصادی نظام کا بہتر طور پر تحفظ کیا جا سکے۔ قومی اقتصادی نظام کو برباد و منظم بنانے کے لیے اس کے اندر سے وہ تمام خرابیاں دور کر دی جائیں جو بالعموم آزاد قومی معاشرہ پر تباہ کن اثرات ڈالتی ہیں۔ ان خرابیوں سے قومی نظام کی قوت اور طاقت کو نقصان پہنچتا ہے۔ سرکار کی بیرونی اور مرضع مال میں خلل پڑتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خرابیوں سے خود اقتصادی زندگی ہی برباد ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قوم پرست شتراکی زیادہ تر بیرونی درآمد کے نظیر قوم کے کارخانوں میں مال کی پیداوار میں خلل ڈالنے کے لیے باگزیر پیدا کرنے کے لیے استعمال نہ کرے گی۔ ساری زیادہ تر توجہ اس کی صرف اس لیے استعمال کرے گی کہ قومی پیداوار بڑھائی جا سکے۔ قومی پیداوار کو بڑھانے کے لیے ان تمام خرابیوں کے خلاف جدوجہد کی جائے گی جو معاشرہ میں خلل پیدا کر کے کاروبار کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان خرابیوں اور ایسے خلل سے قوم کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ فرد میں کارگزاری کی اہلیت اسی حد تک پائی جاتی ہے۔ جس حد تک کہ فرد کو معاشرے میں حیثیت محفوظ ہوتی ہے۔ یا اقتصادی نظام کے ماتحت ہر فرد کے قانونی حقوق کا پورا کیا جاتا ہے۔ فرد میں کارگزاری کی قوت قائم رکھنے کے لیے ایک دوسری شرط یہ بھی ہے کہ ہر فرد کو یقین ہو کہ قوم اقتصادی طور پر خوشحال ہوئی تو قوم کے ہر فرد کو اس خوشحالی میں سے حصہ

ے گا۔

قوم پرست سوشلزم کو قبول کرنے والے مزدوروں کو یہ قربانی کرنا ہوگی کہ خود ان کی مادی خوشحالی قوم کی اقتصادی مرفع الحالی پر منحصر ہے۔

علی ہذا القیاس قوم پرست سوشلزم کو قبول کرنے والے مالکان کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کا وجود قائم رکھنے اور ان کی اقتصادی بہبود کو بڑھانے کے لیے مزدوروں کی خوشحالی اور اطمینان شرط اول ہے۔

مالک اور مزدور کے جھگڑے کس طرح طے ہوں گے

قوم پرست سوشلزم کی مزدور اور قوم پرست سوشلزم کی مالکان دونوں مل کر ساری قوم کے لیے کام کرنے اور کمانے پر تیار ہوں گے۔ ان دونوں گروہوں کو بڑی حد تک ہڑتال کی آزادی دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ جس حد تک انفرادی آزادی دی جائے اتحادی فریق کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ برعکس اس کے کہ جس حد تک فرد پر جبری اتحاد کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ مزدوری میں انفرادی آزادی سے ان اندرونی عوامل کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے جو قابل ترین اور محنتی ترین مزدور سے زیادہ محنت کرنے والے شخص کو ترقی دے کر دوسروں سے بالاتر بنا دیتے ہیں۔ غرض قوم پرست سوشلزم کی نظر میں کسی کے نزدیک ہڑتال محض حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہیں۔ یہ ذریعہ اس وقت تک استعمال کرنا جائز ہے کہ جب تک قوم پرست سوشلزم کی سرکار قائم نہیں ہو جاتی۔ جب قوم پرست سوشلزم کی سرکار قائم ہو جائے گی تو دونوں اور مزدوروں کے دونوں گروہوں میں عام جدوجہد کے امکانات از خود ختم ہو جائیں گے۔ ان دونوں طبقات کے تصادم سے بہبود قومی پیدا اور قومی معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کا باعث تسلیم کر کے قوم پرست سوشلزم کی سرکار ہر فریق کے حصول کی حفاظت اور ہر فریق کی گلہ داشت خود اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ وہ اس اقتصادی بار کو اٹھا سکتا ہے اس کا فرض ہوگا کہ قوم کے اقتصادی نظام کو چلتا رکھے اور اس میں جو نقص یا

عمارت کھڑی کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اگر کسی صنعت میں کوئی خاص کاروبار پہلے سرے سے موجود نہیں تو وہاں کوئی مخلص بڑی آسانی سے یہ کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی علاقہ میں ایک کاروبار پہلے سے چل رہا ہے تو پھر اس قسم کا دوسرا کاروبار کرنا دشوار ہو گا۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ اس رقبہ میں اس قسم کے ایک ہی کاروبار کی گنجائش ہو تو پھر یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ نئے کاروبار چلانے والوں کو یہ صرف اپنا کاروبار چلانے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ بلکہ علاقہ میں جو کاروبار پہلے سے موجود ہے۔ اس کو ختم کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے جب تک پہلا کاروبار ختم نہ ہو دوسرا کاروبار کیسے چل سکتا ہے۔

نئی انجمن کے ساتھ نئے جذبہ کی بھی ضرورت ہے

اگر دوسری ٹریڈ یونین نے چلتا رہنا ہے تو اس کے پہلو بہ پہلو ایک قوم پرست شترانی ٹریڈ یونین چھوڑ دینے سے بھوتو کا مقصد حاصل نہ ہو گا۔ قوم پرست شترانی ٹریڈ یونین بنانے کا مقصد تبھی ہو سکتا ہے جب اس ٹریڈ یونین میں ایک انقلابی اور ایمانی جذبہ سرایت کر جائے کہ اپنے نظریہ فرائض کو ضرور پورا کرنا ہے۔ اگر یہ انقلابی اور ایمانی جذبہ ہو جائے تو اس کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہو گی کہ اس قسم کی یونین سے ملتی جلتی کوئی مخالف تنظیم باقی نہ رہنے دی جائے۔ ایسی ٹریڈ یونین کے لیے یہ اصرار کرنا لازم ہو گا کہ صرف اسی ٹریڈ یونین کی ملازمت ہو۔ اس کی کوئی حریف تنظیم باقی نہیں رہنی چاہیے۔ ایک دوسرا باوار تجویز کا خود بخود خاتمہ کرے گی۔ اس کا تقاضا یہ ہو گا کہ صرف اسی کو باقی رکھا جائے اور باقی سب کو ختم کر دیا جائے۔

مندرجہ بالا مقصد دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے

۱۔ ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم ایک ٹریڈ یونین قائم کریں اور پھر رفتہ رفتہ مارکس ازم کی حامی یعنی انقلابی ٹریڈ یونین سے مقابلہ شروع کریں۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے ہم مارکس ازم کی حامی یعنی انقلابی ٹریڈ

ہو گئی ہیں داخل ہو جائیں اور اس میں ایک نئی روح پھونک دیں۔ بہت ہو گا اس پر ہائی
ٹریڈ یونین کو ایک نئے مقصد کے حصول کے لیے متحرک کرنا ہے۔

مزدوروں کو مالی امداد کی حاجت ہے

پہلا طریقہ تو اس لیے اور بھی مناسب حال نہ تھا کہ ان دنوں ہماری مالی حالت
اچھی نہ تھی۔ ہماری مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ اس کے باعث ہمیں تشویش
لاحق ہو رہی تھی۔ ہمارے آمدنی کے ذرائع بہت کم ہو گئے تھے۔ جس سکے کی قوت خرید
گرنے کا رجحان ہر طرف پھیل رہا تھا۔ اس سے ہماری مالی مشکلات اور بھی بڑھ گئی
تھیں۔ ان دنوں ٹریڈ یونینیں اپنے اراکین کی کوئی خاص مدد نہ کر رہی تھیں۔ جب ٹریڈ
یونینیں اپنے اراکین کو مالی امداد دیتی تھیں۔ تو اراکین کی یہ ٹریڈ یونین کو چندہ دینے
میں دلچسپی کم ہو جاتی تھی۔ مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینیں جو پہلے سے موجود تھیں ان کا حال بھی بتا ہو
رہا تھا۔ وہاں جب ہڑتالوں کے دوران میں ایک نئی پالیسی اختیار کی تو مارکس ازم کی
حامی ٹریڈ یونین کے خزانہ میں لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔ ہڑتال کے وقت تک ان سرکاری
مزدور تنظیم تھے۔ نام کو تو وہ قومی سبوتاژ کہلاتے تھے لیکن تاریخ میں ان کا تذکرہ آئے گا تو
یہی لکھا جائے گا کہ جب مارکس ازم کی حامی ٹریڈ یونینوں کا حال پتلا ہو رہا تھا تو ہڑتالوں کی
پالیسی کے طفیل ان ٹریڈ یونینوں کی مالی حالت بہتر ہو گئی۔

ہم اس قسم کی مالی سہولتیں فراہم ہو جانے کی توقع نہ رکھ سکتے تھے۔ پھر ایک نئی
ٹریڈ یونین میں کوئی شخص کیوں داخل ہوتا ہے جو اپنی مالی کمزوری کے باعث اس کی کوئی
امداد نہ کر سکتی تھی۔ میں نے ان حالات میں یہ فرض کیا کہ نئی تنظیم بنانے کا کوئی
فائدہ نہیں۔ نئی تنظیم میں تو وہی لوگ شامل ہوں گے جو کوئی کام کاج نہیں کرتے اور جس
طرح گھوڑے ہوا کھاتے رہتے ہیں۔

ہر کام کے لیے ایک رہنما چاہیے

ان دنوں کسی قسم کے رضاکار حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس لیے ایک بڑا اہم مسئلہ

ہیں پایا تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہیں تھا جسے یہ ہمکار سونپا جا سکتا۔ اس وقت کے حالات میں جو شخص مارکس ازم کی حامی پولیس تشکیل کرنے کی اس کی جگہ قوم پرست اشتراکیوں کے انتظامی نظام کے حلقہ کو رائج کر سکتا تھا اور ہماری قوم کی تنظیم پولیس میں شمار کیے جانے کے قابل ہوتا۔ انتظامی نظام کے حلقہ کا مقصد یہ ہے کہ دفاعی طاقت کی ہر اس جنگ لڑنے کے لیے جو دفاعی نظام رائج کیا جائے۔ جو شخص یہ کارنامہ سر انجام دے سکتا اس کا مجسمہ بزرگ کے وسیلہ میں نصب کیا جانا چاہیے تھا تاکہ آئندہ نسلیں ہمیشہ سے ذریعہ عقیدت پیش کریں۔

میرے علم میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو اس مرحلہ پر کام کے جانے کے قابل ہوتا۔

حملہ کے لیے مدافعت سے زیادہ طاقت درکار ہوتی ہے

یہ درست ہے کہ ہمیں دفاعی لڑائی نہیں چاہیے والے لوگ بڑی معمولی ذہنیت کے انسان ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمیں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ معمولی قابلیت کے باوجود ان میں دفاعی جنگوں کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب یہ جنگیں عوام ہوئی تھیں تو تب ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اس قسم کی دوسری کوئی چیز موجود نہ تھی۔ برعکس اس کے اگر آج ہم قوم پرست اشتراکی تحریک کوئی نئی چیز قائم کرنی ہے تو ہمیں ایک نئی دنیا تنظیم سے نکر لینا ہوگی۔ جرمنی سے کام لڑنا ہے اس دنیا تنظیم کی بنیادیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ دنیا تنظیم اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تنصیبات بھی طے پا چکی ہیں۔ اگر کوئی حملہ آور کسی مدافعت کرنے والے کو شکست دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ مدافعت کرنے والے سے زیادہ طاقت کا ثبوت دے۔ یہ درست ہے کہ مارکس ازم کی حامی پولیس نے اپنی حفاظت کے لیے جو قلعہ تعمیر کیا ہے آج کل اس کا چلانا معمولی ذہانت رکھنے والے قائدین کے بس کا نہیں ہے لیکن اس قلعہ کو فتح کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے وہ طریقہ ہے کہ ان تھک محنت اور ریاضت سے کسی غیر معمولی قابلیت کے، لیڈ کا ایسے

ماحت اس پر حملہ کیا جائے۔ اگر اس کا مقابلہ میسر نہ آسکے تو پھر وہ جدوجہد کرنا فضول ہوگا۔ اگر ایسا مقابلہ میسر نہیں آسکتا تو پھر جو کچھ ظلم میں کمی ہے اسے برداشت کرنا چاہیے۔ جو کچھ موجود ہے جب اس سے بہتر نظام قائم کرنے کی طاقت ہم میں نہیں تو پھر موجودہ نظام کو برباد کرنا سراسر حماقت ہوگی۔

کوئی کام ادھورا کرنے سے بہتر ہے کہ نہ کیا جائے

یہاں میں زندگی کا ایک اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ اصول ہے کہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی کام کو ترک کر دیا اس کام کو کرنے کے طریقے سے اچھا ہونے کے مقابلہ میں بہت ہوتا ہے۔ جب کوئی مقصد اچھا ہونے کے وسائل میسر نہ ہوں تو پھر اس مقصد میں ہاتھ ڈالنا اس مقصد کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔

سیاسی مسائل کا حل اقتصادی جدوجہد سے پہلے کرنا چاہیے

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ یہ بات محض کہنے کی نہیں بلکہ ہر محل میں ہوتا چاہیے۔ اس دور میں میرا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ جب کوئی شخص سیاسی میدان میں کسی عظیم الشان اقتصادی جدوجہد کا اہتمام کرے یا وہ پھر کسی جدوجہد کے آثار میں کسی اقتصادی اور مالی معاونت کو اپنی جدوجہد کا محور بنا دینا مناسب نہیں ہوتا۔ یہ اصول ہر ملک اور ہر قوم کے بالخصوص حالات ہوتا ہے۔ اگر اس اصول پر عمل نہ کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جو قوت سیاسی جدوجہد میں صرف ہوتی ہے وہ اقتصادی مہم میں لگی ہونے لگے گی۔ اور لوگوں کو جیلیں ہو جائیں گی کہ وہ اپنی ذاتی جائیداد سے رقوم کا انتظام کر کے سرمایہ کو مکان بنا سکتے ہیں تو پھر وہ جائیداد کرنے کے اہتمام میں ایسے منہمک ہو جائیں گے کہ سیاسی جدوجہد کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غاصب لوگ کسی نہ کسی بہانے بس سیاسی اقتدار پر قائم ہو جائیں گے۔ اور اپنی پوزیشن کو اتنا مضبوط کر لیں گے کہ ایک بڑی مدت ان غاصبوں کے قبضہ میں رہے گی۔ عوام کو اس واقعات اور حالات کے پیش نظر یہ آمادہ کیا جائے کہ وہ ان سے منحرف ہو کر

مصالحت کی کوششوں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ اس کام کا یہی جدوجہد ایک طرف
باقاعدہ ہو جائے گی اور دوسری طرف اقتصادی مقصد بھی حل ہو گا۔

اوقاتِ فراغت نہ ہو تو اقتصاد بھی بگڑ جاتا ہے

آج قوم پرست سنٹرل کی تحریک کی جدوجہد کا آغاز ہے۔ ابھی اس تحریک کی پوری
توجہ اپنے اوقاتِ فراغت کو تصورات کی تکمیل پر صرف ہونی چاہیے۔ تحریک کی تمام قوت
اس جدوجہد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ تحریک کا نصب العین مقبولِ عام ہو جائے۔ یہ کوشش
اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ تحریک کی تمام قوتیں اس ایک مقصد کے
حصول کی خاطر جمع نہیں کر لی جاتیں۔

آج ترکی کی جو حالت ہے وہ اس اصول کو ثابت کرنے کی بہترین مثال ہے کہ جب
کوئی قوم بیک وقت اقتصادی مسائل حل کرنے میں منہمک ہو جائے تو پھر اس قوم کے قویٰ
عمل میں کس طرح شل ہو جاتے ہیں۔ قوموں کی طاقت ان کے اوقاتِ فراغت اور
تصورات پر منحصر ہوتی ہے۔ جب اوقاتِ فراغت میں خلل پیدا ہو جائے تو خیالی اقتصادی
جدوجہد ہرگز سودمند ثابت نہیں ہوتی۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں جو تقسیم ہندوستان تھا اس سے وہاں کے ذہین لوگوں نے فائدہ اٹھایا
تھا۔ ذہین لوگوں نے تو اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ باوجود اس کے انقلابات
برپا ہو کر رہا۔ ترکی کے باشندے اپنے ملک کا سنٹرل مقصود رکھنے کی خاطر کوئی سیاسی
جدوجہد نہ کر سکے۔ وہ یہی سیاسی جدوجہد ہے اس پر زور دینے کی کہ انہیں خیال تھا کہ
محض اقتصادی دائرہ عمل میں تعمیری جدوجہد جاری رکھنے سے ملک کا سنٹرل بھی محفوظ کیا
جا سکتا ہے۔

سیاسی قوت نافذ کے حصول سے قبل معاشرتی اصلاح ممکن نہیں

اس تجربہ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے یہی روش اختیار کی تو ہمارا
بھی یہی انجام ہوگا۔ جب ہماری تحریک کی پوری توجہ سیاسی جدوجہد میں صرف ہو گی

تو ہم اپنی سیاسی جدوجہد میں زیادہ بہتر ہونے کے حق دار ہوں گے۔ اگر ہم نے سیاسی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لی تو پھر ہمیں ہر محاذ پر فتح ہوگی۔ برعکس اس کے اگر ہم فی الوقت ٹریڈ یونین کے مسائل میں الجھ کے رہ گئے اور ہمارے دوست اور دشمن کے مابین امتیاز تلاش کرنے لگے تو بحیثیت مجموعی ہمیں نقصان پہنچے گا۔ یہ درست ہے کہ ٹریڈ یونین کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ لیکن خود اس مسئلہ کا کلی حل بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب سیاسی طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے جب سیاسی طاقت ہمارے ہاتھ میں ہوگی تو ہم ٹریڈ یونین کے متعلق بھی اپنے نظریات کو نافذ کر سکیں گے۔ جب تک ہمیں سیاسی قوت حاصل نہیں ہو جاتی۔ ایسے مسائل میں الجھنا سوائے تحریک کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے اور کچھ نتیجہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم فی الوقت ٹریڈ یونین کے مسئلہ میں الجھ گئے تو تحریک کا اصل مقصد ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ممکن ہے کہ ٹریڈ یونین کے مقاصد تحریک کے سیاسی پروگرام پر غالب آ جائیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ تحریک کی اقتصادی مصلحتیں ٹریڈ یونین پر غالب رہیں۔ ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں صرف اس مقصد سے ہونی چاہیے کہ تحریک کے اقتصادات کو فروغ حاصل ہو۔

تحریک کو اجتماعی رفاقت نہیں بلکہ اقتصادی ایمان کی حاجت ہے

تحریک اور قوم کو ایک قوم پرست سوشلسٹ ہی ٹریڈ یونین کی تنظیم سے صرف اسی صورت میں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کہ ٹریڈ یونین مکمل طور پر قوم پرست سوشلسٹ کی اصول پر عامل ہو۔ جب تک ٹریڈ یونین مکمل طور پر قوم پرست سوشلسٹ کی اصول قبول نہ کرے گی تو اس کا خطرہ باقی رہے گا۔ کہ کسی نہ ٹریڈ یونین مارکسی رنگ کی تحریک کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔ ایک ایسی قوم پرست سوشلسٹ کی ٹریڈ یونین جو اپنے آپ کو نظریاتی مارکسی رنگ کی حامی ٹریڈ یونینوں کی حریف سمجھے اگر سرے سے قائم نہ کی جائے تو بہتر ہوگا۔ قوم پرست سوشلسٹ ٹریڈ یونین کو مارکسی رنگ کی حامی ٹریڈ یونین سے صرف اس طور پر حریف الجھن کے نہیں لڑنا۔ بلکہ اس کی جنگ کی بنیاد تو اقتصادی ہونی چاہیے۔ قوم پرست ٹریڈ یونین اس لیے مارکسی رنگ

کی عام ذہنی سطح سے اتر جائے گی کہ وہ انقلابی روایات اور انقلابی جنگ کے تصورات کی حمایت کرے گی۔ انقلابی تصادم کے نقطہ نظر سے یہ عکس قوم پرست ذہنی یونین کا اصول یہ ہوگا کہ قوم کے اندر بڑے پیشے اور بڑی حرفت سے تعلق رکھنے والے افراد کے مفادی گروہ کی حمایت کی جائے۔

جو کام نہ کر سکتے ہوں اس میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیے

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری جماعت کا ذہنی یونین قائم کرنا اب مناسب خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ جب تک کوئی ایسا مخلص اور محنتی کارکن نہیں آ جاتا جو قوت لے یہ مسئلہ حل کرنے کی خاطر پیدا کیا ہو۔ تب تک مجھے اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔

یہ موقف اختیار کرنے کے بعد صرف دو راستے کھلے تھے یا تو ہم اپنی تحریک کے رکن کو ہدایت کرتے کہ وہ ان ذہنی یونینوں میں شامل نہیں ہوں یا پھر ہم انہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ ان ذہنی یونینوں میں شامل ہیں مگر عرصہ انہیں میں داخل رہیں تاکہ جہاں تک ہو سکے ان کے اندر خلل پیدا کیا جائے۔

عام طور پر میں نے یہی مشورہ دیا تھا کہ دوسرا راستہ اختیار کیا جائے۔

۱۹۳۲-۱۹۳۳ء کے درمیانی سال میں یہ روش اختیار کرنا ہمارے لیے نسبتاً آسان تھا۔ ان دنوں ذہنی یونین کی قوت گر چکی تھی۔ اس لیے ذہنی یونین میں شامل ہونے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ حاصل نہ ہو رہے تھے۔ ہماری تحریک کا بھی آغاز تھا۔ لہٰذا ہمارے ارکین کی تعداد بھی تھوڑی تھی۔ ان حالات میں ہم اگر علیحدہ ذہنی یونین بنا لیتے تو اس سے ہمیں بہت نقصان پہنچتا۔ ہماری تحریک کے اصل ارکین جداگانہ ذہنی یونین بنانے کے حق میں تھے۔

جو انجمن ارا کین کی مدد نہیں کر سکتی اسے چندہ بھی نہ لینا چاہیے

نئی ذہنی یونین بنانے کا منصوبہ پیش کرنے سے قبل میں نے کئی کام کیے۔ اس لیے میں

نے اس قسم کا کوئی تجربہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کسی مزدور کی غریبانہ آمدنی میں سے چندے کی ایک ایسی انجمن بنانا جو مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنے اراکین کی خدمت نہ کر سکے گی میرے نزدیک ایک مجرمانہ حرکت ہوتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اگر ایک نوزائیدہ سیاسی پارٹی ختم ہو جائے تو اس سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو تو فائدہ پہنچتا ہے۔ بہرحال کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی پارٹی کو ختم ہو جانے کے خلاف شکایت کر سکے۔ ایک سیاسی تحریک کا ہر رکن اس تحریک کو جو کچھ دیتا ہے بھول کر دیتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ برآمد نہ ہو اور اس کی قربانی رائیگاں ہو جائے۔ لیکن اس کے سبب کوئی شخص انجمن کا چندہ ادا کرتا ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے عوض اسے یہ خدمات بھی ملنی چاہئیں کہ مشکل وقت میں اس کی مالی مدد کی جائے گی۔ اگر ایک تربیتی انجمن مشکل وقت پڑنے پر اپنے اراکین کی مالی مدد نہیں کرتی تو ایسی تربیتی انجمن فریب کاروں کی ایک انجمن ہے۔ اگر وہ فریب کاروں کی انجمن نہیں تو کم از کم اس انجمن کے کرتا دھرتا ایسے نااہل لوگ ہیں جنہیں ان کے فرائض کی انجام دہی کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

جلد بازی کا انجام اچھا نہیں ہوتا

۱۹۲۶ء میں اس مسئلہ کی بابت فیصلہ کرتے وقت ہم نے ان تمام باتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ بعض دوسرے لوگوں نے ہم سے اختلاف رائے کیا اور تربیتی انجمنیں بنا ڈالیں۔ وہ لوگ ہمیں طعنہ دیتے تھے کہ ہم لوگ نظریں اور مشقتیں کے مکانات سے بے خبر ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد یہ تربیتی انجمنیں ختم ہو گئیں۔ اگر ہم نے تربیتی انجمنیں بنائی ہوتیں تو ہمارا بھی یہی حشر ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہوتا کہ ہم راستہ اختیار کرتے تو اپنے اراکین کو دھوکہ دیتے اور خود اس مسئلہ کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔

☆☆☆

باب سیزدہم :: پہلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی حلیفوں کی بابت جرمنی کی پالیسی

غیر ہمدرد عزیز حکمران اچھے بیرونی حلیف نہیں ڈھونڈ سکتے

جرمن سلطنت کی خارجی حکمت عملی ایک عجیب نرالے طریقہ سے چلائی جاتی تھی۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ خارجی حکمت عملی کسی معقول اصول پر مبنی نہ تھی۔ دوسری قوموں سے حلیفانہ تعلقات یا معاہدات محض عملی اور مفید اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں۔ یہ بات انقلاب کے بعد بھی ہوتی رہی۔ بلکہ انقلاب کے بعد صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ جنگ سے پہلے ہمارے سیاسی تصورات کی بنیاد یہ تھی کہ جن مدبرین کے ہاتھ میں ہماری حکومت کی باگ ڈور تھی وہ نااہل تھے۔ لیکن جنگ کے بعد حکومت کی عنان روس کی ہو گئی کہ حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ دیانت اور خلوص سے بے بہرہ تھے۔ جن سیاسی بھلائیوں نے ہمیں جنگ مقاصد اتحاد کے ذریعے حاصل کیے تھے ان کو ہم پسند کرتی تھیں کہ جرمنی کا کسی بیرونی قوم سے کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک مطلق العنان اور آزاد جرمن سرکار برسر کار کام ہو جائے۔ ایک مطلق العنان اور آزاد جرمن سرکار جو ہمارے ہوتے ہوئے لوگ پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے انقلاب برپا کرنے سے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ جب سرکار قائم ہو جاتی تو جرمنی کا قومی اقتصادی نظام اور جرمنی کے مزدور ہمیں بین الاقوامی حالتوں کے بیکار نہ رہنے دیتے اس سے یہ امید ہوتی تھی کہ اگر جرمن سرکار دوسرے ملکوں کے اثر سے آزاد ہو گئی تو شاید اس کا اثر خود جرمنی کی داخلی سیاسیات پر بھی پڑے۔ داخلی سیاسیات میں یہ تبدیلی ان لوگوں کے لیے بہتری کا پیغام تھی جو آج کل جرمنی کی حکومت سنبھالے ہوئے ہیں۔

خارجی وقار سے پہلے داخلی اتحاد لازم ہے

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم جبر کے گڑھے سے نکل کر آزادی کی بلندی پر پہنچ جائے اور یہ ہونے سے پہلے خود قوم کے اندر وہ پرتی کا جذبہ بیدار ہو چکا ہو۔ پہلے کوئی قوم داخلی طور پر متحد ہوتی ہے تب اسے خارجی عروج حاصل ہوتا ہے۔ خارجی حکمت عملی میں ہر کامیابی سے داخلی استحکام کو تقویت پہنچتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب کوئی قوم غلامی سے نجات سے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس میں قوم پرستی کا جذبہ پہلے سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے اور قوم کا احساس خود شناسی سے پہلے بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصول آزادی کی کوشش کے دوران میں ہمسایہ قوم راستہ کا جو رویہ سختی سے کیا جاتا ہے۔ وہ بعد قومی مفاد کے خلاف کسی جرأت کے مرتکب ہوں انہیں معاف نہیں کیا جاتا۔ ان کے رویہ میں کمی ایسے اخلاص کی ہمسایہ قوم حرکات اور مفاد قومی کو نقصان پہنچانے والے کسی امور برداشت کر لیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن جب قوم پرستی کے جذبات بیدار ہو چکے ہوں تو ایسے اخلاص ہمدردی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ظلم ظلم کرنے کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جب تک ان سے نجات حاصل نہ کر لی جائے۔ تب تک دم نہیں لیا جاتا۔ اس سلسلہ میں جنگ جیتنے کے بعد ہر جگہ اس طرح دشمن کے جاسوسوں کی موجودگی کا وہم پایا گیا تھا اور اس وہم نے لوگوں کی عقل اختیار کر لی تھی وہ بہت سچی امور ہے۔ عوام کے جذبات برانگیختہ ہو چکے تھے۔ ایسے ایسے واقعات رونما ہونے لگے کہ ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ظلم توڑنے کے کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ زمانہ امن میں جاسوسوں سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کے زمانہ میں جاسوسوں پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جنگ کے دور میں قومی جذبات زیادہ مشتعل ہوتے ہیں۔

مت کش حکمران کامیاب خارجہ حکومت عملی نہیں چلا سکتے

نومبر کے انتخابات کے بعد جن سرکاری گھرانوں نے حکومت پر قبضہ جما رکھا ہے اس

قوم کے سربراہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر جرمنی کا نظام ایسی طاقتوں سے قائم ہو گیا جن کے خلاف سے جرمنی کو آزادی مل سکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ملک میں قوم پرستی کے جذبات کو فروغ حاصل ہو گا۔ جرمنی میں قوم پرستی کا اساس نظریات پر گیا تو خود ان محرموں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۱۸ء کے بعد ان لوگوں نے حکومت پر قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ جرمنی کے تعلقات خود اپنے کے متعلق کوئی مثبت حکمت عملی تیار نہیں کرتے۔ حکومت کا کاروبار اس طرح چلایا جا رہا ہے جس سے جرمن قوم کے مفاد پامال ہو رہے ہیں۔ یہ کاروائی کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی جا رہی ہے۔ شروع شروع میں تو لوگوں کا خیال تھا کہ حکومت کی یہ پالیسی محض اتفاقی حالات کا نتیجہ ہے۔ لیکن معاملہ کی چھان بین کی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے ماہ نومبر میں جو راستہ اختیار کیا گیا وہ قوم کی غلامی حکمت عملی اس کا منطقی نتیجہ ہے۔

یہی غلامی حکمت عملی کے لیے ہماری قوم کے تین مختلف عناصر ذمہ دار ہیں۔ ان عناصر کی ذمہ داری یکساں نہیں۔ پہلا عنصر تو وہ لوگ ہیں جو براہ راست نظم و نسق چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ یا جن کو سرکاری نظم و نسق چلانے کا ذمہ دار رکھا گیا ہے۔ دوسرا عنصر بار سے عوام یا کنزرویٹو سیاست دان لوگ ہیں۔ تیسرا عنصر ہماری قوم کے عوام ہیں۔ ان کی کچھ اپنی اور معصومانہ غلطیاں ہیں۔

پہلا عنصر جو کچھ کرتا ہے جان بوجھ کر کرتا ہے۔ دوسرا عنصر پہلے عنصر کی معاونت کرتا ہے۔ اس معاونت کی وجہ یا تو یہ ہے کہ شروع ہی سے انہیں رائج الوقت تصورات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس حکمت عملی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی مخالفت کرنے کی ان میں جرأت اور ہمت نہیں تیسرا عنصر اس لیے یہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے کہ ان میں کسی بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔

اندرونی اصلاح کے بغیر بیرونی فتح حاصل نہیں ہوتا

ایک وقت تھا جب ہماری قوم پر ست اشتراکی مزدور پارٹی ایک چھوٹی سی کمزور انجمن تھی۔ اس زمانہ میں اس پارٹی کے کئی ارکین کے ذہن میں ایک خاری حکمت عملی محض خانوں بیٹھ رہی تھی۔ ان ارکین کی اس رائے کی وجہ یہ تھی کہ ہماری تحریک نے شروع سے خاری حکمت عملی کے متعلق ایک اصول تسلیم کر رکھا تھا۔ وہ اصول نہایت ضروری ہے۔ اصول یہ ہے کہ کسی ملک کی خاری حکمت عملی کو طبقوں کی خاص سے آزاد رکھنا کوئی ایسا نظام یا تنظیم جو آسانی سے ہم پر وارد ہو جائے۔ بار بین کی کوئی حکومت ایسی نہ ہو۔ خاری تعلقات میں مطلق العنانی خود اپنی خود ہی اتھارٹی کو شوہ دینے سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پہلے ہمیں وہ اسباب دور کرنے ہوں گے جو ہمارے تنزل کا باعث بنے۔ اسباب کو دور کرنے کے بعد ہمیں ان لوگوں سے نجات حاصل کرنی ہوگی جو ہمارے راستے سے خود ہٹ رہے ہیں۔ جب یہ دونوں مرحلے طے ہو چکے ہوں گے تبھی ہم اس قابل ہوں گے کہ خاری تعلقات میں خود مختاری حاصل کرنے کی نظر جدوجہد کر سکیں۔

مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں یہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ پچھلی نوزائیدہ تحریک کی جانب میں ہم خاری تعلقات کو زیادہ اہمیت کیوں نہ دیتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ہم اپنی توجہات داخلی اصلاح پر مرکوز رکھتے تھے۔

خارجہ پالیسی پختہ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے

رفتہ رفتہ جب ہماری چھوٹی سی اور حقیر سی انجمن وسعت حاصل کرتے کرتے اتنی بڑھ گئی کہ شروع میں اس کی جو بنیادیں رکھی گئی تھیں ان میں بھی توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ایک نوزائیدہ تنظیم ایک زبردست جماعت کی شکل اختیار کر چکی۔ تو ہم نے پھر یہ فرض سمجھا کہ خاری حکمت عملی کے کچھ بنیادی اصول وضع کیے جائیں۔ ایک طرف تو یہ اصول ہمارے ضابطہ حیات کے مطابق ہوتے ہوں۔ دوسری طرف یہ ضروری تھا کہ یہ اصول ایسے ہوں جن پر خاری تعلقات کی واقعی دنیا میں عمل کیا جا

سکے۔

ہماری قوم کو خارجی تعلقات کے مسئلہ میں بالکل یہی تربیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کے مختلف شعبوں کے قائدین اور عوام کو وہ اصول سمجھانے کی ضرورت ہے۔ جس پر ہماری خارجی حکمت عملی ہوگی۔ خارجی حکمت عملی کو کامیابی سے چلانے کے لیے یہ پہلا قدم ہوگا۔ یہ تکمیل تک پہنچانا خارجی تعلقات کے بعد ہی وہ خارجی حکمت عملی تشکیل کی جاسکتی تھی۔ جس سے قوم اپنے خارجی تعلقات خود طے کرنے کی آزادی حاصل کرلے۔ جب تک ہم اپنی خارجی حکمت عملی خود طے نہیں کرتے تب تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہمیں سرکار مکمل طور پر آزاد ہے۔

خارجی حکمت عملی ایک وسیلہ ہے کوئی مقصد نہیں

اس مسئلہ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ایک بنیادی اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ اصول یہ ہے کہ خارجی حکمت عملی ایک ذریعہ ہے کوئی مقصد نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہمیں قوم کی بہتری کا انتظام کیا جائے خارجی حکمت عملی کا ہر مسئلہ اسی زاویہ نگاہ سے اور صرف اسی زاویہ نگاہ سے طے ہونا چاہیے۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ اس عمل اختیار کرنے سے ہماری قوم کو فائدہ پہنچے گا یا یہ عمل نقصان رساں ثابت ہوگا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کا بنیادی گر یہی ہے۔

اس مسئلہ کا حل تلاش کرتے وقت ہمیں دنیا کے اصول سامنے رکھنا چاہیے۔ سیاست کے اندر دنیا کی سیاسی تاریخ کے مختلف ادوار میں خارجہ تعلق کے اصول یہ اور اس قسم کے دیگر عوامل قوم کو فائدہ پہنچانے کے لیے قربان کیے جاتے رہے ہیں۔

خارجہ پالیسی قوم کی خاطر ہے قوم خارجہ پالیسی کی خاطر نہیں

جب تک ہماری قوم میں خارجہ حکمت عملی کا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہماری قوم اور اس کے نوجوانوں کو زندہ رکھنے کے لیے جو مادی سازوسامان درکار ہے وہ کس طرح فراہم کیا جائے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ درکار ہوتا ہے اسے اختیار کیا

جاتا۔ ان میں اقتصادی طبقوں سے معاملے کرنے چاہئیں تھے جو اس زمانہ سے
ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے۔ ایسے حلیف پر فوج بھیج کر ہم اس کی مدد
کرتے یا اس سے ساتھ تعاون کرتے آج بھی نسب العین تو وہی ہے لیکن آج ہمیں
ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا ہے جنگ سے پہلے سوال یہ تھا کہ جرمن قوم کو زندہ رکھا
جائے جرمن قوم کو اس وقت تک جو منضبط ہو آزاد سرکار میسر تھی اور جو جرمن قوم کے
تحفظ کی ضمانت تھی اسے چھوڑا جائے۔ آج ہمارا مقصد یہ ہے کہ پہلے ایک آزاد و منضبط
سرکار دوبارہ قائم کی جائے۔ پھر اسی سرکار کی مدد سے اپنی قوم کو دوبارہ طاقت ور بنایا
جائے۔ جب تک ہی سرکار قائم نہیں ہو جاتی تب تک کسی ایسی ناپید حکومت عملی کے
تعین کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس سے ہماری قوم کا مستقبل محفوظ کیا جا سکے۔ یا
اس کی ضروریات زندگی انہیں بہم پہنچائی جا سکیں۔

بالفاظ دیگر آج جرمنی کی ناپید حکومت عملی کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ کل اپنی کھوئی
ہوئی آزادی واپس حاصل کی جا سکے۔

قوم آزاد ہو گی تو ملک بھی آزاد ہو جائے گا

اس ضمن میں ایک بنیادی اصول یہ ہے جو ہمیں ہر وقت اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔
وہ اصول یہ ہے کہ کسی قوم کی آزادی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ اس قوم کے پاس جتنا
علاقہ تھا وہ سارا واپس حاصل کیا جا سکے۔ اگر کم از کم رقبے پر بھی عوام اور سرکار کی آزادی
کو بحال کیا جا سکے تو اس کی بنیاد پر باقی ماندہ علاقہ بھی واپس لیا جا سکتا ہے جو رقبہ حاصل ہے وہ کتنا تھوڑا ہے
اس کا صرف یہ ہے کہ اپنے علاقے کے اندر اس کی سرکار کو پوری آزادی حاصل ہو تاکہ یہ
سرکار ساری قوم کے جذبات کی ترجمان بن سکے۔ یہ صرف اس سرکار کو قوم کے جذبات
کا ترجمان بنانا ہو گا بلکہ اسے اس عسکری جنگ کے لیے بھی تیاری کرنی ہو گی جس کے
ذریعہ بالآخر تمام قوم کو آزادی نصیب ہو گی۔

اگر ایک قوم میں کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ اور یہ دس کروڑ کے دس کروڑ باشندگان

اس لیے غلامی کی زندگی قبول کر بیٹھے ہیں کہ اس سے وہ آباد ہیں اور اس پر اب کسی سرکار کی حکمرانی ہے کیسی آزادی حاصل کرلے سے وہ ریاستوں میں تقسیم نہ ہو جائے۔ تو ایسی قوم کی موجودہ صورت حال اس سے بدتر ہے کہ ان کی آبادی اور ان کی قوم تقسیم ہو جائے لیکن کم از کم ان کے بیٹے کو آزادی کا کامل نصیب ہو جائے ہاں شرط یہ ہے کہ اس بیٹے کو آزادی نصیب ہوا سے اپنے مقدس فرض کا احساس ہو۔ وہ مقدس فرض یہ ہے کہ یہ صرف یہ آزادی حاصل کرلے وہ اپنا حصہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے چھڑا کر قاتل غلامی روحانی اور تمدنی رشتوں کا اعلان کرتا رہے۔ کہ ہر ممکن اور ہر ضروری ذریعہ کو کام میں لاتے ہوئے اس عسکری جنگ کی تیاری بھی جاری رکھے جس کے ذریعہ وہ قوم کے مظلوم اور بچھڑے ہوئے بھائیوں کو آزاد کرا دیا جائے گا اور متحد کیا جائے گا۔

قوم کے مظلوم مفکر زندہ نیک تمناؤں سے نہیں بچائے جا سکتے

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو صناع کبھی قومی سرکار کے ماتحت تھی اور سیاسی لحاظ سے متحد تھے۔ ان کو اسی صورت میں دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب پہلے ایک شرط پوری ہو جائے۔ وہ شرط یہ ہے کہ پہلے وہ وطن کو آزادی اور سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ ایسی صورت حال میں جو صناع بچھڑ چکے ہیں ان کے خصوصی مفادکو دل پر پتھر رکھ کر ثانوی حیثیت دی جائے گی۔ اس کو ثانوی حیثیت دینے میں کسی جذباتی کمزوری کا اثر قبول نہ کیا جائے گا۔ پہلا کام یہ ہے کہ ملک کے مرکزی رقبے کو آزاد کرا دیا جائے۔ ایک قوم کے بچھڑے ہوئے اور مظلوم ٹکڑے یا کسی صناعت تقسیم ہندوستان سعادت کے منتشر اور پریشان اجزا خالی آرزوؤں آرمانوں اور خیالوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ مظلوم کی مدد میں علم کو فتح کرنے کے لیے کافی نہیں۔ یہ کام تب ہوگا کہ قوم اور ملک کا جو حصہ کم و بیش خود مختار ہے وہ اس کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس حاصل کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کر سکے۔ وہ کھوئے ہوئے علاقے جو کبھی ایک مشترکہ وطن میں شامل تھے۔

ظلم اور جبر کا مقابلہ صرف تلوار سے کیا جا سکتا ہے

[illegible] ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ
ریاستی سرکار کا جو حصہ تقسیم سے بچ گیا ہے اسے خوشحال اور محفوظ رہنے کے لیے پوری
محنت سے کام لیا جائے۔ عوام کے دلوں میں جو ناقابل فراموش آرزوئیں اور ارمان
سوئے ہوئے ہیں انہیں جگایا جائے۔ ان تمناؤں کو ہر دولت کی طاقتوں کے سہارے
حاصل کرنے پر اکسایا جائے۔ ان سب کوششوں کا مقصد ایک ہو کہ جب ساری قوم کو
آزاد و متحد کرنے کا وقت آئے تو سب ایک جان ہو کر اس مہم میں شریک ہوں فرض جو
ادا کرنے ہیں گے ہیں ان سب کے علاوہ ایک بالاتر نصب العین کے واقعات کھلے
جائیں۔ وہ نصب العین یہ ہے کہ ہر مرکزی طاقت بچ گیا ہے اس میں ایسی صلاحیت اور
قوت پیدا کی جائے جو فتح یاب دشمن کے رویے پر ایک ان جانب "شک" کی دن
دشمن کے ارادے پر "شک" کی قوت فراہم ہو گی۔ تبھی قوم ہو ظلم اور زیادتی سے بچائی
جا سکے گی۔ ورنہ کسی احتجاج اور "ہڑتالوں" سے وہ ظالم کے ظلم
کے ماتحت متحد نہیں کیے جا سکتے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں ظلم اور جبر کا مقابلہ
صرف تلوار کی قوت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خارجی حکومت بھی صرف داخلی قوت فراہم کرنے کا موقعہ مہیا کر سکتی ہے

تلوار کی قوت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے؟ تلوار کی قوت پیدا کرنے کا کام فقط
داخلی حکومت عمل سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جس داخلی حکومت عمل سے تلوار کی قوت پیدا
کی جا سکتی ہے اس کو پیدا صرف ایک قومی حکومت کا حصہ ہے۔ جب داخلی حکومت عمل
سے تلوار کی قوت بہم پہنچانی جاری ہو تو یہ فرض خارجی حکومت عمل پر عائد ہوتا ہے کہ داخلی
حکومت عمل کے اس کام میں خلل پیدا نہ ہو اور اختیار جبر کرنے اور ان اختیاروں کو
استعمال کرنے کے لیے [illegible] کسی بیرونی مداخلت کے جاری

رہے۔

میں اس کتاب کی پچھلی جلد میں اس مسئلہ پر بحث کر چکا ہوں کہ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے بیرونی معاملوں سے معاملے کرنے کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ کیوں ناکافی تھی۔ جرمن قوم کو زندہ رہنے کے لیے سامان خورد و نوش کی ضرورت تھی۔ یہ سامان خورد و نوش چار طریقوں سے مہیا کیا جا سکتا تھا۔ ان چار طریقوں میں سے چوتھا طریقہ سب سے زیادہ مشکل تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے یہ چوتھا طریقہ ہی اختیار کیا۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ یورپ میں جرمنی کے علاقہ کی توسیع کی جاتی۔ مگر اس کے ہمارے حکمرانوں نے نوآبادیاں فتح کرنے اور تجارت کی توسیع دینے کا راستہ اختیار کیا۔ یہ پالیسی اس وجہ سے بھی غلط تھی کہ اس کے چلانے والے اس مغالطہ میں مبتلا تھے کہ یہ راستہ اختیار کرنے سے جنگ سے بچ جائیں گے۔ جب کوئی شخص ایک سے زیادہ کرسیوں پر بیٹھنے کی بیک وقت کوشش کرتا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کسی ایک پر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر ملک کے لئے ایک ہی تجویز رکھی جاتی ہے۔ جرمن سلطنت نے جو غلط سکیم عملی اختیار کی تھی اس کے لیے سخت سزا بھگتنی پڑی۔ سزا کی تو نہیں مختلف قسمیں ان میں سے ایک نوعیت جنگ عظیم بھی تھی۔

قوم کی حریت اور استقلال تمدن اور ثقافت سے زیادہ ضروری ہیں

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مناسب ترین عمل یہ تھا کہ تیسرا راستہ اختیار کیا جاتا۔ تیسرا راستہ یہی تھا کہ برا عظم یورپ میں جرمنی کے لیے مزید علاقہ حاصل کرنے کی جرمن سلطنت کو یورپ کی بڑی سرکار بنا دیا جاتا۔ جب یہ ہو جاتا تو پھر جرمنی کے نشوونما کی مزید توسیع کے لیے بیرونی نوآبادیات بھی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اس طریقہ سے نوآبادیات کا حصول بھی قابل عمل بن جاتا۔ میں یہ درست ہے کہ یہ پالیسی اختیار کرنے کے لیے انگلستان کو حلیف بنانا ضروری تھا۔ انگلستان کو حلیف نہ بنایا جا سکتا تھا تو پھر جنگی تیاریوں اور سامان حرب کے لیے اس توسیع پانے کی کوشش کر لی جاتی کہ

ہو تیس یا چالیس سال کے لیے سوائے جنگ پر خرچ کرنے کے باقی تمام ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں میں پشت ڈالنی پڑتی۔ اگر صورت حال یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی تو اس پر چلنا عام انسان کے بس سے باہر تھا۔ کسی قوم کی ثقافتی اور تمدنی حیثیت اس کی سیاسی حریت اور مطلق العنانیت پر مبنی ہے۔ بغیر سیاسی حریت کے تمدن اور ثقافت عام نہیں رہ سکتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حریت کے بغیر تمدن اور ثقافت کی تعلیم و تربیت ہی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب کسی قوم کی سیاسی حریت اور استقلال کے لیے جدوجہد کا مرحلہ درپیش ہو تو کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جا سکتا۔ قوم کے سلاطین امراء اور ارباب حل و عقد جو قیمتی تمدنی اثاثہ ہوتے ہیں کو ضائع کر کے سرکاری خزانہ معمور کرنے کی عیاشانہ تجاویز پر عمل کرنی پڑیں اس کی کئی مثالیں ہمیں دوروں وقت آنے پر مل سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی سرکار اپنی آزادی کے تمام وسائل سیاسی حریت اور استقلال کے حصول کے لیے وقف کر دیتی ہے تو اس کے بعد ضرور ایک خوشحال اور وسیع سلطنت کا دور آتا ہے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قوم کی ثقافت اور تمدن کی روح تو بیکار عرصہ کے لیے ذلیل ہو چکی رہی۔ مگر موقع پانے پر پہلے سے زیادہ شان و شوکت کے ساتھ اپنے مظاہر پیش کرنے لگی۔ یونان نے ایران کے ساتھ طویل جنگ کے دوران جو عذاب برداشت کیے اس کے بعد ہی فلپ کا ماتحتی کا دور شروع ہو گیا۔ روم نے کارتھیج کی بدولت سرکار نے جب کارتھیج کے ساتھ طویل جنگ کی مشکلات اور ہنی بال سے نجات پائی تو پھر اس کی قوت ایک اعلیٰ ترین تمدن کے قیام پر صرف ہونے لگی۔

پارلیمنٹری نمائندے بزدل ہوتے ہیں

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کی دوراندیشی کی حکمت عملی چلانے کے لیے جس جرأت کی ضرورت ہے وہ کسی احمق اور بزدل پارلیمنٹری اکثریت کے نمائندوں میں نہیں پائی جا سکتی۔ ایسی حکمت عملی کا تقاضا یہ ہوگا کہ قوم کی تمام تر توجہ صرف اس ایک کام پر مرکوز کر دی جائے کہ مستقبل میں سرکار کے تحفظ کے لیے جو عسکری جنگ لڑنی ہے اس کی

تیاری کی جائے۔ فریڈرک اعظم کے والد نے یہی جنگ لڑنے کی تیاری کرنے کے لیے عمر بھر قربانی کی۔ لیکن ہماری اس امتحانہ ہار کر عظیم عسکریت کے آباؤ اجداد اس پر عسکریت کا لیبل لگا دیتا تھا جو ایسی قربانی کہاں دے سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جنگ عظیم سے پہلے یورپ میں مزید علاقہ حاصل کرنے کے لیے جرمنی کو اس ذہنی تیاری کی ضرورت تھی۔ اس کی طرف پوری توجہ دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مملکت عملی کی سیاست سے جرمنی کو اس قسم کے بیرونی حملوں کی ضرورت تھی وہ بھی ٹل سکے۔

دشمن کا دشمن بھی دوست ہوتا ہے

جرمنی کی خارجہ پالیسی جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ سب باقاعدہ جنگ کے لیے تیاری کرنے سے گھبراتے تھے۔ وہ ہر اس تجویز کو مسترد کر دیتے تھے جس کا مقابلہ یورپ میں مزید علاقہ حاصل کرنا ہو۔ یہی ان کے لیڈروں نے نوآبادیات کے حصول اور تجارت کی توسیع کی پالیسی کی ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت انگلستان کا جرمنی کے ساتھ جو معاہدہ تھا جو امکان تھا وہ ضائع ہو گیا۔ جب انگلستان سے معاہدہ نہ کیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ روس کو حلیف بنایا جاتا مگر یہ امکان بھی ضائع کر دیا گیا۔ آخر کار جرمنی کے اس وقت کے سربراہوں نے جرمنی کو اس منزل تک پہنچا دیا تھی کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور سوائے آسٹریا ہنگری سلطنت کے جرمنی کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔

خارجی پالیسی کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے

آج جرمنی کی مملکت عملی کی شان یہ ہے کہ اس کا کوئی مقابل قابل قدر نہیں۔ جنگ عظیم سے پہلے تو غلطی یہ تھی کہ جیسا میں بیان کر چکا ہوں جو غلط راستہ اختیار کیا گیا۔ مگر یہ راستہ بھی بھروسے سے اختیار کیا گیا۔ اختیار کے بعد مصیبت یہ ہے کہ خود یہ مملکت عملی میں سرے سے کوئی راستہ ہی اختیار نہیں کیا گیا۔ آج صورت حال اس سے بھی بدتر

ہے۔ جو جنگ سے پہلے تھی۔ یہ خاص حکمت عملی کا مرکز ہے کوئی منصوبہ ہی نہ تھا۔ اگر کوئی منصوبہ ہے تو یہ کہ قوم کے لیے بکا کوئی امکان باقی نہ چھوڑا جائے۔

آج یورپ میں مختلف سرکاروں کے ایک دوسرے سے تعلقات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہم حسب ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

برطانیہ کی پالیسی "قوت کا توازن" برقرار رکھنا ہے

گزشتہ تین سو سال سے یورپ کی تاریخ ایک ہی زبردست قوت کے ارد گرد رہی ہے۔ وہ زبردست قوت انگلستان ہے۔ انگلستان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یورپ کی سرکاروں کو اس طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار رکھا جائے تاکہ قریبی میں "قوت کا توازن" برقرار رہے۔ اس قوت کے توازن کا مطلب یہ ہے کہ یورپ میں انگلستان کا مقصد محفوظ رہے اور دوسرے سے بے پروا ہو کر انگلستان دنیا پر تسلط جمانے کے منصوبے آسانی سے پورے کر سکے۔

ملکہ الزبتھ کے زمانہ سے برطانوی مدبرین کی سیاسی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ باقاعدہ طور پر کوشش کرتے ہوئے یورپ کے استحصال سے یورپ کی کسی سرکار کو اتنا طاقتور نہ ہونے دیا جائے کہ وہ یورپ کی دوسری سرکاروں پر غالب ہو کر انگلستان کی جانب متوجہ ہونے کی جرأت پا سکے۔ انگلستان ضرورت پڑنے پر طاقت کا یہ توازن قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ عسکری مداخلت پر بھی آمادہ رہا ہے۔ انگلستان کی اس پالیسی کا یورپ میں اگر کوئی جواب ہے تو وہ پرشیا کی فوج کی روایت پیش کرتی ہے۔ انگلستان اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے قسم قسم کے راستے اختیار کرتا ہے۔ جس صورت میں بھی وہ یورپ فوری ضرورت کا تقاضا محسوس کرے اس کے مطابق انگلستان اپنا راستہ اختیار کرتا ہے۔ بہرحال راستے مختلف ہی انگلستان کی منزل ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ وہ منزل یہ تھی کہ یورپ میں اس کے لئے کا دھرا کوئی حریف پیدا نہ ہونے پائے۔ تاریخ میں جب بھی کسی نے کوشش کی یورپ میں انگلستان کی پوزیشن خراب ہو گئی۔ لیکن جتنی انگلستان کی پوزیشن خراب ہوئی

ہوں موزوں ہو تا ہے تو جرمنی منزل معین کر سکتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے راستے عارضی طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۰۷ء میں ہی انگلستان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے جرمنی کے خلاف کیا روش اختیار کرنی ہوگی۔ یہ درست ہے کہ بعض مواقع پر انگلستان کی اس طے شدہ پالیسی میں کچھ معمولی لغزشیں بھی ہوئیں۔ ان لغزشوں کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ دنیا کی تجارتی منڈیوں پر جرمنی کا رسوخ بڑھنے لگا۔ تو رعایا کو بھڑکانے والی پریس کی یاس کا سیاسی دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اس سے انگلستان کو تشویش لاحق ہوئی۔ مدتوں سے اس موقع پر جرمنی نے انگلستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان کے مدبرین کی طے شدہ پالیسی مستحکم ہوگی۔

انگلستان دنیا پر تسلط رکھنا چاہتا ہے

جب انگلستان نے جرمنی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ تو اس انگلستان کی نگاہ میں ایک ہی مملکت تھی جس کی اہمیت سیاسی اور تجارتی لحاظ سے مسلمہ صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس اہمیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جرمنی میں بیحد معمولی صنعتی ترقی ہو رہی تھی۔ اس ترقی نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ جرمنی اور انگلستان ایک ہی میدان میں مسابقت کی دوڑ کے لیے تجارتی وڑوں میں دوڑنے لگے۔ اس وقت جرمنی کی قسمت اس عنصر کے قبضہ میں تھی جو کہ ایک انسانی عنصر کا پیدا کیا ہوا تھا کہ دنیا کو تجارت کے رستے پر اس طور پر چھوڑ دیا جائے یہی بات تھی کہ جو انگلستان کے مدبرین کو کھٹکتی تھی مگر مدبرین نے جرمنی کی اس پالیسی کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس مقابلے کی صورت یہ تھی کہ باقاعدہ طور پر اور وسیع پیمانے پر جرمنی کے راستہ میں مشکلات پیدا کر دی جائیں مگر مدبرین کی بنیادی حکمت عملی یہ تھی کہ ہر قیمت پر طرور دنیا میں امن کو قائم رکھنا ہے۔ مگر مدبرین کی حکمت عملی تو یہ تھی کہ ہر قیمت پر ہر دنیا میں انگلستان کا غلبہ و تسلط قائم رکھنا ہے پھر اس حکمت عملی کو بروئے تکمیل تک پہنچانے کی خاطر انگلستان نے ان طریقوں

سے حلیفانہ اتحاد قائم کیا جو خود مختار ریاستوں کے مابین تھا۔ یہ اتحاد بھی انگلستان کی روایتی حکمت عملی کے عین مطابق تھا۔ انگلستان کی روایتی حکمت عملی یہ ہے کہ مقابل کی قوت کا صحیح اور ٹھیک اندازہ لگایا جائے۔ پھر اپنی قوت میں جو بھی کمزوری نظر آئے اس کا کھلے کھلے اقرار کر لیا جائے۔ اس حکمت عملی کے خلاف یہ کہنا بے اصولے پن کی بات ہے درست نہیں۔

دشمن کو ہر قیمت پر شکست دینی چاہیے

جب جنگ کے پیچھے کوئی برتر مقصد ہو یا یہ مقصد تک پہنچانے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے موقعہ پر سوال طریقہ سے نجات پانے اور فرار اختیار کرنے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ سوال تو یہ ہوتا ہے کہ مطلب کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ اور مقصد کیسے حل ہو سکتا ہے۔ مدبر نہ حکمت عملی کا مقصد یہ نہیں کہ کوئی قوم نجات پانے کی راہ رکھتے ہوئے اپنی موت گوارا کر لے۔ مدبر کا تقاضا تو یہ ہے کہ کس قیمت پر بھی ہو اپنی جان بچاؤ۔ ہر وہ ہتھیار اور ہر وہ تدبیر جو اس کے کام چل جائے۔ ہر قوم اپنا سکتی ہے۔ اگر کسی مقصد میں ناکامی ہو تو اسے اپنے غرض سے محرومی تصور کیا جائے گا۔

جب جرمنی میں انقلاب برپا ہو گیا تو انگلستان کو جو پہلا خوف لاحق تھا کہ دنیا پر جرمنی کا تسلط ہو جائے گا اس کا فوری خطرہ ختم ہو گیا۔

اس کے بعد اب انگلستان کے مقابلہ کا تقاضا یہ تھا کہ جرمنی کو ہمارے سے یورپ کے بعد ہونے والی تشویش سے ہی محروم کر دیا جائے۔ جس اس کے لیے ۱۸۱۵ء میں اس طرح جرمنی دوبارہ سے گر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانوی مدبرین ایک نئے مسئلہ سے دوچار ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ جرمنی کے شکست کھا جانے سے جو بیرونی خطرہ پیدا ہو گیا ہے وہ کس طرح ہو گیا ہو۔

ساڑھے چار سال تک جرمانوی سیاست یورپ میں جرمنی کے تسلط کو روکنے کے پیچھے لگی رہی۔ بالآخر صورت حال میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ جرمنی یورپ کی صف

جل کی سرکاروں سے خارج ہو گیا۔ جرمنی کا کردار اس حد تک پہنچ گیا کہ قوم میں اپنا وجود برقرار رکھنے کی آرزو بھی باقی نہ رہی۔ غرض اڑھائی گھنٹوں کے اندر اندر یورپ کا سیاسی توازن بگڑ گیا۔ جرمنی ختم ہو گیا۔ فرانس یورپ کی عظیم ترین سرکار بن گیا۔

انگلستان کو فرانس کا عروج پسند نہیں

جنگ کے دوران میں انگریز عوام کو آخر دم تک لڑنے پر آمادہ رکھنے کے لیے جو زبردست پروپیگنڈا کیا گیا تھا اس نے عوام کے دلوں میں جذبات اور تعصب کو جرمنی کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ انگریز عوام میں جرمنی کے خلاف یہ تعصب پیدا ہو چکا تھا کہ جرمنی نے اب برطانوی بحریہ کے ہاتھوں گویا انگلستان سے جنگ ہار چکے تھے۔ جرمنی اب برطانیہ سے تباہ ہو چکا تھا۔ جرمنی کی فوجی طاقت ختم ہو گئی۔ جرمنی کا اقتصادی نظام ختم ہو گیا۔ جرمنی کی تجارت ختم ہو گئی۔ انگلستان نے جن اغراض کے لیے جنگ شروع کی تھی۔ وہ سب پوری ہو گئیں۔ اب ان اغراض سے آگے بڑھنا خود انگلستان کے مفاد کے خلاف تھا۔ جرمنی کی بربادی خود انگلستان کے لیے مضر تھی۔ یہ خواہش تو انگلستان کے دشمنوں کی ہی ہو سکتی ہے۔ کہ جرمنی یورپ کے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ ہاں نومبر ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کے موسم گرما تک انگلستان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے بحریہ کی بالادستی کو بالکل بھول جاتا۔ جنگ کی طویل مدت میں خود انگلستان نے عوام کے جذبات کو یوں بھڑکا دیا تھا کہ اب ان جذبات سے انحراف کرنا ممکن نہ تھا۔ انگلستان کے عوام جرمنی کے دشمن بن چکے تھے۔ اس لیے انگلستان جرمنی کے متعلق اپنی خارجہ حکمت عملی خود نہ بنا سکتا تھا۔ انگلستان کے لیے اپنی خارجہ حکمت عملی خود بنانا اس لیے بھی دشوار تھا کہ فرانس کی عسکری قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ صلح نامہ کی شرائط کے لیے گفت و شنید فرانس اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ فرانس اس وقت ایسا طاقت ور تھا کہ اپنی من مانی شرائط یورپ کی دوسری طاقتوں سے منوانے کے لیے اپنی طاقت سے کام لے سکتا تھا۔ صلح نامے کی شرائط کے متعلق کئی مہینے گفت و شنید جاری رہی جب تک یہ دن کا پیدا ہوا تھا

تو اس وقت فرانس کے مقابلہ کو پورا ہوتے سے روکنے کے لیے اس قومی طاقت کی ضرورت تھی۔ اس کی کمی صرف جرمنی ہی پوری کر سکتا تھا۔ حالات جو صورت اختیار کر چکے تھے اس کا رخ پھیر لینے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی۔ یہ طاقت جرمنی کی مدد کے بغیر انگلستان فراہم نہ کر سکتا تھا۔ جرمنی کا یہ حال تھا کہ اس کے مدبر عالمہ جنگی کے باعث بھوکے مر چکے تھے۔ جرمنی کے نام نہاد مدبرین پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ جرمنی پر جو شرائط بھی عائد کی جائیں وہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

قوام ۱۸۱۵ کے باہمی تعلقات کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی حفاظت کرنے کے جذبے سے محروم ہو جائے اور دوسری قومیں اس کی نگہداشت کرنا چاہیں تو ان کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ قوم ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا ملک دوسری قوم کی نوآبادی کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

انگلستان کا اس حالت میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرانس بہت سی بڑی طاقت نہ رہ جائے۔ جب اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جرمنی فرانس کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاری نظر آیا تو انگریزوں کے لیے صرف یہ چارہ کار باقی رہ گیا کہ صلح کی گفت و شنید میں خود بھی فرانس کے ساتھ جرمنی کے حصے قرار کرنے میں شامل ہو جائیں۔

پہلی جنگ عظیم میں انگلستان کے مقاصد پورے ہوئے تھے

سچ تو یہ ہے کہ انگلستان اس مقصد کے لیے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہوا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ یہ مقصد پورا ہو کر یورپ کی کوئی ایک سلطنت دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور نہ رہتی تو توازن کو درہم برہم کر سکتی۔ فرانس نے یورپ کی دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں زیادہ قوت حاصل کر لی اور فرانس کی یہ قوت بھی مسلم ہو گئی۔

۱۹۱۸ء میں جرمنی کی فوجی قوت کا اندازہ لگایا ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ جرمنی دوسرے دو ملکوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک ملک جنگی فرانس کی

عسکری قوت جرمنی کے مساوی تھی۔ دوسرے الفاظ یعنی روس کے عسکری وسائل جرمنی سے زیادہ تھے۔ ان دونوں کے علاوہ خود انگلستان کی بحری قوت جرمنی سے زیادہ تھی۔ فرانس اور روس دونوں جرمنی کے مخالف تھے۔ اور جرمنی کے تقسیم ہونے میں حائل تھے۔ جرمنی سلطنت کا دفاعی نقطۂ نظر جرمنی کی عسکری قوت کو کمزور بنا رہا تھا۔ جرمنی کی یہ کمزوری اس امر کی ضمانت تھی کہ جرمنی کی قوت ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔ جرمنی کا بحری ساحل یوں واضح تھا کہ بحری جنگ کے دوران میں جرمنی کا مقابلہ انگلستان سے ہو جائے تو جرمنی انگلستان پر غالب نہ آ سکتا تھا۔ جرمنی کا بحری بیڑا تو رنگ لا رہا تھا۔ بر عکس اس کے جرمنی کا بری محاذ بہت کھلا ہوا اور غیر محفوظ تھا۔

اس کے مقابلے میں آج فرانس کی حیثیت انگلستان کے مقابلے میں دلکش تو ہو ہی نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ فرانس آج دنیا بھر کی عسکری قوت ہے۔ بر اعظم یورپ میں آج فرانس کا کوئی حریف موجود نہیں۔ فرانس کی دائمی سرحدیں اسپین اور جرمنی کے مقابلہ میں دفاعی رکاوٹوں کے باعث محفوظ ہیں۔ جرمنی سے فرانس کو اس لیے کوئی خطرہ نہیں کہ جرمنی کا بیڑا ساحل ہو رہا ہے (فرانس کا ساحل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ یہ جرمنی سلطنت کی رگ و پے کو ایک سے زیادہ مقام پر دبا سکتا ہے۔ یہ صرف فرانس کے طیارے اور دور مار کرنے والی توپیں طور انگلستان پر حملہ کر سکتی ہیں۔ نیز فرانس کی آبدوز کشتیاں اس کی بحری تجارتی گزرگاہوں کی ناکہ بندی بھی کر سکتی ہیں۔ فرانس کا وہ ساحل جو بحر روم کی جانب واقع ہے خاص وسیع ہے۔ دوسری طرف بحر روم میں فرانس کا بحری ساحل اور شمالی فرانس سے ساحل کا وہ حصہ جو فرانس کے قبضہ میں ہے خاصہ وسیع ہے۔ اگر اس طویل ساحل کو کام میں لاتے ہوئے بحر روم اور بحر روم میں دونوں جانب سے بحری آبدوزوں کے ذریعے انگلستان کی ناکہ بندی کر دی جائے تو انگلستان کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے گی۔

یوں بھی جنگ عظیم میں انگلستان کا مقصد تو یہ تھا کہ جرمنی کی عسکری قوت کو روکا جائے۔

نپولین کی جنگ کے سیاسی نتائج پر غور کیا جائے تو نظر یہ آتا تھا کہ فرانس کی قوت یورپ کے براعظم پر مسلط ہوگی۔ عسکری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانس یورپ میں دوبارہ اول کی عسکری حیثیت حاصل کر گیا ہے۔ اور اس کی عسکری قوت چاروں جانب سے محفوظ ہوگئی ہے۔ بحری قوت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس وقت برطانیہ کو مساوی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ جنگ کا اقتصادی نتیجہ یہ نکلا کہ بحری بیڑے بڑھانے جہاں برطانیہ کو برتری کے تمام حقوق حاصل تھے۔ اب برطانیہ کے بحری بیڑوں اور بندرگاہوں کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔

برطانیہ اپنے ہمسایوں کو ایک دوسرے سے لڑائے رکھتا ہے

برطانیہ کی دوسری سلطنت عمل کا نقشہ یہ تھا کہ یورپ ایک خاص حد تک چھوٹی چھوٹی حالتوں میں بٹ جائے اور یہ سب ایک دوسری سے برسرپیکار رہیں۔ فرانس کی خواہش بھی یہ تھی کہ جرمنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے جو ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں۔

انگلستان کی تو ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے اور ہمیشہ یہی کوشش رہے گی کہ یورپ کی کوئی سرکار بھی ترقی نہ کرجائے کہ دنیا کی زبردست سلطنت بن جائے یہی وجہ ہے کہ انگلستان یورپ کی مختلف سرکاروں کے مابین قوت کا توازن برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یورپ میں طاقت کا یہ توازن برقرار رکھے بغیر انگلستان دنیا پر اپنا تسلط جاری نہیں رکھ سکتا۔

فرانس کی خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے اور رہے گی کہ جرمنی کو زبردست طاقت نہ بننے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس جرمنی کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دینا چاہتا ہے۔ جو ایک دوسری سے لڑتی رہیں اور جن میں کوئی مرکزی حکومت قائم نہ ہو سکے۔ جب یہ نقشہ قائم ہو جائے تو فرانس دریائے رائن کے کنارے پر قبضہ کرے گا۔ دریائے رائن کے بائیں کنارے پر فرانس کا قبضہ ہو گیا تو وہ پہلی ضرورت پوری ہو جائے گی جس کے لیے یورپ

ہر فرانس کا تسلط محفوظ نہیں رہ سکتا۔

مذکورہ بالا تجزیہ کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ برطانوی بحریہ اور فرانسیسی بحریہ کی باہمی کی عظمی منزل ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے گی۔

برطانیہ جرمنی کا حلیف بن سکتا ہے

جرمنی کے بیرونی تعلقات کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مندرجہ ذیل امور کو نگاہ میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے جو شخص اس مسئلہ پر غور کرے گا کہ کون سی حکومتیں جرمنی کی حلیف بن سکتی ہیں وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ سوائے انگلستان سے دوستی قائم رکھنے کے جرمنی کا حلیف تلاش کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ جنگ کے ایام میں انگلستان نے جو پالیسی اختیار کی تھی وہ جرمنی کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ یہ پالیسی آج بھی جرمنی کے لیے مفید ثابت ہو رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ بعض حالات موجودہ انگلستان کے مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ جرمنی کو تباہ کر دیا جائے۔ پر عین اس کے برطانوی بحریہ کی جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس امر پر مجبور ہوں گے کہ فرانس کی بڑھتی ہوئی فرانسیسی بحریہ کا مقابلہ کریں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی ملک کے لیے حلیف تلاش کرنے نکلیں تو گزرے ہوئے زمانے کی دشمنیوں اور لڑائیوں کو ذہن میں رکھنے سے کام نہیں چلتا۔ ہاں ماضی کے تجربے سے ہم سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کو ذہن میں رکھا جائے تو اس سے حلیف تلاش کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ تجربے نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہوا خواہ شخص کسی ملک کی دشمنی یا نفرت پر مبنی ہو اس میں ہمیشہ ایک کمزوری مضمر ہوتی ہے۔ قوموں کی دشمنیوں کی وجہ ہم سمجھ بھی جاتی ہیں جب تجارت کرنے والوں کے لیے کسی ملک کی کسی منڈی میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوں۔ دونوں کا حلیف بننا تب ہی بارآور ہو سکتا ہے کہ جب دونوں کے لیے ایک دوسرے کی مدد سے کافی مادی فتوحات حاصل کرنے کا امکان ہو۔ مختصر یہ کہ حلیف اس قوم کو بنانا چاہیے جس

کے ساتھ مل کر دونوں جنگوں کے انتظار میں تیار ہو سکے۔

بین الاقوامی تعلقات جذبات پر نہیں مفاد پر مبنی ہوتے ہیں

ہماری قوم خارجی حکمت عملی کے مسائل سے بالکل نابلد ہے۔ اس کا ثبوت ہمارے روزنامہ اخبارات کی وہ خبریں ہیں جن میں یہ پڑھتے ہیں کہ کسی غیر ملک کا کوئی عہدیدار کسی کانفرنس میں شرکت کرنے آرہا ہے۔ اس دورے کو ہم خیر خواہی کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ اس ملک کی حکمت عملی ضرور ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ یہ سراسر جاہلانہ اور سادہ لوحی کی باتیں ہیں جو یہ سادہ لوحی حماقت کے درجے کو پہنچتی ہے۔ کسی سیاسی کی دلچسپی صرف اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ایک عام آدمی جب سیاست کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو وہ ہوا میں اڑتا ہے۔ برطانیہ امریکہ اور جاپان میں ایسا کوئی سیاسی مدبر نہیں ہے جس کا ساتھ دینا ضروری سمجھا جائے۔ ہر ملک پہلے طور پر سب سے پہلے مگر ہوگا۔ علی ہذا القیاس ہر مدبر سب سے پہلے قوم کا مدبر ہوگا۔ وہ کون سا قومی مدبر ہوگا جس کی پالیسی قومی مفاد کو سب سے زیادہ مقدم رکھے گی۔ لہٰذا جو شخص غیر اقوام کے ساتھ اس شرط پر حلیفانہ معاہدے کرنا چاہتا ہے کہ ان ممالک کے مدبرین لازمی طور پر قومی ہوں تو وہ شخص یا تو گدھا ہے اور یا وہ قوم کو دھوکا دیتا ہے۔ قومیں اس لئے اتحاد نہیں کیا کرتیں کہ ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت و ایثار کے جذبات روز بروز مشتعل ہوتے ہیں۔ قومیں تو اس لئے ایک دوسرے کی حلیف بنتی ہیں کہ اتحاد سے فائدے حاصل کریں۔ یہ درست ہے کہ ایک مدبر اپنے ہر حلیف ملک کا خیر خواہ ہوگا۔ اور کسی قومی مفاد کا خواہاں ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ انگلستان کے بعض مفادات جاپان کے بعض مفادات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ مفاد کی یہ مطابقت ہمیشہ برقرار نہیں ہوتی ہے کبھی کبھی ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آج ان دو ملکوں کے مفادات باہم مطابقت رکھتے ہیں۔ کل متصادم ہو جائیں یہی مدبرین کا کام ہوتا ہے کہ خاص وقت میں جب دو اقوام کے مخصوص مفاد مطابقت رکھتے ہوں اور ان دونوں قوموں

کے خلیف بن جانے سے ان کے مشترکہ مفادات کی منصفانہ نگہداشت ممکن ہو تو ایک دوسرے کے نقصان سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا جائے۔

فرانس جرمنی کا پائیدار دشمن ہے

مذکورہ بالا اصولوں کا موجودہ حالات پر اطلاق کرنے سے پہلے سب دلیل دلائل کے جواب تلاش کرنا ضروری ہے۔ آج کون سی حکومتیں اس مسئلہ سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں کہ مغربی یورپ سے جرمنی کا وجود ختم کر دیا جائے تو فرانس کی اقتصادی اور عسکری قوت اس حد تک مستحکم ہو جائے گی کہ پھر کسی کے لیے اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔ دنیا کی کون سی حکومتیں ہیں جو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اور اپنی خارجہ پالیسی کے روایتی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مغربی یورپ میں فرانس کا اقتصادی اور عسکری تسلط اپنے مفادات کے لیے ایک خطرہ سمجھتی ہیں؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں ایک مسلمہ حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ وہ مسلمہ حقیقت یہ ہے کہ فرانس جرمنی کا جانی دشمن ہے اور ہمیشہ دشمن رہے گا۔ اس سے بڑھ کر فرق نہیں پڑتا کہ فرانس میں کون سی حکومتیں قائم رہ چکی ہیں یا قائم ہوں گی چاہے فرانس میں بوربون کا شاہی خاندان حکمران ہو۔ چاہے انتہا پسند نظریوں کا حامل ہو چاہے پولیس ہو جو ہاتھ کھانے پینے دعوتوں کا کام جمہوریت پر سر انتقاد رہو چاہے کٹر کیتھولک مذہب پر عقیدہ رکھنے والی وچی حکومت کے حامی حکمران ہوں اور چاہے کمیونسٹ یا اشتراکی حکمران ہوں فرانس کی خارجہ پالیسی کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوگا کہ فرانس کی سرحدیں دریائے رائن تک وسیع کر دی جائیں۔ دریا کے اس کنارے پر فرانس کا تسلط مستحکم رکھنے کے لیے جرمنی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔

انگلستان فرانس کا عسکری غلبہ بھی ناپسند کرتا ہے

انگلستان یہ بھی چاہتا کہ جرمنی دنیا کی زبردست قوت نہ بن جائے۔ فرانس یہ چاہتا ہے کہ جرمنی نام کی کوئی حکومت ہی باقی نہ رہے۔ ان دونوں خواہشات کا فرق ظاہر

ہے۔ آج جرمنی کے لیے جدوجہد میں مصروف نہیں کہ دنیا کی ایک بڑی زبردست حکومت کے طور پر اپنی حیثیت محفوظ رکھے۔ آج تو ہماری جدوجہد یہاں تک محدود ہے کہ ہمارے ملک کا جو حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے وہ ہمارے قومی جسم کے کٹے ہوئے اعضا کی طرح ہمیشہ کے لیے کٹ کر الگ نہ ہو جائے۔ جرمنی کے قرار کھو کے یہ صوبے جا چکے ہیں۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھا جائے تو آج یورپ میں صرف دو طاقتیں ایسی ہیں جو جرمنی کی حلیف بن سکتی ہیں۔ ایک انگلستان دوسرا اٹلی۔

انگلستان یہ دیکھ کر خوش نہیں کہ یورپ کے اندر فرانس کی عسکری قوت اب بے لگام ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک روز فرانس کوئی ایسی اقتیار کر لے جو کسی نہ کسی پہلو سے برطانوی مفاد کے منافی ہو۔ انگلستان یہ دیکھ کر کیسے خوش ہو سکتا ہے کہ بحری یورپ میں وہ بے دھڑک نئی نئی بحری کالونیوں پر فرانس کا قبضہ ہو جائے۔ ان کالونیوں پر قبضہ کرنے کے بعد ایک روز فرانس عالمگیر تجارت میں ایسا دخیل ہو سکتا ہے۔ جس سے برطانوی مفاد کو زک پہنچے۔ انگلستان یہ دیکھ کر بھی خوش نہیں کہ یورپ کی دفنی طاقتوں کے ٹکڑے ہو جانے سے آج فرانس کو یورپ میں جو بیساں مقام حاصل ہو چکا ہے کہ وہ چاہے تو عالم گیر تسلط حاصل کرنے کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔ نہ صرف فرانس عالم گیر تسلط کے لیے کوشش کر سکتا ہے بلکہ یورپ میں فرانس کا غلبہ فرانس کو مجبور کر دے گا کہ وہ عالمگیر مسائل میں دخل دے۔ کسی زمانے کے دشمن طیوروں نے انگلستان پر جو ہم برسائے تھے ان کے مقابلہ میں اب فرانس کے طیورے انگلستان پر ہزار گنا بم برسا سکتے ہیں۔ آج فرانس کا عسکری غلبہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے سینے میں ایک زہر آلود خنجر کی طرح پیوست ہے۔

اٹلی یہ بھی فرانس کو یورپ میں غالب نہیں دیکھنا چاہتا

اٹلی بھی یہ نہیں ہونا نہ چاہے گا کہ یورپ میں فرانس کی قوت مزید بڑھ جائے۔ اٹلی کا مفاد اس سے متعلق ہے کہ جو علاقے وہ جنگ میں فتح کریں گے یا امن کے زمانہ میں حاصل کریں گے وہ فرانس کے حلقوں کے سیاسی کوائف کی صورت میں رونما ہو چکا ہے۔ اٹلی

جنگ میں اس لیے شامل نہ ہوا تھا کہ بلجیم و اسٹریا تک میں آسٹریا کو جو تسلط حاصل ہوا تھا اور اس کے باعث حالیہ کو آسٹریا سے سخت دشمنی تھی اس کا مدارک کیا ہو سکے فرانس کی یورپ میں حالت کو مزید غلبہ حاصل ہو تو اس سے حالیہ کی آئندہ ترقی پر اثر پڑے گا۔ حالیہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو فریب نہیں دے سکتا کہ فرانس اور حالاوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک نسل سے تعلق رکھنا قومی روابط کا تعین نہیں کر سکتا۔

آئندہ کی اور بھی جانب داری سے غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ نہ حالیہ اور حالیہ کی سرکاروں کے قومی مفاد محض یہ صرف اس قوم کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جس حالات کی ضرورت ہے ان سے متصادم نہیں بلکہ ان سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔

لیکن جب حلیفانہ معاہدوں کے مکالمات پر غور کرنے بیٹھیں تو ہمیں تین باتیں پیش نظر رکھنے چاہئیں پہلے نکتے کا تعلق خود قومی سے ہے۔ دوسرے دونوں باتیں نکتہ ہذا حالیہ سے متعلق ہیں۔

جسے جواپنی پروا نہ ہو کسی کو اس کی پروا نہیں ہوتی

دنیا میں آج کل جو حکومت قائم ہے کیا اس کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی دوسری حکومت اس سے حلیفانہ معاہدہ کر سکتی ہے۔ جب کوئی حکومت کسی دوسری حکومت سے حلیفانہ معاہدہ کرتی ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاہدہ کرنے والی حکومت کو اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں اس حکومت سے مدد ملے گی جس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہے۔ جو حکومت سوا سیاسی ہے ہاں ہر بڑی حد تک آزاد ہو کر خود اپنی قوم کے مفاد سے غداری کا ارتکاب کرے گی ہو بھلا ایسی حکومت سے کوئی جارحانہ عزائم رکھنے والی حکومت کیوں معاہدہ کرے گی۔ ایسے ناکارہ حلیف سے اس ملت کے لیے تو کوئی نتیجہ نہ نکلے گا جو اپنے اعلیٰ کے زوال کو دعوت دے رہی ہو ہاں بیکل جنگ عظیم سے قبل فرانس نے جو اتحاد قائم کر رکھا تھا اس کا مقصد تو محض یہ تھا کہ جو حالات پیدا ہو چکے

ہیں کہیں اعلیٰ درجہ پر قرار رکھا جائے تاکہ اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کو موت کی گہری نیند سلا دے۔ یہ بیکن اور ہابز کا عمرانی معاہدہ تھا۔ دنیا کی ہر حکومت اس طرح اپنی موت مرنے کے لیے معاہدہ نہ کرتا ہے وہ ہو۔ کسی ایسی سرکار سے زندگی اور موت کا اختیار کیوں تمام کرے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے خاتمہ تصانیف میں غیر حکومتوں کی کاسہ لیسی کرتی ہے اور جس کی داخلہ پالیسی یہ ہے کہ قومی جذبات کو بری طرح سے اور سوا کن انداز سے کچلا جائے۔ کوئی ترقی پذیر سلطنت کی ایسی سرکار سے کیوں معاہدہ کرے جس میں رتی بھر حکومت کی نشانی نہیں اور جس کی حکمت عملی کا کوئی پہلو شاندار نہیں پیش کرنے کا مستحق نہیں۔ کیا یہ عمرانی معاہدے ایسی حکومتوں کے لیے کیے جائیں جن پر وہ لوگ حکمران ہیں جن سے ان کی اپنی قوم کے افراد نفرت کریں اور جو بیرونی ملکوں میں کوئی اثر نہیں رکھتا۔

غلام مطلق بھی بزدلوں کا دوست نہیں

ہر گز نہیں کہ جس حکومت میں عزت نفس کا احساس زندہ ہے اور جو محض اس لیے عمرانی معاہدے نہیں کرتی کہ اپنے حریص پارلیمنٹری نمائندوں کو ساری دنیا میں سیر کرنے کا موقع دے سکے وہ موجودہ دنیا میں کسی سے بھی کوئی عمرانی معاہدہ کرنے کی توقع کر سکتی ہے۔ حالات موجودہ دنیا میں کسی بیرونی حکومت سے صحیح معنوں میں عمرانی معاہدہ نہیں کر سکتا۔ جب کوئی دوسری حکومت دنیا میں کسی کی دوست نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ سارے تمام اقوام ہمارے گھر ہونے کے لیے کھنچے ہوئے ہیں۔ دنیا میں خود اپنی طاقت کے سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ ہماری منتخب شدہ پارلیمنٹ کو کھلے اختیار دیتی رہے۔ ان حالات میں باقی دنیا کو کیا پڑی ہے کہ وہ دنیا کی حفاظت کے لیے لڑتے مریں۔ غلام مطلق کی بزدلوں کی کسی قوم کو آزادی نہیں ملتی۔ ہماری دنیا میں تاریخ آزادی سکھاتی ہیں کہ غلام مطلق کو کسی بزدل قوم کو آزادی تحفے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ ہندوستان حالات جو کہ ہمیں دنیا کو بیوقوف کرنے کی خواہش

نہیں ان کے لیے بھی سوائے اس کے کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ فرانس کے ساتھ مل کر دشمن میں لوٹ مار کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان ساری لوٹ مار کا فائدہ فرانس کو پہنچنے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

کل کا دشمن آج کا دوست بھی بن سکتا ہے

دوسری بات جو ہمیں نہیں بھولنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جرمنی میں ماضی قریب میں ہمارے ساتھ دشمن کی حیثیت سے لڑ چکی ہیں۔ وہاں عوام میں جرمنی کے خلاف جو پروپیگنڈہ اس زور و شور سے ہوتا رہا ہے کہ ان ملکوں کے باشندوں کا بہت بڑا حصہ مستقل طور پر جرمنی کا مخالف بن گیا ہے۔ جب عرصہ دراز سے عوام کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ قوم دوسری صفت قرار دی جا رہی ہو اور ہلاکت کی علم بردار ہے تو پھر بالکل عام حالات کے دور سے یہ جذبہ کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ کل جو ہمارے دشمن تھے آج انہیں فی الفور حلیف نہیں بنایا جا سکتا۔

تیسری بات سب سے زیادہ قابل توجہ ہے کہ اگر ہمیں مستقبل میں جرمنی کے اندر حلیف بنانا مقصود ہے تو پھر تیسری بات اور بھی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ ہے کہ جرمنی کا مفاد کا تقاضا یہ نہیں کہ جرمنی کو مزید برباد ہونے دیا جائے۔ وہاں جس اقتصادی سرمایہ کے جس لیول پر بربادیوں کا قبضہ ہے اس کے مفاد کا تقاضا یہ ضرور ہے کہ جرمنی میں مزید تباہی نہ مچائی جائے۔

یہودی بدترین دشمن ہیں

برطانوی سرکار یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ برطانوی حاکم حکمت عملی اور سرمایہ کے جس لیول پر یہودی کا تسلط ہے اس کے تقاضوں میں ایک واضح تضاد پیدا ہو چکا ہے یہ تضاد زندگی کے ہر کی پہلوؤں پر بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر وہ مسائل ہیں جو برطانوی حاکم حکمت عملی کو درپیش آ رہے ہیں۔ برطانوی سرکار کے مفاد اور اس کی خوشحالی کے تقاضے کے لئے ضروری ہے کہ یہودی سرمایہ دار یہ مطالبہ کرے کہ

یا قدیم یہودیوں کی قوم کے مفاد کے خلاف تھا۔ وہ اور اس کے دوست نازی کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئیں۔

عرصی یہودی جس طرح سوچتے ہیں اس کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے نازی کو یہ شعور کے وقت ملنے کے بعد ضروری ہے کہ جب قوم ہو جب وہ نازی دانشور طبقات کو ختم کر دیا جائے۔ یہ دانشور طبقات ختم ہو گئے تو پھر نازی کے مزدوروں کو بہت آسانی سے یہودی سرمایہ کی خوشحالی میں بھرتی کرنا آسان ہو جائے گا یہودیوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے تحریک کا یہ پہلا قدم ہے۔ اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا کو یہودی اقتدار کے وقت لایا جائے۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہو رہا ہے اور آج کی نازی اس خوفناک جدوجہد کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اگر نازی قوم اور نازی حکومت اس خلوص کے ساتھ میں آ جاتی ہے جو یہودی سے دنیا کی قوموں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ جو لوگوں کے پیسے سود پر دے کے لاکھوں میں تو پھر اس کے بعد تمام دنیا میں عظمت کا دور ہو جائے گی۔ اگر نازی اس عظمت کے پہلے سے بچ جاتا ہے تو دنیا کی قوموں کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا۔

یہودی بڑا موقعہ شناس ہے

بعض سے کہا جا سکتا ہے کہ یہودی اپنی تمام تر سازشی سرگرمیوں روسے کار لاتے ہوئے نازی کے علاوہ دوسری قوموں کی بھی دشمنیاں ہموار رکھتے ہیں یعنی صرف وہ اپنی دشمنیاں ہموار رکھتے ہیں بلکہ وہ انہیں فروغ بھی دیتے ہیں جہاں ان کا بس چلے وہ اس دشمنی کو تصادم تک لے جانے کی سعی کرتے ہیں یہ بھی بعض سے کہا جا سکتا ہے کہ نازی کے خلاف اس مبالغہ آمیزی کی مہم میں نازی قوموں کو بھڑکایا جاتا ہے اس کو اس مبالغہ آمیزی کی بہت تھوڑی آگاہی ہوتا ہے باوجود اس کے یہودی اس دیگر قوم میں یہ زہر پھیلاتا رہتا ہے کہ دیگر ممالک میں یہ مہم چلانے کے لیے عام طور پر یہودی ہی اپیلیں جاری کرتے ہیں جو خاص طور پر کسی مخاصب قوم کے یہودیوں سے تعلق رکھتی ہوں یا اس ملک کے

رکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ فرانس جرمنی کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ہمیشہ سب سے زیادہ بڑا دشمن رہے گا۔ فرانسیسی قوم میں حبشی نسلوں کا تڑکہ لگانے سے فرانس کی صلیبی جنگوں کا یورپ کی سفید فام اقوام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے وقت خود فرانسیسی بھی یورپ کی سفید فام اقوام کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح یہودی دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے جس جدوجہد میں مصروف ہے اس کے ضمن میں فرانسیسی قوم بھی ایک بڑی فعال اکثریت کرتی جا رہی ہے۔ حبشیوں کا خون فرانسیسیوں کی رگوں میں ملتا جا رہا ہے۔ فرانسیسی دریائے رائن کے کنارے تک پہنچتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کالی نسلوں کا خون ایک حاکموں کی صورت میں وسطی یورپ تک پہنچ کر رہے گا۔ فرانسیسی قوم کے لیے حاکموں کی ہوا بنانے کے لیے فرانس سے حبشی ان کی وراثت میں شامل ہے۔ اس حبشی نے جو یہ نظام ہر قسم شاہی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہودی حلقے سے دن سے پلی جا رہی ہوتا رہتا ہے۔ اسے فرانسیسیوں کی یہ روش خوب پسند ہے کہ وہ اس کی چوں کے بیچ مطابق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ فرانسیسیوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمن یورپ کے وسط میں کالی نسل کا ایک وحشی نسل پیدا ہو جائے گی۔ گوروں کے یہ کمزور خون میں کالوں کا یہ وحشی خون شامل ہو جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گوری اشرافت قوموں کا جداگانہ وجود ختم ہو جائے گا۔

فرانس کی وسطی یورپ میں جو مہم چلا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانس کو رائن کا علاقہ یہودی سونپ کر فرانسیسیوں کی اس مہم کی پشت پناہی اور راہنمائی کر رہا ہے۔ فرانسیسیوں کی یہ مہم گوری نسلوں کی زندگی کے خلاف ایک مجرمانہ ہے۔ خود فرانسیسی قوم بھی اس مجرمانہ اقدام کا نشانہ بننے والی ہے۔ آدم کو بھی جنت سے اس لیے نکالا گیا تھا کہ اس نے ممنوعہ شجر کا پھل کھا لیا تھا۔ فرانس گوروں کا کالی نسلوں کے ساتھ اختلاط کر کے اس گناہ کا ایک مرتبہ پھر ارتکاب کر رہا ہے۔ ایک دن آئے

گا کہ خود فرانسیسی قوم کو اس گناہ کا احساس ہو گا اور تب وہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے اس کے بعد فرانس ایک اور عظیم ہے اس کا مقصد عظیم کا تقاضا ہے کہ جذبات پر قابو کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس بات کا یقین نہ رکھ لیا جائے کہ کوئی بھی گوری قومیں ماضی میں ہماری دشمن رہ چکی ہیں۔ بلکہ ہر ایک گوری قوم کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا جائے جو جرمنی کی طرح فرانس کی جانب سے اس خطرے کا شکار ہونے والی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس قوم سے جرمنی معاہدہ کرے اس کو بھی فرانس کی جانب سے اس خطرے کا احساس ہو اور وہ فرانس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر یا غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہو جائے۔

فی الحال مستقبل بعید تک یورپ میں صرف دو قومیں ہیں جن سے جرمنی حلیفانہ تعاون کر سکتا ہے۔ ایک برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے اٹلی۔

دشمن سے بہتر سلوک کی توقع نہ رکھنی چاہیے

اگر ہم ماضی پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ دیکھیں کہ انتخاب کے بعد جرمنی کی خارجہ حکمت عملی کس انداز سے چلائی گئی ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہر بار ہماری حکومت اپنے دشمنوں کے سامنے مراعات پیش کرتی رہی ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ ہماری حکومت ایسا کیوں کرتی رہی ہے۔ اس سوال پر غور کرنے کے صرف دو ممکن نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یا تو وہ ہمیں جھوٹ کر گھر بیٹھ جانے پر یا کم از کم غصے اور عداوت کی آگ میں مشتعل ہو کر ہم اپنی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کے لیے شمشیر بکف گھروں سے نکل آئیں۔ ہماری حکومت اس روش کی وجہ سے یہ نتیجہ تھی کہ وہ معاہدہ کی اہمیت کو نہ سمجھتے تھی۔ یہ حکومت ہمارے لیے خاص مفید ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمارے دشمن نے ہمارا شکار کرنے کا انتظار کیا۔ حالانکہ کسی دانش مند آدمی کو بھی اس کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے فرانس کے پاؤں پڑ کر اس کی منتیں کیں۔ اور اس سے خیرات مانگی۔ یہاں تک کہ ساحل کے علاقہ میں یہ

لوگ بار بار اپنے سرفراس کے پاؤں پر رگڑتے رہے۔ انہوں نے اپنی ان حرکتوں میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ وہ اعلاج سودائی نظر آنے لگے۔ یہ اس عظیم قوم کے سامنے وفادار کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔ فرانسیسی عورتیں ہر مرتبہ جب ان کا بادشاہ ان کے خوشامدی مسرت کے نعرے بلند کرتے تھے کہ دیکھو دیکھو اب جرمنی سے بہتر سلوک ہونے لگا ہے۔ اس تمام کھیل کے پیچھے جو اصل تاریخ والے چھپے بیٹھے تھے وہ کسی بڑی اس معاملے میں گرفتار نہ تھے۔ وہ تو فرانس سے دوستی کا ڈھونگ فقط اس لیے رچاتے تھے کہ جرمنی کی دوسری قوموں سے بڑی صلاحیت اختیار کر کے پھر اپنی آزادی کا انتظام کر لے۔ ان لوگوں کو فرانس کے متعلق کوئی علاقہ نہیں نہ تھی۔ خود فرانس میں جو لوگ ان پر دوستی کا ہار پہنا رہے تھے ان کو بھی کوئی علاقہ نہیں نہ تھی۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اور جو یہ دکھا رہا تھا کہ یہی حرکتوں سے جرمنی کو بچایا جا سکتا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ دراصل پوری تیاری سے وہ سوئی چلے تھے کہ یہ راستہ اختیار نہ کیا گیا تو کہیں جرمن قوم کے عوام اپنی تقدیر کی باگیں خود اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں اور اس راستے پر یہ لوگ چلا رہے تھے اس سے دائیں ہو کر کہیں دوسرے راستے پر نہ نکل جائیں۔

انگلستان سے جرمنی کی دشمنی بھول جانی چاہیے

یہ بھی ہے کہ انگلستان کو مستقل کے لیے جرمنی کا حلیف تجویز کرنا دراصل ہے۔ جرمنی میں جو اخبارات یہودیوں نے چلا رکھے ہیں وہ دن رات انگلستان کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات خاص طور پر ابھارتے رہتے ہیں۔ کئی سادہ لوح جرمن بالکل بے فکری میں وہی باتیں دہرانے لگتے ہیں جو یہودی ان کے کان بھر دیتے ہیں۔ کبھی تو یہ شگوفے چھوڑے جاتے ہیں کہ جرمنی کی بحری طاقت بہر حال ختم کرنی ہوگی کہیں یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ جرمنی کے مقبوضات کہیں اس سے چھینے گئے ہیں۔ کبھی یہ سادہ لوح جرمن کے یہ قول ان یہودیوں کے پاس نقل کر کے بھیج دیتے ہیں جو انگلستان میں بیٹھے ہیں پھر انگلستان میں رہنے والے یہودی جرمنوں کے یہ قول نقل کر کے جرمن

کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ عورتوں کے سادہ لوح لوگ ان پیچیدہ طبقاتی اور سیاسی مسائل کا حل اختیار کرتے ہیں اس پر حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ آج عورتوں کی بڑی طاقت اور اس قسم کے دوسرے امور کے لیے جدوجہد میں مصروف نہیں جگ سے پہلے بھی عورتوں کی قومی قوت کو اس قسم کی مہمات میں مصروف کر دیا اس وقت تک بیکار تھا۔ جب تک پہلے پورپ میں عورتوں کی پوزیشن مضبوط نہ کی جاتی آج اس قسم کی توقعات کو مکمل کرنا بیہودگی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

بار بار یہ دیکھ کر مایوسی کی شدت سے دل چاہتا ہے کہ سر پھوڑ لیا جائے کہ یہودی سازش کرنے والے کس طرح ہماری قوم کی توجہ ان مسائل پر مبذول کر دیتے ہیں جو آج ہونی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ عورتوں کو ایک طرح مظاہرے اور احتجاج کرنے کی ترغیب دیتے ہیں دوسری جانب فرانس ہماری قوم کی باقاعدہ نگہبانی کرتا رہتا ہے۔ جب قوم کی آزادی کے لیے ہمیں ہونٹوں اس قسم کے مظاہرے اور احتجاج کی حقیقت رکھتے ہیں۔

جنوبی بیروں کا مسئلہ

اس ضمن میں مجھے خاص طور پر وہ مثال یاد آتی ہے کہ انگلستان میں واقعہ جنوبی بیروں کا علاقہ جہاں زنگی باشندوں کی اکثریت ہے اسے آزاد کرانے کی مہم چلا کر یہودیوں نے کس خوش اسلوبی سے زنگی قوم کو غلامی کے راستے پر چلا دیا ہے۔

جی ہاں جنوبی بیروں کا مسئلہ آج کل ہماری قوم میں یہودیوں نے پھیلا رکھا ہے۔ میں یہاں اس مسئلہ کا تذکرہ اس لیے چھیڑ رہا ہوں کہ میں ان بدمعاشوں کی جانب سے توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں انہوں نے ہماری قوم کے کثیر گروہوں کی جہالت اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں مشتعل کر رکھا ہے۔ ان بدمعاشوں کا اس مسئلے سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک چور کا شرافت سے تعلق ہو سکتا ہے۔ ہاں پارلیمنٹری نمائندوں کو تو ہم کیا کہہ سکتا ہے۔

پہلے تو میں ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں کہ افریقی جرمنوں کی قسمت کا فیصلہ اگست ۱۹۱۴ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۸ء کے درمیانی وقفہ میں ہو گیا تھا۔ کئی دوسرے جرمنوں کی طرح میں نے بھی افریقی جرمنوں کو بچانے میں حصہ لیا تھا۔ میں نے یہ حصہ اس جدوجہد میں لیا تھا کہ اس کے علاوہ افریقی جرمنوں کو بچانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میری عمر یہ ہے کہ میں فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اس زمانہ میں جنگ میں ہم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کوشش کی تھی کہ افریقی جرمنوں اور دوسرے جرمنوں کو بچا لے جائیں۔ صرف افریقی جرمنوں ہی کی تخصیص نہیں۔ ہم نے دوسرے جرمنوں کو بچانے کی کوشش کی۔

پھیلے ہوئے علاقے صرف قوت بازو سے واپس مل سکتے ہیں

اس وقت کے جرمن افسروں نے تب اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ وہی جماعت سیاست بازی میں لگے رہے۔ جب ان سازشوں میں مصروف تھے تو ہم جنگ لڑ رہے تھے۔ ہم اس امید پر جنگ لڑ رہے تھے کہ ہم نے جنگ جیت لی تو افریقی جرمنوں کا علاقہ بھی جرمن قوم کے قبضہ میں رہ جائے گا۔ تب یہ جماعت وطن واپسی کرنے والے غداروں کی جماعت تھی۔ یہ ایک بالکل بیہودہ بات کر رہے تھے تاکہ جرمنی کو فتح حاصل نہ ہونے پائے جب ان لوگوں نے قوم کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تو سلطنت کے جرمنوں کی قسمت ہو گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ افریقی جرمنوں کو بچانے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے اور دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ میں ہر محاذ جنگ پر گیا اور ہر موقع پر میں نے افریقی جرمنوں کو بچانے کی کوشش کی۔ ہم نے پارلیمنٹری اجلاس میں تقریریں کی ہیں۔ پارلیمنٹ کے باہر بھی ہم نے افریقی جرمنوں کو بچانے کے لیے خدمات انجام دی ہیں۔ افریقی جرمنوں کو بچانے کا صرف یہ راستہ تھا کہ محاذ جنگ پر لڑی لڑی جائے۔ جن لوگوں نے محاذ جنگ کو چھوڑنے کی تلقین کی انہوں نے افریقی جرمنوں کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ ایک افریقی جرمن ہی کیا موقوف ہے انہوں نے تو سارے کے سارے ہی دشمن کے حوالے کر دیے۔

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ احتجاج کرنے سے اور مظاہرے کرنے سے اور جلوس نکالنے سے ہندی بیرونی واپس مل سکتا ہے وہ یا تو ایک سادہ لوح گدھا ہے یا کوئی مکار جھوٹے ہار ہے۔

جو لوگ ہم سے بچھڑ چکے ہیں انہیں واپس لینے کا طریقہ یہ نہیں کہ سب وہ اکٹھے ہو کر ان کے سامنے کھڑے ہو کر مدد کی جائیں یا فیکٹ آف آئیڈیل کی دعائیں مانگی جائیں۔ بچھڑے ہوئے ملاتے تو صرف قوت بازو سے ہی مل سکتے ہیں۔

اب ان حالات میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے کہ وہ سوال یہ ہے کہ آج ہمارے بچھڑے ہوئے ملاتے واپس لینے کے لیے کون کون سے اختیار سے جنگ کرنے پر آمادہ ہے؟

بزدل میدان جنگ سے بھاگ جائیں گے

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے ضمیر کی گہرائیوں سے کہتے ہوئے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اگر آج یہ سرکاری مشینری اور پارٹیوں کے لیڈر اور پارٹی بنکار سے ایک فوج بنا کر ہندی بیرونی فتح کرنے کی مہم میں نکلیں تو میں ان کی صفوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ میری دلی آرزو ہے کہ میں یہ نظارہ دیکھ سکوں کہ جب سروں پر توپ کے گولے گر رہے ہوں تو اس وقت ان مفتخل مظاہرے کرنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ میں ہی بتا سکتا ہے کہ اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ بیرونی کے کھلے میں لی کے گھسنے سے وہ افراتفری مچ جائے گی جو توپ کا گولہ پھٹنے سے ان کو کھلے احتجاج کرنے والوں کے صفوں میں نظر آئے گی۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات ہے کہ ہندی بیرونی شور مچانے والے خود بھی دل سے یہ یقین نہیں رکھتے کہ ان کی ان حرکتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں ہر ایک کو یہی جانتا ہے کہ یہ بیہودہ سازی کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ یہ لوگ تو سوائے شخص اس پر رہا ہے ہیں کہ ہندی بیرونی کی وجہ سے آج ہندوستان کا ماضی میں ہندی بیرونی کے

ہے جنگ کرنے سے ہو رہا ہے۔

ہر شخص اپنی زندگی میں وہی کام کر رہا ہے جس کے لیے اسے بلایا گیا ہے جب وقت تھا تو ہم نے خون کی قربانی دی۔ آج یہ لوگ اپنے وعدوں سے انحراف کر رہے ہیں۔

باتوں سے ملک فتح نہیں ہوتے

سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ آج وہ لوگ جو ہمارے قانون کے حامی ہیں کس طرح سے انتخابی عمل کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں جبکہ سات سال کی تو گزرے ہیں کہ ان مطالبات کے حامی وہ لوگ ہیں جو ہماری وہ ہیں ہماری خاندانوں نے غداری کا ارتکاب کرتے ہوئے اور جھوٹ بولتے ہوئے انتخابیوں کو یہ موقع دیا تھا کہ انتخابی عمل پر قبضہ کریں۔ ہماری خاندانوں نے یوں فریب کاری کی جو ہمیں تصور بھی نہیں تب ان حلقوں نے اس کی تائید کی تھی۔ اس وقت انہیں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ انتخابی عمل کی قسمت کا یہ فیصلہ ہو گا یا کسی اور حصے کا یہ شکار ہو گا۔ ہوں آج اس علاقے کی واپسی کے لیے کوشش کر رہا ہوں ہے یہ وہ ملک ہے اس جدوجہد میں خون بہنے کا امکان نہیں۔ انتخابی تصورات سے جنگ کرنا کسی جلسہ میں احتجاج میں شرکت کرنا یا ٹیلیفون یا خط سے بھری ہوئی تقریریں کرنے کرتے گلہ پھاڑنا یا اخبار میں مضمون لکھتے لکھتے اپنی تکلیف شہادت کو بھی کے ہاتھوں سے واقعہ کر دینا اس سے زیادہ آسان ہے کہ جتنا کہ مثال کے طور پر روبرو کا لاقانونیت کے قبضے میں چلے جانے کے بعد وہاں کسی اور دوسرے ہیں کو ذرا نقصان سے زیادہ۔

کیا وجہ ہے کہ یہ حلقوں نے آج انتخابی عمل کے مسلمہ کو تسلیم اور عالمی کے باہمی تعلقات کی سوئی ہوا کھو بیٹھا ہے اس کی یہ ہے کہ یہ سلسلہ چند ہی سال سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ سعودی عرب کے شاہی خاندان کے تخت کی بحالی کی خاطر پابندی قانون کا نفرہ لگانے والے دراصل چاہتے ہیں کہ ان کی اپنے

ملک سے علیحدہ معاہدہ نہ کر سکے اس کے ذریعے جرمنی کا دوبارہ آزاد ہونے کا امکان ہو۔ یہ لوگ انقلابی لیڈروں کی حمایت میں مصروف جدوجہد نہیں۔ وہ تو جس پالیسی کی حمایت کرتے ہیں اس سے انقلابی لیڈروں کی واپسی کے امکانات کم ہو رہے ہیں۔ ان کا نظریہ صرف یہ ہے کہ جرمنی ہر حالت میں باقی معاہدہ نہ ہو جائے۔

کون خون بہانے پر آمادہ ہے؟

جھوٹ بولنا اور مختلف پارٹیوں کی ان لوگوں کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے اطمینان سے ہمارے دیوتا سے ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ہم نے انقلابی لیڈروں کو غیروں کے حوالے کر دیا۔

ان لوگوں کو ایک ہی واضح جواب دیا جا سکتا ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ وہ ہر جرمن جس کے احساسِ حب الوطنی نے اسے اپنے آپ کو ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک فوجی خدمت کے لیے پیش کیا۔ وہ انقلابی لیڈروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ مادرِ وطن کی حفاظت کے سلسلہ میں اس پر جو فرض عائد ہوتا ہے وہ اسے ادا کرنے سے قاصر رہا ہے۔

اس کے بعد ہر وہ شخص انقلابی لیڈروں غیروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے جس نے عام جنگ کے دوران میں قوم کے جذبہ حب الوطنی اور جذبہ اطاعت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش نہ کی۔ اس کوشش کا مقصد یہ ہونا چاہیے تھا کہ قوم پامردی سے جنگ لڑتی اور مقابلے سے منہ موڑتی۔

تیسرے مرتبہ پر وہ شخص انقلابی لیڈروں غیروں کے حوالے کر دینے کا ذمہ دار ہے جس نے نومبر کے انقلاب میں حصہ لیا۔ اس انقلاب میں ہر وہ شخص حصہ لینے والے کی ذمہ دار ہے جس نے لوگوں نے اپنی بزدلی کے باعث اس انقلاب کا مقابلہ نہ کیا۔ وہ بھی ذمہ دار ہے۔ اس انقلاب نے ہمیں انقلابی لیڈروں واپس لینے کے قابل نہ چھوڑا۔

چوتھے مرتبہ پر انقلابی لیڈروں کے حوالے کر دینے کی ذمہ داری وہ تمام اصلاحیں اور

کے بعد وہ ان مسلمانوں نے ہندوستان کی زمین کے معاملوں پر دھاوا کیا ہے۔

یہ ہے وہ تاریخی سورما یہ ہے حقیقت حال۔

آج ہندوستان کی سرحدوں پر جو فوجی رہتے ہیں کیا ان سے جو سوال پوچھے جائیں وہ ان سے ہی پوچھے جانے والوں سے وہ کیا کہیں گے۔ وہ تو ان سے ہی پوچھے جانے والوں سے ہی مل سکتے ہیں۔ ان سے ہی پوچھی جانی چاہئیں جو ہے بار کسی فکر ہی وہ ان کی کیوں نہ ہوں ان سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت تو ان کو بتانے کی ہے۔ ضرورت تو ان کو سمجھانے کی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ اب قسمت کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان کو واپس لینے کے لیے اب جنگ لڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ اگر ہندوستان کو واپس لینے کے لیے جنگ لڑنے کی تحریک شروع ہوئی تو میں اس کی مخالفت کروں گا۔ میں اس لیے مخالفت کروں گا کہ مجھے یقین ہے کہ ایسی جنگ کو جاری رکھنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے جس قوم میں جوش پیدا کرنا ہوگا وہ قوم اس جنگ کو برقرار رکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ جب کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہی لوگوں کے علم و تعلیم کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ وہاں کا علاقہ جس قوم کی ملکیت ہے اس کی ذہنیت رکھتا ہے۔ آج اس ملک کو فرنگیوں نے ہمیشہ کے لیے غلامی سے دوچار کر رکھا ہے۔

ساری دنیا سے دشمنی نہ مول لینی چاہیے

جنگ سے پہلے جرمنوں نے یہی غلطی کی کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آج جرمنوں کو وہ غلطی دہراتے ہوئے بچنے کے لیے کوئی ہے کے کشمکش سے دور رہنے کا سامان نہ کرنا ہوگا ہے۔ ہمیں اس صورت حال کا ادراک کرنا ہوگا ہے جس کے باعث غلطی کا امکان ہو۔ جرمنی کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن کون ہے۔ جب یہ طے ہو جائے تو پھر اپنی ساری قوت مجتمع کرتے ہوئے ہمیں اس دشمن کا قلع قمع کر دینا ہے۔ ایک دشمن کا قلع قمع کرنے میں اگر کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ہمیں اتحاد

دوسرے مسائل میں قربانی بھی دینا پڑے تو آنے والی نسلیں ہمیں اس فرض سے سبکدوش کر دیں گی۔ آنے والی نسلیں جب یہ سوچیں گی کہ ہمیں کن مشکلات کا سامنا تھا ہمیں کیا کیا چنانچہ دقتیں تھیں ہم نے کن نازک حالات میں فیصلہ کیا تو وہ ہمیں ہر گز ملامت کا مستحق نہ کر دیں گی۔ وہ ہماری کارگزاری کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیں مستحق تعریف قرار دیں گی۔

یہاں میں پھر وہ بنیادی اصول دہرانا چاہتا ہوں کہ جو ہمیشہ میرے سامنے رہتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ چھینے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارا وطن مستحکم کر لیا جائے اور طاقت ور بنا لیا جائے۔

سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قوم کو آزاد کرانے کا امکان پیدا کیا جائے۔ جب یہ امکان پیدا ہو جائے تو پھر ہمیں بڑی سوچ بوجھ سے اپنے حلیفانہ معاہدے کرنے ہوں گے جس کے ذریعے قوم کو آزاد کرانے میں مدد ملے گی۔ یہی سب سے بہتر طریقہ ہو سکتا ہے جب قوم کی سرکاری پالیسی ذلت اور ہلاکت سے بچ جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم قوم پرست اشتراکی اس گڑھے میں گرنے سے بچ رہے تھے جس میں ہمارے ساتھی کھاتے پیتے ہمارے وطن پرستوں کی ترغیب کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر ہم نے آنے والی جدوجہد کے لیے تیاری کی بجائے صرف روایتی احتجاج پر اکتفا کیا تو ہم خود اپنی ناکامی کے ذمہ دار ہوں گے۔

حلیف ڈھونڈنے کی مشکلات

پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے ساتھ ہماری کاوش یہ تھا کہ ہم نے آسٹریا کی اس سرکار سے حلیفانہ معاہدہ کیا تھا جس پر ہیبسبرگ کا شاہی خاندان حکمران تھا۔ آسٹریا کی یہ شاہی سرکار ظلم و ستم کی پوری گورنمنٹ تھی۔ اس وقت کوئی سرکار سے حلیفانہ معاہدہ کرنا محکوموں سے دوستی کرنے کے مترادف تھا۔ آج بھی اگر ہم نے اپنی جدوجہد بالشویک میں اشتراکی جذبات پر مبنی کر لیا تو ہم کبھی ترکی آزاد نہ ہو سکے گا۔

میں نے اوپر جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے ان پر جو اعتراض ہو سکتے ہیں اب میں ان کا اختصار سے بیان کرتا ہوں۔

۱۔ آج تک کسی اس حد تک کمزور ہو چکا ہے کہ اس کی کمزوری بالکل عیاں ہے۔ بھلا اس حالت میں طاقتور کے ساتھ کوئی ملک علیحدہ معاہدہ کیوں کرے گا۔

۲۔ جو قومیں طاقتور کی حیثیت سے پہلی جنگ عظیم میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اب وہ ترکی سے علیحدہ معاہدہ کریں۔

۳۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ دیگر اقوام میں یہودیوں کا تناسب کسی حد تک سرایت کر چکا ہے۔ یہ اقوام اس حد تک یہودیوں کے زیر اثر ہیں کہ کبھی خود اپنے مفاد کا اندازہ نہیں۔ ان اقوام میں یہودیوں کا تناسب اقوام کے اپنے مفاد کے شعور کے طور پر غالب ہے۔ اگر یہ حالت ترکی کے متعلق ان اقوام کی ایک خواہش اور ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے مقصود کس طرح پورا ہو سکتے ہیں۔ کیا یہودی ان خواہشات اور ان مقصودوں میں خلل پیدا نہ کریں گے۔

کمزور کا ساتھی کوئی نہیں ہوتا

بہر حال ہے کہ پہلے اعتراض کے دو پہلوؤں میں سے ایک کا جواب تو میں نے پہلے ہی دے دیا ہوں۔ یہ درست ہے کہ ترکی کی موجودہ حالت میں کوئی قوم اس کے ساتھ علیحدہ معاہدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ جب ایک سرکار کی حالت یہ ہو کہ اس کی حکومت کو خود اپنے اوپر ذرہ بھر اعتماد نہ ہو تو دنیا کی کوئی دوسری سرکار کیوں اس کے علیحدہ معاہدہ کرنے لگی۔ ہمارے بعض ہم وطن حکومت کی جانب سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رائے عامہ میں ایسا خلل پیدا ہو چکا ہے کہ ترکی سرکار کی موجودہ روش کے علاوہ کوئی اور چارہ کار ہی نہیں رہا۔ میں اس عذر کو غلط سمجھتا ہوں اور اسکی پرزور تردید کرتا ہوں۔

یہ ٹھیک ہے کہ گزشتہ چھ سال میں ہماری قوم نے جس بے بسی کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ کر دل بیٹھ جاتا ہے قوم کی شدید ترین ضروریات کو جس بے بسی سے ضرر پہنچایا

گیا ہے اور اس کے متعلق جس لاپرواہی کا اظہار کیا گیا ہے اسے دیکھ کر یہ سوچا تو سرے سے امیدوں کے چھکے ہی چھوٹ جاتے ہیں ہماری قوم نے بڑی بڑی کے مظاہرے پیش کیے ہیں کہ جو بڑا سے بڑا عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اسی قوم نے چند سال پہلے دنیا کے سامنے شوکت اور تیور کے ایسے عملی نمونے پیش کیے ہیں جس پر انسانیت ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

جولائی اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر قوم عالم کے بہترین جوہر اس اتحاد کامل کا ثبوت پیش کیا تھا۔ جو تاریخ میں دنیا کی کسی قوم نے دیرینہ دعوے اور صبر و شکر کا وہ نمونہ پیش نہیں کیا تھا۔ جو مسلمانوں نے پیش کیا تھا۔ آج یہی قوم بے بس ہو چکی ہے اور حواس باختہ ہو چکی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری قوم کی موجودہ حالت اس کی ذلت میں داخل ہے۔ آج ہمیں خود ذلت اور مصیبت برداشت کرنی پڑتی ہے اس کے نظارے ہم اپنے چاروں جانب دیکھتے ہیں اور اس کا شکار ہم خود بن چکے ہیں۔ وہ اس غداری کا نتیجہ ہے اس کا ارتکاب ۱۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو کیا گیا تھا کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

برے کام کا انجام برا ہوتا ہے

اس مقولے کی سچائی کی بہترین مثال ہماری موجودہ حالت ہے۔ ہر بھی ہماری قوم کی صلاحیت میں بڑے بڑے جوہر پنہاں ہیں وہ جوہر آج بھی چھپے ہوئے ہیں لیکن بالکل ضائع نہیں ہوئے۔ یہ جوہر ہماری قوم کے ضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے ہیں۔ آج کل چاروں جانب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں بھی یہ جوہر کبھی کبھی بجلی کی طرح کوند جاتے ہیں۔ ان کی چمک دعوت کرتی ہے کہ ایک دن پھر ایسا آئے گا جب قربانی کے گزرے ہوئے یہ سنہرے دن آ جائیں گے۔ بارہا ہم دیکھتے ہیں کہ جوان نوجوان کسی اجتماع میں کھڑے ہو کر اس طرح ۱۹۴۷ء میں قربانی کا حلف اٹھاتے تھے۔ اسی طرح اب بھی یہ عہد و پیمان کرتے ہیں کہ قوم کو بچانے کی خاطر

پی جہاں عزیز پلٹ کر دیں گے۔ لاکھوں انسان ہوں مصروف جدوجہد ہیں۔ اس طرح ایک سو ہو کر پوری ہمت اور جوش مشقت سے کر رہے ہیں۔ گو ہمیں بے انتہا کامیابی اگر نہیں ہے۔ لیکن اپنی بھلی کے قریب اضافہ ہو رہا ہے۔ آسان مل چلانے میں مصروف ہے۔ ہر شخص اپنی تجربہ گاہ میں مصروف ہے۔ ہر شخص کو اپنے فرض کا یقین ہے کہ ان کے ہونے ان کے جوش اور ان کی وفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

یہ درست ہے کہ قوم آج بھی پہلے دشمنوں کے ہاتھوں ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی ہے لیکن آج وہ حالات نہیں جیسا کہ بلکہ عرصہ پہلے دشمن کی بدسلوکی اسی خوشی برداشت کی جاتی تھی۔ آج دشمن کی بدسلوکی کے خلاف بھی ہر طرف ہو رہا ہے بلکہ شک نہیں کہ قوم کی روش میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

نااہل حکمران بڑی آفت ہیں

ابھی اس تبدیلی نے یہ شکل اختیار نہیں کی کہ اس تبدیلی کا شعور بھی پیدا ہو جائے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ قوم کی قیادت اور سیاسی طاقت کو بحال کرنے کے لیے سوچ بچار جدوجہد شروع ہو جائے گی۔ اگر یہ جدوجہد ابھی شروع نہیں ہوئی تو اس کا الزام صرف ان نااہل لوگوں کے سر ہے۔ جن میں قدر کی کوئی بھی اہلیت نہیں۔ باوجود نااہل ہونے کے یہ لوگ ۱۹۱۸ء سے ہمارے حکمران بنے بیٹھے ہیں۔ اور ہمیں تباہی کے راستے پر لے جا رہے ہیں۔

ہاں ہاں اگر آج کوئی شخص ہماری قوم میں ابھرتا ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ قوم کی رہنمائی کے لیے کیا خدمت انجام دی گئی ہے۔ یہ شکایت کرنا کہ عوام حکومت کے قدم کی پوری تائید نہیں کرتے۔ سرکار کا وجود کہاں ہے کہ اس کے کسی قدم کی تائید کی جائے۔ پھر اگر سرکار کے اقدامات کی تائید نہ ہو تو اس کا مطلب بھی تو نہیں کہ قوم کا قصور ہے۔ حکومت ایک مقدس امانت ہے۔ اگر حکومت کے اقدامات کی عوامی تائید نہیں ہوتی تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ حکومت اس امانت کو بچانے سے قاصر

ہے۔ آخر ہماری حکومت نے قوم کے جذبات خود اعتمادی اور شجاعت و غیرت کو بیدار کرنے کے لیے کیا اہتمام کیا ہے۔ دشمن کے مقابلہ میں علم خلوص کر کھڑے ہونے کی ہمیں ترغیب ہی کب دی ہے۔

۱۹۱۹ء میں جب صیہونیت کے بعد معاہدہ وجود آزمائوں پر ٹھونسا گیا تو یہ امید کی جاتی تھی کہ علم قوم کی اس جمہوری جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترکی کو آزاد کرانے کی آواز بہت جلد ہو گی جب کوئی صیہونیت کے معاہدہ کی شرائط سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا ہے کہ قوم کو ہتھیار ڈالنے کی طرح اختیار کرے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مظلوم قوم میں آزادی و حریت کا انتقال حاصل کرنے کے لیے تحریک شروع ہو جاتی ہے۔

شکست سے بھی فتح کا سامان تیار ہو سکتا ہے

آپ غور کریں کہ معاہدہ ہماری سے ترکی قوم کو بیدار کرنے کے لیے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس معاہدے میں ترکوں کا خون بہانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ ترکوں کو ذلیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہماری حکومت چاہتی تو اس معاہدے سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لے سکتی تھی۔ اگر ہماری حکومت یہ طے کر لیتی کہ ہم ٹھیک طرح چلائی جاتی تو اس صیہونیت کے علم کو رائج کرنے کے لوگوں کی مخالفت اور بہادری دور کی جا سکتی تھی۔ ان میں ٹھیک جذبہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اس جذبہ کو ٹھیک جذبہ سے دوچار ہونے کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی قربانی سے پیچھے نہ ہٹتی۔

اس صیہونیت کے کی ایک ایک شرط ترکی قوم کے پہلے ہی کچل دی گئی تھی۔ اس کچلی گئی سے پہلے اہل تھے۔ اس ظلم کے شکنجے یہاں تک کسے جا چکے تھے کہ چھ کروڑ مرد و عورتیں ہوں محسوس کرتے تھے کہ ان کی رگیں پھٹ رہی ہیں۔ غیظ و غضب اور جذبات کو آگ سب کی جلا کر بھسم کر دیتی۔ یہ ظلم ہوں حکومت اس طرح چلائی کہ سارا ملک ایک دہکتی ہوئی بھٹی کی شکل اختیار کر جاتا۔ پھر اس آگ میں سے آہنی عزم کی تلوار

ہو رہو رہی ہے۔ تم ایک آواز سے پکار اٹھتی کہ ہر تشبیہ ہی رکھو اور تصویر ہے پیام کرو۔

بچوں کو پنگوڑے میں جنگ کی لوریاں دینی چاہئیں

ہاں ہاں ایسے معاہدے سے یہ کام ہو سکتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت ہر قوم ہی جو معاہدات نامہ کیے گئے ہیں وہ گستاخانہ ہیں۔ اس تعلیم و تربیت کی کمزوری کا انکشاف کر کے ایسا پروپیگنڈہ کیا جا سکتا تھا کہ قوم کے سوئے ہوئے جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے اور ہر شہری کے لہو کو اس کو دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

رات کو بچوں کو سلاتے وقت مائیں جو لوریاں دیتی ہیں ان میں یہی تذکرہ ہوتا کہ ملک کا ایک ایک انسان یہی چاہتا ہے۔ ہر گھر اور ہر بستی میں یہی تذکرہ یا ہوتا اور در و دیوار پر یہی نشانات لکھے نظر آتے۔ ہر کوچہ و بازار میں یہی نعرے بلند ہوتے۔ غرض اس عظیم جدوجہد میں ساری قوم شریک ہو جاتی۔ آج ہماری محب وطن انجمنیں دنیا کی اقوام سے جو یہ دعا مانگتی ہیں کہ ہمارے رب ہمیں غلامی سے نجات دے۔ یہ دنیا کی ہر ایک ہندو جنگ مذہبیات میں جہاں اور مناجات کے الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ تو ہمیں طاقت دے۔ ہمیں اتحاد کی توفیق دے۔ ہمیں ثابت قدم رکھ۔ انصاف کرتو ہمیشہ سے عادل ہے۔ انصاف کر۔ اگر ہم آزادی کے مستحق ہیں تو ہمیں آزادی دے۔ اے رب ہمیں جدوجہد کی توفیق دے۔

ان میں سے کسی دعا کا کوئی لفظ نہیں بدلا گیا۔ کچھ بھی نہ کیا گیا۔

کیا ہم دنیا کے خانساماں اور رہبر ہیں؟

اب اس میں غلط کیا بات ہے کہ ہماری قوم کو جو ہونا چاہیے تھا وہ نہیں۔ یا جو وہ بن سکتے تھے نہیں بن سکے۔ باقی دنیا آج ہمیں اپنا خانساماں اور رہبر دیکھتی ہے یا ہمیں اپنا مددگار سمجھا جاتا ہے تو ملک کے تصور میں کمزوری کا کیا دخل ہو سکتا ہے۔

سچ ہے کہ ہماری قوم کی خلقیت دوسری قوموں کے ساتھ ملا ہوا

معاہدہ طے کرنے میں رکاوٹ ہے لیکن ہماری حکومت اس سے بھی بڑی رکاوٹ ہے۔ ہماری حکومت ایسی عائلی حرمہ دوست ہے اور آج بھی ایسی عائلی حرمہ دوست ہے کہ ۷۰ سال کے تعلیم و تشدد کے بعد اب عوام میں حریت کا جذبہ ہی ختم ہو چکا ہے۔

اگر ہماری قوم دوسری قوموں سے علیحدگی معاہدہ کرنے کی خواہش مند ہے تو سب سے پہلے اسے دوسری قوموں کے سامنے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہمیں ایک ایسی حکومت حاصل کرنی ہے جس کا کوئی دباؤ نہ ہو۔ ایسی حکومت سے کام نہیں چلے گا جو برطانوی سرکار کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہو۔ ہماری حکومت ہمارے سروں پر غیروں کا مسلط کردہ ایسا ظالم حکمران ہے جسے دنیا کی کوئی قوم بھی پسند نہیں کرتی۔

چھ سال میں انتخاب ہو سکتا ہے

اگر ہماری قوم کو ایسی حکومت میسر آ جاتی ہے جو اس مسئلہ کا حل ہو یا یہ فرض کر لیتی تو وہ چھ سال کی مدت کے اندر اندر اس معاملے کی خاطر حکومت عملی اس قدر طاقت سے چلاتی کہ عوام میں اس کی حمایت راسخ ہو جاتی۔ عوام کا جذبہ حریت بیدار ہو جاتا۔ آزادی کی تڑپ تیز ہو جاتی۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تقسیم میں بڑی کی رائے نہیں لی۔ اب وہ اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس اعتراض کا جواب بہت آسان ہے۔

جنگ کے دوران میں جرمنی کے خلاف پروپیگنڈے کے باعث دوسرے ملکوں میں جرمنی سے جو عام دشمنی اور مغائرت کا احساس پیدا ہو چکا ہے وہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک جرمن قوم میں قومی بیداری کا جذبہ پیدا کر کے ایک مرتبہ انقلاب نہیں ہو جاتا۔ جب ایسا ہو گیا تو جرمن حکومت بھی بالآخر ایک حکومت کے طور پر کے دوسری قوموں کے برابر میں شمار ہونے لگ جائے گی۔ جب جرمن سرکار جرمنی کی سیاست میں داخل ہو جائے گی تو پھر دوسری حکومتیں بھی ہمارے ساتھ معاملہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی۔ جب تک کوئی حکومت ہو کوئی قوم پالیسی تبدیل نہیں کرتی۔ کہ جب ہمارے ساتھ علیحدگی معاہدہ

کرتا ہے تب تک وہ اس پروپیگنڈہ کی مہم شروع کرتے جس سے اس ملک کی رائے عامہ
جرمنی کے ساتھ ہو جائے۔ جب کسی ملک کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کے مفاد کے لیے
جرمنی کے ساتھ علیحدہ معاہدہ کرنا مفید ہو سکتا ہے تو پھر اس ملک کی حکومت جرمنی کے
حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دے گی۔ سفارتی ذرائع سے پوری
تفصیلات اور استقلال سے کام لیا گیا تو تب کہیں جا کر یہ منزل طے ہو گی۔

تین یا زیادہ اقوامی اتحاد قوموں کے مابین ہوتے ہیں نہ کہ اشخاص کے مابین

چونکہ کسی ملک کی رائے عامہ ہموار کرنے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری
ضروری ہے کہ مہم شروع کرنے سے پہلے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کسی مستقل رائے
عامہ کو ہموار کرنے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مہم اس وقت
تک شروع نہیں کی جا سکتی۔ جب تک یہ پتہ نہیں نہ ہو جائے کہ اس مہم سے جو نتائج
برآمد ہوں گے وہ مستقل میں مفید ثابت ہوں گے۔ رائے عامہ ہموار کرنے والے عامہ کو
بدلنے کی مہم کسی وزیر خارجہ کی خوشامد سے متاثر ہو کر شروع نہیں کی جا سکتی۔ چاہے یہ وزیر
صاحب کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں۔ ایسی مہم شروع کرنے سے پہلے اس امر کی کوئی
ٹھوس علامات ہونی چاہیے۔ اس مہم کے نتائج واقعی مفید ثابت ہوں گے۔ ورنہ دور اندیشی
کے بغیر شروع کیے ہوئے رائے عامہ کو بدلنے کی کسی مہم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عوام میں مستقل
طور پر بدظنی پھیل جائے گی۔ اس قسم کی ٹھوس علامات یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اکثریت
مجموعی کسی حکومت کی پالیسی واضح طور پر مستقل در معین ہو۔ علاوہ یہ پالیسی متعلقہ ملک
کی رائے عامہ میں بھی مقبول ہو۔ کسی ملک کی حکومت کے کسی رکن کی ذاتی خواہش یا
دل لگی ہو تو اس امر کی علامات نہیں ہو سکتیں کہ یہ واقعی اس ملک کی علیحدہ حکومت
قائم کیا جا سکتا ہے۔ ہاں جب ایک دفعہ ایسی علامات مہیا ہو جائے تو پھر ایسی پالیسی کے
حق میں رائے عامہ کو زیادہ ہموار کرنے کے لیے حکومت بھی پروپیگنڈہ کی مہم شروع کر

حق ہے۔ اس مہم کے ذریعہ حکومت کی پالیسی کا پرچار کیا جائے گا۔ اور اس کے لیے عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی جب پراپیگنڈہ کی یہ مہم چلائی جائے گی تبھی پتہ چلے گا کہ وہاں کے عوام کس حد تک حکومت کی پالیسی کی مستقل تائید پر آمادہ ہیں۔

اپنی مدد آپ کرو تو دنیا بھی تمہاری مدد کرے گی

آج ہماری قوم کی حالت ایسی ہے کہ ہم سے حلیفانہ معاہدہ کرنے پر کوئی حکومت تبھی آمادہ ہوگی جب ہماری رائے عامہ ہماری حکومت کی پشت پناہی پر آمادہ ہو۔ پھر ہماری حکومت اور ہماری رائے عامہ دونوں پورے جوش و خروش سے قومی آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔ جب تک ہماری حکومت اور ہماری رائے عامہ دونوں مل کر آزادی کی آزادی کے لیے صدوجہد نہیں کرتیں۔ جب تک ہماری حکومت کو رائے عامہ کی پوری تائید حاصل نہیں ہو جاتی تب تک دوسرے ممالک کی رائے عامہ کو آزادی کے حق میں ہموار نہیں کیا جا سکتا۔ آخر دوسرے ممالک کی رائے عامہ خود اپنے قومی اور ملکی مفاد کا خیال رکھتی ہے۔ وہ ہمیں اپنا حلیف کی صورت میں بنا سکتے ہیں جب ہمیں یقین ہو جائے کہ ہم ان کے حلیف بن کے ان کے ہمدرد پہلو کھڑے ہو کر ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ جب تک کسی ملک کی رائے عامہ وہاں کی حکومت کی تائید نہ کرے اور دونوں مشترکہ طور پر کسی مستقل پالیسی کی خاطر قربانی دینے پر آمادہ نہ ہوں تب تک ان سے حلیفانہ اتحاد نہیں کیا جا سکتا۔

نئی پالیسی مقبول بنانے میں وقت درکار ہوتا ہے

اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ایک شرط اور بھی لازم ہے کہ کسی ملک کی رائے عامہ کو تبدیل کرنے کے لیے خاصی مشقت درکار ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ آسان نہیں ہوتا کہ یہ کام خاصہ مشکل ہے۔ جب کوئی ملک آزادی کے حق میں اپنی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مہم شروع کرے گا تو دنیا کے بیشتر ممالک اس کی مخالفت بھی کریں گے۔

حالت وہ لوگ کریں گے جو اس منصوبے کو ناکام بنانا چاہتے ہوں گے۔ یہ مخالف کوشش کرنے والے پلان کے حق میں رائے بھی پیش کریں گے۔ اب اگر خود حزب اللہ ایسی حرکتیں سرزد کرے گا کہ جن کی مخالفت کرنے والوں کو آسانی سے پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرنے کا موقع مل جائے تو کیا یہ مناسب ہوگا؟ میں تو کہوں گا کہ ایسی حرکتیں سرزد کرنا ایک مجرمانہ عمل ہوگا۔

کسی ملک کی اندرونی پالیسی کے متعلق عام لوگوں تک پہنچنے اور ان کی سمجھ میں آنے کے لیے خاصہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی پالیسی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو تیاریاں کی جاتی ہیں انہیں خفیہ رکھنا ہوتا ہے۔ کم از کم ان تیاریوں کو جو اصل مقصد ہے اس کا انکشاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں تمام عوام کو حکومت پر اعتماد ہوتا ہے۔ سرکار کو اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ دیگر دنیا کے ساتھ کسی کی دوستانہ یا دشمنانہ روش کی پالیسی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس سے کسی حکومت کو تقویت پہنچتی ہے۔ اکثر لوگ اس قسم کی دوستانہ اور دشمنانہ پالیسی سے گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی معاملہ کی تہہ تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ سیاسی مصلحتوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ حکومت کسی کی تشہیلی مداخلت نہیں کی جا سکتی۔ مجھے یہ ہوتا ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی نئی حکومت عملی شروع کی جاتی ہے تو وہاں کے دشمن حلقے کچھ نہ کچھ دہشت پالیسی کی مخالفت ضرور کرتے ہیں کیونکہ وہ اسے سمجھ نہیں سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ محض اندھیرے میں مارکہ لڑائیاں ماری جا رہی ہیں قدامت پسند حلقے ہر نئے تجربہ کے مخالف ہوتے ہیں۔ یوں ہر نئی پالیسی کو کچھ نہ کچھ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دیگیں مارنے سے کچھ فائدہ نہیں

اس حالات میں ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ لوگ دوستوں کے مابین مصالحت کی سعی کر رہے ہیں ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے۔ اندرونی کی حرکتوں سے ان کی مساعی میں اضافہ نہ کیا جائے۔ اس ضمن کا اخلاقی خاص طور پر وہاں ہوتا ہے

جب ہماری محب وطن تنظیمیں اور کچھ حلقے کے کھاتے پیتے لوگ قومی معاملوں میں ہنگامہ کر سیاسیات کے متعلق چوکیں لگاتے ہیں وہ ایسی دھوں کی لپیٹتے ہیں کہ اور ہی باتیں ہو جاتے ہیں کہ جس کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ کسی تو پہ طرہ لگا دیا جاتا ہے کہ کیپ یا انگلی بجری بیڑا اٹھا چاہیے۔ کبھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ ہمارے مطلوبات تو ضرور دیں گے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان شور و غوغا پر عمل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ بے ضرر و بے مزہ دھماکے ہیں جو اشتعال کے جوش میں مالک دی جاتی ہیں۔ ہماری جاں کے دشمنوں کی مطلب برآری کے لیے بہت سہارے پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کو کھلے نعروں کا پتا چلا کر کے ان کے ذریعہ قومی کے سیاسی مفاد کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

ہماری قوم کی طاقت اور اس کا جوش ایک وقت ساری دنیا کے خلاف شاندار لیکن بے ضرر مظاہروں میں ضائع کیا جا رہا ہے۔ ان مظاہروں سے الٹا ہمارے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو لوگ ان مظاہروں میں حصہ لیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسے معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کی اصل بنیادی شرط کیا ہے۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے بالکمل طور پر خفیہ رکھو۔ ہاں ان حکومتوں کے خلاف ایک وقت ہو گئے سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی تمام قومی طاقت اور مادی قوت اپنے بدترین دشمن کے خلاف پوری جسمانی جرأت سے لڑنے پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ مظاہروں کے باعث اس امر کا کوئی امکان ہوتی نہیں رہتا کہ ہم کسی حکومت سے علیحدہ علیحدہ تعلقات قائم کر کے اپنے بدترین دشمن کے ساتھ فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اپنے ہاتھ مضبوط کر سکیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز کرو بڑی باتوں پر توجہ دو

یہاں ہر قوم پرست اشتراکیت کے لیے موقع ہے کہ مدد کی راہنمائی کرے۔ اپنی قوم کو یہ سبق سکھائے اور فرض ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنی توجہ ہٹا کر بڑے

پیش کیا ہے اور کیا خوب ہمارے طرف سے پیش کیا ہے۔

اگر کوئی شخص اس حقیقت کو نہیں سمجھتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنجیدگی میں دشمنی کے لیے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش سے دستبردار ہو جاتا ہے اگر ہمیں سے ہمارا معاہدہ اس پر نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمارے مقبوضات پر نہیں پر اطالیہ سے ہمارا معاہدہ اس پر نہیں ہو سکتا کہ اس نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح پر بلغاریہ سے بھی ہمارا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سوائے فرانس کے ہر کس سے ہمارا معاہدہ ہونے کا امکان باقی رہ جاتا ہے۔ اگر فرانس نے فقط ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا تو ہم سے پھیلے ہیں!

دشمنی کا ہر کس سے ہو وہ کس حد تک دشمن قوم کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق کسی بھی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں ہاں اگر کوئی بیرونی طاقت اس کی حمایت کرے تو بیشک سے یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہ شخص سادہ لوح دیوانہ ہے یا کوئی مکار پولی ہے!!!

جو لوگ ایسی تجاویز پیش کرنے کے مرتکب ہیں۔ ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ سادہ لوح احمق نہیں بلکہ مکار پولی ہیں!!!

خارجہ حکمت عملی میں کچھ چیزیں ترک کرنا ہوگا

غرض مستقبل میں یہ محال ہے کہ دو قومیں آج تک دشمن کی دشمن رہی ہیں لیکن مستقبل میں ان کے حقیقی مفاد سے مطابقت رکھتے ہیں ایسے دشمن کے متعلق اپنی روش بدل دیں۔ لیکن جہاں تک عقل انسانی کام کرتی ہے ایسا تب ہی ہوگا کہ جب پہلے خود ہماری سرکار کی داخلی قوت اتنی بڑھ جائے گی اور ہماری قوم کے متعلق یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم اپنی قوت کے لیے جو جو بھی قربانیاں کریں گے وہ ہمیں ضرور واپس ہو جائے گا کہ کسی قوم کا ہم سے حلیفانہ اتحاد کرنا اس قوم کے لیے بہت مفید ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی لازم ہے کہ ہم اپنے قومی معاملات انجام دینے میں آئندہ کچھ چیزوں کا ارتکاب ترک کر دیں۔ مثلاً دیگر ممالک میں اپنی بین الاقوامی تجارت کے لیے اقتصاد

کرنا ہوگا۔ اس کے باعث ان دونوں کو ہی اپنی پالیسی کا از سر نو تعین کرنا پڑے گا۔ دونوں کے پرانے دشمن ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ دوستی کا طلبگار ہونا نہیں دیکھ سکتے۔

تیسرے اعتراض کا جواب دینا بھی مشکل ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس ملکوں سے طلبگار ہونا کا امکان ہے ان کے حقیقی مفاد کے ترجمان یہودیوں کی مخالفت کے باوجود اپنی خود پسی صورت پر قائم رہ سکیں؟ یہودی تو اب خود بھی اور بڑی طاقتور مغربی سرکاروں کی جان کا دشمن ہے۔

مثال کے طور پر کیا برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم یہودیوں کے تاثرات کو نظر انداز کر سکیں گی یا نہیں؟

فلسطینیت نے صیہونیت کی کمر توڑ دی ہے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس سوال کا جواب دینا خاص مشکل ہے۔ اس سوال کا جواب سے متعدد کا انحصار ہے کہ کوئی حتمی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ ہاں ایک بات یقینی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی سرکار کی کوئی ایک وزارت کسی خاص وقت میں رائے عامہ کا ایسا مکمل تعاون حاصل کر چکی ہو اور ملک کے مفاد کی بنا پر اگر وہ یہ کہے کہ صیہونیت کی بین الاقوامی حیثیت بھی وزارت کی مخالفت کی رو میں روڑے اٹکانے کی کوئی موثر کوشش نہ کریں۔

حالیہ کی فلسطینی حکومت نے یہودیوں کے تیئں سب سے بڑے تعصبوں کو ناکارہ کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہودیوں کے خلاف اس جدوجہد کے باوجود حالیہ کی فلسطینی حکومت یہودیت کے فتنہ کا کامل احساس نہ رکھتی ہو۔ اگر چہ واضح طور پر محسوس نہ کرتی ہو لیکن یہ ہے کہ حالیہ کی فلسطینی حکومت کو اس فتنہ کی ہیئت کا احساس ہے۔ بہر حال اس جدوجہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صیہونیت کی عالمگیر حیثیت اور ہر قسم کی سرکاری حمایتوں کے باوجود ایک عالمگیر طاقت ہے۔ اس کی

زیر فی قوت کا مقابلہ کرنے والے عناصر بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ حالیہ کی فسطائی حکومت نے ایک طرف فری میسن اور دیگر خفیہ انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ دوسری جانب جو اختیارات اپنے آپ کو قومی مفاد کا پابند نہ سمجھتے تھے انہیں بند کر دیا گیا ہے۔ تیسری جانب مارکس ازم شعلی طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سرکار کے فسطائی تخیل کی نشوونما اور اس پر عمل درآمد جاری ہے یہ سب کوششیں چند ہی سال میں حالیہ کی حکومت کو عالمی قوم کے مفادی مخالفت کے قابل بنا دیں گی۔ اس کے بعد صہیونیت کا وہ اژدھا جس نے ساری دنیا کو لپیٹ میں لے رکھا ہے ہنکارتا ہوا بنگلہ زار ہے اس کا عالمی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

امریکہ اور انگلستان کے دل بھی صاف نہیں

انگلستان میں حالات ایسے مبید ہرزس نہیں کہ یہ ملک دنیا کی سب سے زیادہ آزاد جمہوریت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں یہودی اپنی من مانی چلاتا ہے۔ یہودیوں پر کوئی پابندی نہیں۔ یہودیوں کا رائے عامہ پر تسلط ہے۔ اخبار یہودیوں کے واسطہ سے لیتے ہیں۔ وہ خود اس کے انگلستان میں ایک اور مستقل کل مش جاری ہے۔ یہ کل مش دو عناصر کے دو ہیں ہے۔ ایک طرف وہ حلقے ہیں جن کے پیر دسرکاری مفادی حفاظت ہے۔ اور دوسری جانب یہودیوں کی عالمگیر آمریت کے وکیل ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ کشمکش سب سے پہلے اس وقت ہوئے آئی جب مسئلہ جاپان کے متعلق رجعا پسند کے کنزرویٹو پارٹی نے ایک روش اختیار کی اور اسرائیل نے اس کے خلاف روش پر چلنا شروع کر دیا۔

جنگ عظیم کے ختم ہونے پر امریکہ اور جاپان کی وہی قدیم رقابت کھل کر سطح عام پر آئی جب امریکہ اور جاپان میں رقابت شروع ہوگئی تو یورپ کی بڑی بڑی سرکاریں اس مسئلہ سے علیحدہ متعلق نہ رہ سکیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا کہ اس کے باعث جنگ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ مگر برٹش فون کے لحاظ سے امریکہ کے رشتہ دار ہیں لیکن

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر انہیں حسد اور تشویش بھی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ امریکہ میں اقتصادی اور عسکری قوت کے بل بوتے پر دنیا کو چلایا جا رہا ہے۔ کبھی امریکہ محض برطانیہ کا مقبوضہ تھا۔ پھر وہ بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوا اور آج امریکہ چین کی طرح سپر پاور بنتا جا رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ چین ساری دنیا کی منڈی بنتا جا رہا ہے۔ مگر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انگلستان اپنے علاقائی معاملات پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔ برطانوی مدبرین اس امر کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کہ جہاں تک دنیا میں پھیلاؤ ہو رہا ہے کہ دنیا کے سمندروں کی ملکہ برطانیہ ہے۔ وہاں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ دنیا بھر کے سمندروں پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کا تسلط ہے۔

برطانیہ امریکہ کی دیرینہ دوست ریاست کا رقبہ اتنا بڑا ہے جتنا یہاں کے وسائل اور ذرائع سے تھوڑے عرصہ میں استعمال میں آنے لگے ہیں کہ دنیا کی سلطنت کی طرح امریکہ پر حملہ کرنا آسان نہیں۔ اگر قسمت ایک دن یہ موقعہ پھینکے کہ قوموں کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے امریکہ سے جنگ چھڑ جائے تو برطانیہ بغیر کسی ساتھی کی مدد سے بچ جانے کی کوئی امید نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ پہلا گورا گورا ٹھرو ہاں کی بیلی بیلی قوم کی طرف بڑھا کر دونوں میں علیحدہ تعلقات کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ نیل راہ یا نگاہ سے برطانیہ کا تعلق ایک ناقابل معافی گناہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہی راہ یا نگاہ سے برطانیہ کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے سوا کوئی طریقہ ہی نہیں تھا۔ آج برطانیہ کو دنیا میں عالم گیر حیثیت حاصل ہے۔ لیکن برطانیہ میں جو شدید اختلافات پرورش پا رہے ہیں ان سے برطانیہ کی عالمگیر حیثیت کو خطرہ لاحق ہے۔

آج سے چھ سو برس کے عرصہ میں برطانیہ اور جاپان پہلو بہلو بڑھتے چلے آئے ہیں پھر بھی آخر کار برطانیہ نے اس ایشیائی قوم کے ساتھ علیحدہ تعلقات قائم نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے تمام پرانے اثاثہ سے منتقل ہو کر جاپان سے تجارت شروع کر

دی۔

یہودی نے برطانیہ میں رسوخ پیدا کر لیا ہے

آخر اس معمہ کا حل کیا ہے کہ ۱۹۱۸ء تک جب برطانوی حکومت ترکی سلطنت سے لڑ رہی تھی تو یہودی اثرات نے برطانوی حکومت کی پالیسی کی پرزور حمایت کی۔ اب برعکس اس کے یہی اثرات اپنی حکومت سے برگشتہ ہو کر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

ترکی کو برباد کرنا برطانیہ کے مفاد کا تقاضا تھا۔ یہ تو یہودیوں کے مفاد کا تقاضا تھا۔ جس جاپان کی تباہی اگر چہ برطانیہ کے سیاسی مفاد کے مطابق نہیں لیکن اس سے یہودیوں کے دوررس منصوبوں کو بڑی تقویت ملنے کی امید ہے۔ خود یا گھر میں عبوری بادشاہت قائم کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ لگتا ہیں اپنی ساری طاقت اس پر صرف کر رہا ہے کہ دنیا میں اپنی عالم گیر حکومت قرار رکھے۔ یہودی اپنے جارحانہ منصوبے اس طرح سے تیار کر رہا ہے کہ "عالم گیر عبوری بادشاہت" قائم ہو جائے۔

سٹہ بازی کی منڈیوں

یہودی نے آج قوت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ یورپ کی ہر حکومت یہودیوں کی کٹھ پتلی بن چکی ہے۔ کہیں تو یہودیوں کے ہاتھ میں "مقننہ اکثریت" کے ذریعہ سے رسوخ حاصل کر رکھا ہے۔ اور کہیں رائے یا شورائی کے ذریعہ سے براہ راست اقتدار کے ہاتھ میں پہنچا دیا ہے قدیمی یہودی کے جال میں پھنسی تھی۔ یہودی اپنے پرانے دنیا کا رہا ہے۔ مالیاتی معاملے کے ذریعہ سٹہ بازی کی منڈیوں پر قبضہ کر کے یہودی امریکہ میں سرمایہ کا بہت حاصل کر چکا ہے۔ سال بہ سال امریکہ کے حزانوں پر یہودیوں کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکہ کی آبادی اس وقت بارہ کروڑ ہے۔ اس آبادی کا بہت تھوڑا حصہ یہودیوں کے اثر سے باہر ہے۔ یہودی اس رپ کچھ تا ہے کہ امریکہ کی رائے عامہ کا تھوڑا سا حصہ بھی کیوں اس کے اثر سے باہر ہے۔

رائے عامہ کو بہت چالاکی سے دھوکہ دے کر اپنے قبضہ میں لانے اور پھر اس رائے

عالم سے اپنی غرائض پوری کرنے کا کام لینے میں یہودی کو عین وجہ کا ملکہ حاصل ہے۔

یہودیوں کے بڑے بڑے لیڈروں کو پانچ بجنس ہے کہ وہ دن دور نہیں جب تورات مقدس کے احکام پورے ہوں گے۔ اور یہودی دنیا کی تمام دیگر قوموں کو زیر کر لیں گے۔

صیہونیت کے عالم گیر غلبہ کا خواب

یہودیوں نے قوموں کی کثیر تعداد کو قوم پرستی سے منحرف کر کے ان کی یہ حالت بنا دی ہے کہ سب ملک سے یہودیوں کی نوآبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اس علاقہ میں ایک بھی آزاد حکومت ہو گئی تو آخری دم تک اس پورے نظام کا سارا ڈھانچہ منہدم ہو سکتا ہے۔ اس دنیا کی انجیل یہ ہے کہ یا تو ہم ایک عالم گیر نظام ہونے کا دعویٰ ہے۔ لہٰذا اگر اس عالم گیر نظام کی دنیا پر قبضہ نہ ہو سکے تو یا تو ہم کا دعویٰ غلط ثابت ہو جائے گا۔ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا تو سارا مقدمہ ختم ہو جائے گا۔ اگر ایک سرکار بھی رہ جائے جس کی قومی حاکمیت محفوظ رہے اور قومی حکومت میں فرق نہ آئے تو یہودی حکومت کی جو حکمت عملی ہو گی اس کی بنیاد سے بنیاد تک جائے گی قوم پرستی کا تخیل صیہونیت کے عالم گیر غلبہ کا خواب ظلم و تشدد کی دیگر داستانوں کی طرح ہی بیان کر کے رکھ دے گا۔

یہودیوں کو ہزار سال سے یہ تجربہ حاصل ہے کہ کسی صورت حال سے وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اس تجربے کے باعث یہودیوں کو خوب علم ہے کہ کس انتظام کے ذریعہ وہ قوم عالم کی جڑیں کھوکھلی کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی بنیادی سرکار مثلاً جاپان کے خلاف یہ حربہ کام نہیں دے سکتا۔ یہودی بندر کی طرح ترکوں، مگر یہوں، مرکیوں اور فرانسیسیوں کی نقالی تو کر سکتا ہے لیکن پہلے لگ بھگ بنے بنیادوں تک پہنچنے کا یہودی کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے یہودی نے طے کر لیا ہے کہ جاپان کی قومی سرکار کو تباہ کرنے کے لیے وہ دوسری قومی سرکاروں کو اپنا آلہ کار بنائے۔ اس طرح

آخری قومی سرکار پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے یہودی کو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ خطرناک حریف کا صفایا کر چکے۔ مگر جب یہودی کو تمام قومی سرکاروں پر تسلط حاصل ہو جائے گا تو وہ اپنے مفادوں پر ہی ابھر کر حملہ آور ہے گا۔

صیہونیت کی ہزار سالہ ارضی بادشاہت

یہودی جب "مستقبل میں اپنی ہزار سالہ "ارضی بادشاہت" قائم کرے گا تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس وقت ایک جاپانی قومی سرکار بھی قائم ہو۔ اس لیے وہ اپنی آمریت قائم کرنے سے پہلے ہی اس جاپانی سرکار کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہودی دوسری قوموں کو جاپان کے خلاف اسی طرح اکسا رہا ہے جس طرح اس نے نازی کے خلاف دوسری قوموں کو اکسایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی مدبرین تو جاپان سے حلیفانہ تعلقات اپنی خارجہ حکمت عملی کی ہموار رکھنا چاہتے ہیں لیکن برطانیہ اس پروپیگنڈا سے کام لیتے ہیں کہ ہم تو "صیہونیت" کی حمایت چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جاپان کو تباہ کر دینے کے لیے جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ اور جنگ یہ باور کیا جا رہا ہے کہ جاپانی عسکریت اور استعماریت مرد ہوا۔

غرض آج انگلستان میں یہودی برطانوی سرکار کی حکمت عملی کی مخالفت کر رہا ہے۔ اس وجہ سے ظاہر ہے کہ وہ دن دور نہیں جب خود برطانیہ بھی یہودیوں کے عالم گیر شر کے خلاف جدوجہد شروع ہو جائے گی۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قوم پرست شہزادی تحریک کے لیے ایک عظیم کارنامہ انجام دینے کا موقع پیش کرتا ہے۔

دنیا بھر کے محروم اتحاد ہو جاؤ

اور جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کی روشنی میں یہودی قوم کے متعلق ہماری قوم کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ ہمیں دوسری قوموں کو بھی ہوشیار کرنا چاہیے کہ آج دنیا کا اصل دشمن ہے جس سے ساری دنیا کو خطرہ لاحق ہے۔ ہمیں اس کے خلاف نفرت

کی تحقیق نہ کرنی چاہیے۔ آریائی قوم ہے اور ہر مسئلہ میں ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اور ہماری رگوں میں ایک ہی خون بہتا ہے۔ ہماری اور ان کی تہذیب و تمدن کی بنیادیں ایک ہیں۔ ہم سب کو مل کر اس بین الاقوامی دشمن کے خلاف عام جدوجہد کرنا چاہیے۔ جو انسانیت کا حقیقی دشمن ہے۔ آج انسانیت کو جو بھی مصیبت لاحق ہے۔ اس کا حقیقی سبب یہودی ہے۔

قوم پرست اشتراکی تحریک کا یہ فرض ہے کہ کم از کم ہمارے ملک میں ہماری یورپ کے اصل دشمن کی شناخت میں کوئی مغالطہ نہ ہے۔ ہمارا اس دشمن کے خلاف جدوجہد میں آگ کے ایسے شعلے بلند کیے جائیں جو روشنی کے مینار کا کام دیں۔ اسی روشنی میں اس منزل کی جانب راستہ کی جا سکے گی جہاں پہنچ کر ساری قوموں کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے گی۔ یہی منزل آریاؤں کی نجات کی منزل ہے۔ اسی جدوجہد کے ذریعہ وہ اپنی نجات کے لیے کوشش کر سکتے ہیں۔

میں آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عقل کو پیش رہنما بناؤ۔ عزم بالجزم کو اپنا توشہ سفر سمجھو۔ ہم جس مقدس جہاد کی خاطر اس سفر پر گامزن ہوئے ہیں اس کی پاکیزگی ہمیں استقامت اور صبر کی توفیق دے۔ یاد رکھو کہ یہاں کی جنگی سے بہتر تمہاری حفاظت کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

☆☆☆

باب چہارم :: مشرقی یورپ میں جرمن حکمت عملی کا خاکہ

روس کے متعلق جرمنی کی پالیسی تشکیل کرنے کا میں اس مسئلہ کا خاص طور پر تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس خاص توجہ کی وجوہات ہیں

۱۔ روس کے متعلق جرمنی کی پالیسی ایک ایسا مسئلہ ہے جو جرمنی کی خارجہ پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈالے گا۔

۲۔ اس ضمن میں جو مسائل حل کرنے ہوں وہ گویا ایک کسوٹی ہیں جس پر نورانیدہ قوم پرست سوشلزم کی تحریک کی قوت فکر و عمل کو پرکھا جا سکتا ہے۔

تعصب اور جہالت سے آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے

مجھے اعتراف ہے کہ جب کبھی میں دوسری اس وجہ پر غور کرتا ہوں تو اس سے مجھے بڑی تشویش پیدا ہوتی ہے۔ ہماری تحریک کے رکن ان عناصر میں سے بھرتی نہیں کیے جاتے جو مدتوں سیاسی مسائل سے غافل ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ہماری تحریک کے اکثر ارکین انتہا پسند عقائد رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک قطعی امر ہے کہ ہماری تحریک کے ارکین خود بھی حکمت عملی کے مسائل کو ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ایک تو تعصب ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے دوسرے ان مسائل کی پوری واقفیت بھی نہیں۔ یہ تعصب اور جہالت انہیں ان حلقوں سے ورثہ میں ملے ہیں جن میں وہ ہماری تحریک کے اندر شمولیت سے پہلے داخل تھے۔ ان میں سے بہت سے ان رجعت پسند حلقوں سے ان کا وابستہ رہا خاصا ہی سے یہ تعصب اور جہالت وہ ساتھ لاتے ہیں۔ یہ کمزوری فطرتاً ان لوگوں میں ہی نہیں پائی جاتی جو پہلے کیتھولک تھے اور اب ہماری پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔ آج جو لوگ ہماری پارٹی کے رکن بنتے ہیں اس سے پہلے وہ خارجہ پالیسی کے متعلق کبھی ہی تحریری تصورات کے حامل کیوں نہ رہ چکے ہوں لیکن ان کے اندر سوشلزم طلوع ہونے کا ایک فطری رجحان ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ان کی ہمدردیاں ہمیشہ ایک تھی۔ اس بے

ضرورت ہوتی ہے کہ پہلے انہیں جو غلط اعتقادات سکھائے گئے تھے۔ ان کی جگہ صحیح اعتقادات کی تعلیم دی جائے۔ صحیح اعتقادات کی تعلیم مل جانے کے بعد ان لوگوں کے اندر بھی خود حفاظتی کا جوہر موجود ہے اور جس طرح ان کی امت ایک ہے اسی طرح ان کے افکار اور اعمال بھی مفید نتائج مرتب کریں گے۔

خود بولنے نہیں اور سیکھنے پر آمادہ نہیں

کئی اور لوگ ایسے ہیں جن کو تعلیم میں جو بیماری تعلیم دی گئی وہ کبھی دور ہونے کی طرح کم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ان لوگوں کو صحیح بات کی تعلیم دینا بہت مشکل ہے۔ ان کے اندر قوم پرستی کا فکری میدان ختم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ نظریاتی اور سرمایہ داری اعتقادات نے لے لی ہے۔ ہمارے دانش ور طبقات کے کسی نمائندہ کو اس بات پر آمادہ کرنا خاص طور پر مشکل ہے کہ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر منطقی اصول کے مطابق غور کرے۔ دیگر اقوام نے اپنی قوم کے تعلقات کا مسئلہ طے کرتے وقت خود اپنی اور اپنی قوم کے مفاد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ ان لوگوں کے دماغ پر تعصبات اور تصورات کا پردہ پڑا ہوتا ہے کہ ان کے اندر خود حفاظتی کا فطری میدان ہی ختم ہو چکا ہوتا ہے ایسے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے قوم پرست تحریک کو بڑا زور لگانا پڑتا ہے۔ یہ کام اس لیے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک طرف یہ لوگ نااہل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خود اپنے کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں۔ یہ فطرت کی بے رحمی کے وہ بھٹکے ہوئے نمونے ہیں جو اپنے مقابلہ میں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ یہ مغرور اور بگڑے ہوئے لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر یہ استعداد بھی نہیں ہوتی کہ کسی مسئلہ پر سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کر سکیں۔ مسئلہ کا تجزیہ کریں اور حقائق اور دلائل پر غور کریں حالانکہ موجودہ حالات کے لیے خود اپنی پسند کا مسئلہ طے نہیں ہو سکتا۔

بیرونی ممالک سے رشتوں کا نام نہاد تعلقات ہے

یہی وہ حالت ہے جس کے تحت [illegible] کسی قوم کے حقیقی مفاد کی خدمت

سے منحرف کرنے کے لیے ذکر کی جاتی ہے کہ اس کا اجتماعی سوچ سے تو کوئی اور بڑا ہی کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا۔ طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ان کا مقصد اس کے عجیب و غریب اقتصادات کو عمل جامہ پہنانا ہے۔ اگر میں حالات میں یہ فرض کرتا ہوں کہ پوری محنت اور کوشش سے اپنے رفقائے کار کے سامنے آزادی کی حمایت یا کسی کے سب سے اہم مسئلہ کی وضاحت کروں۔ وہ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے دوسرے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مسئلہ کی وضاحت کروں لیکن عام طور پر سمجھا جائے۔ بہت سی وضاحت اس حد تک مختصر ہوگی جتنا کہ اس کتاب کی ضخامت اور حجم کا تقاضا ہے۔ سب سے پہلے میں سب ذیل بنیادی اصول پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جب ہم خارجہ تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ خارجہ تعلقات سے مراد کثیر تعداد ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیرونی دنیا سے کسی قوم کے تعلقات کا تعین کیا جائے۔ کسی قوم کے خارجہ تعلقات ان اصولوں پر مبنی ہونے چاہئیں جو ہمیشہ خاص حالات پر منحصر ہوتے ہیں۔ ہر قوم پر مستقل کی یہ ذمہ داری ہے کہ ایک قومی سرکار کے خارجہ تعلقات مندرجہ ذیل طریقے سے قائم کرنے چاہئیں۔

قوم کی تعداد ملک کے رقبہ میں توازن ہونا چاہیے

ایک قومی سرکار کی خارجہ حکمت عملی کا سب سے پہلا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس قوم کی سرکار زمان ہے اس کے تحفظ اور بقا کا اہتمام کیا جائے۔ کسی قوم کے تحفظ و بقا کا اہتمام تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ اس قوم کی تعداد آبادی اور آبادی میں ترقی کی رفتار کو مدنظر رکھتے ہوئے اتنا رقبہ بطور وطن مہیا کر دیا جائے جس کی وسعت اور پیداوار اور ذرائع اس قوم کی ضروریات کے لیے کافی ہوں۔ آبادی اور رقبہ میں تناسب ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے قوم کی ہونی ہونی ضروریات پوری ہو سکیں۔

قوم اور رقبہ کا یہی تناسب متوازن تب کہلائے گا جب وطنی رقبہ کی آمدنی پیداوار اور

وسائل ہوں کہ وہاں کی زرعی پیداوار صدیوں تک ضروریات پوری کر سکیں۔ اگر وطن کا رقبہ اس ضرورت سے کم ہے تو چاہے یہ صورت حال صدیوں تک برقرار رہے یا ہزار سال تک برقرار رہے ہم حقارت سے پیداوار کے اس تناسب کو قبول نہیں کر سکتے۔ رقبہ کی کمی زیادہ تر ضرورتوں کے رواں یا ناکافی کا سبب بن سکتی ہے۔

جب تک کسی کو وطن کا مطلوبہ رقبہ حاصل نہ ہو کسی قوم کی حریت اور تحفظ کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

زرعی ضروریات کے علاوہ عسکری ضروریات کے لیے بھی رقبہ درکار ہوتا ہے

قومی آزادی کی پائیداری کے لیے جو رقبہ درکار ہے اس کا اندازہ صرف موجودہ ضروریات کے پیمانے سے لگانا ٹھیک نہیں۔ یہ طریقہ بھی غلط ہے کہ رقبے کی زرعی پیداوار سے آبادی کو ماپا جائے۔ صرف اس کو مدنظر رکھا جائے۔ اس آفاقی حقیقت میں کہ "بھلی جنگ تعلیم" سے قبل قومی کی خارجہ پالیسی کے عنوان سے ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ کسی سرکار کا رقبہ صرف قوم کو خوراک اور عام اشیاء مہیا کرنے کے لیے درکار نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کو عسکری ضروریات کے لیے بھی حاصل درکار ہوتا ہے کسی قوم کی سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہوگی کہ اتنا رقبہ فراہم کیا جائے جس پر دشمن کے حملے کی مزاحمت اور دفاع میں مدد ملے۔ قومی تحفظ کا انحصار کسی سرکار کی قوت پر ہے۔ ایک سرکار کی طاقت کا انحصار اس کے عسکری امکانات پر ہوتا ہے۔ عسکری امکانات تقریباً کل وقوع اور علاقہ کے رقبہ کی مقدار پر منحصر ہوتے ہیں۔

ہم جرمنی کی دنیا کی عظیم سرکار بنانا چاہتے ہیں

جرمن قوم کا مستقبل تبھی محفوظ ہو سکتا ہے جب کہ جرمنی دنیا کی ایک زبردست سرکار بن جائے۔ دو ہزار سال سے جرمنی اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرتا آیا ہے اس کا تمام تاریخ عالم کے [illegible] ہے۔ جرمنی کو بھی اپنے خاندان

یا بات میں کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی لیکن بہر حال اس کا شمار بڑی صورتوں میں دنیا کی تاریخ میں ہوتا رہا۔ ہم نے خود یہ دیکھا کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک ہم نے جس جدوجہد میں حصہ لیا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا میں جرمن قوم کی لاکے کی کوشش کی جائے۔ باوجود اس کے یہ کوشش اس حد تک کی گئی کہ تاریخ میں اس کا نام دنیا کی بھیانک جنگ عظیم مشہور ہو گیا۔

جب جرمنی نے اس جنگ میں حصہ لیا تو اس وقت یہ فرض کر لیا گیا کہ جرمنی دنیا کی زبردست سرکاروں میں شامل ہے۔ میں کہتا ہوں فرض کر لیا گیا تھا کیونکہ درحقیقت جرمنی اس وقت بھی دنیا کی عظیم طاقت بنے نہ پایا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جرمن آبادی اور جرمن طاقت کے رقبہ میں جو تناسب تھا وہ جرمنی کو ایک عظیم سرکار کہلانے کے مستحق نہ بنا تا تھا۔ اگر یہ رقبہ کافی ہوتا تو پھر جرمنی دنیا کی زبردست سرکاروں میں شمار ہونے کا مستحق ہوتا۔ اگر رقبہ کاری ہوتا تو دیگر امور سے قطع نظر کیا جا سکتا ہے کہ ہم جنگ جیت چکے۔

یہاں اس بحث میں پڑنا تو میرا مقصد نہیں کہ اگر بعض شرائط پوری ہو جاتیں تو کیا ہوتا۔ لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ صورت حال درحقیقت کیا معنی رکھتی ہے۔ اگر موجودہ صورت حال یہی ہے جو جرمنی کو کمزور رکھنے کا باعث ہے تو ہمیں بلا توقف اس کا انکشاف کر دینا چاہیے۔ اس انکشاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کم از کم قوم پرست شترالی تحریک کو اس امر میں مغالطہ نہ رہے گا کہ جرمنی کی کمزوری کس سبب سے ہے۔ اور اس کا کیا حل ہے۔

سرکار کی عظمت ملکی رقبہ کی وسعت سے متعلق ہوتی ہے

آج جرمنی ہرگز دنیا کی عظیم سرکاروں میں شمار ہونے کے قابل نہیں۔ اگر جرمنی کی موجودہ آبادی کی کمزوری ہو رہی جائے تب بھی جرمنی دنیا کی عظیم سرکار کہلانے کا مستحق نہ ہو گا۔ موجودہ جرمن آبادی کے مقابلہ میں اس کا رقبہ اتنا تھوڑا ہے کہ جرمنی ہرگز دنیا کی عظیم سرکار کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ آج دنیا میں ہے کہ دنیا کی سرکاریں سو سو دنیا

کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اصل سرکاروں کا رقبہ پہلے ہی تناسب سے کہ قریب قریب
ایک چوتھائی براعظم پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں اس سرکار کو کیوں نہ ہی سرکار کہا جا
سکتا ہے۔ جس کا ملکی رقبہ بمشکل ہی پانچ لاکھ مربع کلومیٹر ہو۔

اگر محض رقبہ راضی کے شمار سے دیکھا جائے تو برٹش سلطنت کا ملکہ دنیا کی عظیم
سرکاروں کے مقابلہ میں بالکل حقیر نظر آتا ہے۔ اس سلسلہ میں انگلستان کی نظیر میرے
قول کی تردید میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ انگلستان کا ملکی رقبہ درحقیقت برطانوی عام گیر
سلطنت کے دارالحکومت کا رقبہ ہے۔ برطانوی سلطنت دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر پھیلی
ہوئی ہے۔ برطانیہ کے بعد روسی سلطنت ہائے متحدہ امریکہ، روس اور چین دنیا کی عظیم ترین
سرکاروں میں شامل ہیں۔ ان حکومتوں کا رقبہ وسیع علاقوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ریاستہائے
ان کا علاقہ موجودہ برٹش سلطنت کے علاقہ سے بھی کتنا رقبہ سے بھی زیادہ ہے۔ فرانس کو
بھی ان عظیم الجثہ سرکاروں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ میں تو فرانس اپنی وسیع سلطنت
سے کالے پانی کرنے کے مسلسل اپنی فوج بڑھا رہا ہے۔ دوسرے فرانس نئی طاقت
سے بھی ایک دیوقامت بنتا جا رہا ہے۔ فرانس بے ایک فرنچی سرکار ہے۔ جس کا رقبہ
یورپ میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ فرانس نے آج کل نوآبادیات کے متعلق جو پالیسی اختیار
کر رکھی ہے اس کا مقابلہ ماضی میں برٹش کی اس پالیسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ جو برٹش
نے اپنی نوآبادیات کے متعلق اختیار کی تھی۔ فرانس نے آج کل جو پالیسی اختیار کر رکھی
ہے اگر وہ اس پالیسی پر قائم رہا۔ اور یہ پالیسی آئندہ تیس سو سال تک قائم رہی تو فرانس
کی ہستی کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اس کی جگہ ایک عظیم الشان نوآبادیوں کی
نئی گلوبل سلطنت پیدا ہو جائے گی۔ جو فرانس کی سرکار پر حاوی ہوگی۔ ایسا ہو گیا تو یہ ایک
زبردست نوآبادیاتی رقبہ ہوگا۔ جو دریائے رائن سے لے کر دریائے کانگو تک پھیلا
ہوگا۔ یہاں ایک بہت بڑی آبادی ہوگی۔ یہ بہت بڑی آبادی بہت اس افراط سے پیدا
ہوگی جو فرانس اور اس کے فرنچی مقبوضات کے مابین جاری ہے۔

اس طرح فرانس کی توسیع پسندانہ نوآبادیات کے متعلق پالیسی کو ماضی میں جرمنی کی نوآبادیات کے متعلق پالیسی سے جدا کرتی ہے۔

جرمنی آج دنیا کی عظیم طاقت نہیں

جرمنی کی گزشتہ نوآبادیاتی پالیسی اسی طرح سے ادھوری تھی جیسے کہ اس زمانہ میں پرشین جرمن سرکار کی بربات ادھوری تھی۔ وہ ہمیشہ کسی علاقہ کو جرمن قوم کی آبادکاری کے لیے صاف کرتے تھے۔ بڑی کالی فوج بھرتی کر کے جرمن سلطنت کی حفاظت میں اضافہ کرتے تھے۔ اگر جرمن کالی فوج بھرتی کرنا تو یہ ایک ہی طرح کی پالیسی ہوتی۔ مشرقی افریقہ میں جرمنی کے ماتحت جو مقامی فوجی بھرتی کیے جاتے تھے ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی پھر یہ وسیع پیمانہ پر بھرتی کرنے کی پالیسی بھی نہ تھی۔ دراصل یہ مقامی لشکر صرف نوآبادیات کے مقامی تحفظ کی خاطر بھرتی کیے جاتے تھے۔ کالی فوجیں بھرتی کر کے انہیں یورپ میں استعمال کرنے کا خیال کبھی جرمنی میں پیدا نہ ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس طور پر عمل کرنا جرمنی کے لیے ناممکن تھا۔ برعکس اس کے فرانس کی نوآبادیات کے متعلق تمام پرانی کا طور یہی مصروفہ کہ کالی فوجیں بھرتی کر کے انہیں یورپ میں استعمال کیا جائے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا میں کئی ایسی سرکاریں ہیں جن کی نہ صرف آبادی کی تعداد جرمنی سے زیادہ ہے بلکہ ان کی جنگی قوت کا انحصار جس عددی قوت پر ہے وہ بھی جرمن سے بڑا ہے۔ جرمن سلطنت کے جنگی رقبہ کے مقابلہ میں اس کی آبادی زیادہ ہے۔ رقبے اور آبادی کے تناسب میں یہ عدم توازن جرمنی کی تاریخ میں دوسرا اہل پر نمایاں طور پر نمایاں ہو کر ظاہر ہوا ہے۔ پہلا موقع تو آج سے دو ہزار سال پہلے پیش آیا تھا۔ اور دوسرا موقع آج درپیش ہے۔ دونوں موقعوں پر یہ عدم توازن دنیا کی دوسری زبردست سرکاروں کے مقابلہ میں جرمنی کی حیثیت کو کمزور کرنے کا سبب ثابت ہوا ہے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے جرمن ایک نوخیز قوم تھے۔ اس وقت کی دنیا کی

سرکاروں پر مشتمل تھی۔ دوسرا بلاک روس تھا۔ ان بڑی سرکاروں میں سے آخری سرکار یعنی امریکہ کی دیوار سلطنت تھی۔ روس نے امریکہ کی ہیروشیما میں ایٹمی بمباری کی دھمکی دے کر اپنے آپ کو بڑی بڑی سرکاروں کی دنیا میں کھڑا ہوا پایا ہے۔ ان بڑی بڑی سرکاروں کے مقابلہ میں ترکی کی حیثیت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس کا سامنا ہمیں کھلے دل و دماغ سے کرنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ترکی سلطنت کے رقبہ اور آبادی کا مقابلہ دنیا کی دوسری سرکاروں سے کریں۔ پھر اس تقابل کا مطالعہ گزشتہ صدیوں تک پھیلائیں۔ جب ہم ایسا کر چکیں گے تو ہمیں صاف پتہ چل جائے گا کہ ترکی کی قومی حالت زیادہ تر ہوا کھوکھلی ہے۔ ترکی دنیا کی بڑی بڑی سرکاروں میں ہرگز شامل نہیں۔

رقبہ کی تنگی تمام خرابیوں کی جڑ ہے

دنیا بھر کی دیگر سرکاروں کی ترکی کی حیثیت سے بالکل مختلف ہے۔ ترکی کی آبادی اور رقبہ میں پستی اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ہماری خاندانی پالیسی نے ہمیں جان بوجھ کر یہ منصوبہ اپنے سامنے نہ رکھا کہ ہمیں مزید علاقہ حاصل کرنا ہے۔ ترکی اپنی حفاظت آپ کرنے کے قابل اس لیے نہ رہا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل کا مورخ جب ترکی کی تاریخ لکھے تو ہمیں ہست شناسی تحریک کو اس خصوصیت کا مستحق قرار دے کہ اس تحریک نے قومی خدمت کے مقدس ذریعے کا حق خوب ادا کیا ہے تو ہمیں سب سے پہلے اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنا ہوگا کہ باقی دنیا کے مقابلے میں ترکی کی حیثیت کیا ہے۔ اگر دنیا کے مقابلے میں ترکی کی حیثیت کا احساس کرنے سے ہمیں دکھ ہوتا ہے تو بھی اس سے مفر نہیں۔ ہمیں یہ احساس کرنا چاہیے کہ پھر اس احساس سے اپنے اندر ہمت اور دلیری پیدا کرنا چاہیے۔ پہلے ہمیں حقیقت حال کا احساس کرنا ہوگا۔ جب یہ احساس پیدا ہو جائے گا تب ہی ہم اس نااہلیت اور تنگ دستی کا مقابلہ کر سکیں گے جو خانہ بدوش سلطنت کھلی لڑائی کے وقت

ہماری قومی کوششوں کا محور رہی ہے۔ ہمیں اس بات کی پروا نہ کرنی چاہیے
کہ ہمارا یہ حکمت عملی کے متعلق دشمن کی "روایات" ہمیں اس بات کی پروا نہ کرنی چاہیے
کہ ہمارا یہ حکمت عملی کے متعلق دشمن کی "روایات" کیا ہیں ہمیں نہ تو ہماری کوئی پہلے سے
تصور کیے ہوئے اپنے نمونے کے کسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہماری
تحریک میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم قوم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک ایسے راستے
پر ڈال دیں جس پر چل کر دشمن اپنے رقبہ کی توسیع کر سکے۔ اس دشمن کے رقبہ کی کمی ہی
ہماری قومی زندگی کی تمام سرگرمیوں کی جڑ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دشمن کے رقبہ کی
توسیع کریں۔ یہ ہو گیا تو ہماری تحریک دشمن قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں لے گی۔ یہ نہ
ہو تو ہلاکت کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ ہماری قوم کی دوسری قوم کی غلام نہ بن
جائے۔

اعلیٰ نسل کے حیوان ہی نہیں صحیح الاعضاء انسان بھی درکار ہیں

آج ہماری قومی "ہاری" ہمارے وطنی رقبہ کا بوجھ تو اٹھا لیتی ہیں۔ یہ جسم
توانائی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری تحریک کا فرض ہے کہ اس جسم توانائی کو دور
کرے۔ وطن کا رقبہ قوم کی بقا کے لیے ضرور ہے مگر رہائش مہیا کرنے والے کے واسطے
بھی درکار ہوتا ہے۔ قوم کی روحانی طاقت کا انحصار بھی وطن کے علاقہ کی وسعت پر
ہوتا ہے۔ دشمن کی گزشتہ تاریخ اور دشمن کی موجودہ بیداری میں کوئی مخالفت نہیں ہمارا
فرض ہے کہ اس تفاوت کو رفع کریں۔ پھر اس کوشش کے دوران میں ہمیں یاد رکھنا
چاہیے کہ ہم بنی نوع انسان کے بہترین نمونہ ہیں۔ چونکہ ہم ہر گز بہترین امت ہیں۔
اس لیے ہمارے کندھوں پر فرائض کا بوجھ بھی بھاری ہے۔ ہم پر داخلی بھی ہو سکتے
ہیں جب دشمن قوم اعلیٰ عقیدہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔ جب دشمن قوم اعلیٰ عقیدہ کی مالک
ہو جائے گی تو ہم صرف اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہی نہیں بلکہ وہاں بالغ کی فکر کریں گے
جو خود اپنی مست کاموں پر گھوڑے کا بھی مناسب انتظام کریں گے۔

کسی سرکار کی طاقت کا اندازہ دوسری سرکاروں کے مقابلہ سے ہی کیا جا سکتا ہے

میرا دعویٰ ہے کہ آج تک فرنگی نے جو خانہ ہے حکومت عملی اختیار کی اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ بے سود ثابت ہوئی۔ میرے اس دعویٰ کا ثبوت اس خانہ حکومت عملی کی ناکامی کی صورت میں موجود ہے۔ اگر ہماری قوم دولتی لحاظ سے بہت زیادہ ہوتی یا ہمارے پاس بہت سے ہتھیار ہوتے تو اس صورت میں بھی ہماری کوششوں کے نتائج اس سے بہتر نہ ہو سکتے تھے۔ جو آج ہمارے سامنے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے دس بیس سال پہلے جو واقعات رونما ہوئے وہ اس موضوع پر ہماری ہر قسم کی علط فہمی دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کسی سرکار کی طاقت کا اندازہ محض اس سرکار کی حالت کو سامنے رکھ کر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ ایسے اندازے کے لیے اس سرکار کی حالت کا مقابلہ دوسری سرکاروں سے کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جب فرنگی کی حالت کا مقابلہ دوسری سرکاروں سے کیا جاتا ہے تو واضح ہوتا ہے کہ دوسری سرکاروں نے اپنی طاقت اتنی زیادہ بڑھا لی کہ صرف انہوں نے فرنگی کی یورش کو روک دیا بلکہ فرنگی پر غالب آ گئیں۔ فرنگی کی کمزوری یہاں تک ہوئی کہ فرنگی دوسری سرکاروں کے مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گیا۔ افسوس آج ہماری قوم ہماری بھی دوسری سرکاروں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ہم اس دور میں بھی روز بروز پیچھے رہتے جا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری قوم کی شجاعت کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی۔ ہماری قوم نے اپنے دماغ کی تاثیر کا جو ثبوت دیا ہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم نے نہیں دیا۔ اگر وہ جو اس قربانی کے بعد ہماری ناکامی کا سبب دیکھتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی اس شجاعت کے استعمال کے لیے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔

ایک ہزار سال کی تاریخ کا نچوڑ

اس ضمن میں اگر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں جائے تو گزشتہ ہزار سال میں ہمارے ملک کو عرصہ میں [illegible] ہے تو ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے

کہ ہم نے خون کی ندیوں نہیں بلکہ خون کے سمندر بہائے ہیں ان سے صرف نئی قوموں
نتائج جیسے برآمد ہوئے ہیں انہیں ہی کسی نہ کسی کا حاصل کہنا چاہیے۔ یہ بات
کتنی تلخ ہماری تاریخ کی کتاب میں کیوں نہ لکھی جائے۔ سوچنا چاہیے کہ ہم نے
اس ایک ہزار سال میں کتنی جدوجہد کی کتنی قربانیاں دیں اور پھر ان سب کے جو نتائج
ہمارے سامنے ہیں ان کا کیسی جائزہ لینا چاہیے کہ وہ واقعی نتائج ہیں۔

۱۔ پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ ترکی کی مشرقی سرحد پر ترکوں کی نوآبادیات کی نہیں تھیں
وہ مستقل شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہ کارنامہ سلجوقیوں نے انجام دیا تھا۔

۲۔ دریائے ایبرو کے مشرق میں ملانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین پر مسلمانوں کی آباد
کاری ہوئی دوسرا کارنامہ تھا۔

۳۔ یورپ کی جو شکست کریسکا کا کارنامہ تھی وہ تیسرا کارنامہ تھا۔ یہ کام
سولہویں بادشاہوں کے خاندان نے انجام دیا۔ یہ سارے بعد میں آنے والی سلطنت کے
قیام کے لیے سنگ بنیاد ثابت ہوئی۔

یہ تینوں نتائج اپنے اندر مستقل کے لیے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ رکھتے ہیں۔

ہمیں اپنی قوم کی تاریخ کا صحیح علم نہیں

پچھلے دو نتائج ہماری خارجہ پالیسی کے دو عظیم ترین کارنامے ہیں اور یہی دونوں
سب سے زیادہ پوشیدہ بھی ثابت ہوئے۔ اگر یہ دونوں کارنامے انجام نہ دیے جاتے تو
ہماری قوم آج دنیا میں کسی حیثیت کی مالک نہ ہوتی۔ یہ کارنامے دو بھائی کوشش تھے جس کا
مقصد یہ تھا کہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی اور جس رفتار سے یہ آبادی بڑھ رہی تھی اس کا
ہے ان دونوں کے مابین ایک توازن قائم کیا جائے۔ یہ دونوں کوششیں کامیاب ہوئیں
لیکن بدقسمتی سے اس ضمن میں مزید کوئی کوشش نہ کی گئی۔ ترک مورخین نے ان دونوں
عظیم واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی ان کی صحیح اہمیت کا پورا احساس نہیں کیا اور نہ یہ
دونوں واقعات سے والی نسلوں کے لیے زبردست اہمیت رکھتے تھے۔ ترک مورخین کی

پذیرائی ایک مہلک حقیقت کا عکاس ہے۔ وہ مہلک حقیقت یہ ہے کہ ہم جرمنوں کو اپنی تاریخ کے اہم ترین مراحل کی صحیح ہیئت کا احساس ہی نہیں۔ اس کے برعکس یہی مورخین دیگر کی واقعات کے متعلق قصیدہ خوانی کرتے رہے جن مثال کے طور پر تھوڑی سی کی جیتی ہوئی شجاعت (نظر انداز) ایسے واقعات جس میں محض دلیری اور بہادری کا اظہار کیا گیا ہے کی جنگیں وغیرہ وغیرہ۔ ان مورخین کو یہ احساس نہ تھا کہ ان جنگوں کا ہماری قوم کی اصلی ترقی اور نشوونما پر کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہر شخص اپنی حفاظت کرے یا ملت سب کی حفاظت کرے

جرمنوں کی سیاسی سرگرمیوں کا تیسرا اثر وہ تھا کہ جس نے بشین سرکار قائم کی۔ یہ سلطنت سرکار کے ایک چھوٹے تخیل پر تعمیر ہوئی تھی۔ جوں جوں یہ تخیل پروان چڑھتا گیا توں توں ہماری قوم میں اپنے تحفظ کا شعور بیدار ہوتا گیا اور اس شعور نے جرمن فوج کے ذریعے ملت کے دفاع کے لیے جدوجہد کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ایک ایسا کارنامہ تھا کہ جو موجودہ زمانے کے عین مطابق تھا۔ خود حفاظتی کا یہ اجتماعی تصور یہ تھا کہ ہر شخص خود اپنی حفاظت کرتا ہے اب اس تصور میں یہ ارتقاء ہوا کہ ملت اجتماعی طور پر تحفظ کرتی ہے۔ خود حفاظتی کے تخیل کا یہ ارتقاء ہی بشین سرکار کا مرہون منت تھا۔ بشین سرکار نے سرکار کے اس نئے تخیل کو جنم دیا۔ جرمن قوم صدیوں سے باہمی ہولی فرد بھی کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ بشین فوج کی تنظیم سے اب یہ قوم ایک نظام مسلم میں تبدیل ہو گئی۔ یوں ملت سارے میں ایک قوم کی شکل اختیار کرنے کی استعداد کسی حد تک پیدا ہو گئی۔ دوسری قومیں شروع ہی سے اجتماعیت کے قبلی احساس کے باعث وجود میں آئی تھیں۔ برعکس اس کے جرمنوں کی فرد پرستی نے انہیں اس احساس سے عاری کر رکھا تھا۔ اب عسکری تربیت سے جرمنوں میں بھی اجتماعیت کا احساس پیدا ہو گیا۔ جرمنوں اور دوسری قوموں کے مابین یہ فرق ہے کہ جرمن قوم عسکری تربیت سے دوسری قومیں ترک کر دیں تو شاید ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہو لیکن جرمن قوم جرمن عسکری تربیت

ترک کر دے تو موجب ہلاکت ہو گا۔ اگر قوموں کی دل بستگیوں کو جری عسکری تربیت کے تعلیمی اور اخلاقی اثرات سے محروم کر دیا جائے اور قوموں کے خون میں جنگ اور باہمی انتقام کے جراثیم موجود ہیں کہیں پھیلنے کا موقع دیا جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ قوموں کا تصور کائنات ایک نہ رہے گا۔ اس لمحوں کے بعد ہماری قوم کے اندر کوئی ایسی خصلت باقی نہ رہے گی جس کے بل پر وہ اور ایک آزاد قوم کے زندگی بسر کر سکیں۔

قربانی کرنے اور قربانی کا پھل کھانے میں فرق ہے

اگر یہ نوبت آ گئی تو اس کے بعد قوموں کی اجتماعی زندگی تہذیب و تمدن کے میدان میں ہو ہرگز نہ کھا سکے گی۔ قوموں کے یہ تہذیب و تمدن کی خدمت کرنے کا موقع اس کے بعد صرف یہ رہ جائے گا کہ غیر قوم کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہوئے فقط شخصی حیثیت سے کوئی تمدنی کارنامہ انجام دے سکیں۔ ایسے انفرادی تمدنی کارنامے ہمیشہ گمنام رہیں گے۔ گویا قوموں کی بستی میں اہل فن خاموش کھنڈر کے طور پر استعمال ہو جائیں گے۔ رفتہ رفتہ شاہی آبادیوں کی بنیاد میں کانوں بھی نئی آبادیوں سے خالی ہو جائے گا۔ اس سے خالی آبادیوں کی نسل ہی مٹ جائے گی۔

کیسے تعجب کی بات ہے کہ گزشتہ ہزار سال کی جدوجہد میں ہماری قوم نے جو حقیقی کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کا صحیح اندازہ ہمیں نہیں لیکن ہمارے مخالفین ان سے خوب آگاہ ہیں۔ آج بھی ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اس دور ثلوث کی جنگ سر پر لیتے ہوئے وجد میں آتے ہیں اس کا نتیجہ صرف یہی ہو گا کہ ہماری قوم کی بہترین نسل کے لاکھوں افراد قربان کر دیے جائیں گے۔ بالآخر اس جدوجہد سے کوئی ٹھوس نتیجہ نہ ہو گا۔

آج ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم جو ناپختہ حکمت عملی اختیار کریں گے وہ طے کرنے سے پہلے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہماری قوم کی طویل تاریخ کے دوران ہم نے جو حقیقی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس کے مقابلہ میں جن مواقع پر ہماری قوم کا خون رائیگاں بہا گیا ان دونوں میں کیا بنیادی فرق ہے۔

غیر وطنی کا نام حب الوطنی نہیں

ہمقوم پرست اشتراکی کہتی ہیں کہ ہمارے کھاتے پیتے طبقات نے اس غیر وطنی کا نام حب الوطنی رکھ چھوڑا ہے۔ ہم بھی اندھا دھند اسی کی تقلید کرنے لگیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی جو کچھ کر رہا تھا اس کی بابت اس مغالطہ میں گرفتار ہو جانا کہ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے ہمارے لیے ایک مہلک غلط فہمی ہوگا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم ہر قدم اٹھانے سے پہلے گزرے ہوئے زمانہ کی تقلید پر مجبور ہوں گے۔ ہم پر تعلیم کے لحاظ سے جو ہر قسم کی ترقی کے لیے بیسویں صدی کے تاریکی میں ہمیں اس رجحانات کا آغاز ہوا تھا ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر بھی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جو خواہ جو پالیسی اختیار کی تھی ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں اپنی خواہ جو پالیسی کی بنیاد اس اصول پر استوار کرنی ہے اس کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ وہ اصول یہ ہے کہ جرمنی کا علاقائی رقبہ اتنا بڑھا ہوا ہے اس سے جرمنی کی آبادی اور جرمنی کے رقبہ میں جو توازن درکار ہے وہ پیدا ہو جائے۔ ماضی کے واقعات سے ہمیں ایک ہی سبق سیکھنا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ ہماری خواہ جو پالیسی کا سہارا لے کر ہمارا دشمن ہوا ہے۔

دل ہمیں جرمنی کے لیے مزید علاقے حاصل کرنا ہیں۔

دوسرے ہمیں اپنے ملک کے اندر اپنی داخلی پالیسی میں اس نوع کا اتفاق اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اس اتحاد اور اتفاق کی بنیاد قومیت کے اس تخیل پر ہوگی جو ہم سے مخصوص ہے اور جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

ظلم کا مقابلہ پرامن رہ کر نہیں کیا جا سکتا

اب میں اختصار سے یہ بیان کروں گا کہ جرمنی کے لیے مزید علاقہ طلب کرنا اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے کیوں جائز ہے۔ یہ بیان کر دینا بھی اشد ضروری ہے کہ دوسرے وہ نیا قوم پرست طبقوں میں کن لوگوں کو شامل ہیں جو اس ایسے لڑنے والے

کرنے میں منہمک رہتے ہیں ان کے حاظ خوش آمدیں۔ یہ لوگ جرمن قوم کو ایک طرف تو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہماری خاندانی یا نسلی کامیابی کا سب سے بڑا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ۱۹۱۸ء میں جرمنی پر جو مظالم توڑے گئے اب ان کا تدارک کیا جائے۔ دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ یہی حضرات ساری دنیا کو یہ یقین بھی دلانا چاہتے ہیں کہ جرمن قوم دنیا کی دوسری تمام اقوام سے اخوت اور ہمدردی کے رشتے قائم کرنے کی خواہش مند ہے۔

میں اس کتابچہ کے متعلق صرف حسب ذیل تبصرہ کرنا چاہتا ہوں

یہ مطالبہ ایک سیاسی حماقت ہوگی کہ ۱۹۱۸ء میں جرمنی کی جو سرحدیں پہلے تھیں انہیں بحال کر دیا جائے۔ اس سیاسی حماقت کے نتائج ایسے مہلک ہیں کہ اس حماقت کے ارتکاب کا تصور دینے والے صریحاً قوم کے مجرم ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جرمن سلطنت کی حدود کسی منطق کی پابند نہ تھیں۔ ہاں تو یہ حدود اس لحاظ سے معقل نہ تھیں کہ جرمن نسل کے تمام افراد ان حدود کے اندر آباد نہ تھے۔ مگر یہ حدود اس لیے بھی خلاف عقل نہیں تھیں کہ جنگی وقوع کے وقت یہ حدود کی نظر عوامی حیثیت جرمنی کے حق میں مفید نہ تھی۔ یہ حدود کسی ایسی سیاسی مصلحت پسندی کا نتیجہ نہ تھیں جو سوچ سمجھ کر اختیار کی جاتی ہو بلکہ اس پر عمل ہوتا۔ یہ حدود تو محض عارضی سرحدات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ عارضی سرحدات ایک لمبی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ تھیں کہ جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی تھی۔ دراصل یہ سرحدات فقط اتفاقات زمانہ کا نتیجہ تھیں مگر یوں ہی وقتی کی طبیعی واقع مقصد کے پیش کرنے سے تو یہ ہزار درجہ بہتر ہوگا کہ جائے ۱۹۱۸ء کے کوئی دوسری لمبائیاں عبوری نظام کی خاطر منتخب کر لی جائے۔ اس کے بعد یہ مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جرمنی کی خارجہ حکمت عملی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان حدود میں جرمنی کی جو حالت تھی اسے بحال کرے۔

"قانون جنود" کے گرفتار

میں نے ان مطالبات کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے کھاتے پیتے طبقہ کے ان لوگوں

مزاج کے بھی مطابق ہے۔ یہ لوگ ایسے معاملات میں مستقبل کے بارے میں مفاہمت کا رویہ نہیں رکھتے۔ وہ تو بس گزرے ہوئے زمانے کی واپسی کا خواب دیکھتے ہیں۔ مگر ماضی سے ایسی ان کو خاص قریب کا زمانہ پسند ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا حافظہ ان کے دیکھے ہوئے زمانے سے زیادہ پیچھے نہیں جا سکتا۔ گویا وہ قانون ہمورہ کے پیرو ہیں۔ اس قانون نے ان کے دماغ میں ڈال دیا ہے کہ جو کچھ ہے اس سے وہ یہی تقاضا رکھتا ہے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ موجودہ حالات میں کوئی تبدیلی کی جائے۔ لیکن ان کی یہ محافظت بھی کسی عملی جدوجہد کا سبق نہیں دیتی۔ وہ تو بس ایک بے عمل ضد کرنا جانتے ہیں مگر ان حالات میں ان سے کوئی توقع نہیں کہ ان لوگوں کی سیاسی بقا وہ ہمارے آگے کام نہیں کرتی۔ جب وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انگلی سیاسی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کی سرحدات بحال کر دی جائیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ہمارے خلاف لڑنے والے دشمنوں کے اتحاد میں جو تھوڑا بہت خلل رونما ہوا تھا وہ بھی اس کے رفع ہو جاتا ہے اور ان کی اتحاد بحال ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی حرکتوں کا نتیجہ ہے کہ ایک عالمگیر جنگ ختم ہوئے آٹھ برس گزر چکے ہیں۔ لیکن اس جنگ میں حصہ لینے والے اتحادیوں کے مقاصد باہم متضاد ہونے کے باوجود ان کا گٹھ جوڑ آج تک ڈھیلا نہیں پڑا۔

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنی چاہیے

جن اتحادی حکومتوں نے مل کر جرمنی کے خلاف جنگ کی تھی جرمنی کی شکست سے ان سب نے فائدہ اٹھایا۔ اب ان کو نظر آ رہا ہے کہ جرمنی کی طاقت کا ہوا بالکل ہوا ہو چکا ہے۔ کچھ بھی پھر سے اس سے مقابلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوام بڑی بڑی حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور دشمنی کے باوجود چپ سادھے بیٹھی ہیں انہوں نے سوچا کہ مستقبل میں جرمنی کی قوت کو ابھرنے سے روکنے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اب ان کا گناہگار ضمیر انہیں

ہے یہ بھی رکھتا ہے کہ وہ آپس کا اتحاد اس لیے ترک نہیں کرتے کہ انہیں ہماری قوم سے ڈر لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اتحاد آج تک قائم ہے۔

اس کے علاوہ خود جرمنی کا طرز عمل یہ ہے کہ اس نے اتحادیوں کی مزاحمت و روایت کو تقویت پہنچائی ہے۔ ہمارے کئے گئے پہلے دفاعات ۱۹۱۴ء کی سرحدات کو بحال کرنا جرمنی کے سیاسی پروگرام کا حصہ نہیں قرار دیتے ہیں۔ ہمارے بعض اتحادی جو شاید اس صورت دیگر آپس کا کچھ جھگڑا ترک کر دیتے یہ سمجھتے ہیں کہ جرمنی ۱۹۱۴ء کی سرحدات کی بحالی چاہتا ہے۔ تو اس میں سے ہر ایک یہی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ جرمنی مجھ پر حملہ آور ہونے دے۔ لہٰذا ہماری جرمن حکومت یہی سمجھتی ہے کہ اگر اس نے اپنے اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایسی حالت میں اسے جرمنی سے لڑنا پڑا تو وہ کسی حلیف کے بغیر اکیلی رہ جائے گی۔ جرمنی ۱۹۱۴ء کی سرحدات بحال کرنے کی پالیسی سے جرمنی کا ہر جرمن شک اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کرتا ہے۔ یہی خطرہ سب کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ اب ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات کی بحالی کے پروگرام پر نظر ڈالی جائے تو یہ بجائے خود ایک مرتجانہ پروگرام ہے۔ میں اس پروگرام کو صدر ولسن کے خیالات کی روشنی میں قابل قبول قرار دیتا ہوں۔

اب جرمنی کے پاس وہ ذرائع اور وسائل نہیں جن کی مدد سے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا جا سکے۔

گزشتہ زمانے سے پناہ نہیں ملتی

۶۔ اگر یہ پروگرام کسی طرح کامیاب بھی ہو جائے تو اس کے نتائج ایسے برے ہوں گے کہ خدا بچائے۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات کو بحال کرنے کے لیے ہماری قوم کا خون ایک مرتبہ پھر بہانا بہت برا ہوگا۔

اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیے۔ کہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کی سرحدات جنگ و جدل کے بغیر بحال ہو سکتی ہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ عہد نامہ وارسائی کو جرمنوں کے سامنے گزشتہ زمانے کی ادھر ادھر کی باتیں بنانے سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کا دماغ

پہلے کی سرحدات بحال ہوں یا نہیں۔ ان سرحدات نے ماضی میں ہمیں محفوظ رکھا ہے اور ہمیں ان سرحدات کو برقرار رکھنا ہے۔ مستقبل میں جرمنی کو اپنے پڑوسیوں کے لیے خطرہ بنانے کی ہر کوشش ناکام ہوگی۔ ان سرحدات کے بل پر جرمن قوم ایک بار پھر آزاد اور خودمختار ہوگی۔ ان سرحدات کے بل پر جرمن قوم ایک بار پھر آزاد اور خودمختار ہوگی۔ یہ سرحدات ہی جرمنی کو آزادی مہیا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ عسکری زاویہ نگاہ سے ان سرحدات کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ ان کے باعث ہمیں تحفظ حاصل رہے گا۔ جب تک جرمنی ان سرحدات کا پابند ہے اہل جرمنی کے لیے کسی حالت میں بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں جرمنی کی حیثیت بہتر ہو جائے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی طاقتیں صرف چند ہیں۔ ان سرحدات کو قائم رکھتے ہوئے جرمنی اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان جو تعلقات ہے وہ برقرار ہوگا۔ جرمنی کبھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے برابر رقبہ حاصل نہ کر سکے گا۔ حتیٰ کہ بین الاقوامی تعلقات میں فرانس کی حیثیت گھٹانے میں بھی جرمنی کو کامیابی نہ ہوگی۔

جب غیب سے روٹیاں نازل نہیں ہوتیں تو خود کمانا چاہیے

ایک بات تو بالکل یقینی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے کی سرحدات کو بحال کرنے کی کوشش کامیاب بھی ہوگی تو اس عہد میں ہماری قوم کو اس قدر خون بہانا پڑے گا کہ مستقبل میں قوم کا وجود قائم رکھنے کے لیے کسی موزوں قدم کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ بھی کامیابی کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہماری قوم اپنی آئندہ نسل کے مصور سے محروم کر دے گی۔ "قومی وقار" کے جذبہ کی جھوٹی تسکین ہو جانے کے بعد ہر دیوانی بدلگاموں سے جرمنی کو تجارت کرنے کے حقوق مل جانے پر ہم اسی فریب میں گرفتار ہو جائیں گے کہ اب کسی مزید توسیع اقتدار کی حاجت نہیں۔

اب ان سب خرابیوں کے تدارک کے لیے ہم قوم پرست اشتراکی پارٹی عالم پالیسی کا جو اصول طے کر چکے ہیں اس پر ڈٹے رہیں گے۔ ہمارا وہ طے شدہ اصول یہ

ہے کہ ان قوم کو وہ مزید علاقائی رقبہ ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ جو اس کو زمین پر اس
زمین کا وجود قائم رکھنے کے لئے درکار ہے۔ رب کائنات اور آنے والی نسلوں کی نگاہ
میں بھی ہماری قوم کا مزید بڑھوں رہنا بھی جائز ہوگا کہ جب اس کا مقصد زمین کے رقبہ
میں توسیع ہو۔ اور اس مطلق کے تصور میں اور یہ قدم اس لئے جائز متصور ہوگا کہ جب
اس نے ہمیں اس دنیا میں اپنا رزق تلاش کرنے پر مامور کیا ہے اور غیب سے ہم پر روایاں
نازل نہیں ہوتیں تو پھر کیا یہ ہے کہ زمین پر حاکم کی حیثیت میں ہم اپنا مقام صرف اپنی
ذہانت اور قوت سے ہی محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ آنے والی زمین نسلیں ہمارے اس قدم
کو اس لئے جائز سمجھتی ہیں کہ اس جدوجہد میں جانے والے ہر شہید کے عوض آنے والی
نسلوں کے ہزارہا افراد کی زندگیاں محفوظ ہو جائیں گی آج زمین پر چلنے والوں کی
جان کا تحفظ خون بہا جائے گا اس کے بدلے میں ہمیشہ زمین کے مالکوں کو یہ موقعہ ملے گا کہ
مقدور بھر زمین پر چل چلائیں۔ اور اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہیں آج جو لکیر ان بدبو اس
قرون کا حکم دے گا شاید اس کے معاصرین اسے ظالم کہیں گے۔ لیکن آنے والی
نسلیں اس بدبو کو ادا ہونے سے بری قرار دیں گی۔ وہ قرار کریں گی کہ اس مقصد کے
لئے قربانی کی جانی تھی وہ اس قربانی کا مستحق تھا۔

کسی ملک پر قابض قوم کو خدا سے ٹھیکہ نہیں ملا

یہاں میں پوری شدت کے ساتھ ان قوم پرست مفکروں کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا
ہوں جو کہتے ہیں کہ زمین کے رقبہ میں توسیع کی کوشش "انسان کے مقدس حقوق" کی
خلاف ورزی کے مترادف ہوگی۔ اس قسم کے بیانات کھڑے کرنے کے بعد یہ اہل قلم
حضرات اپنی دانشورانہ ذمہ داری کا رخ زمین کے رقبہ بڑھانے کی کوششوں کے خلاف صرف
کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سرگرمیوں کے بس پردہ جو غیر شعوری کام کرتی ہیں ان کا
ٹھیک ٹھیک سراغ لگانا دشوار مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ ان حضرات کی ترکتوں
سے جو مغالطہ پیدا ہوتا ہے اس سے ہمارے دشمنوں کو یہ تاثر ملتا ہے۔ یہ وہی دشمن

ہیں جو ہماری قوم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ یہی طاقتیں ان سازشوں کی تقویت کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ غیبی صلاحیتیں بطور اعمل اختیار کر کے قوم کو داخلی طور پر کمزور کرنے کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری قوم اپنی زندگی اور موت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے جو صحیح راستہ اختیار کر سکتی ہے یہی سرگرمیاں ہماری قوم کو اس راستہ سے گمراہ کرتی ہیں قوم کا عزم بری طرح متزلزل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ اہم قومی ضرورت پوری کرنے کا جو طریقہ ممکن ہے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے کسی بھی حصہ زمین پر کسی قوم کا قبضہ خدا کی جانب سے لیز پر نہیں ملتا۔ یہی خدا کا منشا ہے کہ یہ قبضہ ہمیشہ رہے۔ قومی کی موجودہ صورت تاریخی حادثات کا نتیجہ ہیں۔ یہ صورت حالات عارضی ہیں۔ مختلف ادوار میں جو یہی صورت پیدا ہوتی رہی قومی کی موجودہ صورت اس کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دوسری قوم کی صورت حالات کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ دنیا کا ظاہری نقشہ جیسا اب بن گیا ہے ہمیشہ یہی قائم رہے گا۔ دنیا کا موجودہ ظاہری نقشہ درحقیقت قوموں کے عروج و زوال کی ایک تاریخ کا آئینہ دار ہے۔ دنیا کا یہ نقشہ فطرت کی زبردست طاقتوں نے پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کل صبح سے پہلے ہی یہ زبردست قدرتی طاقتیں دنیا کا موجودہ ظاہری نقشہ بدل کر کے اس پر نئی قوموں کو اسی طرح قوموں کی زندگی میں اس موجودہ مقام رکھنے کے لیے جو صورت حالات نظر آتی ہیں وہ بدلتی رہتی ہیں۔

دنیا کی حکومتوں کی صورت حالات انسانوں کی بنائی ہوتی ہیں۔ یہ صورت حالات انسان ہی بدل سکتا ہے۔

ملک انعام میں نہیں ملتے فتح کیے جاتے ہیں

اگر کسی قوم نے بہت بڑے علاقائی رقبہ پر قبضہ کر لیا ہے تو یہ کوئی وجہ نہیں کہ اب ہمیشہ اس پر قابض رہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ پر قبضہ جائز قوم کی قوت اور مفتوح قوم کی کمزوری کا ثبوت ہے گویا قبضہ کی جو صورت اس حالت پر ہے اس

سے فیصلہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر جرمن قوم ایک چھوٹے سے رقبے میں مقید ہے اور اس قید کے باعث جرمنوں کا مستقبل تاریک ہے تو یہ نظریہ کا حکم نہیں۔ اگر جرمنی اس صورت حال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جرمنی نظریہ کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔ یہ کوئی خدائے برتر کا فیصلہ تو نہیں کہ جرمنی کے علاوہ دوسری قوموں کو زیادہ زرخیز علاقے رقبہ بڑا دیا جائے۔ یہی ممکن ہے کہ جرمنی کو کم رقبہ ملنے کے لیے خدائے برتر کی تقسیم کو ناانصافی قرار دینا غلط ہوگا۔ جس علاقے پر ہم آج آباد ہیں یہ بھی تو ہمیں نے ہمارے آباؤ اجداد کو انعام کے طور پر نہ دیا تھا۔ اسی طرح مستقبل میں بھی ہماری قوم کو مزید علاقے فتح کرنا ہوگا تو اس کے سامنے زندہ رہنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ یہ مزید علاقے کوئی قوم ہمیں بطور تحفہ نہ دے گی۔ ہمیں یہ علاقے شمشیر پر فتح کرنا ہوگا۔

آج جرمنی کو یہ بات بخوبی معلوم ہو چکی ہے کہ فرانس کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت تبدیل ہونی چاہیے۔ لیکن اگر جرمنی کی خارجہ سیاست فی الحال اس تبدیلی کو عملی شکل نہ دے سکے تو ہم اس کو پورا قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ جرمنی کو اس کا پورا قصور اسی صورت میں ہوگا کہ جب فرانس کے تعلقات استوار کرنے کے بعد جرمنی کی پیش قدمی محدود ہو جائے اور فرانس سے متصل ہے۔ ادھر سے بے فکر ہو کر جرمنی اپنے علاقے پر پوری توجہ دے سکے۔ یہ علاقے کی توسیع یورپ میں ہونی چاہیے۔ بغیر اس کے جرمن قوم کا وجود محفوظ نہیں ہو سکتا۔ نوآبادیاتی علاقے حاصل کرنے سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ تو صرف اسی صورت میں حل ہوگا کہ ہماری قوم کو آباد کرنے کے لیے ایسا علاقہ حاصل کیا جائے جو ہمارے وطن کے رقبہ میں توسیع کر دے۔ یوں بھی صرف نوآبادکار آبادی کا رشتہ وطن سے استوار رہے گا جبکہ یہ وسیع رقبہ ملنے سے جرمنی کو دوہرا فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ وہ وسیع رقبہ پر پھیلنے کے باوجود ایک سیاسی مرکز سے وابستہ رہے گا۔ بغیر اس کے کوئی قوم کو حاصل نہیں ہو سکتے۔

جرمن عوام کا مقام

www.pdfbooksfree.pk

قوم پرست اشتراکی تحریک کو دوسری قوموں کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں تو اپنی قوم کی حمایت کرنا ہے۔ وہ نہ ایسی تحریک کا حامی ہو سکتا ہے۔ ہم حال گزرے ہوئے زمانوں کی تاریخوں پر دوبارہ نہیں لوٹ سکتا ہے۔ جب کہ ہم خود ماضی کی غلطیوں دہراتے ہیں۔ قومی کی پرانی خود ساختہ حکمت عملی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اسے تمام نوآبادیاتی ممالک کو مغلوب رکھنے کی نیت سے چلایا جاتا تھا۔ نئی خود ساختہ حکمت عملی کو اب اس غلطی کا ارتکاب نہ کرنا چاہیے کہ حقوق پر قبضہ کی راہ میں بہہ کر اپنی سب اولیٰ کو اتنی توسیع دی جائے کہ دنیا کی ہر قوم کا ہر فرد اس کی زد میں آجائے۔ ہم کئی چھوٹی چھوٹی غریب قوموں کے حقوق کا تحفظ کر رہے ہیں تاہم ہم قومی قوم کے پرستار ہیں۔

ہم قوم پرست اشتراکیوں نے اس سے کبھی "کے جانا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ایک عظیم قوم محض رقبہ کی وجہ سے تباہ ہونے لگے تو اس وقت جزیرہ حاصل کرنے کا حق ایک فرض کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خاص طور پر جس قوم کی بنیاد کسی علاقے پر ہو جائے وہ حبشی نسل کی کوئی چھوٹی موٹی قوم نہیں بلکہ وہ ہم آہم جرمن قوم ہے جس نے موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیادیں کھڑی کی ہیں اور جس کے بغیر دنیا سے زندگی کا لطف جاتا رہے گا۔ تو پھر یہ فرض اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ جرمنی یا تو دنیا کی زبردست حکومت بن جائے گا یا اصلی حیثیت سے اس کا نام مٹ جائے گا۔ دنیا کی زبردست حکومت بننے کے لیے جرمنی کو جزیرہ رقبہ کی حاجت ہے۔ جزیرہ رقبہ ملنے سے ہی جرمنی کو موجودہ زمانہ میں اہمیت حاصل ہو گی۔ اور آئندہ کے لیے جرمن شہریوں کے رزق فراہم کرنے کا انتظام ہو گا۔

تقدیر کا اشارہ ہے کہ ہم روسیوں پر حملہ کریں

لہٰذا ہم قوم پرست اشتراکیوں نے یوں بوجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ کل سے پہلے جرمن خارجہ حکمت عملی نے جو راستہ اختیار کیا ہے ہم اس راستہ پر چلیں گے۔ جرمنی نے ہمیشہ سے آنکھ پورب اور مغربی پورب کی طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے ہم یہ کوشش

ترک کر دیں گے۔ اس کے بجائے ہم یورپ کے مشرق میں بڑھنے کی جدوجہد کریں گے۔ ہم پہلی جنگ عظیم سے قبل کی نوآبادیات حاصل کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کی پالیسی ترک کر کے مزید علاقہ حاصل کرنے کی پالیسی پر کاربند رہیں گے۔

لیکن جب ہم آج کل یورپ میں مزید رقبہ حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو زیادہ تر روس ہی اس کی سرحدی ریاستوں پر ہماری نظر پڑتی ہے۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود تقدیر ہمیں اس جانب بڑھنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ قدرت نے روس کو یوکرائن کے حوالہ کر کے اس روسی دانشور طبقہ سے محروم کر دیا ہے جس نے کبھی روسی سرکار کو تخلیق کیا تھا۔ یہ دانشور طبقہ ہی روسی سرکار کی تاریخی علامت تھا۔ روسی سرکار کا قیام روس کی سلطانی عمل کی کارگزاری کا نتیجہ نہ تھا۔ اس میں تو بانی عمل کی سیاسی تعمیری استعداد کو دخل تھا۔ دراصل روس کی سرکار کا قیام بھی ژرمن عمل کے تعمیری کارناموں کی ایک مثال تھا۔ ژرمنوں میں قیام حکومت کی وہ فطری استعداد موجود ہے کہ جب وہ کسی دنیاوی عمل کے گھر جا کر آباد ہوتے ہیں تو وہاں بھی ایک سرکار کا تعمیری عمل شروع کر دیتے ہیں۔ روسی زمین پر ایسی بہت سی عالی شان سلطنتیں ژرمنوں کے عملی کام ہوئیں۔ ایسا ہوتا ہے ژرمن عناصر نے روسی نسلوں کو منظم کر کے ہر طرف ان کے حاکم بن کر نہایت زبردست سرکاریں قائم کر دیں۔ یہ سرکاریں اس وقت تک قائم رہیں جب تک خود ژرمنوں کا عمل علاقہ قائم رہا۔ یہ سرکاریں تھیں تو ژرمنوں کے ہنر کا کرشمہ اس لیے ہر یہ سرکاری وقت تک قائم رہی جب تک کہ اس کے بنانے والے ژرمن عناصر عملی علاقہ سے ہٹتی رہے۔ صدیوں تک روس کے رزق کا انتظام وہ سرکار کرتی رہی جس کے حاکموں کی بیشتر تعداد ژرمنوں پر مشتمل تھی لیکن اب ان حاکموں کا علاقہ تو کر دیا گیا ہے۔ ان کی جگہ یہودیوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب روسیوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ خود اپنی طاقت سے یہودیوں کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ دوسری طرف خود یہودی بھی اس زبردست سلطنت کو زیادہ عرصہ قائم نہیں رکھ سکتے یہودی میں ہرگز یہ

عطا میت نہیں ہوتی۔ یہودی تو تباہی کے ذریعہ ہیں مشرق میں رومی کی عظیم شان سلطنت ایک پکے ہوئے پھل کی طرح اس وقت کی منتظر ہے جب اسے جڑ سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ رومی یہودیوں کا علاج بھی نہیں ہوگا جب اس رومی سرکار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم تو دنیوں کو قدرت نے یہ خصوصیات بخشی ہے کہ ہمیں رومی سرکار کی یہ ہوا دیکھنے کا موقع ملے گا۔ یہ سب سے بڑا ثبوت ہے اور روحانی نظریہ درست ہے کہ قوموں کی بنیاد ان کی نسل پر ہوتی ہے۔

دہقان کامل نوردی مجاہد کی تلوار

یہ ہمارا فرض ہے اور قوم پرست شتر ای تحریک کا سبب بھی ہے کہ ہماری قوم میں ایک ایسی سیاسی ذہنیت پیدا کر دی جائے جس سے ہمیں اسلام ہو سکے کہ ہمیں کس ہدف سے کام لینا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے جو کوششیں کرنی ہیں ان کوششوں کی نوعیت کیا خاص ہوگی۔ ہمیں محض جوش و خروش سے الف نوردی کی خاطر سکندر عظیم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مہمات فتح کرنی ہیں بلکہ ہمیں تو اس کا شکار کا مل جانے کی خاطر محنت کرنا ہے۔ قوموں کی تقدیر وہ طاقت صاف کرے گی جس پر ہمیں حد سے زیادہ بھروسا ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ یہودی اس پالیسی کی دل کی تہ سے مخالفت کرتا ہے۔ یہودی دوسروں کے مقابلہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ طریقہ کار اختیار کیا گیا تو خود یہودیوں کے لیے کوئی امید باقی نہ رہے گی۔ صرف اس بات سے ہمارے ہمدرد لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہماری یہ حکمت عملی درست بھی ہے اور مناسب بھی۔ لیکن بدقسمتی سے صورت حال اس کے برعکس ہے۔ نہ صرف ہماری قوم پرست پارٹی بلکہ خالص قوم پرست حلقوں میں بھی مشرق کی جانب بڑھنے کی پالیسی شدید مخالفت کی جاتی ہے۔ اس مخالفت کے دو اسباب ہیں جیسا کہ عام دستور ہے اکثر ہماری قوم کے نام نہاد رہنما ایسی نفسی پیچیدگیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ حقیقی مخالفت کی تہ میں اصل محرک کی روحانیت کا تجزیہ

کیا جاتا ہے۔ یہ اتحاد مخالفت قرنس کے مفاد کے لیے سخت مضر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بسمارک نے روس سے اچھے تعلقات پر زور دیا تھا۔ یہ بات کس حد تک سچی ہے لیکن جو لوگ یہ تذکرہ کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بسمارک نے اطالیہ کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے پر بھی اتنا ہی زور دیا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ ہر جان بسمارک نے ایک مرتبہ اطالیہ سے علیحدہ معاہدہ بھی کیا تھا۔ اس معاہدے سے بسمارک کا مقصد یہ تھا کہ فرانسیسیوں سے آسٹریا کے ساتھ بہتر سلوک کرا سکے۔ آج کل بھی اسی پالیسی پر کیوں عمل نہیں کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ آج کل اطالیہ وہ اطالیہ نہیں جس سے بسمارک کو واسطہ پڑا تھا۔ خوب لیکن سے معزز حضرات مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آج کا روس بھی وہ روس نہیں جس سے بسمارک کو واسطہ تھا۔

بسمارک ایک وقت تھا

بسمارک نے کبھی ایسی خارجہ حکومت عمل کا اعلان نہ کیا تھا۔ جس پر عامل ہونا ہر حال ضروری ہوتا۔ نہ ہی بسمارک نے کوئی قسمیں یا بیعتیں اختیار کی تھیں۔ بسمارک تو ہوا وقت تھا۔ وہ ایسے حالات ہوتے تھے ان کے مطابق کام چلتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو کسی مستقل پالیسی میں الجھانے کا قائل نہ تھا۔ آج یہ سوال نہیں کہ بسمارک نے کیا کیا۔ سوال یہ ہے کہ آج بسمارک کیا کرتا؟ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ بسمارک کا تدبر اسے کبھی یہ اجازت ہی نہ دیتا کہ وہ روس جیسی کسی ایسی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرے جس کی تباہی مقدر ہو چکی ہے۔

مزید برآں بسمارک تو آپ بات قائم کرنے اور حقوق کو ثابت کرنے کا بھی زبردست قائل نہ تھا۔ بسمارک کی سب سے بڑی خواہش تو یہ تھی کہ اس نے سرکار کا جو کام اپنے ہاتھوں سے تمام کیا تھا اسے مستقل شکل دینے اور ہمیشہ کے لئے مستحکم بنانے کا موقع مل جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کی خاطر اس نے روس کے ساتھ معاہدہ کرنا قبول کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس معاہدے کے بعد مشرق سے قرنس پر کوئی حملہ نہ ہو سکے گا تاکہ بسمارک

مغرب میں پہلی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔ لیکن اس زمانے کے حالات میں جو بات مفید تھی وہ آج کل کا عصر میں بھی ہے۔

"مظلوم اقوام کی لیگ"

۱۹۱۰ء کا ذکر ہے کہ جب ہماری نوزائیدہ تحریک کا بھی بالکل آغاز ہوا تھا اور ہمارے محلاپ پر آہستہ آہستہ اس تحریک کا رنگ چڑھنے لگا تھا تو کئی ممالک میں جا بجا ان قوموں کی آزادی کے لیے انجمنیں قائم کی گئی تھیں۔ اس موقعہ پر کئی حلقوں نے ہماری تحریک سے درخواست کی کہ دوسرے ملکوں کی آزادی کے لیے کوشش کرنے والی تحریکوں کے ساتھ ہماری تحریک کا رابطہ قائم ہو جائے۔ اس موقعہ میں مظلوم اقوام کی لیگ کی جانب سے بھی دعوت موصول ہوئی۔ اس مظلوم لیگ کا ان دنوں بڑا چرچا تھا۔ اس مظلوم لیگ نے موٹے موٹے طور پر کالے کا مصر، ہندوستان اور ترکی و ایران کے مقامی رہنما تھے لیکن مجھے تو یہ مظلوم لیگ والے ایک "گورنمنٹ" بھاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ بھی بڑے طنطنے قسم کے لوگ ہیں۔ یہ حضرات دیکھنے تو بہت مارتے ہیں لیکن ان کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ بہرحال کی نہ کسی طرح اس وقت اہل مشرق کے جھانسے میں آ گئے۔ ان میں خاص طور پر قوم پرست نوجوانوں کی تعداد شامل تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک آوارہ گرد ہندوستانی یا کسی مصری طالب علم سے لنڈن کرتے وقت وہ ہندوستان یا مصر کے کسی نمائندہ سے بات کر رہے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہ تھا کہ یہ آوارہ گرد لوگ کسی سے واسطہ ہی کا ہے جن کی پشت پر کوئی طاقت نہ تھی۔ انہیں کسی نے معاہدات کرنے کی اجازت نامے نہیں دی تھی۔ غرض ایسے فرد سے بات چیت کرنے کا فطری نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ معاملہ جہاں تھا وہیں رہتا۔ اس بات چیت میں جو وقت صرف ہوتا تھا وہ بالکل ضائع ہو جاتا۔ میں یہی باتوں سے ہمیشہ بچتا رہا۔ میں تو میں ایسا مصروف رہا تھا کہ اس قسم کی بیہودہ گفتگوؤں میں فضول وقت ضائع نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یقین تھا کہ ہم بیچ کے نمائندوں سے بات کر رہے ہیں جب کبھی یہ بات بالکل فضول

ثابت ہوگی ممکن ہے کہ یہ پالیسی مختصر ثابت ہو۔

قبر کے مردوں سے اتحاد فضول ہوتا ہے

یہ بات قابل افسوس ہے کہ جرمنی نے زمانہ جنگ میں حلیفانہ معاہدات قائم کرنے کی جو پالیسی تجویز کر رکھی تھی اس کا کوئی عملی اور بارآور نتیجہ نہ نکلا۔ اس پالیسی کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ جرمنی بعض بے سود رعایتوں کے ساتھ دو کاغذی معاہدات میں پھنس گیا۔ یہ بے سود رعایتیں ایسی تھیں کہ دوسروں کو اپنی جانب سے قبر میں دفن کر چکی تھی۔ ترکی اور آسٹریا کے لیے معاہدات کوئی خوشی کا موقعہ مہیا نہ کرتے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی عسکری اور صنعتی سرکاریں ہمارے خلاف جارحانہ قدم کے لیے ایک دوسرے کی تلاش میں پھرتی تھیں۔ اس کے جواب میں ہم نے چند کمزور اور بے کار سرکاروں کو جمع کر کے بھان متی کے کنبے کے ذریعہ دنیا کے بیشتر دوست عالم گیر اتحاد کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اس غلط پالیسی کی وجہ سے جرمنی کو بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی۔ باوجود یہ مہنگی قیمت ادا کرنے کے جرمن قوم میں سے کسی شخص نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ اب دوبارہ اس غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ زبردست اور طاقتور حلیفوں کو صلح پسندی کی غرض سے ہتھیار رکھانے پر آمادہ کرنے کے لیے مظلوم قوموں کی ایک بناوٹی اور مصنوعی لیگ مہلک حرکت ثابت ہوا ہے۔ یہ حرکت مہلک اس لیے ہے کہ ایسی فضول کوششوں میں مشغولیت کے باعث جرمنی ان واقعی مکانات سے محروم رہ جائے گا جنہیں ترک کر کے یہ بے کار اور بے کار ہونی قبریں کھودی جا رہی ہیں۔ حقیقی یہ ہے کہ آج جرمنی کی حالت ایسی ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اونچے گھرانے کے بڑے بڑے لوگ نعشوں کے سوداگروں کے ہمراہ ہو لیتے ہیں۔ جہاں ایک دیوانہ سیدھا ہوئی کئی لوگ اس کے پیچھے بھاگنا شروع ہو گئے۔ یہ مظلوم قوموں کی لیگ ہو یا لیگ آف نیشنز ہو یہ لیگ کا کوئی ہو دار حقیقت یا خفیہ ہو ظاہر یا مخلص اس کے پیچھے دوڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان پر انگریز راج ختم ہوا تو انگریز مت جائے گا

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۴۰ء میں بعض قوم پرست حلقوں کے اندر یہ بات کہی جانے لگی تھی۔ حالانکہ ان کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ ان امیدوں کا ظہور یہ تھا کہ ہندوستان میں انگلستان کا راج ختم ہونے والا ہے۔ بعض کند ذہن جاہل انڈین واقعات یہاں آکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تو ہندوستان کے داعی ہیں۔ اس کے بعد وہ دیہات کا دورہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے نا سمجھ معقول لوگوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ برطانوی عالم گیر حکومت کا کام ہندوستان میں ہے کب ختم ہونے والا ہے۔ کسی کو یہ کچھ نہیں کہ اس قسم کے خیالات دراصل سی آئی ڈی والوں کے ذہن میں ہیں۔ ہندی کوئی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی آرزو میں کبھی نہ بجھیں۔ اب یہ لوگ سوچتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریز کا راج ختم ہونے والا ہے اور ہندوستان پر انگریز کا راج ختم ہونے سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ برطانوی حکومت کے خاتمہ سے انگلستان کا اقتدار مٹ جائے گا۔ ان لوگوں کا یہ استدلال یہ واضح کر دیتا ہے کہ ہندوستان پر قبضہ رکھنا انگلستان کے لیے کتنا ضروری ہے۔

انگریز افسر ہٹ گئے تو برطانوی حکومت ختم ہو جائے گی

کیا یہ قوم پرست ذرا بھی سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ دنیا کے اس اہم مسئلے کے بارے میں وہ صرف اپنی ہی معلومات رکھتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے ہاتھ میں انگریز کی قسمت کا پانسہ دے دینا دانائی ہے؟ کیا وہ ان حقائق سے واقف ہیں جو فرض کر لیا کہ واقعی ہے کہ خود انگلستان کو اپنی بقا کے لیے ہندوستان پر قبضہ جاری رکھنے کی اہمیت کا احساس نہیں۔ اس قسم کے بے بنیاد مفروضات میں کھلے رہنے کا ثبوت کرتا ہے کہ ہم نے پہلی جنگ عظیم سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ یا تو ہم انگریزوں کے عزم و ارادہ سے آج بھی ناواقف ہیں یا ہم نے انہیں بالکل غلط سمجھا ہے۔ ورنہ ہمیں معاملہ میں گرفتار کیے ہونے کو انگلستان سے اپنے ہاتھ سے ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا نکل جانے دے گا۔ انگلستان اس وقت تک یہ

نہیں ہونے دے گا جب تک وہ اپنے خون کا آخری قطرہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے صرف نہ کر چکا ہوگا۔ ان تو ہمات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ترکی اور تقریباً برطانوی سلطنت کے عزم و ارادہ سے کتنا ناواقف ہے۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ برطانوی سلطنت کا نظم و نسق درحقیقت کن طریقوں سے چلایا جاتا ہے۔ ہندوستان پر انگلستان کا قبضہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک برطانوی راج اپنی حکومت کے دلوں میں جو اصل کے جوہر کو داخل نہیں کر لیتا۔ ہندوستان کے موجودہ حالت میں اس غلطی کا ارتکاب کا کوئی امکان نہیں ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ختم ہو جانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی زبردست دشمن حکومت اپنی طاقت سے انگریزوں کو شکست دے دے۔ ہندوستانیوں کی جہاد سے انگریزوں کا راج کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ہم مسلمانوں کو تجربہ ہو چکا ہے کہ انگلستان کو کسی کام پر مجبور کرنا کتنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایک لمحہ کے لیے ہم یہ مان لیں کہ ہندوستان کا ہر باشندہ مرتے دم تک لڑتا رہے گا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ہندوستان ہی کسی دوسری قوم کا مقبوضہ ہو۔

مشین گن کی گولیاں "جہاد کا جوش" ٹھنڈا کر دیتی ہیں

یہ امیدیں بھی محض خیالی ہیں کہ عصر میں کوئی شاہانہ جہاد ہو جائے گی۔ "جہاد" کے نعرہ سے ہم مسلمانوں کو شاید یہ دھوکا ہو جائے کہ اب دوسری قومیں ہماری خاطر اپنا خون بہائیں گی۔ اس دھوکہ سے ہم اپنے نفس کو خوش بھی کر لیں۔ اس قسم کی بے وقوفانہ خوش آرائیاں ہمیشہ ہی توقعات پیدا کر دیتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں ہی برطانوی فوج کی چند پلٹنوں نے اپنی مشین گنوں سے بکھ گولیاں برسائیں اور آسمان سے برطانوی بمباروں کی طرف سے بم برسنا شروع ہو جائے گا۔

ہندوؤں کی ایک فوج کبھی ہو کر بھی زبردست سلطنت پر کامیابی سے حملہ آور نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص جبکہ یہ سلطنت ضرورت پڑنے پر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے پر آمادہ ہو۔ میں ایک قوم پرست ہوں میں خوب جانتا

ہوں کہ انسانیت کی مثبت بنیادوں کو قائم رکھنا کتنا ضروری ہے۔ اس لیے میں ان تمام انسان مظلوم قوموں کو عملی لحاظ سے دلیل سمجھتا ہوں۔ میرا یہ احساس ہی مجھے اس سمت سے دور رکھتا ہے کہ میں اپنی قوم کی تنگ نظر پرچند دلیل نسلوں کی تنگ نظری سے وابستہ کروں۔

روس اور جرمنی میں اتحاد نہیں ہونا چاہیے

آج ہمیں روس کے متعلق میں بھی یہی رائے اختیار کرنی ہے۔ آج روس اپنے اس عظیم الرتبہ سے محروم ہو چکا ہے۔ جو تزار سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنے اس عظیم رتبہ سے محروم ہونے کے بعد روس اس قابل نہیں کہ جرمنی اپنی جنگ آزادی میں اسے اپنا حلیف بنائے۔ روس کے نئے حکمرانوں کی پالیسی اور روش میں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ محض فکری رجحان سے بھی مغربی یورپ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے روس اور جرمنی کا اتحاد ہمارے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ ایسے اتحاد کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ساری دنیا سے جنگ چھڑ جائے گی۔ یہ جنگ روس کے علاقہ پر نہ ہوگی بلکہ جرمنی کے علاقہ پر ہوگی۔ اس جنگ میں جرمنی کو روس سے کوئی مؤثر امداد نہیں مل سکتی۔ موجودہ جرمن سلطنت کی قوت کے وارث ہمیں اتنا کافی ہیں کہ ہم اپنے ملک سے باہر اگر کوئی جنگ چھیڑ جائیں تو اپنی سرحدات کی حفاظت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نہ صرف مغربی یورپ ہمارے خلاف ہوگا بلکہ انگلستان بھی ہمارے خلاف لڑ رہا ہوگا۔ جرمنی کے جس علاقہ پر جرمن صنعت سازی کے کارخانے واقع ہیں وہ فوراً کسی دفاع کے دشمنوں کے مشترکہ حملہ کے سامنے جرمنی کو خالی کرنے پڑیں گے۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ جرمنی اور روس کے مابین پولینڈ کی سلطنت واقع ہے۔ پولینڈ کی پوری طرح غرائش کے زیر اثر ہے۔ اگر جرمنی اور روس مل کر مغربی یورپ کے خلاف جنگ چھیڑیں تو جرمنی کی مدد کو پہنچنے کے لیے روس کو پولینڈ طے کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں موجودہ زمانہ کی جنگوں میں ہوائیوں کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی سامان حرب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس جنگ میں بھی ہماری وہی حالت ہوگی جو پہلی جنگ عظیم میں تھی جبکہ اس سے بھی

بڑھ گئی۔ جنگ عظیم کے دوران میں بھی یہ حالت تھی کہ جرمن صنعت کاری کے کارکنوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے شاندار حلیفوں کو امداد مہیا کرنی پڑتی تھی۔ صنعت و حرفت کے اعتبار سے گویا جرمنی کو کبھی جنگ کا بوجھ برداشت کرنا ہی نہ تھا۔ جس معرکہ جنگ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اگر اس کی نوبت آئی تو صنعت و حرفت کے اعتبار سے روس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔

آئندہ جنگ مشینوں سے لڑی جائے گی

دوسری جنگ عظیم میں لڑائی کا سارا دارومدار مشینوں پر ہوگا۔ ایسی جنگ میں مشینی علاقے جرمنی کا بالکل نہ ہونا ہوگا۔ اس میدان میں جرمنی ٹرسناک طور پر پچھڑ گیا ہے۔ پھر جرمنی کے پاس جو تھوڑی بہت مشینیں ہیں۔ ان میں سے روس کو بھی مدد دینی ہوگی۔ آج روس میں کوئی ایسا صنعتی مرکز نہیں جو اورال سے پچھم میں ہو سکتا ہو۔ ان حالات میں اگر معرکہ جنگ چھڑ گئی تو اس کا نقل و حمل ہوگا۔ جرمن نوجوانوں کو اس سے کہیں زیادہ جانیں دینی پڑیں گی جو پہلی جنگ عظیم میں وہ پیش کر چکی ہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ میدان جنگ میں لڑنے کی عزت کا سارا حصہ انہیں کو ملے گا اور نتیجے کی ذمہ داری پہلے سے کمتر آدمیوں کو۔ فرض کر لیجئے کہ کوئی ایسا معجزہ ہو جائے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد جرمنی صحیح سالم دنیا سے بچ جائے تو پھر بھی یہ نتیجہ تو ضرور ہوگا کہ جنگ میں جتنے نوجوان مارے جائیں گے کہ جس سے جرمن قوم کا کچھ نکل جائے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ کے لیے جرمنی چاروں جانب سے بڑی بڑی فوجی طاقتوں کے درمیان محصور ہو جائے گا۔ بتائیے اسے طبیعاتی معاملے سے اور ایسی جنگ سے فائدہ کیا ہوا؟

انتخاب ہمیشہ جنگ کی خاطر ہوتا ہے

یہاں پر اعتراض ضمنی ہے کہ اگر ہم نے روس سے تجارت کر لی تو فوراً جنگ نہ چھڑ جائے گی۔ بلکہ حکومت جنگ کی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طبیعاتی معاملہ جنگ کی خاطر نہ کیا جائے پھر کسی معاملے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ جب کوئی معاملہ

کیا جائے چاہے اس وقت جنگ کا امکان بعید ہو پھر بھی معاہدہ کا اصل مقصد تو جنگ کا امکان ہی ہوتا ہے۔ مگر یہ سوچنا کہاں تک صحیح ہے کہ دوسری حکومتیں جرمنی اور روس کے معاہدہ انتہا کا مطلب نہ سمجھیں گی۔ روس اور جرمنی کا معاہدہ یا تو محض ایک کاغذی معاملہ ہوگا اور اس صورت میں ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یا پھر معاہدہ میں جو کچھ لکھا ہوگا اس پر عمل بھی ہوگا۔ اور ایسی صورت میں ساری دنیا کو اس کا پتہ چل جائے گا۔ یہ تصور ہوگا کہ اس پر عمل بھی ہوگا۔ اور ایسی صورت میں ساری دنیا کو اس کا پتہ چل جائے گا۔ یہ تصور کرنا محض حماقت ہوگی کہ اس حالت میں انگلستان اور فرانس دس سال بیٹھے انتظار کرتے رہیں گے کہ روس اور جرمنی اپنے معاہدہ کے مطابق جنگ کی تیاریوں مکمل کر لیں تو پھر دونوں پر حملہ کر دیا جائے۔ نہیں نہیں۔ جونہی یہ معاہدہ کیا جائے گا جرمنی پر جنگ کی بجلیاں فوراً کوندنے لگیں گی۔

لہٰذا روس سے جرمنی کا معاہدہ کا مطلب یہ ہوگا کہ فوراً ایک نئی جنگ چھیڑ دی جائے اور اس جنگ میں جرمنی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مندرجہ بالا امور کے ساتھ حسب ذیل کو بھی نگاہ رکھنی چاہیے

آج کل جو لوگ روس پر حکمران ہیں وہ کسی آدمی سے معاہدہ کرنے یا معاہدہ کے بعد اس کی پابندی کے قائل ہی نہیں۔

روس کے حکمران بے رحم اور مکار ہیں

بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ روس کے موجودہ حکمران خونخوار مجرم ہیں۔ یہ لوگ انسانیت کے بدترین اور پست ترین عناصر ہیں۔ وہ معاشرہ کے ادنیٰ طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ حالات کی سازگاری کے باعث ایک دم انقلاب میں یہ زبردست سرکار کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ انہوں نے لاکھوں پڑھے لکھے انسانوں کو مار ڈالا یا انہیں ان کے وطن سے در بدر کر کے ذلیل کر دیا۔ انہیں خونخواری کی یہ حرکات کرنے میں لطف آتا ہے۔ اب انہیں حکومت کرتے دس سال ہونے کو آئے ہیں۔ وہ اس تعلیم و تہذیب کے ساتھ حکومت کر رہے

مطابق ان طریقوں سے جنگ لڑتی ہے۔ اس طرح یہودیوں نے اپنی بقا کے مطابق یہ طریقہ کار وضع کیا ہے اور وہ اس طریقہ سے جنگ کرتے ہیں۔

یہودیوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے دوسری قوموں کے معاشرہ میں کسی نہ کسی سوراخ سے گھس جاتے ہیں مگر وہ دوسری قوم کے معاشرہ کے اندر مل نہیں جاتے ہیں۔ یہودیوں کے اختیار روغ گوئی ہمیشہ نزاعی ہوتا ہے وہ خود سے دوسری قوم میں اختلاف پیدا کرتا ہے۔ یہودی ان اختلافوں سے اپنے مقاصد کو برباد کرتا ہے۔ آج دنیا میں بالشویزم کی جو شکل فروغ پا رہی ہے درحقیقت وہ بیسویں صدی میں یہودیوں کے اس خفیہ منصوبہ کی ترجمان ہے جس کے ذریعہ یہودی ساری دنیا پر چھا جانا چاہتے ہیں۔ آج سے پہلے اور قرنوں میں یہودی دوسرے حربہ سے استعمال کرتا رہا ہے لیکن اس کا مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہودی طور پر اس کے لئے یہی رہتے ہیں۔

عزائم کی بنیاد

یہودیوں کی یہ کوشش ان کی فطرت کے عمیق ترین رجحانوں سے صادر ہوتی ہے اور ان کی طبیعت سے عین مطابقت رکھتی ہے۔ کوئی قوم کبھی خود بخود اپنی بنیاد پیدا کرنا یا اقتدار کی تخلیق کرتے رہنا ترک نہیں کرتی۔ صرف یہ ہوتی ہے کہ اپنے کام کے لئے کسی قوم کو اپنی نسل بڑھانے یا نظام اقتدار سے دور رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی کبھی خود بخود اپنی بادشاہت قائم کرنے کا خواب ترک نہ کرے گا۔ نہ ہی وہ اپنی مادی تگ و دو سے دستبردار ہوگا۔ یہودی کو ہار رکھنے کی یہی ایک صورت ہے وہ یہ کہ کوئی اور ہی طاقت اس کو ہرا دے۔ دنیا پر بنی اسرائیل کی بادشاہت قائم کرنے کا خواب یہودیوں کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔ کسی قوم میں یہودیوں کے بعث صرف بانجھ نسل کا اضافہ صرف تب پیدا ہوتا ہے جبکہ اس قوم کا خون پاک نہ رہے۔ اور اس میں انتشار پیدا ہو جائے۔ یہودیوں نے اپنی نسلی خون پاک رکھنے کا اہتمام دنیا کی باقی نسلوں سے بہتر کر

رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی اپنی فطرت کے راستے پر اس وقت تک گامزن رہے گا جس وقت تک کوئی اس سے زیادہ قوی طاقت سے اسے باز نہ رکھے۔ عزازیل کی اولاد انسان کے راہ سے منحرف کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ اسے ان کی ملعون چالوں پر قابو تک واپس بھیجنے کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔

آج ہماری روحانی یا الہٰی جنگ کا میدان جنگ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک دفعہ پھر زندہ ہو جائے اگر ہم اپنی قوم کو بین الاقوامیت کے اژدھا کی کنڈلی سے نجات دلانا چاہتے ہیں اگر ہم یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ہماری نسل کے نسلی خون میں جو تبدیلی ہو رہی ہے اسے روکا جائے تاکہ ہماری قومی خاصیتیں ایک دفعہ پھر ابھر کر سامنے آ جائیں اگر ہماری تمنا ہے کہ حال ہی میں ہماری قوم کو جو عادت ڈالی گئی ہے اس کو دوبارہ ڈالنے کی نوبت نہ آئے۔ تو ہمیں ایک عہد جہد اور مسلسل و متواتر جنگ کرنا ہوگا۔

شیطان سے نجات کے لیے بہتوں کی پناہ درکار ہے

اگر ہماری منزل یہ ہے تو یہ بھی حماقت ہوگی کہ ہم اس ملک سے علیحدہ اتحاد قائم کریں جس کا آقا ہمارے مقصود کا جانی دشمن ہے۔ ہم اپنی قوم کو اس زہریلے کنڈل سے کیسے نجات دلائیں گے۔ اگر ہم خود بھی اس زنجیر میں گرفتار ہو گئے ہم دوسروں کو کیسے سبق دے سکیں گے کہ یہودی انسانی کے خلاف ایک خبیث گناہ کار کتاب ہے۔ اگر ہم خود اس بھنگی فنڈ کے رفیق بن گئے اور اس کے وجود ہم نے تسلیم کر لیا جو اس کے تمام گروہوں کو ایک خاص ضابطہ حیات سے منسلک رہنا ہے ہمیں ان کی مذمت کا کیا حق ہوگا اگر خود ہماری سرکار نے اسی ضابطہ حیات کے مانے والوں کو اپنا حلیف بنایا۔

عالم گیر یہودی یا الہٰی نظام کے خلاف جدوجہد کا تقاضا ہے کہ ہم سود بیت رہن کے متعلق بھی ایک واضح موقف اختیار کریں۔ شیطان سے نجات حاصل کرنے کے لیے

مفادات کی پاسداری حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

آج قوم پرست تحریکوں کے ساتھ ساتھ اتحاد قائم کرنے کی تجویز پر غور کرتے وقت بڑے خوش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو جرمنی میں اپنے گرد و پیش نگاہ ڈال کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی حمایت کرنے والے کون ہیں؟ کیا ان قوم پرستوں کا قبول ہے کہ اس پالیسی کی حمایت کرتا جو مارکس ازم اور لبرل ازم کے حامی عناصر کے خلاف ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی قوم کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے؟ کیا یہودی بھی کبھی قوم پرست تحریکوں کے ہمنوا ہو سکتے ہیں۔

کبھی روس اور جرمنی کا اتحاد بھی ممکن تھا

قدیم جرمن سلطنت نے حلیفانہ معاہدے کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس پر ایک اعتراض خاص طور پر وارد ہوتا ہے کہ وہ اعتراض یہ ہے کہ قدیم جرمن سلطنت نے بھی اس طریق کا ساتھ دے کر دیکھا کہ اس طریق کا ساتھ دے کر کار تمام کھوٹوں سے اپنے تعلقات خراب کر لیے تھے۔ اس تذبذب کی وجہ یہ تھی کہ قدیم جرمن سلطنت برتری پر دنیا کا اس دور میں یقین رکھنا چاہتی تھی۔ تاہم قدیم جرمن سلطنت کی خارجہ پالیسی میں بھی ایک خوبی ضرور تھی۔ وہ خوبی یہ تھی کہ قدیم جرمن سلطنت نے روس کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا سلسلہ قائم کر دیا۔

میں صاف کوئی سے یہ اقرار کرتا ہوں کہ بیسویں صدی کے اوائل میں میری رائے یہ تھی کہ جرمنی کے لیے بہتر ہوتا کہ اگر جرمنی توسیع پذیر سیاست اور بحری قوت میں توسیع کے متعلق اپنی امنگوں پر بھی ترک کر کے انگلستان کے ساتھ روس کے خلاف اتحاد کر لیتا۔ ایسا ہو جاتا تو جرمنی دنیا بھر میں پاؤں پھیلانے کی کوشش پر بالیسی سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ براعظم یورپ میں یا رقبہ حاصل کرنے کی کوشش سے ایک ہولناک جنگ چھڑ جاتی جس کا نتیجہ جرمنی کی حکمت عملی پر کاری ضرب ہو سکتا۔

روس میں بلشویکوں کے عالم گیر اتحاد کے حامی جرمنی کے خلاف جو کارروائی

دھمکیاں دیتے رہتے تھے وہ مجھے آج تک نہیں بھولیں میں یہ بھی نہیں بھولا کہ روس آسٹریا کو مضطرب کرنے کے لیے ہر مہینے کا اعلان کرتا رہتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں بھولا کہ جنگ سے قبل کے ایام میں روس کی رائے عامہ آسٹریا اور ترکی سلطنت کے خلاف نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ میں یہ بھی نہیں بھولا کہ روس کے مرکزی اخبار کھلے الفاظ میں جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی تائید کیا کرتے تھے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جنگ سے قبل ایک اور راستہ اختیار کرنا بھی ممکن تھا یہ ممکن تھا کہ جرمنی روس کی امداد حاصل کر کے انگلستان پر دھاوا بول دیتا۔

شکست سے بھی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے

آج حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ اگر جنگ سے پہلے ہم اپنے تمام جذبات نظر انداز کرتے ہوئے روس کے پہلو بہ پہلو چلنا چاہتے تو ایسا ممکن تھا لیکن دنیا بھر میں وہ حالات بدل چکے ہیں اب قسمت پانسہ پھینک چکی ہے۔ یہ پانسہ فیصلہ کن انداز میں پھینکا گیا ہے۔ ہماری قوم کی قسمت کا فیصلہ اب کے ہو کر رہے گا۔

آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں استحکام حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا استحکام ہمارے لیے سبق کی علامت ہے ہم بھی اپنی فکر کریں۔ ہماری قوم کو خواہوں کی دنیا سے نکل کر حقوں حقیقی کی دنیا میں قدم رکھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی۔ ہمیں اس کے قدیم جرمن سلطنت کو دوبارہ زندہ کرنا اور کامیابی کی منزل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

قوم پرست اشتراکی تحریک کہتی ہے کہ یہ جنگی ہار ہم فرض ہے ہمارے سپرد ہوا ہے۔ ہم اس فرض کی ادائیگی کی صورت میں سبکدوش ہو سکتے ہیں جب خوش فہمیاں ایک طرف رکھ کر عقل کی روشنی میں قدم اٹھایا جائے۔ جب ہوگو نے ۱۹۱۸ء میں ہم پر حکومت کی تھی وہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ایک بہت کامل ثابت ہوگی۔ شکست سے سبق حاصل کر کے ممکن ہے کہ جرمن قوم اپنی خارجہ پالیسی کے لیے بہت بالکل نیا

اندرونی اقتدار کرے۔ قوم کے اندرونی استحکام کی بنیاد ایک حد تک ضابطہ حیات پر ہوگی۔ بیرونی استحکام حاصل کرنے کے لیے جرمنی کے لیے ممکن ہوگا کہ بیرونی دنیا سے بھی اپنے تعلقات مستقل بنیادوں پر استوار کرے۔ ایسا ہو گیا تو پھر جرمنی کے پاس بھی سیاسی روایت کی ایک کمی ہوگی۔ جب بھی جرمن کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوگی تو اسی کسوٹی پر پرکھ کر لیا جا سکے گا کہ یہ فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔ انگلستان کو شروع ہی سے ایسی سیاسی روایت حاصل ہیں۔ ایک زمانہ میں روس کی ایسی روایات کا حامل تھا۔ اور فرانس تو متعدد بار اپنی سیاسی روایات سے کام لیتا رہا۔

جرمن خارجہ حکمت عملی کے بنیادی اصول

جرمن قوم کی سیاسی روایات مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہوں گی۔ بیرونی ممالک سے تعلقات قائم کرتے وقت ہمیشہ ان سیاسی روایات کو مدنظر رکھا جائے گا

جرمنی پر واجب ہے کہ اپنے سوا یورپ میں کوئی دوسری زبردست سرکار قائم نہ ہونے دے۔ اگر جرمنی کی سرحدات سے متصل کوئی دوسری عظیم عسکری سرکار قائم کرنے کی کوشش ہو تو جرمنی کو حق حاصل ہوگا بلکہ اس کا فرض ہوگا کہ تمام ممکن ذرائع استعمال کرتے ہوئے ایسی سرکار کو پنپنے نہ ہونے دے اور بالکل ختم کر دے۔ اس مقصد کے لیے ضرورت ہو تو فوج کشی سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے۔ کسی سرکار سے اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ جرمنی پر حملہ کرے۔ بہر حال کسی سرکار کو عسکری قوت نہ بننے دینا چاہیے۔ یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ ہماری قوم کی قوت کا انحصار توازن قوت پر نہ ہو۔ بلکہ خود یورپ میں ہمارے وطن کے رقبہ پر ہماری حاکمانہ قوت کا انحصار ہو۔ جرمن سلطنت کو اس وقت تک محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا جب تک سے یا ملحقہ نہ آ جائے جو خود جرمنی کے ساتھ متصل ہو اور آنے والے صدیوں سال تک اس رقبہ میں سے جرمن نسل کے ہر فرد کو زمین کا کچھ حصہ میسر آ سکے جو خود اس کی اپنی ملکیت ہو۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ دنیا کے تمام حقوق میں سے مقدس ترین حق یہ ہے کہ انسان کو زمین کے ٹکڑے پر قبضہ اور اس پر

وہ اپنے لیے بھی بازی کر سکے۔ زمین کا یہ رقبہ حاصل کرنے کے لیے جو خون بہایا جا رہا ہے وہ سب سے بڑی چیز ہے۔

دشمن کو بے یار و مددگار نہ دیا جائے

میں یہ باب ختم کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جرمنی کے لیے موجودہ حالات میں علیحدہ اتحاد قائم کرنے کا آج کل کوئی امکان نہیں ہے۔ علیحدہ معاہدات کے سلسلہ میں جرمنی کا طرز عمل جو مصدقہ ثبوت ہے اس بات میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انگلستان اور جاپان ہی ایسے ممالک ہیں جن سے ایسے علیحدہ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسا اتحاد جرمنی کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ میں ایک دفعہ پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ ایسے معاہدوں کی عسکری اہمیت کیا ہوگی۔

ایسے معاہدات کے عسکری نتائج اس سے بالکل مختلف ہوں گے جو جرمنی اور روس کے اتحاد سے رونما ہوتے ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ انگلستان اور جاپان کے ساتھ جرمنی نے صلح کر لی تو اس سے جنگ کا کوئی خطرہ نہیں۔ ایسے معاہدہ کی مخالفت سوائے فرانس کے اور کوئی حکومت نہ کرے گی۔ فرانس کی یہ مجال نہیں کہ جنگ چھیڑ سکے۔ اس معاہدہ سے جرمنی کو اس سے تیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جب یہ تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو ان معاہدات کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکل آئے گی کہ فرانس کے ساتھ صلح طریق پر کر لی جائے۔ ایسے معاہدوں کی بڑی اہمیت یہ ہوگی کہ اس کی تکمیل کے بعد جرمنی کو خارجی سیاست کا کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ جرمنی کے خلاف اتحادیوں نے جو گھر جوڑا رکھا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ فرانس، روس اور انگلستان نے ہمارے خلاف جو محاذ قائم کر رکھا ہے اور جس نے ہمیں اتنا نقصان پہنچایا ہے وہ ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ ہماری قوم کا جانی دشمن فرانس تنہا رہ جائے گا۔ یہ درست ہے کہ شروع شروع میں اس معاہدہ کا ہمیں اخلاقی دباؤ تک محدود رہے گا۔ لیکن یہ اخلاقی دباؤ بھی جرمنی کو آزادی عمل کا موقع مہیا کر دے گا۔ حالات خود بخود تو

ہمراہ آزادی عمل کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ انگلستان نے فرانس اور اٹلی کا باہمی معاہدہ ہو گیا تو ہر معاہدہ میں فیاض دلی کا وہ حصہ اس معاہدہ کے ارکان کو حاصل ہو گا۔ فرانس کے پیش دستی کا کوئی موقع نہ رہے گا۔

ساتھی ہنر مند ڈھونڈنے پڑیں گے

ایک اور فائدہ یہ ہو گا کہ ہیئت تنظیم آج کل فرانسیسی تجارت کی عادت سے اس قدر بے پروا ہیئت میں ہے اس سے بہت حاصل ہو جائے گی۔ فرانسیسی کی ایک بات کی سرحدات ہر قسم کے حملے سے محفوظ ہوں گی۔ فرانسیسی کو یہ سہولت مل جائے گی کہ فرانسیسی کے لیے طرز کا سامان اور اجناس خام مہیا کرنے کا راستہ ہمیشہ آسان رہیں گی۔ اس نئے معاہدہ کا ایک یہ فائدہ بھی ہو گا۔

اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ یہ ہو گا کہ اس نئے معاہدہ میں شریک ہونے والی تمام حکومتوں میں صنعت سازی اور ہنر مندی کی ایک مسابقت ہو گی جس سے وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گی۔ فرانسیسی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فرانسیسی کو اپنے اتحادی حاصل ہو ں گے جو اس کا خون چوس کر جونکوں کی طرح زندہ نہ رہیں گے بلکہ خود فرانسیسی کی صنعت سازی اور ہنر کاری میں مدد دیں گے۔

ایک اور بات بھی نہ بھولنی چاہیے۔ یہ معاہدہ ہو گیا تو فرانسیسی کے حلیف ترک اور روس جیسے ملک نہ ہوں گے۔ دنیا کی سب سے زبردست سلطنت یعنی برطانیہ اور ایک نوجوان قوم زبردست ملت یعنی امریکہ فرانسیسی کو یورپ میں جدوجہد کے لیے موقع مہیا کر دیں گے جو گزشتہ جنگ عظیم میں کبھی بھی ہنر مند حکومتوں کے اتحاد سے فرانسیسی کو حاصل نہ ہو سکتے تھے۔

دوست بنانے کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا پڑتا ہے

میں یہ بات پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایسے معاہدہ کو تکمیل تک پہنچانے کے راستے میں بڑی مشکلات باقی ہیں۔ لیکن انگلستان فرانس اور روس کے معاہدہ میں بھی تو بڑی

مشکلات تھیں۔ اس اتحاد کو پانچ تکمیل تک پہنچانے میں برطانیہ کے شاہی بیڑے کو اہم کردار
حاصل تھا۔ اس کے راستے میں بھی ایسی مشکلات حائل تھیں جو اتحاد میں شامل ہونے والی
قوام کے مزاج کا اندازہ لگانے پر منحصر تھیں۔ باوجود اس کے اس نے جو کامیابی حاصل کی۔
ہمیں بھی ضرور کامیاب ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہم کامیاب ہو کر رہیں گے۔ شرط صرف یہ ہے
کہ ایسے مجاہدوں کی ضرورت کا احساس ہمارے اندر اس جوش سے پیدا ہو جائے کہ ہم کچھ
کر جانے کا عزم کر لیں اور اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اپنے عزائم کو قائم رکھیں۔ یہ
بھی ممکن ہے کہ جب حالات موجودہ ہمارے مسائل کا اس طرح حل پر مجبور کر
دے۔ ہم اپنے سامنے ایک مقصد رکھ لیں گے۔ پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کی باقاعدہ
کوشش کریں گے۔ گزشتہ دو جنگ عظیم میں ہماری خارجہ سیاست عملی سے جو غلطیاں سرزد
ہوئیں ہم انہیں دہرائیں گے۔ اس زمانے میں تو ہمارا کوئی واضح مقصد ہی نہ تھا۔

بڑے بڑے زخموں کا علاج ہو جائے تو چھوٹے چھوٹے گھاؤ خود ہی
بھر جاتے ہیں

مستقبل میں ہماری خارجہ سیاست عملی کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تو ہم مشرق کی جانب
بڑھیں گے اور یا مغرب کی جانب۔ اب ہمارا مقصد فقط یہ ہونا چاہیے کہ ہم مشرق کی
جانب بڑھیں اور یا رقبہ حاصل کریں جس قوم کو اس نے رقبہ کی ضرورت ہے۔ یہ
پالیسی پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں طاقت ور بننے کی ضرورت ہے۔ ہماری قوم
کا دیرینہ دشمن فرانس ہمیں اپنے راستہ پر رکاوٹ کھڑی کرنے کی طاقت نہیں کرنے دیتا۔ وہ یورپ کی بے
سے بڑی قوت کے دوسرے درجہ پر پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یورپ پر فرانس کا تسلط
روکنے کے لیے جو قربانی بھی دینی پڑے اس سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ حالات موجودہ پر
میں ہماری حلیف ہو وہ حکومت ہے جو یورپ پر فرانس کا تسلط کو رائج نہیں کرتی۔ ایسی
حکومتوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہمیں جو دقتیں درپیش ہیں انہیں دور کرنے
کے لیے ہمیں کسی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اس راہ میں جو قربانی بھی دینی پڑے

وہ ہمیں قبول ہوتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہم اپنے بہترین وقت کو فکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ چھوٹے چھوٹے زخم خوردگی جیسے روز مرہ گزرے گا بھر جائیں گے۔ بڑی ضرورت یہ ہے کہ بڑے زخموں کی تلافی کرنے میں ہم پوری محنت سے کام لیا جائے۔ اور پھر انہیں مندمل ہونے دیا جائے۔

ہمیں اپنے منصب کے مطابق شان پیدا کرنی چاہیے

یہ تو قدرتی امر ہے کہ ساری قوم کے دشمن بھی کوششوں کو روکنے کے لیے حملے بھونک بھونک کر دیوانہ ہو جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ بھونکنا ہمقوم پرست اشرافیہ کو اس بات سے باز نہ رکھ سکے گا کہ ہم اپنے دل کی بات پورے زور سے بیان کرتے رہیں۔ ہم تو اس قدامت کو ضرور ہوں کرتے ہیں اس کی تنقیص کرتے ہی رہیں گے۔ ہمارے عامہ کے موجودہ رجحان کا بھی مقابلہ کریں گے۔ یہ دونوں اپنی عیاری سے ہمارے دوستوں کی ناواقفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس رائے عامہ کو ہمارے خلاف بھڑکائیں گے۔ یہ رائے عامہ ہمارے خلاف غیر دوستانہ رویہ اختیار کرے گی۔ اس دن ہم نے دوست بنانے کے ساتھ ساتھ بنانا شروع کر دیا اس دن ہماری مشکلات خود بخود کم ہونا شروع ہو جائیں گی۔ آج ہمارے دوستوں کی فہرست میں ان کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ قسمت کو منظور ہے تو عنقریب ہی وہ دن آنے والا ہے جب یہ دشمن ہمارے گرد و پیش کا ساتھ چھوڑ دے گی۔

مندرجہ حالات یہ ضروری ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں ہماری تحریک کا موقف واضح ہو جائے۔ وہ سمجھ سکیں کہ ہماری تحریک کا ایک واضح سیاسی پروگرام ہے۔ ہم اس پروگرام کو وہ تکمیل تک پہنچانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ قدرت نے ہمیں ایک زبردست مہم سر کرنے کے لیے نامزد کیا ہے۔ اب ہمیں اپنے اندر وہ شان پیدا کرنی ہے جس سے ہمارا واسطہ پڑنے والے شناخت کر سکیں۔

دشمن کی ایک نہ سنی چاہیے

جب ہمیں خود یہ احساس ہو جائے گا کہ ہم نے جو راستہ حکمت عملی اختیار کی ہے

شکست پر مجبور بھی ہو جائو تو رضامند نہ ہونا چاہیے

۱۹۱۸ء میں جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد جرمنی نے جو بھی ہتھیار کی اس کا تقاضا یہ تھا کہ بتدریج جرمنی مکمل طور پر غلام بن جائے۔ جہاں تک مقابلہ انسانی کام کرتی ہے اس کے علاوہ ہو کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس قسم کی مثالوں کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ جب کوئی قوم پوری طرح سے مجبور ہو کے بغیر ہتھیار ڈالتی ہے تو پھر وہ بڑی دقتیں اور ذلتیں برداشت کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔ اسے یہ برداشت نہیں ہوتی کہ اپنی تقدیر بدلنے کے لیے دوبارہ وہ ہتھیار اٹھائے جو ایک دفعہ دشمن کے سامنے ڈال دیے تھے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سمجھنا بھی مشکل نہیں۔ فطرت انسانی کا تقاضا یہی ہے۔ ایک قابل مذمت کام قوم مفتوح پر پے در پے ڈھائے اور ہر کام بتدریج اور آہستہ آہستہ ہی کرتا ہے۔ ایک وقت میں اتنا ہی بوجھ ڈالا جاتا ہے کہ جو قابل برداشت ہو۔ پھر ایک دن یہ نوبت بھی آجاتی ہے کہ فاتح کو محسوس ہو جاتا ہے کہ مفتوح قوم کے اندر سے غیرت کی آخری رمق بھی ختم ہو چکی ہے۔ جو قوم پر خاص غیرت اپنے کسی دشمن کے سامنے جھک جاتی ہے۔ اس کی غیرت کو اسی دن سے گھن لگ جاتا ہے۔ مگر جب ایسی مرعوب غیرت والی قوم اور دوسرے ظلم کے درمیان بکوہ فولاد کھڑا جائے۔ ایسا ہوتا ہے تو یہ غیرت کو پہنچے والی مفتوح قوم اور دوسرے ظلم کو یکجا کر برداشت کرتی ہے کہ کسی سے برداشت نہ کیا ہو۔ اگر اس کا مقابلہ کیا تو کہیں کوئی نیا ظلم نہ ٹوٹ پڑے۔ یہ نیا ظلم بھی جب ٹوٹے تو اس سے اگلے ظلم کے ڈر سے اسے بھی برداشت کر لیا جاتا ہے۔ ہر حال ہتھیار اٹھانے کا عزم ہر مرتبہ یہ سوچ کر ملتوی کر دیا جاتا ہے کہ اگلی مرتبہ ایسا ہوا تو پھر یوں کریں گے۔ جوں جوں مظالم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے توں توں مقابلہ کرنے کی سکت

بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ اور لوگوں میں مقابلہ کرنے کی سکت ختم ہوتی جاتی ہے تو ان میں یہ قبول تقدیر بڑھتا جاتا ہے کہ افسوس پہلے مقابلہ نہ کیا۔ اب تو حالت اتنی خراب ہو چکی ہے۔ کہ مقابلہ کرنے کا ارادہ ہی کیا ہے۔ یہ دل ہارے جیرت قومیں رفتہ رفتہ یوں ہی ہر بے عزتی کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ بے چارگی کا احساس ہمیشہ ان کے جذبات کے اردے کو کچلے رہتا ہے۔ غرض غلامی کے تخم سے غلامی ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں شروع شروع میں جن مظالم کا ذکر کیا ناقابل برداشت ہوتا ہے آخر کار ان کو بڑی اسی خوشی سے رعایتیں سمجھ کر برداشت کر لیا جاتا ہے۔

اگر ایسی قوم کی عادت بھی کر دے تو یہ کی دوسری قومیں بھی سمجھتی ہیں کہ جب اس سے پہلے تا بکجا برداشت کر لیا تھا تو اب اتنی سی بات پر یہ بگڑنے کا کیا موقعہ تھا" زمانہ قدیم میں قرطاجنہ کی تباہی ایک ٹوٹکا کے مثال پیش کرتی ہے۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم آزادی سے روبہ انحطاط ہو جاتی ہے تو اس کا انجام کیسی تباہی ہوتا ہے۔ یہ تباہی خود قوم کی اپنی غفلت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

غیرت بڑی چیز ہے

فرانس کے مشہور مورخ اور مصنف کارلیل نے اپنی کتاب موسومہ "انقلاب فرانس" میں اس حقیقت کو بھی طرح بیان کیا ہے اس نے اس مرض کو تشخیص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب کوئی قوم بزدلی سے تھپوڑا کھا کر غلامی کا داغ اپنی پیشانی پر لگا لیتی ہے۔ تو پھر یہ داغ آسانی سے نہیں دھلتا۔ اس حرکت کے بعد وہ قوم کے ہر خون میں زہر کے ہوا نطرات داخل ہو جاتے ہیں وہ پھر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہتے ہیں اس زہر سے آنے والی نسلوں کی قوت کو بھی مفلوج ہو جاتی ہے۔ ان کو کھن لگ جاتا ہے تصور کا دھار ارخ دکھاتے ہوئے کارلیل نے لکھا ہے کہ جب کوئی قوم جان پر کھیل کر باعزت طور پر جنگ لڑتی ہے تو ہار کی حالت میں اگر اسے ظلمت بھی ہو جائے

کرا سے غلام بھی بنایا جائے تو اس کی دوبارہ زندگی اور آزادی بحال ہو جانے کی امید باقی رہتی ہے۔ ایسی بڑی قوم کی مثال بیج کے تنا کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑیں سرسبز ہوں۔ اس سے ایک نہ ایک دن ایک پودا ضرور پھوٹتا ہے۔

یہ قدرتی بات ہے کہ جب کوئی قوم طاقت کے بل بوتے پر اس کی قوت کردار ضائع ہو جاتی ہے تو پھر وہ مذکورہ بالا قاعدہ کو درست نہیں مانتی۔ لیکن جو قوم اس عقیدہ پر کاربند ہے وہ کبھی زوال کے لیے پست نہیں ہوتی۔ صرف وہی قومیں تباہ ہوتی ہیں جو اس اصول کو بھول جاتی ہیں یا اسے تسلیم ہی نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے بزدلانہ طور پر ہتھیار ڈالے تھے ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اب انہیں بالکل "ہوش" جائے گا یا یہ کہ وہ یک طرفہ عمل شروع کر دیں گے۔ ان سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اس راستہ پر چلیں گے جس پر انسان کی عقل کا تقاضا ہے کہ جرأت مند قوموں کو چلنا چاہیے۔ اس کے برعکس یہ بزدل لوگ ہمیشہ ان قاعدوں کی تردید کرتے ہیں۔ ان کی تردید اس وقت تک جاری رہتی ہے کہ جب قوم یا مستقل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے، یا پھر قوم کا بانکا سجیلا سپاہی کرنال اور غلام رعایا کے ہاتھ سے جرأت ہتھیار چھین لیتا ہے۔ اگر غلامی کی زنجیریں قوم کو مستقل طور پر جکڑ لیں تو پھر حکمران طبقہ اس سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ان کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ عوام عام طور پر غلاموں کی نگرانی اور حفاظت کے فرائض انہیں لوگوں کے سپرد کرتا ہے۔ جو بزدل پیدائشی طور پر ہوتے ہیں اس لیے نہیں جو اقتدار حاصل ہوتا ہے اسے اپنی قوم کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ اقتدار استعمال کرتے وقت ایسے محتاط رہتے ہیں کہ خود دشمن قوم کا کوئی عالم سے عالم فرد بھی یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔

دشمن سے رحم کی امید نہ رکھنی چاہیے

۱۹۱۸ء کے بعد جرمنی میں جو واقعات رونما ہوئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ رضاکارانہ طور پر دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر اس سے رحم کی امید رکھنا کیسی بزدلی کی

حرکت ہے۔ اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے سیاسی اقتدار اور عوام کی سیاسی سرگرمیوں پر بہت زور ہوا۔ میں نے "عوام" کا نام جان بوجھ کر لیا ہے۔ کیونکہ میں یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ اس زمانہ کے قائدین جو اس حرکت سے قاصر رہے اور ان حرکات کے مرتکب ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کی طرح انہیں بھی حقیقت حال کا علم نہ تھا۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ اس طرح ہوتا بھی آیا ہے اور اس کی ذمہ داری کے باعث تھی۔ جنگ عظیم کے بعد جرمن قوم کی قسمت کی باگ ڈور بھلے لوگوں یعنی سوشلسٹوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم جو سوشلسٹ نہیں ان کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے اس وقت کے قائدین کو صحیح صورت حال کا علم نہ تھا۔ اس کے برعکس واقعات کی شہادت یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری قوم کو یہ جبر کرنا ہی کے راستہ پر واقعات کی شہادت یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری قوم یہ جبر کرنا ہی کے راستہ پر چلایا گیا۔ اگر اس زمانہ میں جرمنی کی پولیسی کا تاریخی نگاہ سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خانہ جنگی جیسی احمقانہ نظر آتی ہے درحقیقت ایسی احمقانہ نہ تھی۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ خانہ جنگی بعض سوچے سمجھے منصوبوں سے طے کیے ہوئے ایک منطقی اصولوں پر مبنی تھی جس پر باقاعدہ عمل کیا گیا۔ ان اصولوں کا مقصد یہ تھا کہ اس عقیدہ کو فروغ دیا جائے کہ دنیا پر سوشلزم کی دہشت قائم ہونی چاہیے۔

خانہ جنگی برداشت کرنے سے خود خانہ جنگی پائیدار ہو جاتی ہے

۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۳ء تک پرشیا برباد کی حالت میں تھا۔ نپولین نے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ باوجود اس کے یہ خانہ جنگی کا دور قوم کے اندر یہ جذبہ پیدا کرنے کا سبب بنا قوم میں ایک دفعہ پھر یہ عزم پیدا ہوا کہ جنگ لڑنی چاہیے۔ ۱۸۱۸ء سے لے کر آج تک اتنی مدت گزر چکی ہے لیکن ہمیں دنیا کے اس دور سے دیرینہ کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ برعکس اس کے جرمن سرکار کی قوت مسلسل مضبوط ہوتی چلی آئی ہے۔

نومبر ۱۹۱۸ء کے سات سال بعد لوکارنو کے معاہدوں پر دستخط ہوئے۔

غرض جو جنگ جس نے روس و انگلستان کے جس تسلسل کا تجزیہ کیا ہے اس کا حل جرمن قوم پر شروع ہو چکا ہے جب ایک دفعہ جنگ بند کرنے کے شرمناک معاہدوں پر دستخط کیے گئے تو پھر ساری قوم میں یہ ذلت اور حوصلہ پیدا ہوا کہ ہمارے دشمن نے ہم پر جو مسلسل ظلم و ستم توڑنے شروع کیے ان میں سے کسی ایک کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت کم ہمت و بددل کر کھڑے ہو جاتے دشمن کو بھی اتنی محض تھی کہ اس نے اپنے تمام مطالبات ایک دفعہ قبول نہ کیے۔ دشمن ایک وقت میں تمام مطالبات پورے نہ کرتا رہا کہ جو اس کی رائے میں ہو سکتا تھا۔ ہوں کی مرحلہ پر یہ ظلم پیدا نہ ہو کہ اسے مقابلہ پر آمادہ کرے گی۔ جوں جوں ہر ایک ظالمانہ اور ذلت کی درخواست کی گئی توں توں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر ظلم درخواست کرنے کے بعد کسی نئے ظلم کے خلاف احتجاج کرنا اس لیے بے سود معلوم ہوتا تھا کہ جب ایسے کئی مظالم پہلے درخواست کر چکے ہیں تو اب اس میں ایک اور کا اضافہ کرنا کیسے بوجھ ہو سکتا ہے یہی وہ زہر ناک خطرہ ہے جس کا کہ روس کے مدبر رہنما اقوال میں ذکر ہے۔ جب ایک دفعہ ذلت کی جانے تو اس کے بعد حالات بد سے بدتر ہوتے ہیں۔ ہر گزشتہ کم ہمتی آئندہ کے لیے ضمیر کو کمزور کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ بے غیرتی قوم کے لیے ہمت کا خون کر دیتی ہے۔ اس ذلتی خوف کا توڑ ناممکن ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم غلامی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

زحمت بھی قدرت کی رحمت ہوتی ہے

ہوں ہوں جرمنی کے تھیوریجین لیے جرمنی کی ہر ظلم توڑنے اور جرمنی کو اقتصادی طور پر لوٹ لینے کے دیوار کے بعد دیگرے ناقابل ہوتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جرمنی سیاسی لحاظ سے اپاہج ہو گیا۔ اس سے ساری قوم میں پست ہمتی پھیل گئی۔ اس پست ہمتی نے قوت یہاں تک ہلکا دی کہ جرمنی سے تاوان جنگ وصول کرنے کے لیے مسٹر

گدھے اصطبل سے نکل کر مسند حکومت پر بیٹھ گئے

۱۹۱۸ء کے بعد ہماری قوم کی رہی سہی روح زوال ہو چکی تھی کہ ہماری تباہی سب پر عیاں تھی۔ اس بربادی سے دوں میں کچھ بھر گئی تھی کہ وہ نہ تھا کہ اس پر ہم پر دشمنوں نے بدترین مظالم توڑے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا اندازہ پہلے سے لگایا جا سکتا تھا۔ ہماری قوم نے جس حکومت کی اطاعت اختیار کی وہ جیسی پھوہڑ ہونا تھی ویسی ہی مطلوب ہونے خود غلط بھی تھی۔ اس حکومت کی بنیاد کی اس سے کہ اس کی نے سے تجویز کی اس نے اس حکومت سے بنا کر دی کی یا اس نے حکومت کی بنا حقیقی سوال ہی۔ اسے ملک کا غدار مشہور کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہم تجربت نے یہ تو شاید کچھ اور